الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

کسی شخص یا گروہ کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ یہ کہ [illegible] وہ انتہائی
جذباتی مواقع پر انتہائی عقلی فیصلے کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی
ایک مسلسل امتحان ہے جس میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں کہ آدمی
جذبات سے مغلوب ہو جائے اور منفی تاثر کے تحت کارروائی کرنے لگے۔
ایسے مواقع پر اپنے عقل و ہوش کو باقی رکھنا اور جذبات سے الگ ہو کر
واقعات کے بارے میں فیصلہ کرنا قرآن کی اصطلاح میں صبر ہے اور
یہی کسی کی کامیابی کی واحد یقینی ضمانت ہے [illegible]

[illegible]

فہرست

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم سالانہ زر تعاون بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں تاکہ الرسالہ آپ کے نام جاری رکھا جاسکے۔ منیجر

الرسالہ کوئی صحافتی کاروبار نہیں، وہ اعلانِ حق اور اصلاحِ امت کی ایک صحافتی مہم ہے۔ اس سے کسی کا کوئی ذاتی فائدہ وابستہ نہیں۔ جن لوگوں نے اس کو جاری کرنے کی ہمت کی ہے، ان کے لئے وہ سراسر ایک گھاٹے کا سودا ہے۔ اس کی کامیابی کا واحد راز یہ ہے کہ امت میں کچھ ایسے لوگ اٹھیں جو اس کو "اپنا کام" سمجھ لیں اور اس کو اس طرح آگے بڑھانا چاہیں جس طرح کوئی شخص اپنے ذاتی کام کو آگے بڑھاتا ہے۔ اس کے برعکس الرسالہ کو پڑھنے والے اگر اس کو ایک ڈائجسٹ یا معروف معنوں میں علمی و ادبی پرچہ سمجھتے رہے تو ناممکن ہے کہ یہ صحافتی مہم کسی نتیجہ خیز انجام تک پہنچے۔

قوموں کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس میں ہر شخص اپنی ذمہ داری کو جانتا ہو۔ جس قوم میں دوسروں کی ذمہ داری جاننے والے ماہرین پیدا ہونے لگیں، اس کے لئے اسباب کی اس دنیا میں، موت کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

بدقسمتی سے اس معاملہ میں ہمارا تجربہ زیادہ خوش آئند نہیں۔ ہمیں ایسے خطوط تو روزانہ ملتے ہیں جن میں ہمارا کوئی ہمدرد ہم کو ہماری "ذمہ داریاں" یاد دلاتا ہے۔ مگر ایسے خطوط موصول کرنے کی خوش قسمتی ہم کو کم ہی نصیب ہوتی ہے جس میں کوئی بندۂ خدا ہمیں اس بات سے مطلع کرے کہ الرسالہ کے سلسلے میں اس نے اپنی ذمہ داریوں کو جان لیا ہے۔

زندہ افراد کسی قوم کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ اگرچہ کم ہی قومیں ہیں جو اس معنی میں سرمایہ دار ہوں۔

جب لوگ اندھے اور بہرے ہو جائیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے "زمین و آسمان میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے لوگ گزرتے رہتے ہیں۔ مگر ان پر دھیان نہیں دیتے" (یوسف ۱۰۵) جو بات ہم انسانی زبان میں کہنا چاہتے ہیں، وہ کائنات میں زیادہ بہتر طور پر خدائی زبان میں نشر ہو رہی ہے۔ پھر خدا کی آواز کو سننے کے لئے جب لوگوں کے کان بہرے ہوں تو انسان کی آواز سے وہ کیا اثر قبول کریں گے۔

کائنات کی وسعتوں اور عظمتوں سے زیادہ کون اس بات کا سبق دے سکتا ہے کہ انسان انتہائی طور پر ایک حقیر وجود ہے۔ عجز کے سوا کوئی اور رویہ اس کے لئے درست نہیں۔ اس کے باوجود انسان گھمنڈ کرتا ہے (اسرار ـــ ۳۷)

پہاڑوں کے پتھریلے سینے سے بہہ نکلنے والے پانی کے دھارے سے بڑھ کر کون اس حقیقت کو بیان کر سکتا ہے کہ تم دوسروں کے لئے سیرابی اور ترادٹ کے دریا بن جاؤ۔ مگر انسان دوسروں کے لئے پتھر سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوتا ہے (بقرہ ـ ۷۴)

زمین کے سینہ پر کھڑے ہوئے تناور درختوں سے زیادہ بہتر طور پر کون اس حقیقت کا اعلان کر سکتا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرو تاکہ کوئی اس کو اکھاڑ نہ سکے۔ اس کے باوجود لوگ وقتی جھاڑ جھنکاڑ کی مانند اپنی تعمیرات کھڑی کرتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ فلاں نے میرے درخت کو اکھاڑ لیا (ابراہیم ـ ۲۶)

اگر لوگوں کے پاس سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ ہو تو کائنات ہر آن حق و صداقت کا اعلان کر رہی ہے۔ اور جب خدائی اعلان کو سننے کے لئے لوگوں کے کان بہرے ہو جائیں۔ اور خدائی نشانیوں کو دیکھنے کے لئے لوگوں کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہوں تو کوئی انسانی آواز انھیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اس کے بعد تو لوگوں کو ہوش میں لانے کے لئے قیامت کی چنگھاڑ ہی کا انتظار کرنا چاہئے۔

'The 'big bang' was not all that big

WASHINGTON, December 10 (Reuter).

TWO California scientists have come up with new data suggesting that the "big bang," which brought the universe into being some 15 billion years ago, was a much smoother and more orderly event than popularly imagined.

In an announcement from the National Aeronautics and Space Administration (NASA) recently, Dr. Rechard Muller and Dr. George Smoot of the University of California said they had found that the universe was expanding at a constant rate in almost all directions.

The new findings "take the simplistic big bang theory a long step down the road and give us a model that will eventually help to unravel the mystery of how the universe was formed," Dr Smoot said in an interview.

Most astronomers believe the universe began with a huge explosion. Some think this was a chaotic mess, occurring at different speeds in different places, giving rise to great swirls of matter.

Others see it as an homogeneous event, sending newly formed matter out in all directions at the same speed.

But the new findings seem to indicate that the bang was smoother than even the "homogeneous school" had expected.

It appears, said Dr Smoot, that "there was no explosion such as a Super Nova (large exploding star), but rather some sort of energy release which we don't understand yet.

"We're really giving added weight to the big bang theory. But it is an infinitely more complex process than the originators conceived it to be."

BACKGROUND RADIATION

The two scientists base their ideas on readings of background radiation detected by sensitive instruments aboard a NASA U-2 aircraft at an altitude of 20,000 metres. This plane, a type most famous for spy flights over the Soviet Union and Cuba in the late 1950s and early 60s, is also used for agricultural and earth resources photography, NASA said.

Background microwave radiation, discovered in 1965, is thought to be the heat left over after the bang.

But the U-2 flights found that the radiation was the same in all sectors of the sky, indicating there is no central core of the universe and hence no single primal explosion at one "spot"

The radiation is so regular that it allows the measurement of motion of heavenly bodies, just as resistance to water allows a ship's speed to be measured.

And these measurements reveal one exception to reregularity: the earth, our solar system and our galaxy — the Milky Way—are out of step with the rest of the Hydra at more than one million miles per hour.

"This is a slight paradox, Dr. Smoot said. "Because if our galaxy was constant with the rest of the universal expansion, it should only be travelling at about one-sixth that rate of speed."

Why the Milky Way is acting this way remains unknown, though Dr Bernard Jones of England's Cambridge Institute of Astronomy has suggested that the entire universe might be slightly lop sided, with more matter on one side than on the other.

The gravity of this matter could be tugging the Milky Way, but in that case other galaxies would be affected.

The fact remains that the two scientists found none of the swirls of radiation a chaotic explosion might have caused.

The basic Smoot-Muller model of the universe is one of clusters of galaxies moving away from one another at a constant rate towards the end of the universe—if it has ends.

The model, more complex than idea of a messy explosion, still leaves the basic question unanswered: how did the orignal bang come about?

Some astronomers speculate that it was caused by the collision of matter and anti-matter. This theory holds that there was originally slightly more matter than anti-matter, so some matter was left over after the blast.

THE TIMES OF INDIA,
DECEMBER 11, 1977

کائنات کی ابتدا منظم منصوبہ کے تحت ایک طاقت کے اخراج سے ہوئی، یہ ایک انتہائی پیچیدہ نوعیت کا واقعہ تھا جس کے بعد اس کے تمام اجزار بالکل یکساں رفتار سے چاروں طرف پھیلنے لگے۔ مگر ہمارا شمسی نظام ایک حیرت انگیز استثنار ہے جو اپنی الگ رفتار سے چل رہا ہے ——————

اس قسم کے واقعات بتاتے ہیں کہ یہ کائنات کوئی الل ٹپ حادثہ نہیں، بلکہ ایک باشعور ارادہ ہے جو اس کے پیچھے کام کر رہا ہے۔

موجودہ زمانہ کے فلکیاتی نظریات میں سے ایک نظریہ وہ ہے جس کو بگ بینگ کہا جاتا ہے۔ اندازہ ہے کہ تقریباً پندرہ بلین سال پہلے کائنات ایک سمٹے ہوئے واحد مادہ کی صورت میں تھی۔ یہ ابتدائی مادہ جس کو بعض سائنس دانوں نے "سپر ایٹم" کا نام دیا ہے، اس کے تمام اجزار اندر کی طرف شدت سے کھنچے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس ابتدائی مادی مجموعہ میں زبردست دھماکا ہوا۔ اس دھماکہ کے نتیجے میں اس کے اجزار چاروں طرف پھیلنے لگے اور بالآخر موجودہ کائنات، اپنے تمام ستاروں اور سیاروں سمیت بن گئی۔

حال میں کیلی فورنیا کے دو سائنس داں ایسے نئے حقائق تک پہنچے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑا دھماکہ (بگ بینگ) اس سے بہت زیادہ پرسکون اور منظم واقعہ (ORDERLY EVENT) تھا جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ امریکی ادارہ ناسا کے ایک اعلامیہ میں ڈاکٹر ریکارڈ مطر اور ڈاکٹر جارج اسموٹ (کیلی فورنیا یونیورسٹی) نے کہا ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیق میں پایا کہ کائنات اپنے چاروں طرف بالکل یکساں رفتار سے پھیل رہی ہے۔

اکثر سائنس داں یہ یقین رکھتے ہیں کہ کائنات ایک عظیم دھماکہ سے شروع ہوئی۔ کچھ کا خیال ہے کہ یہ ایک منتشر حالت تھی جس سے مادہ میں ایک بھنور کی کیفیت پیدا ہوئی۔ مگر جدید شواہد بظاہر بتا رہے ہیں کہ معروف معنوں میں یہ کوئی "دھماکہ" نہیں تھا۔ بلکہ اخراج طاقت (ENERGY RELEASE) کا ایک پرسکون واقعہ تھا جس کی حقیقت ابھی ہم سمجھ نہیں سکے ہیں۔ یہ اس سے بہت زیادہ پیچیدہ واقعہ تھا جیسا اب تک سمجھا جاتا رہا ہے۔

دونوں سائنس دانوں کے نظریات کی بنیاد وہ بیک گراؤنڈ شعاعیں ہیں جو ناسا کے یو-۲ جہاز میں لگے ہوئے نازک آلات نے پتہ کی ہیں۔ یہ مخصوص جہاز ۲۰ ہزار میٹر کی بلندی تک اڑایا گیا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ شعاعیں ابتدائی دھماکہ کے وقت نکلی تھیں۔ ان شعاعوں کا علم ابتداءً ۱۹۶۵ میں ہوا تھا۔ یو-۲ جہاز

نے معلوم کیا ہے کہ یہ شعاعیں کائنات کے ہر حصہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں اتنی نظم و ترتیب ہے کہ ان کے ذریعہ آسمانی اجرام کی رفتار کو نہایت صحت کے ساتھ ناپ کر معلوم کیا جا سکتا ہے۔

تاہم جو پیمائش کی گئی ہے، ان سے نظم و ضبط میں ایک انتشار کا علم ہوا ہے۔ زمین، ہمارا شمسی نظام اور ہماری کہکشاں، جس میں شمسی نظام واقع ہے، بقیہ اجرام سماوی کے مقابلہ میں ایک ملین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے علیحدہ ہو رہے ہیں۔ "یہ صورت حال ہمارے مسلمات کے کسی قدر خلاف ہے۔" ڈاکٹر اسموٹ نے کہا "کیوں کہ اگر ہماری کہکشاں بقیہ کائناتی توسیع کے ہم آہنگ ہو تو اس کو موجودہ رفتار کے مقابلہ میں ہلکی رفتار سے سفر کرنا چاہئے۔" ہماری کہکشاں کیوں اس طرح استثنائی انداز سے سفر کر رہی ہے، اس کی وجہ ہم نہیں جانتے۔ اس بنیادی سوال کا جواب بھی ابھی تک نامعلوم ہے کہ کائنات کے مادہ میں ابتدائی حرکت یا دھماکہ کا آغاز کیوں کر ہوا۔

میں نے سمجھا تھا ۔۔۔

- میں نے سمجھا تھا کہ دلیل میں وزن ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ طاقت اپنے اندر اس سے بھی زیادہ وزن رکھتی ہے۔
- میں نے سمجھا تھا کہ کارکردگی سے انسان تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ لیاقت کا سب سے بڑا سرٹیفکٹ موقع پرستی ہے۔
- میں نے سمجھا تھا کہ عہدے اور مناصب کام کرنے کے مواقع ہیں مگر معلوم ہوا کہ یہ سب محض اعزاز کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ لوگ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں وہی ان کے دل میں بھی ہوتا ہے مگر معلوم ہوا کہ ان دونوں میں کوئی تعلق نہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ لوگ مقاصد کے علم بردار ہیں مگر معلوم ہوا کہ اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے سوا لوگوں کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ جو لوگ خدا کی باتیں کرتے ہیں وہ خدا سے ڈرتے بھی ہیں مگر معلوم ہوا کہ خدا ان کے لئے ایک تجارتی عنوان کے سوا اور کچھ نہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ لوگ اصلاح چاہتے ہیں مگر معلوم ہوا کہ ہر شخص کو اپنا مفاد عزیز ہے خواہ وہ دوسروں کو برباد کر کے ہی کیوں نہ حاصل ہو۔
- میں نے سمجھا تھا کہ لوگ خدمت خلق کے لیے سرگرم ہیں مگر معلوم ہوا کہ ساری سرگرمیاں اپنے جاہ اور مفاد کے لئے کی جاتی ہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کا خیر خواہ ہے مگر معلوم ہوا کہ ہر ایک دوسرے کا استحصال کر رہا ہے۔
- میں نے سمجھا تھا کہ جنت کا راستہ وسیع اور جہنم کا راستہ تنگ ہے مگر معلوم ہوا کہ سب سے وسیع راستہ وہ ہے جو جہنم کی طرف جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات : ایک فکری مطالعہ

ایچ۔ اے۔ کریبس (H.A.KREBS) نے نوبل انعام پانے والوں کے علمی حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک سائنس داں کو جو چیز نوبل انعام پانے کے قابل بناتی ہے، وہ دراصل کسی بڑے سائنس داں کی صحبت ہے۔ یہ بڑا سائنس داں اپنے شاگرد کو معلومات کا ڈھیر یا ساز و سامان کا انبار نہیں دیتا۔ بلکہ ایک سائنسی روح (SCIENTIFIC SPIRIT) اور ذہنی رجحان (ATTITUDE OF MIND) اس کی طرف منتقل کرتا ہے۔ اس اسپرٹ یا رجحان کی روشنی میں وہ اپنا سائنسی عمل جاری رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ سائنس داں بن کر نوبل انعام پانے کا مستحق بن جاتا ہے۔

یہی بات، بلاتشبیہہ، اسلام کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ طبیعیات میں مہارت حاصل کرنے کی جو شرط ہے، وہی الٰہیات میں گہری معرفت حاصل کرنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ اسلام کے ذریعہ انسان کو جو چیز ملتی ہے، وہ قوانین و ضوابط کے مجموعہ سے زیادہ ایک ذہن اور مزاج ہے۔ یہ ذہن اور مزاج جب کسی کے اندر پیدا ہو جاتا ہے تو وہ زندگی کے تمام رویوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور بالآخر اس کو خدا کی اس ابدی جنت تک پہنچا دیتا ہے جو کسی انسان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اس سلسلے میں یہاں ہم اسلام کے چند پہلوؤں کا ذکر کریں گے۔

تصوراتی عبادت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے جب پہلا انسان بنایا تو فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے آگے جھک جائیں۔ یہ دراصل اس بات کی علامت تھی کہ انسان کو اس کائنات میں برتر مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے۔ انسان کو یہ برتری، قرآن کے مطابق، اس لئے حاصل ہے کہ اس کو علم اسماء دیا گیا ہے۔ یعنی وہ اسماء (ناموں) کے ذریعہ مسمّیات (چیزوں) کو جانتا ہے، جب کہ فرشتے مسمیات کے ذریعہ مسمیات کو جانتے ہیں۔ (بقرہ۔ ۳۱) انسان کے اندر یہ مخصوص صلاحیت ہے کہ وہ کسی چیز کو سوچ کر جان لیتا ہے، بغیر اس کے کہ وہ حسی طور پر اس کی آنکھوں کے سامنے موجود ہو۔ اس کے برعکس فرشتے چیزوں کو اس لئے جانتے ہیں کہ وہ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، انسان کو تصوراتی علم حاصل ہے اور فرشتوں کو مشاہداتی علم۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کو انسان سے کیا مطلوب ہے اور فرشتوں سے کیا مطلوب ہے — انسان سے تصوراتی عبادت مطلوب ہے اور فرشتوں سے مشاہداتی عبادت۔ فرشتے جس خدا کو دیکھ کر اس کی تسبیح و تقدیس کر رہے ہیں، انسان کو اسی خدا کی تسبیح و تقدیس دیکھے بغیر کرنا ہے۔

علم کا آغاز یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو شعور کی اس سطح پر لائے جہاں وہ دیکھے بغیر حقائق کا ادراک کر سکے۔ بہت سے

جانوروں کی ساخت ایسی ہے کہ وہ اپنی سونگھنے کی صلاحیت کے ذریعے واقعات کو جانتے ہیں، اگر وہ آنکھ کے ذریعہ جاننے پر اصرار کریں تو وہ چیزوں سے باخبر نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح انسان کی تخلیق کچھ اس ڈھنگ پر ہوئی ہے کہ وہ گہری باتوں کو اپنے ذہن کے ذریعہ ہی جان سکتا ہے۔ اگر وہ دیکھنے اور چھونے کی حد تک اپنے علم کو محدود کرے تو وہ تمام اہم باتوں کو جاننے سے محروم رہے گا۔

تصوراتی عبادت کا ایک پہلو اور ہے۔

ایک معمولی آدمی کے مقابلہ میں ایک مشہور قائد کا استقبال کیوں زیادہ ہوتا ہے جب کہ دونوں میں ظاہری طور پر کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی وجہ قائد کی وہ غیر مرئی حیثیت (ایمج) ہے جو اس کے اعمال اور اس کی قربانیوں سے اس کی شخصیت کے گرد بنی ہے۔ یہ ایمج محسوس شکل میں دکھائی نہیں دیتی۔ وہ محض تصوراتی چیز ہے۔ مگر یہ تصوراتی حقیقت اتنی اہم ہے کہ ہر جگہ اپنے آپ کو منوا کر رہتی ہے۔ کوئی اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اسی طرح آدمی کی ایک اور ایمج بن رہی ہے۔ یہ اخروی ایمج ہے۔ موجودہ دنیا میں ایک شخص کے کارناموں کی ایمج اس کے ظاہری پہلو کے اعتبار سے بنتی ہے۔ اگلی دنیا میں اسی کے ساتھ اعمال کے حقیقی اور باطنی پہلو کے اعتبار سے اس کی ایمج بن رہی ہے۔ مثلاً ایک قائد ایک عالی شان تقریر کرتا ہے یا ایک انقلابی منصوبہ بناتا ہے۔ اس کے اس عمل کا دنیوی پہلو یہ ہے کہ قائد کو اخبارات کے صفحۂ اول پر جگہ مل جائے۔ اس کو ہر طرف اعزازات اور استقبالیے ملنے لگیں۔ مگر جہاں تک اخروی پہلو کا معاملہ ہے، اس کا تعلق آدمی کی نیت سے ہے۔ کوئی شخص اپنی نیت میں جتنا خالص ہوگا، اسی کے بقدر خدا کے یہاں اس کی حیثیت قائم ہوگی اور اس کی اخروی ایمج بنے گی۔ دنیوی ایمج کا فائدہ دنیا میں مل جاتا ہے، اخروی ایمج کا فائدہ مرنے کے بعد سامنے آئے گا۔

تصورات کی دنیا (آئیڈیل ورلڈ) ہماری محسوس دنیا (مٹیریل ورلڈ) سے زیادہ حقیقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سے جو عمل مطلوب ہے، وہ بھی اپنی آخری صورت میں تصوراتی ہے۔ ہم اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک تصوراتی (حیاتی) مخلوق ہیں، اس لئے ہمارا اعلیٰ ترین عمل بھی تصوراتی ہی ہوسکتا ہے۔

خدائی اور بندگی کی دریافت

مومن دراصل وہ ہے جو اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ اسرافیل صور لئے کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور پھونک مار کر سارے عالم کو تہ و بالا کر دیں۔ کافر اور مومن کا فرق، باعتبار حقیقت، اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کافر دنیا کی سطح پر جیتا ہے اور مومن آخرت کی سطح پر۔ ایک، ظاہر حیات میں گم رہتا ہے۔ دوسرا، آخر حیات میں اپنے لئے زندگی کا راز پالیتا ہے:

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ (روم — ۷)

وہ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں۔ وہ آخرت کی خبر نہیں رکھتے۔

اس کائنات میں سب سے زیادہ جو چیز نمایاں ہے، وہ آخرت ہے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ زمین وآسمان میں بوجھل ہورہی ہے۔ حاملہ کے پیٹ میں پورا حمل جس طرح بظاہر دکھائی نہ دینے کے باوجود اس کے پورے وجود سے بول رہا ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت باہر آجائے گا۔ ایسے ہی آخرت ساری کائنات میں اس طرح ابلی پڑ رہی ہے کہ ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ ظاہری پردہ پھٹ جائے اور آخرت اپنے تمام لوازم کے ساتھ سامنے آجائے۔

ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً — وہ زمین وآسمان میں بوجھل ہورہی ہے۔ وہ اچانک آجائے گی۔ اعراف — ۱۸۷

قرآن میں مومن کی جو تصویر دی گئی ہے، وہ یہ کہ آخرت کے اس بظاہر چھپے ہوئے واقعہ کو وہ اپنی کھلی ہوئی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے۔ آخرت کا خیال اس کے اوپر اتنا زیادہ چھا جاتا ہے کہ ہر طرف اس کو بس آخرت ہی آخرت دکھائی دینے لگتی ہے۔ ہر واقعہ اس کو آخرت کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ اس کی پوری زندگی کا رخ آخرت کی طرف ہوجاتا ہے۔

دنیا میں ایک شخص سے جو زندگی مطلوب ہے، وہ حقیقۃً یہ نہیں ہے کہ آدمی یہاں کچھ خاص طرح کے عملی رسوم ادا کرلے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد دوسری دنیا میں اس کے سامنے آجائے۔ بلکہ اصل مطلوب یہ ہے کہ آدمی موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت میں زندگی گزارنے لگے۔ وہ آج ہی اس دنیا میں سانس لینے لگے جہاں اس کو کل پہنچنا ہے۔ آدمی جب "تصوراتی عبادت" کے مقام کو پہنچتا ہے، تو وہ اپنے آپ کو بھی پالیتا ہے اور اپنے خدا کو بھی۔ اسلام اس کے لئے خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں اپنی بندگی کی یافت کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

خدا اپنی پوری شان کمال کے ساتھ کائنات میں ظاہر ہوا ہے۔ خدا کی بے پایاں وسعتیں اس کی عظمت کا حال بیان کررہی ہیں۔ سورج کی تابانیاں اس کے نور کو ہر طرف بکھیر رہی ہیں۔ زمین کا سرسبز وشاداب کرہ اس کی رحمتوں کی کہانی سنا رہا ہے۔ ستاروں کی بھڑکتی ہوئی آگ اس کے ہولناک عذاب کی چتاونی دے رہی ہے۔ غرض ذرہ سے لے کر کہکشانی نظاموں تک ہر چیز خدا کی بے پایاں ہستی کا تعارف ہے۔ اسلام کو پانے کا مطلب خدا کو اس کی کائنات میں دیکھ لینا ہے۔ جب آدمی تحقیقی طور پر مومن بن جائے تو زمین وآسمان کی وسعتوں میں پھیلا ہوا یہ عالم اس کے لئے خدا کے جلال وجمال کا آئینہ بن جاتا ہے۔ مخلوقات کے پردہ میں وہ خالق کو اس طرح پالیتا ہے کہ بقیہ تمام چیزیں اس کے لئے سایہ کی مانند ہوجاتی ہیں۔ خدا سب سے زیادہ حقیقی وجود کی حیثیت سے اس کے قلب ونظر کا مرکز بن جاتا ہے۔

دوسری طرف یہی یافت اس کو یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ کس قدر حقیر اور کمزور ہے۔ وہ دیکھنے لگتا ہے کہ اس کائنات میں جو تقسیم ہے وہ عجز اور اختیار کی ہے نہ کہ خود اختیار کی۔ یہاں سارا اختیار ایک طرف ہے اور سارا عجز دوسری طرف۔ اختیار واقتدار کی تمام قسمیں خدا کی طرف ہیں، اور عجز وناداری کی تمام صورتیں انسان کی طرف۔ یہ دریافت اس کے اندر عاجزی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ وہ اس کو اس حقیقت واقعہ سے باخبر کرتی ہے کہ وہ ایک حقیر وجود ہے۔ حدیث کے الفاظ میں وہ پکار اٹھتا ہے:
خدایا تمام انسان بھوکے ہیں الا یہ کہ تو انھیں کھانا کھلائے، تمام انسان ننگے ہیں الا یہ کہ تو انھیں کپڑا پہنائے۔ تمام انسان پیاسے ہیں الا یہ کہ تو انھیں پانی پلائے۔ تمام انسان بے سایہ ہیں الا یہ کہ تو انھیں اپنے سایہ میں جگہ دے۔

عجز کا یہ مقام دراصل انسانیت کی پہچان کا مقام ہے۔ جب آدمی اس مقام پر پہنچتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس عظیم کائنات میں اب تک وہ بے جگہ تھا۔ اب اس نے اپنی جگہ پالی۔ وہ وہاں پہنچ گیا جہاں دراصل اس کو ہونا چاہیے۔

آخرت پسندانہ ذہن:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کا جو تصور دیا ہے، وہ آپ کے لفظوں میں مختصر طور پر یہ ہے:

الدنیا مزرعۃ الآخرۃ — دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

غیر اسلامی زندگی یہ ہے کہ آدمی دنیا ہی کو اپنی کھیتی، بالفاظ دیگر، اپنی کوششوں کا حاصل پانے کی جگہ سمجھتا ہو۔ اس کی سرگرمیوں کا رخ موجودہ دنیا کی طرف ہو جائے ــــــ وہ اپنے دنیوی مستقبل کی تعمیر میں لگا ہوا ہو۔ اس کو اپنے مادی مفادات سے دل چسپی ہو۔ وہ انھیں چیزوں کے لئے متحرک ہوتا ہو جس میں اس کے دنیوی معاملات درست ہوتے ہوں۔ جس میں اس کی شخصیت چمکتی ہو۔ جس میں اس کی "انا" کو تسکین ملتی ہو۔

اس کے برعکس اسلامی زندگی آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) ہوتی ہے۔ مومن کی دلچسپیوں کا مرکز وہ دائمی زندگی ہوتی ہے جو مرنے کے بعد سامنے آنے والی ہے۔ وہ ہمیشہ اخروی مستقبل کی فکر میں رہتا ہے۔ اس کو خدا کے یہاں سرخرو ہونے کا شوق رہتا ہے نہ کہ دنیا میں باعزت زندگی بنانے کا۔ اس کی توجہ، اس کی تمنائیں، اس کی سرگرمیاں، سب آخرت کے گھر کو بنانے کی طرف لگی رہتی ہیں۔ مختصر یہ کہ غیر مومن دنیا میں زندگی گزارتا ہے اور مومن آخرت میں۔ غیر مومن مرنے کے بعد آخرت کے عالم کو جائے گا۔ اور مومن دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔

میڈیکل سائنس کا ایک طالب علم اپنی عمر کے ابتدائی حصہ میں تعلیم و تربیت کے ایک نظام میں داخل ہو کر اپنے آپ کو تیار کرتا ہے تاکہ اپنی عمر کے بقیہ حصہ میں کامیاب ڈاکٹر بن کر باعزت زندگی گزار سکے۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں خدا پرستانہ زندگی اختیار کر کے ہمیں اپنے اندر وہ "انسان" تعمیر کرنا ہے جو موت کے بعد آنے والے مرحلۂ حیات میں عمدہ زندگی پانے کا اہل ثابت ہو:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (نحل - ۹۷)

تم میں سے جو کوئی اچھا کام کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، اور وہ ایمان والا ہو، تو ہم اس کو جلائیں گے اچھا جینا۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے غلط روش اختیار کی۔ وہ آخرت میں اپنے آپ کو ایک پرعذاب زندگی میں گھرا ہوا پائیں گے جس سے نکلنے کی کوئی سبیل ان کے پاس نہ ہوگی:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (طہ — ۱۲۴)

اور جس نے میری یاد دہانی سے منھ پھیرا تو اس کو ملے گی ایک تنگ گزران۔

آخرت کی انھیں دونوں زندگیوں کو جنت اور جہنم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جنت اور جہنم نہ کوئی طلسماتی چیزیں ہیں اور نہ

محض روحانی چیز ہیں۔ وہ زندگی بھی دنیا ہی کی قسم کی ایک زندگی ہوگی۔ دونوں اسی آرام اور تکلیف کے زیادہ کامل مقامات ہیں جن کا ایک ابتدائی نمونہ ہم کو آج کی دنیا میں دکھائی دے رہا ہے۔ قرآن میں جنت کے لذیذ پھلوں کو دنیا کے پھلوں کے ہم شکل بتایا گیا ہے (بقرہ — ۲۵) ۔ اسی طرح جہنم کی زندگی کی تشبیہ اس شخص کی زندگی سے دی گئی ہے جس کی زندگی کا سہارا ایک باغ ہو اور وہ اس کے بڑھاپے کے وقت جل کر تباہ ہو جائے (بقرہ — ۲۶۶) موجودہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص اپنی عمر کے ابتدائی مرحلہ میں اپنے اندر تعمیری اہلیت پیدا کرتا ہے، وہ بعد کو زندگی کے میدان میں اس کی قیمت پاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے ابتدائی اوقات کو کھیل تماشوں میں گنوا دیتا ہے، وہ بعد کو اس حادثہ سے دوچار ہوتا ہے کہ دنیا کے مواقع سے اپنا حصہ وصول کرنے کی استعداد اس کے اندر نہیں ہوتی۔ ٹھیک یہی حال زیادہ بڑے پیمانہ پر آخرت کا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا شمس — ۱۰	آخرت میں وہ شخص کامیاب رہے گا جس نے اپنے جی کو سنوارا۔ اور وہ شخص نامراد ہوگا جس نے اس کو بگاڑا۔

دنیا میں عمل کے دوران ہر آدمی اپنے آپ کو کسی نہ کسی ڈھنگ سے تیار کر رہا ہے۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو حقیقی معنوں میں ایمان اور عمل صالح کا طریقہ اپناتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے اندر ایک ایسی شخصیت تعمیر کر رہے ہیں جو ایسے ماحول میں خوب ترقی کرے جہاں اخلاقی شعور ہو، حق پرستی ہو، احساس ذمہ داری ہو، ظواہر کے مقابلہ میں جواہر کی قدر ہو، سطحی باتوں کے بجائے اعلیٰ حقائق کی اہمیت ہو، خود غرضی کے بجائے اصول پسندی آدمی کی ترقی کا زینہ بنتا ہو، عصبیت کے بجائے حقیقت کی بنیادوں پر فیصلے ہوتے ہوں، لفظی جدال کے بجائے علمی استدلال اپنے اندر وزن رکھتا ہو۔ ایسے لوگ ممکن ہے دنیا کے اندر ناکام ہو جائیں۔ کیونکہ یہاں انسانی اقتدار اکثر فساد برپا کئے ہوئے ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس قسم کی صلاحیت والے لوگ اس دنیا میں بے جگہ ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ ان کو ناگزیر معاش حاصل کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے، مگر جیسے ہی یہ زمین و آسمان بدلے جائیں گے (ابراہیم — ۴۸) اور براہ راست خدائی اقتدار کے تحت معیاری دنیا کی تشکیل ہوگی، یہی لوگ دنیا کے سردار بن جائیں گے۔ جو صلاحیتیں انھوں نے پچھلے پُرمشقت حالات میں پیدا کی تھیں، وہی اس دنیا میں عزت اور آرام کے مواقع پر قبضہ کرنے کی یقینی ضمانت ہوں گی۔

اس کے برعکس جس نے خدا کے بتائے ہوئے راستہ کو نہیں اپنایا، جس کا حال یہ رہا کہ وہ برتر تقاضوں کے بجائے وقتی محرکات کے پیچھے دوڑتا رہا۔ جس نے اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کی کہ ابن الوقتی، جوڑ توڑ، خوشامد، سطحیت، اشتعال، عصبیت اور مفادات کی پرستش کے ذریعہ اپنا کام بنائے، جس نے اس فن میں مہارت حاصل کی کہ وہ اپنی بدعملی اور بے ہودگی کو خوب صورت لفظوں میں چھپا سکتا ہے، ایسا شخص دنیا میں ہو سکتا ہے خوب نمایاں ہو جائے۔ کیونکہ یہاں اکثر اوقات ایسا ماحول چھایا رہتا ہے جس میں اس قسم کی صلاحیتوں کو بہت جلد اپنی قیمت مل جاتی ہے۔ مگر جب وہ آخرت کے عالم میں پہنچے گا تو یکایک وہ محسوس کرے گا کہ یہاں اس کے لئے مواقع حیات بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ یہاں ان صلاحیتوں کی کوئی قیمت نہیں جو اس نے دنیا میں اپنے اندر پیدا کی تھی۔

اپنے خول سے باہر آنا

قرآن میں کہا گیا ہے کہ "زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کی تسبیح کر رہی ہیں۔ مگر لوگ ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے (اسراء ۔ ۴۴)۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وحی کے ذریعے جو حقیقت لفظوں میں بیان کی گئی ہے اسی کی آواز ساری کائنات میں غیر ملفوظ شکل میں بلند ہو رہی ہے۔ پھول اسی کی خوشبو اور رنگینی بکھیر رہے ہیں۔ ہوا اسی پیغام کو لے کر چل رہی ہے۔ ستارے اسی کی خبر رسانی کے لئے روشن ہیں۔ آسمان اسی کے اعلان کے لئے کھڑا ہوا ہے۔ درخت اور پہاڑ اور سمندر، تمام چیزیں اسی کے ابدی نغمے ہر آن نشر کر رہے ہیں۔ مگر یہ سب چیزیں خاموش زبان میں ہیں۔ انسان چونکہ اپنے آپ میں اتنا زیادہ مشغول ہے کہ چپ کی زبان کو سن نہیں پاتا۔ اس لئے خدا کو نطق کی زبان میں اپنا کلام اتارنا پڑا۔

مگر قرآن حقیقتہً غیر ملفوظ نشریات الہٰی کو سننے کے لئے ایک ملفوظ رہنما ہے۔ خدا کو کوئی شخص اسی وقت پاتا ہے جب کہ وہ خاموش وحی کو سننے لگے، جب چھپی ہوئی کائنات میں وہ خدا کو دیکھنے لگے۔ جب غیر محسوس دنیا میں وہ اپنے لئے زندگی کا سامان پالے۔ یہ مقام آدمی کو اس وقت ملتا ہے جب کہ وہ مادیات سے اوپر اٹھ جائے۔ جب وہ اپنی ذات کے خول سے باہر آکر سانس لینے لگے۔

یہ معرفت کی وہ سطح ہے جہاں اپنی سطح پر جینے کا نام کفر اور خدا کی سطح پر جینے کا نام اسلام ہوتا ہے۔ جب آدمی اپنے اوپر اس حد تک قابو پالے کہ اپنے آپ کو اپنے لاشعور سے جدا کر کے دیکھ سکے تو وہ اپنے آپ کو پالیتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور زندگی شروع ہوتی ہے۔ وہ لاشعور کے زیر اثر زندگی گزارنے کے بجائے شعور کے تحت زندگی گزارنے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے باہر آکر اپنے آپ کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے گزر کر خدا تک پہنچ جاتا ہے۔

ہر آدمی جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، بہت جلد اس کے گرد افکار اور جذبات کا ایک خود ساختہ خول بن جاتا ہے اس ترپی فکری خول سے دھیرے دھیرے وہ اتنا مانوس ہو جاتا ہے کہ اس کو وہ حقیقت کے روپ میں دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی احساس کو خارجی حقیقت کے ہم معنی سمجھ لیتا ہے۔ کسی آدمی کے لئے سچائی تک پہنچنے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے۔ جب تک وہ اس خول کے اندر ہے، وہ صرف اپنے آپ کو جانتا ہے۔ اس خول سے نکلنے کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک اور برتر ہستی ہے جو اس کی اپنی ذات کے مقابلہ میں زیادہ حقیقی ہے۔ وہ زوال کے مقابلہ میں کمال سے آشنا ہوتا ہے، وہ عجز کے مقابلہ میں قدرت کو پالیتا ہے۔

اب آدمی کی سوچ اور چاہت کا مرکز اس کی ذات کے بجائے خالق کی ذات بن جاتی ہے۔ وہ اپنی پرستش کے دائرہ سے نکل کر خدا کی پرستش کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے بلند ہو کر اپنے رب کو پالیتا ہے — آدمی جب تک اپنی ذات کے خول سے نہ نکلے وہ نہ اپنے آپ کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اپنے خدا کو۔

نفسیاتی گرہوں سے آزاد انسان :

خدا کا وہ بندہ جس سے خدا خوش ہوگا اور اس کو اپنی جنت میں داخل کرے گا، اس کو قرآن میں نفس مطمئن (فجر ۲۷)

کہا گیا ہے۔ نفس مطمئن سے مراد پیچیدگیوں سے آزاد روح (COMPLEX-FREE SOUL) ہے۔ آدمی اس دنیا میں جو رویہ ظاہر کرتا ہے، وہ کچھ نفسیاتی پیچیدگیوں کے تحت ہوتا ہے۔ کچھ دنیوی کامرانی حاصل ہو جائے تو وہ اپنے کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ دنیوی محرومی لاحق ہو تو احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ کسی سے دل چسپی ہو تو آدمی کو اس کی ہر بات اچھی لگتی ہے۔ کسی سے ان بن ہو جائے تو اس کی ہر بات آدمی کو الٹی دکھائی دیتی ہے۔ جس سے کوئی امید وابستہ ہو، اس کے آگے آدمی جھکتا ہے۔ جس سے کسی نفع کی امید نہ ہو، اس سے بے نیازی برتتا ہے۔ جس محفل میں آدمی کی "انا" کو تسکین ملے، وہاں وہ خوب اپنے جوہر دکھاتا ہے۔ جہاں انا کو تسکین ملنے والی نہ ہو، وہاں جانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا۔ یہ سب زیادہ تر لاشعور کے تحت ہوتا ہے۔ مختلف عوامل کے اثر سے آدمی کا جو ایک ذہن بن جاتا ہے، اس کے تحت وہ تمام کام کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کے ہالہ سے باہر آکر خالص بے آمیز شکل میں رائے قائم نہیں کر پاتا۔ اس کا ہر رویہ متاثر ذہن کے تحت نکلا ہوا رویہ ہوتا ہے نہ کہ حقیقۃً آزاد رویہ۔

ایمان لانا گویا اپنے آپ کو ہر قسم کے اضافی محرکات اور مصنوعی رجحانات سے اوپر اٹھانا ہے۔ جب آدمی حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو خدا کے حوالے کرتا ہے تو وہ نفسیاتی گرہوں سے آزاد انسان بن جاتا ہے۔ وہ خالص فطری حالت میں اشیاء کو دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے الگ ہو کر اپنا مشاہدہ کر لیتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جس کو قرآن میں نفس مطمئن کہا گیا ہے۔ یہ مقام کسی کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک وہ دنیوی علائق اور مادی محرکات سے اوپر نہ اٹھ جائے۔ حتیٰ کہ وہ ان داعیات کو بھی دیکھنے لگے جو لاشعور کے تحت عمل کرتے ہیں اور عام حالات میں خود متعلقہ شخص کو بھی ان کی خبر نہیں ہوتی۔ جب تک ایسا نہ ہو، خدا کے ساتھ آدمی کا ملن نہیں ہو سکتا۔ خدا کی شان صمدیت ہے۔ وہ ہر قسم کی پیچیدگیوں سے ماورا ہے۔ وہ واقعات کو ان کی بے آمیز صورت میں دیکھتا ہے۔ اس لئے خدا کی معیت اسی بندے کو حاصل ہو سکتی ہے جو اپنے اندر اس اخلاقِ خداوندی کو پیدا کرے۔ اس کے برعکس جو آدمی اپنے لاشعور کی گرہوں میں پھنسا ہوا ہو، جو اپنی ذات کے مدار سے باہر نہ نکل سکے، وہ خدا کو نہیں پا سکتا، وہ "خدا کے ساتھ چلنے والا" نہیں بن سکتا۔

نفس مطمئن کے مقام پر پہنچنے کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو حدیث میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله — مومن کی ہوشیاری سے بچو، کیوں کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔

جب آدمی نفسیاتی گرہوں سے آزاد ہو جائے تو وہ حالت فطری کو پہنچ جاتا ہے۔ وہ مکمل طور پر بے آمیز رائے قائم کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔ وہ محبت اور نفرت، خوف اور امید، عزت اور بے عزتی، فائدہ اور نقصان کے احساسات کے تحت نہیں سوچتا۔ وہ ان تمام محرکات سے اوپر اٹھ جاتا ہے جو آدمی کے گرد ہالہ بن کر اس کی عقل کو گھیر لیتے ہیں اور اس کو صحیح رائے تک پہنچنے نہیں دیتے۔ ایسا شخص معاملات میں مکمل طور پر غیر جذباتی اور حقیقت پسندانہ رائے قائم کرتا ہے۔ اس کی نگاہیں تمام مصنوعی دیواروں کو توڑ کر حقائق کو دیکھ لیتی ہیں۔ وہ واقعات کا مشاہدہ اس سطح سے کرنے لگتا ہے جہاں سے خدا کامل اور ابدی شکل میں ان کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو اس مقام پر پہنچ جائے، اس کی رائے لازماً صحیح ہوگی۔ اور

جو شخص صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت پیدا کرے، اس کی طاقت کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔

رزقِ رب :

ایمان زندگی کی حالت ہے اور کفر موت کی حالت (انعام - ۱۲۲) ہر آدمی حقیقۃً ایک مردہ آدمی ہے، وہ زندہ آدمی اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ ہدایت کی روشنی کو پالے۔ جب خدا کی طرف سے اس کو رزق رب پہنچنے لگے۔ (طٰہٰ - ۱۳۱) اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رزق کے دو دسترخوان کھولے ہیں۔ ایک مادی دسترخوان جس میں غلہ اور سبزی اور پھل اور گوشت جیسی چیزیں ہیں۔ یہ حیوانی رزق ہے۔ اس رزق میں حصہ پانا ایسا ہی ہے جیسے کسی جانور کو ایک اچھی چراگاہ مل جائے یا کسی بھیڑیے کو اپنے ناشتہ کے لئے عمدہ گوشت حاصل ہو جائے۔ اگر کسی نے اپنے لئے ہر قسم کے رزق مادی جمع کرلئے ہوں تو یہ زیادہ سے زیادہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے حیوانی سطح کو پالیا ہے۔ مگر اعلیٰ انسانی سطح کا درجہ اس سے آگے ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی کو خدا سے رزق ملنے لگے۔ جب مخلوقات کے بجائے خود خالق اس کے لئے رزق کا سرچشمہ بن جائے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا :

ان ربی یطعمنی ویسقینی — میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی کسی نہ کسی رزق پر جی رہا ہے۔ رزق کے بغیر زندگی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ ایمان اور کفر کی تعریف، اپنی حقیقت کے اعتبار سے کی جائے تو وہ یہ ہوگی —— کفر کی حالت یہ ہے کہ آدمی موجودہ دنیا کے مادی رزق پر جی رہا ہو۔ اور اسلام کی حالت یہ ہے کہ آدمی اپنے کو اتنا اونچا اٹھائے کہ خود خالق کائنات سے اس کو رزق پہنچنے لگے۔ فیضان الٰہی کی ابدی دنیا میں وہ اپنے لئے زندگی کا سامان پالے۔

خارجی ذمہ داری

دوسرے بندگان خدا کے سلسلے میں ایک مومن سے جو چیز مطلوب ہے، وہ نُصح (خیر خواہی) ہے۔ دنیوی معاملات میں اس خیر خواہی کا اظہار قسط (انصاف) کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور اُخروی معاملہ میں شہادت حق کی صورت میں۔ (نساء - ۱۳۵)

قسط یہ ہے کہ ہم اپنے دوسرے بھائی کے لئے وہی چاہیں جو ہم خود اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ ہم جب دوسرے کے بارے میں بولیں یا دوسرے کے ساتھ کوئی معاملہ کریں تو ہماری کارروائی ضد، عصبیت، انانیت یا انتقامی نفسیات کے زیر اثر نہ ہو بلکہ بے لاگ انصاف کے مطابق ہو۔ قرآن میں کہا گیا ہے: کسی کی دشمنی تمھیں ایسا نہ کر دے کہ تم انصاف سے ہٹ جاؤ۔ بلکہ انصاف کرو۔ یہی روش تقویٰ سے لگتی ہوئی ہے (مائدہ - ۸)۔ یہ بہترین جانچ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی قسط پر قائم ہے یا نہیں —— جب کوئی شخص آپ کے اوپر تنقید کرے، جب کسی سے آپ کا اختلاف ہو جائے جب کسی سے آپ کو کسی قسم کی ٹھیس پہنچے، وہی وقت دراصل اس بات کی جانچ کا ہوتا ہے کہ آپ مقام قسط پر ہیں یا

مقام ظلم پر۔ مگر انسان اکثر ٹھیک اسی مقام پر ناکام ہو جاتا ہے جہاں اس کو سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت دینا چاہئے

خیر خواہی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ لوگوں تک حق کا پیغام پہنچائیں۔

رسول کی حیثیت داعی الی اللہ کی ہے۔ امت مسلمہ بھی آپ کی تبعیت میں ذمہ داری کے اسی مقام پر کھڑی کی گئی ہے (یوسف ـ ۱۰۸) دنیا میں رسول اور آپ کے متبعین کا رشتہ، دوسرے انسانوں سے، داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ آخرت میں یہ رشتہ شاہد اور مشہود کی صورت میں ظاہر ہوگا جب کہ رسول اور آپ کے پیرو خدا کی عدالت میں کھڑے ہو کر لوگوں کے بارے میں گواہی دیں گے کہ انھوں نے دعوت الی اللہ کا جواب کس طرح دیا تھا۔ اللہ کے ان گواہوں کو آخرت میں سب سے اونچے مقام پر کھڑا کیا جائے گا جہاں سے وہ تمام اقوام کو دیکھیں اور ان کے بارے میں اپنا بیان دیں۔ اسی لئے قرآن میں ان کو بلندیوں والے (اصحاب اعراف) کہا گیا ہے۔ ابن جریر اور ابن المنذر نے جابر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن میں اور میری امت والے اونچے ٹیلوں پر ہوں گے اور اوپر سے مخلوق کو دیکھ رہے ہوں گے۔" پیغمبر اسلام پر چوں کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہونے والا تھا، اس لئے آپ اپنی امت پر گواہ بنائے گئے۔ آپ کے بعد آپ کی امت کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ وہ قیامت تک تمام انسانوں کے اوپر گواہ بنے (حج۔ آخر)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اس ذمہ داری کا اتنا زیادہ احساس رہتا تھا کہ ہر وقت اس کے لئے دکھی رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس غم میں آپ اپنے کو ہلاک کر ڈالیں گے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ	شاید تم اس غم میں اپنے کو ہلاک کر ڈالو گے کہ لوگ ایمان نہیں لاتے
شعراء ـ ۳	

مکہ کے آخری دور میں جب کہ حالات انتہائی سخت ہو چکے تھے ایک طرف مخالفین کا غصہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک بار جب کہ ابو بکر صدیق خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، مخالفین نے گھیر کر آپ کو مارنا شروع کیا۔ کسی دیکھنے والے نے پوچھا یہ کون ہے۔ مارنے والوں میں سے ایک شخص نے غصہ میں کہا: مجنون بن ابی قحافہ (ابو قحافہ کا پاگل لڑکا)۔ ایک طرف یہ تھا، دوسری طرف مسلمانوں کی معاشیات مکمل طور پر برباد کر دی گئی تھیں۔ زندگی کے تمام راستے ان کے لئے بند ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود صبر و برداشت کے سوا کسی اور چیز کی اجازت نہ تھی۔ اس زمانہ میں وہ آیت اتری جو سورۂ ہود میں شامل ہے

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔ وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ	تم اور تمہارے ساتھی حکم کے مطابق قائم رہو اور حد سے نہ بڑھو۔ خدا دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور ظالموں کی طرف مت جھکو ورنہ آگ تم کو پکڑ لے گی۔
ھود ـ ۱۱۳	

ان حالات میں یہ حکم کتنا سخت تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے فرمایا:

شَيَّبَتْنِي هُودٌ وَأَخَوَاتُهَا	سورہ ہود اور اس کی ساتھی سورتوں نے مجھ کو بوڑھا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اسلام کے ماننے والوں کو اسلام کے مخالفین کے اوپر غالب کرے گا۔ یہ وعدہ جو قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے، شہادت کے معاملہ ہی کا ایک پہلو ہے۔ دنیا میں اہل اسلام کا غیر اہل اسلام پر غلبہ دراصل آخرت میں ان کے اصحاب اعراف (بلندیوں والے) ہونے کا ایک دنیوی اظہار ہے۔ جب بھی خدا پرستوں کا کوئی گروہ اپنے دعوتی عمل سے شاہد آخرت بننے کا استحقاق حاصل کرتا ہے، وہ خدا کی سنت کے مطابق "فوقیت" کا درجہ پالیتا ہے۔ دوسری قوموں کے اوپر اس کی یہ فوقیت آخرت میں یقینی طور پر ظاہر ہوگی۔ اور جب خدا چاہتا ہے تو دنیا میں بھی اس کے لئے فوقیت کا فیصلہ فرما دیتا ہے (بقرہ - ۲۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ غلبۂ اسلام کا راستہ دعوت اسلام کی سمت سے ہو کر جاتا ہے۔ دعوتی عمل کے بغیر محض سیاسی کارروائیوں کے ذریعہ اسلام کو غالب کرنے کی کوشش ایک ایسا منصوبہ ہے جو خدا کی اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اسلام اور سیاست

سیاست اسلامی تحریک کا اشو نہیں، اسلامی تحریک کا ایک مرحلہ ہے جو کبھی پیش آتا ہے اور کبھی پیش نہیں آتا۔ اسلام کا خطاب "انسان" سے ہوتا ہے نہ کہ کسی سیاسی ادارہ سے۔ اس کا نشانہ "قلب" کو بدلنا ہوتا ہے نہ کہ نظام کو بدلنا۔ اسلام کا ایک علم بردار آخرت کی نجات کا پیغام لے کر اٹھتا ہے نہ کہ اقتصادی اور سیاسی نجات کا پیغام۔ یہ کہنا کہ "اسلام کا مقصد فرد سے لے کر سماج تک کی اصلاح ہے" اسی طرح ایک بے معنی جملہ ہے جیسے کوئی باغبان یہ کہے کہ "میرا مقصد بیج سے لے کر پتی تک کو وجود میں لانا ہے"۔ اس قسم کا کوئی جملہ باغبانی کی "مکمل تشریح" نہیں ہے، بلکہ باغبانی کی صرف ناقص تشریح ہے۔ کیوں کہ باغ دراصل بیج کے تحقق کا دوسرا نام ہے نہ کہ بیج سے لے کر پتی تک کی کسی "مکمل" جدوجہد کا۔ اس قسم کے مکمل منصوبے اینٹ پتھروں کی تعمیر کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ زندہ ہستیوں کی تعمیر کے لئے۔

ایک بندۂ مومن کو جو چیز بے چین کرتی ہے، وہ یہ احساس ہے کہ اسے مرنا ہے اور مرنے کے بعد اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ یہ احساس، عین اپنی نوعیت کے اعتبار سے، ایک ذاتی احساس ہے۔ وہ شخصی انقلاب کا پروگرام ہے۔ مگر زندگی کی سرگرمیاں یا تمام انسانی تعلقات اشخاص ہی کے عمل کا دوسرا نام ہیں۔ اس لئے کسی معاشرہ میں جب اشخاص کی قابل لحاظ تعداد آخرت کو سامنے رکھ کر زندگی گزارنے لگے تو جگہ جگہ ان کا سابقہ دوسرے انسانوں سے پیش آتا ہے۔ یہ سابقہ کبھی اعتقادی بحثوں تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم کی مثال میں ہوا۔ کبھی وقت کے حکمراں اور داعی کے درمیان جزوی مصالحت ہو جاتی ہے جیسا کہ حضرت یوسف کی مثال سے معلوم ہوتا ہے۔ کبھی مدعو کی ضد داعی اور مدعو کے درمیان سیاسی ٹکراؤ کی صورت پیدا کر دیتی ہے جیسا کہ نبی آخر الزماں کی مثال میں نظر آتا ہے۔ تاہم ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ داعی سیاسی انقلاب یا حکومتی تغیر کو اپنی دعوت کا اشو بنائے۔ سیاست اور حکومت کا انقلاب بطور ایک امکانی نتیجہ کے اسلامی تحریک کا جز بن سکتا ہے۔ مگر وہ تحریک کا ابتدائی اور بنیادی پروگرام کبھی نہیں ہوتا۔

ایک باغبان کبھی ایسا نہیں کرتا کہ یہ اعلان کرکے فضاؤں اور بادلوں سے لڑنے لگے کہ "میرا مقصد ایک مکمل درخت کو وجود میں لانا ہے"۔ وہ زمین کو درست کرتا ہے اور بیج کی جڑ جمانے پر ساری طاقت صرف کر دیتا ہے۔ اسی طرح اسلام کا داعی اگر ایسا کرے کہ وہ "مکمل انقلاب" کا نعرہ لگاکر وقت کے حکمرانوں سے لڑنا شروع کردے کیونکہ "معاملات زندگی کی باگیں حکمراں طبقہ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں"، تو یہ ایک نادانی کا فعل ہوگا۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے "معاملات کی باگیں" دنیا طلبی اور نفس پرستی کے ہاتھ میں ہوتی ہیں نہ کہ کسی سیاسی ادارہ کے ہاتھ میں۔ اسلام کی کامیابی یہ ہے کہ لوگ دنیا طلبی کو چھوڑ کر آخرت پسند بن جائیں، وہ نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی کو اپنا دین بنالیں۔ یہی اسلام کی سیاست بھی ہے اور غیر سیاست بھی۔ اگر یہ بات حاصل ہو جائے تو گویا سب کچھ حاصل ہو گیا۔ اگر یہ حاصل نہ ہو تو "مکمل انقلاب" کا پروگرام لے کر سیاست کی چٹان سے سر ٹکرانا اتنا ہی بے معنی ہے جتنا "مکمل درخت" کا منصوبہ لے کر فضاؤں میں اچھل کود کرنا۔

مقصد بعثت

پیغمبر اسلام کی بعثت کا مقصد بھی ٹھیک وہی تھا جو دوسرے پیغمبروں کا تھا۔ سب کو ایک ہی دین دیا گیا۔ ان میں سے کسی کا مقصد نہ تو دوسرے سے مختلف تھا اور نہ ایسا ہوا کہ کسی کو ناقص اور کسی کو کامل دین دیا گیا ہو۔ تاہم ان میں بعض اضافی فروق تھے۔ اصل مشن کے ساتھ ہر ایک کو کوئی منفرد وظیفہ بھی عطا کیا گیا اور اس کے لحاظ سے اس کو ضروری اسباب دیئے گئے ——— حضرت ابراہیم، توحید و آخرت کے اعلان کے ساتھ اس پر بھی مامور تھے کہ صحرائے عرب میں پہنچ کر خدا کا پہلا گھر تعمیر کریں۔ حضرت موسیٰ کے ذمہ یہ کام تھا کہ اپنے اصل فریضہ (اعلان حق) کے ساتھ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر باہر لے جائیں۔ حضرت مسیح اپنی پیغمبرانہ ذمہ داری کے ساتھ نبی آخر الزماں کے مبشر بناکر بھیجے گئے، وغیرہ

پیغمبر اسلام کے معاملہ کی نوعیت بھی ٹھیک یہی ہے۔ آپ سے اللہ تعالیٰ کو اصلاً جو چیز مطلوب تھی، وہ تو یہی تھی کہ وہ دنیا کے لئے منذر و مبشر بنیں۔ اسی کے ساتھ آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا منصوبہ یہ بھی تھا کہ خصوصی غیبی مدد کے ذریعہ زمین پر اہل اسلام کی حکومت قائم کر دے تاکہ آخری کتاب کی حفاظت کا انتظام ہو سکے۔

اسلام کی جو تاریخ بنی، وہ پیغمبرانہ مشن کا اضافی جزء ہونے کے باوجود کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ وہ بجائے خود مطلوب بھی تھا۔ مگر یہ مطلوبیت باعتبار وسیلہ تھی نہ کہ باعتبار مقصد۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی آخری کتاب کو محفوظ کرنا تھا، اس لئے ضروری تھا کہ قرآن کے ساتھ اقتدار کو جمع کیا جائے۔ اگر پچھلی آسمانی کتابوں کی طرح قرآن کے ساتھ اقتدار کو جمع نہ کیا گیا ہوتا تو ہزاروں برس کی پیغمبرانہ تاریخ کا تجربہ بتا رہا تھا کہ اس کا انجام بھی بالآخر وہی ہوگا جو پچھلی آسمانی کتابوں کا ہوا۔ اس مصلحت کے تحت اللہ تعالےٰ نے خصوصی فیصلہ کیا کہ وہ آخری شریعت کے ساتھ لازماً اقتدار کو بھی جمع کرے گا (الدین والسلطان توأمان) خواہ یہ اجتماع شرک و کفر کے علم برداروں کو کتنا ہی ناگوار ہو (صف ۔ ۹)

عرب میں جب اسلام کا غلبہ قائم ہو گیا تو سنہ ۱۰ھ میں یہ آیت اتری۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (مائدہ۔ ۳) آج میں نے تمھارے لئے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور

تمھارے اوپر اپنی نعمت تمام کر دی۔

یہاں اکمال دین اور اتمام نعمت سے مراد اصلاً قانون اسلامی کی دفعات کی تکمیل نہیں ہے۔ بلکہ آخری شریعت کے ساتھ اقتدار کو جمع کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ آیت میں اسی کے ساتھ ارشاد ہوا ہے کہ اب عرب کی تسخیر کے بعد کافر اس سے مایوس ہو گئے ہیں کہ وہ تمھارے دین کو مغلوب کر سکیں (اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ)۔ دوسرے مقامات سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے جہاں غلبہ اسلامی کو اتمام نور (صف۔ ۸) سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اتمام کلام الٰہی کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اب اس کلام کو کوئی بدل نہیں سکے گا (انعام۔ ۱۱۵) اللہ تعالیٰ نے قرآن کے نزول کے بعد اس کی پشت پر وقت کی عظیم ترین سلطنت قائم کر دی۔ یہ سلطنت قرآن کو اپنے زیر حفاظت لئے ہوئے نسل در نسل چلتی رہی۔ تاآنکہ صنعتی انقلاب ہوا اور پریس کا دور آ گیا اور سرے سے اس کا امکان ہی ختم ہو گیا کہ کوئی شخص یا گروہ قرآن میں تحریف کر سکے یا اس کو مٹا سکے۔

اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے عقیدہ اور تاریخ کے فرق کو سمجھنا اور دونوں کو الگ الگ کر کے دیکھنا انتہائی طور پر ضروری ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہم قتال اور سیاست کے معرکے گرم کرتے رہیں گے اور سمجھیں گے کہ ہم پیغمبرانہ مشن کو زندہ کر رہے ہیں۔ حالاں کہ درحقیقت ہم دین کو ذبح کر رہے ہوں گے۔ کیوں کہ خدا کا آخری رسول، دوسرے تمام رسولوں کی طرح، لوگوں کو آخرت کی چیتاونی دینے آیا تھا نہ کہ لوگوں سے سیاسی لڑائیاں لڑنے کے لئے۔ مزید یہ کہ اس قسم کا سیاسی جہاد، خود اصل مقصد (اسلام کا غلبہ) تک پہنچانے کے لئے بھی قطعاً بے سود ہے۔ کیونکہ اسلام کا غلبہ خدا کی نصرت سے حاصل ہوتا ہے (وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ) اور خدا کی مقرر کردہ صراط مستقیم کو چھوڑ کر پہلے ہی ہم اس کی نصرت کا استحقاق کھو چکے ہیں۔ یہی نہیں، عین ممکن ہے کہ ہمارا یہ سیاسی جہاد ہمارے لئے دنیا و آخرت میں رسوائی کا سبب بن جائے۔ کیوں کہ دین خداوندی کو آخرت کا سوال بنانے کے بجائے سیاست کا سوال بنانا، دین کی اُلٹی شہادت دینا ہے۔ یہ آنے والی دنیا کے مسئلہ کو موجودہ دنیا کے مسئلہ کی حیثیت سے پیش کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی اُلٹی شہادت آدمی کو سزا کا مستحق بناتی ہے نہ کہ انعام کا۔

ے (اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ) يئسوا منه ان يبطلوه او يئسوا من دينكم ان يغلبوه، لان الله تعالى وفى بوعده من اظهاره على الدين كله (فَلَا تَخْشَوْهُمْ) بعد اظهار الدين وزوال الخوف من الكفار وانقلابهم مغلوبين بعد ما كانوا غالبين (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ) بان كفيتم خوف عدوكم واظهرتكم عليهم كما يقول الملوك: اليوم كمل لنا الملك، اى كفينا من كنا نخافه (وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ) بفتح مكة ودخولها آمنين ظاهرين وهدم منار الجاهلية ومناسكهم   تفسیر نسفی، جلد اول، صفحہ ۲۷۰

کامیابی کا راز خاموش منصوبہ بندی ہے نہ کہ پُرشور معرکہ آرائی

جنگ کو کامیاب طور پر جاری رکھنے کا سب سے اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ دشمن کو جنگ بند کرنے پر راضی کر لیا جائے

صدر مصر انور سادات کا دورۂ اسرائیل کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ جیسا کہ سابق وزیر اعظم مسز گولڈا میر نے کہا ہے، مصر اور اسرائیل کے درمیان اکتوبر ۱۹۷۳ کی جنگ کو آخری جنگ بنانے کی یہ گفتگو پچھلے تین سال سے جاری تھی۔ ۱۹ نومبر ۱۹۷۷ کو مسٹر سادات کا یروشلم میں اترنا صرف اس کا آخری نتیجہ تھا۔

دشمن سے صلح کرنا، جنگ کو زیادہ بہتر طور پر جاری رکھنے کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ مگر اس میں شبہ ہے کہ اقتصادی حیثیت سے برباد شدہ مصر کے حکمراں کے لئے صلح کا محرک یہی ہے۔ اگر یہ اعلیٰ محرک اس اقدام کا سبب بنا ہو تو کیا وجہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اسرائیل کی سرحد پر اپنی بندوقوں کو خاموش کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ دوسری طرف انھیں بندوقوں کا رخ انھوں نے انتہائی بے صبری کے ساتھ فلسطینیوں اور اپنے ہم قوم عربوں کی طرف کر دیا ہے۔

تاہم پرجوش عرب اور اس سے زیادہ پُرجوش فلسطینی بھی اس معاملہ میں کسی تحسین و آفریں کے مستحق نہیں ہیں۔ انور سادات نے بالفرض اگر کوئی غیر صحیح قدم اٹھایا تھا تو کیا آپ کے لئے یہی ایک صورت تھی کہ ان کے خلاف فوراً محاذ آرائی کا معرکہ گرم کر دیں۔ مفاہمت کی خاموش صورتیں تلاش کرنے کا راستہ بھی تو آپ کے لئے کھلا ہوا تھا۔

موجودہ زمانہ میں مسلم قوموں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے قائدین کو صرف ایک ہی طریقہ —— محاذ آرائی کا طریقہ —— معلوم ہے۔ خاموش جد و جہد کا سبق ان میں سے کسی نے نہیں سیکھا۔

اسرائیل کے وزیر اعظم مسٹر بیگن سے پوچھا گیا "کیا اسرائیل اس کے لئے تیار ہے کہ مقبوضہ مغربی اردن اور فلسطینیوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے گفتگو کرے"۔ انھوں نے جواب دیا:

WE WILL FIND A SOLUTION TO THE PALESTINIAN PROBLEM, BUT NOT IN FRONT OF THE TELEVISION CAMERAS

ہم فلسطینی مسئلہ کا حل پالیں گے۔ مگر ٹیلی وژن کیمروں کے سامنے نہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۳ دسمبر ۱۹۷۷)

قوموں کے مسائل کا حل خاموش منصوبہ بندی میں ہوتا ہے۔ مگر اکثر قائدین اس کو پُررونق ہنگاموں میں تلاش کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ اس طرح دو فائدوں میں سے کم از کم ایک فائدہ یقینی طور پر حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ قائد کی اپنی شخصیت بہرحال نمایاں ہو جاتی ہے۔ خواہ قوم کا مسئلہ حل ہو یا نہ ہو۔

الرسالہ ۱۹۷۷ کے مندرجہ ذیل شمارے درکار ہیں
جنوری ، فروری ، اکتوبر ، نومبر
جو صاحبان یہ شمارے فراہم کر سکتے ہوں، وہ براہ کرم ہم کو مطلع فرمائیں —— منیجر

عربی زبان نئی اہمیت حاصل کر رہی ہے

ہزار برس پہلے ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ پر مسلمانوں کا اقتدار قائم تھا۔ یہ صرف ایک سیاسی غلبہ نہیں تھا۔ بلکہ مسلمان اس وقت کی دنیا میں علمی اور فکری امام بنے ہوئے تھے۔ اسپین میں مسلم عہد کے عروج کے وقت اسپینی عیسائیوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جس نے عملاً عرب تمدن کو اختیار کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کو اس زمانہ میں مستعرب (MOZARABES) کہا جاتا تھا۔

قرطبہ کے بشپ (ALVARO) نے ان عیسائی مستعربین پر افسوس کرتے ہوئے لکھا تھا:

"میرے مسیحی بھائی عربی اشعار اور حکایات سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور مسلمان علماء اور فلاسفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس نیت سے نہیں کہ ان کی تردید کریں بلکہ اس ارادہ سے کہ وہ عربی کے صحیح اور شستہ طرز ادا سے آشنا ہو سکیں۔ آج کل ہماری کتب مقدسہ کی لاطینی تفاسیر کا پڑھنے والا کہاں ملتا ہے، اور ایسے لوگ کہاں ہیں جو اناجیل اور انبیاء کے صحف کا مطالعہ کرتے ہوں۔ افسوس کا مقام ہے کہ تمام عیسائی نوجوان جو اعلیٰ قابلیت کے مالک ہیں عربی زبان اور ادب کے سوا اور کسی ادب سے واقف نہیں ہیں۔ یہ لوگ عربی کتابیں بڑے ذوق شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ان کو اپنے کتب خانوں کے لئے زر کثیر صرف کر کے حاصل کرتے ہیں اور علانیہ کہتے ہیں کہ یہ لٹریچر بڑی تحسین کے لائق ہے۔ اس کے برعکس اگر ان کے سامنے مسیحی کتابوں کا ذکر کیا جائے تو وہ حقارت سے جواب دیں گے کہ اس قسم کی کتابیں ان کی توجہ کے لائق نہیں۔ افسوس کہ مسیحی اپنی زبان تک بھول گئے ہیں۔ ہزار میں سے بمشکل ایک شخص ایسا ملے گا جو معقول قسم کی لاطینی میں اپنے دوست کے نام معمولی سا خط بھی لکھ سکے لیکن اگر عربی قابلیت پوچھیے تو بہت سے ایسے اشخاص ملیں گے جو نہایت فصیح و بلیغ عربی میں اپنے خیالات ادا کر سکتے ہیں۔ بلکہ اس زبان میں ایسی عمدہ شاعری کرتے ہیں کہ خود عرب بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکیں۔"

یہ اقتباس اسپینی مستشرق پروفیسر پالنسیا (PALENCIA) کی کتاب سے ماخوذ ہے جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۸ میں شائع ہوا تھا۔ مصری فاضل حسین مونس نے اس کو اسپینی سے عربی میں منتقل کیا ہے۔ (مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۵)

تاتاریوں نے جب عالم اسلام کو تاراج کیا تو صورت حال بدلنے لگی۔ اب نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ فکری اور علمی حیثیت سے بھی مسلم قومیں پستی کی طرف چلی گئیں۔ گیارھویں



يتعلمون العربية في المدرسة العراقية بباريس

٧ طالبا وطالبة هموا من الارجنتين وهولندا وامريكا ويوغسلافيا وبلجيكا والمانيا وفرنسا والسنغال وحتى من جزر القمر ليتعلموا اللغة العربية في المدرسة العراقية بباريس موزعين على صف متقدم واخر اولي فيها .

پیرس میں عراق کی طرف سے ایک اسکول قائم کیا گیا ہے جس میں مغربی نوجوانوں کو عربی زبان سکھائی جاتی ہے اس میں ۷۰ طلبہ و طالبات ہیں جو مختلف ملکوں، ارجنٹائن، ہالینڈ، امریکہ، یوگوسلاویا، بلجیم، جرمنی، فرانس، سنیگال وغیرہ کے ہیں۔

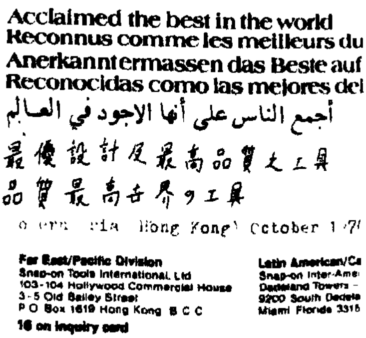
صدی عیسوی کے شیخ عبدالقاہر جرجانی (م ۴۷۱ھ) کے قلم سے یہ الفاظ نکلے کہ اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ انسانی طبیعتیں بدل گئی ہیں۔ جہل اور لاعلمی نے علم و فضل کا درجہ لے لیا ہے۔ جو اوصاف پہلے قابل تعریف سمجھے جاتے تھے، وہ قابل مذمت بن گئے ہیں:

حتّٰی صَارَ أعجَزُ النّاسِ عِندَ الجَمعِ مَن کانَت لَہٗ هِمّةٌ في أن يَستَفيدَ عِلماً أو يَزدادَ فَهماً أو يَكتَسِبَ فَضلاً أو يَجعَلَ لَہٗ ذٰلِكَ بِحالٍ شُغلاً

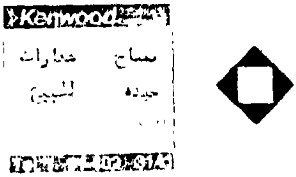
دلائل الاعجاز، صفحہ ۲۸

یہاں تک کہ اب یہ حال ہے کہ لوگوں کے نزدیک وہ شخص سب سے زیادہ ناکارہ سمجھا جاتا ہے جو علوم عربیہ کا شوق رکھتا ہو۔ اور اس میں استفادہ و ترقی میں مشغول ہو۔

اٹھارویں صدی میں جب مغربی قومیں عالم اسلام پر غالب آگئیں تو اس میں اور ترقی ہوئی۔ تقریباً دو سو برس تک یہ حال رہا کہ عربی زبان اور عربی علوم میں مشغول ہونا، کم از کم دنیوی اعتبار سے، بالکل بے فائدہ سمجھا جانے لگا۔ "مسٹر" ہونا عزت کی علامت اور "مولوی" ہونا بے وقعتی کا نشان بن گیا۔ مگر بیسویں صدی کے نصف



ایک عالمی تجارتی ادارہ کا اشتہار ہانگ کانگ کے اخبار میں



لندن ٹائمس میں فروخت جائداد
کا اشتہار عربی زبان میں

آخر میں صورت حال دوبارہ تبدیل ہو رہی ہے۔

ہندستان میں بہت سے ادارے ہیں جو مختلف بیرونی زبانیں سکھانے کا کورس چلاتے ہیں۔ چند برس پہلے ان میں عربی زبان کو کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ آج یہ حال ہے کہ بڑے بڑے انگریزی اخبارات میں جب ان اداروں کا اشتہار چھپتا ہے تو عربی زبان، مختلف غیر ملکی زبانوں کی فہرست میں صرف انگریزی کے بعد نمبر ۲ پر درج ہوتی ہے۔ ہندستانی اخبارات میں ایسے اشتہارات شائع ہونے لگے ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ عربی میں اشتہاری عبارتیں شامل رہتی ہیں۔

یہ محض ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربی زبان موجودہ زمانہ میں کتنی اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اب وہ نہ صرف اقوام متحدہ اور اس کی دوسری ایجنسیوں کی سرکاری زبان ہے بلکہ جدید دنیا کی تمام بڑی بڑی سرگرمیوں میں اس کا استعمال ہونے لگا ہے۔

عربی زبان کی اس جدید اہمیت نے ہمارے عربی مدارس کی تعلیم میں ایک نئی اہمیت پیدا کر دی ہے۔ ان مدارس کے طلبہ اگر تکمیل نصاب کے ساتھ عربی لکھنے اور بولنے کی استعداد بھی لے کر نکلیں تو انھیں یہ شکایت نہ ہوگی کہ "آج کی دنیا میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں"۔

یہ امکانات ہمارا انتظار کر رہے ہیں

"ہندستان زیادہ ترقی کرتا اگر اس نے آزادی کے بعد اپنی توجہ اس پر لگا دی ہوتی کہ بیل گاڑی کو زیادہ بہتر بنائے۔" اس قسم کے جملہ پر ایک عام آدمی ہنس دے گا۔ مگر یہ سب سے زیادہ سچی بات ہے جو آزاد ہندستان کے لئے کہی جاسکتی ہے۔ بیل گاڑی محض بیل گاڑی کا نام نہیں وہ ایک ذہنیت، ایک طرز فکر ہے۔ جس طرح آزادی سے پہلے گاندھی جی کا چرخا محدود معنوں میں محض "چرخا" نہیں تھا، وہ ایک ذہنیت تھا۔ بیل گاڑی پر توجہ دینے کا مطلب مقامی ذرائع پر توجہ دینا تھا۔ اور اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو یقیناً آج ہندستان دگنا زیادہ طاقت ور ہوتا۔ جیساکہ چین کی مثال میں نظر آتا ہے۔

آج بھی ہندستان میں تیرہ ملین بیل گاڑیاں ہیں وہ دس ملین ٹن سامان ڈھوتی ہیں اور اس پر ملک کا تین ہزار کرور روپیہ لگا ہوا ہے۔ اس سے ۲۰ ملین لوگوں کو روزگار ملتا ہے۔ کافی تاخیر کے بعد اب ملک کے سائنس داں بیل گاڑی کو ترقی یافتہ بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ بیل کے کندھے کے اوپر سے گاڑی کے بوجھ کو گھٹائیں اور پہیہ کو بریک دینے کا طریقہ دریافت کریں۔ بیل گاڑی کے پہیہ میں بال بیرنگ اور ربڑ ٹائر کا رواج اس سے پہلے ۱۹۵۰ میں شروع ہوا تھا۔

سری لنکا کے ایک صحافی وریندر تارزی وٹاشی (VARINDRA TARZIE VITTACHI) ۱۹۴۶ میں مہاتما گاندھی سے دہلی میں ملے تھے۔ "ہم ایشیا کے لوگ بہت جلد آزاد ہونے والے ہیں" انھوں نے گاندھی جی سے کہا "اگر آپ کو کوئی ایک مشورہ دینا ہو تو آپ انھیں کیا مشورہ دینا پسند کریں گے"۔ یہ سوال سن کر گاندھی جی کا چہرہ مرجھا گیا۔ انھوں نے غمگین لہجہ میں کہا:

"REDUCE YOUR WANTS AND SUPPLY YOUR NEEDS. OUR NEEDS MAKE US VULNERABLE ENOUGH. WHY INCREASE OUR VULNERABILITY WITH WANTS.
Newsweak, Jan. 26,1976

اپنی مانگ کو کم کرو اور اپنی ضرورت کی چیزیں خود مہیا کرو ہماری ضرورتیں ہم کو کمزور اور جراحت پذیر بناتی ہیں۔ ہم

عام تصور یہ ہے کہ کسی "قدیم" تہذیب کو دوبارہ "جدید" نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح آدمی کو جوانی صرف ایک بار ملتی ہے، اسی طرح تہذیب کو بھی صرف ایک بار عروج نصیب ہوتا ہے۔ اس کے بعد تہذیب پر بڑھاپا آجاتا ہے۔ اور جو بوڑھا ہوگیا اس کو دوبارہ جوان نہیں کیا جاسکتا۔

مگر چین کی مثال نے اس مفروضہ کی تردید کردی ہے۔ نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار جیمز رسٹن (JAMES RESTON) نے پیکنگ میں اپنے طویل قیام کے بعد اپنے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ایک رپورٹ تیار کی ہے جس کا عنوان ہے

NEW LOOK OF AN ANCIENT LAND

اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "چین کی قدیم ترین تہذیب کے بارے میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ یہ کہ آج وہ دوبارہ جوان نظر آتی ہے۔ ایک امریکی مشاہد کے نزدیک چین کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کا "شباب" ہے۔

کیوں اپنی ضرورتوں کو بڑھاکر دوسروں کے مقابلہ میں اپنی کمزوری کو بڑھائیں۔

مذکورہ صحافی لکھتے ہیں "جب میں پچھلے ۳۰ سال کے واقعات کو دیکھتا ہوں تو مجھے نظر آتا ہے کہ گاندھی جی کے مشورہ پر صرف چین نے عمل کیا۔ جب کہ گاندھی جی کا مشورہ چین کو پہنچا بھی نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج چین ایشیا کا سب سے طاقتور اور خودکفیل ملک ہے۔ بقیہ تمام ممالک مغربی قوموں کے اقتصادی غلام ہیں اور ان کے قرضوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔

ہندستان نے آزادی کے بعد اندھادھند بدیشی تہذیب کی نقل شروع کردی۔ ملک کے ذرائع کو کام میں لانے کی طرف کبھی سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی۔ ڈاکٹر نکولس جیکوئے NICOLAS JEQUIER نے ایک کتاب شائع کی ہے:

APPROPRIATE TECHNOLOGY:
PROBLEMS AND PROMISES

وہ لکھتے ہیں کہ زیر ترقی ممالک کی سب سے بڑی دولت ان کی انسانی طاقت ہے۔ مگر کسی ملک میں بھی اس کو بخوبی طور پر استعمال نہیں کیا جارہا ہے۔ جنگل اور زراعت کی ردی چیزیں اور حیوانات کے فضلے بڑی تعداد میں روزانہ ضائع ہورہے ہیں مگر ان کو اب تک کام میں نہیں لایا گیا۔ زراعتی اور غیر زراعتی شعبوں میں بے شمار امکانات غیر استعمال شدہ پڑے ہوئے ہیں۔ مگر ابھی تک ان کی طرف حقیقی توجہ نہیں دی گئی ہے۔

کھانا تیار کرنے کے لئے آجکل ہندستان میں جو گیس استعمال ہوتی ہے وہ حقیقۃً پٹرولیم کی ضمنی پیداوار (BY-PRODUCT) ہے۔ پہلے یہ گیس یوں ہی ضائع ہوجاتی تھی۔ اب اس کو خاص اہتمام سے سلنڈروں میں بھر لیا جاتا ہے۔ باورچی خانہ کے ایندھن کی حیثیت سے وہ آج ہمارے لئے ایک عظیم نعمت ہے۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کو فضلات (WASTES) کہا جاتا ہے، وہ حقیقۃً کسی چیز کی ضمنی پیداوار ہی ہیں۔ ان کو خاطر خواہ استعمال کیا جائے تو وہ انسان کے لئے بے شمار پہلوؤں سے مفید بن سکتی ہیں۔

مثلاً دھان کی بھوسی کو لیجئے۔ آئی۔ٹی۔آئی۔ کانپور اور ریجنل ریسرچ لیبورٹری جورہاٹ میں جو تجربے کئے گئے ہیں، ان سے معلوم ہوا ہے کہ دھان کی بھوسی سیلیکا، سیلولوز، پنٹوز، لگنن جیسے قیمتی اجزار سے مرکب ہوتی ہے اور اس کو نہایت کامیابی کے ساتھ سمنٹ، فائر پروف بورڈ وغیرہ کے بنانے میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بھوسی کی راکھ میں چونا ملاکر باریک پیس دیا جائے تو نہایت عمدہ سمنٹ تیار ہوجاتی ہے۔

ہندستان میں ہر سال ۶۰ ملین ٹن دھان پیدا ہوتا ہے۔ دھان کی بھوسی دھان کا تقریباً ۲۰ فی صد حصہ ہوتی ہے اور بھوسی کی راکھ بھوسی کا تقریباً ۲۰ فی صد حصہ۔ اس طرح ہندستان میں محض بھوسی کے ذریعہ ہر سال دو ملین ٹن سے زیادہ سمنٹ تیار کی جاسکتی ہے۔ اور اگر پیال کو اس میں شامل کرلیا جائے جو انھیں اجزار سے مرکب ہوتا ہے جس سے بھوسی بنتی ہے تو اس کی مقدار پندرہ گنا تک بڑھ جاتی ہے۔

یہ ایک ایسا کام ہے جس کی درجنوں شاخیں ہیں۔ مثلاً بلڈنگ کے سامان اور مختلف قسم کے صنعتی کیمیکل تیار کرنا۔ ایسے چھوٹے چھوٹے پلانٹ تیار کرنا جو ملک کی ۲۵ ہزار رائس ملوں میں لگ سکیں اور ہر رائس مل مقررہ کام کے ساتھ ایک "منی سمنٹ پلانٹ" بن جائے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک سو ٹن سالانہ "بھوسی سیمنٹ"،،

تیار کرنے کا کارخانہ بنایا جائے تو اس کی لاگت تقریباً ا ہزار آئے گی۔ اور اس کے ذریعہ جو سمنٹ تیار ہوگی ؤ ام سمنٹ سے بہت زیادہ سستی ہوگی۔

یہ معاملہ صرف بھوسی اور گٹھلی جیسی چیزوں تک محدود نہیں ہے۔ جانوروں کا گوبر اور انسان کا فضلہ بھی بے شمار فوائد اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ گوبر و فضلہ کو، بغیر کسی خرچ کے، اتنی گیس پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے جس سے گھر کا پورا کھانا پک جائے اور رات کے وقت گھر کی روشنی بھی حاصل ہو سکے۔ ایندھن کے خرچ اور دھوئیں کی کثافت سے بچنے کا یہ نہایت کامیاب ذریعہ ہے۔ اس طریقہ میں مزید فائدہ یہ ہے کہ گوبر یا فضلہ کی اصل کھاد ضائع نہیں ہوتی، بلکہ پوری کی پوری محفوظ رہتی ہے۔ فضلہ کا گیسی حصہ، جو نباتات کے لئے مضر ہے، گھر کے ایندھن اور روشنی میں کام آجاتا ہے اور اس کے بعد عمدہ کھاد خود بخود الگ ہو جاتی ہے۔ کم خرچ، زیادہ فائدہ کا اس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں ہو سکتا۔

حال میں ایک انجینیرنگ کمپنی نے ایک انجن تیار کیا ہے جو

KIRLOSKAR OIL ENGINES LIMITED
13, LAXMANRAO KIRLOSKAR ROAD
KHADKI, PUNE 411 003

گوبر گیس سے چلتا ہے۔ اگر آپ کے پاس ۲۰ مویشیوں کا گلہ ہے تو آپ ایک گوبر گیس پلانٹ تیار کر سکتے ہیں۔ اس کی تیاری میں تقریباً چھ ہزار روپے کا خرچ آتا ہے جس کا ایک حصہ سرکار بطور سب سڈی دیتی ہے۔ اپنے گوبر گیس پلانٹ کے ساتھ پانچ ہارس پاور کا انجن لگا کر آپ اپنے کھیتوں اور باغوں کی آب پاشی کر سکتے ہیں جو بجلی یا تیل کے انجن کے مقابلہ میں ۸۰ فی صد تک اخراجات کو کم کر دیتا ہے۔

اس طرح کے بے شمار امکانات ہیں جو اس وسیع ملک میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں، پچھلے ۳۰ برسوں میں جتنا سرمایہ فیملی پلاننگ اور اس سے متعلق پروگراموں میں خرچ کیا گیا ہے، اگر وہ اس طرح کی اسکیموں میں لگایا گیا ہوتا تو ملک کی حالت آج کہیں زیادہ بہتر ہوتی۔

مولانا عبد الماجد دریا بادی (۱۸۹۲ - ۱۹۷۷) مولانا محمد علی (۱۸۷۸ - ۱۹۳۱) کے بارہ میں فرماتے ہیں "میرے دوست مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت بھی میرے لئے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ بیتاب ہو کر تڑپ کر جوش و خروش سے للکارتے تھے "عبد الماجد اٹھو، چل کر لندن یورپ میں تبلیغ اسلام کریں" صدق جدید (لکھنؤ) ۲ رجون ۱۹۷۷

ڈاکٹر محمد اقبال (۱۸۷۷ - ۱۹۳۸) نے آخر عمر میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا جس کا نام انھوں نے تجویز کیا تھا

AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF QURAN

(مطالعہ قرآن کا ایک تعارف)۔ فرماتے تھے "ایک بار کتاب شروع کی تو انشاء اللہ اسلام کے بارے میں یورپ کے تمام نظریات توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا" شیرازہ (سری نگر) اقبال نمبر، صفحہ ۶۶

اس طرح کے پر جوش ارادہ کی مثالیں ہمارے یہاں بہت سی ملیں گی۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس پوری مدت میں کوئی ایک بھی قابل ذکر شخص نہیں ملتا جس نے مغرب کے انسانوں کے سامنے ان کی زبان میں اسلام کا پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہو۔ اگر کی ہے تو صرف بدنام قادیانیوں نے۔

اسلام: دورِ شمشیر کا خاتمہ، دورِ دعوت کا آغاز

بحرمردار (DEAD SEA) اردن اور اسرائیل کے درمیان واقع ہے۔ اس کا دوسرا نام بحرلوط ہے۔ چار ہزار برس پہلے یہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ چار بڑے بڑے شان دار شہر اس کے کنارے آباد تھے۔ جب یہاں کے لوگوں میں بگاڑ آگیا تو لوط بن حاران بن آزر کو خدا نے پیغمبر بنا کر ان کے پاس بھیجا۔ مگر ان کی سرکشی بڑھتی رہی۔ بالآخر جب حجت تمام ہوگئی تو ۲۰۶۱ ق م میں ایک ہولناک زلزلہ آیا۔ ان کی بستیاں الٹ گئیں۔ سمندر کا پانی ان کے اوپر چڑھ گیا۔ پورا علاقہ اس طرح برباد ہوگیا کہ اب وہاں چڑیاں اور مچھلیاں بھی نہیں پائی جاتیں۔

یہی معاملہ تمام نبیوں کے منکرین و مخالفین کے ساتھ پیش آیا ہے۔ اتمام حجت کے بعد کوئی قوم موجودہ دنیا میں بود و باش کے حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس لئے فرشتوں یا خود اہل ایمان کے ذریعہ اس دنیا سے اس کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ پیغمبر آخرالزماں کے مخالفین بھی، آپ کا انکار کرنے اور آپ کو آپ کے وطن سے نکال دینے کے بعد، اسی خدائی سزا کے مستحق ہو گئے تھے (اسراء ۔ ۷۷) چنانچہ انھیں بھی یہ سزا دی گئی۔ البتہ اس کی صورت بدلی ہوئی تھی۔ دیگر انبیاء کے ساتھیوں کی تعداد چونکہ بہت کم تھی، اس لئے ان کے مخالفین کو ہلاک کرنے کے لئے زلزلہ اور طوفان آئے (عنکبوت ۔ ۴۰) مگر نبی آخرالزماں کے ساتھ حمایت کرنے والوں کی بھی معقول تعداد ہو چکی تھی۔ اللہ تعالٰی نے خود آپ کے ساتھیوں کی تلوار کو آپ کے مخالفین کی ہلاکت کے لئے استعمال کیا (قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ) بدر کی قتل گاہ، اپنی نوعیت کے اعتبار سے، ٹھیک ویسی ہی تھی جیسا عاد و ثمود کے برباد شدہ مساکن۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تلوار، پیغمبر اسلام کے مشن کا اضافی جزء تھی نہ کہ حقیقی جزء۔ وہ شکلاً دفاعی جنگ اور حقیقۃً خدائی سزا کے طور پر ظاہر ہوئی، جیسے پچھلی قوموں پر آنے والا عذاب شکلاً زلزلہ یا طوفان تھا اور حقیقۃً ایک منکر قوم پر خدائی سزا ـــــ مگر بعد کے دور میں اسلام کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں، عام رواج کے اثر سے "تلوار" کے واقعات بہت زیادہ نمایاں ہو گئے۔ لوگوں کو اسلام کی تاریخ تلوار کی تاریخ نظر آنے لگی۔ حتیٰ کہ خود مسلمان بھی شمشیری کارنامے دکھانے کو سب سے بڑا جہاد سمجھنے لگے۔

بعد کے دور میں اسلام کے ساتھ جو المیے پیش آئے، ان میں یہ المیہ سرفہرست ہے کہ دین رحمت دین شمشیر بن گیا۔ اسلام جن مقاصد کے لئے آیا، ان میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انسانوں کے درمیان جنگ و جدل کو ختم کر کے سمجھنے اور سمجھانے کے طریقے کو رائج کرے (ص ـ ۲۹) طاقت کی منطق کی جگہ عقل و فکر کی منطق کو اونچا مقام دے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام، دورِ تلوار کا خاتمہ اور دورِ دعوت کا آغاز تھا۔ قرآن میں یہ حکم کہ قرآن کے ذریعہ جہادِ کبیر کرو (فرقان) گویا اس بات کا اعلان تھا کہ پیغمبرِ اسلام کی بعثت سے تاریخ انسانی میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جب کہ نظریہ "شمشیر و سناں" کا بدل ہوگا۔ نظریاتی طاقت سے فتوحات حاصل ہوا کریں گی۔

اس اصول کا نہایت کامیاب مظاہرہ خود پیغمبر اسلام نے معاہدۂ حدیبیہ کی صورت میں کیا۔ آپ نے جنگ سے بچنے کے لئے بظاہر ایک مغلوبانہ صلح کرلی۔ آپ میدانِ جنگ کو چھوڑ کر میدانِ دعوت کی طرف واپس چلے گئے۔ یہ صلح جو ظاہر بینوں کے نزدیک "ذلت آمیز شکست" کے ہم معنی تھی، خدا نے اس کو فتح مبین (فتح - ۱) قرار دیا۔ ان الفاظ کی صداقت صرف دو برس میں ثابت ہوگئی۔ صلح کے وقت مسلمانوں کی تعداد بمشکل ڈیڑھ ہزار تھی۔ جب کہ اس کے بعد، دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں، ان کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ اب اسلام اتنا طاقت ور ہو چکا تھا کہ مکہ کسی جنگ کے بغیر فتح ہوگیا۔

مسلمانوں کے اندر بعد کے زمانے میں، یہ جو ذہن پیدا ہوا کہ وہ سیاسی اقتدار سے ٹکرانے اور شمشیری کمال دکھانے کو جہاد سمجھنے لگے، اس کی ایک وجہ اور تھی۔ اور وہ وہی فتنہ تھا جس میں اکثر پچھلی امتیں مبتلا ہوئی ہیں۔

سلیمان بن داؤد (۹۳۷ - ۹۷۷ ق م) یہودیوں کے ایک جلیل القدر پیغمبر تھے۔ آپ کی حکومت شام و فلسطین کے علاوہ مشرق میں فرات کے ساحل تک اور مغرب میں سرحد مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان کو بعض غیر معمولی معجزے دیئے گئے تھے۔ ہوا ان کے لئے مسخر تھی، وہ جانوروں کی بولیاں سمجھ سکتے تھے (نمل) معدنیات پر انھیں خصوصی قدرت حاصل تھی۔ جنات ان کے تابع کر دیئے گئے تھے (ص، سبا) اسی قسم کے ایک جن نے ملکہ سبا کا تخت پلک جھپکنے میں یمن سے لاکر فلسطین میں رکھ دیا تھا (نمل)

حضرت سلیمان کی وفات کے بعد، آپ کی یہ خصوصیات، یہود کے لئے فتنہ بن گئیں۔ اپنے "قومی بزرگ" کی تقلید میں انھوں نے کوشش شروع کر دی کہ وہ بھی اس قسم کے کمالات اپنے اندر پیدا کریں۔ انھوں نے بطور خود کچھ کراماتی فنون ایجاد کئے اور ان کو حضرت سلیمان کی طرف منسوب کر دیا (بقرہ - ۱۰۲) سحر و کہانت اور مختلف قسم کے سفلی عملیات، سب مفروضہ "سلیمانی انگشتری" کے بدل کے طور پر بنے۔ طلسماتی اعمال میں انھوں نے اتنی شہرت حاصل کی کہ ۵۸۶ ق م میں جب ایرانی بادشاہ بخت نصر نے ان کو اپنے وطن سے منتشر کیا تو فلسطین کے باہر بھی توہم پرست لوگوں میں وہ اپنے معتقدین پاتے رہے۔ بابل (قدیم عراق) میں وہ محنت مزدوری کرانے کے لئے لے جائے گئے تھے۔ مگر جیوش انسائیکلوپیڈیا کے مطابق "بابل کا مذہبی احترام ہر خطہ کے یہود میں قائم رہا" (جلد ۶، صفحہ ۴۱۳) ــــــــ ۔ ائن ٹفک تعلیم کے اثر سے، موجودہ زمانہ میں، یہودیوں میں اس قسم کے عملیات کا رواج ختم ہوگیا۔ تاہم یہ فن اب بھی اپنے سرپرستوں سے محروم نہیں۔ نبی آخرالزماں کی امت نے اس کو "اسلامی" بنا کر زیادہ بہتر طور پر اپنی مقدس سرپرستی میں لے لیا ہے۔

یہی قصہ، مختلف شکلوں میں، دوسرے انبیاء کی امتوں کے ساتھ بھی پیش آیا ہے۔ ہر نبی کو، اس کے حالات اور زمانہ کے اعتبار سے، کوئی خصوصی چیز دی جاتی ہے۔ اس کی امت کی بعد کی نسلوں میں جب دینی شعور کمزور پڑتا ہے تو یہ چیز فتنہ بن جاتی ہے۔ یہ فتنہ ہمیشہ اس خصوصیت کی مناسبت سے ہوتا ہے جو کسی نبی کو دیا گیا تھا۔

پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو خارق عادت معجزے نہیں دیئے گئے۔ اس کے بجائے آپ کے لئے اللہ تعالٰی نے ایک خصوصی فیصلہ کیا جو، معلوم تاریخ کے مطابق کسی اور نبی کے ساتھ نہیں کیا گیا تھا۔ دوسرے انبیاء کے مخالفین کو

زیر کرنے یا ان کو ہلاک کرنے کے لئے خدائی آفتیں نازل ہوئیں۔ جیساکہ نوح، لوط اور ہود علیہم السلام کے مخالفین کے ساتھ ہوا۔ مگر پیغمبر اسلام کے لئے اللہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ آپ کے پیروؤں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دی جائے اور ان کی تلواروں سے ان کے مخالفین کو زیر کیا جائے (توبہ ۔ ۱۴) اور اس طرح ان کو غالب کرکے ایک طاقت ور اسلامی سلطنت قائم کی جائے۔ ایسا کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ نبی آخرالزماں کے ذریعہ دین خداوندی کو تاریخ کی حیثیت دینی تھی جو ہزاروں نبیوں کی آمد کے باوجود ابھی تک صرف ایک مذہبی افسانہ بنا ہوا تھا۔ نبیوں کی آمد کا سلسلہ بند کرنے کا لازمی تقاضا تھا کہ کتاب الٰہی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا جائے۔ پیغمبر آخرالزماں کو اگر (اظہارِ دین کی) یہ خصوصیت نہ دی جاتی تو ان فائدوں کا حصول ناممکن تھا۔

پیروانِ اسلام کے پاس فتنہ میں پڑنے کے لئے حضرت سلیمان جیسے معجزات وکرامات نہ تھے۔ آپ کی امتیازی خصوصیت، ظاہری طور پر دیکھنے والوں کے لئے، فتوحات اور سیاسی انقلابات تھے۔ بعد کے زمانہ میں اسلام کے پیرؤوں کے لئے یہی چیز فتنہ بن گئی۔ وہ آپ کی زندگی کے سیاسی پہلو کو آپ کے مشن سے الگ کرکے دیکھ نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ پیغمبر عربی اقتدارِ وقت سے ٹکرانے اور سیاسی معجزات دکھانے کے لئے آئے تھے۔ اس لئے نھیں بھی تلوار زنی اور سیاست رانی کے جوہر دکھلانے چاہئیں، ٹھیک ویسے ہی جیسے یہود نے سمجھ لیا کہ حضرت سلیمان ماتی شعبدوں کا مظاہرہ کرنے کے لئے آئے تھے، اس لئے انھیں بھی اسی قسم کی چیزوں میں مشغول ہونا چاہئے۔ حالانکہ یغمبر اسلام کا مشن بھی، قرآن کی تصریحات کے مطابق، وہی تھا جو دوسرے تمام انبیار کا مشن تھا۔ آپ دعوت الی اللہ ر انذار آخرت کے لئے تشریف لائے تھے۔ نہ کہ تلوار چلانے اور سیاسی کارنامے دکھانے کے لئے۔ جس طرح پچھلے انبیار لزلوں اور طوفانوں کے ذریعہ شہروں کو زیر زمین دفن کرنے یا زرخیز زمینوں کو بے آب وگیاہ بنانے نہیں آئے تھے، الاں کہ یہ سب واقعات ان کے ذریعہ سے وجود میں آئے۔ اسی طرح نبی آخرالزماں تلوار چلانے اور قوموں کو زیر کرنے کے لئے مبعوث نہیں کئے گئے، اگرچہ مصلحت خداوندی کے تحت یہ واقعات بھی آپ کی زندگی میں پیش آئے۔

اس ذہن کے اثرات بہت عرصہ سے سیرت اور تاریخ کی ترتیب میں ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ قرآن اور حدیث ں پیغمبر اسلام کی جو تصویر ہے، وہ سیرت میں آکر بدل جاتی ہے۔ سیرت کی کتابیں، دوسرے پیغمبروں کے حالات ندگی کے برعکس، فتوحات اور مغازی کی داستانیں نظر آتی ہیں۔ اسلامی تاریخ تک پہنچ کر یہ ذہن اور ترقی کرتا ہے۔ لامی تاریخ، عملاً، اسلام کی تاریخ سے زیادہ سلاطین اور جنرلوں کے کارناموں کی فہرست بن گئی ہے۔

ایسا ہونا فطری تھا۔ اسلام کی تاریخ، بعد کے زمانہ میں اس وقت مرتب کی گئی جب کہ مسلم تلواروں کی جھنکار سے ام ممالک گونج رہے تھے۔ فتوحات اور جنگوں کی خبریں سارے مسلم معاشرہ میں سب سے بڑا موضوع گفتگو بنی ہوئی تھیں۔ س ماحول میں لکھی جانے والی سیرت کی کتابیں اگر "مغازی" کی داستان بن جائیں اور اسلامی تاریخ "فتوح البلدان" کے روپ میں ڈھل جائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ سیرت یا اسلام کی تاریخ اگر کسی دور میں لکھی گئی ہوتی تو س کا انداز اس سے بالکل مختلف ہوتا جو آج ہمیں اس موضوع کی کتابوں میں نظر آتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں پہنچ کر یہ ذہن ایک نئی شدید تر صورت اختیار کر گیا ہے۔ موجودہ زمانہ اسلامی تحریکوں کا زمانہ ہے۔ مگر ہم حیرت کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں جو اسلامی تحریکیں اٹھیں، ان میں سے اکثر اقتدارِ وقت کے خلاف لڑائی بھڑائی کے راستہ پر مڑ گئیں۔ اس کی وجہ، جزدی طور پر وقت کے سیاسی ماحول کے خلاف ردعمل اور جزدی طور پر مندرجہ بالا تاریخی نفسیات رہی ہے۔ موجودہ زمانہ میں، مغربی تہذیب کے تصادم کی وجہ سے، اسلام اور مسلمانوں کے کے لئے جو مسائل پیدا ہوئے، وہ ایک دعوتی اور تعمیری جدوجہد کا تقاضا کر رہے تھے۔ مگر مسلمان، ساری دنیا میں، شمشیری مقابلہ یا سیاسی ٹکراؤ کے طریقہ کی طرف چلے گئے اور نتیجۃً بربادی کے سوا کچھ بھی ان کے حصہ میں نہ آیا۔

اسلام ساری دنیا کے لئے خدا کی رحمت (انبیاء ـ ۱۰۷) تھا۔ وہ اس لئے آیا تھا کہ خدا کے بندوں کو خدا کے سایہ کے نیچے جمع کر دے۔ مگر خدا کی یہ رحمت ابھی تک اس کے تمام بندوں تک وسیع نہ کی جا سکی۔ اس کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ خود حاملینِ اسلام پر عائد ہوتی ہے۔

حاملین اسلام، خدا کی رحمت کو تمام انسانوں تک پہنچانے میں ناکام رہے۔ اس کی واحد وجہ وہی ہے جس کو قرآن میں تفرق فی الدین (شوریٰ ـ ۱۴) کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دین کے آفاقی اور دائمی حصہ کو قرآن میں محفوظ کر دیا تھا اور کہا تھا کہ بس یہی دین کی شاہراہ (صراط مستقیم) ہے، اس پر چلتے رہو۔ اس کے سوا اپنی طرف سے اس میں نئے نئے راستے مت نکالو (انعام ـ ۱۵۳)۔ مگر مسلمانوں نے خدا کے بتائے ہوئے دین کے سوا بہت سی اور چیزیں نکالیں اور ان کو "دین" قرار دینے پر اصرار کیا۔ ان غیر قرآنی امور پر ساری امت مجتمع نہیں ہو سکتی تھی۔ کچھ لوگوں نے ایک چیز پر اصرار کیا، کچھ لوگوں نے دوسری چیز پر۔ اس طرح دین میں نئے نئے فرقے بنتے چلے گئے۔ ان اختلافات نے لوگوں کو آپس کی لڑائیوں میں مصروف کر دیا، پھر وہ دوسروں تک خدا کا پیغام پہنچانے کا وقت کہاں پا سکتے تھے۔

اسلام ایک سادہ دین ہے (بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ) مگر کچھ لوگوں نے چاہا کہ اسلام کی سادہ تعلیمات میں فنی تفصیلات اور خارجی تعینات کا اضافہ کر کے بزعم خود اس کو "مکمل" کریں۔ یہی کوشش تھی جس نے ان تمام فنون کو پیدا کیا جن کو فقہ اور تصوف اور علم کلام کہا جاتا ہے ـــــ احکام اسلامی کی فنی تفصیلات متعین کرنے کا نام فقہ ہے۔ معرفت الٰہی کے خارجی ذرائع مقرر کرنے کا نام تصوف ہے۔ اعتقادیاتِ اسلامی کو عقلی پیمانوں میں ڈھالنے کا نام علمِ کلام ہے۔ بظاہر یہ کوششیں مفید اور بے ضرر معلوم ہوتی ہیں۔ مگر دینِ خداوندی کا معاملہ عام انسانی معاملات سے مختلف ہے۔ دین میں کوئی اضافہ، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، بالآخر مقدس بن جاتا ہے۔ جو لوگ ایک بار اس سے وابستہ ہو جائیں، وہ نہ صرف خود بلکہ ان کی نسلیں بھی اس کو چھوڑنے یا اس کو غیر اہم سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔ ایسی ہر کوشش دین میں صرف ایک نیا فرقہ وجود میں لانے کا باعث بنتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دین میں کسی طریقہ کا اضافہ کرنا مطلق ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد — جو ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز نکالے جو اس میں نہ ہو

تو وہ قابل رد ہے۔

اس قسم کی کھلی ہوئی ممانعتوں کے باوجود لوگ انتہائی معصومانہ طور پر دین میں اضافے کرتے رہے اور بالآخر ایک دین کو "۷۲" دینوں میں تقسیم کر ڈالا۔

تاہم یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اسلام میں اگر "۷۲" فرقے پیدا ہوئے تو عیسائیت بھی ۷۲ فرقے بن گئے۔ ہندوازم اس سے بھی زیادہ فرقوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس کے باوجود یہ قومیں باہمی جنگ سے بچ کر تعمیر و استحکام کے کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔ عیسائیت کا یہ حال ہے کہ آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ منظم تبلیغی کام اسی مذہب کے لوگ کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اس نے مذہبی تبلیغ کو نئی وسعت اور بلندی عطا کی ہے۔ ہندوازم جدید مغربی دنیا میں زبردست تبلیغی مذہب کی حیثیت سے اپنی جڑیں پھیلا رہا ہے۔ سوامی وویکانند (۱۹۰۲-۱۸۶۳) سے لے کر سوامی پربھوپادا (۱۹۷۷-۱۸۹۶) تک ہندو مبلغین کا ایک سلسلہ ہے جس نے پوری پوری عمر اسی کام میں صرف کر ڈالی اور وقت کی زندہ زبانوں اور آج کی ترقی یافتہ قوموں میں اپنے دھرم کو بڑے پیمانہ پر پھیلانے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر اسلام، عملی طور پر، صدیوں سے ایک جامد مذہب بنا ہوا ہے۔ اس دوران میں اسلام کے پھیلنے کے اگر کچھ واقعات ہیں تو وہ اسلام کی اپنی قوت کی بدولت ظہور میں آئے ہیں۔ اسلام کے نام لیواؤں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ

اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب صرف مذہبی فرقہ بندی کی بدعت تک محدود رہے۔ جب کہ اسلام کے نام لیوا اس سے آگے بڑھ کر سیاسی فرقہ بندی کی شدید تر برائی میں گرفتار ہو گئے۔ عام طرز کی فرقہ بندی زیادہ سے زیادہ مذہبی اختلافات پیدا کرتی ہے۔ مگر سیاسی فرقہ بندی وہ بری بلا ہے جو دو فریقوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بناتی ہے۔ وہ مناظرانہ بحثوں کو تلوار اور بندوق کی لڑائی بنا دیتی ہے۔ سیاسی فرقہ بندی میں صرف دو نہتے فریق ایک دوسرے سے نہیں الجھتے بلکہ یہ ایک نہتے گروہ کے ساتھ وقت کے اقتدار کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہترین طاقتیں اور صلاحیتیں سیاست کے مقتل میں ذبح کر دی جاتی ہیں۔ دعوت و تبلیغ کا عمل مسلمانوں کی طاقت کو غیر اقوام کی طرف لگاتا ہے۔ جب کہ "اسلامی سیاست" کا نعرہ مسلمانوں کو خود مسلمانوں کے خلاف دست و گریبان کر دیتا ہے۔ مسلمان دو طبقوں (بے اقتدار اور با اقتدار) میں بٹ کر ایک دوسرے کو فنا کر دینے پر تل جاتے ہیں۔ اس کی نوبت ہی نہیں آتی کہ وہ متحد ہو کر خدا کے دین کی توسیع و اشاعت کا کوئی موثر کام کر سکیں۔

سیاسی فرقہ بندی کا پہلا واقعہ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد شیعیت کا ظہور ہے۔ اسلام سے پہلے تمام معلوم زمانوں سے یہ سیاسی رواج چلا آ رہا تھا کہ بادشاہ کا بیٹا بادشاہ ہوتا تھا۔ حکومت ساری دنیا میں ایک وراثتی حق سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے معلوم تاریخ میں پہلی بار اس طریقہ کو ختم کر کے شورائی حکمرانی (شوریٰ۔ ۳۸) کے طریقہ کا اعلان کیا۔ مگر بہت سے لوگ جو اسلام میں داخل ہونے کے باوجود، زمانی افکار سے آزاد نہ ہو سکے تھے، اس تبدیلی کو قبول نہ کر سکے اور پیغمبر اسلام کے بعد آپ کے خاندان میں خلافت کو جاری رکھنے پر اصرار کیا۔ چونکہ پیغمبر کا کوئی بیٹا نہ تھا، اس لئے

"اہل بیت رسول" کی اصطلاح وضع ہوئی۔ تاکہ بیٹے کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کے لئے اس کا استحقاق ثابت کیا جا سکے۔

اس تحریک کو جب کامیابی نہیں ہوئی تو انھوں نے دوسری شدید تر غلطی کی۔ جو چیز ابتداءً محض ایک سیاسی نظریہ کی حیثیت رکھتی تھی، اس کو انھوں نے ایک باقاعدہ مذہبی عقیدہ بنا ڈالا۔ حتی کہ اس کو نجات کا دار و مدار قرار دے دیا۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ جس چیز کو مذہبی عقیدہ کی حیثیت دے دی جائے، چاہے وہ بذات خود کتنی ہی بے اصل کیوں نہ ہو، بالآخر وہ مقدس بن جاتی ہے اور پھر اس کو ختم کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی شیعہ عقیدہ کے ساتھ ہوا۔ یہ عقیدہ مقدس بن کر ہزاروں لوگوں کے ذہنوں پر چھا گیا اور اس کے لئے سب کچھ کرنا عین جائز قرار پایا۔

اسلام کی اب تک کی تاریخ میں جتنے بڑے بڑے حادثات گزرے ہیں، ان میں کسی نہ کسی طور پر اس عقیدہ کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آئے گا۔ اس عقیدہ نے مسلمانوں کو ایک دائمی قسم کی خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ شیعہ گروہ تاریخ کے ہر دور میں مسلم معاشرہ کے اندر منفی کردار ادا کرتا رہا ہے۔ آغاز اسلام میں خلافت کے جھگڑوں سے لے کر اب تک بمشکل کوئی ایسا مسلم المیہ ملے گا جس میں بالواسطہ یا براہ راست طور پر اس کی کارفرمائی شامل نہ ہو۔

ان باہمی اختلافات کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں کی وہ طاقت جو اسلام کی اشاعت و توسیع میں لگتی، وہ آپس کی لڑائیوں میں برباد ہو گئی۔ مثال کے طور پر صفین و جمل کی لڑائیوں (۳۷-۳۶ھ) اور حسین و یزید کی جنگ (۶۱ھ) میں جو تقریباً ایک لاکھ مسلمان کٹ گئے، وہ اتنے طاقت ور تھے کہ یورپ کی آخری سرحدوں تک اسلام کو پہنچانے کے لئے کافی تھے۔ مگر یہ انتہائی قیمتی گروہ خود اپنے بھائیوں کی تلواروں سے ذبح ہو گیا۔ ایک تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔

قدیم زمانہ میں سیاست کو عقیدہ بنانے کا رواج غیر اہل بیت کے اقتدار کے مقابلہ میں اہل بیت کے اقتدار کو ثابت کرنے کے لئے ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ میں یہی بدعت نئی شکل میں دہرائی گئی ہے۔ یہ واقعہ ہمارے قائدین کے سیاسی جوش میں کوئی کمی نہ کر سکا کہ سیاست نے موجودہ زمانہ میں وہ معنویت کھو دی ہے جو قدیم زمانہ میں اسے حاصل تھی۔ پچھلی صدیوں میں اجتماعی معاملات کی نوعیت بے حد بدل گئی ہے۔ قدیم زمانے میں سیاسی انقلاب بجائے خود "انقلاب" کے ہم معنی ہوتا تھا۔ آج سیاسی انقلاب صرف ایک ٹربونگ ہے، اگر اس کے ساتھ دوسری غیر سیاسی قوتیں اس کی مدد کے لئے جمع نہ کی گئی ہوں۔

اولاً انیسویں صدی کے آغاز میں اس فکر کا ظہور ہوا جب کہ ایشیا اور افریقہ کے ملکوں سے مغربی استعمار کو ختم کرنے اور مسلم اقتدار کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے اس کو بطور شرعی دلیل کے پیش کیا گیا۔ یہ استعمار مسلمانوں کو تعلیم و ترقی اور تبلیغ و دعوت کے میدان میں ہر قسم کے مواقع دے رہا تھا۔ ایک انگریز پروفیسر ٹامسن آرنلڈ (۱۹۳۱) نے پریچنگ آف اسلام کے نام سے اس زمانہ میں ایک انتہائی قیمتی کتاب لکھی۔ اس کتاب میں یہ عظیم تاریخی رہنمائی تھی کہ سیاسی،

تدار کے بغیر اسلام اپنی دعوتی قوت سے ملکوں اور قوموں کو فتح کر سکتا ہے۔ مگر اس قسم کی باتوں سے مسلمانوں کو کوئی دلچسپی نہ ہو سکی۔ کیوں کہ جس سیاسی نظام کا وجود ہی سرے سے حرام ہو اس کے تحت "آدمی پوری مذہبی زندگی" کا سودا کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی ضروری نہ رہا کہ ہمارا سیاسی پروگرام دنیوی اعتبار سے نتیجہ خیز ہو۔ اب وہ مقدس جہاد تھا جو افضل العبادات ہے اور جس کی راہ میں اپنے کو مٹا دینا بجائے خود کامیابی ہے۔ کیوں کہ وہ سیدھے جنت تک پہنچاتا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال تک بے شمار لوگ "استعمار" سے لڑ لڑ کر انتہائی بے فائدہ طور پر اپنی جان و مال کو برباد کرتے رہے۔

یہ سیاسی جہاد صرف اجنبی حکمرانوں تک محدود نہ تھا۔ سلطان عبدالحمید ثانی (۱۹۱۸—۱۸۴۲) اور شاہ فاروق (۱۹۶۵—۱۹۲۰) جیسے مسلم حکمران بھی اسی سیاہ فہرست میں داخل تھے۔ کیوں کہ وہ مغربی مستعمرین کے "ایجنٹ" بنے ہوئے تھے۔ سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷—۱۸۳۸) کو ایران، مصر اور ترکی کے حکمراں زبردست مواقع دے رہے تھے کہ وہ دعوتی اور تعلیمی میدان میں اسلام کی تعمیر کا کام کریں۔ مگر ان کی مجاہدانہ سیاست کو اس قسم کے کام حقیر معلوم ہوئے۔ وہ ان مواقع کو چھوڑ کر خود ان حکمرانوں کو تخت سے ہٹانے کے منصوبے بنانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ حکمراں طبقہ سے ان کا ٹکراؤ ہوا۔ وہ ہر ملک سے نکالے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ ترکی کے قید خانہ میں مر گئے —— یہی المناک کہانی، موجودہ زمانہ میں، مسلم ملکوں کے بادشاہوں اور مصلحین کے درمیان مسلسل دہرائی جاتی رہی ہے۔

بیسویں صدی میں مسلم ممالک، کم از کم سیاسی معنوں میں، اجنبی اقتدار سے آزاد ہو چکے ہیں۔ مگر مسلمانوں کی باہمی سیاسی لڑائیاں اب بھی ختم نہیں ہوئیں۔ بلکہ اس نے نظریاتی صورت اختیار کر کے مزید شدت پکڑ لی ہے اب اس کا عنوان ہے: اسلامی قانون کا نفاذ یا حکومت الٰہیہ کا قیام۔ جس ملک میں بھی چیخ پکار کرنے یا احتجاجی سیاست چلانے کے مواقع ہیں، وہاں ہمارے مصلحین اور قائدین اسلامی قانون کا جھنڈا لئے ہوئے اپنی قومی حکومتوں سے ٹکرا رہے ہیں اور پوری قوم کو ایک لامتناہی جنگ میں الجھائے ہوئے ہیں۔ انڈونیشیا کے عبد القہار مذکر (۱۹۷۲—۱۹۰۲) کو سابق صدر سوئیکارنو ہر قسم کے اصلاحی کام کے مواقع دے رہے تھے۔ مگر وہ دستور اسلامی کے نفاذ کے نام پر لڑ لڑ کر ختم ہو گئے۔ مصر کے سید قطب (۱۹۶۶—۱۹۰۶) کو سابق صدر جمال عبد الناصر نے اسلامی تعلیم و ترقی کے کاموں کے لئے حکومتی تعاون کی پیش کش کی۔ مگر وہ اور ان کی پوری جماعت صدر ناصر کی معزولی سے کم کسی چیز پر راضی نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے ان کو پیس ڈالا۔ پاکستان کے سید ابوالاعلیٰ مودودی (—۱۹۰۳) کو پاکستان کے حکمرانوں نے دعوتی اور تعمیری کاموں کے لئے ہر قسم کا تعاون دینا چاہا۔ مگر ان کے نزدیک سب سے بڑا کام "بے دین حکمرانوں" کو اقتدار سے بے دخل کرنا تھا تاکہ پاکستان میں اسلام کے دیوانی اور فوجداری قانون کو نافذ کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے وہ اور ان کی پوری جماعت اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں سے ٹکراتے رہے۔ ان بے فائدہ قسم کی باہمی لڑائیوں کا یہ فائدہ تو نہیں ہوا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو جاتا۔ البتہ اس اکھیڑ پچھاڑ میں پاکستان کے بہترین امکانات برباد ہو گئے، حتیٰ کہ خود اسلامی تحریک کے سیاسی امکانات بھی۔ کیوں کہ اسلامی حکومت محض مطالبات اور ایجی ٹیشن

سے قائم نہیں ہوتی۔ اس کے لئے بے حد دوررس منصوبہ بندی درکار ہے اور محاذ آرائی کی فضا میں خاموش منصوبہ بندی کی سیاست سوچی بھی نہیں جاسکتی، اس کو چلانا تو درکنار۔

ہمارے مصلحین کے اس سیاسی ذوق کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ اسلام، ہر مسلم ملک میں، برسر اقتدار طبقہ کا سیاسی حریف بن کر رہ گیا ہے۔ وہ اسلام کو ٹھیک اسی نظر سے دیکھنے لگے ہیں جیسے امریکہ میں کمیونسٹ پارٹی کو دیکھا جاتا ہے۔ اسلام کے نام پر جب بھی کوئی دعوت اٹھتی ہے، وہ فوراً متوحش ہو جاتے ہیں۔ اسلام کا لفظ، موجودہ حالات میں، ان کے لئے حکمرانوں کو بے اقتدار (UNSEAT) کرنے کی تحریک کے ہم معنی بن گیا ہے۔ غیر اسلامی لوگوں کے ساتھ کام کرنے والوں کو وہ آزادی دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام کے علم برداروں کو کام کے مواقع دینے پر راضی نہیں ہوتے۔ کیونکہ موجودہ فضا میں اس کا مطلب، ان کے نزدیک یہ ہے کہ اپنے قتل کے کاغذات پر خود ہی دستخط ثبت کر دیئے جائیں۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کو دوبارہ سربلند کرنے کے سلسلے میں پہلا کام یہ ہے کہ اس فضا کو ختم کیا جائے۔ اسلام کو حکمرانوں کا سیاسی حریف بننے سے بچایا جائے تاکہ مسلم ملکوں کے وسائل اسلامی منصوبوں کے لئے حاصل ہو سکیں۔ اور عالمی سطح پر اسلام کی دعوت و اشاعت کی مہم چلائی جاسکے جس کا زمین و آسمان کو سیکڑوں برس سے انتظار ہے۔

انسانی اندازے کتنے غلط ہوتے ہیں

ام عبداللہ بنت ابی حثمہ بیان کرتی ہیں کہ ہجرت حبشہ کے وقت وہ سفر کی تیاری کر رہی تھیں۔ عمر بن خطاب (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) ادھر سے گزرے۔ اس وقت تک وہ مسلمانوں کے اوپر ظلم کرنے میں انتہائی سخت تھے۔ عمر نے کہا: انه للانطلاق یا ام عبد الله (اے ام عبداللہ کیا روانگی ہو رہی ہے)۔ ام عبداللہ نے کہا: خدا کی قسم، ہاں، تم لوگ ہمارے اوپر مصیبت ڈال رہے ہو۔ ہم خدا کی زمین میں نکل جائیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ ہمارے لئے کوئی گنجائش پیدا کر دے۔ عمر نے یہ سن کر کہا: خدا تمھارا ساتھ دے (صحبکم الله) یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں رقت طاری ہو گئی۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ اس کے بعد ام عبداللہ کے شوہر آئے جو کسی ضرورت سے باہر چلے گئے تھے۔ ام عبداللہ نے ان سے عمر کا واقعہ بیان کیا اور کہا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ ان کے شوہر نے کہا:

لا یسلم هذا حتی یسلم حمار الخطاب — یہ شخص اسلام قبول کرنے والا نہیں۔ یہاں تک کہ خطاب کا گدھا بھی مسلمان ہو جائے۔

مگر یہی عمر بن الخطاب اس کے تھوڑے دنوں بعد مسلمان ہو گئے اور انھوں نے اسلام کی نئی تاریخ بنائی —— انسان اکثر اندازہ کرنے میں غلطی کرتا ہے۔ اگرچہ ہر آدمی یہی سمجھتا ہے کہ اس کا اندازہ بالکل درست ہے۔

پچھلی شریعتوں میں دین کی حقیقت گم ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کے یہاں مقصد پر واقعات کا غلبہ ہوگیا۔ وہ دین کی مقصدی حیثیت کو اس کے واقعاتی پہلوؤں سے الگ کرکے نہ دیکھ سکے۔ وہ بھول گئے کہ واقعات کی حیثیت، نظریات کے مقابلہ میں، ہمیشہ اضافی ہوتی ہے۔ واقعات سے بظاہر دین کی جو تصویر بن رہی تھی اسی کو انھوں نے اصل دین سمجھ لیا۔ اور پھر دین کی ایسی تشریح کر ڈالی جس کا اصل آسمانی دین سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اس بگاڑ کی ایک جزوی مثال وہ ہے جو قرآن میں سورہ آل عمران (۹۳) اور سورہ انعام (۱۴۶) میں بیان کی گئی ہے۔ یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم (۱۸۵۳ — ۲۰۰۰ ق م) جن کا دوسرا معروف نام اسرائیل ہے، یہود کے پیغمبر تھے۔ آپ نے طبی ضرورت کے تحت بعض جائز غذائیں چھوڑ دی تھیں۔ اسرائیلی روایات کے مطابق آپ کو عرق النساء کی شکایت تھی۔ اس لئے بطور علاج آپ نے بعض چیزوں مثلاً اونٹ کا دودھ اور گوشت سے پرہیز شروع کردیا تھا۔ آپ کے بعد آپ کی اولاد نے بھی اپنے بزرگ کی تقلید میں ان کو چھوڑے رکھا۔ حتیٰ کہ آخر میں یہ ذہن بن گیا کہ یہ چیزیں بجائے خود حرام ہیں اور بالآخر یہودی فقیہوں نے اپنی مقدس کتاب (تورات) میں ان کی حرمت درج کردی:

> "چوپایوں میں سے جو جگالی کرتے ہیں یا ان کے پاؤں چرے ہوئے ہیں، تم ان کو یعنی اونٹ اور خرگوش اور سافان کو نہ کھانا۔ کیونکہ یہ جگالی کرتے ہیں لیکن ان کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں۔ سو یہ تمہارے لئے ناپاک ہیں۔"
>
> استثنا ۱۴: ۷ (احبار ۱۱: ۴-۶)

یہود کے ایک بزرگ پیغمبر کا بعض غذاؤں کو نہ کھانا، آپ کی زندگی کا محض ایک اتفاقی جزء تھا، اس کا آپ کے پیغمبرانہ مشن سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر یہود اس فرق کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ جو چیز محض ایک اتفاقی واقعہ کی حیثیت رکھتی تھی، اس سے وہ حرام و حلال کے قوانین اخذ کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے دین خداوندی کی ایسی تصویر بنا ڈالی جو بظاہر درست ہونے کے باوجود سراسر غلط تھی۔

بگاڑ کی اس قسم کی کلی مثال بھی یہودی کے یہاں ملتی ہے اور وہ ان کی آخرت فراموشی اور دنیا پرستی ہے۔ یہود، پیغمبر آخر الزماں کی بعثت سے قبل، دین خداوندی کے نمائندے تھے۔ اپنی اس تاریخ کے تقریباً دو ہزار سال کے دوران انھوں نے عروج و زوال کے زبردست واقعات دیکھے۔ ایک طرف داؤدؑ (۹۶۳ — ۱۰۴۳ ق م) اور سلیمانؑ (۹۳۲ — ۹۹۰ ق م) جیسے بڑے بڑے بادشاہ ان کی قوم میں اٹھے۔ اور یوسفؑ (۱۸۱۶ — ۱۹۰۶ ق م) جیسی عظیم شخصیت ان میں پیدا ہوئی جس کو اس وقت کے شاہ مصر نے ملک کا پورا انتظام سونپ دیا اور اس کے بعد یہود کو موقع ملا کہ مصر کے انتہائی زرخیز علاقہ میں اپنی آبادیاں قائم کرسکیں۔ فرعون کی غرقابی کے بعد وہ شام و فلسطین کے سرسبز اور زرخیز علاقہ کے وارث بنا دیئے گئے (اعراف ـ ۱۳۷)

دوسری طرف یہود کی تاریخ میں بار بار وہ ہولناک لمحے بھی آئے ہیں جب کہ انھوں نے اپنی بدی سے "خداوند کو غصہ دلایا۔ اور خداوند کا قہر اسرائیل پر بھڑکا اور اس نے ان کو غارت گروں کے ہاتھ میں کردیا جو ان کو لوٹنے لگے، اور اس نے ان کو ان کے دشمنوں کے ہاتھ جو آس پاس تھے بیچا۔ سو وہ پھر اپنے دشمنوں کے سامنے کھڑے نہ ہوسکے۔ اور

وہ جہاں کہیں جاتے، خداوند کا ہاتھ ان کی اذیت ہی پر تلا رہتا تھا۔ سو وہ نہایت تنگ آگئے۔ (قضاۃ ۲: ۱۱-۱۷)
مصر سے نکلنے کے بعد ۱۴۴۰ اور ۱۴۰۰ ق م کے درمیان تقریباً چالیس سال تک ان کا یہ حال رہا کہ اپنے "گناہ اور عہد شکنی"
کے جرم میں وہ صحرائے سینا (دشت فاران سے شرق اردن تک) بھٹکتے رہے۔ کیوں کہ ان کے بارے میں خداوند نے
کہہ دیا تھا کہ "میں اس سارے خبیث گروہ سے جو میری مخالفت پر تُلا ہے، ایسا ہی کروں گا۔ اس دشت میں وہ برباد
ہوجائیں گے اور یہیں ہلاک ہوں گے (گنتی ۱۴: ۳۴-۳۵)۔ ۷۲۱ ق م میں اشور کے سخت گیر فرماں روا سارگون
نے سامریہ کو فتح کر کے مملکت اسرائیل کا خاتمہ کیا اور ہزاروں یہودی مار ڈالے۔ ۲۷ ہزار سے زیادہ یہودیوں کو ان کے
ملک سے نکال کر تتر بتر کر دیا۔ وہ دوبارہ آباد ہوئے تو ۵۹۸ ق م میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کر کے
یہودیہ کے بادشاہ کو اپنا قیدی بنالیا۔ دوسری بار ۵۸۷ ق م میں بخت نصر نے شدید تر حملہ کیا اور یہودیہ کے تمام
چھوٹے بڑے شہروں کو ویران کر ڈالا۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا۔ بعد کو ان کے حالات
بدلے اور انھوں نے دوبارہ اپنے ہیکل کی اور اپنے شہروں کی تعمیر کی۔ مگر ۷۰ء میں پھر ٹیٹس رومی نے تلوار
کے زور پر یروشلم کو فتح کر لیا اور بائبل کے بیان کے مطابق ان کے ایک لاکھ ۳۳ ہزار آدمی مار ڈالے۔ ۲۷ ہزار آدمیوں
کو پکڑ کر لے گیا تاکہ ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوائے اور شمشیر زنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لئے استعمال کرے۔
یروشلم اور مقدس ہیکل کو بھی اس نے دوبارہ ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا۔

یہود کی دو ہزار سالہ قدیم تاریخ میں اس قسم کے اتار چڑھاؤ کے واقعات بار بار پیش آئے۔ کبھی انھوں نے
دنیوی عیش و اقتدار کا لطف اٹھایا، کبھی دنیوی ذلت اور بربادی کا دکھ جھیلا — ان کے انبیاء بار بار ان واقعات
کو یاد دلا کر انھیں نصیحت کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دھیرے دھیرے ان کا ذہن یہ بن گیا کہ خدا کا انعام اور سزا
دونوں اسی دنیا میں ملتے ہیں — انھوں نے جنت اور جہنم کی دنیوی تعبیر کر ڈالی — اس کے بعد اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ کتاب
مقدس کی ترتیب میں ان کے یہ خیالات جگہ پانے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب آسمانی کتاب کے نام سے جو کتاب
(تورات) ان کے یہاں پائی جاتی ہے — اس میں دنیوی جنت اور دنیوی جہنم کی تفصیلات سے تو باب کے باب بھرے
ہوئے ہیں مگر آخرت کی جنت اور جہنم کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اگر ملتا ہے تو محض اشاراتی شکل میں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہود کا ذہن انتہائی دنیا پرستانہ ہوگیا۔ جب انھوں نے دنیا ہی کو انعامات خداوندی کا
مقام سمجھ لیا تو بالکل فطری تھا کہ وہ دنیا کی زندگی کے انتہائی حد تک عاشق ہوجائیں۔ قرآن کے الفاظ میں ان کا یہ
حال ہوا: "تم ان یہودیوں کو سب سے زیادہ حیاتِ دنیا کا حریص پاؤگے۔ یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی بڑھ کر۔ ان
میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ ہزار ہزار برس تک جیتا رہے (بقرہ — ۹۶) مال کی محبت میں ان کی اکثریت کا یہ حال
ہوا: "اگر تم ایک دینار بھی ان کے پاس امانت رکھ دو تو وہ اس کو واپس نہ کریں گے۔ الّا یہ کہ تم ان کے سر پر سوار
ہوجاؤ (آل عمران — ۷۵) — اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی دنیا پرستی خالص "نظریاتی" نوعیت کی حامل تھی۔
دنیا کی تمام برائیاں دراصل نفس پرستی کی برائیاں ہیں نہ کہ حقیقۃً نظریاتی برائیاں۔ مگر نفس پرستی کی ہر قسم ابتداءً سادہ

اور معصوم نظریات کی زمین پر اگتی ہے۔ نظریاتی بنیاد کا سہارا لئے بغیر کوئی برائی اس زمین پر جڑ نہیں پکڑ سکتی۔

قرآن نے پہلی بار انسانیت کو اس گمراہی سے نکالا۔ اس نے نظریہ اور تاریخ کو ایک دوسرے سے الگ کیا۔ اور اصل دین کو اس طرح کھول کھول کر بیان کیا کہ کسی بندۂ خدا کو حقیقت کے سمجھنے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں حکم دیا گیا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (شوریٰ - ۱۳)

راہ ڈال دی تم کو دین میں وہی جو کہہ دی تھی نوح کو اور جو حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور وہ جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو، یہ کہ قائم رکھو دین اور پھوٹ نہ ڈالو اس میں۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر)

اس آیت کے سلسلے میں تمام مفسرین متفق ہیں کہ اس میں الدین سے مراد دین کی اصولی اور اساسی تعلیمات ہیں۔ تفصیلی شریعت یہاں مراد نہیں ہے۔ اس تفسیر کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں یہ حکم ہے کہ اس متفق علیہ دین پر قائم ہو جاؤ جو تمام انبیاء کو دیا گیا تھا۔ اب چونکہ، قرآن کی تصریح کے مطابق، مختلف انبیاء کی شریعت اور منہاج میں اختلاف تھا (مائدہ - ۴۸) اس لئے شریعتوں پر اتفاق کے ساتھ عمل نہیں ہو سکتا۔ صرف اساسات دین کے سلسلہ میں یہ ممکن ہے کہ متفقہ طور پر ان کے اوپر عمل کیا جا سکے۔ کیونکہ اساسی تعلیمات سب کے یہاں ایک تھیں۔

اس حکم کے ذریعہ انبیاء کی دعوت اور انبیاء کی تاریخ کے درمیان نوعی فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ مشن خواہ ایک ہو، مگر تاریخیں ہمیشہ جدا جدا بنتی ہیں۔ مختلف انبیاء کے گرد جو الگ الگ تاریخی نظائر بنے یا وقتی حالات کے اثر سے ان کی زندگی میں جو اتفاقی اجزاء شامل ہوئے، ان کو قرآن نے ان کے اصل مشن سے الگ کر دیا اور غیر متبدل اور ابدی تعلیمات کو "الدین" قرار دے کر حکم دیا کہ اصل اور مستقل اہمیت اس کو دو اور اس کی تعمیل میں پوری طرح لگ جاؤ۔

ہر نبی اپنے حالات کی رعایت سے کوئی مخصوص طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ اس کا یہ عمل ایک وقتی نظیر تو ضرور ہوتا ہے۔ مگر وہ دائمی حجت نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر حضرت سلیمان نے یمن کی مشرک ملکہ کو جنگ کی دھمکی دی۔ حضرت یوسف نے مصر کے مشرک بادشاہ کے ساتھ تعاون کا طریقہ اختیار کیا۔ حضرت مسیح نے فلسطین کے مشرک حکمرانوں سے کوئی تعرض نہیں فرمایا۔ یہی عملی فرق انفرادی امور میں بھی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ نے مدین کے ایک صالح خاندان میں شادی کی تو آپ کا مہر آٹھ سالہ خدمت قرار پائی۔ حضرت علی کا نکاح پیغمبر کی لڑکی سے مدینہ میں ہوا تو آپ نے مہر میں ایک زرہ ادا کی۔ وغیرہ۔ اصولی تعلیمات اور عملی تفصیلات میں اس قسم کا فرق لازمی ہے۔ اور اکثر بگاڑ اسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ کسی عملی نظیر کو وہی اہمیت دے دی جاتی ہے جو کہ ایک اصولی حکم کو دینا چاہئے۔

اساسات دین اور متعلقات دین کا یہ فرق ذہن میں ہو تو بھی خدا پرستی پیدا ہوتی ہے۔ فرقہ بندی کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ دینی کوششیں اپنے صحیح مقام پر لگنے لگتی ہیں۔ آدمی اس فتنہ سے بچ جاتا ہے کہ دین کے نام پر ایک ایسی چیز کے لئے معرکہ آرائی شروع کر دے جو حقیقۃً اس کے لئے دینی فریضہ کی حیثیت نہ رکھتی ہو۔

اس فرق کی ایک حکمت یہ ہے کہ اصل دین اور بقیہ تفصیلات کی حیثیت کسی مجموعی فہرست کی نہیں ہے۔ بلکہ عملی تفصیلات، اصل دین کے لئے لوازم ونتائج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اصل دین اگر بیج ہے تو عملی تفصیلات اس کی شاخیں ہیں۔ اصل دین جب قائم ہوجاتا ہے تو بقیہ تفصیلات بھی، حسب حالات، وجود میں آتی چلی جاتی ہیں۔ اصل دین مطلق طور پر ہمیشہ مطلوب ہوتا ہے۔ جب کہ عملی تفصیلات ان واقعی حالات کی نسبت سے مطلوب ہوتی ہیں جن میں کوئی شخص اپنے آپ کو پا رہا ہو۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اصل دین کے علاوہ دین کے جو اور تقاضے ہیں، ان پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ حکم صرف مسئلہ کی نوعیت کو بتا رہا ہے نہ یہ کہ ایک ضروری ہے اور دوسرا غیر ضروری۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصولاً اور اولاً جو چیز بندوں سے مطلوب ہے، وہ صرف وہی "الدین" ہے جو تمام انبیاء کے یہاں مشترک ہے، خواہ وہ جس حال میں اور جس مقام پر بھی پائے گئے ہوں۔ اس کے بعد جو دوسرے متعلقات اور تقاضے ہیں، وہ حالات کی نسبت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں لازماً فرق بھی ہوگا، اور کمی بیشی بھی۔ اس لئے اس قسم کے فروق پر مت لڑو۔ اپنے حالات کے مطابق اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے اپنی تمام توجہ اصل دین پر مرتکز رکھو۔

" اے نابینا صاحب، سنبھل کر قدم بڑھائیے۔ آپ جس راستہ پر چل رہے ہیں، اس میں آپ کے آگے ایک کنواں ہے "۔ یہ فقرہ گرامر کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ اخلاق اور تہذیب کے معیار پر بھی پورا اترتا ہے۔ مگر یہ بظاہر صحیح فقرہ اس وقت بالکل بے معنی ہوگا جب کہ نابینا شخص کنوئیں کے عین کنارے پہنچ گیا ہو اور اندیشہ ہو کہ اس نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو وہ کنوئیں کے اندر جا گرے گا۔ ایسے نازک موقع پر دوسری تمام باتیں حذف ہوجاتی ہیں اور کہنے والا چلا اٹھتا ہے: "کنواں، کنواں"

ایسا ہی کچھ معاملہ خدائی پیغام رسانی کا ہے۔ بظاہر زندگی کے بے شمار مسائل ہیں۔ مگر ہر آدمی سب سے پہلے جس مسئلہ سے دوچار ہے، وہ موت ہے۔ موت کسی شخص کی زندگی کا وہ فیصلہ کن لمحہ ہے جب کہ اس سے عمل کی مہلت چھین لی جاتی ہے اور وہ اچانک ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں دو ہی چیزیں ہیں۔ یا جنت یا جہنم۔

موت کے معاملہ کی نزاکت اس وقت بے حد بڑھ جاتی ہے جب یہ دیکھا جائے کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ وہ کسی بھی وقت کسی بھی شخص کے لئے آسکتی ہے۔ ایسی حالت میں ایک بتانے والے کے پاس سب سے پہلی اور سب سے بڑی بات جو لوگوں کو بتانے کے لئے ہونی چاہئے، وہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو موت کے خطرہ سے آگاہ کرے۔

نجات کا راستہ

ایک شخص ہمہ تن اپنے ذاتی کاروبار میں لگا ہوا ہو تو اس کے پاس دوسروں کو دینے کے لئے صرف رسمی آداب رہ جاتے ہیں۔ یہی معاملہ خدا سے تعلق کا بھی ہے۔ دنیوی ترقی حاصل کرنا، اپنے بچوں کی خواہشات پوری کرنا، دنیا میں اپنے کو عزت اور سربلندی کے مقام پر دیکھنا، انسان کو اتنا زیادہ مرغوب ہیں کہ اس کا سارا وقت اور توجہ انھیں چیزوں میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے بعد رب العالمین کے لئے اس کے پاس جو چیز بچتی ہے، وہ صرف رسمیات ہیں۔ وہ بطور خود کچھ رسمی اعمال وضع کرلیتا ہے۔ یا خدا کی بتائی ہوئی عبادات کو بے روح کرکے ان کو ایک قسم کے رسمی ضمیمہ کے طور پر اپنی زندگی میں شامل کرلیتا ہے۔ اور پھر وقتی طور پر ان رسوم کی تعمیل کرکے اپنے دل کو مطمئن کرلیتا ہے کہ وہ خدا کا حق بھی ادا کررہا ہے۔

قرآن اس لئے اتارا گیا کہ خدا پرستی کے طریقوں میں لوگوں نے جو فرق ڈال رکھا ہے، اس کو واضح کرے اور صحیح طریقہ کی نشان دہی کردے (نحل ۔ ۶۴) قرآن جس زمانہ میں آیا، ساری دنیا میں کوئی نہ کوئی مذہب رائج تھا۔ کوئی قوم ایسی نہ تھی جو مذہب کی قائل نہ ہو۔ مگر ہر ایک نے خود ساختہ طور پر کچھ چیزوں کو مذہب اور خدا پرستی کا درجہ دے رکھا تھا ——— مذہب کو انھوں نے ایسی شکل دیدی تھی جو ان کی دنیا پرستانہ مصروفیات کے ساتھ جمع ہوسکے۔ جو ان کی زندگی کے بنے بنائے ڈھانچہ کو کھنڈت کرنے والا نہ ہو۔

لوگوں کا حال یہ تھا کہ وہ اپنی ساری توجہ اپنے دنیوی کاروبار میں لگائے رہتے اور اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے ایک مقدس جگہ پر جمع ہو کر تالیاں اور سیٹیاں بجا لیتے۔ ان کا خیال تھا کہ بس اتنی بات خدا کو راضی کرنے کے لئے کافی ہے (انفال ۔ ۳۵)۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ عبادت خانوں کی عمارتیں بنا کر اور لوگوں کو "دیگیں" کھلا کر اپنے خدا کو خوش کرلیں گے (توبہ ۔ ۱۹) کچھ لوگ خدا پرستی کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ انسانی ہنگاموں سے الگ ہو کر اپنے لئے تنہائی کا ایک گوشہ بنا لیا جائے اور وہاں بیٹھ کر خدا کے نام کی جپ کرلی جائے (حدید ۔ ۲۷) کچھ اور لوگ تھے جو خدا پرستی کا کمال یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں جن افکار و خیالات کا رواج ہو جائے، انھیں کے رنگ میں رنگ کر مذہب کو بھی پیش کردیا جائے (توبہ ۔ ۳۰) حتی کہ عرب میں ملت ابراہیمی کی باقیات کے طور پر روزہ، نماز، حج اور قربانی وغیرہ بھی کسی نہ کسی شکل میں پائی جاتی تھیں۔ مگر یہ تمام چیزیں بالکل بے روح شکل میں تھیں۔ وہ ایسی ہی تھیں جیسے کسی کے پورے ہاتھ میں ایک چھنگلیا لٹک رہی ہو، جس کا آدمی کی اصل ہستی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

قرآن نے اعلان کیا کہ ان میں سے کوئی بھی چیز وہ نہیں جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہو اور جس کے کرنے والے کو وہ آخرت کے انعامات سے نوازے (بقرہ ۔ ۱۷۷) اللہ کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے، وہ یہ کہ اس کے بندے اپنے خالق کو "کبیر" مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو "صغیر" بنالیں۔ یہ اصلاً ایک قلبی کیفیت ہے۔ انسان، اپنی حقیقت کے

اعتبار سے ایک نفسیاتی وجود ہے، اس لئے اس سے جو آخری عمل مطلوب ہو سکتا ہے، وہ بھی نفسیاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب سے بڑھ کر اپنے بندوں کے دل کو دیکھتا ہے۔ دل کا جھکاؤ، دل کا خوف، دل کی فروتنی ہی وہ چیز ہے جو کوئی بندہ اپنے رب کو پیش کرتا ہے ـــــ "اللہ کو تمھاری قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس کو تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے (حج - ۳۷)

تاہم انسان ایک ایسی مخلوق ہے کہ اس کے دل میں جو کیفیت ہو، وہ ضرور اس کے جسم اور اس کی خارجی سرگرمیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک شخص کو اپنے بیٹے سے پیار ہو تو اس کے عمل سے بھی اس پیار کا اظہار ہوگا۔ کوئی شخص سانپ سے ڈر رہا ہو تو اس کی حرکات بھی ضرور اس کی اس کیفیت کی گواہی دیں گی۔ اسی طرح خدا کے آگے اپنے آپ کو صغیر (چھوٹا) بنانا اگرچہ باعتبار حقیقت ایک قلبی حالت ہے۔ لیکن جب وہ کسی دل کے اندر واقعی معنوں میں پیدا ہو جائے تو اس کے اعضاء و جوارح اور اس کے حرکات و اعمال سے بھی لازماً اس کا اظہار ہوگا۔ نتیجۃً پوری زندگی اس کے دائرہ میں آتی چلی جائے گی۔

حقیقی خدا پرستی، جو آدمی کے لئے آخرت کی نجات کا ذریعہ ہوگی، یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کو پورے معنوں میں خالق، مالک، رب اور محاسب و مجازی تسلیم کرے۔ اس کے ساتھ کسی معاملہ میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ پھر دل و دماغ میں اس کی بڑائی کے احساس کو جگہ دے۔ اس کا اندرونی وجود، اس کی احسان مندی کے جذبہ سے سرشار ہو اور اسی کی طاقت و قوت کے خوف سے کانپتا رہے۔ پھر اس کا ہاتھ، اس کا پاؤں، اس کی آنکھ، اس کی زبان اور اس کے تمام اعضاء و جوارح اسی دائرہ کے اندر اپنے وظائف ادا کریں جو خدا نے اپنی شریعت میں ان کے لئے مقرر کیا ہے۔ اس کی پوری ہستی اس دعا کی عملی تفسیر بن جائے جو رکوع اور سجدہ میں پڑھنے کے لئے ہمیں تلقین کی گئی ہے:

اللّٰھُمّ خشع لک سمعی وبصری ومخی وعظمی وعصبی

خدایا تیرے لئے جھک گیا میرا کان، میری آنکھ، میرا مغز، میری ہڈی اور میرے اعصاب

اسی طرح انسانوں سے تعلقات اور دنیا کے مختلف معاملات میں وہ اسی رویہ کو اپنائے جو خدا نے بتایا ہے۔ اور اس رویہ سے پوری طرح بچتا رہے جس سے خدا نے منع کیا ہے ـــــ دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو دنیا کے پیچھے اپنی پوری زندگی لگا دے۔ اسی طرح آخرت کی نجات کا حق دار بھی وہی ہوگا جس نے اپنی زندگی کو اس کی راہ میں پوری طرح کھپا دیا ہو۔

پچھلے مذاہب میں بگاڑ کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھوں نے دیکھا کہ دنیا میں ہر غلطی کا نتیجہ ضرور نکلتا ہے۔ یہاں ایک غلطی کرنے کے بعد اس کے انجام سے بچنا ممکن نہیں۔ کوئی شخص غصہ میں آکر اپنے بیٹے کا ہاتھ کاٹ ڈالے تو وہ ہمیشہ کے لئے بے ہاتھ ہو جائے گا۔ اس کے بعد کا کوئی بھی عمل اس کے بیٹے کو دوبارہ ہاتھ والا نہیں بنا سکتا۔ اس پر قیاس کر کے سمجھ لیا گیا کہ اعمال کے اخروی نتائج بھی لازمی ہیں۔ ان سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں۔

اس ذہن نے مذاہب میں دو بڑے مدارس فکر پیدا کئے۔ ایک وہ جس کو تناسخ ارواح کہا جاتا ہے۔ اس فکر کے ماننے والوں نے یہ گمان کر لیا کہ آدمی بار بار جنم لے کر اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتتا رہتا ہے۔ انسان کی حالت میں اگر وہ غلطی کرے تو

دوسرے جنم میں وہ کسی نچلی مخلوق کی شکل میں اٹھتا ہے۔ اس طرح بے شمار جنموں میں اپنے اعمال کی پاداش بھگتنے کے بعد بالآخر جنت میں پہنچتا ہے۔

دوسرا ذہن جو اتنی لمبی سزا کو بھگتنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے کفارہ کا عقیدہ ایجاد کیا۔ اس عقیدہ کے مطابق، انسان کے گناہوں کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔ گناہ ایک ایسا عمل ہے جو ایک مرتبہ سرزد ہو جائے تو اس کے نتائج سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔ انسان کو اس لازمی عذاب سے بچانے کے لئے خدا نے یہ کیا کہ اس نے اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا۔ خدا کے بیٹے نے انسان کی صورت میں مجسم ہو کر تمام نوع انسانی کے گناہوں کو اپنے سر پر لے لیا اور اس کی تلافی کے لئے خود سولی پر چڑھ گیا۔ اس طرح گویا خدا خود قربان ہو کر نسل انسانی کے گناہوں کا کفارہ بن گیا۔

قرآن نے انسان کو اس عظیم الشان گمراہی سے نکالا اور صاف لفظوں میں اعلان کیا: "کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ یقیناً اللہ سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے (زمر ۔ ۵۳) اسلام نے بتایا کہ انسان اور اس کے عمل کے درمیان ایک اور ہستی ہے۔ یہ خدا ہے جو ساری قوتوں کا مالک ہے۔ اس کو اختیار ہے کہ جو چیز چاہے باقی رکھے، جو چیز چاہے مٹا دے۔ آدمی گناہ کرنے کے بعد اگر پلٹ آئے۔ وہ اپنی روش کی اصلاح کر کے خدا سے معافی مانگے تو وہ دوبارہ پاک صاف ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ ایسا ہو جاتا ہے گویا آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے باہر آیا ہے (کیوم ولدتہ امہ)

اسلام کے ذریعہ اللہ نے اپنی جن رحمتوں کا اعلان کیا ہے، وہ یہیں تک محدود نہیں — ان کا سلسلہ اس سے بہت آگے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بتایا گیا ہے کہ خدا کی رحمتیں اتنی وسیع ہیں کہ وہ کبھی خود تمھارے گناہوں کو نیکیوں کے خانہ میں لکھ دیتا ہے۔ اس کی قدرت کاملہ تمھاری غلطیوں کے اندر سے تمھارے لئے نئی کامرانی کے مواقع کھول دیتی ہے۔ یہ نہ صرف رحمت خداوندی کا انتہائی اعلیٰ تصور ہے۔ بلکہ یہ اصول خود انسانی نفسیات کو سمجھنے کا نیا دروازہ کھولتا ہے۔ اور انسان کو ان بے پایاں امکانات سے باخبر کرتا ہے جو اس کے خدا نے اس کے لئے اس کائنات میں رکھ دیئے ہیں۔

زید بن ثابت انصاری عربی زبان کے علاوہ فارسی، رومی، قبطی، حبشی اور سریانی زبانیں جانتے تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دیگر زبانوں میں جو خطوط آتے تھے، ان کا جواب لکھتے تھے۔

وہب بن منبہ عربی کے علاوہ یونانی زبان جانتے تھے۔ انھوں نے یمن میں رہ کر یہودیوں اور عیسائیوں کی تاریخ معلوم کی۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام میں انبیاء کے قصے لکھے۔

موسیٰ بن سیار اسواری کے متعلق جاحظ نے لکھا ہے کہ ان کو عربی اور فارسی دونوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ ان کی مجلس میں دائیں جانب عرب ہوتے تھے اور بائیں جانب ایرانی۔ وہ قرآن کی ایک آیت پڑھ کر عربوں کے لئے اس کی شرح عربی میں بیان کرتے، اور پھر بائیں جانب منھ پھیر کر ایرانیوں کے لئے فارسی میں تفسیر کرتے۔ اور یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس زبان میں زیادہ خوبی کے ساتھ بول رہے ہیں۔

ماہنامہ الرسالہ، کی دسمبر ۸۴ء کی اشاعت میں صفحہ ۳۸ پر مضمون "یہ تمثیل ہے نہ کہ واقعہ" نظر سے گزرا۔ اس مضمون سے یہ تاثر ملتا ہے کہ حدیث "فَإِنَّ مَرْأَةً خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ" یا حدیث "فَإِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ" میں ابہام پایا جاتا ہے۔ اور ان سے اصل مدعا واضح نہیں ہو پاتا یہ حدیثیں اپنی پوری شکل میں نقل نہ ہو کر مختصر منقول ہیں۔

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ جس حدیث کو مضمون میں مختصر کہا گیا ہے وہ مختصر نہیں مفصل ہے:

"مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يُؤْذِي جَارَهُ، وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَإِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ، وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ، فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ، وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ، فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا"

"جو اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتا ہو، اسے اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچانی چاہئے۔ اور عورتوں کے حق میں بھلائی کرنے سے میری وصیت قبول کرو، کیوں کہ وہ پسلی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ جو پسلی سب سے بڑی ہے وہ سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے۔ اگر تم اسے سیدھا کرنے میں لگو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ اور اگر یوں ہی رہنے دیتے ہو تو وہ ٹیڑھی رہے گی۔ پس عورتوں کے حق میں بھلائی کرنے کی میری وصیت قبول کرو۔" (اخرجہ البخاری)

دوسری روایت جس کو مضمون میں غیر مختصر قرار دیا گیا ہے، وہ یہ ہے:

"اَلْمَرْأَةُ كَالضِّلَعِ إِنْ أَقَمْتَهَا كَسَرْتَهَا، وَإِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَفِيهَا عِوَجٌ" بخاری

"عورت پسلی کی طرح ہے، اگر تم اسے سیدھی کرنا چاہو گے تو اُسے توڑ دو گے۔ اور اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہو تو ٹیڑھے پن کے ہوتے ہوئے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔"

یہ حدیث پہلی حدیث کے مقابلہ میں مفصل نہیں ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس میں "مِنْ ضِلَعٍ" (پسلی کی) کے بجائے "كَالضِّلَعِ" (پسلی کی طرح) کے الفاظ آئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک حدیث کو سمجھنے میں دوسری احادیث سے مدد ملتی یا مل سکتی ہے لیکن اس سے کسی حدیث کا مبہم یا غیر واضح ہونا ضروری نہیں ہے۔ خود قرآن کی بعض آیتوں کے سمجھنے میں دوسری آیتوں سے مدد ملتی ہے۔ حالاں کہ قرآن کی تمام آیات اپنی جگہ پر مکمل ہیں۔ انھیں ناقص نہیں کہہ سکتے۔

اگر ایک مضمون کی مختلف روایات میں الفاظ کا اختلاف

حدیث میں ہے: المرأۃ کالضلع (عورت پسلی کی مانند ہے) دوسری روایت کے الفاظ ہیں: انہن خلقن من ضلع (عورتیں پسلی کی بنی ہوئی ہیں)۔ دونوں روایتوں کا مفہوم ایک ہے۔ "پسلی" کا لفظ یہاں نسوانی فطرت کی تمثیل کے لئے ہے۔ یعنی عورت کے مزاج میں، بعض مصالح کی بنا پر، ایک قسم کا ٹیڑھ یا ضد رکھی گئی ہے۔ اس ٹیڑھ کو سمجھ کر اس سے نباہ کرو۔ اس کو سیدھا کرنا ایسا ہی ہے جیسے پسلی کے خم کو سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے۔ دوسری روایت میں "من" کا لفظ اسی مفہوم میں ہے جس میں قرآن کی آیت خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ میں "مِنْ" کا لفظ — الرسالہ

پایا جاتا ہے تو اس میں اس کا بھی امکان ہے کہ یہ مختلف الفاظ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہوں، کسی واقعہ کا ذکر آپؐ نے مختلف مواقع پر فرمایا ہو اور اس کے لئے الفاظ آپؐ نے مختلف استعمال کئے ہوں۔ خود قرآن میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ایک ہی شخص کا قول قرآن مختلف مقامات پر مختلف الفاظ میں نقل کرتا ہے لیکن اصل مفہوم اور معنی کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ عین ممکن ہے کہ "مِنْ ضِلَعٍ" اور "کَالضِّلَعِ" دونوں الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے ہوں کسی موقع پر آپؐ نے "مِنْ ضِلَعٍ" فرمایا ہو اور کسی دوسرے موقع پر "عَلَى الضِّلَعِ" فرمایا ہو۔ دونوں کا مفہوم ایک ہے

اور اگر دونوں میں سے ایک روایت راوی کے اپنے الفاظ میں منتقل ہوئی ہو، اس کے الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ ہوں، جب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ راوی کو قولِ رسولؐ کے سمجھنے میں کوئی دھوکا ہوا ہے یا روایت کرنے میں اس سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔ اس لئے کہ "مِنْ ضِلَعٍ" اور "کَالضِّلَعِ" میں جیسا کہ عرض کیا گیا مفہوم کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ "خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ" بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن میں ہے:

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ "بنا ہے انسان شتابی کا" یعنی انسان جلد باز خلوق ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے

وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا "اور انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔" (بنی اسرائیل: ۱۱)

قرآن سے ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ۝

"اللہ ہی ہے جس نے بنایا تم کو ضعف سے پھر اس ضعف کے بعد قوت بخشی پھر اس قوت کے بعد ضعیف اور بوڑھا بنایا، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

پوری آیت پڑھنے سے ظاہر ہے کہ "خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ" کا مطلب یہ ہے کہ انسان کمزور پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح "خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ" کا صاف مطلب یہ ہے کہ عورتیں کی بنی ہیں یعنی پسلی کی طرح ان میں کمزوری اور خم پایا جاتا ہے یہ نسوانی فطرت ہے۔ اس کا لحاظ ضروری ہے۔

(مولانا) محمد فاروق خاں۔ ۱۰ دسمبر ۷۹ء

زندگی کا راز

جو کم پر راضی ہو جائے
وہی زیادہ پاتا ہے ۔

جو زیادہ کے لئے دوڑے
وہ کم سے بھی محروم رہتا ہے
بھی ۔

کیسی عجیب ہے

یہ اسلامی سیاست!

پاکستان میں محمد ایوب خاں کی حکومت تقریباً گیارہ سال (۱۹۶۹ - ۱۹۵۸) رہی۔ اس زمانہ میں پاکستان کے اسلام پسندوں کا نعرہ یہ تھا کہ صدر ایوب کی "بنیادی جمہوریت" نے پاکستانی عوام کو، سیاسی اعتبار سے، دوسرے درجہ کا شہری بنا دیا ہے۔ بنیادی جمہوریت کے بجائے بالغ رائے دہی کے اصول کو پاکستان میں رائج ہونا چاہئے تاکہ جس کے حق میں عوام کے زیادہ ووٹ پڑیں وہ ملک پر حکومت کرے۔ محمد ایوب خاں کا انتخابی نظام، بنیادی طور پر، اگرچہ وہی تھا جو امریکہ میں کامیابی کے ساتھ رائج ہے، حتیٰ کہ یہ خود اسلام سے بھی قریب تر تھا۔ کیونکہ صدر اول میں خلیفہ کا انتخاب ارباب حل وعقد کرتے تھے نہ کہ تمام بالغ رائے دہندگان۔ تاہم پاکستان کے جذباتی نوجوانوں میں اس تحریک کو بہت سے حامی مل گئے۔ بے شمار نقصانات کے بعد جمہوری تحریک کامیاب رہی اور عوام کی کثرت رائے سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت قائم ہوئی۔ مسٹر بھٹو کو تقریباً چھ سال (۱۹۷۷ - ۱۹۷۱) پاکستان میں حکومت کرنے کا موقع ملا۔

جمہوریت کی بحالی کے باوجود پاکستان میں اسلام کے علم برداروں کو کرسی اقتدار پر جگہ نہ مل سکی۔ اب انھوں نے اپنی تحریک جاری رکھنے کے لئے دوسرے الفاظ تلاش کر لیا۔ اب ان کا کہنا تھا کہ مسٹر بھٹو نے دھاندلی سے الیکشن جیتا ہے۔ ورنہ پاکستان کے ۹۹ فی صد عوام ان کے خلاف ہیں۔ یہ بات عقل اور تجربہ کے لحاظ سے ناقابل فہم تھی۔ کسی ملک میں ایک شخص کے مخالفین کی تعداد اگر اتنی زیادہ ہو جائے جتنی کہ مسٹر بھٹو کی بتائی جاتی ہے تو دھاندلی کی کوئی بھی مقدار اس کو کامیاب نہیں کر سکتی۔ مگر پاکستان کے باشندے، خصوصاً مہاجر لوگ، شور و شر کی سیاست سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسلام پسندوں کو دوبارہ اپنے نئے نعرہ کے لئے بہت سے ساتھی مل گئے۔ انھوں نے انتخابی دھاندلی کے خلاف زبردست طوفان برپا کر دیا۔ اب ہا ارب روپیہ کے نقصان کے بعد بالآخر ان کی تحریک کامیاب رہی۔ فوجی افسروں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ۵ مارچ ۱۹۷۷ کو حکومت کی کرسی پر قبضہ کر لیا ــــ انتخابی دھاندلی کو دور کرنے کی کوشش میں فوجی دھاندلی وقوع میں آگئی۔ مسٹر بھٹو نے چند سیٹوں پر دھاندلی کر کے اپنی سیٹوں کی تعداد کو بڑھایا تھا۔ فوجی افسروں نے انتخابات کا تکلف کئے بغیر ہی بزور تخت اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

پاکستان کے نئے حکمراں جنرل ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ ۱۸ اکتوبر کو نیا الکشن ہوگا۔ مگر اب پاکستان کے اسلام پسندوں پر ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ مسٹر بھٹو، وزیر اعظم کے عہدہ سے معزول ہونے کے بعد، دھاندلی کی طاقت سے محروم ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود ان کے جلسے اور جلوسوں میں عوام کی سب سے زیادہ بھیڑ جمع ہو رہی تھی۔ اسلام کے علم برداروں کو اندیشہ ہوا کہ اگر الکشن ہوتا ہے تو مسٹر بھٹو دوبارہ کسی "دھاندلی" کے بغیر ہی کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کی اسلام پسندی نے یہاں بر وقت ان کی مدد کی اور وہ ایک نیا مفید مطلب نعرہ ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ نعرہ تھا: "پہلے احتساب، پھر انتخاب"۔

* یہ نعرہ پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے لیے بروقت قیمتی مدد ثابت ہوا۔ کیوں کہ وہ بھی ٹھیک اسی سیاسی مشکل میں گرفتار تھے جس میں پاکستان کے اسلام پسند گرفتار ہیں۔ اندر ملہوترا نے پاکستان کے موجودہ سیاسی حالات پر ایک تبصرہ شائع کیا ہے۔ اس میں وہ بجا طور پر لکھتے ہیں کہ جنرل ضیاء الحق موجودہ حالات میں صرف اپنی موت کی قیمت ہی پر الیکشن کر سکتے تھے۔ کیوں کہ سارے امکانات بتا رہے تھے کہ الیکشن کا نتیجہ بھٹو کے حق میں برآمد ہوگا۔ اور بھٹو کی کامیابی کے معنی ہیں جنرل ضیاء الحق کی موت:

EITHER THE GENERAL (ZIA) ELIMINATES MR. BHUTTO OR HE SHOULD BE PREPARED FOR HIS OWN ELIMINATION.

جنرل ضیاء الحق یا تو مسٹر بھٹو کو ختم کر دیں۔ یا پھر انھیں خود اپنے خاتمہ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

(ٹائمس آف انڈیا ۳۰ نومبر ۱۹۷۷)

علم برداران اسلام کے مطالبہ نے فوجی حکمرانوں کو موقع دے دیا کہ وہ اپنے اوپر ذمہ داری لئے بغیر "۱۸ اکتوبر" کے الکشن کو غیر متعین مدت تک کے لئے ملتوی کر سکیں۔ انھوں نے فوراً اس مطالبہ کو مان کر الکشن کے التوا کا اعلان کر دیا۔ اور مجرمین کے "احتساب" کے مقدس فریضہ میں مشغول ہو گئے۔

تاہم یقینی ہے کہ "عمل احتساب" کی تکمیل بھی اسلام کے علم برداروں کے لئے تخت اقتدار تک پہنچنے کا زینہ نہ بن سکے گی۔ اب دیکھنا ہے کہ ان کا زرخیز سیاسی ذہن اس کے بعد کون سا نیا نعرہ تلاش کرتا ہے۔

دسمبر ۱۹۷۷ کے پہلے ہفتہ میں خان عبدالولی خاں کی بھائی نے پاکستان کو دوبارہ دس سال پہلے والی سیاست کی طرف لوٹا دیا ہے۔ اُس وقت محمد ایوب خاں کے زور کو توڑنے کے لئے بنگالی لیڈر کو باہر لایا گیا تھا۔ اب مسٹر بھٹو کا زور توڑنے کے لئے پختونی لیڈر کو میدان سیاست میں داخل کیا گیا ہے۔ اگر یہی اسلامی سیاست ہے تو مجھے نہیں معلوم کہ غیر اسلامی سیاست پھر کس دوسری چیز کا نام ہوگی۔

حضرت عثمان کی خلافت کے زمانہ میں مصر سے جزیہ کی آمدنی ایک کروڑ بیس لاکھ درہم سالانہ تھی۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں وہ صرف پچاس لاکھ رہ گئی۔ کیوں کہ مصر کے قبطی عیسائی اس مدت میں کثرت سے مسلمان ہو گئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں یہ رقم اور بھی کم ہو گئی۔ مصر کے حاکم نے ان کو لکھا کہ "قریب ہے کہ مصر کے تمام ذمی مسلمان ہو جائیں اور جزیہ کی آمدنی بالکل بند ہو جائے" خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا: اگر ایسا ہوا تو میں بہت خوش ہوں گا۔ کیوں کہ اللہ نے اپنے رسول کو داعی اسلام بنا کر بھیجا تھا نہ کہ محصول وصول کرنے والا"۔ خراسان کے عامل نے ایک بار لکھا کہ "بہت سے لوگ جو مسلمان ہو گئے ہیں، انھوں نے جزیہ سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ایسا کیا ہے"۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں اس نے لکھا کہ "یہ لوگ کلمہ پڑھ لیتے ہیں مگر ختنہ نہیں کراتے" عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا: "اللہ نے اپنے رسول کو داعی بنا کر بھیجا، خاتن بنا کر نہیں بھیجا"

مسلمان اگر دوسری قوموں سے دنیوی حقوق کا جھگڑا شروع کر دیں تو یہ رسول کے ساتھ غداری کے ہم معنی ہوگا۔ خواہ وہ رسول پہ درود وسلام پڑھ کر ایسا کر رہے ہوں۔

ایک لطیفہ

ڈاکٹر پرمود کمار نے دہلی سے امراض نسواں (GYNAECOLOGY) میں خصوصی ڈگری لی اور اس کے بعد لندن (آکسفورڈ اسٹریٹ) میں اپنا مطب کھولا۔ ایک روز ایک انگریز خاتون تیزی سے ان کے مطب میں داخل ہوئی۔ "ڈاکٹر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنی بات کو کس طرح بیان کروں" اس نے کہا اور پھر ایک وقفہ کے بعد بولی:

I THINK I HAVE A TOUCH OF THE SUN

ڈاکٹر کمار نے اس جملہ کا مطلب یہ سمجھا کہ خاتون غالباً کسی کھلے مقام پر گئی تھیں اور وہاں ان کو تیز دھوپ لگ گئی ہے۔ "آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں" ڈاکٹر نے مریضہ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا "آپ ٹھنڈے مشروبات، خاص طور پر لیموں برف کے ساتھ لیجئے اور آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی،، اگر جلد پر کچھ اثر محسوس ہو تو زیتون کا تیل یا کریم مل لیجئے۔"

خاتون پریشان چہرہ پر مزید حیرانی کے اثرات لئے ہوئے باہر نکل گئی اور ڈاکٹر کمار یہ سوچنے لگے "انگریز خواتین آخر اتنی معمولی معمولی باتوں کے لئے کیوں ڈاکٹر کے پاس آتی ہیں"

شام کو وہ اپنی قیام گاہ پہنچے۔ وہاں مسز گلوریا، ان کی انگریز بیوی نے ان کا استقبال کیا۔ جب دونوں کھانے کی میز پر اکٹھا ہوئے تو انگریز خاتون نے دوبارہ وہی جملہ کہا جس کو وہ اپنے مطب میں ابھی سن آئے تھے:

DARLING, I THINK I HAVE
A TOUCH OF THE SUN

ڈاکٹر کمار نے حیرانی کے ساتھ کہا "نہیں نہیں۔ اس طرح تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ لندن کی خواتین ہر وقت بس سورج کی ہی بات کرتی ہیں۔ دیر تک الفاظ کے تبادلہ کے بعد گلوریا نے محسوس کیا کہ اس کا ہندوستانی شوہر اصل بات کو سمجھ نہیں رہا ہے، اس نے ہنستے ہوئے کہا "میرا مطلب یہ ہے کہ ہم جلد ہی تین ہونے والے ہیں۔" انگریزی زبان میں ایک عورت اپنے حاملہ ہونے کو درجنوں طریقے سے بتا سکتی ہے۔ مذکورہ بالا جملہ بھی اسی قسم کا ایک استعاراتی انداز ہے۔ جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "مجھے سورج چھو گیا ہے"

اعلان

الرسالہ ایک تعمیری جدوجہد بھی ہے اور ایک تاریخ بھی۔ اس کی مستقل اہمیت کی بنا پر اس کی مجلد فائل فراہم کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ فی الحال الرسالہ کے ابتدائی دس شمارے (نمبر ا سے لے کر نمبر ۱۰ تک) محدود تعداد میں عمدہ جلد میں مجلد کرائے گئے ہیں۔ جو لوگ مکمل فائل محفوظ رکھنے کا شوق رکھتے ہوں، وہ اس کو قیمتاً حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک جلد (شمارہ نمبر ا — ۱۰) کی قیمت مع محصول ڈاک ۲۵ روپے ہے
قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیج کر طلب فرمائیں۔

منیجر

"الاسلام" کے بعد ادارۃ الرسالہ کی دوسری کتابی پیش کش

ظہور اسلام

عنقریب شائع ہونے والی ہے

صفحات ۲۰۰ سے زائد

قیمت (تخمینی) چھ روپے

قرآن پہلی کتاب ہے جس نے انسانی تاریخ میں دور نثر کا آغاز کیا۔ علمی طرز فکر کی بنیاد رکھی اور سائنٹفک استدلال کو رائج کیا۔ موجودہ دور کا علمی انقلاب، قرآن ہی کے پیدا کردہ انقلاب کا نتیجہ ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ قرآن کے حاملین اس انقلاب کو سمجھنے میں سب سے پیچھے ہیں ——— وہ ابھی تک شعر و شاعری کی فضا سے نکل نہ سکے۔ حتیٰ کہ ان کی نثر بھی خطابت اور شاعری کی ایک صورت ہوتی ہے۔ سائنٹفک استدلال میں ان کے پیچھے ہونے کا حال یہ ہے کہ ان کے علماء اب بھی سائنٹفک استدلال اور مغرب زدگی کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کی اس علمی پس ماندگی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ دور جدید کے معیار فکر پر ابھی تک اسلام کا علمی اظہار نہ ہو سکا۔ ہر دور کا ایک اسلوب اور ایک فکری معیار ہوتا ہے اور ہر دور کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنے دور کے فکری معیار پر خدا کے دین کا اعلان عام کریں۔ مگر مسلمان جب خود ہی کسی پس ماندگی میں مبتلا ہوں تو وہ اس ذمہ داری کو کس طرح ادا کر سکتے ہیں۔

الاسلام

مؤلفہ :

مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۲۴۰ — قیمت مجلد مع پلاسٹک کور بارہ روپے

قیمت مجلد بغیر پلاسٹک کور دس روپے

دین کی حقیقت، تعلیمات قرآن کی حکمتیں، سیرت رسول کا انقلابی سبق موجودہ زمانہ میں اسلام کے مسائل، دین کا تجدید و احیاء امت مسلمہ کی تعمیر، دعوت اسلامی کے جدید امکانات —

ان موضوعات کے گہرے مطالعہ کے لئے "الاسلام" پڑھیے۔

جدید سائنٹفک اسلوب میں، نہایت دلچسپ اور معلومات سے بھرپور۔

قارئین الرسالہ کے مسلسل اصرار پر قیمت میں غیر معمولی کمی

تاجروں اور ایجنٹوں کے لئے خصوصی کمیشن

کتاب کی روانگی کا خرچ ادارہ کے ذمہ ہوگا

الدار العلمیہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی-۶

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. D (D) 532
REGR. N. NO. 28822/76
JANUARY 1978

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi-110006 (India)

کتاب سبز

از معمر القذافی

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

[illegible]

[illegible]

فہرست

حدیث میں ہے کہ آدمی کبھی ایک بھوکے اور پیاسے کو نظر انداز کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں ایک معمولی آدمی کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ حالانکہ وہ رب العالمین کو نظر انداز کر رہا ہوتا ہے۔

اسی طرح آدمی کبھی ایک پیغام کو نظر انداز کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں ایک معمولی آدمی کی بات کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ حالاں کہ وہ رب العالمین کی بات کو نظر انداز کر رہا ہوتا ہے۔

ایسے لوگوں کی نفسیات دنیا میں تو یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو ہوشیار اور کامیاب سمجھتے ہیں۔ اپنے عمل پر شرمندہ ہونے کے بجائے فاتحانہ انداز سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر جب وہ مرنے کے بعد آخرت کے عالم میں کھڑے کئے جائیں گے تو انھیں دکھائی دے گا کہ ان سے زیادہ نادان اور کوئی نہ تھا۔ ان کو ایسا محسوس ہوگا گویا زمین و آسمان نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اس وقت وہ جانیں گے کہ دنیا میں اپنی جس زندگی پر وہ نازاں تھے، خدا کی نظر میں اس کی کوئی قیمت نہ تھی۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی سنتِ امتحان تھی جس نے ان کو زمین میں زندگی کا موقع دے رکھا تھا۔ امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد ان کو اپنا وجود اس سے بھی زیادہ بے حقیقت نظر آئے گا جتنا کہ مکھی اور مچھر۔

جب کسی کے لئے یہ موقع نہ ہوگا کہ حق کو ٹھکرا کر بھی وہ حق کا چیمپین بنا رہے

کسی کے اسلام نے اس کو یہ اطمینان عطا کیا ہے کہ جنت کے محلات اس کے لئے مقدر ہیں۔ کسی کے اسلام نے اس کو تقریر و خطابت کا شاندار عنوان دے رکھا ہے۔ کسی کا اسلام اس کو انقلاب عالم کا چیمپین بنائے ہوئے ہے۔

بخدا یہ وہ اسلام نہیں جس کو رسول اور اصحاب رسول نے پایا تھا۔ لوگ اگر اس اسلام کو پالیں تو ان کی زبانیں بند ہو جائیں۔ ان کی آنکھیں آنسو بہائیں اور ان کے دل خدا کے خوف سے لرز اٹھیں۔ روشنی کے بجائے تاریکی اور پر رونق مجالس کے بجائے تنہائیاں ان کی محبوب ترین چیز بن جائیں۔ دوسروں کے سامنے شاندار تقریروں کا کرشمہ دکھانا ان کو بے ہودہ فعل معلوم ہونے لگے۔ اپنی غلطیوں اور حماقتوں کا جائزہ لینے میں وہ اتنا مشغول ہوں کہ دوسروں کے پیچھے دوڑنے کی انھیں فرصت نہ رہے۔

آج کی دنیا میں آدمی کھاتا پیتا ہے۔ گھر بناتا ہے۔ عہدے اور مناصب حاصل کرتا ہے۔ اعزازات وصول کرنے کے لئے دوڑتا ہے۔ یہ صورت حال اس کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہے۔ وہ اپنی موجودہ حیثیت کو مستقل حیثیت سمجھ بیٹھا ہے۔ حالانکہ اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک بے زور کیڑا ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب کہ اس کی یہ تمام اضافی حیثیتیں چھین لی جائیں گی۔ حتیٰ کہ لباس بھی اتار لیا جائے گا جو آدمی کے اثاثہ کی آخری چیز ہوتا ہے۔ وہ اچانک اپنے آپ کو اس حال میں پائے گا کہ وہ "ننگے جسم، ننگے پاؤں اور غیر مختون" حالت میں رب العالمین کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔

اس دن ساری اونچ نیچ مٹ جائے گی۔ خوف و دہشت سے لوگوں کی زبانیں بند ہو چکی ہوں گی۔ آدمی کے اپنے وجود کے سوا ہر چیز اس کا ساتھ چھوڑ دے گی۔ کسی کے لئے یہ موقع نہ ہوگا کہ حق کے پیغام کو نظر انداز کر کے بھی حق کا ٹھیکیدار بنا رہے ——— اس آنے والے دن کو جو آج دیکھ لے، وہی کامیاب ہے۔ جو شخص اسے کل دیکھے گا، اس کے لئے اس کے سوا کوئی انجام نہیں کہ وہ "ابد تک روتا اور دانت پیستا رہے"۔

قبولیت دعا میں تاخیر

جاء فی الآثار ان العبد اذا دعا ربه وهو یحبه قال :
یا جبریل لا تعجل بقضاء حاجة عبدی فانی احب ان اسمع صوته

ابن رجب حنبلی، جامع العلوم والحکم، مکتبۃ الریاض الحدیثہ، قاہرہ ۱۹۶۲، صفحہ ۳۴۲

بندہ جب اپنے رب کو پکارتا ہے اور وہ اس کو محبوب ہوتا ہے تو وہ فرماتا ہے :
اے جبریل، میرے بندے کی حاجت پوری کرنے میں جلدی نہ کر۔ مجھے محبوب ہے کہ میں اس کی آواز کو سنوں۔

جاحظ اور حریری

جاحظ (م ۲۵۵ھ) بصرہ میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے وقت کا زبردست عالم اور بے مثل ادیب تھا۔ علم کلام میں اس نے ایک مستقل مدرسۂ فکر پیدا کیا جس کو جاحظیہ کہا جاتا ہے۔ اس نے مختلف فنون پر ۲۰۰ کتابیں لکھی ہیں۔ استاذ ابن العمید (م ۳۶۰ھ) نے اس کی تصنیفات کے بارے میں کہا ہے: "وہ اولاً عقل اور ثانیاً ادب سکھاتی ہیں" اس نے حیوانات، نباتات، اخلاقیات، اجتماعیات اور دوسرے موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کی شائع شدہ کتابیں حسب ذیل ہیں :

کتاب البیان والتبیین
کتاب الحیوان
کتاب المحاسن والاضداد
کتاب البخلاء

علم وادب کے کمال کے باوجود وہ نہایت بدشکل انسان تھا۔ بے ڈول جسم، بھدا چہرہ، بدوضع ابھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ دیکھنے والے کو عجیب الخلقت دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں کا ابھار اتنا نمایاں تھا کہ اس کی وجہ سے اس کا لقب جاحظ (ابھری آنکھوں والا) پڑ گیا۔ اس کا اصل نام ابوعثمان عمرو بن بحر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ متوکل باللہ نے جب اس کے علم وادب کی تعریف سنی تو اس کو اپنے لڑکے کا اتالیق بنانے کے لئے سرمن رائے (عراق) اپنے پاس بلایا۔ مگر جب اس کی بھدی صورت دیکھی تو اس کو سخت کراہت ہوئی۔ اس نے جاحظ کو دس ہزار درہم دے کر واپس کر دیا۔

مشہور ادیب حریری (۴۴۶ - ۵۱۶ھ) بھی نہایت بدشکل اور پستہ قد آدمی تھا۔ ایک آدمی اس کی شہرت سن کر دور سے اس سے ادب سیکھنے آیا مگر اس کی صورت دیکھ کر بھڑک گیا۔ اس پر حریری نے اس کو کچھ اشعار لکھوائے جس کا ایک مصرعہ یہ تھا :

مثل المعیدی فاسمع بی ولا ترنی

(میں معیدی کی طرح ہوں۔ میری باتیں سنو شکل نہ دیکھو)

جو کچھ تم کو دیا گیا ہے، وہ محض دنیا کی زندگی کو برتنے کے لئے ہے۔ اور جو کچھ اللہ کے یہاں ہے، وہ زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لائے اور جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں۔ اور جب غصہ آجاتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور نماز کی پابندی کی۔ اور جو اپنے معاملات آپس کے مشورہ سے چلاتے ہیں۔ اور ہم نے جو رزق ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ کہ جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ برابر کا بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو ظلم ہونے کے بعد برابر کا بدلہ لے، اس کو کوئی الزام نہیں۔ الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔ شوریٰ ۴۳-۳۶

جس کو ڈر ہوگا وہ نصیحت پکڑے گا۔ اور اس سے گریز کرے گا وہ بدبخت جس کو بڑی آگ میں جانا ہے۔ پھر وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ جئے گا۔ کامیاب ہو گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز ادا کی۔ مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔ اعلیٰ ۱۷-۱۰

انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزماتا ہے اور اس کو عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو عزت دار بنایا۔ اور جب اس کو دوسری طرح آزماتا ہے اور اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ تم لوگ یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے۔ محتاج کو کھانا دینے کی آپس میں تاکید نہیں کرتے۔ میراث کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ اور مال کی محبت میں بری طرح پڑے ہوئے ہو۔ ہرگز نہیں۔ جب زمین کو توڑ توڑ کر ریزہ کر دیا جائے گا۔ اور تمہارا رب ظاہر ہوگا اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے۔ اور جہنم اس روز سامنے لائی جائے گی۔ اس دن انسان کو سمجھ آجائے گی۔ مگر اب سمجھ آنے کا موقع کہاں۔ آدمی کہے گا کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لئے آگے کچھ بھیجا ہوتا۔ اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں۔ اور جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں۔ اے اطمینان والی روح! چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اللہ سے راضی، اللہ تجھ سے راضی۔ شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔ فجر ۳۰-۱۵

تباہی ہے ہر اس شخص کی جو عیب نکالتا ہے اور غیبت کرتا ہے۔ جس نے مال جمع کیا اور اس کو گن گن کر رکھا۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہرگز نہیں۔ وہ شخص تو روندنے والی جگہ میں پھینک دیا جائیگا۔ اور تم کیا جانو کہ وہ روندنے والی جگہ کیا ہے۔ وہ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک جا پہنچے گی۔ وہ ان پر بند کر دی جائے گی۔ اونچے اونچے ستونوں میں۔ ہمزہ ۵

"ہم نے اپنے رسول نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری۔ تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں" (حدید ۲۵) قرآن کا یہ ارشاد بتاتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے کیا مطلوب ہے۔ وہ مطلوب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے دائرہ میں دوسروں کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرے جو انصاف کے مطابق ہے۔ اس کا ہر عمل خدائی شریعت کی ترازو میں تلا ہوا ہونا چاہئے۔ لینا ہو یا دینا، دونوں حالتوں میں وہ لوگوں کے حقوق کی پوری پوری ادائگی کرے چنانچہ ارشاد فرمایا:

اے ایمان والو، انصاف پر خوب قائم رہو اور اللہ کی گواہی دینے والے بنو۔ اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو (نساء ۱۳۵) بندۂ مومن کی اگر کسی شخص سے ان بن ہو جاتی ہے، تب بھی اس کے عادلانہ رویہ میں فرق نہیں آتا۔ خدا کا ڈر اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہر حال میں وہی کرے جو حقیقۃً انصاف کا تقاضا ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ ۔ ۸)

کسی کی عداوت کے باعث انصاف کو نہ چھوڑو، انصاف کرو۔ یہی بات تقویٰ سے لگتی ہوئی ہے۔

تاہم خود انصاف پر چلنا جتنا مطلوب ہے، اتنا ہی یہ بات غیر مطلوب ہے کہ آدمی دوسروں کے خلاف انصاف کا جھنڈا لے کر کھڑا ہو جائے۔ ہر شخص سے اپنی ذات کے بارے میں خدا کے یہاں پوچھ ہونی ہے اور ہر شخص کی اصلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں انصاف کو اپنائے۔ وہ خواہ حاکم کی پوزیشن میں ہو یا محکوم کی، ہر حال میں دوسروں کو اس سے انصاف ملے۔

اس کے بعد اگر کسی کو نظر آتا ہے کہ اس کا بھائی، خواہ وہ فرد ہو یا جماعت، بے انصافی کی روش پر چل رہا ہے، تو ان کے لئے اس کے اندر نصیحت (خیر خواہی) کا جذبہ ابھرنا چاہئے نہ کہ ایجی ٹیشن اور محاذ آرائی کا۔ اس کو چاہئے کہ اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح کے لئے اللہ سے دعا کرے حکمت اور خیر خواہی کے ساتھ ان کو بھلائی کی تلقین کرے۔ ان کی اصلاح کے لئے وہی مشفقانہ طریقہ اختیار کرے جو وہ اپنی عزیز اولاد کی اصلاح کے لئے کرتا ہے۔ اس کے بجائے احتجاجی سیاست چلانا اور انصاف کا جھنڈا لے کر کھڑا ہو جانا کسی طرح صحیح نہیں۔ اس قسم کا ہر اقدام صرف بگاڑ میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ کسی بھی درجہ میں حالات کو سدھارنے والا نہیں بن سکتا۔

اصحاب رسول : وہ کیسے لوگ تھے

عمرو بن العاص اور خالد بن الولید صفر ۸ ھ میں اسلام لائے۔ عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ میں مدینہ جاتے ہوئے
ھدہ پہنچا تو راستہ میں دو آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ میں نے دیکھا تو ان میں سے ایک خالد بن الولید تھے۔ دونوں
میں جو گفتگو ہوئی، اس کا ایک حصہ یہ تھا:

قلت این تدید، قال محمد، دخل الناس فی الاسلام فلم یبق احد بہ طعم (اخرجہ البیہقی من طریق الواقدی)

عمرو بن العاص نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے۔ خالد بن الولید نے جواب دیا محمد کے پاس جا رہا ہوں۔ لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ کوئی چاشنی والا آدمی باقی نہیں رہا۔

جل ذو طعم کا مفہوم عربی زبان میں تقریباً وہی ہے جو انگریزی میں (MAN OF TASTE) کا۔ اردو میں اس کو
صاحب ذوق کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں تمام کارنامے انھیں لوگوں نے انجام دیئے ہیں جن کے اندر یہ مزاج
کہ وہ "ذوق" کے تحت رد و قبول کا فیصلہ کرتے ہوں۔ باقی وہ لوگ جو فائدوں اور مصلحتوں کے تحت چلتے ہوں، وہ
ہمیشہ اپنی ذات کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ ان پر نہ زندگی کے بڑے بڑے حقائق کھلتے اور نہ ان سے کسی بڑے کام کی
ید کی جا سکتی۔

عرب میں جو انسانی گروہ جمع تھا، وہ اس صلاحیت کی اعلیٰ ترین مثال تھا۔ یہ انتہائی اونچی طبیعت کے لوگ
۔ اپنے دشمن کے خلاف وہ ہر قسم کا تشدد کر سکتے تھے۔ مگر وہ اپنی آن کو کبھی چھوڑتے نہ تھے۔ کسی بھی حال میں ان
کسی ذلیل حرکت کی امید نہ کی جا سکتی تھی۔ عرب کردار کی شہادتیں تاریخ میں کثرت سے موجود ہیں۔ یہاں بطور نمونہ صرف
واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ایران کی ساسانی سلطنت اور روم کی بازنطینی سلطنت دو بڑی حریف حکومتیں تھیں۔
یں اکثر جنگ جاری رہتی تھی۔ ساتویں صدی کے ربع اول میں ان کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں یہاں تک کہ
۶۰ میں ایرانیوں نے رومیوں کے اوپر غلبہ حاصل کر لیا۔ رومی سلطنت کے تقریباً تمام مشرقی مقبوضات، اردن،
، فلسطین، عراق، مصر، سب ایرانیوں کے قبضہ میں چلے گئے۔ اور رومی شہنشاہ قسطنطنیہ میں پناہ گزیں ہو گیا۔
یہ ٹھیک وہی وقت تھا جب کہ مکہ میں اسلام اور غیر اسلام کی کش مکش اپنی شدید ترین شکل میں جاری تھی۔
، حالات میں اہل کتاب رومیوں کے مقابلہ میں بت پرست ایرانیوں کی فتح مکہ کے لوگوں کے لئے گفتگو کا خصوصی
ع بن گئی۔ مشرکین نے اس سے اپنی فتح کا شگون لیا اور مسلمانوں سے کہا کہ جس طرح پڑوس میں ہمارے بت پرست
ں نے آسمانی کتاب کے حاملین پر غلبہ حاصل کیا ہے، اسی طرح ہم بھی تمھارے اوپر غالب آ جائیں گے۔ عین اس
قرآن کی سورہ نمبر ۳۰ اتری اور اعلان کیا کہ چند سالوں کے بعد دوبارہ حالات بدلیں گے اور رومی، ایرانیوں

کے اوپر غالب آ جائیں گے۔

سورہ روم کی ان آیتوں نے مکہ کے مخالفوں کو اسلام کا مذاق اڑانے کا نیا موضوع دے دیا۔ ابی بن خلف نے ابوبکر صدیق سے کہا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر تم کو یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا تو مجھ سے شرط کر لو۔ چنانچہ دونوں کے درمیان یہ شرط ہوئی کہ رومی اگر دوبارہ غالب آ گئے تو ابی بن خلف ایک سو اونٹ دے گا۔ اور اگر اس کے خلاف ہوا تو ابوبکر صدیق ایک سو اونٹ ادا کریں گے۔

اس کے بعد قریش کے ساتھ مسلمانوں کی کشمکش اور زیادہ بڑھی یہاں تک کہ ہجرت ہوئی اور ۶۲۴ء میں جنگ بدر پیش آئی۔ اس جنگ میں قریش کے اکثر سردار مارے گئے جس نے اسلام کے خلاف ان کے غصہ کو جنون کی حد تک پہنچا دیا۔ عین اس وقت (۶۲۴ء میں) قیصر روم نے ایرانیوں کو نینوا (عراق) کے مقام پر فیصلہ کن شکست دی اور اپنے تمام چھینے ہوئے علاقے ایرانیوں سے واپس لے لئے —— قرآن کی پیشین گوئی پوری ہو گئی۔ ابوبکر صدیق اس وقت مدینہ میں تھے۔ آپ نے ابی بن خلف کے پاس مکہ میں پیغام بھیجا کہ قرآن کی بات صحیح ثابت ہوئی، اس لئے تم شرط کے مطابق ایک سو اونٹ ادا کر دو۔ یہ پیغام مکہ پہنچا تو وہاں کسی نے اس کی مخالفت نہ کی۔ نہ تاویل و توجیہ کے ذریعہ اس کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں سے تمام تر دشمنی کے باوجود، مکہ سے ایک سو اونٹ مدینہ بھیج دیئے گئے۔ جب یہ اونٹ مدینہ پہنچے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق سے فرمایا ان کو صدقہ کر دو —— حق بات کو مان لینا، خیر میں داخلہ کا دروازہ ہے اور یہ صفت قدیم عربوں کے اندر کمال درجہ میں موجود تھی۔

یہی وہ عرب تھے جن کے بہترین حصہ کو کاٹ کر (آل عمران ۱۲۷) اسلام میں شامل کیا گیا تھا، جن کو آج ہم اصحاب رسول کہتے ہیں۔ یہ لوگ جب اسلام میں آئے تو ان کی صلاحیتوں میں اور زیادہ جلا پیدا ہوا۔ وہ ایسے عظیم اوصاف کے مالک بن گئے جیسے اوصاف والے لوگ نہ اس سے پہلے زمین پر آباد ہوئے نہ اس کے بعد دوبارہ دیکھے گئے۔ جاہلیت کے بہتر لوگ اسلام کے بہتر لوگ بن گئے۔ (خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا، متفق علیہ)

اسلام کا مقصد، آدمی کو مادیات کی سطح سے اٹھا کر روحانیات کی سطح پر پہنچانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ زندگی کی اس سطح پر پہنچ جائے جہاں اس کی اپنی فکری سطح اور عالم حقیقت کی سطح دونوں ایک ہو جائیں۔ جب آدمی اس مقام پر پہنچتا ہے تو ایک طرف وہ فیضان الٰہی کا مہبط بن جاتا ہے۔ دوسری طرف ظواہر کا پردہ اس کے لئے اس طرح کالعدم ہو جاتا ہے کہ وہ حقائق کو بے نقاب حالت میں دیکھنے لگتا ہے۔

زندگی کی اس سطح پر پہنچنے کی واحد شرط یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کے خول سے باہر آ جائے۔ وہ اپنے آپ سے الگ ہو کر اپنے آپ کو دیکھنے لگے۔ جب آدمی اپنے خول سے باہر نکل آتا ہے تو وہ فیضان الٰہی کی براہ راست زد میں آ جاتا ہے۔ حقائق خواہ اِس دنیا کے ہوں یا اُس دنیا کے، اس کے لئے اس طرح جانی پہچانی چیز بن جاتے ہیں جس طرح کسی ماں کے لئے اس کی اولاد۔ مگر یہ مقام بلند صرف بلند فطرت لوگوں کو ملتا ہے۔ اس مقام پر پہنچنے کے لئے اپنے آپ کو جس طرح کچلنا پڑتا ہے، اس کی ہمت صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو تمام مصالح و مفادات سے اوپر اٹھ کر

سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ پست فطرت لوگ کبھی اپنی ذات کے خول سے نکل نہیں پاتے۔ اس لئے وہ اسلام کے اونچے مقام کا تجربہ بھی نہیں کر سکتے:

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ — حٰمٓ سجدہ ۔ ۳۵

اور یہ بات انھیں کو ملتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیب والا ہے۔

معاصرین کی رائے:

اصحاب رسول کے بارے میں یہاں ان کے بعض معاصرین کے تاثرات نقل کئے جاتے ہیں۔

عن عبد اللہ بن مسعود قال ان اللہ نظر فی قلوب العباد فاختار محمدا صلی اللہ علیہ وسلم فبعثہ برسالتہ وانتخبہ بعلمہ، ثم نظر فی قلوب الناس بعدہ فاختار اللہ لہ اصحابا فجعلھم انصار دینہ و وزراء نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم — ابن عبد البر، الاستیعاب، جلد ۱، صفحہ ۶

عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں۔ اللہ نے بندوں کے دلوں کو دیکھا۔ پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چن لیا۔ پیغمبری کے لئے آپ کی بعثت فرمائی۔ آپ کو آپ کے علم کی وجہ سے منتخب کر لیا۔ اس کے بعد لوگوں کے دلوں کو دیکھا اور آپ کے لئے آپ کے ساتھیوں کو چن لیا۔ ان کو اپنے دین کا مددگار اور اپنے نبی کا وزیر بنایا۔

حسن بصری تابعی (م۔ ۱۱۰ھ) نے ایک بار اپنے زمانہ کے لوگوں سے کہا:

لقد ادرکت سبعین بدریاً اکثر لباسھم الصوف ولو رأیتموھم لقلتم مجانین ولو رأوا اخیارکم لقالوا مالھولاء من خلاق۔ ولو رأوا اشرارکم لقالوا مایومن ھولاء بیوم الحساب

میں نے ۷۰ بدری صحابیوں کو دیکھا ہے۔ ان کا لباس زیادہ تر صوف کا ہوتا تھا۔ اگر تم ان کو دیکھتے تو تم کہتے یہ پاگل ہیں۔ اور اگر وہ تمھارے اچھوں کو دیکھتے تو کہتے کہ ان کا دین میں کوئی حصہ نہیں۔ اور اگر وہ تمھارے بروں کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ لوگ حساب کے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔

عن عبد اللہ بن عمر قال، اولئک اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کانوا خیر ھذہ الامۃ ابرھا قلوبا و اعمقھا علما و اقلھا تکلفا

(ابونعیم، حلیۃ الاولیاء جلد ۱، صفحہ ۳۰۵)

عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں۔ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کے بہترین لوگ تھے۔ وہ بہت اچھے دل والے، بہت گہرے علم والے اور تکلفات سے دور تھے۔

عن عبد اللہ بن مسعود قال، انتم اکثر صیاما و اکثر صلاۃ و اکثر اجتھادا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھم کانوا خیرا منکم۔ قالوا لِمَ یا ابا عبد الرحمن۔ قال ھم کانوا ازھد فی الدنیا

حضرت ابن مسعود نے اپنے زمانہ کے لوگوں سے کہا۔ تم نماز روزہ میں اصحاب رسول سے زیادہ ہو۔ ان سے زیادہ مجاہدہ کرتے ہو۔ مگر وہ تم سے بہت بہتر تھے۔ لوگوں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے جواب دیا۔ وہ دنیا سے بہت زیادہ بے رغبت تھے۔

وارغب فی الآخرة حلیة الاولیاء، جلد۱، صفحہ ۱۳۶

قال علی بن ابی طالب، واللہ لقد رأیت اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم فما اری الیوم شیئا یشبھھم لقد کانوا یصبحون صفرا شعثا غبرا، وحملت اعینھم حتی تبل ثیابھم، واللہ فکأن القوم باتوا غافلین البدایہ والنہایہ، جلد ۸، صفحہ

سئل عبد اللہ بن عمر، ھل کان اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم یضحکون۔ قال نعم والایمان فی قلوبھم اعظم من الجبال

(اخرجہ ابو نعیم عن قتادة)

دخل ضرار بن ضمرة الکنانی علی معاویة فقال لہٗ۔ صف لی علیا۔ قال: انہ کان یستوحش الدنیا وزھرتھا، ویستأنس باللیل وظلمتہ۔ کان واللہ غزیر العبرة، طویل الفکرة۔ یقلب کفہ ویخاطب نفسہ۔ یعجبہ من اللباس ماقصر ومن الطعام ماجشب۔ یعظم اھل الدین ویحب المساکین لا یطمع القوی فی باطلہ۔ ولا ییأس الضعیف من عدلہٗ۔ فاشھد باللہ لقد رأیتہ فی بعض مواقفہ وقد ارخی اللیل سدولہ وغارت نجومہ یمیل فی محرابہ قابضا علی لحیتہ یتململ تململ السلیم ویبکی بکاء الحزین۔ فکأنی اسمعہ الآن وھو یقول یاربنا یاربنا (ابو نعیم)

اور آخرت کے بہت زیادہ مشتاق تھے۔

علی بن ابی طالب نے کہا، خدا کی قسم میں نے اصحاب رسول کو دیکھا ہے، آج کوئی چیز ان کے مشابہ نہیں، وہ خالی ہاتھ، پراگندہ بال اور غبار آلود ہو کر صبح کرتے تھے۔ ان کی آنکھیں اتنا آنسو گراتیں کہ ان کے کپڑے بھیگ جاتے۔ خدا کی قسم آج کے لوگوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے غفلت میں رات گزاری۔

عبد اللہ بن عمر سے پوچھا گیا، نبی کے اصحاب کیا ہنستے بھی تھے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ اور ایمان ان کے دلوں میں پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا ہوتا تھا۔

ضرار بن ضمرہ امیر معاویہ کے پاس آئے۔ امیر معاویہ نے کہا۔ مجھ سے علی کے اوصاف بیان کرو۔ انھوں نے کہا۔ علی، دنیا اور اس کی رونق سے وحشت محسوس کرتے تھے۔ ان کو رات اور رات کی تاریکی سے انس تھا۔ خدا کی قسم وہ بہت زیادہ عبرت پکڑنے والے، طویل فکر کرنے والے تھے۔ اپنی ہتھیلی کو پلٹتے اور اپنے نفس کو مخاطب کرتے۔ مختصر لباس اور معمولی کھانا ان کو پسند ہوتا۔ وہ اہل دین کی عزت کرتے، مسکینوں کو دوست رکھتے۔ طاقت ور اپنے باطل میں ان سے امید نہ کر سکتا تھا اور کم زور ان کے انصاف سے ناامید نہ ہوتا تھا۔ میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے علی کو بعض مواقع پر دیکھا ہے جب کہ رات کی تاریکی چھا رہی تھی اور ستارے غروب ہو رہے تھے۔ آپ اپنے محراب میں داڑھی پکڑے ہوئے اس طرح بے چین تھے جیسے زہریلے جانور کا ڈسا ہوا بے چین ہوتا ہے۔ غم زدہ کی طرح رو رہے تھے۔ جیسے اب بھی میں ان کو بے قرار حالت میں یہ کہتے ہوئے سن رہا ہوں اے ہمارے رب، اے ہمارے رب۔

معاملات میں اخروی پہلو کو سامنے رکھنا۔

یرموک کی لڑائی میں خالد بن ولید (م ۶۴۲ء) اسلامی فوجوں کے سپہ سالار تھے اور ابو عبیدہ بن الجراح ان کے ماتحت افسر کی حیثیت سے جنگ میں شریک تھے۔ حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو انھوں نے خالد بن ولید کو معزول کر کے ابو عبیدہ بن الجراح کو سپہ سالار مقرر کر دیا اور خالد بن ولید کو ان کے ماتحت کر دیا۔ یہ فرمان لے کر مدینہ سے جو شخص روانہ ہوا تھا، وہ مقام جنگ پر اس وقت پہنچا جب کہ طویل مقابلہ کے بعد لڑائی اپنے آخری انجام کو پہنچنے والی تھی اور فتح کے مقدمات ظاہر ہو چکے تھے۔ قاصد نے یہ فرمان اولاً ابو عبیدہ بن الجراح کو دیا۔ ابو عبیدہ فرمان خلافت کے مطابق فوراً سپہ سالاری کا جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے کر فتح کا کریڈٹ وصول کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ خالد بن ولید کی ماتحتی میں بدستور لڑتے رہے:

فاخفی ابو عبیدة الخبر وصار فی مکانه خلف خالد حتی ظهرت مقدمات النصر۔ وقد سئل عن عدم اخذ لواء القیادة علی الفور فقال: ما سلطان الدنیا ارید وما للدنیا اعمل

ابو عبیدہ نے خبر کو چھپایا اور خالد کی ماتحتی میں بدستور اپنے کو باقی رکھا یہاں تک کہ فتح کے مقدمات ظاہر ہو گئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ قیادت کا جھنڈا آپ نے فوراً کیوں نہ لے لیا۔ فرمایا: میں دنیا کی بڑائی نہیں چاہتا اور نہ دنیا کے لئے عمل کرتا ہوں۔

آخرت کے لحاظ سے کریڈٹ یہ تھا کہ خبر کو چھپایا جائے۔ دنیا کا کریڈٹ اس میں ملتا تھا کہ اس کو ظاہر کر دیا جائے۔ ابو عبیدہ نے آخرت کا کریڈٹ لینا پسند کیا اور دنیا کے کریڈٹ کو نظر انداز کر دیا۔

اب خالد بن ولید کے کردار کو دیکھئے۔ یرموک کی فتح کے بعد جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس عظیم جنگ کے فاتح (خالد بن ولید) کو سپہ سالاری سے معزول کر دیا گیا ہے تو ان کے اندر سخت بے چینی پیدا ہو گئی۔ بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے، انھوں نے حضرت خالد کی بہادری اور جواں مردی پر تقریریں کیں اور ان کی معزولی پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ ان کو ابھارا کہ وہ خلیفہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیں اور وعدہ کیا کہ ہم سب لوگ آپ کا ساتھ دیں گے۔ (یحرضونه علی عصیان امر الخلیفة ویعدونه بانهم سیکونون معه) مگر خالد بن ولید نے اس قسم کے مشورہ کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا۔ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ ابو عبیدہ بن الجراح کی ماتحتی میں ایک معمولی فوجی بن کر اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف لڑتے رہیں۔ اس وقت انھوں نے جو جملہ کہا وہ تاریخ نے ان الفاظ میں محفوظ رکھا ہے:

انی لا اقاتل فی سبیل عمر ولکن فی سبیل رب عمر

میں عمر کی راہ میں جنگ نہیں کرتا، بلکہ عمر کے رب کی راہ میں جنگ کرتا ہوں۔

جذبات سے اوپر اٹھ کر سوچنا :

لاھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اکثر مسلمان ہل گئے ۔ عمر فاروق کا یہ حال ہوا کہ مدینہ کی مسجد میں تلوار لے کر کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے کہ جو شخص کہے گا کہ رسول اللہ کی وفات ہوگئی، اس کی گردن مار دوں گا۔ ابوبکر صدیق رسول کی محبت میں تمام لوگوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ ہجرت کے موقع پر جب آپ مکہ میں اچانک ابوبکر صدیق کے گھر آئے اور فرمایا کہ مجھے مکہ سے چلے جانے کا حکم ہوگیا ہے تو ابوبکر صدیق نے پہلی بات یہ فرمائی : "کیا مجھے بھی ساتھ نصیب ہوگا "۔ آپ نے فرمایا ہاں ۔ یہ سفر بظاہر موت کا سفر تھا۔ مگر اس نازک موقع پر رسول کی معیت ان کو اتنی محبوب تھی کہ خوشی کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ عشق کی حد تک رسول سے عقیدت ہونے کے باوجود جب آپ کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ کی وفات ہوگئی، تو آپ مسجد میں آئے جس سے متصل رسول اللہ کا حجرہ تھا۔ یہاں لوگ حیران و پریشان تھے ۔ عمر فاروق نے مرے سے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ رسول اللہ کی وفات ہوسکتی ہے ۔ مگر ابوبکر صدیق نے اپنی روح کو عالم بالا سے اس حد تک مطابق کر لیا تھا کہ آپ کو اصل حقیقت سمجھنے میں دیر نہیں لگی ۔ انھوں نے آپ کے چہرے سے چادر اٹھا کر آپ کو چوما اور پھر فرمایا : بابی انت وامی، اما الموتۃ التی کتب اللہ علیک فقد ذقتھا، ثم لن تصیبک بعدھا موتۃ ابدا (جو موت اللہ نے آپ کے لئے مقدر کی تھی وہ آپ نے چکھ لی ۔ اس کے بعد اب کوئی موت آپ کو آنے والی نہیں) اس کے بعد آپ باہر مجمع میں تشریف لائے اور تقریر کرتے ہوئے کہا :-

ایھا الناس، انہ من کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات، ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت	لوگو! جو شخص محمد کو پوجتا تھا تو محمد کا انتقال ہوگیا، اور جو شخص خدا کو پوجتا تھا تو خدا زندہ ہے، اس کو موت آنے والی نہیں ۔

تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۱۵۵

یہ عبدیت کا وہ مقام ہے جہاں آدمی نفرت اور محبت کی نفسیات سے الگ ہو کر حقیقت کو دیکھنے لگتا ہے۔ ایسے کامل انسان صدر اول میں بھی تھوڑے سے تھے ، اور بعد کے زمانہ میں تو شاید ایسے لوگ پیدا ہی نہیں ہوئے ۔ الا ماشاء اللہ

اصحاب رسول نے اسی عبدیت کاملہ کا مظاہرہ جمع قرآن کے سلسلے میں کیا۔ ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ میں جب زید بن ثابت انصاری نے قرآن کو مدون کیا تو ان کے نسخہ کے بعد بہت سے اجزا بچ گئے جن پر قرآن کی آیتیں اور سورتیں لکھی ہوئی تھیں ۔ تمام اصحاب کے مشورے سے اس ذخیرہ کو جلا دیا گیا۔ اسی طرح عثمان غنی کی خلافت کے زمانہ میں جب قرآن کے نسخے جمع کئے گئے اور چند مستند نسخے تیار کئے گئے تو بہت سے نسخے بچ گئے جو مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے تھے۔ اس بار بھی اصحاب رسول کے متفقہ مشورہ کے مطابق سرکاری نسخوں کے علاوہ تمام نسخے جلا دیئے گئے ــــــ "قرآن" کو عظیم تر دینی مصلحت کی خاطر جلانا ، ایک ایسی جرأت کا کام ہے جس کا مظاہرہ

صرف ایسے لوگ کر سکتے تھے جو حقیقت کو اس بلند مقام سے دیکھ رہے ہوں جہاں ہر دوسری چیز حذف ہو جاتی ہے اور حقیقت اعلیٰ کے سوا کوئی چیز مرکز توجہ بننے کے لئے باقی نہیں رہتی۔

اختلاف کے باوجود عدل پر قائم رہنا:

عمر فاروق اپنے وقت کی ایک عظیم سلطنت کے حکمراں تھے۔ آپ نے ایک بار تقریر کے دوران کہا: اگر تم لوگ میرے اندر کوئی غلطی دیکھو تو کیا کرو گے۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور بولا:

واللہ لو علمنا فیك اعوجاجا لقومناہ بسیوفنا — خدا کی قسم اگر ہم تمھارے اندر کوئی ٹیڑھ دیکھیں تو ہم اس کو تلوار سے سیدھا کر دیں گے۔

عمر فاروق نے اس "گستاخی" پر آدمی کو تنبیہ کرنے کے بجائے فرمایا الحمد للہ ان جعل فی المسلمین من یقوم اعوجاج عمر بسیفہ (خدا کا شکر ہے کہ اس نے مسلمانوں میں ایسے لوگ بنائے جو عمر کی ٹیڑھ کو تلوار سے سیدھا کر دیں گے) عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ عُیَینہ بن حصن مدینہ آئے اور عمر فاروق سے ملے۔ انھوں نے کہا

ھی یا ابنَ الخطاب، فواللہ ما تعطینا الجزل ولا تحکمُ فینا بالعَدل — اے خطاب کے بیٹے، خدا کی قسم تم نہ ہم کو کچھ دیتے ہو، نہ ہمارے درمیان انصاف کرتے ہو۔

عمر فاروق یہ سن کر غصہ میں آگئے اور اٹھے کہ آدمی کو ماریں۔ یہ دیکھ کر حُر بن قیس نے کہا: اے امیر المومنین "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "معاف کرو اور جاہلوں سے درگزر کرو" اور یقیناً یہ ایک جاہل آدمی ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں:

واللہ ما جاوزہا عمر حین تلاہا علیہ وکان وقافا عند کتاب اللہ تعالیٰ (بخاری) — خدا کی قسم قرآن کی آیت سننے کے بعد عمر نے مطلق تجاوز نہیں کیا۔ وہ خدا کی کتاب پر بہت زیادہ رکنے والے آدمی تھے۔

غزوۂ ذات السلاسل (۸ھ) میں اولاً عمرو بن العاص ۳۰۰ کے لشکر کے ساتھ وادی القری کی طرف روانہ کئے گئے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عبیدہ بن الجراح کو دو سو مہاجرین و انصار کے ساتھ روانہ کیا اور ان کو جھنڈا بھی عطا فرمایا۔ رخصت کرتے ہوئے آپ نے ہدایت فرمائی کہ تم اور عمرو بن العاص دونوں مل کر کام کرنا، اختلاف مت کرنا (اذا قدمت علی صاحبك فتطاوعا ولا تختلفا)

جب وہ عمرو بن العاص کے پاس پہنچے تو ابو عبیدہ بن الجراح نے چاہا کہ لوگوں کی امامت کریں۔ عمرو بن العاص نے کہا کہ آپ بطور مدد کے بھیجے گئے ہیں۔ یہ صحیح نہیں کہ آپ میری امامت کریں جب کہ میں امیر ہوں۔ ابو عبیدہ کے دستہ میں ابو بکر و عمر جیسے لوگ تھے۔ کہا کہ عمرو بن العاص اپنے دستہ کے امیر ہیں اور ابو عبیدہ اپنے دستہ کے۔ مگر عمرو بن العاص نے اس تقسیم سے اتفاق نہیں کیا اور کہا تم لوگ میری مدد کے لئے بھیجے گئے ہو۔ اصل قائد میں ہوں (انما انتم امدد دت بکم فانا القائد) اب ابو عبیدہ بن الجراح نے اپنا حق واپس لے لیا اور کہا: رسول اللہ نے مجھ کو جو

آخری نصیحت کی تھی، وہ یہ تھی کہ تم اور عمرو بن العاص دونوں مل کر کام کرنا اختلاف مت کرنا، اس لئے میں کسی حال میں جھگڑا نہیں کروں گا:

وانک واللہ ان عصیتنی لا طعتک	خدا کی قسم اگر تم میری بات نہ مانو تب بھی میں تمھاری اطاعت کروں گا۔

اس قسم کی ناخوش گوار باتیں جب کسی کی زندگی میں پیش آتی ہیں تو فوراً اس کی انا بھڑ اٹھتی ہے۔ ایسے نازک مواقع پر اپنے کو عجز اور عبدیت کے دائرہ میں محدود رکھنا، جیل جانے اور پھانسی پر چڑھنے سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ اس امتحان میں وہی لوگ پورے اتر سکتے ہیں جو اپنی ذات کی نفی کر کے خدا کی بندگی میں داخل ہوئے ہوں۔

فراست مومن

ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ	مومن کی ہوشیاری سے بچو، کیوں کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اگر ایک طرف عالم آخرت کی حقیقتوں کو آدمی کے اوپر منکشف کرتا ہے تو دوسری طرف وہ موجودہ دنیا کے حقائق بھی اس پر کھولتا ہے، حتیٰ کہ اس کی نظر اتنی بے پناہ ہو جاتی ہے کہ وہ دنیا کے معاملات میں نہایت عاقلانہ فیصلے کرے اور ایسے اقدامات تجویز کرے جس کو فیصلہ کن انجام تک پہنچنے سے کوئی روک نہ سکتا ہو۔

یہاں میں بطور مثال صرف دو حوالوں کا ذکر کروں گا۔ عمر فاروق نے ایک بار فرمایا:

لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر	عقلمند وہ نہیں ہے جو خیر اور شر کو جانے۔
ولکنہ الذی یعرف خیر الشرین	عقلمند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے خیر کیا ہے۔

خلیفہ دوم کے اس قول میں زندگی کے معاملات کا نہایت گہرا شعور پایا جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے لئے خیر و شر میں انتخاب (CHOICE) کا موقع ہو۔ جب کہ یہ امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے کہ دو ناپسندیدہ صورت حال میں سے اس صورت حال کو قبول کر لیا جائے جو "خیر" کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے کا موقع دیتی ہو۔ جو چیز آج حاصل نہیں ہو رہی ہے، وہ کل مزید تیاریوں کے بعد حاصل ہو جائے ——— خلیفہ دوم نے اپنے اس مختصر جملہ میں دنیا کی آدھی سیاست بتا دی ہے۔ اس گہرے سیاسی راز تک وہ اس لئے پہنچ سکے کہ وہ ردعمل کی نفسیات سے الگ رہ کر معاملات پر غور کر سکتے تھے۔

موجودہ زمانہ میں مسلم ملکوں میں اٹھنے والی اسلامی تحریکوں کی مثال سے اس قول کی حکمت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ ان ملکوں کے اسلامی رہنماؤں کا مقصد غیر اسلامی طرز کے حکمرانوں کو ہٹا کر اسلامی طرز کے حکمرانوں کو برسر اقتدار لانا تھا۔ انھوں نے یہ فرض کر لیا کہ وہ اس حالت میں ہیں کہ خیر (اسلامی نظام) اور شر (سیکولر نظام) میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکیں۔ انھوں نے "شر" کو ختم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی تاکہ اس کے بعد "خیر" کو اوپر آنے

کا موقع مل جائے۔ اکثر ملکوں میں، دوسری سیاسی طاقتوں کے ساتھ متحدہ محاذ میں شریک ہوکر، وہ مفروضہ شر کو اقتدار سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ (انڈونیشیا میں ولندیزی، مصر میں شاہ فاروق، ہندستان میں انگریز، پاکستان میں ایوب اور بھٹو، وغیرہ) مگر اس کامیابی کے بعد جو انجام سامنے آیا، وہ صرف یہ تھا کہ فاروق کی جگہ ناصر، ایوب کی جگہ بھٹو، ولندیزی کی جگہ سوئیکارنو اور مستعمرین کی جگہ اکثریت کرسئ اقتدار پر قابض ہوگئی۔ گویا وہ ایک شر اور دوسرے شر میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی پوزیشن میں تھے نہ کہ حقیقۃً خیر اور شر میں سے کسی ایک کو۔ ان تحریکوں نے جو طاقت ایک شر کو ہٹا کر دوسرے شر کو لانے میں خرچ کی، اسی طاقت کو اگر وہ اسلام کے اشاعت و استحکام میں لگاتے تو وہ زیادہ بہتر طور پر "خیر" کی منزل کی طرف سفر کر سکتے تھے۔

علی بن ابی طالب کے زمانہ میں تحکیم کا جو واقعہ پیش آیا، اس کے بعد آپ کی فوج سے تقریباً ۱۰ ہزار آدمی الگ ہوگئے جو عام طور پر خوارج کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ لوگ خلیفہ چہارم کے خلاف سخت غم و غصہ میں مبتلا تھے اور آپ سے جنگ کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔ آپ کے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ قبل اس کے کہ خوارج ہمارے اوپر حملہ آور ہوں، ہم خود بڑھ کر ان کے اوپر حملہ کریں اور ان کا خاتمہ کر دیں۔ علی بن ابی طالب نے فرمایا:

لا اقاتلهم حتى يقاتلوني، وسيفعلون — میں ان سے نہیں لڑوں گا جب تک وہ خود مجھ سے لڑنے کے لئے نہ آئیں۔ اور وہ ضرور ایسا کریں گے۔

عباس محمود العقاد، العبقريات الاسلاميه

دار الآداب بیروت ۱۹۶۶، صفحہ ۶۶۳

خلیفہ چہارم کے یہ دس ہزار ساتھی آپ سے بگڑ کر اور آپ کو مطعون کر کے نہایت نازک موقع پر آپ سے الگ ہوگئے تھے۔ اگر آپ بھی انھیں کی طرح منفی نفسیات میں مبتلا ہو جاتے تو آپ کبھی یہ جملہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ مگر آپ ایک غیر متاثر ذہن کے تحت پورے واقعہ کا مطالعہ کر رہے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے اس گہرے راز کو پالیا کہ خوارج کی یہ جماعت انتہائی جذباتی لوگوں پر مشتمل ہے۔ ان کو غصہ اور نفرت نے ہم سے جدا کیا ہے۔ اس قسم کی نفسیات میں مبتلا لوگ زیادہ دیر تک صبر نہیں کر سکتے۔ ان کی بے صبری ضرور ان کو ابھارے گی کہ وہ ہمارے اوپر حملہ کریں۔ ایسی حالت میں جارحیت کا الزام ہم اپنے سر کیوں لیں۔ ہمیں ان کی طرف سے ہونے والی جارحیت کا انتظار کرنا چاہئے۔ جب وہ جارحیت کر کے ہمارے لئے جنگ کا جواز پیدا کر دیں، اس وقت زیادہ بہتر طور پر ہمارے لئے یہ موقع ہوگا کہ ان کے اوپر بھرپور حملہ کر کے ان کا استیصال کر دیں۔

قابل پیشین گوئی کردار

قرآن کی سورہ نمبر ۶۷ میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی کائنات میں کوئی "تفاوت" نہیں۔ تفاوت کے معنی ہیں فرق، عدم مطابقت۔ تفاوت الشیئان: دو چیزوں کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے سوا جو بقیہ کائنات ہے، اس میں مطلوب اور عمل کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ خدا کا جو تخلیقی منصوبہ ہے، اسی کے مطابق عملاً

ساری کائنات چل رہی ہے۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ساری کائنات مکمل طور پر قوانین فطرت کے مطابق ہے۔ یہ مطابقت اتنی زیادہ ہے کہ کائنات میں ہونے والے واقعات کی نہایت صحت کے ساتھ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ جب ہم قوانین فطرت کو جان لیں تو ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں حالت میں فلاں قسم کا نتیجہ برآمد ہوگا۔ پانی کو آگ پر رکھنے سے لے کر خلائی کشتی کو سیارہ کی طرف بھیجنے تک ساری سرگرمیاں اسی لئے ہیں کہ ہم کو یقین ہے کہ کائنات کی ہر چیز مکمل طور پر اپنے قانون کی پیروی کرتی ہے، وہ اس سے منحرف نہیں ہوتی۔

فکر و عمل کی یہی مطابقت انسان سے بھی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مادی کائنات کے لئے قوانین طبیعی مقرر کئے ہیں اور ساری کائنات کامل یک سوئی کے ساتھ اس کی پیروی کر رہی ہے۔ اسی طرح اس نے انسان کے لئے قوانین شرعی مقرر کئے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان اس سے ہم آہنگ ہوکر اپنی زندگی گزارے۔ زمین و آسمان کو خدا نے بزور اپنے مقررہ قوانین کا تابع بنا دیا ہے، انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خود اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو ان قوانین کے مطابق بنائے۔ طبیعی دنیا، جس طرح قوانین قدرت کے تحت کامل طور پر قابل پیشین گوئی (PREDICTABLE) ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے کہ، اخلاقی اعتبار سے، انسان قابل پیشین گوئی بن جائے۔ مومن اپنے ذاتی ارادہ کو خدا کے ارادہ کے تابع کر دیتا ہے، اس لئے وہ قابل پیشین گوئی ہوتا ہے۔ مومن سے معاملہ کرتے وقت ایک شخص پیشگی طور پر اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کو کس قسم کے ردعمل سے سابقہ پیش آئے گا۔

حسن بصری تابعی نے نفاق (خلاف ایمان حالت) کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔

من النفاق اختلاف القلب واللسان واختلاف السر والعلانية واختلاف الدخول والخروج

نفاق یہ ہے کہ قلب اور زبان میں فرق ہو، چھپے اور کھلے میں فرق ہو، داخل ہونے اور خارج ہونے میں فرق ہو۔

جامع العلوم والحکم، صفحہ ۳۷۷

اصحاب رسول کے ایمان نے اس قسم کے فرق کو ان کی زندگیوں سے مٹا دیا تھا۔ جس طرح مشین کے رہنما پرچہ کو دیکھ کر ایک آدمی سمجھ لیتا ہے کہ وہ کس طرح عمل کرے گی، اسی طرح قرآن و سنت کو دیکھ کر ایک شخص معلوم کر سکتا تھا کہ اصحاب رسول کا ردعمل کسی معاملہ میں کیا ہوگا ——— وہ جانتا تھا کہ ایک صحابی سے جب عہد و پیمان کا کوئی معاملہ ہوگا تو وہ لازماً اس کو پورا کرے گا (بقرہ ۱۷۷)۔ کوئی مالی لین دین ہوگا تو اس کی ٹھیک ٹھیک ادائگی کی جائے گی (مائدہ ۱)۔ اگر کسی وجہ سے اختلاف پیدا ہو جائے تو عدل کے خلاف رویہ کا اس کو سامنا کرنا نہیں ہوگا (مائدہ ۸) وہ حاکم ہو یا ماتحت، دونوں حالتوں میں وہ انھیں حدود پر قائم رہے گا جو اس کے رب نے اس کے لئے مقرر کر دیئے ہیں (توبہ ۱۱۲)۔ اگر وہ کسی کے اوپر غلبہ پائے تو وہ ظلم اور گھمنڈ کا مظاہرہ نہیں کرے گا (من کظم غیظا وهو قادر على ان ينفذه ... ابوداؤد، ترمذی) اس کی غلطی کی گرفت کی جائے گی تو اس کو عزت کا سوال بنا کر وہ اپنی غلطی سے لپٹا نہیں رہے گا بلکہ صاف لفظوں میں اعتراف کرے گا (بقرہ ۲۰۶) اس سے کسی بات کو منوانے کے لئے طاقت کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ایک لفظی دلیل اس سے کوئی صحیح بات منوانے کے لئے کافی ہوگی (محمد ۳) حتیٰ کہ صحابی کے بارے میں

ایک شخص یہاں تک یقین رکھ سکتا تھا کہ وہ اس کے معاملہ پر اپنا معاملہ نہیں کرے گا (لا یبیع بعضکم علی بیع بعض۔ مسلم) اگر کوئی ایسی بات سامنے آئے جس کی بابت وہ علم و مطالعہ نہ رکھتا ہو، تو وہ صاف طریقہ سے کہہ دے گا کہ میں نہیں جانتا (من لم یعلمہٗ فلیقل اللہ اعلم، بخاری) ——— مادی کائنات "طوعاً و کرہاً" خدا کے منصوبہ کے مطابق بنی ہوئی ہے۔ اصحاب رسول نے اپنی مرضی سے اپنے آپ کو خدائی منصوبہ کے مطابق بنالیا تھا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ (بینہ)

اصحاب رسول کا یہی قابل پیشین گوئی کردار ان کو دوسرے انسانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ ایک آدمی نفس و شیطان کے قبضہ میں ہو تو پیشگی طور پر یہ اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ کسی معاملہ میں وہ کس قسم کا مظاہرہ کرے گا۔ مگر جب آدمی اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں خدا کا بندہ بنالے تو وہ اسی طرح قابل پیشین گوئی بن جاتا ہے جس طرح خدا کی بقیہ کائنات۔

موجودہ زمانہ میں بعض مشینی معاشروں نے ٹکنکل پہلو سے اپنے کو قابل پیشین گوئی بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایک ہندوستانی سیاح جاپان کی ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اسٹیشنوں کے نام صرف جاپانی زبان میں لکھے ہوئے ہیں۔ جب کہ جاپانی ریلوے اپنا ٹائم ٹیبل انگریزی میں بھی فراہم کرتی ہے۔ ہندستانی سیاح نے اپنے ایک جاپانی ہم سفر سے شکایت کی کہ آپ لوگ اسٹیشنوں کے بورڈ پر صرف جاپانی زبان میں نام لکھتے ہیں، میرے جیسا آدمی کیسے جانے کہ اس کا مطلوبہ اسٹیشن آگیا۔ "اس کا حل بہت آسان ہے"، جاپانی مسافر نے کہا، "آپ اپنی گھڑی کو صحیح رکھئے اور انگریزی ٹائم ٹیبل جو آپ کے پاس ہے، اس میں دیکھ لیجئے کہ آپ کے مطلوبہ اسٹیشن پر ٹرین کے پہنچنے کا وقت کیا ہے۔ آپ کی گھڑی کی سوئی جب مقررہ وقت پر پہنچے گی تو آپ کی گاڑی اسی اسٹیشن پر کھڑی ہوگی"۔

منصوبہ اور عمل درآمد کے درمیان یہ مطابقت جو بعض مشینی معاشروں نے ٹکنکل سطح پر حاصل کی ہے، یہی انسان سے شرعی اور اخلاقی اعتبار سے مطلوب ہے۔ اصحاب رسول، انسانی تاریخ میں، اس معیار کا سب سے کامیاب نمونہ تھے۔ ان کے بارے میں پیشگی طور پر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ کسی معاملہ میں ان کا رویہ کیا ہوگا۔ اور اگر بشری کمزوری یا بھول چوک سے کبھی ان کے عقیدہ اور عمل میں فرق آتا تو یاددہانی کے بعد فوراً وہ اس کی اصلاح کرلیتے تھے:

ذھب بلال الی عمر مستاذناً فقال لہ الخادم انہ نائم۔ فسألہ کیف تجدون عمر۔ قال: خیر الناس الا انہ اذا غضب فھو امر عظیم۔ قال بلال: لو کنتُ عندہ اذا غضب قرأتُ علیہ القرآن حتی یذھب غضبہ

العبقریات الاسلامیہ، صفحہ ۳۹۷

بلال ایک روز عمر فاروق کے یہاں ملاقات کے لئے گئے۔ خادم نے بتایا کہ وہ سو رہے ہیں۔ بلال نے خادم سے پوچھا، تم لوگ عمر کو کیسا پاتے ہو۔ خادم نے جواب دیا، وہ بہترین انسان ہیں۔ مگر جب غصہ میں آجائیں تو ان کا غصہ بڑا سخت ہوتا ہے۔ بلال نے کہا: اگر میں ان کے غصہ کے وقت ہوتا تو میں ان کے سامنے قرآن پڑھتا۔ اس کے بعد ان کا غصہ ختم ہوجاتا۔

جب قرآن کو چھوڑی ہوئی کتاب بنا دیا جائے

قرآن کی سورہ نمبر ۲۵ میں ارشاد ہوا ہے:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (فرقان - ۳۰)

اور کہا رسول نے اے میرے رب میری قوم نے ٹھیرا دیا اس قرآن کو چھوڑا ہوا۔

اس آیت سے اولاً وہ لوگ مراد ہیں جن کے سامنے قرآن آتا ہے مگر وہ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ جیسا کہ کی دور میں قریش نے کیا۔ تاہم اس نفسیات کا عملی مظاہرہ کبھی ان لوگوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے جو بظاہر قرآن کو ماننے والوں کی فہرست میں داخل ہوں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اپنی تفسیر قرآن میں آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے۔ تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا، اس میں تدبر نہ کرنا، اس کی تلاوت نہ کرنا، اس کی تصحیح قرأت کی طرف توجہ نہ کرنا، اس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا، یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجران قرآن کے تحت داخل ہو سکتی ہیں۔"

قرآن کے ماننے والوں کے لئے قرآن کو "کتاب مہجور" بنانے کی یہ شکل کبھی نہیں ہوتی کہ اس کا احترام و تقدس لوگوں کے دلوں میں باقی نہ رہے۔ برکت اور تقدس کا نشان ہونے کی حیثیت سے وہ ہمیشہ اس کو اپنے طاق کی زینت بنائے رہتے ہیں۔ البتہ وہ اس سے فکری رہنمائی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ خدا کی کتاب میں ان کے لئے ذہنی غذا نہیں ہوتی۔ وہ ان کی حقیقی زندگی کا سرمایہ نہیں بنتی۔ وہ ان کی دنیا پرستانہ زندگی کے لئے "برکت کا تعویذ" تو ضرور ہوتی ہے مگر آخرت کی رہنما کتاب کی حیثیت سے ان کی زندگی میں اس کا کوئی مقام نہیں ہوتا ——— یہ مطلب ہے خدا کی کتاب کو "کتاب مہجور" بنا دینے کا۔

اعلان

۱۔ الرسالہ کے لئے چیک یا ڈرافٹ یا پوسٹل آرڈر کے ذریعہ رقم بھیجنے والے حضرات پانے والے کے خانہ میں صرف حسب ذیل الفاظ لکھیں:

AL-RISALA MONTHLY

الدار العلمیہ کے لئے رقم بھیجنے والے حضرات صرف حسب ذیل الفاظ لکھیں

AL-DARUL ILMIYYA

مذکورہ نام سے پہلے یا بعد مزید کسی اور لفظ کا اضافہ نہ فرمائیں۔

۲۔ الرسالہ کی فائل شمارہ ۱ تا ۱۰ (مجلد) محدود تعداد میں دستیاب ہو سکتی ہے
قیمت فی جلد ۲۵ روپے
محصول ڈاک بذمہ خریدار

۳۔ الرسالہ ماہ جنوری ۱۹۷۷ کے شمارے قیمتاً درکار ہیں۔ جو لوگ فراہم کر سکتے ہوں مطلع فرمائیں۔

منیجر

آہ یہ ظالم انسان !

عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ۲۴ھ میں خلیفہ منتخب ہوئے اور ۳۵ھ میں آپ کو شہید کر دیا گیا جب کہ آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔ امام مسلم عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپنے مکان میں لیٹے ہوئے تھے۔ آپ کی پنڈلیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اتنے میں ابوبکرؓ آئے، آپ اسی حال میں لیٹے رہے اور باتیں کیں۔ پھر عمرؓ آئے۔ آپ تب بھی اسی طرح لیٹے رہے اور باتیں کیں۔ اس کے بعد عثمانؓ آئے۔ اب آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے کو ٹھیک کر لیا۔ جب تینوں چلے گئے تو میں نے عرض کیا۔ اے خدا کے رسول! ابوبکر آئے مگر آپ نہیں اٹھے۔ عمر آئے پھر بھی آپ اسی طرح رہے۔ مگر عثمان آئے تو آپؐ اٹھ گئے اور اپنے کپڑے کو درست کر لیا۔ آپؐ نے جواب دیا:

الا استحیی من رجل تستحیی منه الملائکة

کیا میں ایک ایسے شخص سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے حیا کرتے ہیں۔

امام ترمذی عبدالرحمٰن بن خبابؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں اس وقت مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا جب کہ آپ جیش عسرہ (تبوک) کی تیاری کے لئے لوگوں کو ابھار رہے تھے۔ عثمان بن عفان کھڑے ہوئے اور کہا: اے خدا کے رسول، ایک سو اونٹ مع کجاوہ اور پالان کے میں خدا کے راستہ میں دیتا ہوں" آپؐ نے پھر لوگوں کو ابھارا۔ عثمان بن عفان دوبارہ کھڑے ہوئے اور کہا، "دو سو اونٹ مع کجاوہ اور پالان کے اللہ کے راستہ میں" آپ نے پھر لوگوں کو ابھارا۔ عثمان بن عفان تیسری بار کھڑے ہوئے اور کہا، اے خدا کے رسول تین سو اونٹ مع کجاوہ اور پالان کے اللہ کے راستہ میں" راوی کہتے ہیں، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اتر پڑے۔ اور آپ کی زبان پر یہ کلمہ جاری تھا:

ما علی عثمان ما عمل بعد هذه ما علی عثمان ما عمل بعد هذه

اس کے بعد عثمان جو بھی کریں ان پر کوئی مواخذہ نہیں۔ اس کے بعد عثمان جو بھی کریں ان پر کوئی مواخذہ نہیں۔

امام ترمذی انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں۔ حدیبیہ میں جب بیعت رضوان ہوئی، اس وقت عثمان بن عفان رسول اللہ کے سفیر کی حیثیت سے مکہ گئے ہوئے تھے۔ جب تمام لوگ بیعت ہو چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عثمان اس وقت اللہ اور اس کے رسول کے کام پر ہیں" پھر آپؐ نے اپنے ایک ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا اور خود اپنے ایک ہاتھ سے اپنے دوسرے ہاتھ پر عثمان کے لئے بیعت کی:

فکانت ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعثمان خیرا من ایدیهم لانفسهم

پس عثمان کے لئے رسول اللہؐ کا ہاتھ لوگوں کے لئے ان کے اپنے ہاتھ سے بہتر تھا۔

امام ترمذی مرۃ بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کا حال بیان کیا جو آپ کے

بعد آئیں گے، اتنے میں ایک صاحب سامنے سے گزرے جو کپڑا لپیٹے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا: هذا یومئذ على الهدى (یہ شخص اس دن حق پر ہوگا) میں اٹھ کر ان کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ وہ عثمان بن عفان ہیں۔ (ترمذی) حضرت عثمان نے اپنے مال سے مشکل وقتوں میں اتنی زیادہ اسلام کی مدد کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار ان کے لئے دعا فرمائی۔ ایک بار آپ نے فرمایا:

اللهم انی قد رضيت عن عثمان فارض عنه، اللهم انی قد رضيت عن عثمان فارض عنه

اے اللہ! میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہوجا، اے اللہ میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہوجا۔

ایک بار حضرت عثمان کے ایثار و قربانی سے آپ اتنا خوش ہوئے کہ دعا کا یہ کلمہ دن بھر آپ کی زبان سے نکلتا رہا۔

تاہم یہی عثمان بن عفان تھے جن کے خلاف ان کی خلافت کے بعد کے سالوں میں سارے ممالک اسلامی میں شورش برپا ہوگئی۔ اس شورش کے پیدا کرنے میں متعدد مخلص اور مقدس لوگ بھی شریک تھے۔ یہ شورش اتنی بڑھی کہ ہزاروں کی تعداد میں بلوائی مختلف ملکوں سے جمع ہوکر مدینہ میں گھس گئے۔ انھوں نے حضرت عثمان کے مکان کا محاصرہ کرلیا۔ آپ کے گھر میں پانی کا داخلہ روک دیا۔ آپ کے لئے مسجد نبوی میں جاکر نماز پڑھنا ناممکن بنا دیا۔ جب شدت بہت بڑھی تو آپ اپنے مکان کی چھت پر چڑھے اور بلوائیوں کو خطاب کیا:

عن ثمامة بن حزن القشيری، قال شهدت الدار حين اشرف عليهم عثمان فقال: انشدكم الله والاسلام هل تعلمون ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قدم المدينة وليس بها ماء يستعذب غير بئر رومة۔ فقال من يشتری بئر رومة يجعل دلوه مع دلاء المسلمين بخير له منها فی الجنة۔ فاشتريتها من صلب مالی، وانتم اليوم تمنعوننی ان اشرب منها۔ فقالوا اللهم نعم۔ فقال انشدكم الله والاسلام هل تعلمون ان المسجد ضاق باهله فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم من يشتری بقعة آل فلان فيزيدها فی المسجد بخير له منها فی الجنة فاشتريتها من صلب مالی، فانتم اليوم تمنعوننی ان اصلی فيها ركعتين۔ فقالوا اللهم نعم۔ ۔ ۔ قال الله اكبر، اشهدوا ورب الكعبة انی شهيد، ثلاثا۔

(ترمذی۔ نسائی، دارقطنی)

ثمامہ بن حزن القشیری کہتے ہیں۔ عثمان بن عفان کے محاصرہ کے وقت میں ان کے گھر کے پاس موجود تھا۔ وہ مکان کے اوپر چڑھے اور لوگوں سے کہا۔ میں تم کو اللہ کی اور اسلام کی قسم دلاتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ آئے اور یہاں صرف ایک (یہودی کا) کنواں بئر رومہ تھا جس سے میٹھا پانی لیا جاسکے (وہ بہت مہنگی قیمت پر فروخت کرتا تھا) رسول اللہ نے کہا۔ کون بئر رومہ کو خریدتا ہے کہ وہ بھی اس سے پانی لے اور مسلمان بھی پانی لیں۔ جنت میں اس کو اس سے بہتر ملے گا۔ میں نے (۳۵ ہزار درہم) کے عوض اس کو خریدا۔ اور تم مجھ کو اس سے پانی پینے سے روکتے ہو۔ لوگوں نے جواب دیا۔ خدایا ہاں۔ پھر عثمان بن عفان نے کہا۔ میں تم کو قسم دلاتا ہوں اللہ کی اور اسلام کی۔ کیا تم جانتے ہو کہ مسجد نبوی تنگ پڑگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کون فلاں زمین کو خرید کر مسجد میں اضافہ کرتا ہے، جنت میں اس کو اس سے بہتر ملے گا۔ میں نے اس کو اپنے مال سے خریدا۔ اور تم مجھ کو اس میں دو رکعت نماز پڑھنے سے

رز کتے ہو۔ لوگوں نے کہا خدایا ہاں ۔ عثمان بن عفان نے کہا
اللہ اکبر۔ رب کعبہ کی قسم، تم لوگ گواہ رہو کہ میں شہید ہوں
(تین بار فرمایا)

ان سب کے باوجود لوگوں نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا۔ اور قتل کرنے والے اور ان کا ساتھ دینے والے سب کے سب نماز روزہ والے مسلمان تھے۔ حتی کہ ان کا ساتھ دینے والوں میں کتنے ایسے لوگ بھی تھے جن کے اخلاص اور زندگی میں کسی کو شبہ نہیں تھا۔

**

تھوڑے لوگ ۔ ۔ ۔

بھیک جی میوات کے مشہور صوفی شاعر ہیں۔ وہ تین سو سال پہلے اوڑکی (راجستھان) میں ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ بڈیڈ میں اب بھی ان کا اور ان کے شیخ سلیم شاہ کا مزار موجود ہے۔ انھوں نے اپنا گھر چھوڑ کر درویشی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ ان کے بہت سے اشعار عوام میں مشہور ہیں۔ ایک شعر یہ ہے:

پی پیا کے دیس کی بڑی کٹھن ہے گیل
کوئی کوئی جائیگو سلجھا سلجھا بیل

مطلب یہ ہے کہ محبوب (خدا) کے دیس (آخرت) کا راستہ بڑا کٹھن ہے۔ تھوڑے لوگ ہوں گے جو راستہ کی جھاڑیوں سے بچ کر وہاں تک پہنچیں۔

ڈائری کا ایک ورق

قرآن کی سورہ نمبر ۴۰ میں ایک "رجل مومن" کا ذکر ہے۔ یہ فرعون کے شاہی خاندان کا ایک فرد تھا۔ حضرت موسیٰ اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف فرعون کی کش مکش جب اپنی آخری انتہا کو پہنچ چکی تھی، اس وقت یہ مرد مومن، جو ابتک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا، دربار میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے آخرت کے موضوع پر ایک بے لاگ تقریر کی۔ اس نے اپنی قوم کو یوم التناد (چیخ پکار کے دن) سے ڈرایا۔ ان کو نصیحت کی کہ اپنی زندگی کا نقشہ دار القرار کو سامنے رکھ کر بناؤ۔

یہ تقریر اپنی تاریخی اہمیت کی بنا پر فی الفور سارے ملک مصر میں پھیل گئی۔ ایک شخص کی صرف ایک تقریر نے پوری قوم کے اوپر خدا کی حجت تمام کر دی۔

تاریخ انسانی میں اس قسم کا لمحہ صرف کبھی کبھی پیش آتا ہے۔ زندگی، مخصوص واقعاتی تسلسل کے تحت، کبھی ایک ایسے کلائمکس پر پہنچ جاتی ہے کہ ایک فرد کو، جو اس وقت ایک خاص مقام پر کھڑا ہو، اپنی مخصوص پوزیشن کی وجہ سے ایک ایسا کردار ادا کرنے کا موقع مل جاتا ہے جس کو عام حالات میں لاکھوں انسان مل کر بھی انجام نہیں دے سکتے۔

۱۱ فروری ۱۹۷۷ کو سابق صدر جمہوریہ ہند فخرالدین علی احمد (۱۹۰۵-۱۹۷۷) کے اچانک انتقال کی خبر ملی تو مجھے خیال آیا کہ مرحوم شاید ہندستان کی جدید تاریخ میں پہلے شخص تھے جو اس قسم کی نادر پوزیشن پر پہنچ گئے تھے۔

آدمی بدل جاتا ہے

محمد بن علی بن طباطبا عرف ابن الطقطقی تیرھویں صدی عیسوی کا مشہور مورخ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ عبدالملک بن مروان اموی (۵ھ ـ ۲۳ھ) مدینہ کے مشہور فقہاء میں سے تھا۔ لوگ اس کو "مسجد کا کبوتر" کہتے تھے، کیوں کہ وہ اکثر مسجد میں رہتا اور قرآن کی تلاوت کرتا رہتا۔ اس کے باپ مروان بن الحکم کے مرنے کے بعد جب اس کو بتایا گیا کہ "آج سے تم خلیفہ ہو" تو اس نے قرآن کو فوراً بند کر دیا اور کہا: هذا فراق بيني وبينك (اب میرے اور تمھارے درمیان جدائی ہے)

عبدالملک کی خلافت سے پہلے جب یزید بن معاویہ نے مدینہ والوں سے لڑنے اور کعبہ پر حملہ کرنے کے لئے فوج روانہ کی تو عبدالملک بہت خفا ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا: "کاش آسمان ٹوٹ کر زمین پر گر پڑے"، مگر جب وہ خود خلیفہ ہوا تو اپنے حریف عبداللہ بن زبیر کو مغلوب کرنے کے لئے اس نے وہی فعل شدید تر شکل میں کیا۔ اس نے حجاج بن یوسف کو اس کام کے لئے مقرر کیا جس نے مکہ کا محاصرہ کر لیا اور کعبہ پر منجنیق سے پتھر برسائے۔ سعید بن المسیب، عبدالملک کے استاد تھے۔ ایک روز عبدالملک نے سعید بن المسیب سے کہا: "سعید، اب میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ میں کوئی نیک کام کرتا ہوں تو میرے دل کو خوشی نہیں ہوتی۔ جب کوئی برائی کرتا ہوں تو اس کا کچھ رنج نہیں ہوتا۔ حالاں کہ پہلے ایسا نہ تھا۔ سعید بن مسیب نے جواب دیا: اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تمھارے دل کی موت مکمل ہو چکی ہے۔

الہ آباد ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس جے۔ ایم۔ ایل۔ سنہا نے ۱۲ر جون ۱۹۷۵ کو اپنا وہ تاریخی فیصلہ دیا۔ جس میں مسز اندرا گاندھی کے الکشن (۱۹۷۱) کو ناجائز قرار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۲۶ر جون ۱۹۷۵ کو ایمرجنسی کا نفاذ عمل میں آیا جس نے پورے ملک کو نئے راستہ پر ڈال دیا۔ اس وقت سے لے کر فخر الدین علی احمد کے انتقال تک جو ہنگامہ خیز واقعات ہوئے، ان سب میں مرحوم کا نام شامل تھا۔ ایک صاحب اقتدار شخصیت محض اپنی ذات کو بچانے کے لئے انتہائی بے دردی کے ساتھ پورے ملک کا ڈھانچہ بدلتی رہی اور راشٹرپتی بھون کا صدر نشین اس کے ہر منصوبہ پر قانونی جواز کی مہر لگاتا رہا۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے، آخری دنوں میں مرحوم فخر الدین علی احمد کا ضمیر چیخ اٹھا تھا۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس عہدہ سے استعفا دے دیں گے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا ہوتا اور پھر دربار فرعون کے مومن کی طرح کھڑے ہو کر یہ کہتے کہ "اقتدار کے جوش میں یہ مت بھول جاؤ کہ خدا کی پکڑ تمھارا انتظار کر رہی ہے۔ لوگو! تمھیں مرنا ہے اور مرنے کے بعد خدا کے یہاں حساب دینے کے لئے حاضر ہونا ہے۔" اگر وہ ایسا کرتے تو اچانک وہ اس مقام پر کھڑے ہو جاتے جو شہداء اور انبیاء کا مقام ہے۔ ہندوستانی تاریخ کا کلائمکس اور ان کی مخصوص پوزیشن ان کی تقریر آخرت کو نہ صرف سارے ملک بلکہ ساری دنیا میں پھیلا دیتی۔ کوئی کان نہ ہوتا جس نے اس کو سنا نہ ہو، کوئی نگاہ نہ ہوتی جس نے اس کو پڑھا نہ ہو۔ صدر جمہوریہ کے عہدہ سے استعفا دینے کے نتیجہ میں ممکن ہے کہ چند روز کے لئے ان کی دنیا برباد ہو جاتی۔ مگر وہ اس خدائی پیغام کے ناشر بن جاتے جس کو پچھلی کئی صدیوں سے سارے مسلمان مل کر بھی انجام نہیں دے سکے ہیں اور جس کے ادا کرنے والے کے لئے بلاشبہ خدا کے یہاں سب سے بڑی سرفرازی ہے۔

****

مذہب کی حقیقت

ایک ایم۔ ایس۔ سی سے مذہب کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ دوران گفتگو انھوں نے کہا:

HUMAN QUALITIES ARE MORE IMPORTANT THAN THE RELIGIOUS CUSTOMS

انسانی صفات زیادہ ضروری ہیں بہ نسبت مذہبی رسوم کے۔ یہ جملہ اس نفسیات کو بہت خوبی کے ساتھ بتا رہا ہے جس کی وجہ سے مذہب آج کل کے پڑھے لکھے لوگوں کی نظر میں غیر اہم بن گیا ہے۔ یہ لوگ مذہب کو ایسے رسوم و اعمال کے مجموعہ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جس کا انسان کی اصل زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ حقیقی زندگی میں کامیاب ہونے کے لئے جن اوصاف کی ضرورت ہے، وہ مذہب سے حاصل نہیں ہوتیں، تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے رسمیاتی ضمیمہ کا بوجھ وہ کیوں اٹھائے پھریں۔

مذہب کا یہ تصور اصل مذہب کے مطالعہ سے نہیں بنا ہے بلکہ اہل مذاہب کو دیکھ کر بنتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں مذہب والوں نے یہی نمونہ پیش کیا ہے، گویا مذہب کچھ ناقابل فہم قسم کے رسمی اعمال کی بجا آوری کا نام ہے۔ حالانکہ مذہب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک زندہ قوت کا نام ہے جو انسان کی پوری زندگی میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔

women are born subordinate

DAILY EXPRESS Monday July 4 1977

IT'S A rough old world for women, as the feminists never cease to remind us.

They blame centuries of social conditioning—a kind of conspiracy whereby men all over the world somehow contrive to keep women in a subordinate role.

A much simpler, and more probable explanation is that universal male dominance stems not from social oppression but fundamental differences between the sexes

This is the view put forward by 35-year-old Professor Steven Goldberg of New York in his book "The Inevitability of Patriarchy" (Temple Smith £6·95).

The professor, a stocky ex-marine, whose male dominant tendencies have shot him up the academic hierarchy in less than a decade of teaching, is tough in mind and body

He needs to be. His book has earned him some shrill abuse from feminists in America ("Fascist Pig" and "Male Sadist" are two of the milder epithets), and has upset a few here too, since he arrived to launch the British publication.

"The feminists hate me" Goldberg told me cheerfully "I like to think their intense wrath stems from my inherent rightness

"Putting it simply I believe that the universality of male dominance in all societies cannot be explained by social conditioning.

SACRIFICE

"But it can be explained by the male hormone testosterone which 'programmes' the infant male for a life of greater aggression and dominance while he is still in the womb.

"That's why little boys are clearly more aggressive than little girls even before they've had a chance to be socially conditioned.

"And in later life this same dominance means that men are far more ready to sacrifice holidays, health and family for the sake of their career."

In truth the feminist case is none too strong. If it really were true that male dominance was due to social conditioning rather than innate male qualities, than surely somewhere in the world at some time a society would have evolved in which women were dominant.

None has. And even in societies like those behind the Iron Curtain which boast of sexual equality, one is obviously "more equal" than [illegible]



Steven Goldberg: 'Women know I'm right'

The professor some call the 'Male Sadist' talking to Peter Grosvenor

62-strong council of ministers Not one is a woman

You could even see it in a hole in the road in Leningrad where I once watched five men and five women labourers at work

Much as in Britain half the workers were digging and half were leaning on their shovels.

You may have guessed it was the dominant males who were leaning while the stocky women wielded their spades.

After a lifetime spent researching the diverse societies of the world that expert woman anthropologist Margaret Mead, who is commonly thought to be on the feminist side has declared

"All the claims so glibly made about societies ruled by women are nonsense. We have no reason to believe that they ever existed. Men have always been the leaders [illegible]

Does that mean that men are better than women? Professor Goldberg wags a warning finger.

"Not better, but different The male brain works differently from the female brain In IQ tests with men and women of similar intelligence levels the men tend to score higher on logical and deductive problems, though the women will generally do better in verbal skills.

EMOTION

Unquestionably women have greater emotional awareness even before they have children Little girls are commonly more thoughtful and sensitive to parental moods than little boys

"Of course we are talking [illegible]

[illegible] dominate men—but its only a minority

"Thus it is a statistical probability that even if only five per cent of MPs are women eventually there will be a woman prime minister."

And when women reach the top jobs, Mrs Thatcher will be pleased to hear, they are likely to perform just as well as men.

Professor Goldberg's proposition is quite simply, that they are much less likely to get to the top—and all because of testosterone.

"The masculinisation of the brain by this hormone has been demonstrated conclusively by experiments on female rats and other animals.

"And we have now found the same thing with human beings" says Goldberg

"Obviously you cannot experiment with humans but two decades back it was not uncommon to treat people for certain complaints, like acne with injections of testosterone

"Some injections happened to be given to pregnant women and when they give birth to girls the results were often startling

TOMBOYS

"On a chromosome test the girls were 100 per cent female and they were brought up like little girls. But they behaved like tomboys and worried parents would go to their doctors and say 'I don't understand my little girl. She wants to fight and play like a boy all the time'."

What had happened, think researchers is a hormonal masculinisation of the central nervous system which took place in the womb

The professor concludes "The central fact is that men and women are different from each other from the gene to the thought to the act. These differences flow from the biological natures of man and woman

Women have taken the powers they have not because they were forced by men but because they have followed their emotional imperatives

Women who deny their natures and covet a state of second-rate manhood are forever condemned to argue against their own juices

The experience of men is that there are few women who can out-fight them and few who can out-argue them but when a woman uses feminine means she can deal with any man as an equal

In this and every other society men look to women for gentleness, kindness and love. The basic male motivation is protection of women and children

The feminist campaign [illegible]

مذہبی تعلیم کی سائنسی تصدیق

تاریخ کے ہر دور میں عورتیں، مردوں کے ماتحت رہی ہیں۔ حتیٰ کہ آج بھی مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں یہ صورت حال مکمل طور پر موجود ہے۔ نام نہاد آزادیٔ نسواں تحریک کے مغربی علم بردار اب تک یہ کہتے رہے ہیں کہ یہ کوئی فطری تقسیم نہیں ہے۔ بلکہ سماجی حالات (SOCIAL CONDITIONING) نے مصنوعی طور پر یہ فرق پیدا کر رکھا ہے۔ تاہم حال میں اس سلسلے میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، انھوں نے اس مفروضہ کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

امریکہ کے پروفیسر اسٹیون گولڈبرگ نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے: "نظام سرداری کی ناگزیریت"۔ مصنف کہتے ہیں کہ معاشرہ میں عورت مرد کے فرق کی وجہ حقیقتہً کوئی سماجی دباؤ نہیں ہے۔ بلکہ دونوں جنسوں میں بنیادی فطری فرق اس کا سبب ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد پروفیسر کو امریکہ کی انتہا پسند خواتین کی طرف سے نہایت سخت خطابات ملے ہیں مثلاً "ظالم خنزیر" اور "مرد سادی" وغیرہ۔

سادیت، کونت دی سادے (۱۸۱۴-۱۷۴۰) کی طرف منسوب ہے۔ اس سے مراد ایک قسم کی جنسی کجروی ہوتی ہے جس کے مبتلا کو اس میں لطف آتا ہے کہ وہ معشوق کو جسمانی تکلیف دے۔ "مرد سادی" کا مطلب یہ ہے کہ ایسا مرد جو عورت کے حق میں ظالم ہو

کتاب کی اشاعت کے بعد پروفیسر گولڈبرگ سے جب "ڈیلی ایکسپریس" کا نمائندہ ملا تو انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا: "مساوات نسواں کی علم بردار خواتین مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تمام انسانی معاشرہ میں مرد کا عمومی غلبہ (MALE DOMINANCE) صرف سماجی حالات کی وجہ سے نہیں ہو سکتا"

اس فرق کی زیادہ حقیقت پسندانہ توجیہہ یہ ہے کہ اس کو مردانہ ہارمون (MALE HORMONE) کا نتیجہ قرار دیا جائے جو کہ ابتدائی جرثومہ حیات پر اس وقت غالب آجاتے ہیں جب کہ وہ ابھی رحم مادر میں ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ چھوٹے بچے ہمیشہ چھوٹی بچیوں سے زیادہ جارح ہوتے ہیں اور یہ فرق اس وقت ظاہر ہو جاتا ہے جب کہ ابھی وہ سماجی حالات کے زیر اثر آئے بھی نہ ہوں۔

مساوات نسواں کے علم برداروں کا مقدمہ، خالص علمی اعتبار سے زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی کہ مرد کا غلبہ سماجی حالات کی وجہ سے ہے نہ کہ پیدائشی خصوصیات کی وجہ سے، تو یقیناً کبھی نہ کبھی دنیا کے کسی خطہ میں ایسا معاشرہ ضرور بنتا جس میں عورتوں کو غلبہ حاصل ہوتا۔ جب کہ پوری معلوم تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حتیٰ کہ اشتراکی معاشرہ میں بھی ایسا نہیں ہے جو جنسی مساوات کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔ روس کی وزارتی کابینہ میں ۶۲ طاقت ور وزراء شامل ہیں۔ مگر ان میں کوئی ایک بھی خاتون ممبر نہیں۔

علم الانسان کی ماہر خاتون ڈاکٹر مارگریٹ میڈ جو خود بھی مساوات نسواں کی تحریک سے تعلق رکھتی ہیں، انھوں نے ساری عمر مختلف انسانی معاشروں کا مطالعہ کیا ہے، تاہم وہ لکھتی ہیں:

"ایسے تمام دعوے جن میں زور شور کے ساتھ ایسے معاشروں کا انکشاف کیا گیا ہے جہاں عورتوں کو غلبہ حاصل تھا، بالکل لغو ہے۔ اس قسم کے عقیدہ کے لئے کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ہر دور میں مرد ہی امور عامہ کے قائد رہے ہیں۔ اور گھر کے اندر بھی اعلیٰ اختیار ہمیشہ انہیں کو حاصل رہا ہے۔"

پروفیسر گولڈبرگ کہتے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرد، عورتوں سے بہتر (BETTER) ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مرد عورتوں سے مختلف (DIFFERENT) ہیں۔ مرد کا دماغ اس سے مختلف طرز پر کام کرتا ہے جس طرح عورت کا دماغ کام کرتا ہے۔ یہ فرق چوہوں وغیرہ کے نر اور مادہ میں بہت واضح طور پر تجربہ کیا جا چکا ہے۔ کچھ عورتیں مستثنیٰ ہو سکتی ہیں۔ مگر وہ بہت معمولی اقلیت ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مرد اور عورت ایک دوسرے سے مختلف ہیں، رحم مادر سے لے کر سوچنے کی صلاحیت تک۔ یہ فرق دونوں کی حیاتیاتی نوعیت کے فرق سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ کسی قسم کے سماجی حالات سے۔

(ڈیلی ایکسپریس ۳ جولائی ۱۹۷۷)

شاعر کا اعتراف

طرماح بن حکیم (م ۱۰۰ھ) اور کمیت بن زید اسدی دونوں ہم عصر شاعر تھے۔ دونوں کا نسب، وطن اور مذہب بالکل الگ الگ تھا۔ طرماح قحطانی، شامی اور خارجی تھا۔ اس کے برعکس کمیت عدنانی، کوفی اور شیعہ تھا جیسا کہ معلوم ہے خارجی حضرت علی کے دشمن تھے۔ خوارج کے چھ بڑے فرقے ہوئے ہیں، ازارقہ، نجدات، صفریہ، عجاردہ، اباضیہ، ثعالبہ۔ یہ سب حضرت عثمان و حضرت علی سے برات و بیزاری میں متفق ہیں اور اپنے اس عقیدے کو تمام عبادتوں سے افضل سمجھتے ہیں۔ طرماح کا تعلق فرقہ ازارقہ سے تھا جو اتنا متشدد تھا کہ حضرت علی کو نعوذ باللہ کافر کہتا تھا اور آپ کے قاتل ابن ملجم کو برسرحق سمجھتا تھا۔ دوسری طرف کمیت شیعہ ہونے کی وجہ سے حضرت علی کی تعریف میں اتنا غلو کرتا تھا کہ آپ کو بشریت سے بلند مانتا تھا۔

اس شدید نظریاتی اختلاف کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ کمیت کہتا تھا "ہم دونوں عوام سے بغض رکھنے میں متفق ہیں"۔ ایک بار دونوں شاعر مخلد بن یزید مھلبی کے یہاں گئے۔ اس نے دونوں کو عزت سے بٹھایا اور شعر سنانے کے لئے کہا۔ طرماح نے بیٹھے بیٹھے سنانا شروع کیا۔ مخلد نے کہا ہمیں کھڑے ہو کر سناؤ۔" طرماح نے کہا: "ہرگز نہیں۔ شاعری کی عزت یہ نہیں کہ میں کھڑا ہو جاؤں اور وہ مجھے ذلیل کرے۔" مخلد غصہ ہو گیا۔ اس نے کہا: تم کمیت کے لئے جگہ خالی کر دو۔" اب کمیت آگے بڑھا اور کھڑے ہو کر اشعار سنانے شروع کئے۔ مخلد بہت خوش ہوا۔ اور اس کو پچاس ہزار درہم انعام دیئے۔ جب دونوں باہر نکلے تو کمیت نے آدھے درہم طرماح کو دیئے۔ اس نے کہا: "اے ابو ضبیبہ، تم خوددار ہو اور میں موقع پسند ہوں۔ اور وقت کے مطابق کام کرتا ہوں۔"

خدا کی اس زمین پر کیا کیا پیش آیا ہے

حضرت شعیب حضرت ابراہیم کی نسل سے تھے۔

نسب نامہ یہ ہے:

شعیب بن میکیل بن یشجر بن مدین بن ابراہیم

حضرت شعیب مدین کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے، یہ شہر بحر احمر کے کنارے واقع تھا۔

حضرت شعیب کو فصاحت میں کمال حاصل تھا اسی خصوصیت کی وجہ سے آپ کو "خطیب الانبیاء" کہا جاتا ہے۔ آپ نے بہترین اسلوب اور اعلیٰ ترین استدلال کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے حق کا پیغام دیا۔ اس کے جواب میں ان کی مدعو قوم نے جو کچھ کیا، اس کا ایک حصہ قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

"انھوں نے کہا، اے شعیب تمھاری کہی ہوئی بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہو۔ اگر تمھارے قبیلہ کا معاملہ نہ ہوتا تو ہم تم کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے۔ ہماری نظر میں تمھاری کوئی وقعت نہیں۔ پیغمبر نے کہا، اے قوم، کیا میرا قبیلہ تمھارے نزدیک زیادہ طاقت ور ہے خدا سے، اس کو تم نے پس پشت ڈال دیا، یقیناً میرے رب کے قابو میں ہے جو تم کرتے ہو۔ (ہود)

ایک شخص نے اپنی جماعت میں کوئی دنیوی بنیاد کھڑی کر لی ہو تو لوگ اس کے خلاف ہاتھ اٹھاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ حالاں کہ جس کے گرد و پیش بظاہر دنیوی بنیادیں نہ ہوں، اس کے خلاف کارروائی کرنے سے اور بھی زیادہ ڈرنا چاہئے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہاں خدا اس کی مدد کے لئے کھڑا ہوا ہو۔ اور جس کی مدد پر خود خدا کھڑا ہو اس کو کون تکلیف پہنچا سکتا ہے اور اگر تکلیف پہنچا دے تو اس کی سزا کتنی سخت بھگتنی پڑے گی۔

قدیم زمانہ میں جب کہ دنیا میں قبائلی نظام تھا، ہر آدمی اپنے قبیلہ کی پناہ میں ہوتا تھا، قبیلہ کے کسی فرد کو کوئی قتل کر دے تو پورے قبیلہ کی ذمہ داری ہو جاتی تھی کہ اس سے بدلہ لے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں اسلام کے دشمنوں نے غلاموں کو سخت ترین عذاب دیا حتیٰ کہ بعض کو مار ڈالا۔ مگر جو لوگ کسی قبیلہ سے وابستہ تھے۔ ان پر اس قسم کا ظلم کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ عمر بن خطاب جب اسلام نہیں لائے تھے، ایک روز تلوار لے کر غصہ میں چلے جا رہے تھے، راستہ میں نعیم بن عبداللہ ملے۔ انھوں نے کہا من تريد يا عمر (اے عمر کس کا قصد ہے) انھوں نے کہا محمد کا قصہ تمام کرنے جا رہا ہوں۔ نعیم نے جواب دیا:

واللہ لقد غرتک یا عمر، اتری بنی عبد مناف تارکیک تمشی علی الارض وقد قتلت محمدا

خدا کی قسم اے عمر تمھارے نفس نے تم کو دھوکہ میں ڈال دیا ہے۔ اگر تم نے محمد کو قتل کر دیا تو کیا بنو عبد مناف تم کو زمین پر چلتا ہوا چھوڑ دیں گے۔ یہ سن کر وہ رک گئے۔

حضرت شعیب کی قوم نے آنجناب سے یہی بات کہی تھی "اگر ہم کو یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تمھارا قبیلہ انتقام لینے کے لئے کھڑا ہو جائے گا تو ہم تمھارا خاتمہ کر دیتے" حضرت شعیب نے جواب دیا کہ تم کو قبیلہ کا خوف ہے اور خدا کا خوف نہیں اگر تم نے مجھے ناحق قتل کرنے کی کوشش کی تو خدا میری پشت پر کھڑا ہو جائے گا اور وہ تم سے اتنا بڑا انتقام لے گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے

انشا پردازی اس کو نہ بچا سکی

عبدالحمید بن یحییٰ (م ۱۳۲ھ) شام میں غیر عربی نسل میں پیدا ہوا۔ مگر اپنی غیر معمولی صلاحیت کی وجہ سے عربی انشا پردازی کا امام بن گیا۔ وہ بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان کا سکریٹری تھا۔ جب عباسیوں نے مروان کو مصر میں قتل کر دیا تو وہ بھاگ کر بحرین چلا گیا اور اپنے دوست ابن المقفع کے پاس مقیم رہا۔ عباسی سپاہی اسے ڈھونڈتے ہوئے ایک روز اچانک وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے پوچھا "تم میں سے کون عبدالحمید ہے" ان میں سے ہر ایک نے اپنے ساتھی کو بچانے کے لئے کہا کہ میں عبدالحمید ہوں۔ سپاہیوں نے ابن مقفع کو پکڑ لیا اور چاہا کہ اسے قتل کر دیں۔ عین اس وقت عبدالحمید نے چلا کر کہا: ٹھیر و ہم میں سے ہر ایک کی کچھ علامتیں ہیں۔ اس لئے تم میں سے کچھ یہاں ہماری نگرانی کے لئے رہیں اور کچھ اپنے افسروں کے پاس جا کر مطلوبہ شخص کی علامت دریافت کریں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور اس کے بعد عبدالحمید کو شناخت کر کے پکڑ لیا اور اس کو قتل کر ڈالا۔

عبدالحمید کا طرز بیان اتنا عمدہ تھا کہ پڑھنے والے پر جادو کا اثر کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بنو امیہ اور عباسیہ کے ٹکراؤ کے زمانہ میں اس نے عباسی تحریک کے لیڈر ابو مسلم خراسانی کے نام ایک خط لکھا یہ خط مروان کی طرف سے تھا۔ جب یہ خط پہنچا تو ابو مسلم نے اس خط کو اس ڈر سے نہیں پڑھا کہ اس کو پڑھ کر کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بنو امیہ کے بارے میں نرم پڑ جائے اور مروان کا حامی بن جائے۔ اس نے اس خط کو بغیر پڑھے جلا دیا۔ پھر ایک پرزہ پر اس کے جواب میں مروان کو یہ شعر لکھ بھیجا

محا السیف اسطار البلاغة وانتحی

علیک لیوث الغاب من کل جانب

بلاغت کی سطروں کو تلوار مٹا دے گی اور جنگل کے شیر ہر سمت سے تمہارے اوپر حملہ کریں گے۔

بہت سے یقین ناکافی معلومات کا نتیجہ ہوتے ہیں

میدہ اور کالک کے ملنے سے جو چیز بنتی ہے، وہ ہماری آنکھ کے لئے بھورے خاکستری رنگ کا سفوف ہوتا ہے۔ مگر اس سفوف کا باریک کیڑا، جو خود بھی سفوف کے ذروں کے برابر ہوتا ہے اور صرف خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے، اس کو کچھ سیاہ اور کچھ سفید "اینٹوں" کا ڈھیر سمجھتا ہے۔ اس کے مشاہدہ کے پیمانہ میں خاکستری سفوف کوئی چیز نہیں۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جو یہ بتاتی ہے کہ انسانی رائیں کتنی غلط ہو سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رائے قائم کرنے کے بارے میں ہم کو انتہائی محتاط ہونا چاہئے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ذہن میں ایک نظریہ بنا لیتا ہے اور اس کو درست سمجھنے لگتا ہے۔ حالاں کہ وہ محض اس کی ناکافی معلومات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے اپنے محدود ذہن کے باہر اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی

فکری ڈھانچہ

ہر دور کا ایک فکری ڈھانچہ ہوتا ہے۔ آدمی اسی فکری ڈھانچہ میں سوچتا ہے اور اسی کے مطابق چیزوں کو اپنے لئے قابل فہم بناتا ہے۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگرس (۱۹۵۶) میں خروشچیف نے اشتراکی دنیا کے "جہنمی حالات" کا انکشاف کیا تھا۔ اس کے بعد سابق امریکی کمیونسٹ ہوورڈ فاسٹ (   ) نے کمیونزم سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس نے اپنے بیان میں کہا تھا۔ "میں خود اپنے فکری ڈھانچہ میں کمیونسٹ بنا" مارکس کی نظریاتی تشریح نے اس کو کمیونسٹ نہیں بنایا تھا۔ وہ ایک انسانیت دوست آدمی تھا اور اس ذہن کے تحت کمیونسٹ بن گیا تھا کہ یہ ظلم اور لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ مگر جب اس کو معلوم ہوا کہ "مزدور ڈکٹیٹرشپ میں پہلے سے بھی زیادہ شدید شکل میں سماجی ظلم جاری ہے، تو اس نے کمیونزم کو چھوڑ دیا ——— ہوورڈ فاسٹ اپنے فکری ڈھانچہ ہی میں کمیونزم کو لے سکتا تھا۔ جب کمیونزم اس کو اپنے فکری ڈھانچہ میں نہیں ملا تو وہ اس کے لئے قابل قبول نہ رہا۔

قدیم زمانہ میں عام طور پر دو قسم کے فکری ڈھانچے دنیا میں رائج تھے۔ ایک مشرکانہ، دوسرا فلسفیانہ۔ مشرکانہ فکری ڈھانچہ اس مفروضہ پر عمل کرتا تھا کہ دنیا کی ہر نمایاں چیز اپنے اندر خدا کا ایک "انش" لئے ہوئے ہے، وہ خدائی ہستی کی ایک توسیع ہے۔ اسی طرح فلسفیانہ فکر ذہنی قیاسات پر قائم تھا۔ یونان میں اس فلسفہ نے ترقی پاکر قیاسی منطق (SYLLOGISM) پیدا کی۔ پچھلے زمانہ میں پیغمبروں کے لائے ہوئے دین میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں، وہ انھیں فکری ڈھانچوں کے رواج عام کی وجہ سے تھیں۔ اس کی ایک مثال موجودہ مسیحیت ہے۔ حضرت مسیح وہی سادہ اور فطری دین لے کر آئے جو قرآن میں ہم کو نظر آتا ہے۔ مگر آنجناب کے بعد آپ کے پیرؤوں نے زمانی فکری ڈھانچہ سے متاثر ہوکر مسیحیت کو شرک اور فلسفہ کا ایک آمیزہ بنا دیا۔ "ابن اللہ" کا تصور مشرکانہ فکر سے متاثر ہونے کی وجہ سے مسیحیت میں شامل ہوا۔ اسی طرح کفارہ کے عقیدہ کے لئے قدیم فلسفیانہ فکر نے زمین فراہم کی۔

ساتویں صدی میں اسلام کے عظیم انقلاب کے باوجود مشرکانہ اور فلسفیانہ فکری ڈھانچے دنیا سے ختم نہ ہوسکے۔ اس کی وجہ سے اسلام، مختصر ابتدائی وقفہ کے بعد، بار بار مضاہاۃ (توبہ ۳۰) کا شکار ہوتا رہا۔ قرآن کی صورت میں اسلام کا الہٰی متن اگرچہ مکمل طور پر محفوظ تھا، مگر مسلمان قومیں عملی اسلام کو مروجہ افکار کے نقشہ میں ڈھالتی رہیں۔ زندہ اور مردہ بزرگوں کا مرکز عقیدت بننا جو مختلف صورتوں میں اسلام میں رائج ہوا، وہ مشرکانہ فکر سے متاثر ہونے کی مثال ہے۔ اسی طرح علم فقہ اور علم کلام، قیاسی منطق سے متاثر ہونے کی مثال۔ موجودہ زمانہ میں اسلام اس قسم کی تیسری اثرپذیری سے دوچار ہوا ہے۔ یہ "نظامی طرز فکر" ہے۔ انیسویں صدی میں، صنعتی انقلاب کے پیدا کردہ حالات کے نتیجہ میں، سیاسی اور معاشی اصطلاحوں میں سوچنے کا رواج ہوا تو مسلمانوں نے اسلام کو بھی سیاسی نظام اور معاشی نظام کی صورت میں پیش کرنا شروع کردیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسلام جو حقیقۃً تعمیر آخرت کا موضوع تھا، تعمیر دنیا کا موضوع بن کر رہ گیا۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ دنیا کا مروجہ فکری ڈھانچہ اور قرآن کا فکری ڈھانچہ دونوں ایک ہو گئے ہیں۔ قرآن کا فکری ڈھانچہ برہانیات پر قائم ہے۔ وہ حقائق اور واقعات کی بنیاد پر بنتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی طرزِ فکر اسی کی علمی صورت ہے۔ اس کے رواج نے تاریخ میں پہلی بار انسانی فکر اور قرآنی فکر کی دوئی کو ختم کر دیا ہے۔ انسان کی فکری زمین آج وہی برہانیاتی زمین ہے جو قرآن کی زمین ہے۔ آج یہ ضرورت نہیں کہ اسلام کو لوگوں کے لئے قابل فہم بنانے کی خاطر کسی دوسرے فکری ڈھانچہ کا سہارا لیا جائے۔ آج ہم کو صرف یہ کرنا ہے کہ قرآن کو اس کی اپنی برہانیاتی زبان (نساء ۱۷۴) میں پیش کر دیں۔ یہی اس کو لوگوں کے نزدیک قابل قبول بنانے کے لئے کافی ہوگا۔

ایک پروفیسر سے راقم الحروف کی اسلام کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میری زبان سے نکلا:

ISLAM MEANS REALISM -

اسلام کا مطلب ہے، حقیقت پسندی۔ وہ اسلام کی اس تشریح سے بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے کہا: "اسلام اگر حقیقت واقعہ سے مطابقت کا دوسرا نام ہو، تو کون ہوگا جو اس کا انکار کرے گا"۔ اسلام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آدمی صورت واقعہ کو تسلیم کرے۔ سوچ کا معاملہ ہو یا عمل کا، آدمی وہی کرے جو عالم خارجی کے تقاضوں کے مطابق ہو:

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا (آل عمران — ۸۳)

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کسی اور طریقہ کو چاہتے ہیں حالاں کہ اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے خوشی سے اور ناخوشی سے۔

سائنس اس قسم کے ایک "دین" کے لئے بہترین ذہنی زمین فراہم کرتی ہے۔ سائنس، یعنی علوم قطعیہ (EXACT SCIENCES) اپنی عین فطرت کے مطابق قطعیت فکر (EXACT THINKING) یا صحت فکر (پریسائز تھنکنگ) پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کے ایک ذہن کے لئے اسلام کی بات اسی طرح قابل فہم بن جاتی ہے جس طرح ایک قانون پسند آدمی کے لئے ایک قانونی نکتہ۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار کسی مجلس میں خدا کے وجود پر بحث ہو رہی تھی۔ مسئلہ طے نہیں ہو رہا تھا۔ بستی میں ایک بزرگ تھے۔ جب بحث لمبی ہو گئی تو کچھ لوگ ان کے پاس گئے اور کہا کہ آپ ہماری مجلس میں چلیں اور ہماری مدد فرمائیں۔ وہ اپنے حجرے سے نکل کر آئے۔ مگر مجلس کے سامنے انھوں نے کوئی لمبی تقریر نہیں کی۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے یہ آیت پڑھی:

افی اللہ شک فاطر السمٰوات والارض

اور اٹھ کر چلے آئے۔ بحث ختم ہو گئی۔ لوگ خدا کے وجود کے قائل ہو گئے۔

سیکڑوں برس پہلے جس چیز نے لوگوں کو مطمئن کیا تھا، وہ آیت کا ادبی زور یا قیاسی استدلال تھا۔ یعنی یہ کہ جب ایک کائنات ہے تو اس کا پیدا کرنے والا بھی ہونا چاہئے۔ تاہم آج کے انسان کے لئے اس کے اندر ایک زبردست واقعاتی استدلال موجود ہے۔ "فاطر" کے معنی عربی زبان میں ہیں، پھاڑنے والا۔ آج کا انسان جس زمین و آسمان سے واقف ہے، وہ ایک پھیلتی ہوئی کائنات ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک ایسی کائنات جو ابتداءً سکڑی ہوئی تھی۔

پھر پھاٹی گئی۔ اس وقت اس کے تمام اجزاء (ایٹم) اندر کی طرف بے پناہ طاقت کے ساتھ کھنچے ہوئے تھے۔ اس واحد مجموعۂ مادہ (سپرایٹم) کے متناؤ کا پھٹ کر بیرونی خلا میں منتشر ہونا کسی خارجی قوت کی مداخلت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ پندرہ بلین سال پہلے اس سپرایٹم میں اخراج طاقت (ENERGY RELEASE) کا ایک واقعہ ہوا اور اس کے بعد کائنات اپنے چاروں طرف تیزی سے پھیلنے لگی ——— کل کا انسان جس خدا کی ہستی کو قیاس کے تحت سمجھتا تھا، آج کے انسان کے لئے ممکن ہو گیا ہے کہ وہ اس کو واقعات وحقائق کی روشنی میں سمجھ لے۔

عرب میں اسلام کو سربلند کرنے کے لئے جو طریق عمل اختیار کیا گیا، اس کو قرآن میں اطراف ارض کو گھٹانے کے عمل (رعد ۴۱) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی حریف سے یکبارگی لڑ پڑنے کے بجائے دھیرے دھیرے اس کی دنیا میں داخل ہونا۔ یہ بات قدیم زمانہ میں زیادہ تر اخلاقی طور پر ہی سمجھی جا سکتی تھی۔ آج وہ ایک ٹھوس حقیقت کے طور پر قابل فہم بن گئی ہے۔ کیونکہ آج کا انسان جن بڑے بڑے منصوبوں کا تجربہ کر رہا ہے، وہ اس کے سوا کسی اور طریقے سے مکمل ہی نہیں کئے جا سکتے۔

والٹر شیرا (WALTER M. SCHIRRA) ایک امریکی خلاباز ہے۔ وہ انسان سوار تین خلائی کشتیوں پر بالائی خلا کا سفر کر چکے ہیں۔ ستمبر ۱۹۷۲ میں وہ ایک عالمی دورہ کے تحت ہندستان آئے تھے۔ ایک تقریر میں انھوں نے امریکہ کی خلائی مہم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

> THE TECHNOLOGY THAT ESSENTIALLY PERMITTED US TO GET INTO SPACE WAS A NIBBLING PROJECT. WE DID ONE THING AT A TIME --- WE TOOK SMALL STEPS INSTEAD OF GIANT STEPS. THE GIANT STEP WAS FINALLY TAKEN, OF COURSE.
>
> Link Weekly (Delhi) October 22, 1972

وہ ٹکنالوجی جس نے بنیادی طور پر ہم کو خلا میں داخل ہونے کا موقع دیا، وہ تھوڑا تھوڑا آگے بڑھنے کا منصوبہ تھا۔ ہم نے ایک وقت میں صرف ایک کام کیا۔ ہم نے چھوٹے چھوٹے اقدامات کئے۔ ایسا نہیں کیا کہ یکبارگی بڑا قدم اٹھا دیں۔ بلاشبہ بڑا قدم اٹھایا گیا۔ مگر سب سے آخر میں۔

اسلام نے تدریجی عمل کی تلقین کی تھی۔ مگر شاعری اور تلوار کے زمانہ کا انسان اس کو پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا۔ سائنس کے دور میں اس قسم کا عمل ایک ایسی ٹکنکل ضرورت بن چکا ہے جس کے بغیر کوئی نتیجہ خیز کام کیا ہی نہیں جا سکتا۔ آج کے سائنسی انسان کے لئے اسلام کا طریق عمل، پچھلے دور کے انسان کے مقابلہ میں، زیادہ بہتر طور پر قابل فہم بن چکا ہے۔

۱۹۶۵ کی بات ہے۔ لکھنؤ میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے فلسفہ میں ایم۔اے کیا تھا۔ اور برٹرینڈ رسل پر ریسرچ کی تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ پورے طور پر ملحد ہو چکے تھے۔ ایک روز گفتگو کے دوران انھوں نے کہا:

خدا کو ثابت کرنے کے لئے آپ کے پاس کرائٹیرین (معیار استدلال) کیا ہے۔

میری زبان سے نکلا: "وہی کرائٹیرین جو آپ کے پاس کوئی چیز ثابت کرنے کے لئے ہو" ایک جملہ انھوں نے کہا۔ ایک جملہ میں نے۔ اور اس کے بعد گفتگو ختم ہوگئی۔ اس کی وجہ مخاطب کا سائنٹفک ذہن تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سائنس نے جو دنیا دریافت کی ہے، وہ اتنی پیچیدہ ہے کہ کسی چیز پر بھی براہ راست دلیل قائم نہیں کی جاسکتی۔ ہمارے لئے بالواسطہ استدلال، بالفاظ دیگر استنباطی استدلال، کے سوا چارہ نہیں اور خدا کے وجود کو ثابت کرنے میں عقلی مشکلات صرف اس وقت تک ہیں جب تک براہ راست استدلال پر اصرار کیا جائے۔ استنباطی استدلال کو جائز استدلال تسلیم کرنے کے بعد خدا کے وجود کو ثابت کرنا اتنا ہی یقینی بن جاتا ہے جتنا کسی دوسری معلوم چیز کے وجود کو ثابت کرنا۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ زمانہ کا ذہنی ڈھانچہ، ابتدائی زمین کی حد تک، کتنا زیادہ اسلام کے موافق ہوچکا ہے۔ اسلام کا پیغام، آج کے انسان کے لئے، تاریخ کے تمام معلوم زمانوں سے زیادہ، قابل قبول ہوچکا ہے۔ آج ساری ضرورت صرف یہ ہے کہ اسلام کو، تمام انسانی اضافوں سے الگ کرکے، اس کی بے آمیز شکل میں لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے۔ اس کے بعد اس واقعہ کو ظہور میں آنے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی کہ "کوئی خیمہ یا مکان نہ بچے جہاں اسلام داخل نہ ہوگیا ہو" اور کوئی سینہ نہ ہو جس کے اندر اسلام کی فطری آواز نے اپنی جگہ نہ بنالی ہو۔

مسیح کی زبان سے

آسمان کی بادشاہی اس بڑے جال کی مانند ہے جو دریا میں ڈالا گیا۔ اور اس نے ہر قسم کی مچھلیاں سمیٹ لیں۔ اور جب بھر گیا تو اسے کنارے پر کھینچ لائے۔ اور بیٹھ کر اچھی اچھی تو برتنوں میں جمع کرلیں اور جو خراب تھیں پھینک دیں۔ دنیا کے آخر میں ایسا ہی ہوگا۔ فرشتے نکلیں گے اور شریروں کو راستبازوں سے جدا کردیں گے۔ اور ان کو آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے۔ وہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔ متی ۱۳ : ۴۷-۵۰

ایک نفسیاتی کمزوری

قرآن کی سورہ نمبر ۷۴ میں بتایا گیا ہے کہ جہنم کے اوپر ۱۹ فرشتے مقرر ہوں گے۔ جب یہ آیتیں اتریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پڑھ کر مکہ والوں کو سنایا تو مخالفین کو آپ کی دعوت کا مذاق اڑانے کا بہت اچھا بہانہ ہاتھ آگیا۔ ابوجہل نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "بھائیو! کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ تم میں سے دس دس آدمی مل کر بھی دوزخ کے ایک ایک سپاہی سے نمٹ نہ لیں گے"۔ بنی جمح کا ایک پہلوان بولا: "سترہ سے تو میں اکیلا نمٹ لوں گا۔ باقی دو کو تم لوگ دیکھ لینا"۔

یہ لوگ اتنے بے وقوف نہ تھے کہ اس بات کو نہ جانیں کہ انیس کے معنی ہیں خدا کے انیس۔ اور خدا کا تو ایک ہی سارے عالم کو زیر کرنے کے لئے کافی ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ اپنے ہی جیسا ایک انسان دیکھ رہے تھے۔ بلکہ دنیوی جاہ و مرتبہ میں آپ ان سے بھی بہت کم تھے۔ ایسی حالت میں ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان کے درمیان کا ایک معمولی انسان خدا کی طرف سے بول سکتا ہے۔ ایسا کہہ کر دراصل وہ رسول کا مذاق اڑا رہے تھے نہ خدا اور اس کے فرشتوں کا۔

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ کسی بات کو اس کی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے نہیں دیکھ پاتا۔ وہ حقیقت کو اس کے ظاہر کے پہلو سے جانچتا ہے۔ وہ "بات" کے بجائے بات کہنے والے کو دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبیوں کے پیغام کی اہمیت ان کے مخاطبین کی سمجھ میں نہ آسکی۔ نبی اپنے ظاہری حلیہ کے اعتبار سے ان کو ایک معمولی انسان نظر آتا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک معمولی انسان کو یہ درجہ کیسے مل سکتا ہے کہ خدا کی تجلیات اس پر نازل ہوں، وہ اس مقام پر کھڑا کیا جائے کہ لوگوں کو امر حق سے آگاہ کرے۔ انھوں نے پیشگی فرض کرلیا تھا کہ یہ ایک غیر اہم آدمی ہے، اس لئے اس کی ہر بات ان کو غیر اہم نظر آتی تھی۔

اس میں آپ کے لئے سبق ہے

ہنری ہراس (۱۸۸۹ – ۱۹۵۶) ایک اسپینی مسیحی تھے۔ وہ ۳۴ سال کی عمر میں ۱۸ نومبر ۱۹۲۲ کو بمبئی کے ساحل پر اترے۔ ہندستان کی زمین نے انھیں متاثر کیا اور انھوں نے طے کرلیا کہ وہ اسی ملک میں رہ کر کام کریں گے۔

فادر ہراس (Fr HENRY HERAS) چند دن بعد سینٹ زیویرس کالج کے پرنسپل سے ملے۔ وہ ایک تاریخ داں تھے۔ اس لئے پرنسپل نے پوچھا "آپ کون سی تاریخ پڑھانا پسند کریں گے"۔ فادر ہراس نے فی الفور جواب دیا "ہندستانی تاریخ"۔ پرنسپل کا اگلا سوال تھا "ہندستانی تاریخ کے بارے میں آپ کا مطالعہ کیا ہے"۔ انھوں نے جواب دیا "کچھ نہیں"۔ "پھر آپ کیسے ہندستانی تاریخ پڑھائیں گے"۔ فادر ہراس کا جواب تھا:

I SHALL STUDY IT

"میں ہندستانی تاریخ کو پڑھ کر اپنے آپ کو تیار کروں گا پھر اس کو پڑھاؤں گا"۔

فادر ہراس نے ہندستانی تاریخ کے مطالعہ میں اتنی زیادہ محنت کی کہ وہ سر جادو ناتھ سرکار اور ڈاکٹر سریندر ناتھ سین کے درجے کے مورخ بن گئے۔ آج بمبئی میں ان کے نام پر تاریخی مطالعہ کا ایک بہت بڑا ادارہ قائم ہے جس کا نام ہے — ہراس انسٹی ٹیوٹ۔

ساٹھ کروڑ کام

ایادصیاہی (سابق صدر جن سنگھ) کی موت پر مختلف لوگوں نے مختلف تبصرے کیے۔ مگر ایک تبصرہ ایسا تھا جس نے میرے سارے وجود کو جھنجھوڑ دیا۔

"ـــــ ایادصیاہی جب تک موجودہ دنیا میں تھے، انھوں نے قوم کے مسئلہ کو اصل مسئلہ سمجھا" کہنے والے نے کہا "مگر اب موت کے بعد انھیں معلوم ہوا ہوگا کہ اصل مسئلہ خود اپنی ذات کا مسئلہ ہے"

یہ تبصرہ صرف مرنے والے کے اوپر نہیں بلکہ زندہ رہنے والوں کے لئے بھی ہے۔ وہ ہمارے اوپر تنقید ہے۔ کیونکہ اس زمین پر صرف مسلمان ہی ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہیں۔ مگر انھوں نے دوسروں کو اس حقیقت سے آگاہ نہیں کیا۔ انھوں نے ماحول کے اندر اگر اپنا کوئی تعارف کرایا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ وہ ایک قوم ہیں جو اپنے لئے کچھ حقوق کی طلب گار ہے۔ انھوں نے اب تک اپنا یہ تعارف پیش نہیں کیا ہے کہ وہ نبی آخرالزماں کی امت ہیں ان کے پاس حقیقت کا وہ علم ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں۔

ہمارے ملک میں ہر روز جو سب سے بڑا واقعہ پیش آتا ہے، وہ یہ کہ یہاں بسنے والے انسانوں میں سے ایک لاکھ پچیس ہزار آدمی مرجاتے ہیں کوئی نہیں جانتا کہ موت کے فرشتے کل کے لئے جن ایک لاکھ پچیس ہزار انسانوں کی فہرست تیار کر رہے ہیں، اس میں ہمارے ملک کے باشندوں میں سے کس کس کا نام ہو۔ یہ سارے لوگ اس حالت میں موت کی طرف چلے جا رہے ہیں کہ انھیں کچھ نہیں معلوم کہ موت کے بعد کیا پیش آئے گا۔ اب چونکہ صرف مسلمان ہی وہ گروہ ہیں جن کے پاس حقیقت کا صحیح علم ہے، اس لئے ہماری ذمے داری بے حد شدید ہو جاتی ہے۔ اس ملک کی آبادی اگر ساٹھ کروڑ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ساٹھ کروڑ کام کرنے ہیں۔ ہمیں ساٹھ کروڑ انسانوں تک پہنچ کر خدا کا پیغام حق سنانا ہے۔ کیونکہ آج ہر انسان حقیقت سے غافل ہے۔ ہر آدمی اس کا حاجت مند ہے کہ اس کو دین حق کا پیغام پہنچایا جائے۔ اس کو ان مسائل سے آگاہ کیا جائے جو مرنے کے بعد سامنے آنے والے ہیں۔

ارتقا کا افسانہ

نظریۂ ارتقار کے حامیوں نے بہت سے "قدیم انسان" دریافت کئے ہیں۔ مثلاً پلٹ ڈاؤن مین، نینڈرتھل مین، پیکنگ مین، جاوا مین وغیرہ۔ قدیم انسان کی یہ تمام صورتیں فاسل کی بنیاد پر بنائی گئی ہیں جو زمین میں کھدائی سے برآمد ہوئی ہیں۔ نظریۂ ارتقاء زندگی کی مختلف قسموں کے لئے جس عمل کو فرض کرتا ہے اس کے مطابق درمیانی انواع حیات (INTERMEDIATE SPECIES) کا وجود بھی لازماً ہونا چاہئے۔ مگر ایسی انواع ابھی تک گم شدہ کڑیوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈارون نے تسلیم کیا تھا کہ درمیانی انواع حیات کے نمونے ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ تاہم ڈارون کے بعد قدیم فاسل کی بنیاد پر بہت سی عجیب وغریب انسانی شکلیں بنائی گئی ہیں۔ اور یہ فرض کیا جاتا ہے کہ یہ انسانی سلسلۂ حیات کی قدیم ارتقائی کڑیاں ہیں۔

انھیں میں سے ایک نینڈرتھل مین ہے جو جرمنی کی نینڈر نامی وادی کی طرف منسوب ہے۔ اس قسم کی ہڈیاں اور ڈھانچے ۱۸۵۶ سے ۱۹۰۰ تک ایشیا، یورپ، شمالی افریقہ کے تقریباً ۵۰ مقامات پر ملے۔ پروفیسر بول (MARCELLIN BOULE) نے ان ٹکڑوں کا مشاہدہ کرکے ان کی جو تعبیر کی، اس کو عام طور پر تسلیم کرتے ہوئے اس کو ابتدائی انسانی سلسلے کی ایک کڑی مان لیا گیا ——— گم شدہ کڑیوں میں سے ایک کڑی معلوم کرلی گئی۔

نینڈرتھل مین کی تصویریں کتابوں میں چھپنے لگیں۔ حتیٰ کہ اس کے مجسمے بن گئے۔ مگر بعد کو علمائے حیاتیات نے جو تحقیقات کیں، اس نے بتایا کہ پروفیسر بول نے اندازہ کرنے میں کئی اہم غلطیاں کی تھیں۔ ۱۹۵۵ میں ولیم اسٹراس (جانسن ہاپکنس یونیورسٹی) اور اے۔ جے۔ ای کیو (لندن) نے نینڈرتھل مین کے بنائے گئے ڈھانچہ کا ازسرنو جائزہ لیا۔ یہ رپورٹ مکمل طور پر کوارٹرلی ریویو میں چھپ چکی ہے:

QUARTERLY REVIEW OF BIOLOGY
XXXIII (1957)

محققین کہتے ہیں کہ نینڈرتھل مین کا ڈھانچہ جو ۴۰-۵۰ سال کی عمر کے ایک آدمی کا ہے وہ گٹھیا کی بیماری سے بوسیدہ ہوگیا تھا۔ اس بیماری نے آدمی کے نچلے جبڑے اور اس کی گردن اور پورے ڈھانچہ کو متاثر کیا۔ اس آدمی کے سر کا آگے کی طرف جھکاؤ جو پروفیسر بول نے نوٹ کیا تھا، وہ کم از کم جزئی طور پر، اس کی بیماری کے سبب سے تھا۔ حقیقۃً اس آدمی کا ڈھانچہ ویسا ہی تھا جیسا آج ایک اوسط فرانسیسی آدمی کا ڈھانچہ۔ حتیٰ کہ جدید تحقیقات نے یہ بھی بتایا ہے کہ نینڈرتھل کے دماغ (BRAIN) کا سائز بھی تقریباً وہی تھا جو آج ایک اوسط یورپی شخص کا ہوتا ہے۔ اس کے بال درست کرکے اور موجودہ لباس پہنا کر کھڑا کردیا جائے تو آج کے مہذب انسان سے وہ کچھ بھی مختلف معلوم نہیں ہوگا۔ حال میں نینڈرتھل مین کے جو مزید فاسل ملے ہیں وہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ وہ ابتدائی کڑی نہیں بلکہ آج کے ایک انسان کی مانند تھا۔ نینڈرتھل انسان، لفظاً انسان کے تمام مفہوم کے اعتبار سے مکمل انسان تھا۔

F. CLARK HOWELL,
EARLY MAN.
NEW YORK, TIME-LIFE BOOKS, 1968
PP 123-24

مابعدالطبیعیات کی طرف

انسانی دماغ کی بناوٹ دس سال پہلے تک، ایک راز سمجھی جاتی تھی۔ آج سائنس دانوں کا خیال ہے کہ وہ سائنس کے اوپر سے بہت سے پردے ہٹانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ مگر انسانی دماغ کے بارے میں معلومات میں جو اضافہ ہوا ہے، وہ حیرت انگیز طور پر قدیم مفروضات کی تردید کر رہا ہے۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ انسانی دماغ میوسین دور (MIOCENE PERIOD) کے بعد چودہ ملین سال میں ترقی کر کے موجودہ حالت تک پہنچا ہے۔ مگر موجودہ معلومات بتاتی ہیں کہ انسانی دماغ، سابقہ قیاس کے برعکس، اتنا زیادہ پیچیدہ ہے کہ مذکورہ مدت اس کے ارتقار کے لئے کسی طرح کافی نہیں ہوسکتی۔

انسانی دماغ کے سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ وہ "موڈ" کو کس طرح بدلتا ہے۔ اس سلسلے میں تحقیق کرنے والوں نے دواؤں کے ذریعہ مصنوعی طور پر موڈ کو بدلنے کی کوشش کی۔ یہ دوائیں مختلف کیفی حالات کو گھٹا بڑھا سکتی تھیں یا ان کو بدل سکتی تھیں۔ مثلاً نیند کو کم یا زیادہ کرنا، جنسی جذبات کو متاثر کرنا، حافظہ کی مدت کو مختصر یا لمبا کرنا، احساس حسن کو گھٹانا بڑھانا۔ وغیرہ۔

مگر اس میدان میں تحقیق کرنے والے اپنی تحقیق کے نتائج سے کسی قدر گھبرا رہے ہیں۔ کیوں کہ انھیں معلوم نہیں کہ وہ حقیقتہً کس منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں:

THE RESEARCHERS ARE SLIGHTLY PERTURBED SINCE THEY FEEL THEY DON'T KNOW WHERE THEY ARE REALLY HEADED. PERHAPS THEY ARE STEPPING INTO THE REALM OF METAPHYSICS.

شاید وہ مابعدالطبیعیات کی دنیا میں داخل ہو رہے ہیں۔

(ٹائمس آف انڈیا ۲۸ جنوری ۱۹۷۸)

۔۔۔ مگر اس کے لئے لوگ چندہ نہیں دیں گے

پھلواری شریف کے چند نوجوان جلسۂ سیرت کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ان کا جذبہ یہ تھا کہ پھلواری شریف ایک تاریخی بستی ہے۔ لہذا جلسہ بھی تاریخی نوعیت کا ہونا چاہئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کتنا روپیہ خرچ کرو گے۔ جواب ملا کہ چار یا پانچ ہزار روپیہ چندہ ہو جائے گا۔ میں نے کہا بلاشبہ ہمارے لئے یہ بات باعث فخر ہے کہ ہم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہیں۔ ان کی محبت ہماری سب سے قیمتی متاع ہے۔ لیکن ان کی یاد کو تازہ رکھنے، ان کے اسوۂ حسنہ کو عام کرنے کے لئے جلسہ ہی کیا ضروری ہے، پھلواری شریف میں کوئی اچھی لائبریری نہیں ہے۔ اتنی رقم سے ایک اچھی لائبریری کی بنیاد ڈالی جاسکتی ہے جس میں سیرت پر اعلیٰ درجہ کا لٹریچر ہو اور اسی لائبریری میں تعلیم بالغان کا ایک مرکز بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ جلسہ کی تقریر ہوا میں تحلیل ہو جائے گی۔ لائبریری کا فیض پورے سال بھر لوگوں کو پہنچتا رہے گا۔ نوجوان میری بات سن کر قائل ہوگئے۔ انھوں نے کہا "لیکن لائبریری کے لئے لوگ چندہ نہیں دیں گے جب کہ جلسہ کے لئے آسانی سے رقم فراہم ہو جائے گی"

(نقیب ۱۶ جنوری ۱۹۷۸)

ڈیگال ازم: اپنی مقبولیت کی قیمت پر قوم کے مستقبل کی تعمیر

ہندوستان کے وزیر خارجہ مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے فروری ۱۹۷۸ کے پہلے ہفتہ میں پاکستان کا دورہ کیا۔ اس موقع پر پاکستان کے فوجی حکمراں جنرل ضیاء الحق نے اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے کہا:

THE BEST DESCRIPTION I CAN GIVE OF MR VAJPAYEE IS THAT AS A POLITICIAN IN OFFICE HE IS DIFFERENT FROM WHAT HE WAS IN THE OPPOSITION.

مسٹر باجپئی کے بارے میں بہترین الفاظ جو میں کہہ سکتا ہوں، وہ یہ کہ بحیثیت وزیر حکومت وہ اس سے مختلف ہیں جیسے کہ وہ اس وقت تھے جب کہ وہ اپوزیشن میں تھے۔

دونوں ملکوں کے لیڈروں کے درمیان اسلام آباد میں جو گفتگو ہوئی، اس میں کشمیر کا مسئلہ نمایاں رہا۔ اس واقعہ کے باوجود کہ دونوں ممالک اپنے تعلقات کو مستحکم بنانے کے لئے پوری طرح سنجیدہ تھے، طرفین نے محسوس کیا کہ کشمیر کا مسئلہ دونوں کے تعلقات کو معمول پر لانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، کیونکہ:

THE PUBLIC OPINION IN INDIA WAS VERY SENSITIVE ON THIS SUBJECT.

ہندستان کی رائے عامہ اس مسئلہ کے بارے میں بے حد حساس ہے۔ دوسری طرف جنرل ضیاء الحق نے صفائی کے ساتھ کہا کہ بنیادی مشکل یہ ہے کہ:

WE ARE ALLERGIC ON KASHMIR

کشمیر کے معاملہ میں ہم پاکستانی الرجک واقع ہوئے ہیں۔

ٹائمس آف انڈیا، ۷ فروری ۱۹۷۸

یہ اخباری رپورٹ بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ کی "جمہوری سیاست"، کس تضاد سے دوچار ہے۔ ایک لیڈر جب تک ایوان حکومت کے باہر ہوتا ہے، وہ آتشیں تقریریں کرتا ہے، کیونکہ ہندو پاک جیسے علاقہ میں عوامی لیڈر بننے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔ مگر اس کی سیاسی مقبولیت جب اس کو حکومت کی کرسی پر پہنچا دیتی ہے تو معاملہ بدل جاتا ہے۔ اب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کا انتظام چلانے کے لئے حقیقت پسندی کی ضرورت ہے۔ مگر یہاں عوام کی ذہنی جذباتیت، حقیقت پسندانہ سیاست کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے جو اس سے پہلے حزب اختلاف کی سیاست چلانے کے لئے سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوئی تھی۔ اس تضاد کا واحد حل "ڈیگال ازم" ہے یعنی اپنی مقبولیت کی قیمت پر ملک کے مستقبل کی تعمیر۔ جنرل ڈیگال (نے الجیریا کو آزاد کرکے اچانک فرانس کو یورپ کا سب سے طاقت ور ملک بنا دیا۔ اگرچہ اس کے بعد ڈیگال کی اپنی سیاسی زندگی ختم ہوگئی ——— ڈیگال ازم عملاً سیاسی خودکشی کے ہم معنی ہے۔ اور خودکشی کی معروف قسم جتنی عام ہے، یہ دوسری قسم اتنی ہی کمیاب ہے۔

الرسالہ کے اگلے شمارہ (اپریل ۱۹۷۸) میں ایک انتہائی اہم مضمون آرہا ہے جس میں دس زندہ سائنس دانوں نے کائنات کے بارہ میں حیرت انگیز حقائق کا انکشاف کیا ہے ——— ایڈیٹر

یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۴ میں "دارالارشاد" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ ادارہ کے مقاصد بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"ہمارے کاموں کی بڑی قسمیں صرف دو ہی ہیں — مسلمانوں کی داخلی اصلاح واحیائے علم وعمل، اور غیر قوموں میں اسلام کی تبلیغ۔ یہ دونوں کام بغیر کسی ایسی جماعت کی موجودگی کے انجام نہیں پا سکتے۔ جس قدر تحریکیں، انجمنیں، کانفرنسیں اور متفرق کوششیں بغیر اس کے ہوں گی، وہ اسی طرح ضائع ہو جائیں گی جس طرح اب تک ضائع ہو چکی ہیں" البلاغ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵

چالیس سال پہلے مولانا آزاد کا یہ تجزیہ کس قدر صحیح تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ دنوں بعد وہ ان دونوں کاموں کو چھوڑ کر "متفرق کوششوں" بالفاظ دیگر سیاست کی لائن پر چل پڑے۔ اگرچہ وہ آخر وقت تک یہی اعلان کرتے رہے کہ "میں نے ۱۶ سال کی عمر میں اپنے لئے جو راستہ مقرر کیا تھا، اسی پر میں آج بھی قائم ہوں"

یہی موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام شخصیتوں کا حال ہوا ہے۔ وہ آغاز میں ایک خالص دینی مقصد لے کر اٹھیں۔ مگر دھیرے دھیرے ان کی گاڑی سیاست کی پٹری پر اتر گئی۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ہر ایک آخر وقت تک یہی اعلان کرتا رہا کہ وہ اب بھی اسی مقصد پر قائم ہے جو اس نے شروع میں اپنے سامنے رکھا تھا۔

وقت گزرنے کے بعد

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو مہاتما گاندھی کو گولی سے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس وقت سے ہر سال یہ دن "یوم شہیداں" کے طور پر منایا جاتا ہے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۷۸ کو اس موقع پر جو تقریبات ہوئیں، ان میں سے ایک یہ تھا کہ برطانی نوبل انعام یافتہ لارڈ فلپ نوئل بیکر کو لکچر کے لئے مدعو کیا گیا۔ اس اجتماع کی صدارت مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے انجام دی۔

مسٹر باجپئی، جو اس وقت ہندستان کے وزیر خارجہ ہیں، ۱۹۴۸ میں ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی (ہندو مہاسبھا) کے پرسنل سکریٹری تھے۔ مسٹر باجپئی کی صدارتی تقریر کی جو رپورٹ اخبارات میں آئی ہے، اس کا ایک حصہ یہ ہے۔

MR ATAL BEHARI VAJPAYEE, EXTERNAL AFFAIRS MINISTER, CONFESSED HERE TODAY THAT HE HAD FOUND MAHATMA GANDHI WANTING AT THE TIME OF INDIA'S PARTITION IN HIS APPROACH TO THE COMMUNAL QUESTION.

The Times of India, 31.1.1978

وزیر خارجہ مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے اپنی تقریر میں اعتراف کیا کہ اُس وقت ان کا خیال تھا کہ مہاتما گاندھی نے ملک کی تقسیم کے وقت فرقہ وارانہ سوال پر جو موقف اختیار کیا، وہ قومی معیار سے گرا ہوا تھا۔ (مگر اب وہ سمجھتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کا موقف ہی درست تھا)

حقیقت پسند رہنماؤں کے ساتھ اکثر یہ المیہ پیش آتا ہے کہ ان کے وقت کے پرجوش لوگ ان کے موقف کو پست ہمتی کا موقف سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ بعد کے حالات ثابت کرتے ہیں کہ وہی زیادہ صحیح اور قابل عمل تھا۔

بناوٹی قصے

"شیخ ابویزید قرطبی فرماتے ہیں۔ میں نے یہ سنا کہ جو شخص ستر ہزار بار لا الٰہ الا اللہ پڑھے اس کو دوزخ کی آگ سے نجات ملے۔ میں نے یہ خبر سن کر ایک نصاب یعنی ستر ہزار کی تعداد اپنی بیوی کے لئے بھی پڑھا۔ اور کئی نصاب خود اپنے لئے پڑھ کر ذخیرۂ آخرت بنایا۔

ہمارے پاس ایک نوجوان رہتا تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ صاحب کشف ہے۔ جنت دوزخ کا بھی اس کو کشف ہوتا ہے۔ مجھے اس کی صحت میں کچھ تردد تھا۔ ایک مرتبہ وہ نوجوان ہمارے ساتھ کھانے میں شریک تھا۔ دفعتہً اس نے ایک چیخ ماری اور اس کا سانس پھولنے لگا۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ اس نے بتایا کہ میں نے ابھی اپنی ماں کو دیکھا ہے۔ وہ دوزخ میں جل رہی ہے۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میرے پاس لا الٰہ الا اللہ کے پڑھے ہوئے جو نصاب ہیں، ان میں سے ایک نصاب اس کی ماں کو بخش دوں۔ اس طرح اس نوجوان کی سچائی کا بھی تجربہ ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے ایک نصاب ستر ہزار کا، ان نصابوں میں سے جو اپنے لئے پڑھے تھے، اس کی ماں کو بخش دیا۔ یہ میں نے چپکے ہی سے اپنے دل میں بخشا تھا اور میرے اس پڑھنے کی خبر بھی اللہ کے سوا کسی کو نہ تھی۔ مگر اس کے بعد فوراً ہی وہ نوجوان کہنے لگا کہ چچا! میری ماں دوزخ کے عذاب سے ہٹا دی گئی" (۴۴)

یہ ایک معمولی سی مثال ہے۔ اس طرح کے بے شمار قصے گھڑ گھڑ کر امت کے اندر پھیلا دیئے گئے ہیں۔ پچھلی صدیوں میں لاتعداد کتابیں لکھی گئی ہیں جو اس قسم کی بناوٹی کہانیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ ان قصوں اور کرامات کی جعلی داستانوں نے بہت سے لوگوں کو موقع دیا ہے کہ وہ ان کے ذریعہ مذہب کی دکانیں قائم کریں۔ کیونکہ عوام بہت جلد طلسماتی قصوں کے فریب میں آجاتے ہیں۔

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

ماہنامہ الرسالہ۔ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی

۱۔ مقام اشاعت جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۲۔ وقفۂ اشاعت ماہانہ

۳۔ نام پرنٹر (طابع) ثانی اثنین خاں
قومیت ہندوستانی
پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

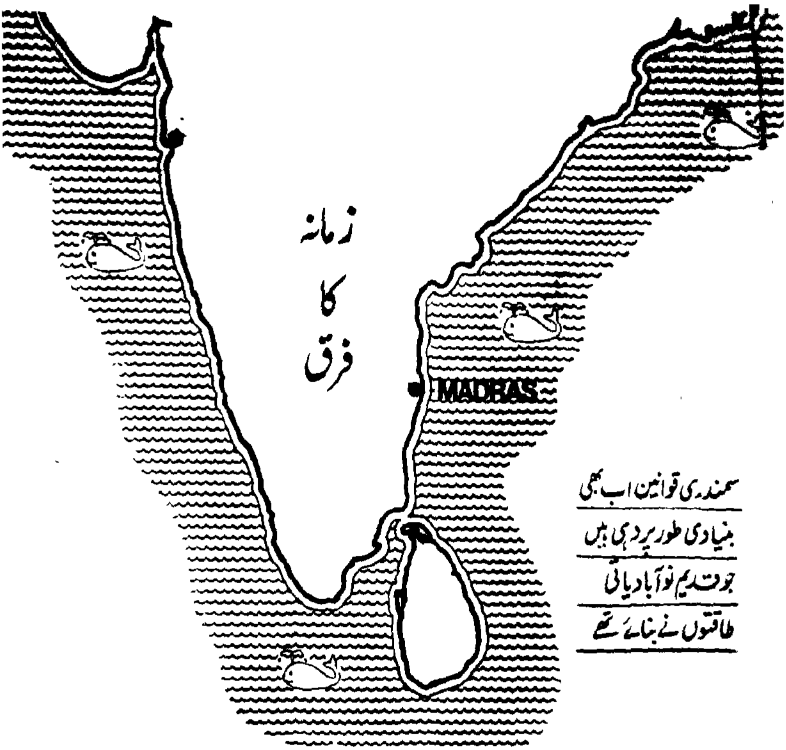
۴۔ نام پبلشر (ناشر) ثانی اثنین خاں
قومیت ہندوستانی
پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۵۔ نام ایڈیٹر (مدیر مسئول) ثانی اثنین خاں
قومیت ہندوستانی
پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

۶۔ نام اور پتہ مالک رسالہ ثانی اثنین خاں
جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

میں ثانی اثنین خاں تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں، میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

ثانی اثنین خاں
یکم مارچ ۱۹۷۸ء



سمندری قوانین اب بھی
بنیادی طور پر وہی ہیں
جو قدیم نوآبادیاتی
طاقتوں نے بنائے تھے

قدیم زمانہ میں سمندروں کی حد بندی کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بحری طاقت وجود میں آنے کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا۔ طے کیا گیا کہ کسی ملک کی سرحد سے تین میل تک کا سمندری پانی اس کا علاقائی پانی شمار ہوگا۔ تین میل کی حد اس سادہ سے حساب پر مقرر کی گئی تھی کہ ساحلی توپوں کی مار تین میل تک جاتی ہے۔ اس وقت سمندر زیادہ سے زیادہ کسی دشمن کے لئے آبی سڑک کا معنی رکھتی تھی۔ اس لئے سرحدی ریاستوں نے اتنے فاصلے کو کافی سمجھا جو جنگی جہازوں کے حملے سے انھیں محفوظ رکھے۔

موجودہ زمانہ میں سمندری ساحل نے نئی اہمیت حاصل کرلی ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ سمندر کے نیچے قیمتی معدنیات خصوصاً پٹرول کے ذخائر موجود ہیں۔ اس لئے اب ملکوں کو فکر ہوئی کہ اپنے ساحلی علاقوں میں اضافہ کریں۔ ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی آزادی کے بعد سے مسلسل یہ مسئلہ نظرثانی کے لئے اٹھایا جاتا رہا ہے۔ مئی ۱۹۷۶ میں نیویارک میں ۱۵۰ قوموں کی کانفرنس اس مسئلہ پر ہوئی۔ ہندستان اور دوسری زیر ترقی اقوام کی طرف سے یہ تجویز تھی کہ علاقائی منطقہ (TERRITORIAL ZONE) کو تین میل سے بڑھا کر بارہ میل کر دیا جائے۔ اور اسی کے ساتھ ساحلی ریاستوں کی خشکی کی سرحد سے دو سو میل تک کے پانی کو اقتصادی منطقہ (ECONOMIC ZONE) قرار دیا جائے جس میں ان ریاستوں کو سمندری ذرائع کے خصوصی استعمال کا حق ہو۔ تاہم یہ تجویز نیویارک کانفرنس میں منظور نہ ہو سکی

ایک سفر

جنوری ۱۹۷۸ کے دوسرے ہفتہ میں برہان پور کا سفر ہوا۔ ۹ جنوری کی شام کو برہان پور پہنچا اور ۱۱ جنوری کو دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔

برہان پور، دہلی سے ۱۰۵۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ مدھیہ پردیش کے اس تاریخی شہر کی بنیاد پانچ سو سال پہلے شاہان فاروقی کے زمانہ میں ڈالی گئی تھی۔ موجودہ آبادی تقریباً سوالاکھ ہے جس میں نصف سے کچھ کم مسلمان ہیں۔ یہاں کے خاص کاروبار دو ہیں۔ ایک بیڑی۔ دوسرا پاورلوم کے کپڑے۔ شہر دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک طرف مسلمان آباد ہیں۔ دوسری طرف ہندو صاحبان۔ ہندو مسلم تعلقات بہت اچھے ہیں۔ یہاں کثرت سے تاریخی عمارتیں ہیں۔ جامع مسجد بہت بڑی اور انوکھی تعمیر کا نمونہ ہے۔ یہ ۵۰ - ۱۶۴۶ء میں مکمل طور پر پتھر سے بنائی گئی۔ اس کے اندر عربی کے علاوہ ایک سنسکرت کا کتبہ ہے۔ اس کتبہ میں حمد کے بعد لکھا ہوا ہے —— "جب تک سورج اور چاند ستارے ہیں، شاہان فاروقی کا اقتدار بھی دنیا میں قائم رہے"

فقہ کی مشہور کتاب فتاویٰ عالمگیری اسی شہر برہان پور میں اورنگ زیب کے آخری زمانہ میں لکھی گئی موجودہ محمڈن لا اسی کا خلاصہ ہے۔ اورنگ زیب کے حکم سے شیخ نظام الدین نے چار علمائے جون پور کی مدد سے اس کو مرتب کیا تھا۔ عبدالرحیم خان خاناں ۲۸ سال تک برہان پور کے گورنر رہے۔ اسی زمانہ میں ۱۰۲۵ھ میں ملا عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی تصنیف کی۔ شیخ علی متقی (۸۸۵ھ—۹۷۵ھ) مؤلف کنز العمال یہیں کے رہنے والے تھے۔ برہان پور، مغل دور میں دکن کے چھ صوبوں کا صدر مقام تھا۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب سب یہاں رہ چکے ہیں۔ پندرھویں اور سولھویں صدی میں یہاں شاہان فاروقی کی حکومت تھی جس کا پہلا بادشاہ عادل خاں اول (۱۴۵۷ - ۱۵۰۳ء) گزرا ہے —

۱۶۰۱ء میں اکبر نے چاہا کہ دہلی اور دکن کے درمیان سے اس "پتھر کو ہٹا دے"۔ گیارہ مہینے تک اس کی فوجیں یہاں کے قلعہ کا محاصرہ کئے رہیں مگر اس کو فتح نہ کرسکیں۔ آخر میں اکبر نے صلح کی۔ جب اس نے دیکھا کہ طاقت سے وہ اسیر گڑھ کے قلعہ کو فتح نہیں کر سکتا تو اس نے سیاست کے ذریعہ اس کو فتح کیا۔

برہان پور میں کثرت سے تاریخی یادگاریں ہیں جن کو بیان کرنے کے لئے پوری کتاب درکار ہے۔ راقم الحروف کو قلعہ کی مسجد نے بہت متاثر کیا، جہاں میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ۱۰ جنوری کو عصر کی نماز ادا کی پتھر کی اس مسجد کا سنگ بنیاد ۹۹۲ھ میں رکھا گیا تھا۔ مسجد اب بھی نہایت عمدہ حالت میں ہے۔ ست پڑا پہاڑ پول کے اوپر ۸۵۰ فٹ کی بلندی پر واقع اس وسیع مسجد میں اگرچہ پنج وقتہ نماز نہیں ہوتی۔ مگر ہم نے اس کو نہایت صاف ستھرا پایا۔

مغل حکومت کی یہ روایت رہی ہے کہ ہمایوں سے لے کر اورنگ زیب تک تمام مغل شہزادے خود اپنے باپ کے خلاف بغاوت کرتے رہے۔ اورنگ زیب تخت نشین ہونے سے پہلے برہان پور کا گورنر تھا۔ اس نے ۱۶۰۹ء میں اپنے والد شاہجہاں سے بغاوت کی۔ اس واقعہ کا فارسی کتبہ قلعہ میں لگا ہوا ہے۔ ایک شعر یہ ہے:

چو شاہزادہ اورنگ زیب دیں پرور
گرفت جائے پدر را بہ قوت شمشیر

برہان پور میں کچھ باذوق لوگوں نے حلقۂ نیرنگ خیال کے نام سے ایک تنظیم قائم کی ہے۔ اس تنظیم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی خاص نظریہ سے بندھی ہوئی نہیں ہے۔ وہ فکری توسع کی قائل ہے۔ لوگوں میں آزادانہ طور فکر کا مزاج ابھارنا چاہتی ہے۔ راقم الحروف کے پاس تنظیم کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا جس میں لکھا گیا تھا:

" تقریباً تیرہ سو برس پہلے ایک عظیم سانحہ کربلا میں گزرا تب سے آج تک علماء کرام نے اس پر بہت کچھ لکھا اور اپنی تقریروں میں بہت کچھ کہا اور یہ سال کسی نہ کسی صورت میں اس کی یادگار منائی جاتی رہی ہے — اور رہے گی۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ واقعہ یا حادثہ اسی رد عمل کا محتاج تھا جو ہمارے سامنے ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ کوئی آج کا محقق " روایتی نقطۂ نظر سے ہٹ کر " اس موضوع

" شہادت عظمیٰ اور اس کا رد عمل "

پر اپنی محققانہ تقریر میں اس انداز سے روشنی ڈالے کہ اسے ہر قوم اور ہر مذہب خیال کے لوگ اگر نہ مانیں تو کم از کم سوچنے کے لئے ایک نئی راہ نکل آئے۔

اس سلسلہ میں جب غور کیا گیا اور ایک قابل، عالم، مدبر اور محقق شخصیت کی تلاش ہوئی تو احباب کی غالب اکثریت نے آپ کی شخصیت کی طرف رہنمائی کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ مکتوب آنجناب کی خدمت میں پیش ہے۔ اس توقع کے ساتھ کہ آپ اسے شرف قبولیت بخشیں گے اور ہمیں پہلی فرصت میں بواپسی ڈاک اپنے مثبت جواب سے ممنون فرمائیں گے۔"

عام حالات میں شاید مجھ کو اس موضوع سے دلچسپی نہ ہوتی۔ مگر حلقہ نیرنگ خیال کے دعوت نامہ کی اس بات نے مجھے متاثر کیا کہ وہ " روایتی نقطۂ نظر سے ہٹ کر " اس کے بارے میں کچھ سننا چاہتے ہیں۔ میں نے دعوت قبول کرلی۔ اور ۸ ر جنوری کی شام کو شہادت حسین کے موضوع پر میری تقریر ہوئی۔ بھرے ہوئے پنڈال میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک تھے۔ اجتماع کے اگلے دن شہر کی ایک ممتاز شخصیت ڈاکٹر جی۔ آر۔ گیتا میری قیام گاہ پر تشریف لائے اور کہا " آپ نے جو باتیں کہیں، مجھ کو بہت ٹھیک لگیں۔ یہی بات اگر سب مولوی کہنے لگیں تو مسلمان ترقی کر جائیں "

۸ ر جنوری کے اجتماع کے علاوہ دو نشستیں اور ہوئیں۔ ایک رؤسار شہر کی جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک تھے۔ دوسری مقامی جماعت اسلامی کی طرف سے اس کے دفتر میں۔ قیام کے دوران میں غیر رسمی طور پر کثرت سے لوگوں سے گفتگوئیں ہوتی رہیں۔

قدیم زمانہ میں برہان پور پارچہ بافی کا اتنا بڑا مرکز تھا کہ اس کے کپڑے بیرونی ممالک کو برآمد ہوتے تھے۔ سترسو

टेवरनियर ने अपनी दूसरी बार की यात्रा के वर्णन में लिखा है -

" ... . It has a large castle still standing in the middle of the town and it is there that the Governor resides. The Government of this province is so important that it is conferred only upon a son or an uncle of the king, and Aurangzeb, who now reigns, was for a long time Governor of Burhanpur during the reign of his father ...." (1657 A.D.)

یہیں شاہزادہ جہانگیر سے ملاقات کی تھی ۔ علمی حیثیت سے اس کا یہ مقام تھا کہ شیخ علی متقی کے استاد کا انتقال میں ہوا تو ان کی تاریخ وفات "شیخ مکہ" سے نکالی گئی ۔ مغل حکمرانوں کے نزدیک برہان پور کی سیاسی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ بادشاہ کا بیٹا یا کوئی قریبی رشتہ دار ہی یہاں کا گورنر بنایا جاتا تھا ۔ آج اگرچہ یہ چیزیں موجود نہیں ہیں ۔ تاہم یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہاں کی پچاس ہزار مسلم آبادی ، امکانی طور پر ، اس پوزیشن میں ہے کہ ہر قسم کی ترقی کا بہترین نمونہ بن سکے ۔ دینی ترقی اور دنیوی استحکام دونوں کے لئے نہایت کامیاب منصوبہ بندی کے امکانات یہاں موجود ہیں ۔ مگر یہ امکان واقعہ بننے کے لئے ابھی کسی آنے والے دن کا انتظار کر رہا ہے ۔

پنجاب میل میں میری کیبن میں میرے علاوہ جو تین آدمی تھے ، ان میں ایک صنعت کار تھے ۔ اور دو سرکاری افسر ۔ ان لوگوں نے ملک کے بگاڑ اور بھرشٹاچار پر گفتگو شروع کی ۔ تینوں نہایت جوش و خروش کے ساتھ ثابت کر رہے تھے کہ ملک میں ہر سطح پر بگاڑ اور بدنظمی عام ہو چکی ہے ۔ صنعت کار ، مزدوروں کی یونین بازی اور حکومت کی غلط پالیسیوں کی تفصیل بیان کر رہا تھا ۔ سرکاری افسران اپنے شعبوں میں وزیروں کی مداخلت اور نیتاگر دی کے تجربات گنا رہے تھے ۔ ایک نے کہا : " خرابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ آج کسی افسر کو نہ اچھے کام کا انعام ملتا ہے نہ برے کام کی سزا ۔ اس لئے وہ سوچتا ہے کہ جو ہو رہا ہے ہونے دو " ۔ دوسرے نے کہا : آج کل سرکاری افسروں کا حال یہ ہے کہ کام کرنے کے بجائے اپنے کو بچانے کی فکر میں رہتے ہیں ۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ :

ISSUE CLEAR INSTRUCTIONS

(واضح احکام دو) اب ہمارے ہمدردہم کو یہ سکھاتے ہیں :

ISSUE VAGUE ORDERS

(مبہم احکام جاری کرو) یہ باتیں پورے زور شور سے جاری تھیں اور میں خاموش سامع بنا ہوا سوچ رہا تھا ـــ جس ملک میں پیداوار تیار کرنے والوں اور انتظامیہ چلانے والوں کا یہ حال ہو ، اس کا مستقبل میں کیا انجام ہوگا ۔

ایک واقعہ

اکتوبر ۱۹۷۵ میں یہ خبر آئی تھی کہ فیروز رستم جی دارو والا نے اپنا ایک گردہ حمید دلوائی کو دے دیا تاکہ ان کی صحت کو بچایا جاسکے ۔ ۳۳ سالہ دارو والا جو ابھی غیر شادی شدہ تھے ، ۱۳ دسمبر ۱۹۷۵ کو انھیں یروادا جیل میں پھانسی دے دی گئی ۔ جو لوگ حمید دلوائی سے اختلاف رکھتے ہیں ، وہ شاید یہ سمجھیں کہ ایک "دشمن اسلام" کی مدد کرنے کے نتیجہ میں دارو والا کو یہ سزا ملی ۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ دارو والا پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے ۲ فروری ۱۹۷۱ کو ایک پارسی خاندان کے چار افراد کو قتل کر دیا ہے ۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۷۱ کو مقدمہ کا فیصلہ ہوا اور دارو والا مجرم قرار دیئے گئے ۔ یہ واقعہ جو "گردہ دان" سے چار سال پہلے واقع ہوا تھا ، اسی کے جرم میں دارو والا کو پھانسی دی گئی ۔

اکثر خارق عادت واقعات اسی قسم کے ہوتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ تاریخ ، مقام ، اشخاص وغیرہ کے تعینات کے بغیر مجہول شکل میں بیان کئے جاتے ہیں ۔ اگر تعین کے ساتھ بیان کیا جائے تو تحقیق کے بعد فوراً ان کی حقیقت کھل جائے گی ۔

"ظہور اسلام" کا آخری صفحہ

پوٹاشیم سائنائڈ (POTASSIUM CYANIDE) ایک سفید چمک دار کیمیکل ہے۔ وہ مختلف صنعتوں میں استعمال ہوتا ہے، اگرچہ سستے سوڈیم سائنائڈ کی دریافت نے اس کے صنعتی استعمال کو کم کردیا ہے۔ اسی کے ساتھ پوٹاشیم سائنائڈ ایک انتہائی طاقت ور زہر ہے۔ اس کا کھانا فی الفور موت کا باعث ہوجاتا ہے۔

سائنس دانوں کو خیال ہوا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا مزا کیا ہے۔ مزہ معلوم ہونے کے لئے اس کو کھانا ضروری تھا۔ بالفاظ دیگر کوئی شخص اپنے کو ہلاک کرکے ہی دوسروں کو خبر دے سکتا تھا کہ اس کا مزہ کیا ہے۔

ایک شخص نے طے کیا کہ وہ اس خدمت کو انجام دے گا۔ اس نے ایک ہاتھ میں پوٹاشیم سائنائڈ لیا اور دوسرے ہاتھ میں قلم۔ زہر کو کھانے کے بعد اس نے اس کا مزا لکھنا چاہا۔ اس نے صرف ایک لفظ ایس (S) لکھا تھا کہ اس کا خاتمہ ہوگیا۔ انگریزی میں ایس کے حرف سے دو لفظ بنتے ہیں۔ ایک سویٹ (میٹھا) دوسرا سالٹ (نمکین)۔ دوبارہ سوال پیدا ہوا کہ مرنے والے کی مراد میٹھے سے تھی یا نمکین سے۔

اب ایک اور شخص اٹھا۔ اس نے کہا کہ میں زہر کو کھاؤں گا اور "ایس" کو چھوڑ کر اگلا حرف لکھوں گا۔ اگر ڈبلیو (W) لکھوں تو سویٹ سمجھنا اور اگر اے (A) لکھوں تو سالٹ۔ اس نے دوسری بار زہر کو چکھ کر قلم کو حرکت دی۔ حرف "اے" لکھ کر اس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس طرح دنیا نے جانا کہ پوٹاشیم سائنائڈ کا مزہ نمکین ہے۔

اس قصہ کو یہاں نقل کرنے کا مقصد ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ میرا لڑکا ظفر الاسلام خاں (پیدائش ۱۹۴۸) جو اس وقت لیبیا میں ہے، اس نے مجھے خط لکھا کہ میرا ارادہ ہے کہ لیبیا کا کام چھوڑ کر ہندستان واپس آجاؤں اور ماہنامہ الرسالہ اور الدار العلمیہ کے تحت آپ احیائے اسلام کی جو کوششیں کر رہے ہیں، اس میں آپ کی مدد کروں۔ میں نے جواب میں مذکورہ بالا قصہ کا حوالہ دیتے ہوئے ظفر الاسلام کو لکھا:

> تمھارے باپ نے ایک بار "پوٹاشیم سائنائڈ" کھاکر "ایس" لکھا ہے۔ اگر تم دوسری بار اس کو کھاکر اگلا حرف "اے" لکھنے والے بننا چاہتے ہو تو آجاؤ۔

اسلام کا احیاء موجودہ زمانہ میں کچھ زندگیوں کی قیمت مانگتا ہے۔ جانوں کی نہیں، حوصلوں اور تمناؤں کی۔ "ظہور اسلام" اس امید میں شائع کی جارہی ہے کہ وہ کچھ لوگوں کو اس قسم کی قربانی کے لئے آمادہ کرے گی۔ اگرچہ اس قسم کی امید قائم کرنا بڑی جرأت کا کام ہے۔ حوصلوں اور تمناؤں کی قربانی، جانوں کی قربانی کے برعکس، ہمیشہ کمیاب تھی اور اب تو شاید وہ نایاب کے درجہ میں پہنچ چکی ہے۔

وحید الدین

۱۹ جنوری ۱۹۷۸

الاسلام

مؤلفہ:
مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۲۴۰ — قیمت مجلد مع پلاسٹک کور بارہ روپے

قیمت مجلد بغیر پلاسٹک کور دس روپے

دین کی حقیقت، تعلیمات قرآن کی حکمتیں، سیرت رسول کا انقلابی سبق
موجودہ زمانہ میں اسلام کے مسائل، دین کا تجدید و احیاء
امت مسلمہ کی تعمیر، دعوت اسلامی کے جدید امکانات —

ان موضوعات کے گہرے مطالعہ کے لئے "الاسلام" پڑھئے۔
جدید سائنٹفک اسلوب میں، نہایت دلچسپ اور معلومات سے بھرپور۔

قارئین الرسالہ کے مسلسل اصرار پر قیمت میں غیر معمولی کمی
تاجروں اور ایجنٹوں کے لئے خصوصی کمیشن

کتاب کی روانگی کا خرچ ادارہ کے ذمہ ہوگا

الدار العلمیہ، جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۔ ۶

Single Copy Rs 2.00

Regd No. D (D) 532
Regd. R N No. 28822/76
MARCH 1978

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI-110006 (INDIA)

کتاب سبز

از معمر القذافی

لیبیا کے صدر معمر القذافی ایک انقلابی نظریہ کے موجد ہیں

اپنے خیالات کو "الکتاب الاخضر" میں واضح کیا ہے

کے پہلے جزء کا اردو ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔ یہ جزء معمر القذافی کے

تیسرے عالمی نظریہ کے سیاسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے

اردو ترجمہ کے ساتھ اصل عربی متن بھی شامل ہے

کتاب عمدہ کاغذ پر آفسیٹ سے طبع ہوئی ہے

دس روپے پچاس پیسے

ایجنٹ کے لیے خصوصی کمیشن

مکتبہ ...

قاسم جان اسٹریٹ ...

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

آپ لکڑی کو توڑیں تو وہ دو ٹکڑے ہو جائے گی
مگر زندہ چیزوں کے لئے شکست کا کوئی
سوال نہیں۔ ایک زندہ ایبا (AMOEBA) جب
ٹوٹتا ہے تو وہ دو زندہ ایبا بن جاتا ہے۔

اداریہ ———

ایک مشہور مسلم جماعت کے ترجمان نے ماہنامہ الرسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ نقطۂ نظر ایک عظیم فتنہ کا سرچشمہ ہے۔ ایسا فتنہ جس میں علامہ مشرقی کا دماغ، پرویز کا قلم، نیاز فتح پوری کی عقل اور علامہ مودودی کی زبان اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے" (الجمعیۃ ۶ مارچ ۱۹۷۸) دوسری طرف الرسالہ کے ایک مداح لکھتے ہیں: "فکر مودودی کے مقابلہ میں فکر وحید زیادہ عمیق اور سائنٹفک ہے"۔ ان دونوں کے درمیان وہ لوگ ہیں جو اکثر ہم سے پوچھتے ہیں "کیا آپ کا الرسالہ ابھی نکل رہا ہے"؟ حالاں کہ یہ سوال اتنا ہی بے معنی سوال ہے جیسے کسی سے پوچھا جائے "کیا آپ کے صاحبزادے ابھی باحیات ہیں"؟

ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں لوگوں کو نہیں معلوم کہ تنقید در اصل اپنے بھائی کے ساتھ خیر خواہی کا نام ہے یا کم از کم علمی تجزیہ کا۔ اسی طرح لوگوں کو نہیں معلوم کہ ایک دعوت اگر انھیں حق نظر آئے تو اس کے سلسلے میں ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ لوگ اپنے بیٹے کے حق میں اپنی خیر خواہی کو خوب جانتے ہیں۔ اپنے ذاتی مصالح کے سلسلے میں وہ اپنی ذمہ داریوں سے اتنا زیادہ باخبر ہیں کہ وہ ان کے لاشعور کا جزء بن گیا ہے۔ مگر دوسروں کے لئے وہ صرف لفظی تنقید یا لفظی تعریف کو کافی سمجھتے ہیں۔

ایسی حالت میں الرسالہ کے اوپر ٹائٹل کا اضافہ صرف اس کے خسارہ میں اضافہ کے ہم معنی ہے۔ تاہم یہ جانتے ہوئے صرف اس بھروسہ پر ہم یہ اقدام کر رہے ہیں کہ جو خدا "ٹائٹل کے بغیر" الرسالہ کو چلاتا رہا ہے وہ "ٹائٹل کے ساتھ" بھی الرسالہ کو چلائے گا۔

وما ذلك على الله بعزيز

فہرست

اس قسم کی باتوں سے صحیح ذہن نہیں پیدا ہو سکتا

عن زید بن ارقم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال لا الٰہ الا اللہ مخلصا دخل الجنۃ قیل وما اخلاصھا قال ان تحجزہ عن محارم اللہ (رواہ الطبرانی فی الاوسط والکبیر)

زید بن ارقم سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص لا الٰہ الا اللہ اخلاص کے ساتھ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ پوچھا گیا کلمہ کا اخلاص کیا ہے۔ فرمایا، وہ اس کو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے روک دے۔

اس حدیث کی تشریح میں ایک بزرگ لکھتے ہیں :

" اور یہ ظاہر ہے کہ جب حرام کاموں سے رک جائے گا اور لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہوگا تو اس کے سیدھا جنت میں جانے میں کیا تردد ہے۔ لیکن اگر حرام کاموں سے نہ بھی رکے تب بھی اس کلمہ پاک کی یہ برکت تو بلا تردد ہے کہ اپنی بداعمالیوں کی سزا بھگتنے کے بعد کسی نہ کسی وقت جنت میں ضرور داخل ہوگا۔ البتہ اگر خدانخواستہ بداعمالیوں کی بدولت اسلام و ایمان ہی سے محروم ہو جائے تو دوسری بات ہے۔" (۱۷)

" حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث میں یہ نقل کیا گیا کہ خوش خبری سنو اور دوسروں کو بھی بشارت سنا دو کہ جو شخص سچے دل سے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اخلاص کے ساتھ تھوڑا سا عمل بھی بہت کچھ رنگ لاتا ہے، اس لئے اخلاص سے جو شخص کلمۂ شہادت پڑھے اس کی ضرور مغفرت ہوگی، وہ ضرور جنت میں داخل ہو کر رہے گا۔ اس میں ذرا بھی تردد نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے کچھ دنوں سزا بھگت کر داخل ہو لیکن ضروری نہیں۔" (۸۹)

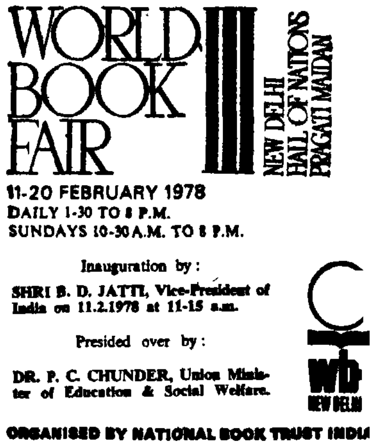
اس عبارت پر خالص "مسئلہ" کی حیثیت سے اعتراض کرنا مشکل ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ محرمات سے رکنا اور محرمات سے نہ رکنا دونوں میں اگر "بلا تردد" جنت کی خوش خبری دی جانے لگے تو اس سے کبھی صحیح ذہن نہیں پیدا ہو سکتا۔ یہود بھی تو یہی کہتے تھے کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (ہم کو آگ نہیں چھوئے گی مگر چند دن) پھر اسی قسم کا عقیدہ اگر ہم بھی بنا لیں تو ہمارے یہاں اُس سے مختلف ذہن کیوں پیدا ہوگا جو یہود کے یہاں پیدا ہوا۔ اس قسم کے مسائل وضع کرنے والے شاید کتاب الٰہی کی اس آیت کو بھول گئے ہیں۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ

نہ تمھاری خوش گمانیوں سے کچھ ہوگا نہ اہل کتاب کی خوش گمانیوں سے، جو برا کرے گا وہ ضرور اس کا بدلہ پائے گا۔

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے
براہ کرم اپنا سالانہ زر تعاون روانہ فرما کر شکریہ کا موقع دیں —— منیجر

کتابوں کی عالمی نمائش



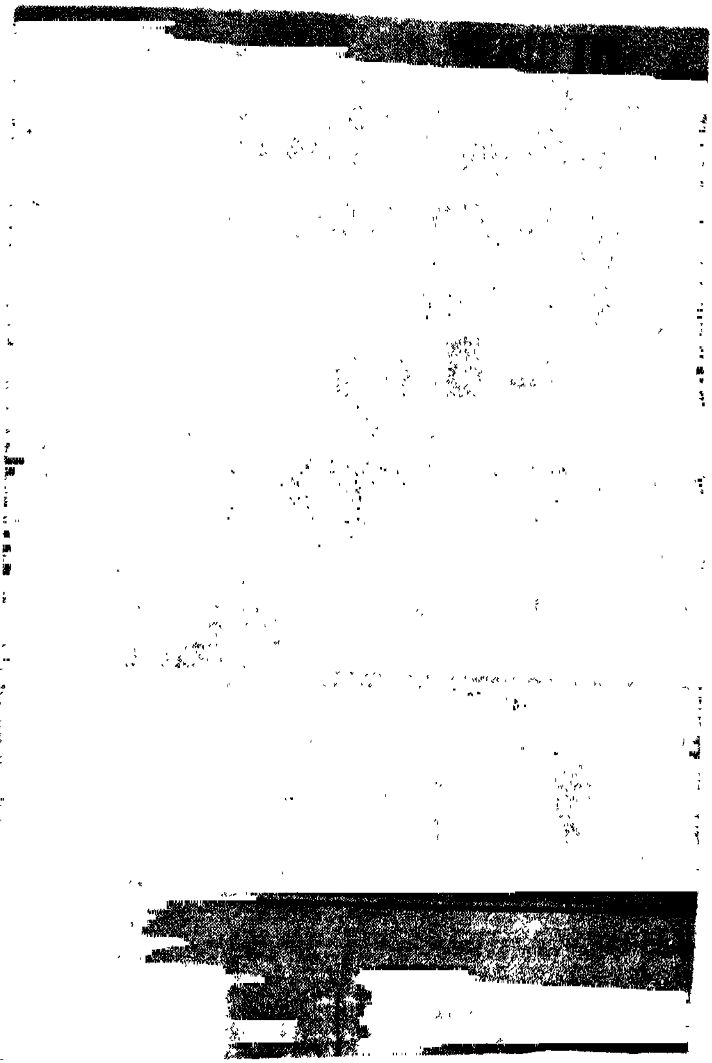
کتابوں کی بین اقوامی نمائش ہندوستان میں پہلی بار ۱۹۷۲ میں نئی دہلی میں ہوئی۔ دوسری بار ۱۹۷۶ میں۔ اور اب اس قسم کی تیسری نمائش ہمیشہ سے زیادہ بڑے پیمانہ پر جون ۱۹۷۸ء میں نئی دہلی میں ہوئی ہے۔ نئی دہلی اب بین اقوامی کتابی نمائش کے شہروں کے کلب کا ممبر ہو چکا ہے۔ ان شہروں میں فرینک فرٹ، لیپزگ، وارسا، بلگریڈ، قاہرہ، مانٹریل، سنگاپور، ٹوکیو، ماسکو وغیرہ شامل ہیں۔

نئی دہلی کی تیسری بین اقوامی کتابی نمائش میں ملکی اور غیر ملکی شرکا کی تعداد توقع سے زیادہ ہوگئی۔ چنانچہ پرگتی میدان میں ۱۴۰۰۰ مربع میٹر جگہ اس کے لئے مخصوص کرنی پڑی جو پچھلی دونوں نمائشوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ امریکہ، انگلستان، روس، مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی، ہالینڈ، زیکوسلاواکیہ، بلگریڈ، ہنگری، رومانیہ، سوئٹزرلینڈ، یوگوسلاویہ، کینیا، زمبیا، غانا، سینیگال، عراق، مصر، کویت، بنگلہ دیش، پاکستان، سنگاپور، جاپان، انڈونیشیا، نیوزی لینڈ وغیرہ ۳۵ غیر ملکوں کے ۲۰۰ ناشرین نے اس موقع پر شرکت کی اور اس نمائش میں اپنا اسٹال لگایا۔ ہندوستان کے جن ناشرین نے اس میں شرکت کی ان کی تعداد تقریباً ۴۰۰ ہے۔ ان کے علاوہ اقوام متحدہ اور متعدد دوسرے ملکوں نے اپنے اطلاعاتی دفاتر اس موقع پر قائم کئے۔

پرائیویٹ اداروں کے علاوہ ہندوستان کے مختلف مرکزی اور ریاستی اداروں نے نمائش میں اپنے اپنے اسٹال کھولے۔ تاہم تین بڑی عمارتوں اور ان کے درمیانی پارک میں پھیلی ہوئی اس وسیع نمائش میں سب سے زیادہ غلبہ انگریزی کتابوں کا رہا۔ دوسرے نمبر پر ہندی کتابیں تھیں۔ اور اس کے بعد اردو اور دوسری علاقائی زبانوں کی کتابیں نیز غیر ملکی زبانوں کی کتابیں مثلاً روسی، جرمن، جاپانی، عربی، فارسی وغیرہ۔

اس موقع پر کتابوں کی نمائش کے علاوہ دوسری معاون تقریبات کا پروگرام بھی رکھا گیا۔ مثلاً کتابوں کی اشاعت کے مختلف پہلوؤں پر سیمینار، ایک چار روزہ بین اقوامی سیمینار بھی ہوا جس میں دنیا کے مختلف حصوں کے ماہرین نے تعلیمی مطبوعات کے بارے میں بحث و مباحثہ کیا۔ اسی طرح نمائش کے دوران متعدد دوسرے پروگرام ہوتے رہے۔ مثلاً فیڈریشن آف انڈین پبلشرس کی طرف سے ریفریشر کورس، فیڈریشن آف پبلشرس اینڈ بک سیلرس ایسوسی ایشن کی طرف سے بین الاقوامی کتابی صنعت پر لکچر اور ٹریننگ کورس۔ آتھرس گلڈ آف انڈیا کی طرف سے

نئی دہلی کی تیسری ورلڈ بک فیر (فروری ۱۹۷۸) کا ایک منظر۔ کتابوں
کی قطار میں "کتاب سبز" دکھائی دے رہی ہے ——————



مصنفین کا کنونشن وغیرہ۔

یونیسکو کے تازہ اعداد وشمار کے مطابق ہندستان، کتابوں کی پیداوار کے معاملہ میں دنیا کا ساتواں سب سے بڑا ملک ہے۔ انگریزی کتابوں کی تیاری میں امریکہ اور انگلستان کے بعد ساری دنیا میں اس کا تیسرا نمبر ہے۔ ملکی اعتبار سے چند زبانوں کے اعداد وشمار یہ ہیں:

۱۹۷۶ میں	انگریزی کتابیں	۶۷۳۳
	ہندی	۲۲۳۵
	کنڑی	۱۲۶۱
	مراٹھی	۱۲۹۰
	بنگالی	۱۱۴۶
	گجراتی	۷۶۰
	تامل	۶۹۷
	ملیالم	۴۵۰
	اردو	۲۶۹

یہ اعداد وشمار سرکاری ہیں۔ تاہم اصل تعداد غالباً اس سے زیادہ ہوگی۔ اندازہ ہے کہ ہندوستان میں ہر سال ۲۰ ہزار سے زیادہ کتابیں مختلف زبانوں میں چھپتی ہیں۔ ہندستان دنیا کی آبادی کا پندرہ فی صد ہے۔ مگر ہندستان کی مطبوعات دنیا بھر میں چھپنے والی کتابوں کا بمشکل چار فی صد ہوتی ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے ہندستانی مطبوعات کی تقسیم یہ ہے:

ادبی کتابیں	کل مطبوعات کا ۳۱ فی صد
سیاسی اور معاشی کتابیں	۱۳ فی صد
طب اور طبیعیاتی سائنس	۳ فی صد

وہ کتابیں جن کی اشاعت (PRINT-RUN) زیادہ ہے وہ یا تو کورس کی کتابیں ہیں یا ناول۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ایک ملین آبادی پر ہر سال تقریباً ۵۰۰ کتابوں کا اوسط ہے جب کہ ہندستان میں یہ اوسط صرف ۳۰ ہے۔ دوسرے ملکوں میں فی شخص سالانہ ۲۰۰۰ صفحات کا اوسط ہے اور ہندوستان میں صرف ۳۲ صفحات کا۔

ہندستان کی مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کے اشتراک سے ایک اسکیم چلائی جارہی ہے جس کا مقصد ملک کی علاقائی زبانوں میں یونیورسٹی سطح کی کتابیں شائع کرنا ہے۔ اس سلسلے میں اب تک تقریباً ساڑھے چار ہزار کتابیں شائع کی جاچکی ہیں۔ ان کتابوں کی قیمتیں "نہ نفع نہ نقصان" کے اصول پر رکھی جاتی ہیں۔

ایک ہندستانی ڈائرکٹری میں گیارہ ہزار ملکی ناشرین کے نام و پتے چھاپے گئے ہیں۔ ان میں ڈھائی ہزار ہندی ناشرین ہیں۔ سترہ ہزار انگریزی، اور چودہ ہزار بنگالی۔ انگریزی زبان اب بھی ہندستان میں غالب حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انگریزی ملک کے خوش حال طبقہ کی زبان ہے۔ اس لئے انگریزی زبان میں چھپنے والی کتابیں بہت جلد بازار میں اپنا مقام پالیتی ہیں۔ دوسری زبانوں کی مطبوعات زیادہ تر ادب، مذہب اور ثقافت سے متعلق ہوتی ہیں۔

ہندستان میں تصنیف کے کام کو ترقی دینے کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے ہیں۔ ان میں انڈین کاپی رائٹ ایکٹ میں کی گئی حالیہ ترمیم اور مصنفین کے لئے نقد انعامات شامل ہیں۔

●●●●●●●●●●●●●●●●

کبھی جاننا اس کا نام ہوتا ہے کہ آدمی یہ کہہ دے کہ "میں نہیں جانتا"

ہیوی ویٹ باکسنگ کے سابق چیمپین محمد علی (۳۶) کو لیون اسپنکس (۲۴) نے ۱۵ فروری ۱۹۷۸ کو ہرا دیا۔ محمد علی کے لئے یہ بے حد غیر متوقع تھا کیونکہ پچھلے ۱۴ سال کی مسلسل کامیابیوں نے محمد علی کے اندر اتنا زیادہ اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ وہ کہنے لگے تھے:

I AM KING OF THE WORLD

میں دنیا کا بادشاہ ہوں۔

تاہم یہ امکان ہے کہ یہ شکست محمد علی کی زندگی کے لئے ایک نیا موڑ پیدا کرنے کا باعث ہو۔ تین سال پہلے محمد علی نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ کھیل کی دنیا سے ریٹائر ہو جائیں گے تاکہ وہ اسلام کی خدمت کریں اور اپنی قوم کی تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے لئے کام کریں۔"

جون ۱۹۷۵ میں محمد علی کی ملاقات حاجی بی کی حسن (کالی کٹ) سے ہوئی تھی۔ اس وقت وہ کوالالمپور میں تھے۔ حاجی حسن کی باتوں سے محمد علی بے حد متاثر ہوئے۔

"حاجی حسن نے مجھ کو اسلام کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کیا" محمد علی نے کہا "اس نے حیرت انگیز طور پر میرے نقطۂ نظر کو بدل دیا۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ مذہب کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت صرف کروں۔"

مگر اس کے بعد محمد علی اپنے ارادہ پر قائم نہ رہ سکے۔ انھوں نے کھیل کے میدان میں اپنی مشغولیت کو بدستور جاری رکھا۔ تاہم موجودہ شکست نے دوبارہ ان کے ذہن کو ماضی کی طرف موڑ دیا ہے۔ ۱۷ فروری کو لندن میں اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں دوبارہ اسپنکس سے لڑوں گا اور چیمپین کا ٹائٹل اس سے چھینوں گا۔" تاہم اگر میں ایسا نہ کر سکا تو میں سمجھوں گا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ میں اپنی زندگی کا رخ مذہب کی طرف موڑ دوں۔"

THEN I WOULD GIVE MY LIFE TO THE LOVE OF GOD AND THE HOLY KORAN AND BECOME A FULL-TIME DEDICATED MUSLIM EVANGELIST. 'WHAT I REALLY WANT TO DO IS CONVERT PEOPLE,' ALI WENT ON. 'IN 50 YEARS, EVERYONE WHO READS THIS INTERVIEW WILL BE DEAD AND GOING TO HEAVEN OR HELL. I WANT THEM TO GO TO HEAVEN.'

The Times of India, 18.2.1978

پھر میں اپنی زندگی کو خدا کی محبت اور مقدس قرآن کے لئے وقف کر دوں گا۔ میں ہمہ وقتی طور پر مسلم مبلغ بن جاؤں گا۔ درحقیقت میں جو کچھ چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں لوگوں کو مسلمان بناؤں۔ آج جو لوگ میرے اس انٹرویو کو پڑھ رہے ہیں، ان میں سے ہر ایک پچاس برس بعد مر چکا ہوگا اور اس کے بعد یا تو جنت میں اس کا ٹھکانا ہوگا یا جہنم میں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کو جنت میں پہنچانے کی کوشش کروں

(ٹائمس آف انڈیا ۱۸ فروری ۱۹۷۸)



Heavyweight boxing champion Muhammad Ali (centre) at Kuala Lumpur's National Mosque on Friday last. On Ali's brother Rahaman and on left Fuad Stephens, ... Sabah. (Times of India June 24,

"جو لوگ ان سطروں کو پڑھ رہے ہیں، ان میں سے ہر شخص پچاس برس بعد مرچکا ہوگا۔ اس کے بعد اس کا ٹھکانا یا تو جنت ہے یا جہنم۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کو جنت میں پہنچانے کی کوشش کروں"——— کیسی عجیب ہے یہ بات۔ اور اس سے بھی زیادہ عجیب یہ ہے کہ یہ بات ایک کھلاڑی کی زبان سے آج کی دنیا کو سننے کو مل رہی ہے۔

مسلمان کی حیثیت سے ہماری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ہم دنیا کو آنے والے دن کی چیتاونی دیں۔ ہر دن لاکھوں انسان زمین پر مر رہے ہیں۔ مگر ان کو نہیں معلوم کہ وہ مر کر کہاں جا رہے ہیں۔ پیغمبر کے ذریعہ اللہ نے اس راز کو کھولا ہے اور پیغمبر کے بعد ہمارے اوپر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ ہم اس سب سے بڑی حقیقت سے اہل عالم کو باخبر کریں تاکہ لوگ زندگی کے اگلے مرحلہ میں داخل ہونے سے پہلے اس کے مسائل سے واقف ہو جائیں اور ابھی سے اس کی تیاری شروع کر دیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں بے شمار مسلم تحریکیں ساری دنیا میں کام کر رہی ہیں۔ مگر کوئی ایسی تحریک نہیں جو فی الواقع اس لئے اٹھی ہو کہ دنیا والوں کو اس آنے والے ہولناک دن سے آگاہ کرے۔

یاد رکھئے اللہ کی نظر میں ہماری قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ ہم اس کا مطلوبہ کام کر رہے ہوں۔ اگر ہم اس کام کو انجام نہ دیں تو اللہ کی نظر میں ہماری کوئی قیمت نہیں۔ خدا کو نہ ہماری کراماتوں کی ضرورت ہے اور نہ ہمارے انقلابی نعروں کی۔ اس کو نہ شان دار عمارتیں درکار ہیں اور نہ جگمگاتے ہوئے پنڈال۔ اس کو تو صرف یہ مطلوب ہے کہ اس کے بندے اس سے باخبر ہو جائیں کہ ان کا رب بالآخر ان سے کیا معاملہ کرنے والا ہے۔

آدمی دن کی روشنی میں یہ سمجھ کر اپنا نظام بناتا ہے کہ تھوڑی دیر میں شام آنے والی ہے اور رات کو اس یقین کے ساتھ سوتا ہے کہ چند گھنٹوں کے بعد ضرور صبح ہوگی۔ مگر آخرت کی دنیا کا کسی کو ہوش نہیں۔ کوئی نہیں جو موت کو اس طرح دیکھ رہا ہو جس طرح دن کا ایک مسافر آنے والی شام کو دیکھتا ہے۔ اور ایسے لوگ تو معدوم کے درجے میں ہیں جو موت کے دوسری طرف جہنم کو بھڑکتا ہوا دیکھ رہے ہوں۔ ہر آدمی اس طرح زندگی گزار رہا ہے جیسے موت بھی دوسروں کے لئے ہے اور جہنم بھی دوسروں کے لئے

سب سے پہلا کام جذباتیت کو ختم کرنا اور لوگوں کو باشعور بنانا ہے

ایک بادشاہ اور اس کے وزیر میں بحث ہوئی۔ سوال یہ تھا کہ طبیعت غالب آتی ہے یا تربیت۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ تربیت کے ذریعہ کسی کے اندر نئے اوصاف پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ جب کہ وزیر کا کہنا یہ تھا کہ تربیت سے کسی کو بدلا نہیں جاسکتا۔ کسی کی جو اصل طبیعت ہے، وہ بالآخر غالب آکر رہتی ہے۔

بادشاہ نے طے کیا کہ وہ وزیر کو غلط ثابت کرے۔ اس نے محل کے خادموں کو حکم دیا کہ دو بلیاں حاصل کریں اور ان کو اس بات کی تربیت دیں کہ وہ اپنے دونوں اگلے پیروں میں مشعل لے کر کھڑی رہیں۔ تربیت شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ کی مشق کے بعد دو بلیاں ایسی تیار کرلی گئیں جو مشعل لے کر کھڑی ہوسکتی تھیں۔

بادشاہ کو جب بلیوں کے تربیت یافتہ ہونے کا پورا اطمینان ہوگیا تو اس نے ایک تاریخ مقرر کرکے اعلان کردیا کہ اس روز خصوصی دربار ہوگا۔ وزیر کو بھی اس میں شریک ہونے کا حکم دے دیا گیا۔ مقررہ تاریخ پر سارے لوگ جمع ہوئے۔ دربار سجایا گیا۔ اس کے بعد دونوں تربیت یافتہ بلیاں لائی گئیں۔ ان کو بادشاہ کے تخت کے دونوں طرف اس طرح رکھا گیا کہ دونوں بالکل ساکت و صامت دو مشعلوں کو لئے ہوئے دونوں طرف کھڑی ہوئی تھیں۔

اب بادشاہ وزیر کی طرف مخاطب ہوا۔ "دیکھو، یہ بلیاں کیا بتارہی ہیں۔ طبیعت غالب آتی ہے یا تربیت"۔ وزیر کو بادشاہ کی ان تیاریوں کا حال پہلے سے معلوم تھا۔ چنانچہ دربار کے لئے آتے ہوئے اس نے ایک چوہا اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ بادشاہ اپنے فخریہ چیلنج کو پیش کرچکا تو وزیر بولا "حضور جان بخشی ہو تو میں اس کا جواب دوں"۔ بادشاہ نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا، ہاں اپنا جواب پیش کرو۔ تم کو پوری اجازت ہے"۔ اس کے بعد وزیر بلیوں کے قریب آیا اور جیب سے چوہا نکال کر ان کے سامنے ڈال دیا۔ چوہا سامنے آتے ہی جو واقعہ ہوا وہ یہ کہ دونوں بلیاں مشعل کو پھینک کر چوہے کے اوپر جھپٹ پڑیں۔ بادشاہ کے چیلنج کا یہ اتنا موثر جواب تھا کہ اس کے بعد وزیر کو یہ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ "حضور دیکھ لیجئے، تربیت کے اوپر طبیعت غالب آگئی"۔

یہ تمثیل، کم از کم جزوی طور پر، ان ملکوں پر صادق آتی ہے جہاں اسلامی جماعتیں عوامی ووٹ کی طاقت سے اسلام کو غالب کرنے کی کوشش کررہی ہیں۔ یہ جماعتیں عوام کو اسلام کے نام پر اکٹھا کرتی ہیں اور اس کے بعد ایک شاطر سیاست داں ایک "شوشہ" چھوڑ دیتا ہے اور معاً سارے اسلامی ووٹر اسلامی کیمپ کو چھوڑ کر ان کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ بلی کی تربیت کی ساری کوشش "چوہے" کو دیکھتے ہی ختم ہوجاتی ہے

یہ اسلامی جماعتیں اسلامی حکومت قائم کرنے کے نام پر میدان سیاست میں کودتی ہیں۔ برسوں تک پریس اور پلیٹ فارم کے ذریعہ ملک کی رائے عامہ کو اسلام کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ "غلاف کعبہ" اور "شوکت اسلام" کے نام پر ہونے والے جلسوں میں لوگ جوق در جوق شرکت کرتے ہیں۔ "اسلام زندہ باد" کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ اسلام کی یہ دھوم دیکھ کر اسلامی قائدین کو گمان ہونے لگتا ہے کہ ۹۹ فی صد لوگ

ان کے ساتھ ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے کسی اسلامی قائد کو یہ پُر فخر الفاظ کہنے کا موقع مل جاتا ہے کہ " اب ہمارا نقطۂ نظر بہتر طور پر سمجھا جانے لگا ہے۔ ملک میں ہماری اکثریت ہے۔ ہر فرد اس بات سے اتفاق کرتا ہے کہ اسلامی نظام قائم کیا جائے (ذکری، دسمبر ۱۹۷۷) ۔

اس " صدفی صد " اکثریت کے باوجود جب الکشن ہوتا ہے تو یہ اسلامی جماعتیں بری طرح ہار جاتی ہیں، حتیٰ کہ ان کے امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہو جاتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب ملک کے " صدفی صد " لوگ اسلامی جماعتوں کے حلقۂ متفقین میں شامل ہیں تو وہ لوگ کہاں سے آتے ہیں جو " دھاندلی " کرکے ان کو شکست فاش دے دیتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہ وہی عوام ہیں جن کے " ہر فرد " کو اپنا حامی سمجھ لیا گیا ہے۔ مسلم ملکوں، خاص طور پر برصغیر ہند کے مسلمان، اتنے زیادہ جذباتی ہیں کہ کسی بھی تماشے کی بات کے پیچھے نہایت آسانی سے دوڑ پڑتے ہیں۔ فروری ۱۹۷۸ میں محمد علی کے مقابلہ میں لیون اسپنکس کی جیت عیسائی حلقوں کے لئے زبردست خوشی کا باعث تھی۔ مگر یہ ناقابل تصور ہے کہ اس کے بعد اسپنکس کو امریکہ کی طرف سے کسی ملک کا سفیر بنا دیا جائے۔ جب کہ محمد علی کو شکست کے باوجود، بنگلہ دیش کی حکومت کی غیر معمولی مہمانی کا شرف حاصل ہوا اور ۲۲ فروری کو ڈھاکہ میں اعلان کیا گیا کہ محمد علی، امریکہ میں حکومت بنگلہ دیش کے اعزازی نمائندہ (کونسل جنرل) ہوں گے اور ان کی کار اور ان کے مکان پر بنگلہ دیش کا سرکاری جھنڈا لہرائے گا۔ امریکہ میں کھیل کا ایک ہیرو میدان سیاست کا ہیرو نہیں بنایا جاسکتا۔ جب کہ برصغیر ہند میں ایک فلم ایکٹر وزیر اعلیٰ ہو سکتا ہے اور ایک مکا باز سرکاری سفیر۔

مسلم ملکوں کے عوام کی یہی جذباتیت اور بے شعوری ہے جس نے ان کو نعرہ باز سیاست کے لئے زرخیز زمین بنا دیا ہے۔ اسلام کے نعرہ میں روایتی اور جذباتی کشش انھیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مگر اس کشش کی کوئی زیادہ گہری بنیاد نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شاطر سیاستداں میدان میں آتا ہے اور کوئی ایسا پُر فریب شوشہ چھوڑتا ہے جس میں وقتی دل چسپی کا سامان ہو تو وہ نہایت آسانی سے اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ اس وقت ان ملکوں کے عوام کا ٹھیک وہی حال ہوتا ہے جو تربیت یافتہ بلیوں کے سامنے چوہا چھوڑنے کا ہوا تھا۔ اس طرح اسلامی سیاست کا نتیجہ عملاً اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا کہ ایک " مسٹر شاطر " کی جگہ دوسرے مسٹر شاطر اقتدار کی کرسی پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ " مولانا اسلام " کی محرومی " انقلاب " کے بعد بھی اسی طرح باقی رہتی ہے جیسے وہ انقلاب سے پہلے تھی۔

ہندستان میں لوک سبھا کی میعاد میں دوبار ایک ایک سال کی توسیع کے بعد ۱۸ جنوری ۱۹۷۷ کو جب وزیر اعظم اندرا گاندھی نے چھٹے عام الکشن (اپریل ۱۹۷۷) کا اعلان کیا تو پاکستان میں مسٹر بھٹو کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے ووٹروں سے یہ کہہ سکیں کہ ہندستان نے ان کے زیر اثر لوک سبھا کا الکشن کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ یہ حسن اتفاق مسٹر بھٹو کا ساتھ دے رہا تھا کہ انھوں نے ہندستان سے کسی قدر پہلے اپنے ملک میں دوسرے عام الکشن (مارچ ۱۹۷۷) کے انعقاد کا اعلان کر دیا تھا۔

پونیہ پرسہ داس گپتا نے ان دنوں پاکستان کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

" مسٹر بھٹو کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی شاہ ضرب سے

فی الواقع برصغیر ہند کی قیادت چھین لی ہے۔ ان کا پُراسرار استدلال یہ ہے کہ پاکستان میں الکشن کے انعقاد کا اعلان کر کے انھوں نے مسز اندرا گاندھی کو مجبور کر دیا کہ وہ بھی ان کی پیروی کریں اس کے بعد ان کے لئے یہ مشکل نہ ہوگا کہ دوسرے معاملات میں بھی وہ ہندستان کو آمادہ کر سکیں کہ وہ پاکستان کا لحاظ کرے۔"

(انڈین اکسپریس ۱۱ فروری ۱۹۷۷)

اسی قسم کے شوشے تھے جنھوں نے پاکستان کے پچھلے دو الکشنوں میں مسٹر بھٹو کو کامیاب کیا، اور اگر پاکستان میں دوبارہ الکشن ہوں تو اسی طرح کوئی "مسٹر بھٹو" دوبارہ شوشے چھوڑ کر یقینی طور پر ووٹروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا اور "مولانا اسلام" حیرت کے ساتھ دیکھیں گے کہ ان کا بیلٹ بکس خالی پڑا ہوا ہے۔

غلطی پر غلطی یہ ہے کہ یہ اسلامی جماعتیں مسئلہ کو گہرائی سے نہ دیکھ کر فوراً یہ کہہ دیتی ہیں کہ ہماری شکست اس لئے ہوئی کہ "فریقِ ثانی نے دھاندلی کی تھی"۔ یہ بات خالص منطقی طور پر صحیح ہونے کے باوجود الکشنی سیاست کے سلسلے میں بالکل بے معنی ہے۔ دھاندلی اگر شکست و فتح کے لئے اتنی ہی مؤثر ہے تو سوال یہ ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے مقابلہ (دسمبر ۱۹۷۰) میں یحییٰ حکومت ساری دھاندلیوں کے باوجود کیوں ہار گئی۔ اور اندرا گاندھی کی بے مثال دھاندلیوں کے باوجود جنتا پارٹی کو کیوں کامیابی (اپریل ۱۹۷۷) حاصل ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ "دھاندلی" کا لفظ بول کر اپنی شکست کی توجیہ کرتے ہیں، وہ صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ دو میں سے کسی ایک دیوالیہ پن کی سرحد تک پہنچ گئے ہیں۔ سیاسی تدبر کا دیوالیہ پن یا اخلاص کا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی جماعتوں کی یہ باتیں اس قدر خالی از معنی ہیں کہ اگر منطقی اعتراض سے بچنے کے لئے ان کو "سیاسی جھوٹ" نہ کہا جائے تو انتہائی لاحاصل سیاسی مشغلہ کے بارے میں کم از کم یہ تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان پر انگریزی کی یہ کہاوت پوری طرح صادق آتی ہے:

FOOLS RUSH IN WHERE
ANGELS FEAR TO TREAD

نادان لوگ وہاں جا گھستے ہیں جہاں فرشتے قدم رکھنے سے گھبراتے ہیں۔

ایسی سیاست جو ذرائع و وسائل کی بربادی کے ہم معنی ہو۔ جو اہل ملک کی منفی جذباتیت میں اضافہ کرے، جو بار بار ایسے ناکام ہنگامے کھڑے کرے جن سے قدیم روایتیں ٹوٹ جائیں اور نئی صالح روایتیں قائم نہ ہوں، جو بے شمار اقتصادی اور سماجی نقصانات کے بعد عملاً صرف یہ نتیجہ دکھائے کہ ایک ظالم حکمراں کی جگہ دوسرا اس سے ظالم تر حکمراں تختِ اقتدار پر قبضہ کر لے، حتیٰ کہ جو اپنے "اسلامی محاذ" کو مضبوط بنانے کے لئے تخریبی عناصر کو اس طرح ابھارے کہ وہ زندہ ہو کر خود مسلم ملک کے ٹکڑے کر ڈالیں، ایسی سیاست کو کم سے کم جو نام دیا جا سکتا وہ یہی ہے۔

اعلان

الرسالہ ماہ جنوری ۱۹۷۷ کے شمارے قیمتاً درکار ہیں۔ جو لوگ فراہم کر سکیں، مطلع فرمائیں۔

منیجر

علم کلام کی حقیقت

ابو الہذیل العلاف نویں صدی عیسوی کا ایک متکلم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر تین ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ ابو الہذیل کا کہنا تھا کہ صفت کسی طرح ذات کی محمول نہیں ہوسکتی، صفت یا تو عین ذات ہے یا غیر ذات۔ وہ آخرت میں کسی مادی زندگی کا قائل نہ تھا۔ کیونکہ مادی یا جسمانی زندگی کے لئے حرکت ضروری ہے اور "حرکت کی ایک ابتدا ہے اور ہر ابتدا اپنی انتہا پر پہنچ کر ختم ہوجاتی ہے" ——— مذہب کی تعلیمات کو قدیم فلسفہ کی اصطلاحوں میں سمجھنے کی ان کوششوں نے ہمارے متکلمین کو عجیب و غریب قسم کی بے فائدہ موشگافیوں میں الجھا دیا۔ علم کلام، فلسفہ و منطق کے بجائے اگر قرآنی برہانیات (بالفاظ دیگر حقائق کون) کی بنیاد پر وضع کیا جاتا تو علم کلام اس الہیاتی استدلال کا علم ہوتا جس کو قرآن میں "حجت ابراہیم" کہا گیا ہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی کو کوئی ایسی چیز دی جاتی تھی جس سے وہ اپنی مخاطب قوم پر اپنی صداقت کو مدلل کرسکے۔ مختلف انبیاء کو اس سلسلے میں مختلف چیزیں دی گئیں جو ان کے اپنے حالات کے لحاظ سے انھیں درکار تھیں:

تلک الرسل فضلنا بعضهم علی بعض، منهم من کلم الله ورفع بعضهم درجات وآتینا عیسی بن مریم البینات وایدناه بروح القدس (بقرہ ۲ — ۲۵۳)

یہ پیغمبر کہ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فوقیت بخشی ہے۔ کوئی ان میں ہے کہ اللہ نے اس سے کلام کیا اور بعض کے درجے بلند کیے اور ہم نے عیسی بن مریم کو کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے ان کی تائید کی۔

حضرت ابراہیم کو اس مقصد کے لیے جو چیز دی گئی وہ حجت عقلی تھی۔ اگرچہ یہ استعداد ہر نبی کے اندر موجود تھی مگر آپ کو خصوصی طور پر اس کا فیضان ہوا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص طور پر آپ کی طرف منسوب فرمایا۔ ارشاد ہوا ہے:

وتلک حجتنا آتیناھا ابراھیم علی قومہ (انعام - ۸۴)

اور یہ ہماری دلیل ہے کہ ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں دی۔

قرآن میں حجتِ ابراہیم کے دو واقعات بصراحت مذکور ہیں۔ ایک، قوم کی ستارہ پرستی پر آپ کا اعتراض۔ دوسری، بادشاہِ وقت (نمرود) سے آپ کی گفتگو۔ میں یہاں دوسری حجت کو نقل کرتا ہوں:

الم تر الی الذی حاج ابراھیم فی ربہ ان آتاہ اللہ الملک۔ اذ قال ابراھیم ربی الذی یحیی ویمیت قال انا أحیی وامیت قال ابراھیم فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب فبھت الذی کفر (بقرہ - ۲۵۸)

کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے بحث کی اپنے رب کے بارے میں، اس واسطے کہ اللہ نے اس کو سلطنت دی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، بولا کہ میں جلاتا ہوں اور مارتا ہوں۔ پھر ابراہیم نے کہا اللہ سورج کو مشرق سے لاتا ہے تو اس کو مغرب سے لادے، اس پر وہ منکر بھوچکا ہو گیا۔

اس مثال میں مخاطب نے پیغمبر سے حجت کی ہے یعنی وہ اس دعوے کے لیے دلیل کا مطالبہ کرتا ہے جو دونوں کے درمیان زیرِ بحث ہے۔ سوال یہ تھا کہ کسی کو قابلِ بندگی ہونے کا حق کس بنیاد پر ملتا ہے۔ مخاطب کا دعویٰ تھا کہ یہ معیار مقتدرِ اعلیٰ ہونا ہے اور چونکہ وہ ملک کا مقتدرِ اعلیٰ ہے، اس لیے وہ بندگی کا مستحق ہے۔ حضرت ابراہیم نے عقلی استدلال کے ذریعے ثابت کیا کہ زمین و آسمان کے حقیقی اقتدار کا مالک بادشاہ نہیں خدا ہے۔ آپ کا استدلال اتنا قوی تھا کہ مخاطب مبہوت ہو کر رہ گیا۔

اس مثال سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ جب مخاطب عقلی دلیل مانگے تو دعوت کا حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے سامنے عقلی دلیل پیش کی جائے۔

۲۔ یہ عقلی استدلال اس معیارِ استدلال کے مطابق ہونا چاہیے جو خود مخاطب نے

پیش کیا ہو۔

۳۔ استدلال اتنا قوی ہو کہ مخاطب اپنے کو دلیل سے عاجز سمجھنے لگے جس کا نفسیاتی نام مبہوت ہونا ہے۔

یہی علم کلام ہے۔ علم کلام کا مقصد، بنیادی طور پر یہ ہے کہ مخاطب کے پیش کردہ معیار استدلال کے مطابق اپنی دعوت کو مدلل کیا جائے۔ مخاطب جن اصطلاحوں میں بات کو سمجھنا چاہتا ہے، انھیں اصطلاحوں میں اس کو سمجھایا جائے اور اس کے مانوس فکری ڈھانچے کے مطابق اس کے لیے دین کو قابلِ فہم بنایا جائے۔

دین کو پوری طرح ماننے کے لیے "ایمان" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ ایمان کی تعریف یہ ہے کہ وہ داخل القلب ایمان (حجرات-۱۴) ہو۔ یہ ایمان کسی کے دل میں اترنے کے لیے جس راستے سے گزرتا ہے، وہ عقل کا راستہ ہے۔ عقل داخلۂ ایمان کا دروازہ ہے۔ جب تک ایمان کسی کے قلب میں جاگزیں نہ ہو، اس وقت تک سوال یہ رہتا ہے کہ عقل کے دروازے میں کون سا قفل لگا ہوا ہے اور وہ کس کنجی سے کھل سکتا ہے۔ چونکہ قفل متعدد ہو سکتے ہیں، اس لیے اس پہلے مرحلے کے لیے کنجیاں بھی متعدد درکار ہوتی ہیں۔ مگر جب دروازہ کھل جائے تو اس کے بعد سوال کئی نہیں رہتے بلکہ صرف ایک بن جاتا ہے۔ جس طرح خدا ایک ہے، اسی طرح انسان کی فطرتِ صحیحہ بھی ایک ہے۔ داخل القلب ایمان حاصل ہونا گویا فطرتِ صحیحہ کی وحدت کا کائنات کی وحدت سے مربوط ہو جانا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں تعلق باللہ کا حصول کہا جاتا ہے۔ تعلق باللہ بلا تشبیہ اسی قسم کا ایک واقعہ ہے جیسے میرے کمرے کے بلب اور پاور ہاؤس کے درمیان بجلی کے رشتے کا قائم ہو جانا۔ اس طرح کا تعلق باطنی طور پر ہمیشہ صرف ایک معنی رکھے گا اور وہ ہے "بجلی کی رو" مگر اس بہاؤ کو دوطرفہ قائم کرنے کے لیے سوئچ مختلف حالات میں مختلف ہو سکتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ علم کلام اصلاً معرفتِ الٰہی کا علم نہیں ہے بلکہ اثباتِ الٰہی کا علم ہے۔ اثبات و استدلال کے طریقے ہر دور میں جداگانہ ہو سکتے ہیں مگر معرفت کا علم ہر دور میں یکساں رہے گا کیونکہ

عقل انسانی ایسا کرسکتی ہے کہ اپنے دروازے کھولنے اور بند کرنے کے لیے نئے نئے تالوں اور کنجیوں کا تجربہ کرے۔ مگر خدا کے یہاں اس قسم کی تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔ خدا اپنی ذات میں ایک ازلی اور ابدی حقیقت ہے۔ اسی طرح فطرتِ انسانی کا اصل جوہر جس کے تاروں کے ذریعے خدا اور بندے کا تعلق قائم ہوتا ہے، وہ بھی ایک مستقل اور غیر تغیر پذیر حقیقت ہے۔ اس لیے تعددِ کلام کی ضرورت صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک فطرتِ صحیحہ بیدار نہ ہوئی ہو۔ جب فطرت بیدار ہو جائے اور دنیا ے حقیقت میں بندے اور خدا کا تعلق اپنی اصل حیثیت میں قائم ہو جائے، اس وقت وحدتِ کلام تعددِ کلام کی جگہ لے لیتی ہے۔

علم کلام کی ضرورت کے دو اور پہلو ہیں :

۱۔ ذہنی غلبہ کی فضا پیدا کرنا۔

۲۔ اتمامِ حجت

اول الذکر پہلو کا مطلب یہ ہے کہ دین کی علمی نمائندگی کے نتیجے میں عمومی طور پر ایسی ذہنی فضا بن جائے کہ دین اور خدا کی بات ہلکی بات نہ رہے بلکہ بھاری بھرکم بات بن جائے۔

ذہنی غلبہ کی یہ فضا اسلام دو طریقوں سے حاصل کرتا ہے۔ ایک سیاسی قوت۔ دوسرے عقلی استدلال۔ اگر کسی علاقے میں اسلام کا سیاسی اقتدار قائم ہو جائے تو خواہ حکومت مذہبی معاملات میں غیر جانب دار ہی کیوں نہ ہو، اسلام کے حق میں ذہنی غلبہ کی ایک فضا خود بخود قائم ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آٹھ نو سو برس کی حکومت کے باوجود یہاں کے مسلم حکمرانوں نے کبھی اشاعت دین کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ اس غلطی کے لیے میں انھیں معذور قرار دینے کا دکیل نہیں بن سکتا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ مسلم اقتدار نے عمومی غلبہ کی جو فضا پیدا کی، وہ تبلیغ دین کی غیر سرکاری کوششوں میں مددگار ثابت ہوئی۔ جب اس علاقے کو خراسان اور ماوراء النہر کے سیاسی حوصلہ مندوں نے فتح کیا تو اسی کے ساتھ بخارا، بلخ، سمرقند، خوارزم، عراق اور ایران کے علماء قطار در قطار یہاں

آنا شروع ہوئے۔ ابتداءً ملتان اور لاہور کے علاقے ان کا مرکز بنے۔ اس کے بعد جب ۷۰۰ھ میں سلطان شمس الدین التمش نے دہلی کو دارالسلطنت بنایا تو ہر طرف سے علما سمٹ سمٹ کر دہلی میں جمع ہونے لگے۔ اس طرح حکومت کے براہ راست تعاون کے بغیر، مگر اسلام کے سیاسی غلبے کی عمومی فضا میں، تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کے وہ سارے کارنامے انجام پائے جن کا نتیجہ آج ہم اس برصغیر میں ۲۰ کروڑ مسلمانوں کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

ذہنی غلبے کی اس فضا کے لیے سیاسی غلبہ ناگزیر نہیں، وہ عقلی استدلال کے ذریعہ بھی پیدا ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ عقلی بنیادوں پر بنی ذہنی فضا اتنی وسیع اور قوی شکل اختیار کر سکتی ہے کہ سیاسی غلبے سے پیدا ہونے والی فضا پر بھی بھاری ثابت ہو۔ یہاں مثال کے طور پر مغربی قوموں کی موجودہ سائنس کا نام لیا جاسکتا ہے۔ مغربی قوموں کا سیاسی اقتدار آج ایشیا اور افریقہ سے تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ مگر مغربی قوموں نے دماغی علوم میں جو برتری حاصل کی ہے، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج بھی آزاد شدہ ممالک پر ان کا مکمل ذہنی غلبہ قائم ہے۔ کسی چیز یا کسی نظریے کا "فارن" ہونا اس کی بہتری کا ایسا ثبوت ہے جو بلا بحث تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یہ ایک مسلّمہ بن گیا ہے کہ جو چیز مغرب سے آئے وہ ضرور معیاری ہوگی۔ حالانکہ صرف چند سو برس پہلے مغربی سائنس کی یہ حیثیت نہیں تھی۔ کیمسٹری قدیم طرز کے کیمیا دانوں کے سامنے محض تانبے پیتل کو سونا بنانے کا ایک خبط تھا اور فلکیات پرانے نجومیوں کے ہاں لوگوں کو مستقبل کی بات بتا کر ان کو لوٹنے کی ایک بدنام تدبیر تھی۔

ذہنی مرعوبیت اور تصوراتی غلبے کی یہ فضا جب کسی تحریک کے حق میں پیدا ہو جائے تو بہت سی مصنوعی اور غیر ضروری رکاوٹیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں اور تحریک کی توسیع و ترقی کا کام ایک موافق فضا میں ہونے لگتا ہے۔ ذہنی غلبہ کی فضا کی مثال پختہ سڑک کی ہے۔ اگر آپ اپنی گاڑی ناہموار بیابان میں چلا رہے ہوں تو طرح طرح کی زحمتیں پیش آتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ کو ایک بنی بنائی پختہ سڑک مل جائے تو سفر نہایت تیزی اور آسانی سے ہونے لگے گا۔

علم کلام کا ایک کام اسی قسم کی ذہنی فضا پیدا کرنا ہے۔ علوم کا ایسا مطالعہ کہ وہ

اسلامی عقائد کے مؤید نظر آنے لگیں۔ تاریخ کی ایسی نقشہ کشی جس میں اسلام اپنی واقعی جلوہ پالے۔ حقائق کائنات کی ایسی تعبیر جس سے اسلام کی تصدیق و تصویب ہو۔ اسلامی صداقتوں کا ایسے انداز اور ایسے دلائل کے ساتھ اظہار جو وقت کے ذہن پر عظیم سوالیہ نشان بن کر مسلط ہو جائے۔ غرض برتر علمی تدوین اور اعلیٰ استدلال کے ذریعے لوگوں کے طرز فکر پر اس طرح چھا جانا کہ ان کی عقل کو نظر آنے لگے کہ اسلام کے سوا کوئی چیز حقیقت کے خانے میں بیٹھ ہی نہیں رہی ہے۔ جہاں اسلام کا احترام دلوں میں جگہ پا چکا ہو وہاں دعوت اسلام کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے اور یہ ایک طاقتور علمِ کلام کا نہایت اہم فائدہ ہے۔

علمِ کلام کا ایک پہلو اتمام حجت ہے۔ اتمام حجت کے معنی ہیں ثبوت کو مکمل کرنا۔ استدلال کو آخری حد تک پورا کر دینا۔ یہ کام کیونکر ہوگا۔ اس کی صرف ایک شکل ہے۔ وہ یہ کہ خود انسان کے پاس اور اس کے اپنے تجربے میں جانچنے پرکھنے کی جو صلاحیت ہے، اس کے اعتبار سے اپنے دعوے پر دلیل کو آخری حد تک پہنچا دیا جائے۔ یہ صلاحیت عقل کہلاتی ہے۔ اس لیے اتمام حجت کے معنی ہیں ــ عقلی طور پر کسی کے لیے دین کی صداقت کو آخری حد تک ثابت شدہ بنا دینا۔ پچھلے زمانوں میں انسان کی عقل خارقِ عادت واقعات کو اپنے لیے آخری فیصلہ کن چیز سمجھتی تھی، اس لیے قدیم دور میں اکثر انبیا نے اتمام حجت کے لیے خارق عادت معجزات پیش کیے۔ مگر آخری رسول کی بعثت کے بعد دنیا ایک نئے دَور میں داخل ہو رہی تھی جب کہ علم کو فیصلہ کن مقام ملنے والا تھا، اس لیے آپ کو کتابی معجزہ ـ قرآن ـ دیا گیا، جو نہ صرف اپنی ابدی صداقت کی وجہ سے ممتاز ہے بلکہ ترقی یافتہ انسانیت کی عقل کے لیے حجت اور برہان بننے کا سارا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی جب آتا تو وہ اپنی قوم کی اپنی زبان میں خطاب کرتا۔ (وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ، ابراھیم-۴) اس وقت تک کسی قوم کو منکر قرار دے کر اسے سزا نہیں دی جاتی جب تک پیغمبر کی دعوت کا اس تک پہنچنا معلوم

اور ثابت نہ ہو۔ (لم یکن ربک مهلک القری بظلم و اهلها غافلون، انعام - ۱۳۱)
اتنی قوت و شدت سے دعوت پیش کی جاتی کہ مخاطب پکار اٹھتا کہ تم نے تو اپنا سبق ہم کو خوب پڑھ پڑھ کر سنا دیا ہے۔ (... ولیقولوا درست، انعام - ۱۳۱) نبوت کے لیے خصوصیت سے موزوں صلاحیتوں والی شخصیت کا انتخاب کیا جاتا۔ (الله یصطفی من الملائکة رسلا ومن الناس، حج - ۷۵)

یہ سب کیوں تھا۔ اسی لیے کہ دعوت پہنچانے کا وہ اعلیٰ ترین معیار حاصل ہو سکے جو مخاطب کے ذہن کے اعتبار سے اس کے لیے آخری دلیل بن جائے۔ جب انکار تعقل سے محروم ہو چکا ہو اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی بنیاد اس کے پاس باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے پاس سوچنے اور رائے قائم کرنے کی جو سب سے بڑی صلاحیت ہے وہ عقل ہی ہے۔ اس لیے انسان کا یہ جرم کہ ایک بات جو حق تھی، اس کو پوری طرح سمجھ لینے کے باوجود اس نے نہیں مانا، اسی وقت متحقق ہو سکتا ہے جب اس کے اپنے عقلی معیار کے مطابق اس حق کو ثابت کر دیا گیا ہو۔ کسی اور معیار کے لحاظ سے کوئی بات خواہ کتنی ہی مسلم الثبوت کیوں نہ ہو۔ ایسے شخص کو مجرم قرار دینے کے لیے وہ کافی نہیں ہو سکتی جس نے اپنی عقل کی بساط کے مطابق اس کا برحق ہونا جان نہ لیا ہو۔ یہی چیز ہے جس کے لیے پیغمبر کشتی لڑا، جس کے لیے عصا کو سانپ کی شکل دی گئی، جس کے لیے حجت ابراہیمی ظاہر ہوئی، جس کے لیے قرآن کو معجزۂ ادب کی شکل میں اتارا گیا۔ دعوت کا یہ اہتمام کبھی صرف حجت کا اتمام ہو کر رہ جاتا ہے اور کبھی ذہن کے دروازے کھول دیتا ہے، جیسا کہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے۔

اوپر کی گفتگو نے ہم کو جس مقام پر پہنچایا ہے، اس کے بعد یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ علم کلام کی اصل حقیقت کیا ہے۔ علم کلام کا کام اصلاً یہ نہیں ہے کہ دین کی حقیقت کو اس کے ابدی مفہوم میں بیان کرے۔ بلکہ علم کلام یہ ہے کہ وہ لوگ جن کے لیے شخصی یا زمانی اسباب کی بنا پر دین، عقلی طور پر قابل فہم نہ رہا ہو، ان کے لیے دین کو عقلی اصطلاحوں میں قابلِ فہم بنا دے۔ یہ تعریف بلاشبہ ایسی نہیں ہے جو پوری صورتِ حال

کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ دوسری چیزوں کی طرح یہاں بھی استثنا نہ صرف ممکن بلکہ ناگزیر ہے مگر عمومی طور پر (ایک قابل عمل توضیح کے اعتبار سے) یہ کہنا صحیح ہوگا کہ علم کلام کی حقیقت یہی ہے۔

علم کلام کی یہ تعریف اس کو بیک وقت دو چیزوں سے الگ کر دیتی ہے۔ اوّل فلسفہ سے جو حقیقت کو (اس کی ذاتی حیثیت میں) فی نفسہٖ متعین کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے معروضی طریق مطالعہ Objective Study سے جو کم از کم اپنے ادّعا کے مطابق حقیقت کی غیر جانبدارانہ تحقیق کا نام ہے۔ علم کلام کے نزدیک اسلام کی حیثیت خود ایک (دریافت شدہ) مسلّم التبوت نظام فکر کی ہے۔ علم کلام کا کام صرف اس کی زمانی تشریح اور اس کو مخصوص حالات کے اعتبار سے مدلّل کرنا ہے۔ اسی طرح نام نہاد معروضی طریق مطالعہ اختیار کرنے کا مطالبہ بھی علم کلام سے نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ علم کلام حقیقتہً کوئی علمی تلاش نہیں بلکہ تلاش میں کامیاب ہونے کے بعد ان عقلی دلائل کو مرتب شکل میں دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے جو خود پیش کرنے والے کے لیے متعلقہ سچائی پر مطمئن ہونے کا سبب بنے تھے۔" اسلام ایٹ دی کراس روڈس" کے مصنف کے سامنے غالباً یہی پہلو تھا جس کی بنا پر انھیں اپنی کتاب کے آغاز میں کہنا پڑا:

It does not pretend to be a dispassjonate survey of affairs: It is the statement of a case: the case of Islam versus Western civilization.

(یعنی اس کتاب میں ٹھنڈے دل سے غیر جانبدارانہ جائزے کا انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے، اس کا انداز ایک مقدمہ جیسا ہے۔ اسلام کا مقدمہ مغربی تہذیب کے نام)

اسلامی دعوت بیک وقت اپنے ساتھ دو متضاد تقاضے رکھتی ہے۔ ایک طرف اس کو اس نازک مگر دائمی رشتہ کی وضاحت کرنی ہے جو بندے اور خدا کے درمیان اس وقت قائم ہوتا ہے جبکہ وہ ایمان کی دولت کو پا گیا ہو۔ یہ ایک ابدی آواز ہے جس کو ابدی الفاظ میں بیان کرنا ہے۔ دوسری طرف اسلامی دعوت کا ایک پہلو یہ ہے کہ

(ذہنوں میں تقریب پیدا کی جائے اور) دین کو قابلِ فہم بنانے کے لیے اس کو مخاطب کے عقلی معیار کے مطابق ثابت کیا جائے۔ یہ دوسری چیز، اوّل الذکر کے برعکس، بڑی حد تک زمانی نوعیت کی حامل ہے۔ چونکہ انسان کا عقلی معیار اس کی معلومات کے تابع ہے اور یہ معلومات دن بدن بڑھتی اور بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے عقلی معیار بھی اس کے ساتھ تغیر و تبدل کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ وقتی اصطلاحوں میں دائمی حقیقت کی تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ امام رازی کی تفسیر کے فلسفیانہ اور طبیعیاتی مباحث آج بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔

بلاشبہ اسلامی دعوت میں ان دونوں پہلوؤں کی اہمیت ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مستثنیٰ حالات کو چھوڑ کر دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کا بدل نہیں بنایا جا سکتا۔ جب بھی ہم ایک کو دوسرے کی جگہ پر رکھیں گے، بیشتر حالات میں کوئی ایک یا دونوں مقصد مجروح ہو جائیں گے۔ اس لیے عملی بات یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تقسیمِ عمل کے اصول کو مان لیا جائے۔ تشریحِ دین کا علم مثبت دائرے کے لیے ہے اور علم کلام اس کے مقابلے میں دفاعی یا منفی دائرے میں اپنی خدمت انجام دیتا ہے۔ اول الذکر کا کام دین کو ایک مطلق صداقت کی حیثیت سے ظاہر کرنا ہے۔ جبکہ ثانی الذکر سے بنیادی طور پر جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ مخاطب کی ذہنی رکاوٹوں کو دور کرے تاکہ وہ اصل دعوت کو سمجھ سکے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ مثبت تعبیرات منفی استدلال کے لیے بالکل غیر مفید ہیں یا یہ کہ منفی استدلال کا مثبت تعبیر کے لحاظ سے کوئی فائدہ نہیں۔ نازک علمی مسائل، وہ بھی ایسے مسائل جن کا تعلق انسان کی نفسیات سے ہو، اس طرح کی مطلق تقسیم قبول نہیں کرتے۔ دونوں مختلف پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں اور اکثر حالات میں ایک دوسرے کے لیے معین و مددگار بھی۔ تاہم نوعیت کے فرق کو سمجھنے کے لیے دونوں کے درمیان اس قسم کی تقسیم ناگزیر ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ فلسفہ اور علم کلام دونوں ہم معنی الفاظ

نہیں ہیں، جیسا کہ ماضی میں غلطی سے سمجھ لیا گیا تھا۔ ایک زمانے میں فلسفہ عام طور پر مذہب کے ایک شعبے کے طور پر کام کرتا رہا ہے۔ اس زمانے میں فلسفہ کا کام زیادہ تر یہ تھا کہ مذہبی عقائد کو فلسفیانہ اصطلاحات میں بیان کر دیا جائے۔ یہ فلسفہ جب عباسی دور میں (ترجمہ ہو کر) مسلم سوسائٹی میں پھیلا تو ابتداءً بہت سے لوگوں کو توحش ہوا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ مذہب کے بالمقابل کوئی اور چیز ہے۔ بعد کو زیادہ تحقیق سے سمجھ میں آیا کہ زیادہ تر فرق صرف انداز اظہار کا ہے۔ ورنہ فلسفہ اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں۔ چنانچہ فلسفہ میں تھوڑا سا ردوبدل کر کے اس کو مسلمان بنا لیا گیا اور اسی مسلمان فلسفے نے بالآخر علم کلام کی شکل اختیار کر لی۔

اس واقعہ سے یہ فائدہ تو ہوا کہ فلسفہ اور مذہب دو متصادم چیزیں نہیں رہیں بلکہ فلسفہ خود مذہب کا خادم اور مؤید بن گیا۔ مگر اس ترکیب نے علم کلام میں ایک غلطی بھی شامل کر دی۔ وہ یہ کہ علم کلام کے موضوعات وہی بن گئے جو خود فلسفہ کے موضوعات تھے۔

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

ثم لما نقلت الفلسفة عن اليونانية الى العربية وخاض فيها الاسلاميون وحاولوا الرد على الفلاسفة فيما خالفوا فيه الشريعة فخلطوا بالكلام كثيرا من الفلسفة ليتحققوا مقاصدها فيتمكنوا من ابطالها وهلم جرا الى ان ادرجوا فيه معظم الطبيعيات والالهيات وخاضوا في الرياضيات حتى كاد لا يتميز عن الفلسفة لولا اشتماله على الالهيات

شرح العقائد النسفیہ، صفحہ ۶

پھر جب فلسفہ یونانی زبان سے عربی زبان میں منتقل ہوا اور مسلمان اس میں گھسے اور انھوں نے فلاسفہ کا ان مسائل میں رد کرنے کا ارادہ کیا جو شریعت کے خلاف تھے تو انھیں اپنی بحث میں فلسفہ کا کافی حصہ لینا پڑا تاکہ وہ فلسفہ کے اصل مسائل کو محقق کر دیں اور پھر ان کا غلط ہونا ثابت کر سکیں۔ یہاں تک کہ مسلمانوں نے فلسفہ میں طبیعیات اور الہیات کا بھی بڑا حصہ لے لیا۔ اسی طرح مسلمان ریاضی کی طرف متوجہ ہوئے تو اس میں ایسا گھسے کہ اگر اس میں الہیات کا حصہ نہ ہوتا تو اس کو فلسفہ سے ممتاز کرنا دشوار ہو جاتا۔

فلسفہ کا کام اصلاً حقیقت کی دریافت تھا۔ نیز اپنی فطرت کے اعتبار سے وہ حقیقت کو اس کی آخری حدود تک متعین کرنا چاہتا تھا۔ جب دونوں علوم باہم مخلوط ہوئے تو نتیجہ یہ ہوا کہ علم کلام نے بھی اپنے ذمہ یہی کام لے لیا اور یہ کوشش شروع کر دی کہ حقیقت کے بارے میں فلسفہ کے پیدا کردہ تمام سوالات کا جواب اس طرح دیا جائے کہ حقیقت اپنی آخری شکل میں متعین ہو کر سامنے آجائے۔

اسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ ملت کے عام اور معروف عقائد کے بالمقابل عقائد کا ایک طویل مجموعہ تیار ہو گیا۔ یہ مجموعہ نہ صرف امت کے اصل عقائد پر اضافہ تھا بلکہ بہت سے پہلوؤں سے وہ قرآن و سنت کے اسلام سے ٹکرانے والا تھا۔ پھر جب متکلمین کے موضوعہ عقائد کے لوازم و نتائج پر نظر گئی تو معلوم ہوا کہ یہ شریعت سے الگ ایک شریعت ہے جس نے خدا کے قرآنی تصور تک کو بدل ڈالا ہے۔ یہی وہ صورتِ حال تھی جس نے متکلمین اور محدثین کے درمیان زبردست کشمکش پیدا کر دی اور وہ سارے ناخوشگوار واقعات وجود میں آئے جن کو ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کلام کا کام اصلاً دفاعی ہے نہ کہ اثباتی۔ یعنی علم کلام کو یہ نہیں بتانا ہے کہ دین کیا ہے۔ اس کو صرف یہ کرنا ہے کہ دین کے خلاف جو علمی حملے یا اس کی راہ میں ذہنی رکاوٹیں ہیں، ان کا فکری سطح پر مقابلہ کر کے انھیں ختم کرے۔ دوسرے لفظوں میں علم کلام کا کام ذہنی میدان میں وہی ہے جو بدر و حنین کے معرکے میں تلوار کا۔ تلوار، بلاشبہ اسلام کے دفاع کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اگر تلوار کو توجیہہ دین کے مقام پر رکھ دیا جائے تو پھر وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کو "بیلچہ پارٹی" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح علم کلام اگرچہ اسلام کے دفاع کے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن اگر اس کو دین کی فلسفیانہ توجیہہ کے لیے استعمال کیا جانے لگے تو وہ چیز وجود میں آئے گی جس کو ایک مصنف نے "فنی مفروضات" کا نام دیا ہے اور جو مصنف مذکور کے الفاظ میں "ایک ایسا اسلام ہے جس کو ملت کے عقائد سے ذرا تعلق نہیں" مثال کے طور پر تفسیر بیضاوی کے آغاز میں "رحمان" کی حقیقت کی طویل بحث، جو صرف اس لیے

پیدا ہوئی ہے کہ ذہن رحمانیت کو فلسفیانہ سوالات کی روشنی میں متعین کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ سادہ طور پر سمجھنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہمارے اعمال کی جو جزا خدا کی طرف سے ملتی ہے، اسے مجازاً رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قدیم فلسفہ کے اتباع میں متکلمین نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ عرض قائم بالغیر ہوتا ہے اور اس کا وجود آنی اور فانی ہے۔ اس فلسفیانہ مسئلے کو علم کلام میں شامل کرنے کی وجہ سے بہت سے غیر ضروری مسئلے پیدا ہو گئے۔ اس کی وجہ سے اعمال کے وزن کو سمجھنا ناممکن ہو گیا۔ افعال کے صدور سے قبل استطاعت کا وجود محال قرار پایا۔ قیامت کے دن ہاتھ پاؤں کی شہادت ناقابل تصور ہو گئی۔ حدیث میں تھا کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان، اس کی کوئی اصلیت باقی نہیں رہی۔ وغیرہ۔

علم کلام کو فلسفے سے مخلوط کرنے کی یہ غلطی اس طرح پھیلی کہ بعد کے لوگ بھی اپنے آپ کو اس سے بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر اقبال جب "الٰہیات اسلامی کی تشکیل جدید" کرنے بیٹھے تو وہ بھی اس میں مبتلا ہو گئے۔ مثلاً اسلام کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد جنت اور جہنم ہے۔ اس عقیدے کے سلسلے میں بہت سے فلسفیانہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ سوال کہ جنت اور جہنم مادی ہیں یا غیر مادی۔ ڈاکٹر اقبال نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی تو انھیں کہنا پڑا:

Heaven and Hell are states, not localities.

(جنت اور جہنم احوال ہیں، مقامات نہیں) یہ الفاظ ڈاکٹر اقبال کے قلم سے اس لیے نکلے کہ اس کے بغیر جنت اور جہنم کا عقیدہ ان کو فلسفے کے ڈھانچے میں بیٹھتا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ مگر عین اس وقت جب وہ سمجھ رہے تھے کہ دین کو فلسفے کے ڈھانچے کے اندر بٹھانے میں وہ کامیاب ہو چکے ہیں، دین کا اصل عقیدہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس کے برعکس اگر علم کلام کو وہ اپنی حدود میں رکھتے تو وہ صرف یہ ثابت کرنے پر قناعت کرتے کہ مرنے کے بعد بہر حال ایک ایسا انجام سامنے آنے والا ہے جو اپنی نوعیت میں ویسا ہی ہوگا جس کو مذہب نے انسانی الفاظ میں جنت اور جہنم سے تعبیر

کیا ہے۔ باقی یہ سوال کہ وہ مادی ہے یا غیر مادی، اس کا علم کلام سے تعلق نہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے فلسفے کی حد شروع ہو جاتی ہے۔

ایک چیز ہے دین کی واقعیت اور ایک چیز ہے دین کی نوعیت۔ جب علم کلام کو دفاعی مقصد تک محدود رکھا جائے تو اس کا کام ہوتا ہے دین کی واقعیت کو چیلنج کرنے والوں کے مقابلے میں دین کی واقعیت ثابت کرنا۔ اس کے برعکس جب علم کلام کو اثباتی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کلامی زبان میں دین کی حقیقی نوعیت کی تفصیل کر رہے ہیں۔ جبکہ خود دین میں اس طرح کی تفصیلات بیان نہیں کی گئی ہیں بلکہ صریح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ اس قسم کی تفصیلات متعین کرنے کے پیچھے نہ پڑو:

وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنہا — اور اللہ تعالیٰ نے بعض چیزوں کے بارے میں بغیر بھولے ہوئے سکوت اختیار کیا ہے تو اس کے بارے میں خوض نہ کرو۔

شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی بنیاد پر کہا تھا:

ابھموا ما ابھمہ اللہ — اللہ نے جس کو مبہم رکھا ہے تم بھی اس کو مبہم رکھو۔

خیر الروایات

ظاہر ہے کہ جن باتوں کی حقیقت اللہ نے بیان نہ فرمائی ہو، اس کے متعلق آپ کا بیان لامحالہ انسانی علم کی بنیاد پر ہوگا۔ ایسی حالت میں آپ کے بیان کا دو میں سے کسی ایک غلطی کا شکار ہونا لازمی ہے۔ حقیقت کی تفصیلی نوعیت اگر انسان کے لیے ناقابلِ ادراک ہے اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس سے سکوت اختیار فرمایا ہے، تو انسانی علم بھی اس کے ادراک سے ہمیشہ قاصر رہے گا۔ ایسی حالت میں مجرد علم انسانی کی بنیاد پر جو تشریح کی جائے گی وہ لازمی طور پر غلط ہوگی اور اگر بالفرض اس کو قابل ادراک مانا جائے، جب بھی اس معاملے میں، کم از کم موجودہ انسانی علم کوئی صحیح بنیاد فراہم کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا کیونکہ یہ انسانی علم خود اپنے اعتراف کے مطابق ابھی ارتقائی مرحلے میں ہے۔ اس کو کسی بھی درجہ میں یہ دعویٰ نہیں کہ وہ حقیقت کے آخری عرفان تک پہنچ گیا ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ اگر ہم موجودہ انسانی علم کی بنیاد پر حقیقت الحقایق کی تفصیلی نوعیت متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ کوشش زمانی معیار کی روشنی میں دائمی حقیقت کو متعین کرنے کی کوشش ہوگی جو بالفرض آج غلط نظر نہ آئے، جب بھی آئندہ یقینی طور پر غلط ثابت ہوگی۔

انسان کی تمام غور وفکر اپنی معلومات کے دائرے میں ہوتی ہے۔ معلومات کے باہر آدمی کوئی تصور قائم نہیں کرسکتا۔ انسان اپنے حواس کے ذریعہ معلومات اخذ کرتا ہے اور پھر عقل ان سے کلیات بناتی ہے اور انھیں کلیات کے بارے میں غور وفکر کرتی ہے۔ جو چیزیں ہمارے محسوسات سے باہر ہیں، ان کے معاملے میں وحی والہام کے بغیر مجرد عقل کام نہیں کرسکتی۔ متکلم کے لیے ضروری ہے کہ اس فرق کو واضح طور پر اپنے سامنے رکھے ورنہ وہ خود بھی غلط رائے قائم کرے گا اور دوسروں کو بھی غلطی میں مبتلا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ منکرین نے روح (وحی) کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا، اس کے جواب میں روح کی اصل حقیقت پر بحث نہیں چھیڑ دی گئی بلکہ یہ جواب دیا گیا:

یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی	وہ تجھ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں کہدو
وما اوتیتم من العلم الا قلیلا	کہ روح خدا کے حکم سے ہے اور تم کو بہت تھوڑا
اسراء ۸۵	علم دیا گیا ہے۔

علم کلام کی جس حد بندی کی ہم نے وکالت کی ہے۔ اس کے سلسلے میں یہ آیت بہت اہم بنیاد کا کام دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس دائرۂ فہم کے اندر رائے قائم کرسکتا ہے جو فطرت کی طرف سے اسے دیا گیا ہے۔ اس دائرے سے باہر جاکر رائے قائم کرنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ اس لیے حقیقت پسندی یہ ہے کہ جو امور ہمارے دائرۂ فہم کے اندر ہوں، ان کے بارے میں آخری حدود تک جانے کی کوشش کریں۔ مگر جو امور عقل کے دائرے سے باہر ہوں، ان میں مجمل اثبات پر قناعت کریں۔

قدیم زمانے میں یہ بات ممکن ہے صرف مذہبی عقیدہ نظر آتی ہو۔ مگر آج وہ سائنسی امر واقعہ بن چکی ہے۔ انیسویں صدی کی سائنس کے برعکس آج کی سائنس متفقہ طور پر یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ حقیقت الحقایق انسانی عقل یا ریاضیاتی پیمائشوں سے باہر کی چیز ہے۔

اس کے بارے میں ہم یہی کر سکتے ہیں کہ بعض خارجی علامات کی بنا پر ایک قیاسی رائے قائم کریں۔ دوسرے لفظوں میں سائنس کا سفر ایک حد کے بعد اس مقام پر آجاتا ہے جہاں مجمل ایمان کے بغیر چارہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں جدید سائنس نے تقریباً وہی موقف اختیار کر لیا ہے جس کی طرف قرآن نے ڈیڑھ ہزار برس پہلے نشاندہی کی تھی۔

قرآن کی ایک اور آیت ہے:

ھوالذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ھن ام الکتاب واخر متشابھات فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ماتشابہ منہ ابتغاء الفتنہ وابتغاء تاویلہ - ومایعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون آمنا بہ کل من عند ربنا ومایذکر الا اولوالالباب

آل عمران - ۷

اللہ نے تم پر کتاب اتاری جس کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو محکم ہیں۔ یہ ام الکتاب ہیں۔ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ سو جن کے دل میں کجی ہے وہ اس کے اس حصے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو متشابہ ہیں، فتنہ ڈھونڈنے کے لیے اور تاویل ڈھونڈنے کے لیے۔ حالانکہ ان کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں، وہ یوں کہتے ہیں ہم اس پر اجمالاً یقین لائے سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے ذریعہ جو حقیقتیں انسان پر ظاہر کی گئی ہیں، وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن کو محکم الفاظ کی شکل میں بتایا گیا ہے۔ دوسرے وہ جن کا نزول تشبیہی الفاظ کے ذریعہ ہوا ہے۔ اول الذکر کا تعلق اس دنیا سے ہے جو پوری طرح ہماری عقل کی گرفت میں آتی ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں محکم بات بتا دی گئی۔ ثانی الذکر کا تعلق اس دنیا سے ہے جو براہِ راست ہماری محدود عقل کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اس لیے ان کو تشبیہی الفاظ کے ذریعہ بتایا گیا۔ جیسے ایٹم کے نظام کو سمجھانے کے لیے شمسی نظام کی مثال دی جائے۔

محکم اور متشابہ کے فرق کو ربوٰا اور جنت و جہنم کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ربا (سود)

کی حرمت کا معاملہ انسانی دائرے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے اس کی بحث میں یہ کوشش بالکل صحیح اور جائز ہوگی کہ اس کے نفع وضرر کو آخری حد تک معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس میں ہم کو مثالوں کا سہارا لینے یا اجمالی عقیدے پر قناعت کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر جنت اور جہنم کا معاملہ ایک ایسی دنیا سے تعلق رکھتا ہے جس کو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ کوئی زندہ آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے۔ اس لیے اس کی بحث میں ہمیں اس پر اکتفا کرنا پڑے گا کہ مجرد اس کے امکانی وجود کو ثابت کرنے تک اپنی گفتگو کو محدود رکھیں۔ اس کی تفصیلی نوعیت متعین کرنے کے چکر میں نہ پڑیں۔ اگر ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرنے لگیں کہ جنت اور جہنم احوال ہیں یا مقامات، تو یہ انسانی عقل کے دائرے سے باہر قدم رکھنا ہوگا۔ خوش قسمتی سے عصر حاضر کا سائنسی طرز فکر بعینہ یہی ہے۔

آج کا ایک سائنس دان یہ ثابت کرنے میں اپنا وقت صرف نہیں کرتا کہ مکان Space, خارجی چیز Objective, ہے یا داخلی Subjective ۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے دائرہ امکان سے باہر ہے کہ اس کی حقیقی حیثیت متعین کر سکے۔ وہ "مکان" پر گفتگو کرتا ہے نہ اس پر کہ وہ خارجی ہے یا داخلی۔ اس قسم کے مسئلہ کو سائنس میں داخل کرنا سائنس کو فلسفہ بنا دینا ہے، بالکل اسی طرح جیسے قدیم متکلمین نے علم کلام کو فلسفہ بنا دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا معاملہ "متشابہات" کے قبیل سے ہے۔ یعنی انسان موجودہ عقل کے ساتھ چونکہ ان کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتا، اس لیے ان کو تشبیہی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے اس بحث میں متکلمین کی صرف وہ باتیں ٹھیک کہی جا سکتی ہیں جو وحی کے ظاہری الفاظ سے ماخوذ ہیں۔ جہاں انھوں نے ایسی باتیں کہی ہیں جن کی کوئی بنیاد وحی و الہام میں نہیں ہے اور وہ محض عقل کی پیداوار ہیں۔ ان کی صداقت نہ صرف مشکوک قرار پاتی ہے بلکہ خود یہ امر مشتبہ ہے کہ اس ممنوعہ حد میں قدم رکھنا ان کے لیے جائز تھا یا نہیں۔ مثلاً اتنی بات تو یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے بہت سی صفات ثابت کی ہیں۔ لیکن ان صفات کی کیفیت ونوعیت کہ وہ صفات حادث ہیں یا قدیم ہیں، عین ذات ہیں

یا غیر ذات ہیں، یا لاعین ولاغیر کی بحث، اس قسم کی تمام باتیں محض اپنی عقل سے نکالی ہوئی ہیں۔ ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ متکلمین نے یہاں علم کلام کے دائرہ سے باہر قدم رکھا ہے۔

البتہ اس میں بعض استثنائی صورتیں ہیں مثلاً چونکہ وحی کی بنا پر یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات خود قدیم ہے اور اس کے سارے ذاتی کمالات بھی قدیم ہیں، لہٰذا جو لوگ صفات کو حادث کہتے ہیں ان کی غلطی یقینی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ صفات الٰہی کو قدیم کہتے ہیں، اگرچہ مجرد عقل سے کہتے ہیں، ان کی رائے صحیح ہے۔ مگر صفات کا عین ذات ہونا یا غیر ذات ہونا، یا لاعین اور لاغیر کا نظریہ، یہ سب نہ مجرد عقل سے معلوم ہو سکتا ہے اور نہ وحی و الہام اس بارے میں رہنمائی کرتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کی تشریحات میں اگر خوض نہ کیا جائے اور صفات الٰہی کے مجرد اثبات پر اکتفا کی جائے تو یہ زیادہ صحیح بات ہے اور یہی قرن اول کے لوگ کرتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ پھر بھی بعض پہلوؤں سے علم کلام کو ایسے الفاظ استعمال کرنے پڑیں گے جو اپنے اندر زمانی قدر رکھتے ہوں اور جن کے متعلق یہ امکان ہو کہ مستقبل میں وہ اپنی موجودہ قدر کھو سکتے ہیں۔ مگر اس اندیشہ کو ضرورۃً اس لیے گوارا کیا جائے گا کہ بوقت استدلال وہ بہر حال مخاطب کے اوپر حجت ہیں۔ اور جہاں تک آئندہ کا تعلق ہے، ان سے نفس دین میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی۔

جب دین کی واقعیت ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی مواد استدلال کو استعمال کیا گیا ہو تو اس بنا پر دین کی حقیقت پر کوئی حرف نہیں آتا کہ اس مواد کے کسی جزء نے بعد کے زمانے میں اپنا وزن کھو دیا ہے۔ ایسا کوئی واقعہ صرف مواد استدلال کو متاثر کرتا ہے نہ کہ موضوع استدلال کو۔ دین کی واقعیت اصولاً صرف اس وقت مشتبہ ہو سکتی ہے جبکہ مواد کی کمزوری ثابت ہونے کے بعد کوئی دوسری دلیل اس کی صحت کو ثابت کرنے کے لیے باقی نہ رہے۔ جبکہ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ دین ایک دائمی اور قطعی صداقت ہے اور ہر زمانے میں اس کے حق میں استدلال کے لیے قوی سے قوی تر مواد حاصل ہوتا رہا ہے۔

متکلمین کی محولہ بالا غلطی کا اعادہ منطق کے استعمال میں بھی ہوا۔ منطق میں جن طریقوں سے کسی چیز کے حق میں حجت قائم کی جاتی ہے، اس کی چھ قسمیں بتائی گئی ہیں ۔ برہان، جدل، سفسطہ، خطابت، شعر، مغالطہ۔

برہان اس قیاس منطقی کو کہتے ہیں جس کے مقدمات یقینی طور پر صادق ہوں۔ جدل وہ قیاس ہے جس کے مقدمات اگرچہ مدعی کے نزدیک صادق نہ ہوں مگر خصم ان کو صادق مانتا ہو۔ ایسے مقدمات سے جو قیاس مرکب ہوتا ہے اس سے مقصود صرف خصم کو ساکت کرنا ہوتا ہے نہ کہ کسی بات کو ثابت کرنا۔ سفسطہ وہ قیاس ہے جس کے مقدمات صادق تو نہیں ہوتے لیکن بادی النظر میں صادق معلوم ہوتے ہیں۔ سفسطہ کے معنی ملمع کرنے کے ہیں۔ یعنی کاذب مقدمات پر صدق کا ملمع کر دیا گیا ہو۔ خطابت وہ قیاس ہے جو ایسے مقدمات سے مرکب ہوتا ہے جن کے لیے نہ صادق ہونا ضروری ہوگا نہ کاذب۔ اگرچہ احتمال دونوں کا ہوتا ہے۔ چونکہ عوام میں وہ مقبول ہوتے ہیں، اس لیے ایسے مقدمات سے جو قیاس مرکب ہوتا ہے، اس کے نتیجے سے لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ شعر وہ قیاس ہے جس کے مقدمات زیادہ تر غلط اور کبھی صحیح بھی ہوتے ہیں۔ اس قیاس سے مقصود مخاطب میں کوئی خاص کیفیت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ دھوکا دینا مقصود نہیں ہوتا۔ مغالطہ وہ قیاس ہے جس میں محض غلط اور جھوٹے مقدمات سے کام لیا جائے۔ اس سے مقصود مخاطب کو دھوکے اور غلطی میں ڈالنا ہوتا ہے۔

منطق کے معاملے میں متکلمین کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر جدلیات وغیرہ سے کام لیا، دلائل و براہین کو استعمال نہیں کیا۔ انھوں نے منطقی اسلحہ خانے کے صرف وہ ہتھیار لیے جو دشمن سے لڑنے کے واسطے ہوتے ہیں اور منطق کے ان طریقوں سے کام نہیں لیا جن سے مخاطب کو متاثر اور مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ منطق انھیں دونوں چیزیں دے رہی تھی مگر انھوں نے پہلی کو لیا اور دوسری کو چھوڑ دیا۔ اگرچہ بعض مستثنیٰ مثالیں بھی ہیں مگر اکثریت کے اعتبار سے صورت حال یہی ہے۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ ہمارے یہاں وہ علم کلام وجود میں آیا جو دلوں کو کھولنے کے بجائے

دوں کے دروازے بند کرنے والا" تھا۔ اس نے داعی اور مدعو کی گفتگو کو شطرنج کا کھیل بنا دیا جس میں آدمی پہلے سے سیکھی ہوئی چالوں کے ذریعہ فریق ثانی کو زک دینے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ آدمی کو گھیر کر منطقی تدبیروں سے چت کر دینا، یہ علم کلام کا کمال بن گیا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوشش کو ایک ذہنی کھیل تو قرار دیا جا سکتا ہے مگر اسلام کی دعوت کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ تاہم اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ خود علم کلام کی خرابی نہیں ہے بلکہ منطق کے غلط استعمال کی خرابی ہے۔ علم کلام میں وہ اس لیے داخل ہوگئی کہ اسی طریقے کو علم کلام کی بنیاد فرض کر لیا گیا۔ مناظرہ، جس نے دعوت کے کام کو ایک "بازی" بنا دیا اور مناظرہ بازی کا فن وجود میں آیا، وہ زیادہ تر اسی غلطی کا نتیجہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ علم کلام، اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، نام ہے اس بات کا کہ دین کو عقل کے ذرائع سے ثابت کیا جائے۔ چونکہ انسان کے اپنے پاس کسی بات کو سمجھنے کا واحد ذریعہ عقل ہے، اس لیے اسلام عقل کے ذریعہ اپنی بات سمجھا کر انسان کو مطمئن کرتا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں جب یونان کی منطق و فلسفہ ترجمہ ہو کر مسلمانوں کے اندر پھیلے تو لوگوں نے سمجھا کہ یہ بہترین عقلی ذریعہ ہے جس سے دین کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ اندازہ صحیح نہیں تھا۔ چنانچہ علم کلام کو یونانی منطق و فلسفہ پر ڈھالنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم کلام ایک فرضی اور قیاسی علم بن گیا جس کا تعلق حقیقت کی دنیا سے نہ تھا۔

یہ کام اس وقت ہوا جبکہ خود قرآن میں علم کلام کی دوسری بنیاد موجود تھی۔ وہ تھی تخلیق کائنات کی بنیاد جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ حق کی بنیاد پر ہے:

ما خلقنا السماوات والارض وما بینھما الا بالحق احقاف - ۳	ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

اس لیے یہ بالکل فطری بات ہے کہ اس کے اندر اثبات حق کا سارا مواد چھپا ہوا ہو۔ زمین و آسمان کی تخلیق میں اثبات دین کی جو حقیقی بنیاد تھی، وہ ارسطو کی منطق کی خیالی بنیادوں سے زیادہ قوی تھی۔ قدیم زمانے میں لوگوں کو قرآن کی اس کلامی بنیاد کی اہمیت سمجھ میں نہ آتی ہو۔ مگر موجودہ زمانے میں سائنس نے قرآن کے اشارات کو

تفصیلات کی صورت دیدی ہے اور قرآن کے اجمالی دلائل کو مکمل اور متعین دلائل بنادیا ہے۔ اب یہ سمجھنا نہایت آسان ہوگیا ہے کہ قرآن کی کلامی بنیاد ہی واحد بنیاد ہے جس پر علم کلام کی تعمیر کی جانی چاہیے۔ یہ وہ علم کلام ہوگا جو آدمی کے لیے آیت ہوگا، جو اس کو ذکر کرنے والا بنائے گا، دینی فکر کی صلاحیت پیدا کرے گا، جس کے بعد آدمی کا دل پکار اٹھے گا کہ حق یہی ہے، جو آدمی کو آخرت کے احساس سے سرشار کردے گا، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

ان فی خلق السماوات والارض واختلاف
اللیل والنھار لآیات لاولی الالباب۔
الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی
جنوبھم ویتفکرون فی خلق السماوات
والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا،
سبحانک فقنا عذاب النار
آل عمران: ۱۹۰-۹۱

بلاشبہ آسمان اور زمین کے بنانے میں اور رات
اور دن کے آنے جانے میں، نشانیاں ہیں عقل
والوں کے لیے جو کہ اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے،
بیٹھے اور لیٹے۔ اور غور کرتے ہیں آسمان اور
زمین کے پیدا ہونے میں، وہ پکار اٹھتے ہیں،
اے رب تونے اس کو عبث پیدا نہیں کیا،
تو پاک ہے سو بچا ہم کو آگ کے عذاب سے۔

استدلال کا یہ طریقہ تقریباً وہی ہے جس کو فلاسفہ **Arguments from design** کہتے ہیں۔ یہاں میں عہد حاضر کے ایک مشہور ترین منکر خدا کا ایک اقتباس نقل کروں گا جس نے صریح طور پر اس طریق استدلال کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ برٹرینڈرسل (۱۸۷۲-۱۹۷۰) اپنی کتاب "میں کرسچین کیوں نہیں" کے آغاز میں لکھتا ہے:

"It is true that scholastics invented what professed to be logical arguments proving the existence of God, but the logic to which these traditional arguments appealed is of an antiquated Aristotalian sort which is now rejected by practically all logicians.... there is one of these arguments which is not purely, I mean the arguments from design. This argument, however. was destroyed by Darwin.

ترجمہ: یہ صحیح ہے کہ علمائے مذاہب نے کچھ ایسی دلیلیں ایجاد کی ہیں جن کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ منطقی دلائل ہیں اور ان سے خدا کا وجود ثابت ہوتا ہے مگر وہ منطق جس پر ان روایتی استدلالات کی بنیاد قائم ہے، ارسطو کی قدیم منطق ہے جس کو عملاً اب تمام علمائے منطق رد کر چکے ہیں۔ ہاں ان دلائل میں ایک دلیل ایسی ضرور ہے جو خالص منطقی نہیں ہے۔ میری مراد نظم کائنات کی دلیل سے ہے۔ مگر ڈارون نے اس دلیل کو ختم کر دیا ہے۔"

برٹرینڈرسل نے مذکورہ استدلال کا وزن تسلیم کرتے ہوئے ڈارونزم کے حوالے سے اس کو رد کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر کائنات کا نظم تو ایک واقعہ ہے جبکہ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء کوئی ثابت شدہ واقعہ نہیں۔ وہ صرف ایک کام چلاؤ نظریہ Workable Theory ہے اور ظاہر ہے کہ محض ایک کام چلاؤ نظریے کی بنیاد پر کسی چیز کی واقعیت کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

توہماتی مذہب کو دیکھ کر ایک شخص نہایت آسانی سے یہ خیال قائم کر لیتا ہے کہ مذہب توہم پرستی کا نام ہے، یہی حال علم کلام کی اس شکل کا ہے جو آٹھ سو برس پہلے یونانی فلسفے کی زمین پر وجود میں آئی اور بعد کو صدیوں تک ہمارے دینی نصاب تعلیم کا ایک لازمی جز بنی رہی۔ آج جب علم کلام کا لفظ بولا جاتا ہے تو فوراً ذہن اس مخصوص علم کی طرف چلا جاتا ہے جو حقیقۃً علم کلام کی تاریخ کا ایک جزو ہے نہ کہ کل علم کلام۔

ایک بزرگ نے علم کلام پر تنقید کرتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی (صاحب الکلام) کا یہ "اعتراف" نقل کیا ہے:

فلسفی سر حقیقت نتوانست کشود
گشت راز دگر آں راز کہ افشا می کرد

شعر میں "فلسفی" کی نارسائی کا ذکر ہے نہ کہ متکلم کی۔ مگر قدیم متکلمین کے تتبع میں علم کلام اور فلسفہ کو ہم معنی سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں علم کلام حقیقۃً

علم دعوت ہے۔ جبکہ فلسفہ خود ایک مذہب ہے جو کسی چیز کو پہلے سے تسلیم کیے بغیر مجرد عقلی ذرائع سے حقیقت کی تلاش کرتا ہے۔

علم کلام کا یہ غلط تصور صرف ایک علمی اور فنی غلطی نہیں ہے بلکہ پچھلی صدیوں میں ہمیں اس کی وجہ سے زبردست نقصانات پہنچے ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہمارے یہاں سنجیدہ طبقے میں یہ ذہن بن گیا کہ دعوت و تبلیغ کے لیے علم کلام کوئی اچھا معاون نہیں ہے کیونکہ وہ زیادہ تر کج بحثی کا محرک ہوتا ہے۔ اس کا ردعمل یہ تھا کہ قدیم محدثین کی طرح بعد کے صوفیا نے بھی اس کو ترک کرنا ضروری سمجھا اور دوسری انتہا پر پہنچ گئے۔ انھوں نے سمجھا کہ کراماتی طریقۂ تبلیغ کی راہ میں زیادہ بہتر نتائج پیدا کرتا ہے۔ یہ طرزِ فکر اگرچہ جزوی صداقت کا حامل تھا مگر اسی کے ساتھ نقصان کا پہلو لیے ہوئے تھا۔

اس کی وضاحت ایک مثال سے ہو جائے گی۔ ہندوستان کی جو قومیں صوفیا کی تبلیغ سے مسلمان ہوئیں، ان میں عام طور پر بدعات و توہمات کا اس سے زیادہ زور ہے جتنا ان مسلم خاندانوں میں جو مسلم اقتدار کے زمانے میں باہر سے آئے اور یہاں آباد ہو گئے! اس کی وجہ کیا ہے۔ وجہ بالکل سادہ ہے۔ صوفیا کے ذریعے جو لوگ مسلمان ہوئے وہ عام طور پر کسی ذہنی و فکری انقلاب کے نتیجے میں مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ دعا و تعویذ اور کشف و کرامات سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ لوگ بالکل فطری طور پر اپنے ساتھ وہ تمام رسوم و رواج بھی لے آئے جو ان کے اپنے پچھلے سماج میں ہزاروں برس سے چلے آ رہے تھے یہ رسوم و رواج ان کے مسلمان ہونے کے باوجود، کہیں بالکل سابقہ حالت میں باقی رہے جیسا کہ ہریانہ کے میواتیوں اور راجستھان کے میراتیوں کی مثال میں نظر آتا ہے اور کہیں ان رسوم و رواج میں صرف اتنا تصرف ہوا کہ ان کو اسلامیا لیا گیا، جیسے ڈیہ وارہ کی جگہ شہید دارہ وغیرہ۔

صوفیا کے طریق تبلیغ کے برعکس علم کلام کا طریق تبلیغ فکری تبدیلی اور ذہنی انقلاب کی طرف سے اپنا عمل کرتا ہے۔ اس لیے جب کوئی اس راستے سے اسلام کو اختیار کرتا ہے تو وہ مکمل شعور کے ساتھ ایک مجموعۂ عقائد کو چھوڑ کر دوسرے مجموعۂ عقائد کو اپناتا ہے۔ اس لیے فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے زیر اثر جو شخص اپنا مذہب بدلتا ہے، وہ

پورے معنوں میں ایک نیا اور مختلف انسان بن جاتا ہے۔

یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ علم کلام، اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے، عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں تعلیم بالقلم (علق) کہا گیا ہے۔ یعنی علم وفکر کی راہ سے کسی کے اندر نفوذ کرنے کی کوشش کرنا۔ اللہ تعالے نے اسی طریقے کو اپنا طریقہ بتایا ہے:

علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم — خدا نے قلم کے ذریعے تعلیم دی، انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔

تمام انبیاء اپنی مخاطب قوموں کی ذہنی سطح اور زمانی حالات کے مطابق اسی ڈھنگ پر دین کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے۔

آخر میں ایک اور بات کا ذکر کرنا ضروری ہے، ورنہ علم کلام کی بحث ادھوری رہ جائے گی۔ اوپر میں نے علم کلام پر جو گفتگو کی ہے وہ دراصل اس پہلو سے ہے کہ ہم دیگر علوم سے الگ کرکے علم کلام کو سمجھنا چاہیں تو وہ کیا قرار پاتا ہے۔ بلاشبہ علم کلام فی نفسہ ایک دفاعی علم ہے مگر اس کی یہ حیثیت صرف اس وقت تک ہے جبکہ اس کو متکلم کی ذات سے الگ کرکے خالص منطقی مفہوم میں دیکھا جا رہا ہو۔ جب کلام کے ساتھ متکلم کو ملا لیا جائے تو بات بدل جاتی ہے۔ اس وقت علم کلام صرف ایک دفاعی علم نہیں رہتا بلکہ وہ سب کچھ بن جاتا ہے جو ایک صحیح اور مطلوب اسلامی دعوت کے اندر ہونا چاہیے۔

اس کو میں ایک مثال سے واضح کروں گا۔ نماز کیا ہے۔ اگر آپ منطقی طور پر اس کا خارجی تعین کرنا چاہیں تو نماز نام ہے چند کلمات کو زبان سے دہرانے اور کچھ مقررہ حرکات انجام دینے کا۔ نماز کا خارجی تعین کسی بھی طرح اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ مگر معلوم بات ہے کہ نماز صرف اس کا نام نہیں ہے۔ نماز کا دوسرا لازمی جزو خشوع ہے۔ یہ جزو اتنا اہم ہے کہ اس کے بغیر کوئی نماز حقیقی نماز نہیں بنتی۔ (لاصلوٰۃ لمن لم یتخشع)

نماز میں یہ دوسرا جزو کہاں سے آیا۔ یہ نماز کی اس شکل میں نہیں ہے جس کو ہم خارجی طور پر جان سکتے ہیں۔ بلکہ یہ وہ جزو ہے جو انسان کی نفسیات اس کے اندر شامل کرتی ہے۔ ایک برتی انسان ایسا بنایا جا سکتا ہے جو فقہ کے سارے تعینات کے ساتھ ایک

مکمل نماز کو دہرایئے۔ یہ نماز ظاہری طور پر مکمل ہونے کے باوجود خشوع سے خالی ہوگی۔ مگر نماز کی اسی شکل کو جب ایک خدا سے ڈرنے والا انسان دہراتا ہے تو اس وقت اس کی نفسیات کی آمیزش سے نماز خشوع کی نماز بن جاتی ہے۔ نماز انسان سے الگ ہو تو وہ الفاظ اور حرکات کا ایک ڈھانچہ ہے۔ نماز انسان کے ساتھ ہو تو وہ ایک پُر کیف عمل ہے۔

یہی حال علم کلام ہے۔ اگر آپ کاغذ کے اوپر اس کا خارجی مطالعہ کر رہے ہوں تو علم کلام ایک دفاعی علم نظر آئے گا جو اس لیے ہے کہ مخاطب کے عقلی سوالات کا جواب دے سکے۔ لیکن جب اسی کے ساتھ آپ متکلم کو بھی ملالیں، اس متکلم کو جو حقیقی داعی ہو اور خدا کے بندوں کو خدا کی راہ کی طرف لانے کے لیے بے قرار ہو، تو علم کلام صرف اتنی سی چیز نہیں رہتا جو کاغذ کے اوپر منطقی تعین میں نظر آتا ہے بلکہ اس کے اندر انسان کی ہستی کی وہ تمام چیزیں شامل ہو جاتی ہیں جو داعیانہ جذبات کے تحت پیدا ہوتی ہیں۔

اپریل ۱۹۶۷ء کا واقعہ ہے۔ لکھنؤ میں ایک صاحب سے میری چند ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ ایک نہایت ذہین اور محنتی آدمی ہیں۔ انھوں نے فلسفہ میں ایم اے کیا ہے اور سات سال کی ریسرچ کے بعد برٹرینڈرسل پر اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ تیار کیا ہے۔ فلسفہ کا طالب علم یوں بھی عام طور پر مذہب کے بارے میں متشکک ہو جاتا ہے اور برٹرینڈرسل تو اس دور میں ملحدوں کا سردار ہے۔ پھر برٹرینڈرسل پر ریسرچ کرنے والے کا عالم کیا ہوگا۔ فلسفہ کی تعلیم اور برٹرینڈرسل پر ریسرچ نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو پورے معنوں میں علمی الحاد تک پہنچا دیا تھا۔

ان ملاقاتوں میں اتفاق سے چند علما بھی شامل تھے۔ میں نے گفتگو کی تو ساری گفتگو میں کہیں خدا، آخرت، رسالت وغیرہ کا کوئی نام نہ تھا۔ "منھ بند کرنے" کی ٹکنیک بھی ساری گفتگو میں کہیں استعمال نہیں کی گئی تھی۔ مگر گفتگو کے خاتمے پر انھوں نے تقریباً تمام باتوں کو مان لیا تھا۔

علما جو خاموش بیٹھے ہوئے ساری گفتگو کو حیرانی کے ساتھ سُن رہے تھے، بعد کو

انھوں نے کہا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کی اس گفتگو کو علم کلام کے خانے میں رکھیں یا دعوت کے خانے میں۔ اگر علم کلام کے خانے میں رکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو عین دعوت ہے اور دعوت قرار دینا چاہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو پورے معنوں میں علم کلام ہے۔ میں نے کہا کہ یہ علم کلام بھی ہے اور دعوت بھی، حقیقت یہ ہے کہ علم کلام اور دعوت دونوں الگ الگ صرف اس وقت رہتے ہیں جبکہ ان کا مطالعہ منطق کی میز پر کیا جا رہا ہو۔ مگر علم کلام جب ایک داعی کی ذات میں شیر و شکر ہو جائے، اس وقت ایک ایسی چیز وجود میں آتی ہے جو دعوت بھی اتنا ہی ہوتی ہے جتنا علم کلام۔

ایک وضاحت

امام ابو حنیفہ پہلے متکلم تھے پھر انھوں نے اس کو چھوڑ کر فقہ کا میدان اختیار کیا۔ ابوالحسن اشعری نے ۴۰ سال کے اعتزال کے بعد بصرہ کے منبر پر کھڑے ہو کر اس سے براءت کا اعلان کیا۔ امام غزالی کا انتقال ہوا تو صحیح بخاری ان کے سینہ پر رکھی ہوئی تھی۔ امام جوینی کی زبان پر مرتے وقت یہ فقرہ تھا: "میں نیشاپور کی بڑھیوں کے عقیدہ پر مرتا ہوں"۔ اسی قسم کے اقوال علامہ آمدی، شہرستانی اور خسرو شاہی وغیرہ متکلمین سے بھی منقول ہیں۔ امام رازی نے اپنی کتاب اقسام اللذات میں لکھا ہے کہ "میں نے دیکھ لیا کہ کلام و فلسفہ سے نہ بیمار تندرست ہوتا ہے اور نہ پیاسا سیراب"۔ امام موصوف نے مرض الموت میں ۲ محرم ۶۰۶ ھ کو اپنا وصیت نامہ لکھوایا۔ اس کا ایک فقرہ یہ تھا:

ولقد اختبرت الطرق الكلامية والمناهج الفلسفية فما رأيت فائدة تساوي الفائدة التي وجدتها في القرآن العظيم	میں نے کلام اور فلسفہ کے طریقوں کو آزمایا مگر میں نے ان کا فائدہ اس فائدہ کے برابر نہیں پایا جس کو میں نے قرآن میں پایا۔

اس قسم کے "اعترافات" جو قدیم متکلمین کے یہاں ملتے ہیں، وہ متکلمین کی غلطی کو بتاتے ہیں نہ کہ خود علم کلام کی غلطی کو۔ علم کلام، دینی تعلیمات کو استدلال کی زبان میں پیش کرنے کا نام ہے۔ ہمارے قدیم متکلمین کے زمانہ میں جس فلسفہ و منطق کا رواج تھا، انھوں نے اسی کو عقلی استدلال کا معیار سمجھ لیا۔ چونکہ یہ فلسفہ و منطق خیالی موشگافیوں پر قائم تھا، اسلامی علم کلام بھی خیالی موشگافیوں کی وادی

میں بھٹک گیا اور کہا جانے لگا: من تمنطق تزندق (جو منطق میں مشغول ہوا وہ زندیق ہوگیا) حالانکہ عین اسی وقت عقلی استدلال کی ایک اور زیادہ محکم بنیاد موجود تھی۔ یہ وہ استدلال تھا جو آیات کائنات میں غور وفکر سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن نے اسی طرز استدلال کی تعلیم دی تھی۔ علم کلام کی بنیاد اگر آیات کائنات پر رکھی جاتی، تو علم کلام لوگوں کے لئے اضافۂ ایمان کا سبب بنتا، بجائے کہ ایک متکلم کو آخر وقت میں اس سے توبہ کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

تصوف اور علم کلام کی علیحدگی کی وجہ بھی یہی ہے کہ دونوں اپنے اصل سرے کو پانے میں ناکام رہے۔ تصوف جس روحانیت کو عملیاتی ورزشوں میں ڈھونڈ رہا ہے اس کا راز خلق اللہ میں غور وفکر میں چھپا ہوا ہے۔ اسی طرح علم کلام جن دلائل کو خیالی قیاس آرائیوں میں تلاش کر رہا ہے وہ زیادہ بہتر طور پر آسمان وزمین کی نشانیوں میں موجود ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں ذکر وفکر (آل عمران) علم کلام کی بنیاد بھی ہے اور تصوف کی بنیاد بھی۔ اگرچہ دونوں اپنی اس حقیقی بنیاد سے محروم ہوکر دو الگ الگ وادیوں میں بھٹک رہے ہیں۔

یہ بات علم کلام کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہے کہ کسی متکلم کا انتقال ہونے لگا تو اس نے اپنے سینے پر صحیح بخاری رکھ لی۔ یہ چیز علم کلام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ کسی بھی شرعی کام کے سلسلے میں پیش آسکتی ہے۔ یہ بالکل فطری بات ہے کہ جب آدمی کا آخر وقت آئے تو وہ ہر دوسری چیز کو چھوڑ کر براہ راست خدا سے لو لگانا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص جنگی حالات میں اسلامی علاقے کی سرحد پر پہرہ دے رہا ہے۔ اس اثنا میں اتفاق سے دشمن اس پر قابو پا لیتا ہے اور اس کا کام تمام کر دینا چاہتا ہے تو وہ فوراً سرحد کی رکھوالی کا کام چھوڑ کر دو رکعت نماز کی نیت باندھ لیتا ہے۔ حالانکہ اس قسم کے پہرے دار کو حدیث میں المرابط فی سبیل اللہ کہا گیا ہے اور اس کو نہایت افضل کام بتایا گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ شخص چاہتا ہے کہ موت کے فرشتے آئیں تو وہ ہتھیار بند نہ ہو بلکہ سجدے میں پڑا ہو۔ بعض متکلمین کے اس قسم کے واقعات کی نوعیت بس اتنی ہی ہے۔

ایک جان دار کی آنکھ نکال کر اس کو دوبارہ الٹ کر لگا دیا جائے تو وہ جان دار اب بھی دیکھے گا۔ مگر اس کو ہر چیز الٹی دکھائی دے گی ——————

جسم کے مختلف اعضا کو صحیح کام کرنے کے لئے کتنی نازک ترکیب درکار ہوتی ہے۔ اتنا پیچیدہ نظام اس قدر صحت کے ساتھ، کیا خود بخود چل رہا ہے ——————

لندن سے ایک انسائیکلوپیڈیا چھپی ہے جس کا نام ہے "قاموس جہالت"، اس میں ساٹھ مشہور سائنس‌داں مختلف علمی شعبوں کا جائزہ لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انسان کن چیزوں کے بارے میں ابھی تک لاعلم ہے۔ یہاں ان میں سے دس مختلف سائنس دانوں کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی شعبوں کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کے شعبہ کی واحد سب سے بڑی نامعلوم حقیقت کیا ہے۔

۱۔ کائنات اتنی یکساں کیوں

آئن رکسبرگ، پروفیسر تطبیقی ریاضیات، کوئن میری کالج، لندن: کائنات تعجب خیز حد تک یکساں ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزا میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کئے گئے ہیں، وہ تکلی اعداد پر مشتمل ہیں جیسے کسی الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے جو کہ تقریباً ۱۸۴۰ کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے تکلی طور پر انہیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے۔ کیا کائنات کے وجود کے لئے ان اعداد میں وہی متناسب قدر ضروری ہے جو ہم دیکھتے ہیں۔

۲۔ کیا کوئی زڈ ذرہ ہے

عبدالسلام، پروفیسر نظری طبیعیات، امپیریل کالج، لندن: اگلے دس برسوں میں ہمیں یا تو زڈ ذرہ کا وجود تسلیم کرنا ہے یا یہ ثابت کرنا ہے کہ اس کا کوئی وجود نہیں۔ اگر اس کا وجود ثابت ہو گیا جیسا کہ موجودہ نظریہ کی پیشین گوئی ہے، تو اس کے بعد عالم فطرت کی چار طاقتیں جن کا ہمیں علم ہے، ان میں سے دو طاقتوں کا ایک ہونا ثابت ہو جائے گا۔ (یہ چار طاقتیں یہ ہیں: کشش، برقی مقناطیسیت، طاقت ور نیوکلیر فورس جو کہ ایٹم کے نیوکلیس کو آپس میں باندھے رہتی ہے، اور کمزور نیوکلیر فورس جو ریڈیائی لہروں سے متعلق ہے) پروفیسر عبدالسلام اور دوسرے سائنس دانوں نے حال میں کمزور نیوکلیر فورس اور برقی مقناطیسیت کو ایک ثابت کرنے میں کچھ کامیابی حاصل کی ہے۔ زڈ ذرہ کی دریافت سے قوی تجرباتی تائید حاصل ہوگی۔

۳۔ ڈی این اے سے پہلے کیا تھا

ڈاکٹر گراہم کیرنس اسمتھ، لکچرر کیمسٹری، گلاسگو

RESEARCH

The top ten secrets of science

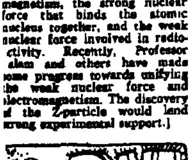
IN THE *Encyclopaedia of Ignorance**, published next Thursday, some 60 well-known scientists survey different fields of research, trying to point out significant gaps in our knowledge of the world. They write at very different levels, at very different lengths. However, last week we contacted some of the authors dealing with major branches of science and asked them to name a single unsolved problem which they personally found especially important or interesting. They give their choices below, together with those of two—Professor John Maynard Smith and Dr Francis Crick—who could not be contacted and which have been taken directly from the book.

1: Why is the universe so uniform?

Ian Roxburgh, Professor of Applied Mathematics, Queen Mary College, London: "The universe is astonishingly uniform. No matter which way we look, the universe has the same constituents in the same proportions. The laws of physics discovered on earth contain arbitrary numbers, like the ratio of the mass of an electron to the mass of a proton, which is roughly 1840 to one. But these turn out to be the same in all places at all times. Why? Did a creator arbitrarily choose these numbers? Or must these numbers have the particular uniform value we observe for the Universe to exist?"

2: Is there a Z-particle?

Abdus Salam, Professor of Theoretical Physics, Imperial College, London. "In the next decade we need to confirm or disprove the existence of the so-called Z-particle. If it does turn out to exist as predicted by current theory it will clinch the unification of two of the four forces we know in nature. [The four forces are gravity, electromagnetism, the strong nuclear force that binds the atomic nucleus together, and the weak nuclear force involved in radioactivity. Recently, Professor Salam and others have made some progress towards unifying the weak nuclear force and electromagnetism. The discovery of the Z-particle would lend strong experimental support.]



3: What preceded DNA?

Dr Graham Cairns-Smith, lecturer in chemistry, University of Glasgow. "We need to discover a new genetic material as different as you like from DNA. [The double helix structure of DNA was discovered by Francis Crick and James Watson in Cambridge in 1953.] I do not believe that DNA could have been made on the primitive earth. Life must have started with something else and DNA evolved later."

4: How are genes switched on and off?

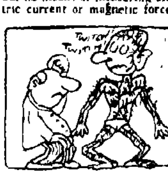
Sir John Kendrew, Chairman of the European Molecular Biology Organisation, Heidelberg. "We know something about how genes are switched on and off in bacteria, but next to nothing about how it is done in higher animals." [It is by switching genes on and off that the cells of a single organism, which all contain the *same* set of genes, are able to do such different jobs, and become constituents of nerves, skin, etc.]

5: Why do we have an immune system?

The body's immune system defends us against infection, is responsible for allergies, and makes organ transplant so difficult. But according to *Dr H S Micklem of the University of Edinburgh,* "The most interesting question is not how the immune system works, but why it is there at all. Invertebrates seem to get along quite well without one, but it is incredibly complicated in vertebrates. The idea that it was needed to detect small changes in the cell surface which might lead to cancer has been popular in the last ten years but there is a lot of data to suggest it is not good enough."

6: How can we measure evolution?

John Maynard Smith, Professor of Biology, University of Sussex, thinks that the theory of evolution has a built-in problem. "The essential components of the theory of evolution are mutation (a change in a gene), selection (differential survival or fertility of different types) and migration. The theory tells us that each of these processes, at a level far too low to be measurable in most situations, can profoundly affect evolution. Thus we have three processes which we believe to determine the course of evolution, and we have a mathematical theory which tells us that these processes can produce their effects at levels we cannot usually hope to measure directly. It is as if we had a theory of electromagnetism but no means of measuring electric current or magnetic force."



7: How is the nervous system built?

Francis Crick, Salk Institute, California. "Perhaps the most challenging problem in the whole of developmental biology is the construction of the nervous system of an animal. Many years ago it was shown by Roger Sperry that if a newt's eye was removed, so that the optic nerve from its eye to its brain was broken, then even if the eye was replaced upside down, the optic nerve would regenerate from the retina, grow towards the brain and connect up again. After a period the animal could see again with this eye but it always saw upside down. In other words, the new connection had been made 'correctly' except that the eye did not know it had been inverted. The results show that fairly precise processes are at work to make the correct, rather intricate, connections needed between one set of nerves and another but exactly what these mechanisms are we do not yet know."

[In other words, the very fact that it *was* upside down shows how specific the links are.]

8: Does the quantum theory apply to gravity?

Sir Hermann Bondi, Chief Scientist, Department of Energy. "If we follow Einstein's widely accepted theory of gravity then any rapid change in the source of a gravitational field—two stars orbiting round each other, for example — should radiate gravitational waves at the speed of light. All other forms of radiation are 'quantised,' that is to say they are not continuous but come in discrete but minute packets. It is hardly conceivable that gravitational waves are not quantised too, but nobody has yet succeeded in establishing the equations, though many have tried."

9: How do different parts of the brain link up?

Professor Horace Barlow, Cambridge. "We are almost totally ignorant about how different parts of the brain communicate with one another. For example, what goes on between the parts of the brain concerned with hearing and the rest when we recognise a familiar voice? You can draw an analogy with speech. It is carried by sound waves but it is far more meaningful than the babbling of a baby which is carried by sound waves, too. In the brain nervous impulses are the equivalent of soundwaves, but we have no idea of how they become meaningful."

10: How old is man?

Dr Donald C Johnson, Museum of Natural History, Cleveland, Ohio. "Fossil discoveries in Europe, Africa and Asia are pushing human origins further back in time. However, it is becoming increasingly clear that the scenario of human evolution is much more complex. The problem time is three to four million years ago. There appears to have been a great diversity of possible human ancestors and we don't know how they were related."

[This is due partly to Dr Johanson's discoveries in Ethiopia and others, of even older fossils, made in Pakistan.]

---

* "*Encyclopaedia of Ignorance*," published by Pergamon, £10 hardback or in two paper-cover volumes, £3.50 each.

یونیورسٹی: ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک نیا جینیٹک مادہ دریافت کریں جو ڈی این اے سے بالکل مختلف ہو۔ (ڈی این اے کا دوہرا مرغولہ نما ڈھانچہ کیمبرج میں ۱۹۵۳ میں فرانسس کریک اور جیمس واٹسن نے دریافت کیا تھا) مجھے یقین نہیں کہ ڈی این اے ابتدائی زمین پر بن سکتا تھا ضروری ہے کہ زندگی کسی اور چیز سے شروع ہوئی ہو اور ڈی این اے کا ارتقا بعد کو ہوا ہو۔

۴۔ جین کس طرح متحرک اور غیر متحرک ہوتے ہیں

سر جان کینڈریو، جیرمین یوروپین مالے کیولر بیالوجی آرگنائزیشن، ہائڈلبرگ: جین کس طرح بیکٹیریا میں متحرک اور غیر متحرک ہوتے ہیں، ان کی بابت ہم کسی قدر جانتے ہیں۔ مگر اعلیٰ حیوانات میں یہ واقعہ کیونکر ہوتا ہے، اس کی بابت ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ (جین کے متحرک اور غیر متحرک ہونے ہی کی وجہ سے ایسا ہے کہ ایک جسم کے سل، جو سب کے سب ایک قسم کے جین پر مشتمل ہوتے ہیں، وہ مختلف قسم کے عمل کر پاتے ہیں اور نسوں، جلد، وغیرہ کے اجزائے ترکیبی بن جاتے ہیں)

۵۔ ہمارے اندر محفوظ نظام کیوں

جسم کا مانعی نظام ہم کو چھوت سے بچاتا ہے۔ یہی ہمارے اندر الرجی کا سبب ہے، اور اعضاء کی پیوند کاری کو اس قدر مشکل بنا دیتا ہے۔ مگر اڈنبرا یونیورسٹی کے ڈاکٹر میکلم کے نزدیک "سب سے زیادہ دلچسپ سوال یہ نہیں ہے کہ یہ مانعی نظام کیسے کام کرتا ہے، بلکہ یہ کہ خود اس کا وجود ہی کیوں ہے۔ بے ریڑھ کے جانور اس کے بغیر بھی اچھی طرح گزر کر لیتے ہیں۔ مگر ریڑھ دار حیوانات میں یہ نظام ناقابل یقین حد تک پیچیدگی کے ساتھ شامل ہے۔ پچھلے دس سالوں سے اس خیال کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے کہ اس نظام کی ضرورت اس لئے تھی کہ خلیہ کی سطح میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں جو سرطان کا سبب بن سکتی ہیں، ان کا پتہ لگایا جا سکے، مگر بہت سی حالیہ دریافتیں اس کی تائید کرتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔

۶۔ ارتقاء کی پیمائش ہم کیسے کریں

جان مینرڈ اسمتھ، پروفیسر حیاتیات سسیکس یونیورسٹی کا خیال ہے کہ ارتقاء کا نظریہ ایک ناقابل حل اندرونی مسئلہ سے دوچار ہے۔ "نظریہ ارتقاء کے تین حقیقی اجزاء ہیں:

تغیر (جین میں تبدیلی کا واقع ہونا)
انتخاب (فرق کا باقی رہنا یا مختلف اقسام کی زرخیزی)
نقل مکانی

یہ نظریہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک، اکثر حالات میں ناقابل پیمائش حد تک نچلی سطح پر، ارتقاء کے عمل پر گہرے اثرات ڈال سکتا ہے۔ اس طرح ہم تین طریقوں سے واقف ہیں جن کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ وہ ارتقاء کے عمل کا تعین کرتے ہیں۔ پھر ہمارے پاس ایک ریاضیاتی نظریہ ہے جو ہم کو بتاتا ہے کہ یہ تینوں طریقے ایسی سطحوں پر اپنا اثر ڈالتے ہیں جن کی بالواسطہ پیمائش کی ہم امید نہیں رکھتے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارے پاس برقی مقناطیسیت کا ایک نظریہ تو ہو مگر ہمارے پاس نہ تو برقی لہروں کو ناپنے کا کوئی ذریعہ ہو اور نہ مقناطیسی زور کو ناپنے کا۔

۷۔ نظام عصبی کس طرح بنتا ہے

فرانسس کریک، سالک انسٹی ٹیوٹ، کیلی فورنیا: حیاتیاتی ترقیات میں شاید سب سے بڑا علمی چیلنج یہ سوال ہے کہ ایک جاندار میں عصبی نظام کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ بہت سال پہلے راجر اسپری نے تجربہ کر کے دکھایا تھا کہ اگر ایک دریائی چھپکلی کی آنکھ اس طرح نکالی جائے کہ اس کی نظر کی نس آنکھ سے دماغ تک ٹوٹ جائے۔ اس کے بعد اگر اس کی آنکھ کو دوبارہ الٹ کر بھی لگا دیا جائے تو نظر کی نس آنکھ کے پردہ سے دوبارہ شروع ہو کر دماغ کی طرف بڑھے گی اور دوبارہ اس سے جڑ جائے گی۔ کچھ عرصہ کے بعد جانور اس آنکھ سے دوبارہ دیکھ سکتا تھا مگر ہمیشہ الٹی شکل میں (کیونکہ آنکھ الٹی لگی ہوئی تھی) دوسرے لفظوں میں یہ کہ نیا تعلق بالکل درست تھا۔ بجز اس کے کہ آنکھ کو یہ پتہ نہ تھا کہ وہ الٹی لگی ہوئی ہے۔ یہ نتائج بتا رہے ہیں کہ اعصاب کے ایک نظام کو اعصاب کے دوسرے نظام سے ٹھیک ٹھیک مربوط کرنے کے لئے بہت ہی درست اور پیچیدہ طریقے کارفرما ہوتے ہیں۔ مگر یہ طریق عمل کیا ہے، اس کو ہم متعین طور پر نہیں جانتے۔ (دوسرے لفظوں میں خود یہ واقعہ کہ آنکھ الٹی لگی تھی، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ رابطے کس قدر متعین ہوتے ہیں)

۸۔ کوانٹم نظریہ کیا کشش کے نظریہ پر بھی چسپاں ہوتا ہے

سر ہرمن بونڈی، چیف سائنٹسٹ، شعبہ انرجی: اگر ہم آئن سٹائن کے مقبول عام نظریہ کشش کو مانیں تو کسی مقناطیسی میدان کے مرکز میں یکایک تبدیلی (مثلاً دو ستاروں میں جو ایک دوسرے کے گرد گھوم رہے ہوں) سے ایسا ہونا چاہئے کہ کشش کی لہریں روشنی کی سی رفتار سے پیدا ہوں۔ ریڈی ایشن کی دوسری تمام صورتیں "کوانٹم" کے مطابق ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلسل نہیں ہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی مقداروں کی شکل میں غیر مسلسل طور پر آتی ہیں۔ یہ بات مشکل قابل فہم ہے کہ کشش کی لہریں مقداروں کی شکل میں نہیں ہوتیں۔ مگر ابھی تک کوئی اس بات کو ثابت نہیں کر سکا ہے، حالانکہ بہت سے لوگ اس کی کوشش کر چکے ہیں۔

۹۔ دماغ کے مختلف حصے کس طرح رابطہ قائم کرتے ہیں

پروفیسر ہورس بارلو، کیمبرج: ہم تقریباً مکمل طور پر اس بات سے بے خبر ہیں کہ دماغ کے مختلف حصے کیوں کر ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس وقت دماغ کے سننے والے حصہ میں اور بقیہ حصوں میں کس قسم کا ارتباط قائم ہوتا ہے جب کہ ہم کسی مانوس آواز کو پہچانتے ہیں۔ تم بول کو مثال میں پیش کر سکتے ہو۔ وہ صوتی لہروں پر چلتی ہے۔ مگر وہ ایک بچہ کی توتلاہٹ سے کہیں زیادہ بامعنی ہوتی ہے جو خود بھی صوتی لہروں پر چلتی ہے۔ دماغ کے اندر عصبی حرکات صوتی لہروں کے مساوی ہوتی ہیں۔ مگر ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ کس طرح بامعنی ہو جاتی ہیں۔

۱۰۔ انسان کب سے زمین پر ہے

ڈاکٹر ڈونالڈ جانسن، میوزیم آف نیچرل ہسٹری، کلیولینڈ، اوہائیو: یورپ، افریقہ اور ایشیا میں جو متحجرات (فوسل) برآمد ہوئے ہیں، وہ انسان کی ابتدا کو اور زیادہ پیچھے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ بہر حال یہ بات دن بدن نمایاں ہوتی جا رہی ہے کہ ارتقاء کا معاملہ (سابقہ تصور کے خلاف)

کہیں زیادہ پیچیدہ ہے، وہ مدت جس کا تعین ایک مسئلہ ہے، وہ تین ملین سے لے کر دس ملین سال پیچھے تک ہے۔ انسان کے امکانی آباؤ اجداد میں بظاہر بہت زیادہ فرق رہا ہے۔ اور ہم کو نہیں معلوم کہ ان کے درمیان باہمی رشتہ کیا تھا۔ (اس کی وجہ جزوی طور پر ڈاکٹر جانسن کی حبشہ میں دریافتیں ہیں۔ نیز اس سے بھی زیادہ قدیم فاسل پاکستان میں ملے ہیں)

علم کا دریا

حیرت انگیز طور پر

اقرار خدا کی طرف جارہا ہے

طبیعی تحقیقات سے مابعد الطبیعی حقائق برآمد ہو رہے ہیں

موجودہ زمانہ میں ہونے والی طبیعی تحقیقات حیرت انگیز طور پر انسان کو "مافوق الطبیعی" منزل پر پہنچا رہی ہیں۔ ہر علمی شعبہ میں یہ صورت حال پیش آرہی ہے کہ محققین اپنی تلاش وجستجو میں جب آگے بڑھتے ہیں تو بالآخر وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبیعی قانون کی حد ختم ہوگئی اور مافوق الطبیعی قوتوں کی کارفرمائی شروع ہوگئی ——— ۱۹۸۰ میں لندن سے شائع ہونے والی قاموس جہالت (THE ENCYCLOPAEDIA OF IGNORANCE) دراصل اسی صورت حال کا ایک علمی اعتراف ہے۔

کائنات کے ابتدائی منجمد مادہ میں انفجار سے موجودہ دنیا کا وجود میں آنا ۲۰ سال پہلے تک ایک سادہ طبیعی واقعہ نظر آتا تھا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ وہ عام معنوں میں کوئی طبیعی یا مادی واقعہ نہ تھا بلکہ ایک بے حد منظم واقعہ تھا جو اخراج طاقت (ENERGY RELEASE) کے ذریعہ وجود میں آیا۔ عالم مادی کے ترکیبی اجزا کی تصویر پہلے ایک بے ترتیب ڈھیر کی مانند تھی۔ اب محققین بتا رہے ہیں کہ کائنات ایک بے حد یکساں (UNIFORM) واقعہ ہے۔ الکٹران کے مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے ۱۸۴۰ کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر زمانہ میں باقی رہتا ہے۔ گویا کسی خارجی طاقت نے تحکمی طور پر (ARBITRARILY) کائنات کو ریاضیاتی یکسانیت کا پابند کر رکھا ہے۔ زمینی حالات میں ارتقائی طور پر زندگی کے وجود میں آنے کے تمام مفروضات بے دلیل ثابت ہو رہے ہیں اور اب علمائے حیاتیات کا رجحان یہ ہوتا جارہا ہے کہ زندگی "اوپر سے" زمین پر بھیجی گئی ہے۔ عالم فطرت کو کنٹرول کرنے والی طاقتیں "کئی سے گھٹ کر" ایک "ہوتی جارہی ہے اس وحدت کے لئے کوئی مناسب سائنسی لفظ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی اس کو زڈ ذرہ (Z-PARTICLE) اور کوئی جادوئی ذرہ (CHARMED PARTICLE) کہتا ہے۔ وغیرہ

ایک سفر

۱۹ فروری کو شیوگنج (ضلع سروہی) پہنچا اور ۲۲ فروری ۱۹۷۸ کو دہلی کے لئے واپسی ہوئی ۔

شیوگنج، دہلی سے چھ سو کلومیٹر کے فاصلہ پر راجستھان کا ایک قصبہ ہے ۔ یہ گرینڈ ٹرنک روڈ کے کنارے واقع ہے ۔ یہاں کی آبادی بارہ ہزار ہے جس میں مسلمان تقریباً ایک ہزار ہیں ۔ پہلے یہ ریاست سروہی کا ایک حصہ تھا جو سو سال سے کچھ عرصہ پہلے آباد کیا گیا ۔ آزادی ہند کے وقت سروہی ریاست کے راجہ سر سروپ رام سنگھ دیوڑا تھے جو یہاں عام طور پر " دربار صاحب " کہے جاتے تھے ۔ وہ اسلام سے متاثر ہوئے ۔ کئی سال تک اسلام کا مطالعہ کرتے رہے ۔ ۱۹۴۶ میں انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان کر دیا ۔ اعلان اسلام کے بعد وہ زیادہ تر دہلی میں رہنے لگے تھے ۔ ان کا انتقال ۱۹۴۷ میں دہلی میں ہوا ۔ ان کی قبر اب بھی دہلی میں موجود ہے ۔ ان کا اسلامی نام سر سلطان عبداللہ دیوڑا تھا ۔ راجہ صاحب کے اسلام کے بعد یہاں اور بھی بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے ۔

راجہ صاحب کے کوئی اولاد نہیں تھی ۔ انھوں نے غالباً تین بڑی بڑی جائدادیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام وقف کیں ۔ ریاستوں کے خاتمہ کے بعد جو حالات پیدا ہوئے، ان کی وجہ سے یہ جائدادیں یونیورسٹی کے قبضہ میں نہ آسکیں ۔ تاہم، جیسا کہ مجھے بتایا گیا، ملا طاہر سیف الدین نے اپنی چانسلری کے زمانہ میں موہن لال سکھاڑیا (سابق وزیراعلیٰ راجستھان) پر زور ڈال کر ماؤنٹ آبو اور آبو روڈ کی دو کوٹھیوں کی جزوی قیمت یونیورسٹی کو دلائی جو تین لاکھ روپئے تھی ۔ مسٹر سکھاڑیا کا حلقہ انتخاب اودے پور تھا ۔ یہاں ملا طاہر سیف الدین کے ماننے والے کافی تعداد میں ہیں ۔ اس لئے یہاں وہ اپنی ایک انتخابی قیمت رکھتے ہیں ۔

مندرجہ بالا تین لاکھ کی رقم سے مسلم یونیورسٹی میں سروہی ٹرسٹ قائم ہوا جو ابھی تک چل رہا ہے مسلم یونیورسٹی کے پراسپکٹس (۷۶ ـ ۱۹۷۵) میں اس کے متعلق حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہیں :

> SIROHI TRUST: The trust awards a limited number of stipends to deserving Muslim students, preferably from Rajasthan, who are in need of financial assistance. (p.69)

سروہی ٹرسٹ کے تحت محدود تعداد میں وظائف دیئے جاتے ہیں ۔ یہ وظائف ترجیحاً راجستھان کے مستحق مسلم طالب علموں کے لئے ہیں جو مالی امداد کے ضرورت مند ہوں ۔

یہاں چند مسجدیں ہیں ۔ میں نے ایک مسجد دیکھی جو سو سال پہلے تعمیر کی گئی تھی ۔ اس مسجد سے متصل کافی زمین ہے جن پر کچھ تعمیرات کرائی گئی ہیں ۔ تاہم اب بھی اتنی کافی زمین ہے کہ اگر اس کو استعمال کیا جائے تو یہاں ایک اچھا مدرسہ قائم کیا جا سکتا ہے جس کی یہاں سخت ضرورت ہے ۔ اس وقت بھی ابتدائی تعلیم کا ایک مکتب چل رہا ہے ۔

شیوگنج بعض تجارتی سامانوں کے لئے راجستھان کی سب سے بڑی منڈی کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ۲۰ فروری کو یہاں راشٹرپتی نیلم سنجیوا ریڈی آئے تھے انھوں نے آبادی کے باہر ایک اسپتال کا سنگ بنیاد رکھا ۔ دو سو ایکڑ زمین پر یہ جدید ترین طرز کا اسپتال جسلوک (بمبئی) کے معیار کا اسپتال ہوگا ۔ اس پر دو کروڑ روپے کے خرچ کا منصوبہ ہے ۔ یہ اسپتال حکومت ہند کے علاوہ عالمی ادارۂ صحت (WHO) کے تعاون سے تعمیر کیا جا رہا ہے ۔

شیوگنج کا ریلوے اسٹیشن جوائی بندھ ہے ۔ جوائی

ایک ندی ہے اس پر ۳۰۴ مربع میل کا بندھ بنایا گیا ہے۔ تین کروڑ کی لاگت سے بننے والے اس بندھ کا افتتاح ۱۹۵۳ میں ہوا تھا۔ یہ مقام اس علاقہ کے لئے ایک عمدہ تفریح گاہ ہے۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے ۲۱ فروری کو چند گھنٹے یہاں گزارے۔ یہاں فطرت کا پرسکون ماحول ہے۔ درخت، چڑیاں، پہاڑ، جھیل، کھلا آسمان، اس قسم کی چیزوں کے درمیان جب انسان ہوتا ہے تو گویا کہ وہ اپنے خدا کے قریب ہوتا ہے۔ شہروں کی مصنوعی چمک دمک آدمی کو "مشینی تہذیب" کی یاد دلاتی ہے، جب کہ مناظر قدرت آدمی کو خدائی کرشموں (آلاء اللہ) کی یاد دلاتے ہیں۔ ذاتی طور پر راقم الحروف کو فطرت کی خاموش دنیا سے بے حد دلچسپی ہے۔ مگر زندگی کی ذمہ داریاں دوبارہ شہری ہنگاموں کی طرف کھینچ لاتی ہیں۔
شیوگنج کے مسلمانوں کی دعوت پر میں یہاں آیا۔

۲۰ فروری ۱۹۷۸ء (۱۲ ربیع الاول) کو سیرت کے عنوان پر میری دو تقریریں ہوئیں۔ ایک دن میں اور دوسری رات میں۔ اجتماع میں مسلمانوں کے علاوہ کچھ غیر مسلم بھی شریک ہوئے۔ میں نے اپنی تقریروں میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ "۱۲ ربیع الاول" عام معنوں میں کوئی جشن اور عید کا دن نہیں ہے جس کے تقاضے رسمی تقریبات سے پورے ہو جاتے ہوں۔ اس کی معنویت یا دینی قدر و قیمت اسی وقت ہے جب کہ اس کو تجدید عہد کے دن کے طور پر منایا جائے۔ ایمان لا کر ہم نے اللہ اور رسول سے جو عہد کیا ہے، آج ہم اس کو پورا کرنے کا ازسرنو عزم کریں۔ پھر میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کے اصحاب کے واقعات سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کا مطلب کیا ہے اور اللہ کے یہاں مومن و مسلم کی حیثیت سے اٹھائے جانے کے لئے ہمیں کیسی زندگی بنانی چاہئے۔

प्रस्तावित अस्पताल की विशेषताएँ

(१) आधुनिकतम चिकित्सा यन्त्र, सही रोग निदान एवं अनुभवी डॉक्टरों की सुविधा
(२) कुल ५०० में से लगभग २०० शय्याएँ नि:शुल्क,
(३) ट्रस्ट द्वारा संचालन। दानदाताओं को व्यवस्था में प्रतिनिधित्व, कक्ष/भवन पर नाम, एवं शय्याओं के आरक्षण की सुविधा। आयकर से मुक्ति



(४) कुल लागत करीब दो करोड़ रुपये (अभी तक प्राप्त आश्वासन करीब ६० लाख रुपये)
(५) मेडिकल डाइरेक्टर-डा. डी. बी. ओझा, भूतपूर्व डाइरेक्टर, मेडिकल एण्ड हेल्थ सर्विसेज, राजस्थान
चीफ इंजीनियर- श्री भीमराज शाह, भूतपूर्व चीफ इंजीनियर, राजस्थान
आर्किटेक्ट- श्री उत्तम सी. जैन, बम्बई

سرسری مطالعہ سے جو رائے قائم کی جاتی ہے وہ تحقیق کے بعد اکثر غلط ثابت ہوتی ہے

معاویہ بن ابی سفیان (۶۰۵ - ۶۸۰) ایک نمایاں صحابی تھے۔ ان کے بارہ میں ایک صاحب لکھتے ہیں:

"دیت کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہ نے سنت کو بدل دیا۔ سنت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی۔ مگر حضرت معاویہ نے اس کو نصف کر دیا، اور باقی خود لینی شروع کر دی"

معاہد کی دیت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف اقوال مروی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہے۔ (دیۃ ذمی دیۃ مسلم، السنن الکبریٰ للبیہقی، جلد ۸، صفحہ ۱۰۲) دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہوگی (عقل الکافر نصف دیۃ المسلم، نیل الاوطار جلد ۷، صفحہ ۶۴) اس بنا پر عہد صحابہ سے یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہونی چاہئے، اور کچھ لوگ مسلمان اور معاہد کی دیت میں فرق نہیں کرتے۔ حضرت معاویہ نے دراصل دو رایوں میں سے ایک رائے کو ترجیح دی ہے نہ کہ خود کوئی نئی رائے پیدا کی ہے۔

"باقی خود لینی شروع کر دی" کے الزام کی حقیقت یہ ہے کہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں امام زہری کا مقولہ ان لفظوں میں نقل کیا ہے: معاویہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے معاہد کی دیت کو کم کر کے نصف کر دیا اور نصف اپنے واسطے لے لی (واخذ النصف لنفسہ)

یہ عبارت سرسری نظر میں مغالطہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کی وجہ اس کا اجمال ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے معاملہ کو تفصیلی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان کا بیان اس کو واضح کر دیتا ہے کہ یہاں اپنی ذات سے مراد حکومتی خزانہ ہے۔ بیہقی نے اپنی سنن میں امام زہری کا مقولہ ابن جریج کی سند سے تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ وہاں الفاظ یہ ہیں:

فلما کان معاویۃ اعطی اهل المقتول النصف والقی النصف فی بیت المال جب معاویہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے آدھی دیت مقتول کے رشتہ داروں کو دی اور آدھی بیت المال میں داخل کر دی۔

آج لوگوں کے لئے سب سے آسان کام بولنا ہے اور سب سے مشکل کام چپ رہنا۔ مگر بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب کہ بولنا اتنا سنگین کام معلوم ہوگا کہ لوگ سوچیں گے کاش وہ ساری عمر چپ رہتے، کاش انھوں نے اپنے ہونٹوں کو سی لیا ہوتا ——

سوال وجواب

الرسالہ ماہ فروری ۱۹۷۸ میں ایک مضمون بعنوان "شہادت حسین" شائع ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں کشمیر سے ایک دوست تحریر فرماتے ہیں:

"سیاسی حریف بنا کوئی بری بات نہیں (اگر اس کا مقصد حصول رضائے الٰہی ہو) امام حسنؓ ایک باغی کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوتے ہیں۔ اور آپ اسے صحیح قرار دے کر تعریف کرتے ہیں۔ اس کا صاف مطلب تو یہ ہے کہ باہمت باغی چھا جاتے رہیں گے۔ اور من مانے طریقوں سے اپنی مرادیں بر لاتے رہیں گے۔ کیا یہ ایک منفی رجحان نہیں ہے۔ ایک جائز طور پر بیعت شدہ خلیفہ کی دست برداری —— مقابل کی طاقت سے دب کر۔ سراسر اسلامی روح کے خلاف ہے۔"

مذکورہ مضمون کے سلسلے میں یہ بات مختلف لوگوں کی طرف سے مختلف الفاظ میں آتی رہی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ امام حسن کے کردار کو نمایاں کر کے ہم لوگوں کے اندر سے جہاد کی اسپرٹ ختم کر رہے ہیں اور ان کو بزدل بنانا چاہتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ "جہاد" یا "بزدلی" ہماری خودساختہ چیزوں کے نام ہیں یا جہاد وہ ہے جو قرآن و حدیث کے مطابق جہاد ہو۔ اور بزدلی وہ ہے جو قرآن و حدیث سے بزدلی ثابت ہو۔

مذکورہ مضمون میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ تمام تر قرآن اور حدیث اور تعامل صحابہ کی روشنی میں کہا گیا ہے۔ کوئی چیز بھی محض بیانیہ انداز سے بطور خود نہیں کہہ دی گئی ہے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ہمارے کسی بھائی نے اب تک قرآن اور حدیث اور سیرت کے ان حوالوں کی بات کچھ نہیں کہا۔ البتہ جہاد اور بزدلی کی خودساختہ اصطلاحوں میں وہ ہمارے اوپر ریمارک دینے میں مشغول ہیں۔ اگر کسی کو اختلاف ہو تو اس کو یہ ثابت کرنا چاہئے کہ مذکورہ مضمون میں جو حوالے دیئے گئے ہیں۔ وہ غلط ہیں۔ یا ان سے وہ بات نہیں نکلتی جو مضمون نگار نے ان سے نکالنے کی کوشش کی ہے اور یہ ساری بحث علمی انداز میں ہونی چاہئے نہ کہ محض لفظی ریمارک کی صورت میں۔

حق وہ نہیں ہے جو ہمارے اپنے ذہنی سانچہ میں حق نظر آئے۔ حق وہ ہے جو قرآن و حدیث سے حق ثابت ہو۔

◆◆◆

انسان سے کم، اللہ سے زیادہ

قال ثور بن یزید - قرأتُ في بعض الكتب ان عيسى عليه السلام قال: يا معشر الحواريين كلّموا الله عزوجل كثيرا وكلّموا الناس قليلا - قالوا: كيف نكلّم الله كثيرا - قال: اخلوا بمناجاته، اخلوا بدعائه (خرجه ابونعيم)

ثور بن یزید کہتے ہیں۔ میں نے بعض کتابوں میں پڑھا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریین سے کہا۔ اے لوگو! اللہ سے زیادہ باتیں کرو اور انسانوں سے کم باتیں کرو۔ انھوں نے پوچھا۔ کس طرح ہم اللہ سے زیادہ باتیں کریں۔ حضرت عیسیٰ نے کہا: —— تنہائیوں میں اللہ سے سرگوشیاں کرو، تنہائیوں میں اللہ سے دعا مانگو۔

Single Copy Rs 2.00

Regd. No. D (D) 532
Regd R.N. No. 28822/76
APRIL 1978

Al-Risala Monthly

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI-110006 (INDIA)

کتاب سبز   از معمر القذافی

جمہوریہ لیبیا کے صدر معمر القذافی ایک انقلابی مفکر اور عہد ساز شخصیت ہیں۔ انھوں نے اپنے خیالات کو "الکتاب الاخضر" میں واضح کیا ہے۔ اس کتاب کے پہلے جزء کا اردو ترجمہ شائع ہوگیا ہے۔ یہ جزء معمر القذافی کے تشکیل کردہ "تیسرے عالمی نظریہ" کے سیاسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔

اردو ترجمہ کے ساتھ اصل عربی متن بھی شامل ہے جس سے کتاب کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ کتاب عمدہ کاغذ پر آفسیٹ سے دو رنگوں میں شائع ہوئی ہے۔

الدار العلمیہ

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

الرسالہ

شمارہ ۱۸ مئی ۱۹۷۸

جمعیۃ بلڈنگ • قاسم جان اسٹریٹ • دہلی ٦

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عن الزبیر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: دب الیکم داء الامم قبلکم الحسد والبغضاء

ابن عبد البر، جامع بیان العلم وفضلہ
جزء ثانی، صفحہ ۱۵۰

تمہاری طرف رینگ کر آگئی پچھلی امتوں کی بیماری ــــ حسد اور بغض۔

فہرست

اداریہ

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو عالم بھی ہیں۔ انھوں نے کہا: الرسالہ کی آواز انبیاء والی آواز ہے۔ اس کے سوا ہمارے لئے نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر میدان عمل میں نکل پڑیں۔ خواہ اس کے نتیجہ میں دنیا بالکل برباد ہو جائے۔

ایک اور صاحب جو الرسالہ کو شروع سے پڑھ رہے ہیں، اپنے خط میں لکھتے ہیں: "میں نے طے کیا ہے کہ اپنے کھیتوں میں زیادہ توجہ دوں اور اللہ سے دعا کروں کہ وہ میری مختصر زمین میں اتنی برکت دے کہ الرسالہ کی دعوتی مہم کے سلسلے میں اپنی آرزوؤں کو پورا کر سکوں۔ دوسری بات میں نے یہ طے کی ہے کہ اپنے یہاں پانچ پرچوں سے الرسالہ کی ایجنسی شروع کروں۔"

ہمارے نزدیک دوسری بات ہی اسلامی بات ہے۔ پہلی بات صرف ایک قسم کا وسوسہ ہے شیطان مختلف طریقوں سے آدمی کو بہکاتا ہے۔ اس میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے۔

اسلام کے لئے آج ہم کو جو کچھ کرنا ہے، وہ صرف دو چیزیں ہیں۔ یہ سمجھ کر زندگی گزارنا کہ کل ہم اللہ کے سامنے پیش ہونے والے ہیں۔ دوسرے اپنے بھائیوں میں صالح خیالات کی اشاعت۔ یہ دونوں کام ہر شخص کے لئے ممکن ہیں۔ اور ممکن دائرہ سے آغاز ہی کا نام کام ہے۔ غیر ممکن دائرہ سے آغاز کا منصوبہ بنانا خندق میں چھلانگ لگانا ہے۔ اور خدا نے کسی کو اس کا مکلف نہیں کیا ہے۔

تبدیلیوں کی حقیقت

بمبئی کو دروازۂ ہند (گیٹ وے آف انڈیا) کہا جاتا ہے۔ اس کی علامت کے طور پر وہاں سمندر کے کنارے اس نام کا ایک گیٹ بھی بنایا گیا ہے۔ یہ اس زمانہ کی یادگار ہے جب کہ سمندر کے راستہ سے ہندستان آنے والے لوگ بمبئی کی بندرگاہ پر اتر کر ہندستان میں داخل ہوتے تھے۔ مگر اب سفری حالات بدل چکے ہیں۔ اب ہندستان کا دروازہ بمبئی کا بندرگاہ نہیں بلکہ دہلی کا بین اقوامی ہوائی اڈہ ہے۔ اب بندرگاہوں کے بجائے ہوائی اڈوں کے ذریعہ ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک میں داخل ہوتے ہیں۔ تاہم یہ فرق طریق داخلہ کا فرق ہے نہ کہ اصول داخلہ کا۔ اس سے نفس داخلۂ ہند کے قوانین پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے ان تبدیلیوں کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے جس کے حوالہ سے مذہب میں تبدیلی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ دنیا میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ یہ تبدیلیاں مذہب اور سماج کے درمیان پھر سے مطابقت کا تقاضا کرتی ہیں۔ مگر یہ صرف موجودہ حالات پر مذہب کے اصولوں کے از سر نو انطباق کا سوال ہے نہ کہ خود مذہب کو بدل کر نیا مذہب بنانے کا — قدیم زمانہ میں جانور سواری کا کام دیتے تھے۔ اب سفر کے لئے مشینی سواریاں استعمال ہوتی ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک مسافر جس مقام پر پہنچنے کے لئے پہلے پورب کی طرف جاتا تھا، اب وہ اسی کے لئے پچھم کی طرف دوڑنے لگے گا۔

"میرے لئے ایک سائیکل خرید دیجئے" بیٹے نے باپ سے کہا۔ باپ کی آمدنی کم تھی۔ وہ سائیکل خریدنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اس نے ٹال دیا۔ لڑکا بار بار کہتا رہا اور باپ بار بار منع کرتا رہا۔ بالآخر ایک روز باپ نے ڈانٹ کر کہا "میں نے کہہ دیا کہ میں سائیکل نہیں خریدوں گا۔ اب آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات مت کرنا۔"

یہ سن کر لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے بعد روتے ہوئے بولا: "آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں۔" اس جملہ نے باپ کو تڑپا دیا۔ اچانک اس کا انداز بدل گیا۔ اس نے کہا: اچھا بیٹے اطمینان رکھو میں تمھارے لئے سائیکل خریدوں گا۔ اور کل ہی خریدوں گا۔" یہ کہتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اگلے دن اس نے پیسہ کا انتظام کر کے بیٹے کے لئے نئی سائیکل خرید دی۔

لڑکے نے بظاہر ایک لفظ کہا تھا۔ مگر یہ ایک ایسا لفظ تھا جس کی قیمت اس کی اپنی زندگی تھی، جس میں اس کی پوری ہستی شامل ہو گئی تھی۔ اس لفظ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے سرپرست کے آگے بالکل خالی کر دیا ہے۔ یہ لفظ بول کر اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے نقطہ پر کھڑا کر دیا جہاں اس کی درخواست اس کے سرپرست کے لئے بھی اتنا ہی بڑا مسئلہ بن گئی جتنا خود اس کے لیے۔

اس واقعہ سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ذکرِ الٰہی کی وہ کون سی قسم ہے جو میزان کو بھر دیتی ہے اور جس کے بعد خدا کی رحمتیں بندے کے اوپر امنڈ آتی ہیں۔ یہ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی "نصاب" ہے۔ یہ ذکر کی وہ قسم ہے جس میں بندہ اپنی پوری ہستی کو انڈیل دیتا ہے۔ جب بندے کی آنکھ سے عجز کا وہ قطرہ ٹپک پڑتا ہے جس کا تحمل زمین و آسمان بھی نہ کر سکیں۔ جب بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے ساتھ اتنا زیادہ شامل کر دیتا ہے کہ "بیٹا" اور "باپ" دونوں ایک ترازو پر آ جاتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب کہ ذکر محض لغت کا لفظ نہیں ہوتا بلکہ ایک شخصیت کے پھٹنے کی آواز ہوتا ہے۔ اس وقت خدا کی رحمتیں اپنے بندے پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ بندگی اور خدائی دونوں ایک دوسرے سے راضی ہو جاتے ہیں۔ قادرِ مطلق عاجزِ مطلق کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

مکمل تدبیر، اور اسی کے ساتھ اللہ پر مکمل اعتماد

انسان بیک وقت دو مختلف تقاضوں کے درمیان ہے۔ ایک عبدیت کا تقاضا، دوسرے امتحان کا۔ انسان کے حالت امتحان میں ہونے کا پہلو تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے سارے اختیار اور اپنی تمام امکانیات کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے۔ دوسری طرف عبدیت کا پہلو زور کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر حال میں آدمی اللہ پر بھروسہ رکھے، اپنے کو یا اپنی تدبیروں کو کچھ نہ سمجھے۔ اسباب کا اہتمام ہمارے حالت امتحان میں ہونے کا اظہار ہے اور اللہ پر اعتماد ہماری عبدیت کا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جب مکہ کے حالات اس حد تک سخت ہوگئے کہ لوگوں نے آپ کے قتل کا ارادہ کرلیا تو آپ اپنے وطن کو چھوڑ کر یثرب (مدینہ) چلے گئے۔ سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کے لئے آپ نے ہر قسم کا ممکن اہتمام فرمایا —— سفر کے ہر چیز کو مکمل طور پر راز میں رکھا۔ عام شاہراہ کے بجائے غیر معروف راستہ سے سفر فرمایا۔ مکہ سے رات کے وقت پیدل نکلے اور سواری کا انتظام آگے ایک صحرائی مقام سے کیا۔ آپ کو مدینہ جانا تھا جو کہ سے شمال کی جانب واقع ہے۔ مگر آپ نے اس کے الٹی طرف جنوبی سمت میں سفر فرمایا۔ مکہ کے باہر چند میل جا کر ایک سنسان پہاڑی غار (ثور) میں تین دن ٹھہرے رہے جو اتنا تنگ تھا کہ آدمی صرف لیٹ کر اس کے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

آپ جب ابوبکر صدیق کے ساتھ غار ثور میں مقیم تھے، قریش کے کچھ لوگ آپ کو ڈھونڈتے ہوئے غار کے کنارے تک پہنچ گئے۔ آہٹ پاکر ابوبکر صدیق نے کہا، دشمن اتنے قریب آچکا ہے کہ اگر انھوں نے جھک کر اپنے قدموں کے نیچے کی طرف دیکھا تو وہ ہم کو پالیں گے۔ آپ نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا:

ماظنك باثنين يا ابابكر الله ثالثهما — ابوبکر ان دو کی نسبت تمھارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہو

اس واقعہ میں نبوت کا مقام نظر آرہا ہے۔ ایک طرف تدبیر کمال درجہ پر۔ دوسری طرف اللہ پر اعتماد کمال درجہ پر۔ یہی نبوت کی شان ہے۔ پیغمبر اس شان عبدیت میں کمال درجہ پر ہوتا ہے۔ پیغمبر کے ساتھیوں اور فیض پانے والوں میں بھی یہ اوصاف درجہ بدرجہ پیدا ہوتے ہیں۔

یہ احترام نہیں، ناقدری ہے

فقہ کی کتابوں میں علی مرغینانی (۵۹۳ - ۵۱۱ھ) کی کتاب "ہدایہ" بہت مشہور اور مقبول کتاب ہے۔ علمائے احناف کے فتاوی کا مدار زیادہ تر اسی پر ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ ہدایہ کی جلدوں کو سمجھ کر پڑھنے یا اس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس اس کی "تلاوت" کر لینا کافی ہے۔ اس کو جلی حرفوں میں چھپوا لیا جائے اور الفاظ کی صحیح ادائگی کی ضمانت کے لئے اعراب بھی لگا دیئے جائیں اور اس کے بعد لوگوں کو دے دیا جائے کہ وہ صبح و شام اس کے الفاظ کو دہرالیا کریں۔ اگر کوئی ایسا کہے تو سارے علماء اس کے مخالف ہو جائیںگے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ قرآن کے بارے میں وہ ٹھیک اسی عمل پر راضی ہو گئے ہیں۔ جو بات انھیں شامی اور در مختار اور ہدایہ اور کنز الدقائق کے معاملہ میں بے معنی نظر آتی ہے، وہی بات قرآن کے معاملہ میں عین مطلوب بن گئی ہے۔

مجھے ایک بار سفر میں ایک نوجوان کی ہم راہی کا اتفاق ہوا۔ یہ ایک فیض یافتہ نوجوان تھا اور صوم و صلوٰۃ کا نہایت پابند تھا۔ وہ اپنے گلے میں ایک حمائل لٹکائے ہوئے تھا۔ ہمیشہ باوضو رہتا اور جہاں موقع ملتا، قرآن کھول کر اس کی تلاوت شروع کر دیتا۔ اس کا ذوق شوق دیکھ کر میں نے کہا: آپ عربی زبان بھی سیکھ لیجئے تاکہ جب آپ قرآن پڑھیں تو اس کو سمجھ بھی سکیں۔ میری اس بات کے جواب میں اس نے جو کچھ کہا وہ عام مسلمانوں کی نفسیات کی مکمل ترجمان تھی: "ہم تو صرف ثواب کے لئے قرآن پڑھتے ہیں"

یہ حال اس کتاب کا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس کے اتارنے کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ لوگ اس پر غور کریں اور اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کریں۔ (ص - ۲۹)

* *

زبانوں کی کثرت

مغرب نے جب ہندستان کے علمی ذخیرہ کی طرف توجہ کی تو اس نے زیادہ تر قدیم کلاسیکی ادب، سنسکرت ادب کو دیکھا۔ سر ولیم جونز نے کالی داس کو ہندستان کا شکسپیر کہا (۱۷۸۹) گوئٹے نے ویدوں میں ایک نئی دنیا پائی جس میں وہ رہ سکتا تھا (۱۸۱۱) شوپنہار نے اعتراف کیا کہ اپنشد اس کے لئے زندگی کی تسکین رہی ہیں (۱۸۵۱) میکس مولر نے کہا کہ ویدسے ہم اتنے ہی اہم سبق سیکھ سکتے ہیں جیسے کہ ہم ہومر اور ورجل میں پاتے ہیں (۱۸۸۲)

اس کے مقابلہ میں جدید ہندستانی لٹریچر کی طرف مغرب نے بہت کم توجہ دی ہے۔ البرشٹ ویبر (۱۸۵۲) اور ڈاکٹر سوجیت مکرجی (۱۹۷۵) کے بیان کے مطابق اس کی وجہ ہندستانی زبانوں کی کثرت ہے۔ قدیم لٹریچر سے واقفیت کے لئے صرف سنسکرت کو جاننا ان کے لئے کافی ہو گیا تھا جب کہ جدید لٹریچر سے واقفیت کے لئے انھیں اتنی زیادہ زبانیں سیکھنی پڑیں گی جو البرشٹ ویبر کے الفاظ میں کسی ایک اسکالر کے امکان سے زیادہ ہیں۔

کبھی سیاست کو ترک کرنے ہی کا نام سیاست ہوتا ہے

اکتوبر ۱۹۴۴ میں دوسری عالمی جنگ اپنے شباب پر تھی۔ امریکہ، بحرالکاہل کے جزائر کو فتح کرتے ہوئے، جاپان کے دروازہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس وقت جاپان کے وائس ایڈمرل اونشی (TAKIJIORO ONISHI) نے اپنی فوج کے اعلیٰ افسروں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میرے خیال سے اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے جس میں ہم یقین کر سکیں کہ ہماری معمولی طاقت زیادہ سے زیادہ موثر بن سکتی ہے۔ وہ یہ کہ ہم "زیرو فائٹرس" کا ایک دستہ بنائیں جو ۲۵۰ کیلوگرام کا بم لے کر دشمن کے سمندری جنگی جہازوں پر اپنے آپ کو گرادیں"

اونشی کی یہ تجویز ہوابازوں تک پہنچائی گئی۔ فی الفور منظوری کا فیصلہ ہو گیا۔ ہوابازوں کا ایک دستہ بنایا گیا جس کا نام تھا کامی کیز (KAMIKAZE) یہ ایک جاپانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "خدائی آندھی" یہ نام اس لئے اختیار کیا گیا کیونکہ تیرھویں صدی میں قبلائی خاں کے حملہ سے "ایک خدائی آندھی نے جاپان کو بچایا تھا" جس میں اس کی جنگی کشتیاں ایک سمندری طوفان نے تباہ کر ڈالی تھیں۔

اگست ۱۹۴۵ میں جنگ ختم ہوئی تو پانچ ہزار کی تعداد میں جاپانی ہواباز اس طرح اپنی جانیں دے چکے تھے۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۴۴ اور جون ۱۹۴۵ کے درمیان ۳۴ امریکی جنگی جہازوں کو تباہ کر دیا تھا۔

جاپان کے بہادر ہوابازوں نے کن جذبات کے ساتھ یہ قربانیاں دی تھیں، اس کا اندازہ ایک خط سے ہوگا۔ سسومو (SUSUMU-KIJITSU) اسی قسم کا ایک ۲۲ سالہ جاپانی ہواباز تھا جس نے ایک بم لے کر اپنے ہوائی جہاز کو دشمن کے ایک سمندری جنگی جہاز پر گرایا تھا، اس نے آخری دن اپنے دفتر سے اپنے خاندان کو حسب ذیل خط لکھا:

"میرے پیارے والدین، پیارے بھائیو اور میری پیاری بہن!

یقیناً آپ کو اس کا علم نہیں ہوگا، مگر چند دن پہلے میں نے آپ کو الوداع کہی ہے جب کہ میں اپنے گھر کے اوپر پرواز کر رہا تھا، میرے جہاز کے بازوؤں کے سایہ نے ہمارے مکان کی چھت کو چھوا۔ میرے خیالات ہمہ تن آپ کی طرف لگے ہوئے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ بہت جلد میرا وقت آجائے گا۔ مگر مجھے موت کا ڈر نہیں۔ مجھے صرف یہ فکر ہے کہ میرا عمل کیا جاپان کو بچانے کے لئے مفید اور فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ میں اور میرے ساتھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہماری قربانیاں ہمارے بعد کی نسلوں کے لئے فتح لے آئیں گی۔ ہم نہایت پرسکون ہیں۔ ہم اکثر مذاق کرتے ہیں اور اپنا وقت پڑھنے اور تاش کھیلنے میں گزارتے ہیں۔ آپ ہمارے لئے غمگین نہ ہوں۔ اس کے برعکس آپ کو فخر کرنا چاہئے کہ میرا جسم اگرچہ جلد ہی ختم ہو جائے گا مگر میری روح ہمیشہ آپ کے پاس رہے گی۔۔۔۔ اب الوداع، کیونکہ آخر وقت کی گھنٹی ہو چکی ہے۔

(آپ کا بیٹا اور بھائی سسومو)

تاہم تاریخ کی یہ انوکھی قربانی جاپان کو بچانے والی ثابت نہ ہو سکی۔ کیوں کہ دشمن کے پاس ایک اور برتر طاقت تھی جس کے مقابلہ میں جاپانی ہوابازوں کی یہ لامثال قربانی

Kamikaze: Suicide Pilot

بھی بے اثر تھی۔ یہ تھا ایٹم بم۔ ۶ اگست ۱۹۴۵ کو امریکی ہوائیہ نے دو ایٹم بم جاپان کی زمین پر گرائے جس نے ہیروشیما اور ناگاساکی جیسے عظیم صنعتی شہروں کو چند منٹ میں خاک کا ڈھیر بنا دیا۔ اب جاپان کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ تاہم جاپان کے لئے اب بھی راستے بند نہیں ہوئے۔ اب اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے "جنگ کو جاری رکھنے کے لئے جنگ کے خاتمہ" کا اعلان کر دیا۔ جاپان کے شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے ریڈیو پہ قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"— ہم ایک ناقابل برداشت صورت حال سے دوچار ہیں۔ مگر ہمیں اس ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے تاکہ ہم جاپان کی اگلی نسلوں کی تعمیر نو کر سکیں۔"

جاپان نے امریکہ کے سیاسی اور فوجی اقتدار کو تسلیم کر لیا اور اس کے تحت غیر سیاسی میدانوں میں اپنی ترقی و استحکام کی تدبیریں شروع کر دیں۔ اب ان کا خصوصی نشانہ تھا سائنسی تعلیم اور جدید صنعت — "جنگ کو ختم کر کے جنگ جاری رکھنے" کی تدبیر کامیاب رہی۔ ۱۹۴۵ میں کئے گئے اس خاموش فیصلہ کا نتیجہ ۱۹۷۰ میں برآمد ہوا۔ ۲۵ سال تک "سیاست" چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان ایک ناقابل تسخیر سیاسی طاقت بن گیا۔ سائنسی تعلیم، ٹکنالوجی، صنعت اور قومی کردار کی تعمیر میں جاپان نے جو غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی تھیں، اس نے اپنے بالواسطہ اثرات پیدا کرنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ امریکہ کے لئے اس کو نظر انداز کرنا ناممکن ہو گیا۔ امریکہ نے جزائر جاپان کا اقتدار جاپانی باشندوں کے حوالے کر دیا۔ اس کی فوجیں اوکی ناوا میں اپنے عظیم فوجی اڈہ کو خالی کر کے اپنے وطن واپس چلی گئیں۔

وہ ہار کو ماننا جانتا تھا

امریکہ کے ایک شخص نے ۱۸۳۱ میں تجارت کی۔ اس میں وہ ناکام ہو گیا۔ ۱۸۳۲ میں اس نے الکشن میں شکست کھائی۔ ۱۸۳۴ میں اس نے دوبارہ تجارت کی مگر اس بار بھی ناکام رہا۔ ۱۸۴۳ میں اس کو امید تھی کہ اس کی پارٹی اس کو کانگرس کی ممبری کے لئے نامزد کرے گی۔ مگر اس کی امید پوری نہ ہو سکی۔ ۱۸۵۵ میں وہ سینٹ کے لئے کھڑا ہوا مگر ہار گیا۔ ۱۸۵۸ میں دوبارہ اس کو سینٹ کے الکشن میں شکست ہوئی۔

یہ بار بار ناکام ہونے والا شخص ابراہام لنکن (۱۸۰۹ - ۱۸۶۵) تھا جو بالآخر ۱۸۶۰ میں امریکہ کا صدر چنا گیا اور آج وہ نئے امریکہ کا معمار سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نارمن ونسنٹ پیل نے لنکن کی کامیابی کا راز یہ بتایا ہے: HE KNEW HOW TO ACCEPT DEFEAT وہ جانتا تھا کہ شکست کو کس طرح تسلیم کیا جائے۔

ایک تبصرہ جو بہت سی کتابوں پر صادق آتا ہے

"بھیم راؤ جی امبیڈکر" ایک تازہ مطبوعہ انگریزی کتاب ہے۔ ٹائمس آف انڈیا کا تبصرہ نگار اس کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتا ہے:

WHAT USEFUL PURPOSE THE BOOK SERVES ESCAPES ME COMPLETELY AS I THINK IT IS AN EXCELLENT EXAMPLE OF HOW A GOOD SUBJECT CAN BE TURNED INTO UNREADABLE BOOK FOR LACK OF EFFORT, AND ORIGINALITY IN ORGANISING ALREADY-KNOWN MASS OF FACTS.

Times of India, 5.2.1978

یہ کتاب کون سی مفید خدمت انجام دے گی، میں اس کو سمجھنے سے بالکل معذور رہا۔ میرا خیال ہے کہ یہ کتاب اس بات کی ایک شاندار مثال ہے کہ کس طرح ایک عمدہ موضوع، محنت اور نیاپن نہ ہونے کے سبب سے ایک ناقابل مطالعہ کتاب کی صورت اختیار کرسکتا ہے جب کہ اس موضوع پر لکھنے کے لئے کافی مواد موجود ہو۔

آگ: درخت کا خوبصورت بچہ

عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ علماء بنی اسرائیل میں سے تھے۔ جب رسول اللہ کے دست مبارک پر بیعت کی سعادت ان کو حاصل ہوئی تو انھوں نے عرض کیا کہ قرآن کے ساتھ تورات کی تلاوت بھی جاری رکھوں۔ آپ نے فرمایا، اقرأ هذا ليلة وهذا ليلة (ایک رات قرآن پڑھا کرو اور ایک رات تورات)

تذکرہ حفاظ ذہبی، جلد ۱، صفحہ ۲۶

قرآن کی صحیح رہنمائی میں اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے سے جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے، خود قرآن کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ ایک دن میں یجروید کے اردو ترجمہ کا مطالعہ کر رہا تھا، ایک جگہ مجھے یہ فقرہ ملا "اے اگنی تو خوبصورت بچہ ہے، پودوں میں سے نکالا ہوا تاریکی کو دور کرتا ہوا، ماؤں سے شور کرتا ہوا پیدا ہوا ہے" (ادھیا ۱۲) اس اشلوک نے معاً میرے دماغ کو قرآن کی ان آیتوں کی طرف منتقل کر دیا جن میں ارشاد ہوا ہے کہ تم دیکھتے ہو اس آگ کو جسے تم پیدا کرتے یا نکالتے ہو، کیا تم نے اس درخت کو اگایا، یا ہم ہیں اس کے اگانے والے" (الواقعہ) قریب قریب یہی مضمون سورہ یٰسین میں بھی ہے۔ عام مفسرین، عرب کے بعض خاص درختوں کا ذکر کر کے لکھ دیتے ہیں کہ ان کی شاخوں کو باہم رگڑ کر عرب آگ پیدا کیا کرتے تھے، اسی کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یجروید کا یہ طرز تعبیر قرآن کے طرز تعبیر سے اس درجہ ملتا جلتا تھا کہ خیال گزرا کہ کیوں نہیں قرآن میں بھی "درخت" کو عام معنی میں سمجھا جائے، اور جیسے وید میں ہے کہ آگ خوبصورت بچہ ہے پودوں سے نکالا ہوا، یعنی آگ کا ظہور لکڑی ہی کے جلنے سے ہوتا ہے اور اسی سے شور کرتا ہوا پیدا ہوتا ہے، قرآن میں بھی کیا اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (مولانا مناظر احسن گیلانی)

خدا کی کائنات میں غور و فکر سب سے بڑی عبادت ہے

حدیث میں آیا ہے کہ ایک گھڑی کا سوچنا ستر برس کی عبادت سے افضل ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص تنہائی میں اللہ کو یاد کرے، وہ ایسا ہے جیسے اکیلا کفار کے مقابلہ میں چل دیا ہو۔ ایک حدیث کے مطابق سات آدمی وہ ہیں جن کو اللہ اس دن اپنے سایہ کے نیچے جگہ دے گا جب کہ اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو اللہ کو تنہائی میں یاد کرے اور اس کی آنکھ سے آنسو بہہ پڑیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ایک آواز دینے والا آواز دے گا کہ عقل والے لوگ کہاں ہیں۔ لوگ پوچھیں گے، عقل والے کون ہیں۔ جواب دیا جائے گا، وہ لوگ جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے رہے اور آسمان اور زمین کی تخلیق میں غور کرتے تھے اور کہہ اٹھتے تھے، خدایا تو نے ان کو عبث پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے۔ پس ہم کو جہنم کے عذاب سے بچا۔ ابن ابی الدنیا نے ایک مرسل روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار صحابہ کی ایک جماعت کے پاس آئے۔ وہ لوگ چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا، کیا سوچ رہے ہو۔ انھوں نے جواب دیا، اللہ کی مخلوقات میں غور کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں اللہ کی ذات میں غور نہ کرو، اللہ کی مخلوقات میں غور کیا کرو۔

ابو ہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص چھت پر لیٹا ہوا آسمان اور ستاروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس پر خدا کی عظمت کا تاثر قائم ہوا اور بولا: "خدا کی قسم مجھے یقین ہے کہ تمھارا پیدا کرنے والا کوئی ضرور ہے، اے اللہ تو مجھے بخش دے۔" خدا کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہوئی اور وہ بخش دیا گیا۔ عبداللہ بن عباس کہتے ہیں، ایک ساعت کا غور تمام رات کی عبادت سے افضل ہے۔ ام درداء سے پوچھا گیا کہ ابو درداء کی محبوب عبادت کیا تھی، فرمایا غور و فکر۔ ابو ہریرہ کی ایک روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک ساعت کا غور و فکر ساٹھ برس کی عبادت سے افضل ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی وہ مخفی یاد جس کو فرشتے بھی نہ سن سکیں، اس کا ثواب ستر درجہ زیادہ ہے۔

عبادہ بن صامت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ بہترین ذکر خاموش ذکر ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو کفایت کا درجہ رکھتا ہو۔ ایک حدیث کے مطابق آپ نے فرمایا کہ اللہ کو ذکر خامل سے یاد کیا کرو، پوچھا گیا، ذکر خامل کیا ہے۔ فرمایا "مخفی یاد"

یہی وہ ذکر (یاد الٰہی) ہے جس کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ جو ایسا کرے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں خواہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔

عن ابی ھریرۃ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ   نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دنیا ملعون ہے اور جو کچھ

وسلم یقول الدنیا ملعونۃ وملعون مافیھا الا ذکر اللہ وما والاہ وعالما ومتعلما
دنیا میں ہے وہ بھی۔ مگر اللہ کی یاد اور وہ چیز جو اس کے قریب ہو اور عالم اور طالب علم۔

امام غزالی نے لکھا ہے کہ غور و فکر کو افضل عبادت اس لئے کہا گیا کہ اس میں ذکر (یاد الٰہی) تو موجود ہوتا ہی ہے، اسی کے ساتھ اس میں دو چیزوں کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک اللہ کی معرفت، کیونکہ غور و فکر معرفت کی کنجی ہے، دوسرے، اللہ کی محبت کہ وہ فکر سے پیدا ہوتی ہے۔

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں، اگر علم چاہتے ہو تو قرآن کے معانی پر غور کرو کہ اس میں اولین و آخرین کا علم ہے۔

یوں آتی ہے آفت، اور آخرت کی آفت سب سے بڑی ہے

جب کسی کو مال و اولاد کی نعمت ملتی ہے تو وہ دراصل خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس کا شکرانہ یہ ہے کہ آدمی ان کو اپنی ذاتی چیز نہ سمجھ لے بلکہ دوسروں کو بھی اس میں حق دار سمجھے اور کمزور طبقات کے لئے بھی اس میں حصہ لگائے۔ خدا کی نعمت پانے کے بعد "مناع للخیر" بن جانا خدا کو سخت ناپسند ہے۔ اس قسم کا فعل نہ صرف آخرت میں آدمی کے لئے بوجھ بنے گا۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ دنیا میں بھی ملی ہوئی نعمت اس سے چھین نہ لی جائے۔

قرآن میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

"ہم نے اسی طرح ان کو آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ہم نے باغ والوں کو آزمائش میں ڈالا تھا۔ جب انھوں نے قسم کھائی کہ اپنے باغ کا پھل صبح سویرے ضرور توڑیں گے۔ ان کو ایسا وثوق تھا کہ انھوں نے یہ نہ کہا کہ "اگر خدا چاہے"۔ پھر رات کو جبکہ وہ ابھی سو رہے تھے تمھارے رب کی طرف سے ایک آفت اس باغ پر پھر گئی اور اس کا حال ایسا ہو گیا جیسے روندی ہوئی فصل۔

وہ صبح کو اٹھے اور ایک دوسرے کو پکارا، اگر تم کو پھل توڑنا ہے تو سویرے اپنے کھیت پر چلو۔ پھر وہ لوگ چل پڑے۔ آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے کہ آج تمھارے باغ میں کوئی محتاج نہ آنے پائے۔ وہ یہ سمجھ کر جا رہے تھے کہ وہ اس پر قادر ہیں۔ مگر جب وہاں پہنچے اور باغ کی حالت دیکھی تو کہنے لگے "یقیناً ہم راستہ بھول گئے ہیں"۔ پھر جب حقیقت معلوم ہوئی تو بولے "ہماری قسمت پھوٹ گئی"۔

ان میں جو بہتر آدمی تھا، وہ بولا۔ میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم خدا کی پاکی کیوں نہیں بولتے۔ انھوں نے جواب دیا۔ واقعی پاک ہے ہمارا رب بے شک ہم ہی قصوروار ہیں۔ پھر ایک دوسرے پر ملامت کرنے لگا، انھوں نے کہا، افسوس ہمارے حال پر، بلاشبہ ہم سرکش ہو گئے تھے، بعید نہیں کہ ہمارا رب اس کے بدلے ہمیں اس سے بہتر باغ عطا کرے۔ ہم اس کی طرف رجوع کرتے ہیں ــــ یوں آتی ہے آفت اور آخرت کی آفت تو سب سے بڑی ہے۔ القلم ۳۳ ـ ۱۷

بہت سے چمک دار سکے آخرت کے بازار میں کھوٹے ثابت ہوں گے

خواہ دنیا میں وہ کتنے ہی کامیاب دکھائی دیتے ہوں

سعدی شیرازی کا ایک شعر ہے

بزرگ زادہ ناداں بشہر وا ماند
کہ در دیار غریبش بہیچ نستانند

"شہروا" کے معنی ہیں رواج دادۂ حکومت۔ اس سے مراد وہ نقود یا سکے ہیں جن کو کسی حکومت نے رائج کر رکھا ہو۔ ایسے سکے کی قیمت صرف اس حکومت کے حدود میں ہوتی ہے۔ اس سے باہر اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ سعدی شیرازی کہتے ہیں کہ بڑے آدمی کے کوئی صاحبزادے جو خود ناداں ہوں، وہ اپنے وطن میں اپنے باپ کی وجہ سے عزت دار بنے رہتے ہیں، مگر اپنے وطن سے باہر اسی طرح بے قیمت ہو جاتے ہیں جس طرح ایک ملک کا نوٹ دوسرے ملک میں اپنی قیمت کھو دیتا ہے۔

موجودہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے شیطان کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔ جو لوگ شیطان کے پسند کئے ہوئے راستوں پر چلتے ہیں، ان کو یہاں بہت جلد عزت اور ترقی حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر اس قسم کے لوگ جیسے ہی اگلی دنیا میں داخل ہوں گے وہ بالکل بے قیمت ہو جائیں گے۔ کیونکہ اگلی دنیا وہ ہے جہاں شیطان کی عمل داری مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ جو لوگ شیطان کی سرپرستی کی وجہ سے موجودہ دنیا میں عزت دار بنے ہوئے تھے وہ وہاں بھی اور بھی سے زیادہ بے قیمت ہوں گے کیوں کہ وہاں عزت صرف اس کے لئے ہے جس کو خدا اپنی سرپرستی میں لے لے۔

علی بن ابی طالب، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے۔ ان کے یہاں پہلا لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا نام حرب (جنگ) تجویز کیا۔ آپ نے اس کو پسند نہیں کیا اور اس کے بجائے لڑکے کا نام "حسن" رکھا۔ علی بن ابی طالب کے یہاں دوسرا لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے دوبارہ چاہا کہ اس کا نام حرب رکھیں۔ آپ نے فرمایا نہیں، اس کا نام حسین رکھو۔
(منہاج السنۃ النبویۃ لابن تیمیہ)

جنگ اور تصادم اسلام میں اتنا زیادہ ناپسندیدہ ہے کہ ہر قیمت پر اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن میں ہدایت کی گئی ہے کہ تمہارا حریف اگر صلح کے لئے آگے بڑھے تو تم بھی آگے بڑھ کر اس سے صلح کر لو۔ حتیٰ کہ اگر یہ اندیشہ ہو کہ حریف صلح کے پردہ میں تم کو دھوکا دینا چاہتا ہے تب بھی اس کی پروا مت کرو اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس سے صلح کر لو (الانفال ۶۱)

ذکر و دعا کی حقیقت

"فلاں دعا بہت مجرب ہے، اس کو پڑھا کرو" "فلاں ذکر کی بڑی فضیلت ہے، صبح و شام اس کا ورد کیا کرو"۔ اس قسم کی باتیں اکثر سننے میں آتی ہیں۔ بے شمار کتابیں لوگوں نے لکھ رکھی ہیں جن میں اس قسم کے "مجربات" جمع کیے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ کتنی بزرگی کی دکانیں اسی لئے قائم ہیں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کو دعاؤں اور اذکار کے کیمیتی نسخے معلوم ہیں، لوگ وہاں حاضری دیتے ہیں اور وہ پُراسرار طور پر ان کو ایسے مجربات کی تلقین کرتے ہیں جو ان کو سینہ بہ سینہ پہنچے ہیں۔

مگر یہ ساری باتیں قطعاً بے اصل ہیں۔ دعا یا ذکر کوئی جادو کا منتر نہیں ہے جس کے سارے کمالات کچھ مقرر الفاظ میں چھپے ہوئے ہوں۔ اگر یہ خاص الفاظ مقرر طریقے پر زبان سے پڑھ دیئے جائیں تو اس کی تاثیر ظاہر ہو جائے گی اور اگر الفاظ اور طریقے میں کچھ فرق ہو گیا تو منتر کا طلسماتی کمال ظاہر نہیں ہوگا۔ دعا یا ذکر دل کی کیفیات اور اندرونی تڑپ کا نام ہے نہ کہ پُراسرار الفاظ کے کسی مجموعہ کا۔

قصہ مشہور ہے [illegible] ایک بند محل تھا۔ اس محل کے اندر بے شمار خزانہ بھرا ہوا تھا، مگر وہ کسی کنجی سے نہیں کھلتا تھا، بلکہ ایک منتر سے کھلتا تھا۔

ایک شخص کو اس محل کی تلاش ہوئی۔ برسوں تک پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومنے کے بعد اسے ایک شخص ملا جو اس جادوئی محل کا راز جانتا تھا۔ اس نے اس کا پتہ بتایا اور کہا کہ تم اس کے سامنے پہنچو تو کہنا "کھل اے سم سم"۔ یہ کہتے ہی محل کا دروازہ کھل جائے گا اور تم اس میں داخل ہو جانا۔

اب آدمی نے سفر شروع کیا۔ چلتے چلتے بالآخر وہ خزانہ کے اس محل تک پہنچ گیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ اس کو کھولنے کا منتر بھول گیا۔ وہ محل کے بھاری دروازہ کے سامنے کھڑا ہو کر طرح طرح کے ملتے جلتے الفاظ دہراتا رہا: تم تم، بم بم، چم چم۔ مگر دروازہ نہیں کھلا۔ کیونکہ وہ تو ایک خاص لفظ کے بولنے ہی سے کھلتا تھا اور آدمی وہ لفظ بھول چکا تھا۔

وہ دوبارہ محل کے عارف کی طرف روانہ ہوا اور دریاؤں اور بیابانوں کا سفر کر کے اس سے ملاقات کی۔ عارف نے دوبارہ اس کو بتایا کہ اس جادوئی محل کا منتر "سم سم" ہے۔ اب اس نے اس منتر کو خوب رٹ ڈالا اور دوبارہ سفر کر کے محل کے پاس پہنچا۔ اب وہ محل کے سامنے کھڑا ہوا تو اس کو اس کا جادوئی منتر خوب یاد تھا۔ اس نے کہا "کھل اے سم سم" ان الفاظ کا زبان سے نکلنا تھا کہ محل کا دروازہ کھل گیا اور خزانوں کی چمکتی ہوئی دنیا اس کے سامنے آگئی۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دعا اور ذکر بھی اسی طرح "سم سم" کی قسم کے منتر ہیں، مگر یہ دین سے انتہائی ناواقفیت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بندوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ اخبات و انابت (دل کا جھکاؤ اور توجہ) ہے نہ کہ لفظی طلسمات۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دیہاتی کا اونٹ گم ہو گیا۔ وہ بیتابانہ اس کو ڈھونڈ رہا تھا۔ لمبی تلاش اور دوڑ دھوپ کے بعد جب اونٹ اس کو ملا تو اس کا دل شکر الٰہی کے جذبہ سے بھر گیا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا:

اللھم انت عبدی وانا ربك۔ خدایا تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔

لفظوں کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ کفر کا کلمہ ہے۔ مگر یہ الفاظ اللہ تعالےٰ کو اتنے پسند آگئے کہ اس کو خدا کے مقبول بندوں میں شامل کر دیا گیا۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ میں "اللہ ہمارے ظاہر کو نہیں دیکھتا، وہ ہمارے قلب اور ہمارے باطن کو دیکھتا ہے۔"

دعا اور ذکر دین کی سب سے اعلیٰ حقیقتیں ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کچھ پُراسرار قسم کی عربی منتر ہیں۔ ان کو رٹ کر خاص خاص وقت میں دہرا دو، اور عمل کے دروازے کھل جائیں گے۔ دعا کی حقیقت بندے کا اپنے مالک کو پکارنا ہے۔ اسی طرح ذکر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا خوف اور محبت اس طرح دل پر چھا جائے کہ ہر وقت اس کی یاد آتی رہے۔ دعا اور ذکر وہی افضل ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلے، خواہ وہ اپنی مادری زبان میں ہو۔ خواہ اونٹ والے کی طرح وہ بے ڈھنگے الفاظ میں کیوں نہ ادا ہوئی ہو۔

خلیفہ ثانی کی نصیحت

حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں عراق پر شاہانِ کسریٰ کا قبضہ تھا۔ اس وقت جس بادشاہ کی حکومت تھی اس کا نام یزدجرد تھا۔

عراق کے ساتھ لڑائی کے زمانہ میں ایک بار خلیفہ ثانی نے ارادہ کیا کہ وہ خود محاذ جنگ پر جا کر اسلامی فوجوں کی کمان کریں، مدینہ میں مشورہ ہوا۔ اکثر مسلمانوں کی رائے ہوئی کہ آپ کو خود جانا چاہئے۔ مگر خواص نے رائے دی کہ آپ دار السلطنت میں ٹھہریں اور یہاں رہ کر لشکروں کی روانگی کا انتظام کریں، یہی زیادہ بہتر ہے۔

دوسری رائے کے حق میں فیصلہ ہوا اور سعد بن ابی وقاص کو عراق روانہ کیا گیا جہاں اس وقت قادسیہ کے مقام پر جنگ ہو رہی تھی۔ حضرت سعد روانہ ہونے لگے تو حضرت عمر نے ان کو وصیت فرمائی۔ اس وصیت کا خلاصہ یہ تھا:

"سعد! تمھیں یہ بات دھوکے میں نہ ڈالے کہ تم رسول اللہ کے ماموں کہلاتے ہو اور آپ کے صحابی ہو۔ اللہ برائی کو برائی سے نہیں دھوتا بلکہ برائی کو بھلائی سے دھوتا ہے۔ اللہ اور بندوں کے درمیان کوئی رشتہ داری نہیں۔ اس کے یہاں صرف اس کی بندگی مقبول ہوتی ہے۔ اللہ کے یہاں شریف رذیل سب برابر ہیں۔ سب اس کے بندے ہیں اور وہ سب کا رب ہے۔ اس کے انعامات بندگی سے حاصل ہوتے ہیں۔ ہر معاملہ میں اس چیز کو دیکھنا جو رسول اللہ کا طریقہ تھا، وہی عمل کی چیز ہے۔ میری اس نصیحت کو یاد رکھنا۔ تم ایک بڑے کام کے لئے بھیجے جا رہے ہو۔ اس سے چھٹکارا صرف حق کے اتباع سے ہو سکتا ہے۔

اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو خیر کا عادی بنانا۔ اللہ کے خوف کو اختیار کرنا۔ اور اللہ کا خوف دو باتوں میں جمع ہوتا ہے۔ اس کی اطاعت میں اور گناہ سے پرہیز کرنے میں۔ اور اللہ کی اطاعت جس کو بھی نصیب ہوئی، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت سے محبت کے ذریعہ نصیب ہوئی۔"

آر۔ ایس۔ ایس۔ اور مسلمان

ڈاکٹر کیشو بلی رام ہیڈگوار (۱۸۹۰-۱۹۴۰)

آر۔ ایس۔ ایس۔ کے بانی ہیں۔ انھوں نے ۱۹۲۵ میں اس تنظیم کو قائم کیا تھا۔ ڈاکٹر ہیڈگوار کے بعد ۱۹۴۰ میں گرو گولوالکر اس کے سرسنچالک مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۳ میں ان کے انتقال کے بعد سے بالا صاحب دیوراس (۶۳) اس تنظیم کے سرسنچالک ہیں۔

مسٹر رمیش چندر نے ناگ پور میں بالا صاحب دیوراس سے ایک انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا ایک سوال و جواب یہ تھا:

"Muslims Are Wary"

Q: Is it true that Muslims are rather wary about joining the Sangh? You had once earlier referred to certain changes that will have to be made before opening your doors to non-Hindus. What exactly are these?

A: No, I don't think I have referred to certain changes that will have to be made before opening our doors to other communities. But it is true that Muslims are rather wary and not enthusiastic about joining the Sangh. Which is why I did say that it is only the Hindus who ask us to admit Muslims and not the Muslims themselves. Till today they have not come forward. What I have said possibly in my speeches is that some Muslims came to see me here. We have had some discussions. I have told them: Look here, you are proselytising people. You believe you have the right to convert and you believe that it is your duty to convert. That is not our way of thinking. We started the shuddhi programme just recently. But, then again, that is only as a reaction. In the old days there was no shuddhi.

Remember Swami Vivekananda went to America. He gave lectures on the Vedas, Upanishads, Gita. The Americans appreciated the lectures. Thousands became his disciples. But he did not convert a single American to Hinduism. That is our thinking.

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ مسلمان آر۔ ایس۔ ایس۔ میں شامل ہونے کے معاملہ میں بہت محتاط ہیں۔ آپ نے اس سے پہلے ایک بار کہا تھا کہ غیر ہندوؤں کو سنگھ میں لینے سے پہلے اس میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں گی۔ وہ تبدیلیاں کیا ہیں۔

جواب: نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں نے ایسی تبدیلیوں کا ذکر کیا تھا جو دوسرے فرقہ کے لوگوں کے لئے سنگھ کا دروازہ کھولنے سے پہلے کی جائیں گی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ سنگھ میں شامل ہونے کے معاملہ میں مسلمان محتاط ہیں نہ کہ پُرجوش۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ یہ صرف ہندو ہیں جو ہم سے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو سنگھ میں شامل کیا جائے۔ مسلمان خود نہیں کہتے۔ اب تک وہ آگے نہیں بڑھے ہیں۔ میں نے اپنی تقریروں میں جو کچھ کہا ہوگا وہ صرف یہ کہ کچھ مسلمان یہاں مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ ہمارے درمیان کچھ باتیں ہوئیں میں نے ان کو بتایا۔ دیکھئے، آپ لوگوں کو مسلمان بناتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو مسلمان بنانے کا حق ہے اور یہ آپ کا فریضہ ہے مگر یہ ہمارا سوچنے کا طریقہ نہیں۔ ہم نے شدھی کا پروگرام ابھی جلد ہی شروع کیا ہے۔ یہ صرف ردعمل کے طور پر وجود میں آیا۔ قدیم زمانہ میں یہاں کوئی شدھی نہ تھی۔

دیکھئے، سوامی ویویکانند امریکہ گئے۔ وہاں انھوں نے ویدوں پر اپنشدوں پر اور گیتا پر لکچر دئے۔ امریکنوں نے ان لکچروں کو پسند کیا۔ ہزاروں ان کے معتقد بن گئے۔ مگر انھوں نے ایک امریکی کو بھی ہندو نہیں بنایا۔ یہ ہمارا سوچنے کا طریقہ ہے۔

دی السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا۔ ۱۲ مارچ ۱۹۷۸

غلط وہ نہیں ہے جو غلطی کرے —
غلط وہ ہے جو غلطی کا اعتراف نہ کرے

اپنی محبوب شخصیتوں کے چرچے ہیں مگر خدا کے چرچے نہیں

کوئی تحریک کیسی ہے، اس کو جاننے کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس سے جو لوگ متاثر ہوتے ہیں ان میں کیسا مزاج بنتا ہے۔ دور اول میں قرآن نے صحابہ کے اندر جو مزاج پیدا کیا، وہ خدا پرستی اور آخرت پسندی کا مزاج تھا۔ ان میں کے چند آدمی جب ایک جگہ بیٹھتے تو وہ خدا و آخرت کے چرچے کرتے، ان کے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جاتا تو ان کو خدا یاد آتا۔ ہوا اگر تیز ہو جاتی، تب بھی وہ کانپ جاتے کہ کہیں قیامت نہ آ گئی ہو۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر جو تحریکیں اٹھیں اور ان سے جو لوگ متاثر ہوئے، ان کو دیکھئے تو کسی میں یہ مزاج دکھائی نہ دے گا ——— کسی تحریک نے یہ مزاج پیدا کیا ہے کہ اس کے چند وابستگان جب کہیں اکٹھا ہوتے ہیں تو ان کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے بزرگوں کی فضیلتیں اور کرامتیں بیان کریں۔ کسی تحریک نے اپنے لوگوں کو ایک قسم کا علیاتی اسلام تقسیم کر رکھا ہے اور اس کا ہر فرد اس کے طلسماتی فوائد کا ٹیپ ریکارڈ بنا ہوا ہے۔ کسی تحریک نے اسلام کے نام پر ایک عجیب و غریب قسم کا سیاسی مزاج بنایا ہے۔ اس کے متاثر افراد کا لذیذ ترین موضوع گفتگو صرف وہ چیزیں ہوتی ہیں جن میں سیاست کی چاشنی ہو۔ وہ وہیں متحرک ہوتے ہیں جہاں کوئی سیاسی اقدام کا موقع ہو۔ خواہ یہ سیاسی اقدام عملاً سیاسی خندق میں چھلانگ لگانے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔

آج کل جس اسلامی گروہ کو دیکھئے سب کا یہی حال نظر آئے گا۔ ان کی مجلسوں میں اپنے "حضرت" کے چرچے ہیں۔ مگر خدا کے چرچے نہیں۔ ان کی زبانوں پر کرامانی اسلام کی داستانیں ہیں۔ مگر اس اسلام کی گونج نہیں، جو خدا کا خوف اور بندوں کی خیر خواہی پیدا کرتا ہے۔ ان کے یہاں سیاسی مسائل پر بحثیں ہیں۔ مگر قیامت میں قائم ہونے والی عظیم عدالت کے ذکر سے ان کی صحبتیں خالی ہیں۔ ان حالات میں بڑی بڑی اسلامی تحریکوں کے وجود میں آنے کے باوجود اگر اسلام سربلند نہ ہو رہا ہو تو تعجب کی کوئی بات نہیں، کیونکہ خدا کی نصرت خدا والے دین پر نازل ہوگی نہ کہ ہمارے اپنے بنائے ہوئے دین پر۔

اس کا حسد اس کے لئے حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن گیا

قرآن میں ایک کردار کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

"ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں۔ مگر وہ اس سے نکل بھاگا۔ پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا۔ یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو کر رہ گیا۔ اگر ہم چاہتے تو اس کو ان نشانیوں کے ذریعہ بلند مرتبہ کر دیتے۔ مگر وہ تو بالکل دنیا کی طرف جھک پڑا اور اپنی خواہش کی پیروی کرنے لگا۔ سو اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ اگر تم اس پر بوجھ لادو تب بھی ہانپے اور چھوڑ دو تب بھی ہانپے۔ یہی مثال ان لوگوں کی ہے جو ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں۔ تم یہ قصہ ان کو سناؤ، شاید کہ وہ سوچیں۔ اعراف۔ ۱۷۶

یہاں ایک شخص کی مثال دے کر بتایا گیا ہے کہ آدمی جب حق سے انکار کرتا ہے تو اس کی نفسیات کیا ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر فطری طور پر حق کی معرفت رکھ دی ہے۔ اس کے بعد مزید اہتمام یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے ایسے واقعات لائے جاتے ہیں اور ان پر ایسی حقیقتیں روشن کی جاتی ہیں کہ سچائی ان کے لئے ایک جانی پہچانی چیز بن جائے۔ مگر اس کے باوجود اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی محض مفادات اور مصالح کی بنا پر حق کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ حق کی پرستش کو صرف اس لئے چھوڑ دیتا ہے کہ اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ خود اپنی پرستش کرنے یا کرانے کے مواقع سے محروم ہو جائے گا۔

مفسرین کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ اس آیت میں جس شخص کی مثال دی گئی ہے، وہ عرب کا رئیس اور شاعر امیہ ابن ابی الصلت ثقفی ہے۔ اس نے اپنی تمام زندگی کاروبار میں گزاری۔ تجارتی سفروں کے سلسلے میں شام اور یمن وغیرہ کا سفر کرتا رہتا تھا۔ ان سفروں میں اس کی ملاقات عیسائی راہبوں اور پادریوں سے ہوئی۔ قدیم آسمانی کتابوں کے کچھ حصے سنے۔ چونکہ اس کی طبیعت میں دینداری تھی، بہت جلد متاثر ہو گیا۔ شراب چھوڑ دی۔ ٹاٹ پہننے لگا۔ بتوں پر اعتقاد نہ رہا۔ دین ابراہیمی کی بابت اس کا ایک شعر ہے:

كل دين يوم القيامة عند الله　　　الا دين الحنيفة زور

قیامت کے دن اللہ کے یہاں دین حنیفی کے سوا ہر دین باطل ہوگا

ایک نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

الحمد لله ممسانا ومصبحنا　　　بالحمد صبحنا ربي ومسانا

رب الحنيفة لم تنفد خزائنه　　　مملوءة طبق الآفاق سلطانا

الا نبي لنا منا فيخبرنا　　　ما بعد غايتنا من رأس محيانا

تعریف خدا کی ہے صبح و شام جو ہماری صبح و شام بخیر کر رہا ہے۔ دین ابراہیمی کا رب ہے، اس کے خزانے بھرے ہوئے ہیں کبھی ختم نہیں ہوتے۔ سارے جہان پر اس کی فرماں روائی ہے۔ کیا ہمارا کوئی پیغمبر نہیں جو ہمیں بتائے

کہ ہماری زندگی کی ابتدا اور انتہا میں کتنا فاصلہ ہے۔

اس کے ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مخلص شخص تھا، اور اس کو خدا کے پیغمبر کی تلاش تھی مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک "مرد کامل" کے لئے اپنے شوق کا اظہار کرتا ہے۔ حالاں کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوگ خود اس کو وہ مرد کامل مان لیں اور اس کی پرستش شروع کر دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس کے اپنے زمانہ میں ہوئی۔ مگر آپ پر ایمان لانے کے بجائے وہ آپ کے خلاف حسد کرنے لگا۔ اس نے کہا: "مجھے امید تھی کہ نبوت مجھے ملے گی"۔ اس کے بعد وہ لوگوں کو آپ کے خلاف اکسانے لگا۔ غزوۂ بدر میں جو مخالفین اسلام قتل ہوئے تھے، ان کا مرثیہ لکھ کر لوگوں کو بھڑکاتا رہا۔ جب اپنی تخریبی کوششوں میں اسے کامیابی ہوتی نظر نہ آئی تو وہ اپنی بیٹی کو لے کر یمن کی آخری حدود کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے پھر طائف آیا اور وہیں مرگیا۔ آخر وقت میں اس کی زبان پر یہ اشعار تھے:

کل عیش وان تطاول دھرا	منتھی امرہ الی ان یـزولا
لیتنی کنت قبل ماقد بدا لی	فی رؤس الجبال ارعی الوعـولا
اجعل الموت نصب عینیک واحذر	غولۃ الدھر ان للدھر غـولا

زندگی خواہ کتنی ہی لمبی ہو۔ اس کا انجام بہر حال زوال ہے۔

کاش اس حالت کے رونما ہونے سے پہلے میں پہاڑوں کی چوٹیوں میں ہوتا اور وہاں پہاڑی بکروں کو چرایا کرتا۔

تو موت کو اپنا نصب العین بنا اور زمانہ کی آفتوں سے ڈرتا رہ کیونکہ زمانہ اچانک پکڑ لیتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بار اس کے کچھ اشعار سنائے گئے جس میں توحید کے مضامین تھے، ان کو سن کر آپ نے فرمایا: "اس کی زبان مومن تھی اور اس کا دل کافر"

بائبل کی زبان میں

تم نے بہت امید رکھی مگر تم کو تھوڑا ملا

بنی اسرائیل کے نبی حجی، جن کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح ہے، کی ایک کتاب موجودہ عہد نامہ قدیم میں شامل ہے، وہ اپنی قوم کو متنبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تم نے بہت سا بویا پر تھوڑا کاٹا۔ تم کھاتے ہو پر آسودہ نہیں ہوتے۔ تم پیتے ہو پر پیاس نہیں بجھتی۔ تم کپڑے پہنتے ہو پر گرم نہیں ہوتے۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ رب الافواج فرماتا ہے کہ اپنی روش پر غور کرو۔ تم نے بہت امید رکھی اور دیکھو تھوڑا ملا۔ اور جب تم اسے اپنے گھروں میں لائے تو میں نے اسے اڑا دیا۔"

"رب الافواج فرماتا ہے کیوں۔ اس لئے کہ میرا گھر ویران ہے۔ اور تم میں سے ہر ایک اپنے گھر کو دوڑا چلا جاتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں ابھی خداوند کے گھر کی تعمیر کا وقت نہیں آیا۔ تب خداوند کا کلام حجی نبی کی معرفت پہنچا کہ کیا تمہارے لئے مسقف گھروں میں رہنے کا وقت ہے جب کہ یہ گھر ویران پڑا ہے۔ اب رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی روش پر غور کرو۔"

اعتدال سے ہٹنے کے بعد

نظام ایک معتزلی تھا۔ معتزلہ کے عقیدہ کے مطابق اس کا کہنا تھا کہ "گناہ کبیرہ کا مرتکب ہمیشہ جہنم میں جلے گا"۔ اور چونکہ شراب پینا گناہ کبیرہ میں سے ہے۔ اس لئے شراب پینے والا ہمیشہ جہنم میں جلے گا۔ ابونواس نے اپنے ایک قصیدہ میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا:

فقل لمن یدعی فی العلم فلسفۃ

حفظت شیئا وغابت عنک اشیاء

اس شخص سے کہہ دو جو فلسفہ کا دعوے دار ہے کہ تم نے ایک چیز یاد کر لی ہے اور بہت سی چیزیں تم سے اوجھل ہیں۔

اصل یہ ہے کہ معتزلہ نے جنت اور جہنم کے اثبات کے لئے اشیاء کے لازمی خواص سے استدلال کیا۔ انھوں نے کہا جس طرح آگ کا نتیجہ گرمی ہے اور برف کا نتیجہ ٹھنڈک۔ اسی طرح اعمال کے بھی لازمی نتائج ہوتے ہیں۔ یہ بات ایک حد تک صحیح تھی۔ مگر وہ اس کو آخری حدود تک لے گئے۔ یہاں تک کہ گناہ کبیرہ کا خاصہ ان کے نزدیک اتنا قطعی بن گیا کہ ارتکاب جرم کے بعد کبھی وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتا تھا۔

معتزلہ کی غلطی یہ تھی کہ وہ بھول گئے کہ یہاں اسباب وعلل کے درمیان خدا کی ذات بھی ہے۔ وہ بندہ کی شرمساری کو پسند کرتا ہے اور توبہ کو قبول فرماتا ہے حتیٰ کہ وہ کسی بندہ کو اس طرح پاک کر دیتا ہے گویا اس سے گناہ ہی سرزد نہ ہوا ہو۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر، وہ اپنے بعض بندوں کے لئے ان کے گناہ کو بھی ثواب کے خانہ میں لکھ دیتا ہے: أُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ۔ (فرقان ۷۰)

اصل کام خلود فی النار والوں کو خلود فی الجنۃ کے دائرہ میں لانا ہے

میں ایک ناخواندہ قسم کا آدمی ہوں، ڈگری بھی بی۔ اے کی ہے وہ بھی انگریزی کی نہیں اردو کی (جامعہ ملیہ دہلی کی!) عربی فارسی میں بھی جنتری ہوں۔ واقفیت بھی اس درجہ کا ہوں کہ تیس برس حجاز مقدس میں ہو گئے، نہ اچھی طرح عربی بول سکتا ہوں نہ لکھ سکتا ہوں، نہ غیر کی امداد کے سوا پوری طرح سمجھ سکتا ہوں۔ یہ تو ہوئی تعلیمی حالت، اخلاقی کمال کا یہ حال ہے کہ ایک ایسے گناہ کا مرتکب ہوں جو نہ بیان ہو سکتا ہے نہ اس کا کوئی مداوا ہے۔ اسلام نہیں پوری انسانیت کا مجرم ہوں، نہ بھٹو کی کوئی حقیقت ہے میرے سامنے، نہ حجاج بن یوسف کی۔ لیکن یہ سب وہ باتیں ہیں کہ کسی کو میری بات پر کان نہیں دھرنا چاہئے، لیکن کہنے پر مجبور ہوں

۱۔ ہماری قوم ایک آوارہ قوم ہے اور اسی لئے ناکارہ — آوارہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کا کوئی مقصد نہیں!

۲ عارضی طور پر کوئی مقصد کسی خطۂ ارضی یا قطعۂ ملی کا بن گیا، بن گیا۔ ورنہ ملی طور پر انفرادی اغراض اور بے مقصدی ہمارا مقصد ہے۔

۳۔ کیا واقعی ہم بے مقصد پیدا کئے گئے ہیں، بے فائدہ، عبث؟

۴۔ نہیں مقصد ہے، خوشنودئ خدا اور رضائے الٰہی، والدخول فی الجنۃ!

۵۔ مگر ان چیزوں کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے، دونوں غیر مرئی اور غیر محسوس ہیں۔

۶۔ دنیا میں ظاہری مقصود: عبادت و اطاعت، مگر اُمم سابقہ کے لئے!

۷۔ ہمارے لئے ساری اصطلاحی عبادات ذریعہ ہیں، مقصود نہیں، ہاں سب سے بڑی عبادت عبدیت کی دعوت۔ وہ ہمارا مقصود قرار دیا گیا۔ اخرجت للناس (للمسلمین نہیں)۔

۸۔ اخرجت للنّاس۔ یعنی برائے اخراج النّاس مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ۔ مِنَ النّارِ اِلَی الْجَنَّۃِ مِنَ الکُفْرِ اِلَی الْاِسْلَامِ

۹۔ یہ مرئی اور محسوس بھی، اس کی چیکنگ (CHECKING) بھی ہو سکتی ہے، محاسبہ بھی ہو سکتا ہے۔

۱۰۔ یہ ہر شخص کا مقصد ہے، مقصد حیات۔ عملاً ایسا فریضہ جیسے نماز، ہر صغیر و کبیر پر واجب۔ ہر حال میں ہر جگہ، مرد و زن، صحیح و معذور سب برابر۔ اس میں وہ رخصت بھی نہیں جو نماز کے لئے عورت کو، اور زکوٰۃ کے لئے غلام کو مل جاتی ہے۔

۱۱۔ ہاں "وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ" کی بنا پر ایک مستقل طائفہ بھی اس کے لئے مقرر یا منتخب ہو سکتا ہے۔ مگر اس طرح کہ ہر شخص مالی اور جانی طور پر اس کے ساتھ اس طرح مربوط و موثوق ہو کہ کسی حال میں اپنے آپ کو قلبی طور پر اس سے جُدا نہ پا سکے۔ مگر کام یہی ہو کہ: "مخلود فی النّار" والوں کو: "مخلود فی الجنّۃ" کے دائرے میں لانا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہی کام تھا، ساری عمر اسی کو انجام

دیتے رہے۔

۱۲۔ ہم کو ایک ہزار سال دیئے گئے، سارا ملک مسلمان ہو سکتا تھا، نہیں اٹھے حکومت ضبط کر لی گئی، ذلیل و خوار ہوئے، لاکھوں نذرِ اجل ہوئے، پھر شراب خور کی نہیں، پیشاب خور کی غلامی میں ڈال دیئے گئے۔ ہزار سال میں سارا ملک مسلمان ہو سکتا تھا۔

۱۳۔ اسپین میں چھ سو سال دیئے گئے، قوت و سطوت اور علم و فن کے ساتھ، نہیں اٹھے، سمندر میں ڈبو دیئے گئے۔ اگر سارا نہیں تو آدھا یورپ تو مسلمان ہو سکتا تھا۔

۱۴۔ خلافتِ عثمانیہ کو سات سو سال دیئے گئے، اسلام کہاں سے کہاں پہنچتا۔ یورپ نہیں امریکہ بھی مسلمان ہو سکتا تھا، سلطنت مٹ گئی، خود ہی برباد ہو گئی۔ آج سارے عالم کی باگ ڈور کفر کے ہاتھ میں ہے، جیسا چاہتے ہیں نچاتے ہیں یہ سب ترکِ دعوت کا نتیجہ ہے۔

۱۵۔ قادیانی اور کچھ نہیں، یہ تو ضرور بتا گیا کہ دعوت دو تو آج بھی لاکھوں مسلمان ہو سکتے ہیں، اور غلط اسلام اس طرح پھیل سکتا ہے تو صحیح اسلام تو کس تیزی سے جائے گا، بلکہ اُن کے ہاں اس کا بھی جواب ہے کہ جب تک مسلمان خود کامل مسلمان نہیں بن جائیں گے، وہ دعوت کے نااہل ہیں۔

۱۶۔ تاریخِ اسلام میں ہزاروں نہیں لاکھوں ہی عالم پیدا ہوئے خدا معلوم کیا قصہ ہے، ہر ایک نے اس کو شجرِ ممنوعہ ہی سمجھا، چاروں طرف سے گھر گئے تو مدافعت تو ضرور فرمائی، مگر ہجوم کو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔

۱۷۔ غزالیؒ، رومیؒ، سب اصلاحِ نفس اور اصلاحِ مسلمین میں لگے رہے، کسی نے اس ضرورت کو ضرورت، فریضہ کو فریضہ، مقصد کو مقصد نہیں گردانا۔

۱۸۔ یہودیوں کا ایک مقصد ہے، دو ہزار برس بعد اس کو پا ہی لیا۔ ساری قوم لگی اور ہر دور میں لگی رہی، مسلمانوں کی بیخ کنی اور ہیکل سلیمان کی واپسی۔

۱۹۔ عیسائیت کا ایک مقصد ہے۔ ہر دم، ہر لمحہ، ہر وقت اس میں مشغولی۔ مشن (مقصد) کیا چیز ہے، نام سے ظاہر ہے۔ ساری قوم کا مقصد، غلام اور بادشاہ دونوں کا مقصد (مشنری) مقصد زندگی ہر وقت نظر کے سامنے۔ اُن کی حکومت اور ان کا حاکم بھی اسی لئے ہوتا ہے۔ پوری قوم اسی میں لگی ہوئی ہے۔

۲۰۔ عیسائی دنیا کی مصنوعات میں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جو صلیب سے خالی ہو۔ یہ ان کی سب سے ادنیٰ خدمتِ دین ہے، اس طرح وہ دنیا کے ہر گھر میں عیسائیت کا شعار پہنچاتے ہیں، بلکہ گھروں کو ان نشانوں سے بھر دیتے ہیں۔ ہمارے شاہوں اور گداؤں دونوں کے گھر ان نشانوں سے آباد ہیں، مزین ہیں۔ خود حرمین شریفین کی جانمازوں اور قالینوں پر ہزاروں صلیبیں بنی ہوئی ہیں اور عمارتیں تو بنائی جاتی ہیں صلیب کی بنیاد پر۔!

۲۱۔ کیا یہ نفس کا دھوکا نہیں ہے کہ پہلے اپنے آپ کو بنا لیں، پھر دوسروں کو دعوت دیں گے؟ ہزار برس ہو گئے آج تک تو بنے نہیں، دس ہزار برس مزید درکار ہیں۔ (قادیانیوں کی مثال بھی اسی دھوکے کا جواب ہے!)

یہ سب ترکِ دعوت کا نتیجہ ہے

۴۲۔ تحریکِ خلافت میرے بچپن اور لڑکپن کی چیز ہے، جلسوں میں نظمیں پڑھتے تھے۔ عورتوں کے مجمع میں جاکر چندہ جمع کرتے تھے۔ اس وقت تو کبھی خیال بھی نہیں آیا، اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے، ہم جھولیاں بھر بھر کر لاتے تھے اور کبھی ایک چھلا اس میں سے لینے کا خیال نہیں پیدا ہوا۔ مقصدِ عالی اخلاق کو خود بنا دیتا ہے۔ ہزاروں، لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان یکایک بن گئے تھے۔ جامعہ ملیہ بھی اس کا ایک مظہر تھی۔ قرآن کی تلاوتیں اور تہجد کی نمازیں ایک فیشن بن گئی تھیں۔

۴۳۔ مقصدِ مشترک کے لئے جب متحد ہوتے ہیں (اور مقصدِ مشترک خود ہی متحد کر دیتا ہے!) تو آپس کے اختلاف دب جاتے ہیں، کام مسلسل ہو تو فنا بھی ہو سکتے ہیں، یہی ہم نے خلافت میں دیکھا، یہی آپ متحدہ محاذ میں دیکھ رہے ہیں۔

۴۴۔ ہمارے ہاں سیکڑوں فرقے پیدا ہی اس لئے ہوئے کہ ملت کے سامنے کوئی مشترک مقصد نہیں تھا۔ آج مقصد کی تڑپ پیدا ہو جائے، ساری حماقتیں ختم ہو جائیں گی۔

> یہ ایک مکتوب ہے جس کو میثاق (لاہور) بابت مارچ۔ اپریل ۱۹۷۸ سے یہاں نقل کیا گیا ہے، مکتوب نگار کا نام و پتہ یہ ہے:
> عبدالقیوم (عبدالملک)
> ص۔ب ۲۷۴، مدینہ منورہ
> ۲۰ جنوری ۱۹۷۸

●●●

موجودہ صدی کے ربع اول کے آخر میں خلافت تحریک اٹھی اور سارے ملک میں طوفان کی طرح پھیل گئی۔ یہ تحریک اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے سیاسی تھی۔ مگر تحریک نے جو نعرے اور دلائل استعمال کئے وہ سب مذہبی تھے۔ چنانچہ جو لوگ اس تحریک سے متاثر ہوئے ان میں مذہبیت اتنے زور شور کے ساتھ پیدا ہوئی کہ "قرآن کی تلاوتیں اور تہجد کی نمازیں بھی عام فیشن بن گئیں"

یہ مثال بتاتی ہے کہ کس طرح ایک سیاسی تحریک بھی مذہبی اخلاقیات پیدا کر دیتی ہے۔ اگرچہ اس قسم کی اخلاقیات کی کوئی اسلامی قیمت نہیں۔ اسلامی قیمت صرف ان اخلاقیات کی ہے جو جہنم کے شعلوں کو دیکھ کر آدمی کے اندر ابھری ہو نہ کہ سیاسی مسائل کو دیکھ کر ——— دنیا کے لحاظ سے ان اخلاقیات کی اہمیت ہے جو دیر پا ہوں اور آخرت کے لحاظ سے وہ اخلاقیات اہمیت رکھتی ہیں جو خدا کے سامنے جوابدہی کے احساس سے ابھری ہوں۔ مگر ہنگامی تحریکوں میں دونوں میں سے کوئی قدر بھی موجود نہیں ہوتی۔

ایک عبرت انگیز واقعہ

تولیخان (چنگیز خاں کا پوتا) ۶۵۵ھ میں چنگیز خاں کے تخت حکومت پر بیٹھا۔ یہ حکومت اس وقت چین سے لے کر یورپ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسلامی سلطنت بہت ضعیف حالت میں تھی۔ عیسائی، مجوسی اور یہودی مغلوں کے دربار میں رسوخ حاصل کر کے اسلام اور مسلمانوں سے ان کو متنفر کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اباقا خاں ابن ہلاکو خاں نے خراسان سے تولیہ خاں کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ مجھ کو یہودیوں اور مجوسیوں نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کی کتاب قرآن میں لکھا ہے کہ مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو، آپ کا اس تعلیم کے متعلق کیا خیال ہے۔ اگر مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ ہم کو جہاں پائیں قتل کریں تو ایسی حالت میں مسلمانوں کی قوم کا دنیا میں باقی رہنا ہمارے لئے ایک مستقل اندیشہ کا باعث ہے۔ تولیہ خاں اسلام سے متاثر تھا چنانچہ اپنی حکومت میں اس نے ایک وزیر مسلمان بھی رکھا تھا جس کا نام امیر احمد بناکتی تھا۔ اباقا خاں کی اس عرضداشت کو پڑھ کر تولیہ خاں نے بعض مسلمان علماء کو بلایا اور پوچھا کہ کیا تمھارے قرآن میں ایسا حکم موجود ہے۔ انھوں نے کہا "ہاں یہ حکم قرآن میں ہے" تولیہ خاں نے کہا کہ پھر تم ہم کو قتل کیوں نہیں کرتے۔

انھوں نے جواب دیا کہ اس وقت ہم قوت نہیں رکھتے۔ جب قوت پائیں گے، تم کو قتل کر دیں گے۔ تولیہ خاں نے کہا کہ اب چونکہ ہم قدرت رکھتے ہیں لہذا ہم کو چاہئے کہ ہم تمھیں قتل کریں۔ یہ کہکر اس نے ان علماء کو قتل کرا دیا اور حکم جاری کیا کہ مسلمانوں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ یہ خبر مولانا بدر الدین بیہقی اور مولانا حمید الدین سمرقندی کو ملی تو وہ تولیہ خاں کے دربار میں گئے اور کہا کہ آپ نے مسلمانوں کے قتل عام کا حکم کیوں جاری کیا۔ تولیہ خاں نے کہا یہ بتاؤ "اقتلوا المشرکین"، کا حکم جو تمھارے قرآن میں ہے، اس کا کیا مطلب ہے۔ دونوں عالموں نے کہا کہ عرب کے بت پرست جو مسلمانوں کے قتل پر ہمہ تن آمادہ تھے۔ ان کی نسبت خدا نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ اپنی حفاظت کے لئے ان کو قتل کرو۔ یہ حکم تمھارے لئے نہیں ہے کیونکہ تم تو خدا کی وحدانیت کے قائل ہو اور اپنے فرمان کے اوپر خدا کا نام ہمیشہ لکھتے ہو۔ یہ سن کر تولیہ خاں بہت خوش ہوا اور اسی وقت حکم صادر کیا کہ میرا پہلا حکم جو مسلمانوں کے قتل کی نسبت جاری ہوا اس کو منسوخ سمجھا جائے (۸۰ – ۳۷۹)

سطحی علم اور گہرے علم کا فرق اس واقعہ سے واضح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کے پاس گہرا علم نہ ہو، اس کو چاہئے کہ چپ رہے نہ کہ بے معنی باتیں بول کر غیر ضروری مسائل پیدا کرے۔

پیغمبر عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت اس لئے ہوئی تھی کہ وہ انسان کو نظری اور عملی ہر اعتبار سے، وہ راستہ بتا دیں جس پر چل کر انسان، خواہ وہ فرد ہو یا جماعت، نصرت الٰہی کا استحقاق حاصل کرے اور اپنی دنیا و آخرت کو کامیاب بنائے۔ اسی معنی میں کہا گیا ہے:

خَیْرُ الْهَدْیِ هَدْیُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ — سب سے بہتر طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے

وہ بادشاہ ہو کر بھی

اعتراف کرنا جانتے تھے

معاویہ بن ابی سفیان (۶۰۵ – ۶۸۰ء) نے اپنی خلافت کے زمانہ میں جمعہ کا خطبہ دیا اور کہا :

ایہا الناس ان المال مالنا والفیئ فیئنا۔ من شئنا اعطینا ومن شئنا منعنا

اے لوگو، ساری دولت ہماری دولت ہے اور سارا مال غنیمت ہمارا مال ہے۔ ہم جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں۔

کسی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ جب دوسرا جمعہ آیا تو انھوں نے پھر یہی بات دہرائی۔ مگر کوئی نہ بولا۔ پھر جب تیسرا جمعہ آیا تو معاویہ نے پھر یہی بات کہی۔ اب ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا :

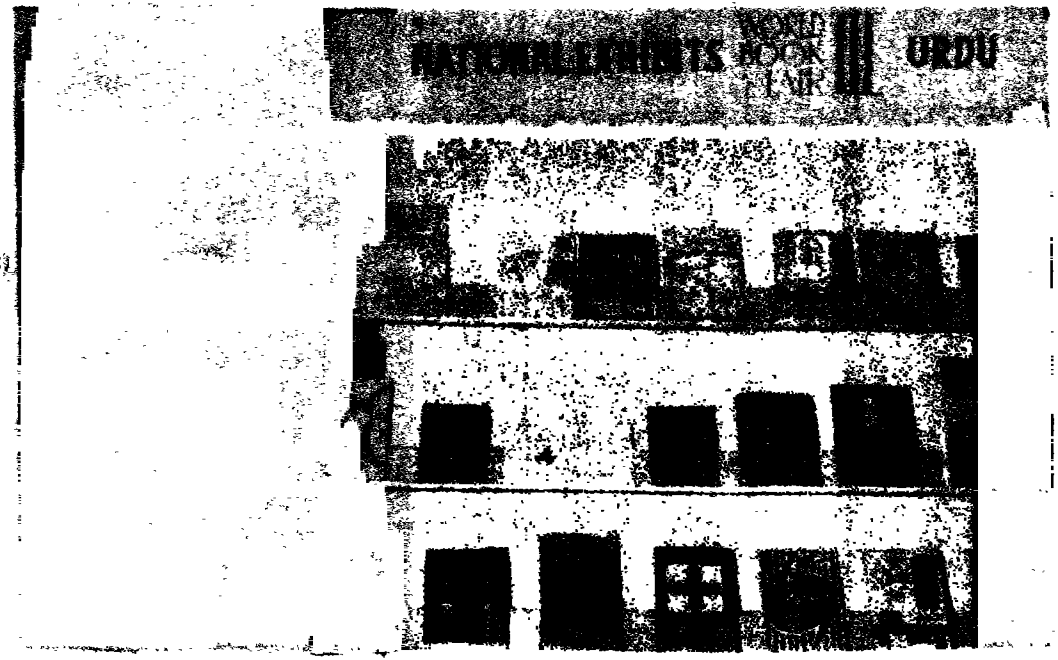
کلا، انما المال مالنا والفیئ فیئنا، من حال بیننا و بینہ حکمنا ہ الی اللہ باسیافنا

ہرگز نہیں۔ مال ہمارا ہے۔ مال غنیمت بھی ہمارا ہے۔ جو شخص ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہوگا، ہم اپنی تلوار کے ذریعہ اس کا فیصلہ اللہ کے پاس لے جائیں گے۔

یہ سن کر معاویہ منبر سے اتر آئے۔ اس شخص کو بلوایا۔ جب اسے معاویہ کے پاس داخل کیا گیا تو لوگ کہنے لگے کہ یہ شخص مارا گیا۔ لیکن معاویہ نے دروازے کھول دیئے۔ لوگ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ شخص معاویہ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ معاویہ نے کہا: اللہ اس شخص کو زندہ رکھے، اس نے مجھے زندہ کر دیا (ان ھذا احیانی احیاہ اللہ) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "میرے بعد کچھ امراء ایسے آئیں گے جو باتیں کہیں گے مگر ان کا جواب نہیں دیا جائے گا۔ ایسے لوگ آگ میں بندروں کی طرح داخل ہوں گے۔ میں نے ایک بات کہی تھی، کسی نے اس کی تردید نہ کی تو مجھے ڈر ہوا کہ میں ان امراء میں داخل نہ ہو جاؤں۔ میں نے دوبارہ وہی بات کہی۔ پھر بھی کسی نے جواب نہ دیا۔ تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں انھیں لوگوں میں سے ہوں۔ پھر میں نے تیسرے جمعہ میں وہی بات کہی تو یہ شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے میری تردید کی۔ اللہ اسے زندہ رکھے۔ اس نے مجھے زندہ کر دیا۔ اب مجھے امید ہے کہ اللہ مجھے ایسے امراء کے زمرہ سے نکال دے گا۔ پھر معاویہ نے اس شخص کو انعام دیا۔

الذہبی : تاریخ الاسلام، جلد ۲، صفحہ ۳۲۱

بعض اوقات آدمی کا کام اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ اعتقادی اختلافات اس کو قبول کرنے میں مانع نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر زمخشری (۴۶۷ – ۵۳۸ھ) معتزلی تھا اور ابن منظور (۶۳۰ – ۷۱۱ھ) شیعہ۔ مگر ان کی حیثیت تفسیر کشاف اور لسان العرب کو عام اہل سنت کے درمیان مقبول بنانے میں مانع نہ ہو سکی کیونکہ انھوں نے ایسی کتابیں تیار کیں جن کے مثل اس موضوع پر دوسری کوئی کتاب نہیں۔



نئی دہلی کی تیسری ورلڈ بک فیر (فروری ١٩٧٨) کا ایک منظر۔ کتابوں کی قطار میں "کتاب سبز" دکھائی دے رہی ہے۔

BOOKS ON DISPLAY AT THE THIRD WORLD BOOK FAIR, NEW DELHI (Feb 19[illegible])
THE GREEN BOOK (AL-KITAB-UL-AKHZAR) CAN BE SEEN IN THE SECON[illegible]

کتابوں کی عالمی نمائش

WORLD BOOK FAIR III

NEW DELHI
HALL OF NATIONS
PRAGATI MAIDAN

11-20 FEBRUARY 1978

DAILY 1-30 TO 8 P.M.
SUNDAYS 10-30 A.M. TO 8 P.M.

Inauguration by

SHRI B. D. JATTI, Vice-President of India on 11.2.1978 at 11-15 a.m.

Presided over by:

DR. P. C. CHUNDER, Union Minister of Education & Social Welfare.

ORGANISED BY NATIONAL BOOK TRUST INDIA

کتابوں کی بین اقوامی نمائش ہندوستان میں پہلی بار ۱۹۷۲ میں نئی دہلی میں ہوئی۔ دوسری بار ۱۹۷۶ میں۔ اور اب اس قسم کی تیسری نمائش ہمیشہ سے زیادہ بڑے پیمانہ پر جون ۱۹۷۸ء میں نئی دہلی میں ہوئی ہے۔ نئی دہلی اب بین اقوامی کتابی نمائش کے شہروں کے کلب کا ممبر ہو چکا ہے۔ ان شہروں میں فرینک فرٹ، لیپزگ، وارسا، بلگریڈ، قاہرہ، مانٹریل، سنگاپور، ٹوکیو، ماسکو وغیرہ شامل ہیں۔

نئی دہلی کی تیسری بین اقوامی کتابی نمائش میں ملکی اور غیر ملکی شرکا کی تعداد توقع سے زیادہ ہو گئی۔ چنانچہ پرگتی میدان میں ۱۴۰۰۰ مربع میٹر جگہ اس کے لئے مخصوص کرنی پڑی جو پچھلی دونوں نمائشوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ امریکہ، انگلستان، روس، مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی، ہالینڈ، زیکوسلاوکیہ، بلگریڈ، ہنگری، رومانیہ، سوئزرلینڈ، یوگوسلاویا، کینیا، زمبیا، غانا، سنیگال، عراق، مصر، کویت، بنگلہ دیش، پاکستان، سنگاپور، جاپان، انڈونیشیا، نیوزی لینڈ وغیرہ ۳۵ غیر ملکوں کے ۲۰۰ ناشرین نے اس موقع پر شرکت کی اور اس نمائش میں اپنا اسٹال لگایا۔ ہندوستان کے جن ناشرین نے اس میں شرکت کی، ان کی تعداد تقریباً ۳۰۰ ہے۔ ان کے علاوہ اقوام متحدہ اور متعدد دوسرے ملکوں نے اپنے اطلاعاتی دفاتر اس موقع پر قائم کئے۔

پرائیویٹ اداروں کے علاوہ ہندوستان کے مختلف مرکزی اور ریاستی اداروں نے نمائش میں اپنے اپنے اسٹال کھولے۔ تاہم تین بڑی عمارتوں اور ان کے درمیانی پارک میں پھیلی ہوئی اس وسیع نمائش میں سب سے زیادہ غلبہ انگریزی کتابوں کا رہا۔ دوسرے نمبر پر ہندی کتابیں تھیں۔ اور اس کے بعد اردو اور دوسری علاقائی زبانوں کی کتابیں نیز غیر ملکی زبانوں کی کتابیں مثلاً روسی، جرمن، جاپانی، عربی، فارسی وغیرہ۔

اس موقع پر کتابوں کی نمائش کے علاوہ دوسری معاون تقریبات کا پروگرام بھی رکھا گیا۔ مثلاً کتابوں کی اشاعت کے مختلف پہلوؤں پر سمینار، ایک چار روزہ بین اقوامی سمینار بھی ہوا جس میں دنیا کے مختلف حصوں کے ماہرین نے تعلیمی مطبوعات کے بارے میں بحث و مباحثہ کیا۔ اسی طرح نمائش کے دوران متعدد دوسرے پروگرام ہوتے رہے۔ مثلاً فیڈریشن آف انڈین پبلشرس کی طرف سے ریفریشر کورس، فیڈریشن آف پبلشرس اینڈ بک سیلرس ایسوسی ایشن کی طرف سے بین اقوامی کتابی صنعت پر لکچر اور ٹریننگ کورس اور مصنفین کا کنونشن وغیرہ

عرب - اسرائیل

اردن کے شاہ عبداللہ کو ۱۹۵۱ میں مسجد اقصیٰ (یروشلم) میں قتل کر دیا گیا تھا۔ ان کو قتل کرنے والا ایک فلسطینی انتہا پسند تھا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۷۷ کو مصر کے صدر انور السادات نے مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کی۔ اور صحیح و سالم قاہرہ واپس آگئے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ۲۶ سال پہلے مسجد اقصیٰ کی زمین پر مسلمانوں کا غلبہ تھا آج وہاں یہودی قابض ہو چکے ہیں۔ فلسطین کی بازیابی کے بارے میں عربوں نے اور ساری دنیا کے مسلمانوں نے جو پالیسی اختیار کی اگر اس میں انھیں خدا کی مدد حاصل ہوتی تو ناممکن تھا کہ آغاز تحریک میں جہاں وہ تھے اس سے آج اتنا زیادہ پیچھے چلے جاتے۔

اسرائیل کے بارے میں عربوں اور ساری دنیا کے مسلمانوں کی پالیسی اب تک یہ رہی ہے کہ اس کے وجود کو سرے سے تسلیم نہ کیا جائے۔ مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر نے اسی موقف کو بھدے الفاظ میں اس طرح ادا کیا تھا:

نحن ابناء الفراعنة سنغرقكم في البحر

ہم فرعونوں کی اولاد ہیں۔ ہم تم کو سمندر میں دھکیل دیں گے۔

مگر آج مصر اور دوسرے مسلم ممالک اس کو تسلیم کرنے کے لئے اپنے کو راضی کر چکے ہیں، صرف اس شرط پر کہ اسرائیل اپنے بعد کے مقبوضات عربوں کو واپس کر دے! الٹی سمت میں یہ کامیاب سفر بھی عجیب ہے۔

آپ بیتی

جون ۱۹۶۵ کا واقعہ ہے۔ میں نینی تال کے ایک اسکول میں فزکس کا استاد تھا۔ ایک لڑکا میرے پاس ٹیوشن کے طور پر پڑھنے آتا تھا۔ اس کا نام وزیر سنگھ تھا عمر تقریباً سترہ سال تھی۔ ایک روز وہ کسی قدر دیر سے آیا۔ حال یہ تھا کہ قمیص [illegible] ہونٹوں سے خون جاری، بال بکھرے ہوئے۔ اس کا یہ حلیہ دیکھ کر میں نے خیریت دریافت کی۔

اس نے بتایا کہ وہ آرہا تھا کہ راستہ میں ایک مقام پر ایک رکشہ والے سے اس کا ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے بعد لڑکے میں اور رکشے والے میں تو تو میں میں ہوئی اور دونوں لڑ گئے۔ رکشے والا سردار تھا اور اپنے ظاہری حلیہ میں تھا۔ مگر لڑکا بے داڑھی مونچھ اور بغیر پگڑی تھا۔ بظاہر یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ سردار ہے۔

لڑائی میں رکشے والے نے لڑکے کو پٹک دیا۔ اور مارنے لگا۔ اتنے میں لڑکے نے پنجابی زبان میں رکشے والے کو برا بھلا کہا۔ یہ سن کر رکشے والا ٹھٹھک گیا۔ اس نے پوچھا:

"تم کون ہو، تمھارا نام کیا ہے"

"وزیر سنگھ"

"کیا تم سردار ہو"

"ہاں"۔

اس کے بعد رکشے والا فوراً اٹھ گیا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا۔ سردار سردار کو نہیں مارتا" اس نے کہا اور دونوں گرد جھاڑتے ہوئے اپنے اپنے راستہ پر چلے گئے۔

سید حیدر علی ایم۔ ایس۔ سی (پیدائش ۱۹۴۴) دہلی

اپنے لاشعور کو پڑھئے

محمد جاوید اقبال بی۔اے (پیدائش ۱۹۴۸) نگینہ ضلع بجنور کے رہنے والے ہیں۔ آج کل دہلی میں مقیم ہیں۔ ایمرجنسی کے دوران گرفتار ہوئے تھے۔ ان کو سنٹرل جیل (ناسک روڈ) میں رکھا گیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ جیل میں ان کے ساتھیوں میں سے ایک عبدالستار صاحب (پربھنی) تھے۔ ستمبر ۱۹۷۷ کی ایک مجلس میں انھوں نے یہ واقعہ بتایا۔

میری بھابی عرصہ سے بیمار رہتی تھیں۔ ان کو پیٹ کے عارضے تھے۔ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ مختلف حکیموں اور ڈاکٹروں کا علاج ہوتا رہا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بالآخر میں نے تجویز کیا کہ موصوفہ کو کسی نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ ہم ان کو حیدرآباد لے گئے اور وہاں ایک مشہور نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھایا۔ ان کی فیس ۵۰۰ روپیہ تھی۔

ڈاکٹر نے مریضہ کو دیکھا۔ مختلف قسم کے سوالات کئے۔ مگر مرض کی جڑ معلوم نہ ہو سکی۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے ایک انجکشن دیا۔ یہ بے ہوشی کا انجکشن تھا۔ مگر وہ آدمی کو پوری طرح بے ہوش نہیں کرتا۔ بلکہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پہنچا دیتا تھا۔

نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مریضہ کا شعور دب جائے اور لاشعور ابھر آئے۔ اب ڈاکٹر کے لئے ان کے لاشعور سے ربط قائم کرنا ممکن ہو گیا۔ ڈاکٹر نے موصوفہ سے سوال و جواب شروع کیا۔ نیم بے ہوشی کی وجہ سے مریضہ اب بھی سنتی تھی اور سوال کا جواب دیتی تھی۔ مگر یہ جواب اس کے لاشعور سے آتا تھا نہ کہ شعور سے۔

ڈاکٹر سوال و جواب کے ذریعہ موصوفہ کے لاشعور کو کریدتا رہا۔ بالآخر معلوم ہوا کہ اصل بات یہ ہے کہ موصوفہ کے بچے جب چھوٹے تھے تو ان کو اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر میں مر گئی تو میرے بچوں کا کیا ہوگا۔ وہ برباد ہو جائیں گے۔ یہ اندیشہ عرصہ تک موصوفہ کو پریشان کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ان کے لاشعور کا جزء بن گیا۔ لڑکے بڑے ہو گئے۔ ان میں سے کوئی کاروبار کا کام بھی کرنے لگا۔ اب بظاہر اندیشہ کی کوئی وجہ باقی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ خود مریضہ نے بھی اس انداز سے سوچنا چھوڑ دیا۔ شعوری طور پر اب یہ سوال ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ "میں مر جاؤں گی تو میرے بچوں کا کیا ہوگا"۔ مریضہ اب اپنے خیال میں بچوں کے مستقبل کی طرف سے مطمئن تھی۔ مگر ان کی بیماری بدستور جاری تھی۔

ڈاکٹر نے موصوفہ کے لاشعور سے ربط قائم کرنے کے بعد اندازہ کیا کہ بچوں کے مستقبل کا اندیشہ اگرچہ اب ان کے شعوری ذہن میں موجود نہیں ہے، مگر وہ ان کے لاشعور کا جزء بن کر اب بھی پوری طرح باقی ہے اور یہی دراصل ان کی بیماری کا سبب ہے۔ اس تشخیص کے بعد علاج آسان تھا۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں ڈاکٹر نے موصوفہ سے جو گفتگو کی اس میں اس نے ان کے لاشعور میں یہ خیال ڈالا کہ وہ بالکل تندرست ہیں اور وہ مرنے والی نہیں ہیں۔ ان کے بچوں کے لئے کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ ہوش میں آنے کے چند دن بعد موصوفہ کی حالت میں

نمایاں فرق تھا۔ چند مہینوں کے وقفہ سے یہ عمل تین بار کیا گیا۔ ہر بار موصوفہ کو نیم بے ہوش کر کے ڈاکٹر ان کے لاشعور میں یہ خیالات ڈالتا کہ وہ بالکل تندرست ہیں اور ہرگز مرنے والی نہیں ہیں۔ ان کے بچوں کے لئے کسی قسم کے اندیشہ کا کوئی سوال نہیں ہے ۔ تیسری بار مریضہ بالکل اچھی ہو چکی تھیں۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لاشعور کس طرح آدمی کے اوپر اثر انداز ہوتا رہتا ہے جدید نفسیات نے ثابت کیا ہے کہ آدمی کا بیشتر عمل اس کے لاشعور کے زیر اثر واقع ہوتا ہے۔ ہماری محبت اور نفرت، ہمارا اتفاق اور اختلاف، ہماری تعریف اور تنقید، ہماری رائیں اور فیصلے، زیادہ تر لاشعور سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں بہت کم حصہ ہمارے شعور کا ہوتا ہے۔ کوئی شخص جب ایک چیز کو قبول اور دوسری چیز کو رد کر دیتا ہے تو بظاہر اس لئے کرتا ہے کہ ایک چیز اس کو ٹھیک معلوم ہوئی اور دوسری غلط نظر آئی۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ یہ بڑی حد تک اس کے لاشعور کا کرشمہ ہوتا ہے۔ برسہا برس سے وہ جس قسم کے افکار و خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ دے رہا تھا، وہ سب اس کے لاشعور میں جمع ہو رہے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے اس کے لاشعور کو ایک خاص نہج پر ڈال دیا۔ اب جو چیز اس کے سامنے آتی ہے وہ خالص ذاتی وصف کی بنیاد پر اس کا جائزہ نہیں لے پاتا۔ اس کے لاشعور میں جو مزاج بنا ہوا ہے وہ اندر اندر اپنا کام کر کے آدمی کی رائے قائم کرنے کی قوت کو ایک سمت میں موڑ دیتا ہے۔

اس کا تجربہ نہایت آسانی سے اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ کسی شخص کے سامنے دو ایسے آدمیوں کا معاملہ پیش کیا جائے جن میں سے ایک ان کا پسندیدہ شخص ہو اور دوسرے کو وہ ناپسند کرتا ہو۔ بالکل ایک درجہ کی غلطی کو دونوں کی طرف منسوب کیا جائے۔ اپنے مبغوض شخص کی غلطی فوراً اس کی سمجھ میں آجائے گی۔ وہ اس پر شدید رد عمل کا اظہار کرے گا۔ اس کے برعکس اپنی پسندیدہ شخصیت کے بارے میں وہ ٹھیک اسی درجہ کی غلطی کی تاویل کرے گا۔ اس کا غلطی ہونا اس کو نظر ہی نہ آئے گا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ آدمی پوری طرح مخلص ہوگا۔ ایسا نہیں ہوگا کہ وہ جان بوجھ کر دو متضاد رویے اختیار کر رہا ہو۔ اسے مطلق خبر نہیں ہوگی کہ وہ ایک ہی معاملہ میں دو متضاد رویے اختیار کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ لاشعور کے تحت بول رہا ہوگا نہ کہ شعور کے تحت۔

مگر اس "انجان" غلطی کے لئے انسان کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ آدمی کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے لاشعور کی رکھوالی کرے۔ وہ لاشعور کو غلط بننے سے روکے۔ تاہم لاشعور میں غلط باتوں کے داخلہ کو مکمل طور پر روکا نہیں جا سکتا۔ اس لئے آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ خود فکری کی صلاحیت پیدا کرے۔ وہ خود اپنے خلاف سوچے۔ حتیٰ کہ اپنے لاشعور کو دیکھنے لگے۔ جب اس کا لاشعور کسی سے غلط قسم کی محبت اور کسی سے غلط قسم کی نفرت کا جذبہ ابھارے تو وہ جان لے کہ یہ داعیات کہاں سے آرہے ہیں۔

ہر وہ شخص جو یہ چاہتا ہو کہ آخرت میں اس کو رسوا نہ ہونا پڑے، اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے لاشعور سے باخبر ہونے کی کوشش کرے ◆◆

فرد کا جھکنا قوم کا سربلند ہونا ہے

لارڈ سالسبری (۱۹۰۳-۱۸۳۰) ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ حکومت میں برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ اس زمانہ میں کار کا رواج نہ تھا۔ وزیر اعظم سالسبری اپنی سائیکل پر سوار ہو کر جا رہے تھے۔ ایک مقام پر وہ سڑک کے غلط رخ سے گزرنے لگے۔ سڑک پر متعین کانسٹبل نے انھیں روکا۔ وزیر اعظم نے کانسٹیبل کو بتایا کہ میں وزیر اعظم ہوں اور چوں کہ مجھے عجلت تھی اس لئے مجھ سے ٹریفک کے ضابطہ کی خلاف ورزی ہو گئی۔ کانسٹبل نے جواب دیا کہ میں اپنی ڈیوٹی کو بجالانے والا کانسٹبل ہوں۔ میرا فرض صرف یہ ہے کہ کہ ٹریفک کی خلاف ورزی نہ ہونے دوں۔ چوں کہ آپ ایک سفید ریش بزرگ ہیں اس لئے میں صرف اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ آپ کا چالان نہ کروں۔ لیکن اتنا آپ کو بہر حال کرنا پڑے گا کہ آپ واپس جائیں اور جہاں سے سڑک شروع ہوتی ہے وہاں سے سیدھی سمت میں آئیں۔ وزیر اعظم نے بے چون و چرا ٹریفک کانسٹبل کا حکم مان لیا۔ نیز اس واقعہ کا ذکر ملکہ وکٹوریہ کے پرائیویٹ سکریٹری سے خود کر کے اس فرض شناس کانسٹبل کو خراج تحسین پیش کیا۔

برطانیہ کے دوسرے وزیر اعظم مسٹر بالڈون (۱۹۴۷-۱۸۶۷) کا واقعہ ہے۔ وہ اپنی کار میں سفر کر رہے تھے۔ ایک چوراہہ پر کار رکی۔ ٹریفک کی قطار میں ان کی گاڑی پیچھے تھی۔ راستہ کھلا تو ڈرائیور نے قبل اس کے کہ آگے کی موٹریں گزریں، وزیر اعظم کی موٹر آگے نکال لینے کی کوشش کی۔ ٹریفک کانسٹبل نے فی الفور روکا۔ ڈرائیور نے کہا کہ وزیر اعظم صاحب کو سرکاری کام کی وجہ سے جلدی ہے۔ کانسٹبل نے کہا، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ موٹر نشین کون ہے۔ قانون کی رو سے ٹریفک کی پابندی عام شہری اور وزیر اعظم دونوں پر لازم ہے۔ یہ سن کر وزیر اعظم نے موٹر سے اتر کر کانسٹبل سے معافی مانگی اور ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ کانسٹبل کے حکم کی تعمیل کرے۔

نیشنل ہیرالڈ جنوری ۱۹۷۸)

لیڈر اپنے کو اصول کے آگے جھکائے تو ساری قوم اصول کے آگے جھکنے والی بن جاتی ہے اور یہی کسی قوم کی طاقت کا سب سے بڑا راز ہے

سیاست کا راز

ابو فراس حمدانی عباسی دور کا شاعر ہے۔ وہ اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے:

اذا ما ارسل الامراء جیشا

الی الاعداء ارسلنا الکتابا

یعنی ہماری دھاک کا یہ عالم ہے کہ جہاں دوسرے امراء کو مقابلہ کرنے کے لئے لشکر بھیجنا پڑتا ہے، وہاں ہم صرف خط بھیج دیتے ہیں اور وہی فیصلہ کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک شعر میں شاعر نے سیاست کا راز بتا دیا ہے، سیاست یہ نہیں ہے کہ حریف سے لڑائی بھڑائی جاری رکھی جائے۔ سیاست یہ ہے کہ اپنے آپ کو اتنا طاقت ور اور مستحکم بنا لیا جائے کہ جب ضرورت پڑے تو صرف ایک "تحریر" بھیج دینا معاملہ کو ختم کرنے کے لئے کافی ہو۔

رائے سے رجوع

سورۂ انعام آیت ۹ (وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ) کی تفسیر میں ایک شاذ قول اس مفہوم کا ہے کہ "ہم ان کو وہی کپڑے پہناتے جو کپڑے یہ لوگ پہنتے ہیں۔" راقم الحروف نے ایک سوال کے جواب میں اسی قول کو ترجیح دی تھی (الرسالہ اکتوبر ۱۹۷۶ دسمبر ۱۹۷۶)

مگر بعد کی تحقیق سے مجھ پر واضح ہوا کہ آیت کا یہ مفہوم درست نہیں ہے۔ درست مفہوم وہی ہے جس کو جمہور مفسرین نے لیا ہے۔ یعنی اس سے مراد اشتباہ و التباس ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کا کہنا تھا کہ خدا کو اگر اپنا دین بھیجنا تھا تو فرشتہ کے ذریعہ کیوں نہ بھیجا۔ اس کے جواب میں قرآن میں کہا گیا کہ اگر ہم فرشتہ کے ذریعہ ہدایت بھیجتے تو اس کو بھی آدمی کی صورت میں بھیجتے تاکہ اشتباہ کا پہلو باقی رہے۔ انسان اس دنیا میں حالت امتحان میں ہے، اس لئے اعلان حق کا جو بھی ذریعہ اختیار کیا جائے، بہر حال حکمتِ امتحان کا تقاضا ہوگا کہ التباس واشتباہ کا پردہ باقی رکھا جائے۔ حق کا اپنی عریاں شکل میں آنا در اصل مہلت امتحان کا ختم ہونا ہے۔ اس کے بعد انسان رب العالمین کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے، نہ کہ ظلم و فساد جاری رکھنے کے لئے اس کو زمین پر باقی رکھا جائے۔

فرشتہ اگر پیغام بر بنکر آئے تو سنت الٰہی کی بنا پر وہ بھی انسان کی شکل میں آئے گا، اور اس وقت یہ لوگ اس انسان نما فرشتہ کے باب میں بھی وہی اشکالات اور احتمالات اور وہی کج بحثیاں پیدا کریں گے اور وہی کٹ حجتی نکالیں گے جو آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کر رہے ہیں۔

اگلی آیت میں کہا گیا ہے: "اور تم سے پہلے بھی پیغمبروں کے ساتھ تمسخر کیا گیا ہے پھر ان لوگوں کو جو پیغمبروں کی ہنسی اڑاتے تھے، عذاب نے آگھیرا (انعام ۱۰)۔ قرآن میں بار بار اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ بائبل میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے۔ یہاں بائبل کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

" اور خداوند ان کے باپ دادا کے خدا نے اپنے پیغمبروں کو ان کے پاس ہر وقت بھیج بھیج کر پیغام بھیجا۔ کیوں کہ اسے اپنے لوگوں اور اپنے مسکن پر ترس آتا تھا۔ لیکن انھوں نے خدا کے پیغمبروں کو ٹھٹھوں میں اڑایا اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا۔ اور اس کے نبیوں کی ہنسی اڑائی۔ یہاں تک کہ خداوند کا غضب اپنے لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا۔
(۲۔ تواریخ، ۳۶: ۱۶۔۱۷)

التباس کا پردہ نہ ہوتا تو نبیوں کا یہ انجام نہیں ہو سکتا تھا۔

وحید الدین ۱۰ مارچ ۱۹۷۸

کسی نے اپنی دنیوی زندگی کو کامیاب بنا لیا ہو تو اکثر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کی آخرت بھی ضرور کامیاب رہے گی۔ حالاں کہ دونوں میں کوئی لازمی تعلق نہیں۔

ایک سفر

مارچ ۱۹۷۸ کا تیسرا ہفتہ میوات میں گزرا۔

اس سفر کا اصل مقصد یہ تھا کہ چند دن شہر سے دور کھلی فضا میں گزارے جائیں۔ شہروں کی دنیا بڑی حد تک مصنوعی دنیا ہوتی ہے مگر جب آدمی آبادیوں سے دور کھلی فضا میں ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ قدرت کے قریب پہنچ گیا ہے۔ وہ ایک ایسے آفاقی آئینہ کے سامنے ہے جہاں وہ خدا کو براہ راست دیکھ سکتا ہے۔

میں نیم کھیڑا (ضلع گوڑگاؤں) کے باہر اوجینا ڈرین کے ٹیلے پر کھڑا تھا۔ آسمان کی وسعتیں، پہاڑوں کی بلندیاں، زمین کے قدرتی مناظر میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ "انسانوں کی دنیا سے دور خدا کی دنیا کتنی حسین ہے"، میری زبان سے نکلا۔ خدا نے دو چیزوں میں اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے۔ ایک، عالم کائنات (یدبر الامر) کی سطح پر۔ دوسرے، الہامی شریعت (یفصل الآیات) کی سطح پر۔ اول الذکر مقام پر وہ براہ راست اپنی مرضی کو نافذ کر رہا ہے۔ ثانی الذکر مقام پر وہ چاہتا ہے کہ انسان خدا کی مرضی کو جانے اور بطور خود اس کو اپنی زندگی میں نافذ کرے۔

"کیا خدا کی دونوں دنیاؤں میں تضاد ہے"

میرے دل نے کہا۔ "کیا تدبیر امر کی سطح پر خدا کچھ اور ہے اور تفصیل آیات کی سطح پر کچھ اور۔ بقیہ کائنات کو خدا انتہائی محکم قوانین کی بنیادوں پر چلا رہا ہے۔ مگر انسانوں سے اس کو مطلوب ہے کہ وہ خوابوں اور کرامتوں کی ایک پراسرار دنیا بنا کر اس کی طلسماتی فضا میں زندگی گزاریں۔ خدا کو شیشم یا چنار کا ایک درخت اگانا ہو تو وہ سو سال کا خاموش منصوبہ بناتا ہے۔ مگر اپنے بندوں سے وہ چاہتا ہے کہ نعروں اور تقریروں کا طوفان اٹھا کر آناً فاناً اپنے مستقبل کو بدل ڈالیں۔ ستاروں اور کہکشاؤں کی دنیا میں وہ ہر آن متحرک ہے۔ مگر مدرسوں اور خانقاہوں میں وہ جمود اور تقلید پر راضی ہو گیا ہے۔ پھولوں اور پتیوں میں وہ خوش ذوقی کا دریا بہا رہا ہے۔ ہوا کے جھونکوں اور پانی کے جھرنوں میں وہ لطافت کا خزانہ بکھیر رہا ہے۔ آسمانوں کی وسعت اور پہاڑوں کی بلندی میں وہ خاموش عظمتوں کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ مگر انسانوں سے وہ چاہتا ہے کہ وہ گدھے اور کوّے کی طرح چیخیں اور احتجاج اور مطالبات کی غوغا آرائی کریں۔ چہچہاتی ہوئی چڑیوں سے لے کر روشن ستاروں تک۔ ہری بھری گھاس سے لے کر نیلے آسمان تک ہر طرف انتہاء حکمت و معنویت نظر آتی ہے۔ ہر جگہ انتہائی بامعنی سرگرمیاں جاری ہیں، مگر اپنے بندوں سے خدا ایسی عبادات پر راضی ہے جس میں کچھ رٹے ہوئے الفاظ کو زبان سے دہرا لینے سے بڑے بڑے مقامات طے ہوتے ہیں اور عالی شان جنتیں حاصل ہو جاتی ہیں"

حقیقت یہ ہے کہ جو دین آج مقررین اسلام اور مفکرین ملت ہر طرف تقسیم کر رہے ہیں، اس کو دین کہنا اس قرآن پر اتہام ہے جس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ ویسا قرآن سارے جن و انس مل کر بھی تصنیف نہ کر سکیں۔ ایسا دین خدا کی اس عظیم و حسین کائنات کے اندر ایک مسخرہ پن کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کائنات کی سطح پر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ خدا کی دنیا رنگ اور خوشبو بکھیرنے والے پھولوں اور پیار اور بے نفسی کا سبق دینے والی چڑیوں کے لئے ہے۔

مگر دین کے ٹھیکیدار آج جس دین کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا خدا کی جنت نکمے لوگوں کا کباڑ خانہ ہے یا مسخروں کی نمائش گاہ۔

یہ بات آج لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر جب صور پھونکا جائے گا اور ساری حقیقتیں کھل جائیں گی، اس وقت لوگ اس کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیں گے۔ اگرچہ اس وقت کا دیکھنا کسی کے کام نہ آئے گا۔

یہاں چند مجلسوں میں وعظ و نصیحت کا موقع بھی ملا۔ زیادہ تر حدیثیں اور صحابہ کے واقعات سنائے گئے۔ ایک تقریر کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

جب مجھ کو کہیں تقریر کرنی ہوتی ہے تو ہمیشہ ایک سوال میرا پیچھا کرتا ہے "کیا بات ہے جو میں کہوں" واقعہ یہ ہے کہ کوئی بات ایسی نہیں جو کہی نہ جا چکی ہو۔ عربی شاعر عنترہ کا ایک شعر ہے:

هل غادر الشعراء من متردم

کیا پچھلے شعراء نے کوئی پیوند لگانے کی جگہ باقی چھوڑی ہے جس کو ہم پورا کریں۔

دینی اور اخلاقی لحاظ سے یہ بات اور زیادہ صحیح ہے حقیقت یہ ہے کہ کہنے والے ساری بات کہہ چکے ہیں۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ سننے والوں کا قافلہ سننے سے پہلے جس راستہ پر چل رہا تھا، اسی راہ پر سننے کے بعد بھی چلا جا رہا ہے۔ گویا اصل مسئلہ کہنے کا نہیں ہے۔ اصل مسئلہ کہنے کو پکڑنے کا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کے لئے کوئی تیار نہیں۔

میوات میں تین سو سال پہلے ایک صوفی شاعر گزرے ہیں۔ ان کے اشعار اکثر میواتیوں کو یاد ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

پی پیارے کے دیس کی بڑی کٹھن ہے گیل
کوئی کوئی جائیگو بھیک جی سلجھا سلجھا بیل

میں سمجھتا ہوں کہ آدمی اگر پکڑے تو یہی ایک شعر اس کی اصلاح کے لئے کافی ہے۔ بھیک جی کہہ رہے ہیں کہ آخرت کا راستہ بڑا کٹھن ہے۔ یہ جھاڑیوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہی شخص منزل پر پہنچے گا جو جھاڑیوں سے بچ بچ کر چلے جو اس قسم کا اہتمام نہیں کرے گا وہ راستے میں الجھ کر رہ جائے گا۔

میو لوگ کس حد تک اس پر عمل کر رہے ہیں، اس کے لئے میں یہیں کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ کل (۱۸ مارچ ۱۹۷۸) صبح دس بجے ہم گاؤں کے باہر تھے۔ وہاں سرکار کی طرف سے بند بنایا جا رہا ہے۔ سینکڑوں مرد، عورتیں مٹی ڈھونے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک عورت جو مٹی کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے تھی، ایک مرد نے اس سے کہا کہ "یہاں مٹی ڈال"۔ اس پر عورت بگڑ گئی۔ "تو کون ہوتا ہے بتانے والا" اس نے کہا۔ پہلے لفظی تکرار ہوئی۔ اس کے بعد دونوں طرف سے لاٹھیاں آگئیں۔ کچھ لوگ مرد کی طرف سے اور کچھ عورت کی طرف سے جمع ہو گئے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔

یہ سارے کے سارے مسلمان تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ایک مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کی جان، مال، آبرو حرام ہے۔ مگر جب ایک "جھاڑی" آگئی تو اس سے بچ کر نکلنے کے لئے وہ تیار نہ ہوئے۔ وہ جھاڑی سے الجھ گئے۔ وہ بھول گئے کہ اس طرح وہ اپنی آخرت کی منزل کو کھوٹا کر رہے ہیں۔

آپ لوگ داڑھی بھی رکھتے ہیں۔ نماز اور تسبیح بھی پڑھتے ہیں۔ مگر جہاں کوئی جھاڑی آئی، اس میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ خدا کا فکر دلوں میں پیدا نہیں ہوا۔ ہم نے آخرت کو اپنی منزل نہیں بنایا۔ ہاتھ میں تسبیح کیوں نہ ہو، عملاً سارے لوگ دنیا کی منزل کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ صرف یہ ہے کہ کوئی "بے داڑھی" ہو کر اس طرف بھاگ رہا ہے، کوئی داڑھی اور تسبیح لئے ہوئے اس مقدس سفر میں مشغول ہے۔

مومن کا ہر مسئلہ آخرت کا مسئلہ ہے۔ مگر ہماری زندگی میں جب کوئی صورت پیش آتی ہے تو ہم فوراً اس کو دنیا کا مسئلہ بنالیتے ہیں۔ مثلاً لڑکی کی شادی کو لیجئے۔ ایک مومن کے گھر میں شادی کا معاملہ ہو تو خواہ کتنا ہی قرآن و حدیث سنایا جائے، وہ اسی طرح شادی کرے گا جس طرح عام دنیا پرست کرتا ہے۔ خواہ اس کی قیمت سودی قرض اور کھیت کا رہن ہی کیوں نہ ہو۔

کوئی شخص آپ کو سخت بات کہہ دے۔ کسی سے آپ کو تکلیف پہنچ جائے تو آپ چاہتے ہیں کہ اس کو مٹا ڈالیں۔ اس کی معاشیات کو تباہ کر دیں۔ اس کی عزت کو خاک میں ملا دیں۔ یہ سب اس لئے ہے کہ آدمی بھول جاتا ہے کہ اس کے اور اس کے فریق کے درمیان خدا کھڑا ہوا ہے جو سارے طاقت وروں سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اگر معاملہ کا یہ پہلو ذہن میں ہو تو اپنے کسی بھائی کو ذلیل کرنے کا خیال مضحکہ خیز حد تک بے معنی معلوم ہو۔ کیوں کہ عزت اس کے لئے ہے جس کو خدا عزت دے اور ذلیل وہ ہے جو خدا کی نظر میں ذلیل قرار پائے۔

ہر کسان جانتا ہے کہ ٹونے ٹوٹکے سے کوئی کھیت اپنی فصل نہیں اگاتا۔ مگر خدا کی جنت جو تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے، اس کے متعلق فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ کچھ الفاظ زبان سے دہرا کر یا کچھ رسمی اعمال ادا کر کے مل جائے گی۔ یہ عظیم انسان بھول ہے۔ خدا کی پوری کتاب نطق کی زبان میں اور خدا کی ساری کائنات خاموشی کی زبان میں اس کا انکار کر رہی ہے۔

مومن وہ ہے جو ہر مسئلہ کو آخرت کا مسئلہ سمجھے، جو آخرت کی عزت و ذلت کو اہمیت دے نہ کہ دنیا کی عزت و ذلت کو۔

اسلامی تعلیم

اسلامی تعلیم ایک دوطرفہ منصوبہ ہے۔ اس کا ایک مقصد یہ ہے کہ مسلم نسلوں میں علم دین کا تسلسل باقی رکھا جائے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہر دور کے اہل ایمان کو شعوری اعتبار سے اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنے زمانہ کے فکری مسئلوں پر دین کی معرفت حاصل کر سکیں۔ پہلے مقصد کے حصول کا دائمی ذریعہ قرآن اور اسوۂ رسول کی تعلیم ہے۔ مگر دوسرے مقصد کے لئے کوئی دائمی نصاب نہیں ہو سکتا۔ اس کا تعین اس دور کے علمی و ذہنی حالات سے ہوتا ہے جس دور کے لئے نصاب مقرر کرنا مقصود ہو۔

MODERNISERS IN RETREAT

Orthodoxy Sweeping Muslim World

موقع پرستی اور سطحیت کی زمین پر دین حق کا محل کھڑا نہیں ہو سکتا

پیرس سے فرانسیسی زبان کا ایک میگزین شائع ہوتا ہے جس کا نام ہے LE NOUVEL OBSERVATEUR ستمبر ۱۹۷۷ کے پہلے ہفتہ کی اشاعت میں اس میں مصر کے کچھ ادیبوں کا ایک مشترک مضمون چھپا ہے جس میں اس بات پر اظہار خیال کیا گیا ہے کہ حال میں کس طرح اکثر مسلم ملکوں میں "روایت پرست مذہبی طبقہ" اچانک ابھر آیا ہے۔ قریب میں جن لوگوں نے مسلم ملکوں کے سفر کئے ہیں یا جو مختلف مسلم ملکوں میں چھپنے والی تازہ کتابوں اور اخبارات و رسائل سے باخبر ہیں، وہ آج کل کثرت سے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا کے شرق اوسط کے نمائندہ دلیپ بیڈ گاونکر نے اس سلسلہ میں ایک مفصل جائزہ شائع کیا ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۱ ستمبر ۱۹۷۷)

دو سو برس پہلے جب مغربی طاقتیں مسلم دنیا پر چھا گئیں تو تمام مسلم ملکوں میں اسلام کے احیاء کی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں جو موجودہ صدی کے وسط تک جاری رہیں۔ اب دوبارہ، اگرچہ نسبتاً کم تر شدت کے ساتھ، تمام مسلم ملکوں میں اسلام کے نام پر سرگرمیاں ابھر آئی ہیں۔ پچھلی تحریکیں باہر کی نوآبادیاتی طاقتوں کے جواب میں اٹھی تھیں، موجودہ تحریکوں کا نشانہ خود اپنے ملکوں کا سیکولر اور جدت پسند طبقہ ہے۔ اس لحاظ سے موجودہ تحریکوں کا حریف ان کے پیش رووں کے مقابلہ میں بہت کمزور ہے۔ تاہم تقریباً یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح نوآبادیاتی تسلط کے خلاف اٹھنے والی تحریکیں اپنے اصل مقصد (غلبۂ اسلام) میں مکمل طور پر ناکام رہیں، موجودہ تحریکیں بھی اپنے اصل مقصد (احیائے اسلام) میں قطعاً ناکام ثابت ہوں گی۔ وقتی ہنگاموں اور نمائشی فتوحات کے سوا خدا کے دین کو ان سے کچھ ملنے والا نہیں ہے۔

وجہ بالکل سادہ ہے۔ یہ تحریکیں حقیقۃً کسی الٰہیاتی جذبہ کے تحت نہیں اٹھی ہیں۔ یہ محض پٹرول کی دولت ہے جس نے اچانک انھیں زندگی دے دی ہے۔ روایتی ذہن اور روایتی علم رکھنے والے لوگ پچھلے سو سال سے اپنے ملکوں میں دبے ہوئے تھے۔ مسلم معاشرہ کے تمام اہم شعبوں پر مغربی تعلیم یافتہ اور جدت پسند لوگ قابض تھے۔ روایتی طبقہ نہ تو ان لوگوں کے زیر اثر قائم شدہ حکومتی شعبوں کو سنبھالنے کی اہلیت رکھتا تھا نہ ان کے انتظام کے تحت ہونے والے اجتماعات اور کانفرنسوں میں خطابت کا کمال دکھانے کی قوت اپنے اندر پاتا تھا۔

روایت پرست طبقہ مسلسل اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ ان کو زیر کر سکے اور تمام شعبوں کو ایسی سطح پر لائے جہاں اس کے لئے اپنی صلاحیتوں کے مطابق غالب کردار ادا کرنا ممکن ہو سکے۔ یہاں پٹرول کی دولت

کے مالکوں نے ان کی مدد کی کیونکہ دونوں کا مفاد کم از کم جزوی طور پر، ایک ہو گیا تھا۔

پٹرول کی دولت جن ملکوں میں ظاہر ہوئی ہے، ان میں سے اکثر ملکوں میں شیوخ اور ملوک حکمراں ہیں۔ جدت پسند مسلمان، جن کا ذہن جمہوریت اور سوشلزم کے تصورات سے بنا ہے، وہ ان کو قبول نہیں کر رہے تھے۔ ان حکمرانوں کو مسلسل ان کی طرف سے جوابی انقلاب کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ مصر، عراق، شام، لیبیا میں یہ گروہ ملوکیت کے ادارہ کو ختم کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ دوسرے ملکوں میں ان کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ ایران کے بادشاہ کو مصدق نے معزول کرنے کی ناکام کوشش کی۔ جمال عبدالناصر نے سعودی عرب میں ملوکیت کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ کویت کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ شیخ کویت کے اختیارات کو کم کر کے جمہوریت لانا چاہتا ہے۔

یہی صورت حال کم و بیش اکثر ممالک میں پائی جاتی ہے۔ ان حالات میں شیوخ و ملوک نے، دوسری حفاظتی کوششوں کے ساتھ، ایک تدبیر یہ اختیار کی ہے کہ نہ صرف اپنے ملکوں میں بلکہ ساری مسلم دنیا میں روایت پرست طبقہ کو ابھارا جائے۔ جدت پسند طبقہ کے زور کو گھٹایا جائے۔ اس طرح انھیں امید ہے کہ وہ اپنی پوزیشن کو مضبوط کر سکیں گے۔

ان حالات میں جو لوگ سیاسی اچھل کود کر رہے ہیں یا تقریر و تحریر کے کمالات دکھا رہے ہیں، وہ صرف موقع پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اور عوام میں سے جو ان تماشوں پر خوش ہو رہے ہیں، وہ سطحیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ موقع پرستی اور سطحیت کی زمین پر دین حق کا محل کھڑا ہو جائے۔ کم از کم موجودہ دنیا میں اس قسم کا واقعہ ظہور میں نہیں آسکتا۔ ایسے معجزات دکھانے کے لئے ہمیں دوسرے زمین و آسمان بنانے پڑیں گے۔

* * * * * * * * * * * * * * * * * *

خارجی ختم ہو گئے
خارجیت زندہ ہے

ایک بار خارجی فرقہ کے چالیس آدمیوں نے ابن زیاد کے دو ہزار سپاہیوں کو مار بھگایا تھا۔ اس پر ایک خارجی شاعر نے فاتحانہ نظم لکھی۔ چند اشعار یہ ہیں:

أألفا مومن فیما زعمتم
ویقتلکم بآسک اربعونا
کذبتم لیس ذاک کما زعمتم
ولکن الخوارج مومنونا
ھی الفئة القلیلة قد علمتم
علی الفئة الکثیرة ینصرونا

کیا تم اپنے گمان کے مطابق دو ہزار مومن تھے اور تم کو مقام آسک پر صرف چالیس نے مار بھگایا، تم جھوٹے ہو اور تمھارا خیال غلط ہے، درحقیقت خوارج مومن ہیں، تم نے جان لیا کہ یہی وہ تھوڑی جماعت ہے جو بڑی جماعت پر غالب آتی ہے۔

خارجی شاعر کی اس دلیل کو آج کوئی بھی تسلیم نہیں کرے گا۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ آج بھی ہمارے درمیان بے شمار لوگ ہیں جو اس قسم کی وقتی اور ظاہری کامیابیوں کو اپنی صداقت کا لازمی ثبوت سمجھتے ہیں ——— خارجی فرقہ دنیا سے ختم ہو گیا، مگر خارجیت آج بھی دنیا میں زندہ ہے۔

وضعی قانون اور الٰہی قانون

راسکو پاونڈ (۱۹۶۴ – ۱۸۷۰) نے قانون کا مقصد سماجی انجینیرنگ (SOCIAL ENGINEERING) بتایا ہے۔ یہ بیان یقیناً صحیح ہوتا بشرطیکہ پاونڈ (ROSCOE POUND) یہ بھی ثابت کرسکتا کہ انسانی سماج کل پرزوں کا ایک مجموعہ ہے۔ مگر بدقسمتی سے امریکی پروفیسر کے لئے یہ ثابت کرنا ممکن نہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں وضعی قانون کی اس کم نصیبی کا راز چھپا ہوا ہے جس کی بنا پر وہ ڈھائی ہزار سالہ کوششوں کی تاریخ رکھنے کے باوجود اب تک اپنا کوئی قابل قبول اصول قانون دریافت نہ کرسکا۔

ایک شخص جب اصول قانون کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے سامنے تقریباً ایک درجن بڑے بڑے اسکولوں کے نام آتے ہیں۔ مگر فنی تفصیلات سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو ان مدارس فکر کو اصولی طور پر دو قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک، نظریاتی اصول قانون (IDEOLOGICAL JURISPRUDENCE) جو اس تلاش میں مصروف ہے کہ "قانون کو کیسا ہونا چاہئے" (LAW AS IT OUGHT TO BE)۔ دوسرے، تحلیلی اصول قانون (ANALYTICAL JURISPRUDENCE) جو قانون کی تعبیر ویسی ہی کرنا چاہتا ہے "جیسا کہ وہ ہے" (LAW AS IT IS)۔ اصول قانون کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ دونوں قسم کے اسکول کسی قابل قبول نتیجہ تک پہنچنے میں مکمل طور پر ناکام رہے ہیں۔ علمائے قانون جب قانون کی تشریح ثانی الذکر اصول کی روشنی میں کرتے ہیں تو انھیں اس تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ قانون کا منطقی جواز ان کے ہاتھ سے نکل گیا اور جب اول الذکر اصول کی روشنی میں قانون کو سمجھنا چاہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسی کسی چیز کی دریافت ممکن ہی نہیں۔

ایک طرف وہ علمائے قانون ہیں جو قانون کو محض اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ انسانی سماج کا ایک خارجی ڈھانچہ ہے، اس لئے اس کو معلوم قواعد وضوابط کی روشنی میں ٹھیک اسی طرح بنایا جاسکتا ہے جیسے عجائب خانہ میں جانوروں کے لئے کٹہرا بنایا جاتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر کی ایک وکالت جان آسٹن (۱۸۵۹ – ۱۷۹۰) کا مشہور نظریہ تھا جس میں اس نے کہا:

LAW IS WHAT IS IMPOSED BY A SUPERIOR ON AN INFERIOR,
BE THAT SUPERIOR THE KING OR THE LEGISLATURE.

یعنی قانون ان احکام کا نام ہے جو سیاسی طور پر اعلیٰ ہستی کی طرف سے سیاسی طور پر ادنیٰ ہستی کے اوپر نافذ کیا گیا ہو۔ یہ اعلیٰ ہستی خواہ بادشاہ ہو یا مقننہ۔

جان آسٹن (JOHN AUSTIN) کا یہ نظریہ بظاہر ایک قابل عمل نظریہ ہونے کے باوجود منطقی صحت سے مکمل

طور پر محروم ہے۔ کیونکہ یہ قانون ساز کو یہ مقام دے دیتا ہے کہ اس کا عمل انصاف کے معیاروں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ حالاں کہ انسانی عقل کبھی اس کو قبول نہیں کر سکتی کہ انصاف (JUSTICE) کے تصور کو قانون سے الگ کر دیا جائے۔ قانون جب کسی کے اوپر ایک فیصلہ کا نفاذ کرتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ اسی وقت جائز فیصلہ ہے جب کہ وہ انصاف پر مبنی ہو۔

تاہم آج تمام دنیا میں، عملی طور پر، جان آسٹن ہی کے نظریہ کی حکمرانی ہے۔ نام نہاد آزاد دنیا میں یہ کام بغیر کسی اصولِ قانون کے ہو رہا ہے۔ ایک فرانسیسی قانون داں نے جو بات اپنی حکومت کے بارے میں کہی ہے، وہی دوسری تمام حکومتوں پر بھی صادق آتی ہے:

OUR GOVERNMENT HAS THE POWER BUT NOT THE RIGHT.

ہماری حکومت کے پاس قانون کے نفاذ کے لئے طاقت ہے مگر اس کا اسے کوئی حق نہیں۔

اشتراکی دنیا میں یہ جبری منطق اس سوویت اصول قانون کے تحت نافذ ہے کہ اشتراکی یا سماجی تعلقات (SOCIAL RELATIONSHIPS) ہی کا دوسرا نام قانون ہے۔ اشتراکی دنیا میں چونکہ علمی تحقیق بھی سیاست ہی کا ایک حصہ ہے، اس لئے باہر کی دنیا کے مفکرین کی اس تنقید کا اُس پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ قانون کی یہ سوشلسٹ تفسیر قانون کے معیاری کردار (NORMATIVE CHARACTER) کا انکار کر رہی ہے اور قانون کو گھٹا کر صرف اقتصادی قانون بنا دیتی ہے (IT REDUCES LAW TO ECONOMIC LAW)

اگرچہ عملی طور پر ساری دنیا میں یہی صورت حال ہے کہ سیاسی طاقت کے زور پر قوانین بنتے ہیں اور رائج کئے جاتے ہیں۔ مگر علمائے قانون کا ایک طبقہ اس سے بے نیاز ہو کر اصول قانون کی علمی تلاش میں مصروف ہے۔ تاہم اس کی اب تک کی تلاش نے اُس کو صرف اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ اصول قانون کے معاملہ میں کسی متفقہ معیار تک پہنچنا ممکن نہیں۔ کیونکہ اس تلاش کا مقصد قانونی معیارات (LEGAL NORMS) کا تعین ہے، اور قانونی معیارات کا تعین اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ بنیادی انسانی اقدار کا تعین ہو جائے۔ اور تمام علمار کا فیصلہ ہے کہ اقدار (VALUES) کی دریافت خالص عقلی طریقوں سے ممکن نہیں۔

اصول قانون کا مقصد قانون کی فلسفیانہ بنیاد (فلاسفیکل فاؤنڈیشن) یا اس کی قانونی قدر (لیگل ویلو) تلاش کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اصول قانون کا کام یہ ہے کہ وہ قانون کے لئے وجہ جواز (JUSTIFICATION) فراہم کرے۔ جب تک کوئی قانون اپنی پشت پر قابل قبول اصولِ قانون نہ رکھتا ہو، عقلاً جائز نہیں کہ وہ ان انسانوں کے اوپر نافذ کیا جائے جن کے لئے کسی چیز کی قدر و قیمت جاننے کا واحد معیار عقل ہے۔ چنانچہ معلوم تاریخ کے مطابق انسان ڈھائی ہزار سال سے اس تلاش و جستجو میں مصروف ہے، مگر بے شمار دماغوں کی جدوجہد کے باوجود اب تک وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

قانون کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب انسان لکھنا نہیں جانتا تھا، اس وقت بھی قانون کسی نہ کسی شکل میں

موجود تھا۔ تحریر کی دریافت کے بعد اس کو لکھا بھی جانے لگا۔ سب سے قدیم تحریری قانون جو مل سکا ہے، وہ سمیری بادشاہ حمورابی کا قانون ہے جو ۱۹۰۰ ق م میں وضع ہوا تھا۔ سمیری قوم دجلہ و فرات کی وادی میں رہتی تھی۔

اصولِ قانون پر غور و فکر کا کام، تاریخی ریکارڈ کے مطابق، یونانی فلاسفہ سے شروع ہوا۔ سولن جو قدیم یونان کا مشہور قانون داں تھا، اس کا زمانہ مسیح سے چھ سو سال قبل کا ہے۔ افلاطون (۳۴۷-۴۲۷ ق م) کی کتاب قانون پر قدیم زمانہ کی مشہور ترین کتاب ہے۔ قانونی پیشہ بھی سب سے پہلے روم میں مسیح سے تقریباً پانچ سو سال قبل شروع ہوا۔ پندرھویں صدی تک قانون علم الٰہیات ہی کا ایک جز سمجھا جاتا تھا۔ سولھویں صدی میں وہ نیا ذہن پیدا ہوا جس نے بالآخر قانون کو مذہب سے الگ کر دیا۔ تاہم اب بھی وہ علم سیاست کا ایک جزو بنا رہا۔ انیسویں صدی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے فلسفۂ قانون کو فلسفۂ سیاست سے الگ کیا اور اصول قانون کو ایک مستقل علم کی حیثیت سے ترقی دے کر اس کو اختصاصی مطالعہ کا موضوع بنا دیا۔

قدیم زمانہ کے فلاسفہ کچھ مسلمات سے اپنا اصول قانون اخذ کرتے تھے جن کو وہ فطری حقوق کہتے تھے۔ سولھویں صدی کے بعد یورپ میں جو ذہنی انقلاب آیا، اس نے ثابت کیا کہ یہ مسلمات حقیقۃً مفروضات ہیں جن کے لئے کوئی عقلی دلیل موجود نہیں۔ اس کے بعد فرد کی آزادی سب سے بڑا مسلّمہ قرار پائی جس کو اصول قانون کی بنیاد بنایا جا سکتا تھا۔ مگر صنعتی انقلاب کے نتائج نے بتایا کہ فرد کی آزادی کو اگر خیرِ اعلیٰ (SUMMUM BONUM) مان لیا جائے تو وہ انسانیت کو استحصال اور انارکی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچاتی۔ اب اجتماعی بھلائی (SOCIAL GOOD) کو سب سے بڑا خیر قرار دیا گیا جو قانون سازی کے لئے رہنما اصول کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر جب اس نظریہ کے پیچھے ہی استعمال سے ایک ہولناک سیاسی جبر وجود میں آیا تو معلوم ہوا کہ فرد کی آزادی اگر سماج کے لئے نقصان دہ تھی تو سماجی بھلائی کا یہ نظریہ فرد کو مجبور و مقہور بنا کر رکھ دیتا ہے۔ بیسویں صدی فرد اور سماج کے درمیان مطابقت تلاش کرنے کی صدی ہے۔ موجودہ صدی کے نصف ثانی میں جن مدارسِ فکر کو قبولیت حاصل ہوئی، ان کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی طور پر قانون کی ایسی بنیاد ڈھونڈ رہے تھے جہاں فرد اور سماج کے مختلف تقاضوں کو ہم آہنگ کیا جا سکے۔ مگر یہ تجربہ بھی ناکامی کے سوا کہیں اور پہنچتا ہوا نظر نہیں آتا۔ آج بھی ایسی کتابیں شائع ہو رہی ہیں جن کا ٹائٹل اس قسم کا ہوتا ہے:

LAW IN QUEST OF ITSELF

(قانون خود اپنی تلاش میں) حتیٰ کہ علمائے قانون کے ایک طبقہ نے اپنا یہ آخری فیصلہ دے دیا ہے کہ ایسی کسی کوشش کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں:

A PURELY LOGICAL INTERPRETATION OF LEGAL RULES IS IMPOSSIBLE

قانونی احکام کی خالص منطقی تعبیر ناممکن ہے۔ گسٹاو ریڈبرش (۱۹۴۹-۱۸۷۸) کا کہنا ہے کہ مطلوبہ قانون

Scientifically known صرف بذریعہ اقرار (CONFESSION) اپنایا جا سکتا ہے نہ اس لئے کہ وہ علمی طور پر معلوم ہے۔ ریڈبرش (GUSTAV RADBRUCH) کی مثال کوئی انفرادی مثال نہیں، بلکہ اسی بنیاد پر ایک مستقل مدرسۂ فکر وجود میں آیا ہے جس کو اضافی مدرسۂ فکر کہتے ہیں۔ اس فکر کے حاملین (RELATIVISTS) کا کہنا ہے:

ABSOLUTE JUDGMENTS ABOUT LAW ARE NOT DISCOVERABLE

مطلق قانون قابلِ دریافت نہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اصول قانون کی اصل مشکل یہ ہے کہ وہ جس چیز کی تلاش میں ہے، اس کا براہ راست تعلق مسئلہ اقدار سے ہے اور یہ مسئلہ وہ ہے جہاں انسانی عقل اپنی ساری کوشش کے باوجود کسی متفقہ جواب تک پہنچنے میں قطعاً ناکام رہی ہے۔ ایک طرف یہ صورت ہے کہ انسان، وجدانی طور پر، خیر و شر کا اتنا شدید احساس رکھتا ہے کہ اس کو نہ تو اٹھارویں صدی کے میکانکی فلسفے ختم کر سکے اور نہ سوویت روس کا کلیت پسندانہ نظام، جس کو نصف صدی سے بھی زیادہ طویل عرصہ تک یہ موقع ملا کہ وہ نسلِ انسانی کو اپنے نظریاتی کارخانہ میں ڈھال سکے۔ دوسری طرف یہ مشکل کہ بہترین دماغوں کی ساری کوشش بھی اقدار کا کوئی متفقہ معیار تلاش کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہی ہے۔ سائنس کی ترقی اس کو زیادہ سے زیادہ واضح کرتی جا رہی ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں اقدار اپنا کوئی معروضی مقام (OBJECTIVE STATUS) نہیں رکھتیں۔

جوزف وڈ کرچ (۱۸۹۳–۱۹۷۰) نے اپنی کثیر الاشاعت کتاب (THE MODERN TEMPER) میں اس کا مطالعہ کیا ہے۔ "خواہ انسان کتنی ہی کوشش کرے"، پروفیسر کرچ (JOSEPH WOODKRUTCH) لکھتے ہیں "اس کی روح کے دو نصف مشکل ہی سے باہم متحد ہو سکتے ہیں۔ اور وہ نہیں جانتا کہ وہ اس طرح خیال کرے جیسے کہ اس کی عقل بتاتی ہے کہ اسے خیال کرنا چاہئے، یا وہ اس طرح محسوس کرے جیسے اس کے جذبات اس کو محسوس کراتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنی برباد اور تقسیم شدہ روح کے اندر ایک مضحکہ بن کر رہ گیا ہے"

کرچ کا یہ جملہ اکثر نقل کیا گیا ہے:

MAN IS AN ETHICAL ANIMAL IN AN UNIVERSE
WHICH CONTAINS NO ETHICAL ELEMENT. (16)

انسان ایک اخلاقی جانور ہے ایک ایسی کائنات میں جو اپنے اندر کوئی اخلاقی عنصر نہیں رکھتی۔

کرچ کی غلطی یہ ہے کہ اس نے اپنے دائرہ سے باہر قدم رکھ دیا ہے۔ میں جس بنیادی نکتہ پر زور دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ جو چیز ثابت ہوئی ہے، وہ یہ نہیں کہ اقدار کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہ انسان ان کو دریافت نہیں کر سکتا۔ یہاں میں ڈاکٹر الکسس کیرل (۱۸۷۳–۱۹۴۴) کا حوالہ دوں گا۔ ڈاکٹر کیرل (ALEXIS CARREL) نے اپنی کتاب انسان نامعلوم (MAN THE UNKNOWN) میں دکھایا ہے کہ اقدار کا مسئلہ اتنے مختلف النوع علوم کی کامل واقفیت سے تعلق رکھتا ہے جن کو انسان اپنی محدود عمر میں کسی طرح حاصل

نہیں کرسکتا۔ ان کو حاصل کرکے ان کا تجزیہ کرنا اور نتیجہ نکالنا تو درکنار۔ انھوں نے مزید اس بات کو رد کر دیا ہے کہ ماہرین کی ایک کمیٹی اس مسئلہ کی تحقیق کرکے کسی آخری نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرے، کیونکہ "ایک اعلیٰ آرٹ کی تخلیق ایک ذہن کرتا ہے، اعلیٰ آرٹ کسی اکیڈمی کے ذریعہ کبھی وجود میں نہیں آتا"

سگمنڈ فرائڈ (۱۹۳۹ـ۱۸۵۶) کے وقت سے اب تک نفسیات کے جو مختلف اسکول وجود میں آئے ہیں، وہ باہمی اختلافات کے باوجود اس مشترکہ کوشش میں مصروف رہے ہیں کہ نفسیات کا کوئی اقدار سے آزاد علم (VALUE FREE SCIENCE) وجود میں لائیں۔ مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ ایک صدی کی مسلسل کوششوں کے باوجود وہ اس منزل تک پہنچنے میں بالکل ناکام رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اب ان کے درمیان اس کے خلاف رد عمل شروع ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کا ممتاز ماہر نفسیات ابراہام میسلو (۱۹۷۰ - ۱۹۰۸) جو خود ثبوتی کرداریت (POSITIVISTIC-BEHAVIOURISTIC TRADITION) کے زیر سایہ تیار ہوا تھا، اپنی عمر کے آخری حصہ میں وہ انسانی فطرت کے دور تر گوشے (FARTHER REACHES OF HUMAN NATURE) کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔ میسلو (ABRAHAM MASLOW) کا کہنا ہے:

PSYCHOLOGY HAD VOLUNTARILY RESTRICTED ITSELF
TO ONLY HALF OF ITS RIGHTFUL JURISDICTION.

نفسیات نے اپنے جائز حدود کار کے نصف حصہ سے بطور خود اپنے آپ کو روک لیا۔

الٰہی قانون

وضعی قانون کی ناکامی کے بارے میں اوپر میں نے جو اشارات کئے، وہ ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے اصول قانون کا مطالعہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قانون دانوں کا یہ مفروضہ قطعی طور پر بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے کہ انسان خود اپنے لئے قانونی معیار دریافت کرسکتا ہے۔

اس کے بعد ہمارے سامنے دوسرا مفروضہ آتا ہے اور وہ الٰہی قانون کا مفروضہ ہے۔ الٰہی قانون، جس کا محفوظ اور مستند متن قرآن کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ قانون کا ماخذ خدا کا الہام ہے۔ یعنی یہ کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ خدا نے الہام کے ذریعہ اپنا قانون اپنے رسول پر اتارا ہے یہی قانون انسان کے لئے صحیح ترین دستور العمل ہے۔ اس قانون کی بنیاد پر قیاس اور اجتہاد کرکے مزید قانون سازی ہوسکتی ہے۔ مگر اصولی طور پر اس سے انحراف جائز نہیں۔

میں پیشگی طور پر اعتراف کرتا ہوں کہ خالص علمی اعتبار سے یہ ایک پیچیدہ دعویٰ ہے۔ مگر جو نکتہ خصوصی طور پر قابل لحاظ ہے، وہ یہ کہ اس کی پیچیدگی کے اسباب خود قانون میں ہونا ضروری نہیں۔ وہ اس واقعہ میں بھی ہوسکتے ہیں کہ ہماری عقل کچھ محدودیتوں (LIMITATIONS) کا شکار ہے اور اس بنا پر وہ سارے حقائق کا براہ راست

احاطہ نہیں کرسکتی۔ خوش قسمتی سے جدید سائنس کا موقف اس معاملہ میں ہماری تائید کرتا ہے۔ جدید سائنس نے یہ اعتراف کیا ہے کہ حقائق کی مقدار صرف اتنی ہی نہیں جو براہ راست ہمارے حسیاتی تجربہ میں آتی ہیں۔ بلکہ اس سے آگے اور بھی حقائق ہیں۔ مزید یہ کہ نامعلوم حقائق نہ صرف معلوم حقائق سے مقدار میں زیادہ ہیں بلکہ وہ معلوم حقائق کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور معنی خیز ہیں۔ امریکی پروفیسر فریڈ برتھولڈ (FRED BERTHOLD) نے منطقی ثبوتیت (LOGICAL POSITIVISM) کے فلسفہ کو چند لفظوں میں اس طرح سمیٹا ہے:

THE IMPORTANT IS UNKNOWABLE, AND THE KNOWABLE IS UNIMPORTANT

جو چیز اہم ہے وہ ناقابل دریافت ہے اور جو چیز قابل دریافت ہے، وہ اہم نہیں۔

۱۹ ویں صدی میں یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ انسان کل حقیقت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اگرچہ اس وقت بھی کُلی حقیقت عملاً انسان کی دسترس سے اتنی ہی دور تھی جتنی اس سے پہلے یا اس کے بعد رہی ہے۔ تاہم یہ یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن انسان ضرور اسے دریافت کرلے گا۔ مگر بیسویں صدی کے سائنسداں خود ثبوتیت (POSITIVISM) یا فعلیت (OPERATIONALISM) کے جھنڈے کے نیچے ہم کو بتا رہے ہیں کہ یہ فرض کر لینا بالکل غلط تھا کہ سائنس ہم کو آخری حقیقت (ULTIMATE REALITY) یا خیر (GOOD) کے بارے میں کوئی بات بتا سکتی ہے۔ وقت کا دوسرا فلسفہ جس کو وجودیت (EXISTENTIALISM) کہا جاتا ہے، وہ بھی ہم کو یقین دلا رہا ہے کہ اس کی کوئی صورت نہیں کہ محدود انسان خیر کا ایسا معیار (NORM) دریافت کرسکے جو اس سے ماوراء ہو۔

ان دریافتوں کے بعد انسانی علم اب جس مسئلہ پر پہنچا ہے، وہ یہ کہ قطعی دلائل صرف اس میدان تحقیق میں قائم کئے جاسکتے ہیں جن کو برٹرینڈ رسل (۱۸۷۲—۱۹۷۰) نے چیزوں کا علم (KNOWLEDGE OF THINGS) کہا ہے۔ دوسرا میدان تحقیق جو اس کے الفاظ میں صداقتوں کا علم (KNOWLEDGE OF TRUTHS) سے تعلق رکھتا ہے، ان میں براہ راست دلیل قائم کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ مان لیا گیا ہے کہ ہم کسی معاملہ میں قطعیت (CERTAINTY) تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم صرف یہ کرسکتے ہیں کہ اغلب رائے (PROBABLE JUDGMENT) تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ یہ بات صرف غیر مادی حقائق تک محدود نہیں ہے بلکہ بہت سی وہ چیزیں جن کو مادی حقائق میں شمار کیا جاتا ہے، ان کا معاملہ بھی تقریباً ایسا ہی ہے، جیسے روشنی، یا مقناطیسی قوت کی تشریح۔

میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ فیصلہ کی یہ بنیاد جو جدید علم نے فراہم کی ہے، وہ عین الٰہی قانون کے حق میں ہے۔

الٰہی قانون کا یہ مفروضہ کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے، غالباً جدید انسان کے لئے اتنا زیادہ ناقابل فہم نہیں جتنا اس کا یہ جزو کہ خدا بذریعہ الہام اپنی مرضی انسان کے پاس بھیجتا ہے۔ اکثر بڑے بڑے سائنس داں کسی نہ کسی شکل میں خدا کو مانتے تھے۔ نیوٹن (۱۶۴۲—۱۷۲۷) کے نزدیک نظام شمسی کو متحرک کرنے کے لئے ایک خدائی ہاتھ (DIVINE ARM) کی ضرورت تھی۔ ڈارون (۱۸۰۹—۱۸۸۲) آغاز حیات کے لئے ایک خالق (CREATOR)

کو ضروری سمجھتا تھا۔ آئن سٹائن (۱۹۵۵ - ۱۸۷۹) کو ایک برتر ذہن (SUPERIOR MIND) کی جھلک دکھائی دی جو کائنات کے مظاہر میں اپنے کو ظاہر کر رہا تھا۔ سر جیمس جینس (۱۹۴۶ - ۱۸۷۷) کے مطالعہ نے اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ کائنات "گریٹ مشین" سے زیادہ "گریٹ تھاٹ" معلوم ہوتی ہے۔ سر آرتھر ایڈنگٹن (۱۹۴۴ - ۱۸۸۲) کے نزدیک جدید سائنس ہمیں اس حقیقت تک پہنچا رہی ہے کہ:

THE STUFF OF THE WORLD IS MIND-STUFF

(کائنات کا مادہ ایک شئے ذہنی ہے)۔ الفرڈ نارتھ وائٹ ہڈ (۱۹۴۷ - ۱۸۶۱) کے نزدیک جدید سائنسی معلومات یہ ثابت کر رہی ہیں کہ فطرت ایک زندہ حقیقت ہے نہ کہ بے روح مادہ (NATURE IS ALIVE)

تاہم جہاں تک الہام کا تعلق ہے، مجھے اعتراف ہے کہ خالص علمی اعتبار سے یہ ایک نہایت پیچیدہ عقیدہ ہے۔ یہ ان چیزوں میں سے نہیں جس کا عمومی مشاہدہ کرایا جا سکتا ہو۔ مگر یہ کہنا مبالغہ آمیز نہیں کہ ہمارے تجربہ میں ایسے بہت سے حقائق آتے ہیں جن سے استنباط کیا جا سکتا ہے کہ یہاں ایسی کوئی حقیقت پائی جاتی ہے جس کو الہام سے تعبیر کیا جا سکے۔ جدید میتھڈالوجی اس کو تسلیم کرتی ہے کہ مستنبط حقائق (INFERED FACTS) بھی اتنے ہی یقینی ہو سکتے ہیں جتنے کہ مشہود حقائق (OBSERVED FACTS)۔ اس لئے ہمارے استدلال کی اہمیت اس سے کم نہیں ہوتی کہ وہ مشاہداتی نہیں ہیں بلکہ استنباطی نوعیت کے ہیں۔

۱۹ ویں صدی میں قانون تعلیل (PRINCIPLE OF CAUATION) کو خالق کا بدل سمجھ لیا گیا تھا۔ مگر موجودہ صدی میں ایسے بہت سے واقعات سائنس کے علم میں آئے ہیں جن کی توجیہہ اسباب مادی کے عام اصول کے تحت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ریڈیم کے الکٹران کا ٹوٹنا، جن کو معلوم قوانین کے تحت بیان کرنے کی ساری کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ حتیٰ کہ ایک سائنس داں کو کہنا پڑا کہ ریڈیم کے کسی ٹکڑے میں کون سا الکٹران کس وقت ٹوٹے گا، اس کا فیصلہ کرنا خداؤں کے اختیار میں ہے، خواہ وہ جو بھی ہوں:

IT MAY REST ON THE KNEES OF WHATEVER GOODS THERE BE

حیوانات کا مطالعہ بھی یہی بتاتا ہے۔ حیوانات کے بارے میں ثابت ہو چکا ہے کہ ان کے اندر جو جبلت (INSTINCT) ہوتی ہے، وہ اکتسابی نہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی اپنے چھتہ کو ہشت پہل بناتی ہے۔ کسی تربیت نے اس کو نہیں بتایا کہ ہشت پہل خانہ کے مقصد کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے، حتیٰ کہ وہ اس کی معنویت کا کا بھی کوئی ذاتی شعور نہیں رکھتی۔ اس کے باوجود وہ اس ریاضیاتی طرز تعمیر میں اس طرح مصروف رہتی ہے جیسے اس سے کسی نے کہہ دیا ہو کہ تم ایسا ہی کرو۔ (فَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ، نحل - ۶۸)

اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جو ہمیں اس اغلبیت کی طرف لے جاتے ہیں کہ اشیاء سے باہر کوئی شعور ہے جو اشیاء کو ان کے وظیفۂ حیات کے بارے میں ہدایات دے رہا ہے۔ حتیٰ کہ سر آرتھر اڈنگٹن نے جدید کوانٹم نظریہ کو الہام کی سائنسی تصدیق قرار دیا ہے۔ قرآن کا یہ بیان بیسویں صدی کے انسان کے لئے شاید اس سے زیادہ

قابلِ فہم ہے جتنا وہ ساتویں صدی کے انسان کے لئے ہو سکتا تھا:

وَاَوْحٰى فِىْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (حٰمٓ سجدہ ۱۲-) اور خدا نے ہر آسمان میں اس کا حکم اتارا

اس کے بعد جب ہم انسان کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ جس کو حیاتیاتی حصہ کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا وہ جس کو نفسیاتی حصہ کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا حیاتیاتی حصہ ٹھیک اسی طرح مکمل طور پر خارجی قوانین کا پابند ہے جس طرح کائنات کی دوسری چیزیں اس کی پیروی کر رہی ہیں۔ وہ چیز جس کو میڈیکل سائنس کہا جاتا ہے، اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ان مخفی قوانین فطرت کا پتہ لگائے جس کے تحت انسانی زندگی کا حیاتیاتی حصہ کام کرتا ہے اور اس کو اس حصہ انسانی پر استعمال کرے۔ اب اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ قانون فطرت جو ستاروں اور سیاروں سے لے کر انسان کے حیاتیاتی حصہ تک کارفرما ہے، اس کا ماخذ وہ الہام ہے جو کائناتی شعور کی طرف سے ہر ایک کو پہنچ رہا ہے تو اس کے بعد، اسی پر قیاس کرتے ہوئے، یہ ماننا خود بخود آسان ہو جاتا ہے کہ انسان کے نفسیاتی حصہ کے لئے قانون کا تعین بھی اسی شعور کی طرف سے ہو سکتا ہے اور اسی کی طرف سے ہونا چاہئے۔

خالص عقلی نقطۂ نظر سے کہا جا سکتا ہے کہ اس استدلال کی بنیاد ایک "قیاس" پر قائم ہے۔ مگر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انسان کی ساخت کچھ اس ڈھنگ پر ہوئی ہے کہ قیاسی استدلال سے مفر اس کے لئے ممکن نہیں۔ اگر وہ قیاسی استدلال کو تسلیم کرنے سے انکار کرے تو لازماً اس کو تشکیک کی پناہ گاہ میں جانا پڑے گا۔ جو عملی طور پر ناممکن ہے۔

قرآن نے بھی اس معاملہ میں جواب کا یہی انداز اختیار کیا ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّىْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا — تم سے وحی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وحی خدا کے حکم سے ہے اور تم کو صرف تھوڑا علم دیا گیا ہے

یہاں وحی سے متعلق سوال کے جواب میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ امر رب ہے۔ دوسرے یہ کہ تم کو علم قلیل دیا گیا ہے۔ پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ وحی اسی طرح انسان کے لئے امر رب ہے جس طرح سارا نظام عالم امر رب (قانون فطرت) کے ماتحت ہے۔ یہ کوئی منفرد چیز نہیں بلکہ انسانی دائرہ میں وہی چیز ہے جس کا مشاہدہ تم کائنات کے دائرہ میں کر رہے ہو۔ دوسرے جزو کا مطلب یہ ہے کہ وحی کو عقلی طور پر سمجھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ تم اس حقیقت واقعہ کو تسلیم کرو کہ انسان کو علم قلیل دیا گیا ہے۔ اس کو علم کثیر نہیں دیا گیا۔ اس واقعہ کو مان کر چلوگے تو وحی کی حقیقت سمجھ جاؤ گے اور اگر اس واقعہ کا انکار کر کے سمجھنا چاہو تو تم اس کو نہیں سمجھ سکتے۔

حیرت انگیز بات ہے کہ تیرہ سو برس پہلے کا اعلان آج سائنس کے جدید ترین مرحلہ میں اپنی صداقت کو مزید شدت کے ساتھ ثابت کر رہا ہے۔ پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) کے ساتھ جس نئے دور سائنس کا آغاز ہوا ہے،

اس نے قطعیت کے ساتھ تسلیم کر لیا ہے کہ انسان بعض حیاتیاتی اور نفسیاتی محدودیتوں کا شکار ہے، اس لئے وہ سارے حقائق کو اپنے محسوسات کی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ ضروری ہے کہ اپنے قلت علم کی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے وہ مروجہ سائنسی طریقوں پر بعض ایسے طریقوں کا اضافہ کرے جو انیسویں صدی تک غیر سائنسی سمجھے جاتے تھے۔

آئن سٹائن نے کائنات کے بارے میں جو انقلاب انگیز سائنسی نظریات وضع کئے، اس کے سلسلے میں اس نے اعتراف کیا کہ یہ کام اس طریقہ کی پابندی کر کے نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر، حرکیات گیس کا نظریہ (KINETIC THEORY OF GASES) میں کارآمد ہے۔ یہاں اس نے ترکیبی طریقہ (SYNTHETIC METHOD) کے بجائے تحلیلی طریقہ (ANALYTICAL METHOD) سے کام لیا۔ اس نے سائنسی نظریات کی دو تقسیمیں کیں۔ ایک عمارتی نظریات (CONSTRUCTIVE THEORIES) دوسرے اصولی نظریات (PRINCIPLE-THEORIES) اس نے کہا کہ نظریہ اضافیت (RELATIVITY) کو سمجھنے کے لئے صرف دوسرے قسم کا نظریہ ہی کام دے سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس نے کائنات کے گہرے حقائق کو سمجھنے کے لئے سائنسی مشاہدہ کے بجائے ایک قسم کے سائنسی تصور (SCIENTIFIC CONTEMPLATION) کی وکالت کی۔ چنانچہ ایک پروفیسر نے آئن سٹائن کے نظریہ کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

IN DEALING WITH THE ETERNAL VERITIES, THE AREA OF EXPERIMENT IS REDUCED AND THAT OF CONTEMPLATION ENHANCED.

ابدی حقیقتوں کی بحث میں تجربہ کا دائرہ گھٹ جاتا ہے اور تصور کا دائرہ بڑھ جاتا ہے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک الہامی قانون ہے جو انسان کی رہنمائی کے لئے اتارا گیا ہے۔ یہ بات کہ وہ فی الواقع ایک الہامی قانون ہے، اس کے لئے خود قرآن نے بڑی عجیب دلیل دی ہے۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ انسان کبھی بھی اس کے جیسی کتاب نہ بنا سکے گا، خواہ وہ اس کے لئے کتنی ہی کوشش کر ڈالے:

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ بقرہ - ۲۳

اور اگر تم اس کتاب کے بارے میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر اتاری ہے تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا بنی اسرائیل - ۸۸

کہہ دو اگر آدمی اور جن اس لئے جمع ہوں کہ ایسا قرآن بنا لائیں تو وہ ہرگز نہ لا سکیں گے خواہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہوں

انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی کے مقالہ نگار کے الفاظ میں، فلسفیانہ اعتبار سے جو بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ وہ کیا معیار ہے جس پر الہام کے دعوے کو جانچا جا سکے:

THE MAIN PHILOSOPHICAL QUESTION THAT ARISES CONCERNS THE CRITERIA BY WHICH REVELATION CLAIMS MAY BE JUDGED.

چند نئی کتابیں

تجدید دین

تجدید کا مطلب ہے خدا کے دین کو انسانی گرد و غبار سے پاک کرنا۔ آج اسلام پر وہ سارے "گرد و غبار" پڑ چکے ہیں جو پچھلی امتوں کے دین پر پڑے تھے۔ یہ گرد و غبار کیا ہے اور خدا کے دین کو کس طرح اس سے پاک صاف کیا جا سکتا ہے، "تجدید دین" میں اس کا مطالعہ کیجئے۔ صفحات ۴۸

مذہب اور جدید چیلنج

"علم جدید کا چیلنج" مولانا وحید الدین خاں کی مشہور کتاب ہے۔ "مذہب اور جدید چیلنج" اسی کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۷ میں اردو میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد عربی اور ترکی زبانوں میں اس کے درجن سے اوپر ایڈیشن شائع ہوئے۔ تمام عالم اسلام میں اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ۱۷ فروری ۱۹۷۶ کو مولانا وحید الدین خاں طرابلس میں صدر قذافی سے ملے تو لیبی لیڈر نے فوراً کہا: لقد قرأت کتابك الاسلام یتحدی (میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی پڑھ لی ہے)۔
الامام الاکبر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود (جامعہ ازہر قاہرہ) نومبر ۱۹۷۵ میں ہندستان آئے انھوں نے جامعہ ڈابھیل سورت میں تقریر کرتے ہوئے علماء سے کہا کہ آپ لوگ الاسلام یتحدی کا مطالعہ کیجئے۔ جس میں اسلام کے خلاف جدید شبہات کا کافی و شافی رد موجود ہے۔ صفحات ۲۲۶

ان کے علاوہ متعدد دوسری کتابیں تکمیل کے مرحلہ میں ہیں جو انشاء اللہ جلد شائع ہوں گی، مثلاً "صفحات و تاریخ کا سبق"، "ملت کی تعمیر"، "اسلام دور جدید میں"، "سائنسی مضامین"، "مستقبل کی طرف" وغیرہ۔

مکتبہ الرسالہ - جمعیۃ بلڈنگ - قاسم جان اسٹریٹ - دہلی ۶

ایجنسی کی شرائط

۱۔ کم از کم پانچ پرچوں پر ایجنسی دی جائے گی۔

۲۔ کمیشن پچیس فی صد

۳۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوں گے۔

۴۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ ہوں گے۔

۵۔ غیر فروخت شدہ پرچے واپس لے لئے جائیں گے۔

منیجر **الرسالہ** جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

ہر قسم کی کتابیں

قرآن، درسیات اور دوسرے موضوعات پر

کسی بھی ادارہ کی چھپی ہوئی

ہم سے طلب کیجئے

محصول ڈاک بذمہ خریدار ——— روانگی بذریعہ وی پی

مکتبہ الرسالہ

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI-110006 (INDIA)

Single Copy Rs 2 00

Regd No D (D) 532
Regd R N. No 28822/78
May 1978

Al-Risala Monthly

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI-110006 (INDIA)

کتاب سبز

از معمر القذافی



الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

تجدید دین

از

مولانا وحید الدین خاں

قیمت دو روپے
سال اشاعت ۱۹۷۸

مکتبہ الرسالہ
جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جبیر بن نفیر نے عوف بن مالک اشجعی کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے آسمان کی طرف نظر کی اور فرمایا۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ علم اٹھالیا جائے گا۔ انصار میں سے ایک شخص نے کہا جس کا نام زیاد بن لبید تھا، اے خدا کے رسول! کیا علم ہم سے اٹھالیا جائے گا۔ حالانکہ ہمارے درمیان خدا کی کتاب ہے اور ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو اس کی تعلیم دے رہے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تم کو مدینہ کا سمجھ دار آدمی جانتا تھا۔ یہود و نصاریٰ کیا تورات و انجیل کو نہیں پڑھتے۔ پھر بھی ان کی باتوں پر ان کا عمل نہیں ہے

جبیر بن نفیر کی ملاقات شداد بن اوس سے ہوئی۔ انھوں نے ان کو یہ حدیث سنائی۔ انھوں نے کہا عوف نے سچ کہا۔ پھر شداد نے کہا۔ جانتے ہو، علم کا اٹھ جانا کیا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ شداد نے کہا، اس کے برتن کا چلا جانا (ذهاب اوعیته) اس کے بعد شداد نے کہا:

هل تدری ای العلم یرفع، قال قلت لا ادری۔ قال الخشوع حتی لا یری خاشعا	کیا تم جانتے ہو کون سا علم اٹھالیا جائے گا۔ انھوں نے کہا نہیں۔ فرمایا: خشوع اٹھالیا جائے گا۔ یہاں تک کہ کوئی خاشع دکھائی نہ دے گا۔
ابن عبد البر، جامع بیان العلم وفضلہ، جزء اول صفحہ ۱۵۲	

جس گروہ کے پاس خدا کی کتاب ہو، اس پر جب دینی زوال آتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ دین داری کی صورتیں مٹ جاتی ہیں یا اس کا چرچا باقی نہیں رہتا۔ ایسا تاریخ میں کبھی نہیں ہوا۔ ان کا زوال دراصل یہ ہے کہ دین ان کے یہاں قساوت کی سطح پر باقی ہو، خشوع کی سطح پر وہ ختم ہو جائے (حدید ۱۶)۔ خشوع والی دین داری قلب میں اتری ہوئی ہوتی ہے۔ جب کہ قساوت والی دین داری صرف اعضاء و جوارح کو چھوتی ہے۔ وہ شعور کا حصہ نہیں ہوتی، وہ آدمی کے اندرونی وجود میں آگ نہیں لگاتی۔

حامل کتاب قوم میں یہ زوال اس وقت آتا ہے جب کہ خدا کے دین کو "فن" بنا دیا گیا ہو۔ فن نام ہے کسی حقیقت کو ناپ تول کی زبان میں متعین کرنے کا۔ اب چوں کہ اندرونی حقیقت ناپ تول کی گرفت میں نہیں آتی، وہ صرف بعض ظاہری پہلوؤں کو بیان کر سکتی ہے، اس لئے جب کسی قوم کے اندر اس قسم کے فنون ترقی کرتے ہیں تو ظاہری بحثوں والے دین کے ماہرین تو ان کے یہاں خوب پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ ناپید ہو جاتے ہیں جو کیفیت والے دین سے آشنا ہوں ——— عبادت جو دل کی گھلاوٹ کا نام ہے، فقہی ناپ تول کے ایک ظاہری عمل کا نام رہ جاتی ہے۔ روحانیت جو خدا اور آخرت کی سطح پر جینے کا نام ہے، اس کے مقامات عملیاتی ورزشوں سے طے ہونے لگتے ہیں۔ دعوت دین جو دراصل بندوں کے ساتھ خیر خواہی کا اظہار ہے، وہ تقریر اور تحریر، مناظرہ اور احتجاج حتی کہ ہڑبونگ اور توڑ پھوڑ کی صورت اختیار کر لیتی ہے وغیرہ

کتاب الٰہی کا کوئی حامل گروہ جب قساوت کی سطح پر آجائے تو اس کو دوبارہ خشوع کی سطح پر لانے کی تدبیر صرف یہ ہے کہ دین کو انسانی آمیزشوں سے پاک کیا جائے۔ حقیقی دین داری خدا و رسول کے بتائے ہوئے دین سے آسکتی ہے نہ کہ انسانوں کے وضع کئے ہوئے دین سے۔

تجدید دین

تجدید کے معنی ہیں نیا کرنا۔ تجدید دین کا مطلب یہ ہے کہ دین کے اوپر جب گرد و غبار پڑ جائے تو اس کو صاف کر کے دوبارہ دین کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کر دیا جائے۔

دین کے اوپر "گرد و غبار" کی وجہ ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ اور وہ ہے آسمانی متن میں انسانی اضافہ۔ یہ اضافہ ابتداءً وقتی محرکات کے تحت وجود میں آتا ہے۔ اور اس کے بعد رفتہ رفتہ مقدس بن کر اصل خدائی مذہب کا جزء بن جاتا ہے۔ اس کو لوگ اسی طرح ماننے لگتے ہیں جس طرح خدائی وحی کو ماننا چاہیے۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ اپنے احبار و رہبان کو خدا کے سوا اپنا رب بنا لیتے ہیں (توبہ ۔ ۳۱)

اس اضافہ کے محرکات عام طور پر دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ مذہب کی حقیقت کو خارجی طور پر متعین کرنے کی کوشش (EXTERNALISATION)

۲۔ مذہب کی تعلیمات کو عقلی اصطلاحوں میں بیان کرنا (RATIONALISATION)

پہلی غلطی کی ایک مثال بائبل (پرانا عہدنامہ) کے ابتدائی ابواب ہیں جو قربانی کی انتہائی جزئی تفصیلات سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ بے شمار آداب اور طریقے یا قرآن کے الفاظ میں اصر و اغلال (اعراف ۔ ۱۵۶) جو موجودہ بائبل میں درج ہیں، ان کا حقیقی موسوی شریعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ بعد کے یہودی علما کی پیدا کردہ فقہ تھی جس کو کتاب مقدس میں شامل کر دیا گیا۔ اسی طرح وہ بدعت (حدید ۔ ۲۷) جو مسیحیت میں رہبانیت کے نام سے رائج ہوئی، وہ بھی بعد کو پیدا ہونے والا مسیحی تصوف تھا جس کا حضرت مسیح نے کبھی حکم نہیں دیا تھا۔ یہ چیزیں جو ابتداءً یہودی عبادت یا مسیحی روحانیت کا خارجی ڈھانچہ بنانے کی کوشش کے سلسلے میں وجود میں آئیں، دھیرے دھیرے خود یہودیت اور مسیحیت کا جزء بن گئیں۔ یہاں تک کہ ان کے ہجوم میں اصل دین خداوندی گم ہو کر رہ گیا۔

دوسرے بگاڑ کی مثال موجودہ مسیحیت کے عقائد —— تثلیث، کفارہ، ابنیتِ مسیح وغیرہ ہیں۔ یہ عقائد نہ صرف یہ کہ حضرت مسیح نے کبھی تلقین نہیں کیے بلکہ آج بھی وہ متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی انجیلوں میں نہیں پائے جاتے۔ کفارہ کا عقیدہ سینٹ پال نے ایجاد کیا، تاہم تثلیث اس کے یہاں بھی نہیں۔ یہ سب مسیحی متکلمین کی باتیں تھیں جو بعد کے دور میں وجود میں آئیں۔ مسیحیت جب شام سے باہر نکلی تو دوسری قوموں، خاص طور پر مصریوں اور یونانیوں کو، مسیحی بنانے کی خاطر مسیحی علماء نے یہ کیا کہ اپنی تعلیمات کو ان کی مانوس زبان میں بیان کرنا شروع کیا جس کو قرآن میں مضاہاۃ (توبہ ۳۱) کہا گیا ہے۔ مسیحی بزرگوں کی یہ باتیں دھیرے دھیرے مقدس ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ رومی شہنشاہ قسطنطین اول کے زمانہ میں جب ان کو سیاسی حمایت بھی حاصل ہو گئی تو نیقیا کونسل (۳۲۵ء) کے ذریعے اس خود ساختہ مسیحیت کو انھوں نے حقیقی مسیحیت کی حیثیت سے بزور رائج کر دیا۔ گویا وہ چیز جس کو آج مسیحی عقائد کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت کسی زمانہ کا مسیحی علم کلام تھا جو بالآخر مسیحیت کا جزء بلکہ اصل مسیحیت بن گیا۔

آج اسلام پر یہ سارے "گرد وغبار" اسی طرح پڑ چکے ہیں جس طرح وہ پچھلی امتوں کے دین پر پڑے تھے۔ اسلام کی تجدید کا کام سب سے پہلے ان آمیزشوں کو اس سے الگ کرنا ہے۔ خدا کے دین کو از سر نو زندہ کرنے کی کوئی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کو انسانی گرد وغبار سے پاک نہ کر دیا جائے۔

پیغمبر اسلام نے مختلف انداز سے اپنی امت کو واضح تنبیہہ کر دی تھی کہ وہ اس فتنہ سے بچیں۔ دنیا سے جاتے ہوئے آپ نے جو آخری نصیحت کی، وہ یہ تھی:

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بہما، کتاب اللہ وسنۃ رسولہ	میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ جب تک ان کو پکڑے رہوگے تم گمراہ نہ ہوگے، خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔
موطا امام مالک	

مگر بعد کے دور میں، جیسا کہ خود پیغمبر اسلامؐ نے پیشین گوئی فرما دی تھی، اس وراثت نبوی پر اضافے شروع ہو گئے حتی کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسلام کی فہرست میں بھی نہایت معصومانہ طور پر وہ ساری چیزیں شامل کر دی گئیں جنھوں نے دوسرے مذاہب کو بگاڑ ڈالا تھا۔ تاہم دونوں مثالوں میں ایک زبردست نوعی فرق ہے۔ دیگر مذاہب میں فقہ و تصوف یا علم کلام کے اضافے ان کے اصل آسمانی متن کا حصہ بن گئے۔ یہاں تک کہ اب یہ معلوم کرنا ہی ناممکن ہو گیا کہ ان کی "کتاب مقدس" کا کون سا جزء وہ ہے جو خدا نے ان کے رسول پر اتارا تھا اور کون سا وہ ہے جو بعد کے لوگوں نے اضافہ کر کے اس میں شامل کر دیا۔ اس کے برعکس اسلام، ہر قسم کے اضافوں کا شکار ہونے کے باوجود، اصل خدائی متن (قرآن) کو آج بھی مکمل طور پر محفوظ کئے ہوئے ہے۔ اور کسی بھی شخص کے لئے ممکن ہے کہ وہ انسانی اضافوں کو الگ کر کے اصل خدائی دین کو دریافت کر سکے۔

۱۔ اس سلسلے کی پہلی خرابی وہ ہے جو فقہ[1] کے راستے سے آئی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے لکھا ہے:

اعلم ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم لم یکن الفقہ فی زمانہ الشریف مدونا، ولم یکن البحث فی الاحکام یومئذ مثل البحث من ھٰؤلاء الفقہاء حیث یبینون باقصی جھدھم الارکان والشروط و آداب کل شیئ ممتازا عن الآخر بدلیلہ، ویفرضون الصور ویتکلمون علیٰ تلک الصور المفروضۃ ویحدون مایقبل الحد ویحصرون مایقبل الحصر الی غیر ذلک من صنائعھم، اما رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فکان یتوضأ فیری الصحابۃ وضوءہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فقہ کی تدوین نہیں ہوئی تھی اور نہ اس وقت مسائل میں ایسی بحثیں ہوتی تھیں جیسی یہ فقہا کرتے ہیں کہ نہایت کوشش سے ارکان و شروط اور ہر شے کے آداب ایک دوسرے سے جدا جدا مع دلائل بیان کرتے ہیں۔ اور صورتیں فرض کر کے ان مفروضہ صورتوں میں گفتگو کرتے ہیں اور جو حد کے قابل ہے اس کی حد بیان کرتے ہیں اور جو حصر کے قابل ہے اس کا حصر کرتے ہیں اور اسی قسم کے دوسرے امور کرتے ہیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں یہ تھا کہ آپؐ وضو کرتے تھے پس صحابہ آپ کے وضو کو دیکھتے اور خود بھی ویسا ہی کرتے بغیر

[1] فقہ سے مراد اس بحث میں صرف عبادتی فقہ ہے۔

فياخذون به من غير ان يبين ان هٰذا ركن وذلك ادب، وكان يصلي فيرون صلاته فيصلون كما رأوه يصلي وحج فرمق الناس حجه ففعلوا كما فعل فهذا كان غالب حاله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم ولم يبين ان فروض الوضوء ستة او اربعة ولم يفرض انه يحتمل ان يتوضأ انسان بغير موالاة حتى يحكم عليه بالصحة او الفساد الا ما شاء الله، وقلما كانوا يسألونه عن هٰذه الاشياء۔ عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: ما رأيت قوما كانوا خيرا من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ما سألوه الا عن ثلاث عشر ة مسألة حتى قبض

حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول

باب اسباب اختلاف الصحابہ والتابعین فی الفروع

اس کے کہ آپ یہ کہیں کہ یہ رکن ہے، وہ مستحب ہے اور آپ نماز پڑھتے پس صحابہ آپ کی نماز کو دیکھتے اور خود بھی اسی طرح نماز پڑھتے جس طرح آپ کو نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ اور آپ نے حج کیا۔ پس لوگوں نے آپ کے حج کو دیکھا اور ویسا ہی کیا جیسا آپ نے کیا تھا۔ یہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا غالب حال تھا آپ نے یہ بیان نہیں کیا کہ وضو میں فرائض چھ یا چار ہیں اور نہ آپ نے اس احتمال کو فرض کیا کہ انسان بغیر پے در پے کے وضو کرے تاکہ اس کے صحیح یا فاسد ہونے کا حکم کیا جائے، الا ماشاء اللہ۔ اور صحابہ اس قسم کی باتیں آپ سے بہت کم دریافت کرتے تھے۔ عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ میں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر لوگ نہیں دیکھے۔ انھوں نے آپؐ سے صرف تیرہ مسئلے دریافت کئے، یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی۔

فقہ کا لفظ، اپنے موجودہ اصطلاحی مفہوم میں، قرآن و حدیث میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ بحیثیت فن اس کی تدوین کا آغاز قرن اول کے بعد ہوا جب کہ مسائل نے نئی وسعت اختیار کرلی۔ اسلام پھیلتا جارہا تھا، یہاں تک کہ وہ چین کی سرحدوں سے لے کر فرانس کی سرحدوں تک جا پہنچا۔ بے شمار نئے لوگ اسلام میں داخل ہوگئے اور ان کی وجہ سے نئے نئے سوالات پیدا ہونے لگے۔ اس وقت ان سوالات کا جواب دینے کا پہلا مرکز عراق بنا۔ عراقی فقہاء نے قیاس اور استخراج کے ذریعے نئے سوالات کے جوابات دینے شروع کئے۔ اس وقت حدیثیں مدون نہ ہوئی تھیں، اس لئے کسی فقیہہ کے پاس سارا ذخیرۂ حدیث اس طرح موجود نہ تھا جیسے وہ آج ہم کو اپنے کتب خانہ میں رکھا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی فقہاء کے یہاں کثرت سے اپنی سابق رایوں سے رجوع ملتا ہے۔ فقہ کی کتابیں اس قسم کے اندراجات سے بھری ہوئی ہیں:

هذا رأي ابي حنيفة الاول، وانه رجع عنه

هذا مذهب الشافعي القديم وهو في العراق وهذا مذهبه الجديد في مصر

هذا احدى الروايات عن مالك (او عن احمد بن حنبل) وان هناك روايات اخرى

حدیث کی جمع و ترتیب کا کام جو نمایاں شکل میں دوسری صدی ہجری کے نصف ثانی میں شروع ہوا، اس کی بڑی وجہ وہ ردعمل تھا جو ارباب حدیث کے درمیان عراقی فقہاء کے خلاف پیدا ہوگیا تھا۔ گویا حدیث کی تدوین اس تحریک کا ایک جزء تھی کہ مسائل کی بنیاد "رائے" کے بجائے احادیث و آثار پر ہونی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دور کی حدیث کی کتابوں میں وہی حدیثیں جمع کی گئیں جن سے فقہی احکام معلوم ہوتے تھے۔ اس کی ایک مثال موطا امام مالک ہے۔ بعد کی

کتب حدیث، جن میں ہر قسم کی حدیثیں جمع کی گئیں، ان میں بھی ابواب کی ترتیب فقہی طرز پر نظر آتی ہے۔ اسی کا اثر تھا کہ امام بخاری نے اپنی کتاب کی تالیف سے پہلے یہ نقشہ بنایا کہ ایک ضابطہ قانون میں کیا کیا ابواب ہونے چاہئیں اور اس کے مطابق پیشگی ابواب مقرر کئے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں بہت سے عنوانات کے تحت تو کئی کئی روایتیں ملتی ہیں۔ بعض عنوان کے تحت صرف قرآن کی ایک آیت درج ہے اور بعض عنوانات دونوں سے خالی ہیں۔

تاہم جہاں تک "فقہ" کا سوال ہے، حدیث کی جمع و ترتیب کے بعد بھی اس کی ضرورت باقی تھی۔ عبادت کے طریقے اگرچہ بنیادی طور پر تمام صحابہ کے یہاں ایک ہی تھے۔ مگر حدیث نے بتایا کہ اس کے ضمنی پہلوؤں میں مختلف صحابہ کے عمل میں بعض فرق پایا جاتا ہے۔ اب سوال تھا کہ کیا کیا جائے اور عبادت کا کون سا ڈھانچہ مقرر کیا جائے۔ یہاں لوگوں کی دو رائیں ہوگئیں۔ ایک طرف محدثین تھے، دوسری طرف فقہاء۔ محدثین کی رائے یہ تھی کہ الصحابة كلهم عدول کے مطابق کسی بھی صحابی کی رائے پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ اسامہ بن زید کہتے ہیں، میں نے قاسم بن محمد بن ابوبکر سے پوچھا، غیر جہری نماز میں امام کے پیچھے قرأت کیسی ہے۔ فرمایا: قرأت کرو تب بھی اصحاب رسول اللہ میں تمہارے لئے اسوہ ہے اور نہ کرو تب بھی اصحاب محمد میں اسوہ ہے (۸۰) عمر بن عبد العزیز کا قول ہے: ہر صحابی امام ہے اور ہر صحابی کی پیروی درست ہے (۸۰) محمد بن عبد الرحمٰن صیرفی بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا، اگر کسی مسئلہ میں صحابہ کا اختلاف ہو تو کیا تنقید و تمحیص کرنا چاہئے تاکہ جس کے ساتھ حق نظر آئے اس کی پیروی کی جائے۔ جواب دیا "نہیں"، انھوں نے کہا پھر کیا کریں، کہا: جس صحابی کے قول کو چاہو لے لو" (تقلد ايهم احببت ۸۳) ائمہ حدیث کے فقہی مسلک کے بارے میں علماء کے درمیان جو اختلاف ہے، اس کی وجہ یہی ہے۔ کیونکہ معروف معنوں میں ان کا کوئی ایک فقہی مسلک ہی نہ تھا۔ (جامع بیان العلم، جزء ثانی)

مگر فقہاء کی رائے اس سے مختلف تھی۔ ابو عمر کہتے ہیں کہ امام شافعی، لیث بن سعد، اوزاعی، ابو ثور اور دیگر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جب ایک ہی مسئلہ میں دو متضاد قول ہوں تو دونوں حق نہیں ہو سکتے۔ لازمی طور پر ایک ہی صحیح ہوگا، دوسرا غلط (ما الحق الا واحد، ۸۲) - ایسی صورت میں ضروری ہے کہ کتاب و سنت، اجماع امت اور اصول مسلمہ پر قیاس کرکے ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح قرار دیا جائے۔

اس بحث میں حق بلاشبہ محدثین کی طرف تھا۔ بعض امور ایسے ضرور ہیں جن میں فرق کا معاملہ حق اور ناحق کا معاملہ ہوتا ہے۔ مگر ہر فرق کی نوعیت یہی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر بعض روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گمان تھا کہ بعض جانور (مثلاً چوہا، گوہ) یہود کی مسخ شدہ نسلوں کی اولاد ہیں (لعله من القرون التي مسخت، مسلم) مگر دوسری روایات کے مطابق آپ نے فرمایا کہ تمام جانور پہلے سے ہیں۔ کوئی جانور کسی مسخ شدہ قوم کی نسل سے نہیں (ان الله لم يلعن قوما قط فيمسخهم فكان لهم نسل، ولكن هذا خلق كان، ابوداؤد) ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک ہی بات صحیح ہو سکتی ہے۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ ایک روایت کو ترک کرکے دوسری کو اختیار کریں۔ اسی طرح بعض روایات کے مطابق اولاد مشرکین کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ وہ اپنے آباء کے ساتھ جہنم میں ہوں گے

(ھم مع آباءھم، ابن کثیر) دوسری طرف ایسی بھی روایات ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ بچہ حالتِ طفلی میں مرجائے تو وہ جنت میں جائے گا (المولود فی الجنۃ، احمد) طبرانی کی ایک روایت کے مطابق آپ سے اطفالِ مشرکین کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا وہ اہلِ جنت کے خادم ہوں گے (ھم خدّام اھل الجنۃ) ظاہر ہے کہ ایک لڑکا بیک وقت جنت اور دوزخ دونوں جگہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ہمارا فرض ہوگا کہ دونوں قسم کی روایات کی چھان بین کر کے صحیح تر قول کو تلاش کریں۔

مگر جہاں تک عبادت کے طریقوں میں مذکورہ فرق کا تعلق ہے، وہ نہ صرف انتہائی ضمنی اور فروعی ہیں بلکہ ایک ایسے دائرہ سے تعلق رکھتے ہیں جہاں فرق کے معنی لازماً یہ نہیں ہیں کہ ایک صحیح ہے اور دوسرا غلط۔ اس معاملہ میں فرق دراصل تنوع اور توسع کو بتاتا ہے نہ کہ حق اور ناحق کو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک ہی صحابی کو بسا اوقات مختلف عمل کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر امام مالک اور امام شافعی نے بروایت عروہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق نے منبر پر آیت سجدہ تلاوت کی اور اتر کر سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ دوسروں نے بھی کیا۔ اگلے جمعہ کو دوبارہ آپ نے آیت سجدہ تلاوت کی اور سجدہ نہیں کیا۔ لوگوں نے قصد کیا کہ سجدہ کریں تو منع فرمایا اور کہا کہ اپنی جگہ بیٹھے رہو (ازالۃ الخفا، مقصد دوم، ۱۶۹) حضرت عمر مسجد میں داخل ہوئے اور دو رکعت نماز پڑھی اور امام شافعی یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ اگلے دن آپ مسجد میں آئے اور ایک رکعت نماز پڑھ کر سلام پھیر دیا۔ کہا گیا، آپ نے ایک ہی رکعت نماز پڑھی۔ فرمایا، یہ نافلہ تھی۔ جو چاہے زیادہ پڑھے اور جو چاہے کم (۱۷۰) اسی طرح حضرت عمر کے بارے میں روایت کیا گیا ہے کہ نماز میں آپ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم عام طور پر بآواز بلند نہیں پڑھتے تھے۔ مگر کبھی کبھی آپ نے بسم اللہ بآواز بلند بھی پڑھا (۱۶۲) حضرت عبداللہ بن عباس کو معلوم تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات بارش کے موقع پر منادی کے ذریعہ اعلان کرایا تھا کہ الاصلوا فی الرحال۔ اس کے باوجود ان کے بارے میں روایات میں آتا ہے:

قال لموذنہ فی یوم مطیر یوم جمعۃ، اذ قلت اشھد ان محمد ارسول اللہ فلا تقل حی علی الصلاۃ، قل صلوا فی بیوتکم۔ فکان الناس استنکروا ذلک، فقال فعلہ من ھو خیر منی (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) وانی کرھت ان اخرجکم فی الطین والدحض

حضرت ابن عباس نے جمعہ کے روز بارش کے دن اپنے مؤذن سے کہا، جب تم اذان میں اشہد ان محمدا رسول اللہ کہو تو اس کے بعد حی علی الصلاۃ مت کہنا بلکہ یہ فقرہ کہنا: صلوا فی بیوتکم (اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو) مؤذن نے جب اس طرح اذان دی تو لوگوں کو عجیب معلوم ہوا۔ ابن عباس نے فرمایا: یہ اس ہستی نے کیا ہے جو مجھ سے بہت بہتر تھا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ انھوں نے کہا: مجھے پسند نہیں ہوا کہ تم کو کیچڑ اور پھسلن میں گھر سے نکالوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی عبادت، اپنے بنیادی ڈھانچہ کے اعتبار سے، ایک مقرر عمل ہونے کے باوجود اپنی ساری تفصیلات میں ایک مخصوص عمل کی یکساں تکرار کا

نام نہ تھی، جیساکہ آج ایک شخص کو اپنے مسلک کی مدون فقہ میں نظر آتا ہے۔ بلا شبہ اس کی ایک متعین شکل تھی۔ مگر مختلف وجوہ سے اس میں بار بار فرق بھی پیدا ہو جاتا تھا۔

فرق کی ایک وجہ وہ ہے جو کسی اتفاقی سبب سے پیدا ہوئی۔ مثال کے طور پر طواف کعبہ کے وقت رمل (کندھوں کو ہلاتے ہوئے چلنا) اگرچہ بعد کے فقہاء کے نزدیک سنت ہے مگر عبداللہ بن عباس کا قول ہے کہ آپ نے اس کو وقتی مصلحت کی بنا پر اختیار کیا تھا:

انما فعله النبي صلى الله عليه وسلم على سبيل الاتفاق لعارض عرض وهو قول المشركين "حطمهم حمى يثرب" وليس بسنة حجۃ اللہ البالغہ	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو محض اتفاقی طور پر ایک امر عارض کی وجہ سے کیا تھا۔ اور وہ یہ کہ مشرکین مکہ نے کہا تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ کے بخار نے کمزور کر دیا ہے۔ ورنہ طواف میں رمل کرنا مستقل سنت نہیں ہے۔

اسی طرح ایک فرق وہ ہے جو کیفیت عبادت کے وفور سے پیدا ہوتا ہے۔ ترمذی، ابو داؤد، نسائی نے روایت کیا ہے کہ رفاعہ بن رافع نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی۔ درمیان میں انھیں چھینک آگئی تو ان کی زبان سے بآواز بلند نکلا: الحمد لله حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه مباركا عليه كما يحب ربنا ويرضى۔ آپ نے سلام پھیرنے کے بعد پوچھا: نماز میں کون بولا تھا (من المتكلم في الصلاة) کسی نے جواب نہ دیا۔ آخر تیسری بار پوچھنے پر رفاعہ نے کہا کہ انا یا رسول اللہ (میں اے خدا کے رسول) آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اس کلمہ کو لینے کے لئے تیس سے زیادہ فرشتے دوڑ پڑے تھے۔ (مشکوٰۃ، مالا یجوز فی الصلاۃ وما یباح، ۹۱)

اسی طرح فرق کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ اسلام میں اصل اہمیت حقیقت عبادت کی ہے نہ کہ شکل عبادت کی۔ اس لئے عبادت کی ادائگی کے دوران اگر اس کی شکل میں معمولی فرق ہو گیا تو آپ نے اس کو نظر انداز کیا اور عبادت کی اصل حقیقت پر زور دیا:

عن اسامة بن شريك قال خرجت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم حاجا فكان الناس يأتونه فمن قائل يا رسول الله اسعيت قبل ان اطوف او اخرت شيئا او قدمت شيئا، فكان يقول لا حرج الا على رجل اقترض عرض مسلم وهو ظالم فذلك الذي حرج وهلك (مشکوٰۃ کتاب المناسک)	اسامہ بن شریک کہتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے لئے نکلا۔ پس لوگ آپ کے پاس آتے۔ کوئی کہتا، یا رسول اللہ میں نے طواف سے پہلے سعی کر لیا، کوئی کہتا میں نے فلاں چیز پہلے کر لی، میں نے فلاں چیز بعد میں کی۔ آپ ان کو جواب دیتے، اس میں کوئی حرج نہیں۔ حرج کی بات اور ہلاک کرنے والی بات تو یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی عزت پر حملہ کرے۔

قرآن میں نماز کی ادائگی پر بے حد زور دیا گیا ہے۔ مگر نماز کی متعین صورت نہیں بتائی گئی ہے۔ حدیث سے نماز کی شکل معلوم ہوتی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ حدیث یہ بھی بتاتی ہے کہ نماز کی ضمنی شکلوں میں تنوع اور توسع

ہے۔ یہ کوئی "کمی" کی بات نہیں ہے جس کی تلافی کے لئے ہمیں ایک نیا فن ایجاد کرنے کی ضرورت ہو۔ یہ دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ نماز ایک زندہ عمل ہے۔ اور زندہ عمل کبھی بھی مشینی یکسانیت کا پابند نہیں ہوتا۔ فقہ نے بالکل غیر ضروری طور پر یہ کوشش کی کہ اس فطری توسع اور تنوع کو ختم کر کے عبادت کا یکساں نظام بنائے۔ اس مصنوعی تدبیر نے نمازیوں کو نماز کے حقیقی فائدہ سے محروم کر دیا۔ وہ نماز کو ایک قسم کا عملیاتی ضمیمہ سمجھنے لگے۔ نہ کہ ایک ربانی سرچشمہ جو زندگی اور حرارت کی خوراک لینے کے لئے تلقین کیا گیا ہو۔

تاہم اگر فروعی عبادت میں "ترجیح" ڈھونڈنا اور یکسانیت پیدا کرنا ضروری ہو، جب بھی اس کا وہ طریقہ کسی طرح صحیح نہ تھا جو فقہار نے اختیار کیا۔ انھوں نے یہ کیا کہ بطور خود اپنے اپنے مدارس فکر قائم کئے اور ہر ایک ذاتی طور پر ترجیح تلاش کرنے میں لگ گیا۔ اب چونکہ بطور واقعہ عبادات میں تنوع پایا جا رہا تھا، کلی یکسانیت کی تلاش مختلف طبائع کو ایک ہی نتیجہ پر نہیں پہنچا سکتی تھی۔ کسی نے ایک طریقہ کو ترجیح دی کسی نے دوسرے طریقہ کو۔ اس طرح ایک ڈھانچہ بنانے کی کوشش میں کئی ڈھانچے وجود میں آ گئے۔

مسیب بن رافع تابعی کہتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں دستور تھا کہ ایسا کوئی معاملہ پیش آتا جس کا حکم کتاب و سنت میں نہ ملتا تو ایسے معاملہ کو صوافی الامرار (امرار کا میدان) کہتے تھے۔ حکام کو اطلاع دی جاتی۔ وہ علماء کو جمع کرتے اور ان کے متفقہ فیصلہ پر عمل کیا جاتا (جامع بیان العلم جزء ثانی ۱۴۴) یہ طریقہ ایسا ہے جس میں اختلاف نہیں ہوتا۔ حکومت کا نور انتشار و اختلاف کو ختم کرنے کا ضامن بن جاتا ہے۔ صدر اول میں قرآن کی تدوین کے سلسلہ میں اسی پر عمل کیا گیا۔ یہ کام اگر حکومت کی سرپرستی میں انجام نہ پاتا اور لوگ اپنے اپنے طور پر صحیفہ الٰہی کو مرتب کرتے تو شدید اختلافات کا اندیشہ تھا۔ اسی طرح فقہ میں اگر بالفرض یکساں ڈھانچہ بنانا ضروری ہو تو اس کا طریقہ بھی یہی تھا کہ یہ کام حکومت کی ماتحتی میں واحد ادارہ کے تحت انجام پاتا۔ اس کی بعض مثالیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً تکبیرات جنازہ کی تعداد پر صحابہ کے درمیان اختلاف ہوا تو حضرت عمر نے سب کو چار تکبیروں پر جمع کر دیا (۸۵) عبد اللہ بن مقفع نے خلیفہ منصور عباسی کو ترغیب دی تھی کہ وہ ایک متفقہ قانون مقرر کر کے ریاست کی طرف سے جاری کر دے (رسالۃ الصحابہ)

فقہ اپنے پہلے مرحلہ میں مختلف روایات کے درمیان ترجیح تلاش کرنے کا نام تھی مگر سوالات بڑھ رہے تھے۔ لوگوں کو محسوس ہوا کہ جمع شدہ آثار و احادیث میں تمام سوالات کا جواب نہیں ہے۔ اب انھوں نے معلوم احکام کی بنیاد پر مزید استخراج کا طریقہ اختیار کیا۔ اس طرح فقہ کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اور وہ دور ترجیح سے گزر کر دور تخریج میں داخل ہو گئی۔

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

فلما مهدوا الفقه على هذه القواعد فلم تكن مسألة من المسائل التي تكلم فيها من قبلهم والتي وقعت في زمانهم الا وجدوا فيها حديثا ...

جب علمار نے فقہ کو ان قواعد پر مرتب کیا تو ان مسائل میں سے جن میں قدماء نے کلام کیا تھا اور وہ جو ان کے زمانہ میں واقع ہوئے تھے کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس کے

ثم انشأ اللہ تعالیٰ قرنا آخر۔۔۔فوقع تدوین الحدیث والفقہ والمسائل من حاجتھم بموقع من وجہ آخر وذلک انہ لم یکن عندھم من الاحادیث والآثار ما یقدرون بہ علی استنباط الفقہ علی الاصول التی اختارھا اھل الحدیث۔۔۔ فمھدوا الفقہ علی قاعدۃ التخریج

حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول، ۵۲ - ۳۴۸

متعلق کوئی نہ کوئی حدیث انھوں نے نہ پائی ہو۔ اس کے بعد اللہ نے ایک دوسرے زمانہ کی پیدائش کی۔ پس حدیث، فقہ اور مسائل کو دوسرے طرز پہ مدون کرنے کی ضرورت واقع ہوئی اور یہ اس واسطے کہ ان کے پاس اتنی احادیث اور آثار نہ تھے جن سے ان اصولوں کے موافق جن کو ارباب حدیث نے پسند کیا ہے، استنباط فقہ پہ قادر ہوتے۔ چنانچہ انھوں نے تخریج کے قاعدہ پر فقہ کی ترتیب دی۔

تخریج کے قاعدہ پر فقہ کی تدوین، معاملات اور قانونی مسائل کی حد تک صحیح تھی۔ کیونکہ قانونی اور معاملاتی امور میں ہمیشہ نئے نئے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور ان میں قیاس و اجتہاد کے بغیر چارہ نہیں۔ مگر عباداتی امور تک اس کی توسیع بلاشبہ ایک اجتہادی غلطی تھی جس نے عبادت کو ایک "فن" بنا دیا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ میں سیدھے سادے آسان دین کو لے کر بھیجا گیا ہوں (بُعثتُ بالحنیفیۃ السمحۃ) مگر عباداتی امور میں نئے نئے فقہی مسائل ایجاد کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ دین ایک ایسا پیچیدہ فن بن گیا جس کو فن فقہ کا متخصص ہی جان سکتا ہو۔ جس طرح فنون میں موشگافیاں کی جاتی ہیں اور نئی نئی باریکیاں پیدا کر کے قانون وضع کئے جاتے ہیں، اسی طرح عبادات میں باریکیوں کی تلاش شروع ہو گئی:

ومنھا ان اقبل اکثرھم علی التعمقات فی کل فن۔۔۔ ومنھم من کثر القیل والقال فی اصول الفقہ۔۔۔ فاستقصی وا جاب وتقصی وعرف وقسم

شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ، جلد اول، صفحہ ۳۵۹

اس میں سے یہ ہے کہ اکثر لوگ ہر فن کی باریک بینی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بعض نے اصول فقہ کے متعلق بڑی قیل قال کی۔ پس نہایت درجہ چھان بین کی۔ ہر امر کی تعریف و تقسیم کی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبادات میں ایسی بحثیں ہونے لگیں جن کا صحابہ کے زمانہ میں کوئی وجود نہ تھا۔ امام شافعی (۲۰۴ - ۱۵۰ھ) پہلی بار کوفہ پہنچے تو مسجد میں ایک نوجوان کی نماز انھیں ٹھیک دکھائی نہ دی۔ انھوں نے کہا:

"نماز ٹھیک طرح پڑھا کرو تاکہ خدا تمھارے حسین چہرے کو عذاب دوزخ میں مبتلا نہ کرے"

نوجوان نے کہا میں پندرہ برس سے اسی مسجد میں محمد بن حسن (۱۸۹ھ) اور ابو یوسف (۱۸۲ھ) کے سامنے نماز پڑھ رہا ہوں۔ ان اماموں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ اور تم میری نماز پر اعتراض کرتے ہو۔ دونوں امام اتفاق سے اس وقت مسجد کے باہر موجود تھے۔ نوجوان نے جا کر ان سے کہا "آپ لوگوں نے میری نماز میں کبھی کوئی خرابی دیکھی ہے" انھوں نے جواب دیا "خدایا کبھی نہیں"، نوجوان نے کہا، مگر مسجد میں ایک شخص بیٹھا ہے جس نے میری نماز پر اعتراض کیا ہے۔" دونوں اماموں نے کہا، تم اس شخص کے پاس جاؤ اور سوال کرو کہ نماز میں تم کس طرح داخل ہوتے ہو" نوجوان مسجد میں واپس آیا اور امام شافعی سے کہا "اے وہ شخص جس نے میری نماز پر اعتراض کیا ہے، بتاؤ کہ تم نماز میں کس طرح داخل ہوتے ہو"

(یامن عاب علیّ صلاتی بم تدخل فی الصلاۃ) امام شافعی نے جواب دیا:

بفرضین وسنۃ دو فرض اور ایک سنت کے ساتھ میں نماز میں داخل ہوتا ہوں

نوجوان نے یہ جواب امام محمد بن حسن اور امام ابویوسف کو پہنچایا تو انھوں نے کہا "جواب ایسے آدمی کا ہے جس کی علم پر نظر ہے"، اب انھوں نے لڑکے کو دوبارہ بھیجا کہ جاؤ پوچھو وہ دونوں فرض اور سنت کیا ہیں۔ اس نے آکر پوچھا تو امام شافعی نے کہا: پہلا فرض نیت ہے، دوسرا فرض تکبیر تحریمہ ہے۔ اور سنت دونوں ہاتھوں کا اٹھانا ہے (رحلۃ الامام الشافعی، المطبعۃ السلفیۃ قاہرہ، ۱۳۵۰ھ، صفحات ۱۳-۱۴)

یہی واقعہ اگر دو صحابی کے درمیان ہوتا تو کیا ان کا سوال و جواب بھی اسی قسم کا ہوتا۔

فضل بن موسیٰ کا بیان ہے کہ مشہور محدث اعمش (۱۴۷ھ) بیمار پڑے اور امام ابوحنیفہ (۸۰-۱۵۰ھ) ان کی عیادت کے لئے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ امام ابوحنیفہ نے اعمش سے کہا "ابو محمد! یہ خیال نہ ہوتا کہ بار بار آنے سے آپ کو تکلیف ہوگی تو میں جلد جلد عیادت کو آتا"، اعمش نے جواب دیا: "جب آپ اپنے گھر میں ہوتے ہیں، اس وقت بھی میرے اوپر بوجھ ہوتے ہیں، عیادت کا کیا ذکر"۔ فضل کا بیان ہے کہ واپسی پر امام ابوحنیفہ نے مجھ سے کہا "اعمش کا کبھی نہ کوئی روزہ صحیح ہوا ہے نہ غسل جنابت"۔ فضل کہتے ہیں کہ سحری اور غسل کے بارے میں امام اعمش کا مسلک امام ابوحنیفہ سے مختلف تھا۔ (ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ، جزء ثانی، صفحہ ۱۵۷)

کیا کسی صحابی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ محض فروعی مسائل میں فرق کی وجہ سے وہ کسی کے روزہ اور غسل کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں اس قسم کا حکم لگاتا۔

اس قسم کے مباحث و مسائل کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ اسلامی کے نام سے ایک ایسا فن وجود میں آگیا جس سے اصحاب رسول بھی ناواقف تھے۔ کس صحابی کو خبر تھی کہ وضو میں مثلاً "چار فرض ہیں، ۱۳ سنتیں ہیں اور ۸ مستحبات"۔ علم دین کے بارے میں فقہ کے ایجاد کردہ اس فنی معیار نے بعض اوقات بڑی ناپسندیدہ چیزیں پیدا کردیں۔ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے امام اوزاعی (۱۵۷ھ) سے کہا تھا:

لولا فضل الصحبۃ لقلت ان علقمۃ افقہ من عبد اللہ بن عمر (حجۃ اللہ ۳۲۷)	اگر صحابی ہونے کی فضیلت عبداللہ بن عمر میں نہ ہوتی تو میں کہتا کہ علقمہ، عبداللہ بن عمر سے زیادہ فقیہ ہیں۔

امام ابوحنیفہ کے ذہن میں یہ بات اسی لئے آئی کہ "فقہ"، ان کے زمانہ میں جس فن کا نام بن گیا تھا اس فن میں انھیں عبداللہ بن عمر صحابی علقمہ تابعی سے پیچھے نظر آتے تھے۔ بعض اوقات یہ ذہن اور بھی زیادہ ناپسندیدہ شکل میں ظاہر ہوا۔ ضحاک مشک کو مکروہ سمجھتے تھے۔ لوگوں نے کہا "مگر اصحاب محمدؐ تو مشک کا استعمال کرتے تھے"، ضحاک نے جواب دیا "ہم اصحاب محمدؐ سے زیادہ جانتے ہیں"، (نحن اعلم منھم، جزء ثانی ۱۵۵) صحابہ سوالات کا جواب دینے سے بچنے کی کوشش کرتے اور نئے نئے سوالات کی حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ اب ایسے لوگ پیدا ہوگئے جو بیباکی کے ساتھ نئے نئے سوالات گھڑتے اور ان کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ مثال کے طور پر:

سئل الامام الخجندی رحمہ اللہ عن رجل شافعی المذہب	امام خجندی سے کسی نے پوچھا کہ ایک شخص شافعی المذہب

تركت صلاة سنة او سنتين ثم انتقل الى مذهب ابى حنيفة كيف يجب عليه القضاء، ايقضيها على مذهب الشافعى او على مذهب ابى حنيفة

حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول، ۳۷۸

نے ایک سال یا دو سال کی نماز ترک کر دی۔ اس کے بعد اس نے ابوحنیفہ کا مذہب اختیار کر لیا تو اس پر کس طرح سے قضا واجب ہے، آیا امام شافعی کے مذہب کے موافق قضا نماز ادا کرے یا امام ابوحنیفہ کے مذہب کے موافق۔

اس قسم کی باتیں صحابہ کے زمانہ میں معدوم تھیں۔ حتیٰ کہ کوئی شخص اگر کسی صحابی سے ایسا سوال کرتا تو وہ اس کا جواب دینے کے بجائے اس پر لعنت بھیجتا کہ کیا تم دین محمدی کو دین یہودیت بنانا چاہتے ہو۔ مگر بعد کو یہ حال ہوا کہ لوگ نہایت دلیری کے ساتھ اس قسم کے سوالات کرتے اور جواب دینے والے فخر کے ساتھ ان کا جواب دیتے کیونکہ "فقہ" ان کے نزدیک سب سے بڑا علم تھا:

وكان بعدهم قوم لا يكرهون المسائل ولا يهابون الفتيا ويقولون على الفقه بناء الدين فلا بد من اشاعته

حجۃ اللہ البالغہ، ۳۵۲

ان کے بعد ایسے لوگ ہوئے جو مسائل کو بیان کرنے میں کوئی برائی محسوس نہیں کرتے تھے اور فتویٰ دینے سے خوف نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دین کی بنیاد ہی فقہ پر ہے، اس لئے اس کی اشاعت ضرور ہونی چاہئے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ اصحاب حدیث اور ارباب رائے (فقہاء) کے درمیان زبردست اختلاف پیدا ہوا۔ حضرت ابوہریرہ کی یہ روایت محدثین کے درمیان خوب پھیلی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ امت کچھ زمانہ تک کتاب اللہ اور کچھ زمانہ سنت رسول اللہ پر چلے گی۔ پھر رائے پر عمل شروع ہوگا اور اسی وقت سے گم راہی میں پڑ جائے گی۔ (جامع بیان العلم، جزء ثانی، ۱۳۴) قاسم بن محمد بن ابوبکر نے فقہی خوض کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہا:

قال القاسم انكم تسئلون عن اشياء ما كنا نسأل عنها وتنقرون عن اشياء ما كنا ننقر عنها

(حجۃ اللہ البالغہ، ۳۱۷)

تم ایسی باتیں دریافت کرتے ہو جن کو ہم (صحابہ سے) دریافت نہیں کرتے تھے اور ایسی باتوں کی تفتیش کرتے ہو جن کی ہم تفتیش نہیں کرتے تھے۔

فقہی خوض کے نتیجہ میں جب عبادت الٰہی کے ایسے ایسے احکام و مسائل وجود میں آئے جن سے اصحاب رسول اللہ بھی ناواقف تھے تو اہل نظر چیخ اٹھے۔ بقیۃ بن الولید کا بیان ہے کہ امام اوزاعی (۱۵۷ھ) نے مجھ سے کہا "اے بقیہ! علم وہی ہے جو اصحاب محمدؐ سے پہنچا ہے۔ اور جو کچھ اصحاب محمدؐ سے نہیں پہنچا، وہ علم ہی نہیں" (ثانی ۲۹) سعید بن جبیر تابعی (۹۵ھ) نے کہا "جو بات اصحاب بدر کو نہیں معلوم وہ دین بھی نہیں"۔ —— (ما لم يعرفه البدريون فليس من الدين ۹۷) ۔ شعراء نے اس پر نظمیں لکھیں۔ ایک شاعر اپنی طویل نظم میں کہتا ہے:

قد نقر الناس حتى احدثوا بدعا
في الدين بالرأي لم تبعث به الرسل (۹۸)

لوگوں نے کھود کرید کی، یہاں تک کہ دین میں ایسی نئی چیزیں نکالیں جنھیں پیغمبر نہیں لائے تھے۔

عبد اللہ بن مسلمہ قعنبی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں امام مالک کے پاس گیا تو دیکھا کہ رو رہے ہیں۔ میں نے سلام کیا،

انھوں نے جواب تو دیا مگر روتے رہے۔ میں نے کہا ابو عبداللہ! کیوں آپ اس قدر رو رہے ہیں؟" فرمایا: "میرا معاملہ اب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مجھ سے بہت زیادتی ہوئی، کاش اس معاملہ میں میرے لفظ لفظ پر ایک ایک کوڑا مجھے مارا جاتا اور میں نے اپنی رائے سے کچھ نہ کہا ہوتا، اتنے زیادہ فتوے نہ دیئے ہوتے" (جزو ثانی، صفحہ ۱۴۵)

امام مالک کہتے ہیں، اگلے لوگ جن کو میں نے دیکھا، ان کا یہ دستور نہ تھا کہ بے دھڑک کہہ دیں، یہ حلال ہے، وہ حرام ہے[۱]۔ عبداللہ بن مسلمہ قرشی سے روایت ہے کہ امام مالک نے کہا "یہ معاملہ برابر استوار رہا۔ یہاں تک کہ ابو حنیفہ ظاہر ہوئے اور مسلمانوں میں رائے کو رواج دے گئے" خالد بن نزار نے امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ابو حنیفہ تلوار لے کر اس امت پر ٹوٹ پڑتے تو اتنا نقصان نہ پہنچا سکتے جتنا اپنی رائے و قیاس سے پہنچا گئے ہیں"۔ ابن عیینہ نے کہا "کوفہ کا معاملہ درست رہا، یہاں تک کہ ابو حنیفہ کا ظہور ہوا۔ جزء ثانی، صفحہ ۱۴۷

امام ابو یوسف (۱۸۲ھ) نے جب عباسی سلطنت میں قانون کا عہدہ سنبھالا تو فقہ کے پھیلاؤ کے لئے ایک مادی محرک بھی پیدا ہوگیا:

وکان اشهر اصحابه ذکرا ابو یوسف رحمه الله فولی قضاء القضاة ایام هارون الرشید فکان سبب الظهور مذهبه والقضاء به فی اقطار العراق وخراسان وماوراء النهر (حجة الله، ۳۴۴)

امام ابو حنیفہ کے شاگردوں میں سب سے مشہور امام ابو یوسف ہیں۔ وہ ہارون رشید کے عہد میں قاضی القضاۃ مقرر کئے گئے۔ پس وہ امام ابو حنیفہ کے مذہب کی شہرت کا اور اطراف عراق، خراسان اور ماوراء النہر میں معمول بہ ہونے کا سبب بن گئے۔

امام ابو یوسف کو اسلام میں سب سے پہلے "قاضی القضاۃ" کہا گیا۔ وہ تین عباسی خلفاء — مہدی، ہادی اور ہارون الرشید کے زمانہ میں قاضی کے منصب پر فائز رہے۔ اس زمانہ کے لحاظ سے ان کا عہدہ بیک وقت چیف جسٹس اور وزیر قانون دونوں کا تھا۔ چنانچہ پوری حکومت اسلامی میں فقہ، خاص طور پر فقہ حنفی کو خوب ترقی ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ حکومت کے عہدوں کے لئے فقہ میں مہارت حاصل کرنے لگے۔ محمود وراق (۲۴۵ھ) کی ایک طویل نظم کے چند شعر یہ ہیں (جامع بیان العلم وفضلہ، جزء اول، صفحہ ۱۶۶)

رکبوا المراکب واغتدوا زمرا الی باب الخلیفه
صبح ہوئی اور سوار ہو کر خلیفہ کی ڈیوڑھی کی طرف دوڑے

وصلوا البکور الی الرواح لیبلغوا الرتب الشریفه
اونچے عہدوں کی طلب میں رات دن ایک کر دیتے ہیں

ضاقت قبور القوم واتسعت قصورهم المنیفه
ان کی قبریں تو تنگ ہو چکی ہیں مگر اونچے محل خوب وسیع ہیں

---

[۱] ماکانوا یجترئون علی ذالک وانما کانوا یقولون نکرہ ھذا ونری ھذا حسنا، جزء ثانی ۱۴۶

متفقه جمع الحديث الی قیاس ابی حنیفه

متفقہ ہیں انھوں نے احادیث کو قیاس ابو حنیفہ کے مطابق کرلیا ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذاہب فقہ کے ابتدائی بانیوں کے ذہن میں ہرگز وہ تفریقی شدت نہ تھی جو بعد کو وقوع میں آئی۔ مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ عبادتی فقہ کو مختلف مذاہب میں تقسیم کرنے کا کوئی دوسرا نتیجہ بھی نکل نہ سکتا تھا۔ ساری تاریخ بتاتی ہے کہ مابعد الطبیعیاتی اموریں، دوسرے لفظوں میں وہ امور جن کی صداقت کو عقلی طور پر جانچا نہ جاسکتا ہو، انسان بے حد حساس واقع ہوا ہے۔ اس قسم کے اموریں معمولی اختلاف بھی دو انسانی گروہوں کے درمیان ناقابل عبور دیوار کھڑی کر دینے کے لئے کافی ہے۔ مثال کے طور پر قصاص کے بارے میں امام شافعی نے سورہ حج کی آیت ۶۰ سے استدلال کیا ہے کہ کسی شخص سے قصاص اسی خاص ڈھنگ پر لیا جائے گا جس ڈھنگ پر اس نے ظلم کیا ہو۔ مثلاً کسی نے اگر ایک آدمی کو پانی میں ڈبا کر مارا ہے تو اس کو بھی ڈبا کر ہی مارا جائے گا، کسی نے آگ میں جلا کر مارا ہے تو اس کو بھی جلا کر مارا جائے گا۔ مگر حنفیہ اس کے قائل نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قتل خواہ کسی طریقہ سے کیا گیا ہو، قاتل سے قصاص ایک ہی معروف طریقہ پر لیا جائے گا۔

قانون کے ماہرین اور علماء کے درمیان قانون کی تعبیر میں اس قسم کے اختلافات ہمیشہ ہوتے ہیں۔ مگر یہ اختلاف فرقہ بندی اور باہمی تعصب پیدا نہیں کرتا۔ اس کے برعکس عبادتی اموریں اتنا سا اختلاف بھی ایک ہی جگہ دو عبادت گاہیں بنوا دیتا ہے کہ نماز با جماعت کے لئے تکبیر کہی جائے تو مقتدیوں کو شروع ہی میں صف بنا کر کھڑا ہو جانا چاہئے یا اس وقت جب مکبر قد قامت الصلوٰۃ کہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے: الخلاف فی الدین ینتج من الخصومة اکثر مما ینتج الخلاف فی السیاسة۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں باہمی اختلاف کی واحد سب سے بڑی وجہ وہ عبادتی اختلاف ہے جس کو الگ الگ فقہ کی شکل میں مرتب کیا گیا۔ حالانکہ یہ اختلاف جو حقیقۃً انتہائی ضمنی تھا، باعتبار حقیقت کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ وہ چیز جس کو فقہاء "متعارض روایتوں" میں ترجیح یا افضلیت تلاش کرنا کہتے ہیں، عباداتی اموریں اکثر اوقات غیر ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ تعارض حقیقۃً عبادت کی ضمنی شکلوں میں تنوع کی تصدیق کرتا ہے نہ کہ اختلاف کو بتاتا ہے جس کو ختم کرنے کے لئے کسی علمی مشقت کی ضرورت ہو۔

اسی کے ساتھ ایک نقصان اور بھی ہوا۔ ان جزئیات یا دوسرے لفظوں میں "تکمیلی احکام" کی اہمیت ابتدائی فقہاء کے نزدیک اگرچہ اس سے زیادہ نہ تھی کہ عوام کو ایک بنا بنایا مکمل ڈھانچہ دے دیا جائے تاکہ وہ بآسانی ان عبادات کو ادا کر سکیں۔ مگر یہاں بھی انسان کی تاریخی کمزوری ان کے معصوم ارادوں پر غالب آگئی۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ عبادت ایک انتہائی مقررہ عمل کو یکسانیت کے ساتھ دہرانے کا نام ہے۔ اس طرح، اگرچہ اعتقادی طور پر نہیں مگر عملی طور پر، حقیقتِ عبادت کے بجائے شکلِ عبادت لوگوں کا مقصود بن گیا۔

موجودہ عباداتی فقہ نے، اس طرح، بیک وقت مسلمانوں کو دو تحفے دیئے ہیں۔ ایک اختلاف دوسرے مذہبی جمود۔ اہل حدیث کا گروہ اسی فقہی خرابی کو ختم کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا۔ مگر وہ خود ایک شدید تر قسم کا فقہی گروہ

پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے بھی وہی غلطی کی جو ان کے پیش رووں نے کی تھی۔ "آمین" آہستہ کہی جائے یا بلند آواز سے، امام کے پیچھے فاتحہ پڑھی جائے یا نہ پڑھی جائے، اس قسم کے ضمنی فروق جو عبادتی افعال کے بارے میں روایات میں ملتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو تسلیم کرنے کے بجائے وہ دوبارہ اس کوشش میں لگ گئے کہ ایک کو راجح قرار دے کر بقیہ کو مرجوح ثابت کریں۔ اور اس طرح دوسروں کے بالمقابل خود اپنا ایک "صحیح تر" نظام عبادت مقرر کریں۔ اس قسم کی کوشش صرف ایک نیا فقہی فرقہ وجود میں لا سکتی تھی اور اس نے وہی انجام دیا۔

اس صورت حال کی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ عبادتی فقہ کو معاملاتی فقہ سے الگ کر دیا جائے جیسا کہ وہ دوسری صدی ہجری سے پہلے تک الگ تھی۔ معاملاتی فقہ میں اجتہادی تفصیلات یا مزید تعینات نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہیں۔ مگر عبادتی فقہ کو صرف انھیں طریقوں کی جمع و ترتیب تک محدود رہنا چاہئے جو صحیح روایات میں موجود ہیں۔ یہاں نہ ترجیح پسندیدہ ہے نہ تخریج۔ جہاں ایک سے زیادہ طریقے ملیں، وہاں ضروری حوالوں کے ساتھ تمام طریقوں کو درج کر دینا چاہئے، بجائے اس کے کہ ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ خلیفہ ہارون رشید نے ایک بار ارادہ کیا کہ تمام لوگوں کو حکم دے دیا جائے کہ وہ مسائل میں صرف امام مالک کی فقہی رایوں پر عمل کریں۔ امام موصوف نے خلیفہ کو روک دیا اور فرمایا کہ ایسا نہ کرو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب فروعات میں مختلف ہوئے ہیں (لا تفعل فان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اختلفوا فی الفروع (حجۃ اللہ) فروعی اختلاف اگر صحابہ کے لئے اجتماعی عبادت گزاری میں مانع نہ تھا تو ہمارے لئے وہ کیوں مانع ہو جائے گا کہ "وہی ضرورت" کے نام پر دین میں ایسے اضافے کریں جو خدا و رسول کے دیئے ہوئے توسعات کا دروازہ بند کر دے۔ اس کا غیر مطلوب ہونا اس تاریخی واقعہ سے ثابت ہے کہ ان "اختلافات" کے باوجود صحابہ کا یہ حال تھا کہ وہ بنیان مرصوص (صف) بنے ہوئے تھے۔ اور جب اختلافات کو ختم کر کے یکساں عبادتی نظام بنایا گیا تو امت میں ایسا اختلاف پڑا کہ آج تک ختم نہ ہوا۔

دوسری انتہائی ضروری چیز مدارس دینیہ میں تعلیم کے موجودہ نہج کی تبدیلی ہے۔ اس برائی کو امت کے اندر مسلسل باقی رکھنے کا واحد مؤثر عامل یہی ادارہ ہے۔ ہمارے دارالعلوم، موجودہ حالات میں، صرف اس بات کا ذریعہ بن گئے ہیں کہ اپنے مخصوص فقہی مسلک کو قرآن و سنت کے مطابق ثابت کر دکھائیں۔ ۱۳۳۰ھ میں رشید رضا مصری ہندستان آئے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ دارالعلوم دیوبند بھی گئے۔ وہاں ان کے خیر مقدم کے لئے ایک جلسہ ہوا۔ اس موقع پر موصوف نے دارالعلوم کے ایک استاد سے پوچھا کہ یہاں حدیث کے درس کا طریقہ کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ جب حدیث پڑھی جاتی ہے تو محدث پہلے اس کے علمی نکات کو بیان کرتا ہے۔ اگر بادی الرائے میں حدیث امام ابو حنیفہ کے مسلک کے خلاف ہوتی ہے تو محدث حنفی مسلک سے اس کی مطابقت ثابت کرتا ہے۔ رشید رضا نے یہ سن کر کہا، کیا یہی تمام احادیث میں ہوتا ہے۔ کہا گیا ہاں۔ انھیں یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی۔

مولانا محمد یوسف بنوری (۱۹۷۷ - ۱۹۰۸) کی روایت کے مطابق (نفحۃ العنبر صفحہ ۱۷) انھوں نے کہا:

ھل الحدیث حنفی، وکیف یمکن ذلک وھل	کیا حدیث بھی حنفی ہے۔ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔
ھٰذا الا عصبیۃ مالہا من سلطان	یہ تو محض عصبیت ہے جس کے لئے کوئی دلیل نہیں۔

مولانا انور شاہ کشمیری اس زمانہ میں دارالعلوم میں حدیث کے استاد تھے۔ انھیں یہ خبر پہنچی تو انھوں نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں اسی کو اپنا موضوع بنایا اور "ثابت" کر دیا کہ تمام حدیثیں فقہ حنفی کے مطابق ہیں۔

تاہم مولانا انور شاہ کشمیری (۱۹۳۴ - ۱۸۷۵) کو آخر عمر میں اس طریق تعلیم کی خامی کا احساس ہو گیا تھا۔ موصوف کے شاگرد مولانا مفتی محمد شفیع (۱۹۷۶ - ۱۸۹۷) ناقل ہیں کہ مولانا کشمیری نے ان سے کہا: "ہماری تمام کد و کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کریں۔ مگر کیا حاصل ہے اس کا۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صواب محتمل الخطاء ثابت کریں اور دوسرے مسلک کو خطاء محتمل الصواب کہیں۔ ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو۔ اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ وہ صواب ہو۔ قبر میں منکر نکیر یہ نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا۔ آمین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی۔ جس چیز کو نہ دنیا میں نکھرنا ہے نہ محشر میں۔ اس کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی۔ اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی جس کی دعوت انبیاء کرام لے کر آئے تھے۔ آج وہ دعوت تو نہیں دی جا رہی۔ ہم لگے ہوئے ہیں ان فروعی بحثوں میں۔" (الجمعیۃ دہلی)

ہمارے عربی مدارس، خواہ وہ کسی بھی مسلک کے تحت قائم ہوئے ہوں، ان میں شیخ الحدیث کا منصب اسی قسم کی فقہی پہلوانی کے لئے خاص ہو گیا ہے۔ یہاں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو بظاہر عالم دین کی سند لے کر نکلتے ہیں مگر حقیقۃً وہ عالم اختلاف ہوتے ہیں۔ وہ علم دین کا کمال یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے فقہی مذاہب کے مقابلہ میں اپنی فقہ کو صحیح ثابت کر دکھائیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے دینی فروق کو لے کر ان کی بنیاد پر اکھاڑے قائم کرتے ہیں اور ساری امت کو ایسے جدال و نزاع میں الجھا دیتے ہیں جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ مزید یہ کہ غیر اہم فقہی فروق کو اہم ترین دینی مسئلہ بنا کر وہ عوام کے اندر یہ ذہن پیدا کرتے ہیں کہ عبادت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ فلاں مخصوص اشکال کے بجائے فلاں مخصوص اشکال کے ساتھ اس کو دہرا لیا جائے۔ مدارس دینیہ میں جب تک اس قسم کی نسل پیدا کرنے کا سلسلہ بند نہ کیا جائے عوام کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ ان مدارس کے سلسلے میں کم سے کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ امتِ واحدہ کو انھوں نے امتِ متفرقہ میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے:

اَلَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا ، كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (روم - ۳۲)	جنھوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اپنے دین کو اور ہو گئے فرقے فرقے، ہر گروہ اسی میں خوش ہے جو اس کے پاس ہے۔

۲۔ اس سلسلے کی دوسری چیز وہ ہے جس کو تصوف کہتے ہیں۔ پہلا شخص جس کو اسلام کی تاریخ میں "صوفی" کے لفظ سے پکارا گیا، غالباً ابو ہاشم الصوفی (۱۵۰ھ) تھے۔ تاہم اس وقت تک صوفی کے معنی صرف یہ تھے کہ وہ شخص جو زہد

اور عبادت میں غلو کرے۔ چونکہ یہ لوگ اچھے لباس کو چھوڑ کر صوف (اون) کے معمولی کپڑے اپنے جسم پر لپیٹ لیتے تھے، اس لئے انھیں صوفی کہا جانے لگا۔ اس کے بعد اس کے قواعد اور اصطلاحات بننے لگے۔ یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری میں پہنچ کر تصوف نے اسلامی روحانیات کے ایک باقاعدہ فن کی شکل اختیار کر لی۔ اشراقی فلسفہ، رہبانیت اور ویدانت میں اس کے لئے کافی مواد تھا۔ اس طرح مختلف بیرونی عناصر کی مدد سے ایک ایسی چیز وجود میں آئی، جس پر اگرچہ اسلام کا لیبل لگا ہوا تھا، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک متوازی مذہب تھا جو اسلام کے اندر اسلام کے بالمقابل بنایا گیا۔

تصوف کی ایک قسم وہ ہے جس کو "باطنیت" کہا جاتا ہے۔ تیسری صدی ہجری میں، خاص طور پر ایران میں، کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جن کا کہنا تھا:

ان للقرآن ظاهرا وباطنا، والمراد باطنه — قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے، اور مقصود باطن ہی ہے۔

اسی لئے وہ باطنیہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ علماء کے متفقہ فیصلہ کے مطابق یہ زنادقہ کا گروہ تھا جس نے اپنی اباحیت اور بے عملی کو چھپانے کے لئے یہ نظریہ گھڑ لیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ الصوفی لا مذهب له (صوفی کا کوئی مذہب نہیں) اس فرقہ کے ایک شخص سے کہا گیا، تم نماز نہیں پڑھتے (الا تصلی) اس نے جواب دیا:

انتم مع اورادکم ونحن مع وارداتنا — تم اپنے اوراد میں ہو اور ہم اپنی واردات میں

ان کا عقیدہ تھا کہ شریعت کے مکلف عوام ہیں نہ کہ خواص (ان التکلیف خاص بالعوام، ساقط بالخواص)۔ اسی طرح وہ لوگ ہیں جو حلول اور اتحاد کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ سالک جب اپنے سلوک کی آخری منزل پر پہنچتا ہے تو خدا اس کے اندر اتر آتا ہے۔ اس وقت بندے اور خدا میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ اس کے لئے یہ کہنا صحیح ہو جاتا ہے کہ ھو انا وانا ھو (وہ میں ہے، میں وہ ہوں) اسی طرح وحدت الوجود کا نظریہ جس کے تحت ابو حسین الحلاج نے کہا تھا ما فی الجبۃ الا اللہ چنانچہ علماء نے ان کے ارتداد کا فتویٰ دیا اور وہ مقتدر کی خلافت میں ۳۰۱ھ میں قتل کر دیئے گئے۔ اسی طرح تصوف کے وہ طریقے جو سماع و رقص کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ بتاتے ہیں حتیٰ کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو امرد پرستی کو قرب الٰہی کا سبب سمجھتے ہیں۔ اس کے جواز کے لئے انھوں نے ایک حدیث بھی گھڑ رکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں نے اپنے رب کو جوان مرد کی صورت میں دیکھا (رأیت ربی فی صورۃ شاب امرد)

تاہم تصوف کی ان شکلوں پر یہاں ہم کوئی گفتگو نہیں کریں گے۔ کیونکہ علماء متفقہ طور پر ان کی ضلالت کا فتویٰ دے چکے ہیں۔ ہماری گفتگو تمام تر تصوف کے ان طریقوں تک محدود ہوگی جن کو امت کے اندر قبول عام حاصل ہوا، اور جن کو اب تک بے شمار لوگ نجات کا سب سے قریبی ذریعہ سمجھے ہوئے ہیں۔

اس تصوف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مسنون تعبدی طریقوں میں مقداری اضافہ۔ دوسرے مسنون تعبدی طریقوں پر نوعی اضافہ۔ پہلے طریقہ کے بارے میں ابو القاسم جنید بغدادی (۲۹۷ھ) نے کہا ہے:

من هبناهذا مقيد بالكتاب والسنة — ہمارا یہ طریقہ کتاب وسنت کے ساتھ مقید ہے۔

ابتدائی دور کے صوفیاء (اگر انھیں یہ لقب دیا جا سکے) میں یہی پہلی قسم کا تصوف رائج تھا۔ ان لوگوں نے نماز، روزہ، تلاوت قرآن وغیرہ جو بذات خود مسنون طریق عبادت ہیں، ان کی مقدار میں وہ حد بندی باقی نہ رکھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھی۔ مثلاً پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ آپ رات کے پچھلے پہر کچھ رکعتیں (اکثر گیارہ رکعتیں) ادا فرماتے تھے۔ ان بزرگوں نے ساری رات نماز پڑھنی شروع کر دی۔ آپ فرض روزوں کے علاوہ مہینہ میں چند دن مزید روزے رکھ لیتے تھے۔ ان حضرات نے مسلسل روزے رکھنے شروع کر دیئے جس کو صوم وصال کہا جاتا ہے۔ آپ مخصوص اوقات میں قرآن کا کوئی حصہ پڑھ لیا کرتے تھے۔ انھوں نے ہر وقت بس قرآن ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ اگر امام نووی کا بیان صحیح ہو تو ان میں ایسے لوگ بھی ہوئے جو ہر روز آٹھ بار پورا قرآن ختم کر لیتے تھے۔ وغیرہ

عبادت کے مسنون طریقوں میں اس قسم کا اضافہ صراحۃً ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ بخاری ومسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے:

جاء ثلاثة رهط الى بيوت ازواج النبي صلى الله عليه وسلم يسألون عن عبادة النبي صلى الله عليه وسلم. فلما أخبروا كانهم تقالوها. فقالوا: واين نحن من رسول الله وقد غفر له ما تقدم من ذنبه وما تأخر. فقال احدهم: اما انا فاصلي الليل ابدا. وقال آخر: انا اصوم الدهر ولا أفطر. وقال آخر: انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا. فجاء رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: انتم الذين قلتم كذا وكذا. اما والله لانى لاخشاكم لله واتقاكم له، لكني اصوم وافطر واصلي وارقد واتزوج النساء، فمن رغب عن سنتي فليس مني

تین مسلمان ازواج رسولؐ کے گھروں پر آئے اور آپ کی عبادت کے بارے میں دریافت کیا۔ جب انھیں بتایا گیا تو انھیں آپ کی عبادت بہت کم معلوم ہوئی۔ انھوں نے کہا، رسول اللہ سے ہمارا کیا مقابلہ۔ آپ کے تو تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا: میں تو رات بھر نمازیں پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا، میں مسلسل روزے رکھوں گا۔ تیسرے نے کہا، میں تجرد کی زندگی اختیار کروں گا اور عورتوں سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم ہی وہ لوگ ہو جنھوں نے ایسا اور ایسا کہا ہے۔ سنو، خدا کی قسم میں تم سب میں زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور متقی ہوں۔ مگر میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ اور عورتوں سے نکاح کرتا ہوں۔ یہ میری سنت ہے اور جو میری سنت کو چھوڑے وہ مجھ سے نہیں۔

ایک اور روایت اس طرح سے ہے:

اخرج ابن جرير وعبد الرزاق وابن المنذر

آپ کے اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے ارادہ کیا کہ دنیا

عن ابی قلابة قال: اراد ناس من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یرفضوا الدنیا ویترکوا النساء ویترهبوا فقام رسول اللہ فغلظ فیهم المقالة ثم قال: انما هلك من كان قبلكم بالتشدید۔ شددوا علی انفسهم فشدد اللہ علیهم۔ فاولئك بقایاهم فی الدیار والصوامع۔ اعبدوا اللہ ولا تشركوا به شیئا وحجوا واعتمروا واستقیموا یستقم بكم

کو ترک کر دیں اور عورتوں سے قطع تعلق کر لیں اور راہب بن جائیں۔ رسول اللہ کو معلوم ہوا تو آپ وعظ کے لئے کھڑے ہوئے اور ان کے متعلق سخت گفتگو فرمائی۔ آپ نے کہا تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ اسی قسم کی شدت کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ انھوں نے اپنے اوپر شدت کی تو اللہ نے بھی ان پر شدت کی۔ انھیں کی بقایا ہے جو صوامع میں ہے۔ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ حج کرو، عمرہ کرو اور سیدھے رہو، تمھارے ساتھ سیدھا معاملہ کیا جائے گا۔

ان "عباد و زہاد" کی مدافعت میں جو لٹریچر تیار ہوا، اس کا خلاصہ مولانا عبد الحیٔ لکھنوی (۱۳۰۴-۱۲۶۴ھ) کی کتاب اقامۃ الحجۃ علی ان الاکثار فی التعبد لیس ببدعۃ (حلب - ۱۹۶۶ء) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تمام دلائل کی قدر و قیمت صرف اس وقت تک ہے جب کہ متعلقہ "اکابر" کے عمل کا لازماً صحیح ہونا بطور پیشگی مفروضہ کے مان لیا جائے۔ اگر اس مفروضہ کو ذہن سے نکال دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان توجیہات کی علمی اعتبار سے کوئی حقیقت نہیں۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے اپنی امت پر شفقت کی وجہ سے کم عبادتیں کیں، کیونکہ آپ اگر زیادہ عبادت کرتے تو ساری امت پر ویسا ہی کرنا فرض ہو جاتا۔ (کان یترك كثرة العبادات شفقة علی امته ورحمة علی اتباعه لئلا یتحرجوا باتباعهم فی ذلك)

اس استدلال کی کمزوری اس واقعہ سے ثابت ہے کہ عبادات میں تشدد کے بجائے آپ کا اعتدال اگر امت پر شفقت کی وجہ سے تھا تو آپ نے دوسرے معاملہ میں لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (شعراء - ۳) کا اسوہ اپنی امت کے لئے کیوں چھوڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے مومن بندوں سے یہ مطلوب ہی نہیں کہ وہ اس قسم کے کرشمے دکھائیں کہ مغرب کے وضو سے فجر کی نماز پچاس سال تک پڑھتے رہیں اور روزانہ آٹھ آٹھ بار قرآن "ختم" کر ڈالیں۔ اپنے جسم کو غیر ضروری مشقت میں ڈالنا یا رات دن کچھ اشکال عبادت کو دہراتے رہنا وہ چیز نہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہو۔ اس کو جو چیز مطلوب ہے وہ اندرونی طور پر تو یہ ہے کہ اس کے بندے اس کی محبت اور خوف سے سرشار ہوں۔ اور خارجی طور پر یہ کہ ایک طرف اپنے عمل کو زندگی کی تمام سرگرمیوں میں خدائی تعلیم کے مطابق بنائیں، اور دوسری طرف دوسرے بندگان خدا کو اللہ کے دائرہ میں لانے کی کوشش کریں۔

بعد کے بزرگوں کے بارے میں کثرت "عبادت" کے افسانے، اگر بالفرض صحیح ہوں جب بھی یہ وہ دین نہیں جو پیغمبر عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے لائے اور جو قرآن و سنت کی شکل میں اب بھی ہمارے پاس پوری طرح محفوظ ہے۔ اس قسم کے کمالات جو بعد کے لوگوں سے منقول ہیں، بلاشبہ ان کا ہدی محمدی سے کوئی تعلق نہیں۔

مگر دورِ زوال کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ اپنے رجال پر تنقید کی جرأت ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے اعمال پر نکیر کے بجائے ان کی توجیہہ بلکہ تحسین شروع ہو گئی۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ وہ اس قدر مقدس ہو گئے کہ اب کسی کے لئے یہ سوچنا بھی محال ہو گیا کہ ان میں کوئی نقص ہے۔ حافظ ذہبی (۷۴۸ھ) اور ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) کا تشدد صوفیاء کے بارے میں مشہور ہے۔ مگر ان کا بھی یہ حال ہے کہ کسی کی مدح و ثنا کے ذیل میں کثرت عبادت کے قصے نقد و جرح کے بغیر نقل کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ یہ قصے باعتبار واقعہ بھی اکثر ناقابل اعتبار ہوتے ہیں اور دین کی حقیقت سے تو ان کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ یہی حال ہماری اکثر کتابوں کا ہے۔

تصوف کی دوسری شکل، تعبدی امور میں نوعی اضافہ کا معاملہ، پہلی سے بھی زیادہ شدید ہے۔ پہلا اگر قرآن کے الفاظ میں اعتدار (اعراف۔۵۵) ہے تو دوسرا ابتداع (حدید۔۲۷) اور معلوم ہے کہ دین میں احداث اور ابتداع، خواہ وہ اچھی نیت ہی سے کیوں نہ ہو، قطعاً مردود ہے۔ بخاری و مسلم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے:

من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو ردٌّ	جو ہمارے دین میں کوئی نئی چیز لائے وہ رد ہے

امام زادہ جوغی سمرقندی (۵۷۳ھ) نے اپنی کتاب شرعۃ الاسلام میں صحابہ کے بارے میں لکھا ہے:

وقد کانت الصحابة ینکرون اشد الانکار علی من احدث او ابتدع رسما لم یتعهدوه فی عهد النبوة قل ذلك او کثر صغر ذلك او کبر (صفحہ ۹)	صحابہ اس شخص کے خلاف شدید ترین انکار کرتے تھے جو کوئی ایسا طریقہ نکالے جس کو انھوں نے نبوت کے زمانہ میں نہ دیکھا ہو خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، چھوٹا ہو یا بڑا۔

صحابہ کا یہ شدید رد یہ عبادات کے بارے میں تھا، معاملات کے بارے میں نہ تھا۔ معاملات انسانی کا بہت گہرا تعلق دنیا کے عملی حالات سے ہے جو ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ اس لئے اس میں صراحۃً نئے فیصلوں کی اجازت دی گئی ہے جس کو قرآن میں استنباط (نساء۔۸۳) اور حدیث میں اجتہاد (معاذ بن جبل) کہا گیا ہے۔ مگر عبادت کا تعلق ازلی و ابدی ہستی کے ساتھ انسان کے رویہ سے ہے اس لئے اس میں کسی تبدیلی اور اضافہ کا سوال نہیں۔ تدریجی حکمت یا معذوری کی بنا پر کسی کے ساتھ رعایت تو کی جاسکتی ہے مگر اپنی طرف سے قیاسی اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ عبادات کے معاملہ میں صرف اتباع ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا اتبعوا ولا تبتدعوا (اتباع کرو، نئی چیز نہ نکالو) معاملات کے باب میں مسلسل اجتہاد کیا گیا۔ مگر کسی صحابی نے نکیر نہ کی۔ مگر عبادات میں ذرا سا نیا پن بھی ان کے لئے ناقابل برداشت ہوتا تھا۔ عبداللہ بن مغفل کے صاحبزادہ کہتے ہیں:

سمعنی ابی وانا فی الصلاة اقول: بسم الله الرحمٰن الرحیم فقال لی: ای بُنَیَّ مُحْدَثٌ، ایاك والحدث (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی)	میرے باپ نے مجھ کو نماز میں کہتے ہوئے سنا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تو مجھ سے کہا، میرے بیٹے یہ نئی چیز ہے اور تم کو چاہئے کہ نئی چیز سے بچو۔ ۵

---

۵ ذہنی کیفیت کے تحت حمد یا دعا کا کلمہ زبان سے نکل پڑے تو جائز ہے مگر اس کو مسئلہ بنانا جائز نہیں۔

معاملات انسانی کی نوعیت چونکہ دنیوی حالات کی تبدیلی سے بدلتی رہتی ہے، اس لئے اس میں اجتہاد کی اجازت دی گئی تھی۔ مگر عبادات و روحانیات کے پہلو سے جو کچھ مطلوب ہے، اس میں کمی بیشی کا سوال نہیں۔ اس میں صرف اتباع ہے۔ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم و فضلہ میں سعید بن مسیب سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے خطبہ دیا اور اس میں فرمایا:

یا ایہا الناس انہ قد سنت لکم السنن و فرضت لکم الفرائض و تُرکتم علی الواضحۃ، الا ان تضلوا بالناس یمینا و شمالا (جزء ثانی، صفحہ ۱۸۷)

اے لوگو تمہارے لئے طریقے جاری کر دیئے گئے اور تمہارے لئے فرائض مقرر کر دیئے گئے۔ اور تم ایک واضح امر پر چھوڑ دیئے گئے۔ خبردار لوگوں کے ساتھ دائیں بائیں نہ بھٹک جانا۔

نبوت کے بعد امت مسلمہ کے اندر جو فتنے پیدا ہوئے، ان کو شاہ ولی اللہ نے تیس تک شمار کیا ہے۔ دسواں فتنہ ان کے الفاظ میں یہ ہے ــ "سنت ماثورہ میں جو اوراد و وظائف آگئے ہیں، ان کے علاوہ اپنی طرف سے مزید اوراد و وظائف کا بہ نیت تقرب الی اللہ عزوجل یعنی ثواب پانے کی غرض سے اختراع کرنا اور امور مستحبہ کو مثل واجبات کے اپنے ذمہ لازم کر لینا اور لوگوں میں ان وظائف کے پھیلانے کی رغبت کا دلوں میں پیدا ہونا (ازالۃ الخفا) شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں جو روایتیں نقل کی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

دارمی نے حکم بن مبارک سے روایت کی ہے، وہ کہتے تھے ہمیں عمرو بن یحییٰ نے خبر دی، وہ کہتے تھے میں نے اپنے والد سے سنا، وہ اپنے والد سے نقل کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ ہم نماز فجر سے پہلے عبداللہ بن مسعود کے دروازہ پر جاکر بیٹھ رہتے تھے۔ جب وہ اپنے گھر سے نکلتے تو ہم ان کے ساتھ مسجد میں جاتے تھے۔ ایک روز ابن مسعود کے مکان پر بوقت معہود ابوموسیٰ اشعری آئے اور ہم سے پوچھا کیا ابوعبدالرحمٰن (عبداللہ بن مسعود) گھر سے نکلے۔ ہم نے جواب دیا کہ ابھی نہیں نکلے۔ یہ سن کر وہ ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن مسعود گھر سے برآمد ہوئے۔ اور ہم لوگ ان کے ساتھ اٹھ کر چلے۔ پھر ان سے ابوموسیٰ نے کہا، اے ابوعبدالرحمٰن، میں نے ابھی مسجد میں ایک نئی بات دیکھی۔ مگر الحمدللہ میں نے اچھی بات دیکھی۔ عبداللہ بن مسعود نے پوچھا، تم نے کیا دیکھا۔ ابوموسیٰ نے کہا اگر مسجد پہنچنے تک آپ زندہ رہے تو آپ بھی دیکھ لیں گے۔ پھر کہا، میں نے مسجد میں لوگوں کو دیکھا کہ وہ جدا جدا حلقے کرکے بیٹھے ہیں اور نماز کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہر حلقہ میں ایک ایک شخص ہے جس کے ہاتھ میں سنگریزے ہیں، وہ کہتا ہے: سو مرتبہ اللہ اکبر کہو، سب لوگ سو بار اللہ اکبر کہتے ہیں اور ان سنگریزوں پر گنتے جاتے ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے سو بار لا الٰہ الا اللہ کہو، سب لوگ سو بار لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے سو بار سبحان اللہ کہو، سب لوگ سو بار سبحان اللہ کہتے ہیں۔ یہ سن کر عبداللہ بن مسعود نے پوچھا کہ پھر تم نے ان سے کیا کہا۔ ابوموسیٰ نے جواب دیا، آپ کی رائے اور آپ کے حکم کے انتظار میں میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ انھوں نے کہا، تم نے کیوں نہ ان کو حکم دیا کہ ان سنگریزوں پر تکبیر و تہلیل و تسبیح کے بجائے وہ لوگ اپنے اپنے گناہوں کو شمار کریں۔ اور تم نے ان سے اس بات کی ذمہ داری کیوں نہ لی کہ ان کی نیکیوں میں سے کچھ ضائع نہ ہوگا۔

شمار کرنا بے کار ہے۔ یہ کہہ کر ابن مسعود چلے اور ہم سب ان کے ساتھ چلے۔ یہاں تک کہ وہ ان حلقوں میں سے ایک حلقے کے پاس پہنچ کر ٹھہر گئے۔ اور ان لوگوں سے پوچھا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ انھوں نے جواب دیا، اے ابوعبدالرحمٰن ہم ان سنگریزوں سے تکبیر اور تہلیل اور تسبیح کے کلمات شمار کرتے ہیں۔ ابن مسعود نے کہا، اس کے بجائے تم لوگ اپنے اپنے گناہوں کو شمار کرو اور میں ضامن ہوتا ہوں کہ تمھاری نیکیوں میں سے کوئی نیکی ضائع نہ ہوگی۔ اے امت محمد! تمھارا برا ہو۔ تمھاری ہلاکت کتنی جلد آگئی۔ ابھی تمھارے نبی کے اصحاب کثرت سے موجود ہیں۔ تمھارے نبی کے کپڑے ابھی بوسیدہ نہیں ہوئے اور آپ کے برتن ابھی نہیں ٹوٹے۔ مگر تم ابھی سے بدعتیں ایجاد کرنے لگے۔ قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یا تو تم ایک ایسے دین پر ہو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے زیادہ راہ راست پر ہے یا تم گمراہی کے دروازہ پر پہنچ گئے ہو اور وہ دروازہ کھلنے والا ہے۔ ان لوگوں نے جواب دیا، اے ابوعبدالرحمٰن خدا کی قسم، ہم اس فعل سے نیکی ہی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ابن مسعود نے کہا، بہت سے نیکی کا ارادہ کرنے والے ایسے ہیں کہ انھیں نیکی نہیں ملتی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا ہے کہ بہت سے لوگ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن ان کے گلے سے تجاوز نہ کرے گا۔ خدا کی قسم میں نہیں جانتا شاید تم میں اکثر ایسے لوگ ہوں۔ (ازالۃ الخفار عن خلافۃ الخلفار، مقصد اول)

یہ روایت جس کو دارمی کے علاوہ طبرانی نے اور ابونعیم نے حلیۃ الاولیار میں مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے، یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ عبادتی امور میں صحابہ کس قدر حساس تھے اور معمولی جدت کو بھی انتہائی طور پر ناپسند کرتے تھے۔ کجا کہ یہ اضافے اتنے زیادہ ہو جائیں کہ وہ متوازی مذہب بن جائے اور باقاعدہ اس کے ماہرین اور معلمین پیدا ہونے لگیں۔

وصفی زبان

تصوف کا ابتدائی محرک یہ تھا کہ فقہ ظاہری کی طرح ایک "فقہ باطن" بنائی جائے اور اس کے قواعد وضع کئے جائیں۔ مگر یہ کوئی سادہ بات نہ تھی۔ یہ ایک کیفی حقیقت کو وصفی زبان (DESCRIPTIVE LANGUAGE) میں بیان کرنا تھا۔ فنی اصطلاحات کی زبان کسی شے کے صرف خارجی پہلوؤں کا احاطہ کر سکتی ہے، اس لئے بندے اور خدا کے درمیان تعلق جیسے معاملہ کو فن کا موضوع بنانا دین میں ایک قسم کے عمل تفریق کو جگہ دینا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کیفیت محبت کے بیان کے لئے ریاضیاتی زبان کو استعمال کیا جائے۔ اس کوشش نے عبادت الٰہی کے کیفی پہلو کو اس کے خارجی مظاہر سے الگ کر دیا۔ ذکر نے ورد کی صورت اختیار کر لی اور کثرت ذکر کے معنی یہ ہو گئے کہ کچھ مخصوص الفاظ کو تسبیح کے دانوں پر بتکرار دہرایا جاتا رہے۔ اسی طرح تدبر قرآن (محمد۔ ۲۴) تلاوت قرآن بن گیا۔ کیونکہ متصوفانہ ذوق کے مطابق مقداری پیمانہ میں ناپنے کی چیز تلاوت ہے نہ کہ تدبر و تفکر۔ یہی وجہ ہے کہ متصوفانہ اذکار کی طویل فہرست میں ہم اللہ اور لا الٰہ الا اللہ جیسے الفاظ کا ذکر تو پاتے ہیں مگر دوسری بہت سی چیزیں جن کے

ذکر کو دین میں بے حد اہمیت دی گئی ہے ، اس فہرست میں درج نہیں۔ مثلاً آخرت (مدثر۔ ۵۵) نعمت الٰہی (ملکہ۔۴) آلاء رب (اعراف۔ ۶۹) موت (اکثروا ذکر ھادم اللذات) وغیرہ۔ کیونکہ اللہ اللہ کا ورد تو کیا جا سکتا ہے۔ مگر آخرت آخرت، نعمت نعمت، آلاء آلاء، موت موت کا ورد ایک بے معنی بات ہے۔

جب تعلق مع اللہ ایک خارجی طور پر قابل بیان چیز بن گیا تو اس کے بعد بالکل فطری طور پر یہ ہوا کہ اس کے حصول کے خارجی طریقے وضع ہونے شروع ہو گئے۔ محض قیاس کی بنیاد پر یہ فرض کر لیا گیا کہ انسان کے بدن میں چھ مقامات ہیں جہاں انوار و برکات بھرے ہوتے ہیں۔ ان کو لطائف ستہ کا نام دیا گیا۔ اول لطیفہ قلبی جس کی جگہ بائیں پستان کے نیچے ہے۔ دوسرا لطیفہ روحی جس کا مقام دائیں پستان کے اوپر ہے۔ تیسرا لطیفہ نفس جس کا مقام ناف کے نیچے ہے۔ چوتھا لطیفہ سری جس کا مقام سینہ کے درمیان ہے۔ پانچواں لطیفہ خفی جس کا مقام ابرو کے اوپر ہے، چھٹا لطیفہ اخفیٰ جس کا مقام ام الدماغ ہے۔ اس مفروضہ کی بنا پر عجیب عجیب قسم کے اشغال، ضربات اور مراقبے وضع کئے گئے جن کا مقصد یہ تھا کہ ان مقامات انوار پر زور ڈال کر ان کو جاری کیا جائے تاکہ سارا جسم اللہ اللہ پکارنے لگے۔ مثال کے طور پر ایک طریقہ یہ ہے کہ دونوں آنکھیں اور دونوں لب بند کر کے سانس کو ناف کے نیچے سے نکال کر قلب میں حبس کرے اور لا کو (تصور میں) ناف سے اٹھا کر گلے تک پہنچا کر الٰہ کو گلے سے لطیفۂ روحی کے مقام تک لا کر الا اللہ کی ضرب خوب زور سے اس طرح دل پر لگائے کہ ضرب کا اثر تمام لطیفوں تک پہنچ جائے۔ اس طرح کی بے شمار چیزیں حیرت انگیز حیات کے ساتھ وضع کی گئیں اور ان کو دین کے عبادتی نظام میں "معاون ذریعہ" کی حیثیت سے داخل کر دیا گیا۔ تاہم معاون ذریعہ کا لفظ بھی محض رعایتی تھا کیونکہ بعض ظاہری کرشموں کی وجہ سے عام طور پر یہ ذہن بن گیا کہ معروف دینی طریقوں کے مقابلہ میں یہ طریقے حصول مقصد کے لئے زیادہ مفید ہیں۔ ایک مشہور بزرگ فرماتے ہیں کہ خدا تک پہنچنے کے تین طریقے ہیں جن میں سے ایک طریقہ صوم و صلوٰۃ اور تلاوت قرآن وغیرہ کا ہے، مگر:

روندگان این راہ در زمان طویل بمقصود رسند	اس راہ کے چلنے والے بہت لمبی مدت میں اپنی منزل مقصود کو پہنچتے ہیں۔

تصوف کے طریقے کی حمایت کرتے ہوئے ایک اور بزرگ لکھتے ہیں :

انہا خیر طریق واسرعہا للبلوغ الی غایۃ تزکیۃ النفس وتربیتہا (بحوالہ التصوف والحیاۃ دمشق ۱۹۶۲، ۳۳)	نفس کی تربیت و تزکیہ کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ زیادہ بہتر اور تیز تر طریقہ ہے۔

ہمارے بزرگوں کو یہ غلط فہمی صرف اس لئے ہوئی کہ انھوں نے کیفیت نفسی اور کیفیت عادی میں فرق نہیں کیا۔ رگ کیماس کو دبانا اور ہوجاج حق اور پاس انفاس جیسے عملیاتی طریقوں کی مدد سے کچھ مخصوص الفاظ (یا آوازوں) کو خاص طرح سے ادا کرنے کی مشق کرنا، یہ نتیجہ دکھا سکتا ہے کہ وہ الفاظ یا آوازیں انسان کے طبعی وظائف میں غیر شعوری طور پر شامل ہو جائیں۔ مگر اس لفظی ورزش کا اسلام سے کیا تعلق۔ اس قسم کی کوئی مشق کسی کے اندر یہ طبیعت پیدا کر دے کہ وہ اپنے دل کی دھڑکنوں یا سانس کے آنے جانے میں اللہ اللہ کی آواز سننے لگے تو یہ کسی بھی درجہ میں وہ چیز نہیں ہے

جس کو قرآن میں ذکر کہا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک واہمہ ہے۔ قلب اور تنفس تو درکنار کسی مشین کی "کھٹ کھٹ" کی آواز میں آواز ملا کر اگر آپ "حق حق" کہنے لگیں تو کچھ دیر کی مشق کے بعد آپ کو ایسا محسوس ہوگا گویا مشین سے کھٹ کھٹ کی نہیں حق حق کی آواز آرہی ہے۔ مگر شدید ترین غلط فہمی ہوگی کہ اس قسم کے واہمہ کو ذکر سمجھ لیا جائے۔ ذکر تو ایک اعلیٰ ترین نفسیاتی کیفیت ہے جو آدمی کے شعور کا (نہ کہ عادت کا) حصہ بن کر اس کے پورے وجود میں شامل ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کسی بچھڑے ہوئے محبوب کی یاد کسی کی ہستی میں سما جائے اور اس کو دائمی طور پر بے چین کر دے۔

دین میں اس اضافہ کا لازمی نتیجہ ایک اور شدید تر بدعت کا وجود میں آنا تھا۔ اور وہ ہے "مرشد کامل" کا عقیدہ۔ جب اللہ سے تعلق قائم کرنے کے طریقے صرف وہ نہ رہے جو قرآن و سنت میں درج ہیں، بلکہ ایسے طریقے، نسبتاً زیادہ زود اثر، دریافت ہو گئے جو کچھ خاص لوگوں ہی کو معلوم تھے (مثلاً کہا جاتا ہے کہ "شغل بساط" بلا واسطہ طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خواجہ معین الدین چشتی کو ملا تھا جس کے ذریعہ انھیں معراج باطنی حاصل ہوئی) تو دین نے بالکل فطری طور پر علم سفینہ کے بجائے علم سینہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اب ایسے لوگوں سے نسبت حاصل کرنا ضروری ہو گیا جو پُراسرار طور پر روحانی علوم کے مالک تھے اور اپنے مریدوں کو اس کی نسبت خاص منتقل کر سکتے تھے۔ اسی کے ساتھ خود شیوخ کو بھی یہ ضرورت تھی کہ وہ اپنے اندر ایسی تسخیری قوت پیدا کریں جس کے ذریعہ وہ عالم خیال میں اپنے قلب سے مرید کے قلب پر ضرب لگا سکیں اور اس کے دل کو انوار و برکات سے بھر دیں۔ یہ قوت محض نماز روزہ کے ذریعہ نہیں آسکتی تھی۔ یہ تقاضا انھیں زیادہ سے زیادہ عملیات کی طرف لے گیا۔ اب ایسے بزرگ پیدا ہونے لگے جو اِس قسم کا کرشمہ دکھا سکتے تھے کہ ایک نظر سے آدمی کو تڑپا دیں اور ایک توجہ سے قلوب کو بدل ڈالیں۔ اس طرح عیسائی رہبانوں اور ہندو جوگیوں کا فن تسخیر اسلامی لباس اختیار کر کے دین محمدی میں داخل ہو گیا۔

یہاں پہنچ کر کہنوت (اگر وڈم) پوری طرح اسلام میں داخل ہو گیا۔ حالاں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میری امت میں کہنوت کا کوئی وجود نہیں۔ قرآن میں اس کو خدا کے سوا اس کے بندوں کو رب بنانا قرار دیا گیا تھا۔ شیوخ تصوف کے بارے میں نہایت مبالغہ آمیز تصورات پیش کیے جانے لگے۔ مثلاً الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ (شیخ اپنی قوم میں ایسا ہی ہے جیسے نبی اپنی امت میں) اور من اراد ان یجلس مع اللہ فلیجلس مع اہل التصوف (جو اللہ کے پاس بیٹھنا چاہتا ہے وہ صوفیاء کے پاس بیٹھے) شیوخ کے شعبدوں اور کرامات کی داستانیں اتنی کثرت سے پھیلائی گئیں کہ وہ زبان و ادب کا جزو بن گئیں۔ بالکل بے اصل قسم کی موضوع کہانیوں کو لوگ اس طرح دہرانے اور یقین کرنے لگے گویا یہ بالکل واقعہ ہیں۔ بزرگوں کی مجالس و مواعظ کا بڑا حصہ اسی قسم کی محیر العقول داستانوں پر مشتمل رہنے لگا۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی بھول گئے کہ اس قسم کی کہانیاں بیان کر کے، غیر شعوری طور پر، لوگوں کو یہ تاثر دے رہے ہیں کہ ہمارے بزرگ صحابہ کرام سے بھی زیادہ بلند مرتبہ لوگ تھے۔ کیونکہ صحابہ میں سے کسی کے بارے میں اس قسم کے چمتکار ثابت نہیں۔ صحابہ کے بعض خارق عادت واقعات جو

صحیح روایات میں آتے ہیں۔ وہ ہرگز کرامت کے واقعات نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت اہل ایمان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی نصرت کی ہے۔ کرامت، بطور ایک شخصی صفت کے، قطعاً ایک غیر اسلامی تصور ہے۔ اسلام میں جو چیز ثابت ہے وہ صرف دعا اور اس کی مقبولیت کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی نصرت ہے۔ یہ نصرت بلاشبہ صحابہ کرام کو حاصل ہوئی اور آج بھی مسلمانوں کو حاصل ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ صحابہ والے کام کو کر سکیں۔ صحابہ کی کرامتوں اور موجودہ زمانہ کے بزرگوں کی کرامتوں کا فرق اسی سے واضح ہے کہ صحابہ کی کرامتوں نے عرب و عجم سے باطل کا استیصال کر دیا تھا جب کہ ہمارے بزرگوں کا حال یہ ہے کہ کرامات کی مفروضہ دنیا میں تو جن و انس، نباتات و حیوانات سب کو وہ مسخر کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر حقیقت کی دنیا میں ان کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ ان کے چاروں طرف باطل طاقتیں اسلام اور ملت اسلام کو روند رہی ہیں اور وہ ان کے دفعیہ کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔

بزرگ پرستی (دوسرے لفظوں میں بزرگی کی گدی وجود میں آنے) کا فتنہ یہیں نہیں رکا۔ کرامات اور شعبدوں کی فرضی داستانیں جو تمام مجالس تصوف کا سب سے نمایاں جزء ہوتی ہیں، انھوں نے لوگوں کے ذہن کو اس قدر توہماتی بنا دیا کہ اب وہ اپنے بزرگوں کو عام انسانوں سے الگ ایک مستقل طبقہ فرض کرنے لگے جس طرح انبیاء و ملائکہ عام انسانوں سے الگ ایک طبقہ ہوتے ہیں۔ ان کو خدا کا مختار و مصطفیٰ فرض کر لیا گیا اور ان کی طرف ایسے ایسے فضائل منسوب کرنے لگے جو مضحکہ خیز حد تک بے معنی تھے۔ اسی میں سے "اولیاء اللہ" کا مروجہ تصور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اولیاء اللہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اہل ارشاد، دوسرے اہل تکوین۔ اول الذکر خدا کے وہ چنے ہوئے لوگ ہیں جن کے سپرد مخلوق کی ہدایت، قلوب کی اصلاح و تربیت اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کے طریقوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ ان اولیاء میں جو اپنے زمانہ میں سب سے افضل ہو وہ قطب الارشاد کہلاتا ہے۔ ثانی الذکر سے مراد وہ اولیاء اللہ ہیں جن کے سپرد مخلوق کی معاش کی اصلاح، دنیا کا انتظام اور مصائب کا دفع کرنا ہوتا ہے۔ یہ خدا کے اذن کے تحت اپنی باطنی قوت سے ان امور کی درستی کرتے رہتے ہیں۔ ان میں جو سب سے اعلیٰ اور دوسروں کے اوپر حاکم ہوتا ہے اس کو قطب التکوین کہتے ہیں۔ گویا اہل ارشاد، انبیاء کے مماثل ہیں اور اہل تکوین، فرشتوں کے مماثل جن کو مدبرات الامر کہا گیا ہے — حیرت انگیز بات ہے کہ اتنا بڑا عقیدہ بے شمار لوگوں نے نہایت اخلاص کے ساتھ قبول کر لیا حالانکہ قرآن و حدیث میں اس کے لئے قطعاً کوئی سند موجود نہ تھی۔

تصوف کے ابتدائی موجدین خواہ کتنے ہی نیک نیت ہوں، اس میں کوئی شک نہیں کہ تصوف اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ٹھیک وہی چیز تھی جس کو قرآن میں ابتداع (حدید ـ ۲۷) کہا گیا ہے۔ کچھ بزرگوں نے سادہ طور پر یہ سوچا کہ دین کی اصل حقیقت (تعلق باللہ) کو لوگوں کے اندر پیدا کرنے کے لئے کچھ ایسے اضافی طریقے وضع کریں جن کو اسلام کی منصوص عبادتوں کے ساتھ بطور معاون تدبیر کے استعمال کیا جا سکتا ہو۔ مگر وہ بھول گئے کہ اس طرح وہ خدا پرستی کے بجائے انسان پرستی کو اسلام میں داخل کر رہے ہیں۔ جب اللہ سے تعلق پیدا کرنے اور اس سے قریب ڈھونڈنے کا علم ایک ایسا علم بن جائے جس کو صرف قرآن و سنت سے معلوم نہ کیا جا سکتا ہو تو لازماً ایسا ہوگا کہ وہ

لوگ مرشد اور مرجع قرار پا جائیں جن کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ "نفوس مزکاۃ" ہیں اور سینہ بہ سینہ اس پر اسرار علم کے وارث بنتے چلے آرہے ہیں۔ مزید یہ کہ اس تدبیر کو اختیار کرکے ہمارے یہ بزرگ خدا کی "ممنوعہ چراگاہ" میں داخل ہو گئے۔ کیونکہ عبادتی امور میں کسی بھی قسم کا اجتہادی اضافہ مطلق طور پر ناجائز ہے۔

اسلام کی بعد کی تاریخ میں انحراف کی جو صورتیں پیدا ہوئیں، ان میں دو چیزیں نہایت عجیب تھیں۔ ایک معاملات کے باب میں اجتہاد کا دروازہ بند کرنا۔ دوسرے، عبادات کے باب میں اجتہاد کا دروازہ کھولنا۔ حالاں کہ شریعت کے حقیقی منشا کے اعتبار سے معاملہ اس کے برعکس تھا۔ معاملات کے بارے میں صریح طور پر اجازت دی گئی تھی کہ نئے پیش آمدہ امور پر اسلام کی اصولی تعلیمات کی روشنی میں غور کرکے حکم لگایا جائے۔ ابتدائی دور کے فقہا نے اسی پر عمل کرتے ہوئے اجتہادات کئے تھے۔ مگر بعد کے لوگوں کے لئے کہہ دیا گیا کہ:

ان الاوائل لم یترکوا للاواخر شیئا	پچھلے لوگوں نے بعد والوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑا

حالانکہ یہ دین میں حیرت انگیز حد تک ایک اندوہناک جسارت ہے۔ جب خدا کی کتاب اور رسول کی سنت کے باوجود دوسری صدی ہجری کے ائمہ فقہ کے لئے یہ گنجائش تھی کہ وہ اجتہاد کریں تو کیا ان ائمہ کے فتاوی خدا کی کتاب اور رسول کی سنت سے بھی زیادہ جامعیت کے حامل ہیں کہ ان کے بعد، خواہ حالات کتنے ہی بدل جائیں، کسی کو اجتہاد کی ضرورت نہ ہوگی۔

وہ لوگ جنھوں نے براہ راست پیغمبر کی صحبت سے اسلام سیکھا تھا، ان کے لئے یہ بات انتہائی طور پر اجنبی تھی کہ دین میں "بزرگی" کا ایک مستقل ادارہ وجود میں آجائے۔ لوگ دینی پیشوائی کی گدیوں پر اسی طرح بیٹھنا شروع کردیں جس طرح بادشاہی نظام میں ایک کے بعد دوسرا تخت نشین ہوتا ہے۔ صحابہ کرام، رسول اللہ کے بعد، خدا کی کتاب اور رسول کی سنت کے سوا کسی چیز کو نہیں جانتے تھے جس سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ وہ عمر فاروق رض پر بھی اسی طرح تنقید کرتے تھے جیسے کسی عام انسان کے اوپر۔ ان کی بات کو جب وہ مانتے تھے تو شخصی عقیدت مندی کے تحت نہیں بلکہ اس وقت جب کہ انھوں نے اپنی بات کی صداقت ثابت کردی ہو۔ قاضی شریح کے سامنے جب خلیفہ چہارم حضرت علی بن ابی طالب نے نصرانی کے خلاف زرہ کا مقدمہ پیش کیا تو حضرت علی کی طرف سے گواہی میں ان کے غلام قنبر اور ان کے لڑکے حسن تھے۔ قاضی شریح نے حضرت حسن کی ساری بزرگی کے باوجود ان کی گواہی نہیں مانی:

فقال اترد شهادة الحسن وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم الحسن والحسين سيدا شباب اهل الجنة، قال لا ولكن حفظت عنك انه لا تجوز شهادة الولد على والده	حضرت علی نے کہا کیا تم حسن کی گواہی کو رد کرتے ہو حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حسن اور حسین جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔ قاضی شریح نے کہا نہیں۔ کیونکہ میں نے آپ ہی سے سن کر یاد کیا ہے کہ لڑکے کی گواہی باپ کی موافقت میں جائز نہیں۔
کنز العمال، جلد ۴، صفحہ ۲	

رجال کے سلسلہ میں ان کا تصور یہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی کی اقتدا کرنا چاہتا ہے تو اس کو مُردوں کی اقتدا کرنا چاہئے

نہ یہ کہ کسی زندہ شخص کو اپنا "شیخ" بنالیا جائے۔ کیونکہ کوئی بھی شخص اس دنیا میں معصوم نہیں۔ نبی کے سوا ہر زندہ شخص کے لئے یہ امکان ہے کہ وہ کسی بھی وقت فتنہ میں پڑ جائے (من کان مستنا فلیستن بمن قد مات فان الحی لا تؤمن علیہ الفتنۃ، ابن مسعود) حضرت علی نے فرمایا:

إياكم والاستنان بالرجال، فإن الرجل يعمل بعمل أهل الجنة ثم ينقلب لعلم الله فيه فيعمل بعمل أهل النار فيموت وهو من أهل النار، وإن الرجل ليعمل بعمل أهل النار فينقلب لعلم الله فيعمل بعمل أهل الجنة فيموت وهو من أهل الجنة، فإن كنتم لا بد فاعلين فبالأموات لا بالأحياء

ابن عبدالبر، جامع بیان العلم، جلد ۲، صفحہ ۱۱۴

رجال کی سنت پکڑنے سے بچو۔ اس لئے کہ آدمی جنت والوں کا عمل کرتا ہے، پھر اللہ کے علم کے مطابق پلٹ جاتا ہے اور آگ والوں کا عمل کرنے لگتا ہے۔ پھر اسی حال میں مرجاتا ہے اور وہ آگ والا ہوتا ہے۔ اور بے شک آدمی آگ والوں کا عمل کرتا ہے، پھر اللہ کے علم کے مطابق پلٹ جاتا ہے اور جنت والوں کا عمل کرنے لگتا ہے، پھر اسی حال میں مرجاتا ہے اور وہ جنت والوں میں سے ہوتا ہے۔ پس اگر تمہیں لوگوں کی اقتدا ہی کرنی ہے تو مرے ہوئے لوگوں کی اقتدا کرو نہ کہ زندہ لوگوں کی۔

"بزرگی" کا ادارہ جو بعد کے دور میں ملت اسلامیہ کے اندر قائم ہوا، اس کی کوئی اصل کتاب و سنت میں موجود نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی کوئی چیز اسلام کے ڈھانچہ میں بالکل اجنبی ہے۔ یہ تمام تر دوسری قوموں کے طریقے (ہرمیٹ ہڈ اور گروڈم) کی نقل تھی جس کو اسلامی اصطلاحوں کا لباس اڑھاکر اسلام میں داخل کر لیا گیا۔ اس قسم کی کوئی چیز اسی وقت تک اسلام میں چل سکتی ہے جب تک کتاب و سنت کے بجائے بزرگوں کے ملفوظات و مکتوبات اور ان کی شخصیت کے بارے میں افسانوی داستانیں دین کا ماخذ بنی ہوئی ہوں۔ جس لمحہ کتاب و سنت دین کا ماخذ بن سکے، یہ سارے معتقدات اس طرح ختم ہو جائیں گے جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

۳۔ اس سلسلے کی تیسری خرابی وہ ہے جو علم کلام کے ذریعہ وجود میں آئی۔ علم کلام اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے اسلامی دعوت و تعلیم کی ایک معاون شاخ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مخاطب جس زبان سے مانوس ہے اور جن اصطلاحوں میں بات کو سمجھنا چاہتا ہے، اسی زبان اور اسی اصطلاح میں اس کے سامنے دینی پیغام کو پہنچایا جائے۔ اس کی اسی اہمیت کی بنا پر امام غزالی (۱۱۱۱ – ۱۰۵۹) نے علماء کے تعلیمی نصاب میں خالص دینی موضوعات کے ساتھ علوم آلہ کے طور پر معقولات کا جوڑ لگایا تھا تاکہ اسلامی درسگاہوں سے ایسے لوگ تیار ہوں جو ایک طرف دین کا گہرا علم رکھتے ہوں۔ دوسری طرف وقت کے اسلوب میں اسلام کی نمائندگی کرسکیں۔

مگر علم کلام، عین اپنی نوعیت کے اعتبار سے، ایک زمانی علم ہے۔ وہ اسلام کی دائمی حقیقت کو زمانی اصطلاحوں میں بیان کرتا ہے۔ اس لئے اس کی اہمیت اس وقت خود بخود ختم ہو جاتی ہے جب کہ وہ زمانہ ختم ہو جائے جس کے اندر وہ

وجود میں آیا تھا۔ مگر یہاں بھی اسی انسانی کمزوری نے کام کیا جس کے اثرات ہیں دوسری چیزوں میں نظر آتے ہیں۔ وہ یہ کہ کوئی چیز جب ایک بار وجود میں آجائے اور اس کے ساتھ کچھ قابل احترام شخصیتوں کے نام وابستہ ہو جائیں تو دھیرے دھیرے وہ مقدس بننا شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ اس میں ترمیم و اصلاح کی بات سوچنا بھی لوگوں کو ایسا لگتا ہے جیسے وہ گناہ ہو۔

یہی حال اسلام کے اس کلامی لٹریچر کا ہوا جو عباسی دور میں پیدا ہوا تھا۔ یہ علم کلام اس وقت اتنا موثر ثابت ہوا کہ جو علوم اسلام کے لئے چیلنج بن کر ظاہر ہوئے تھے وہ خود اسلام کے خادم بن گئے۔ مگر زمانہ کی تبدیلی نے اب ان کی اہمیت قطعی طور پر ختم کر دی ہے۔ آج "معقولات" کے نام سے جو چیز ہمارے دارالعلوموں میں پڑھائی جاتی ہے اس کو نامعقولات کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ اس کی بنیاد ایسے عقلی قیاسات پر قائم ہے جو آج مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ جو چیز محض ایک وقتی تدبیر کی حیثیت رکھتی تھی، اس کو بعد کے لوگوں نے دینی نصاب کا مستقل جزء بنا لیا۔ اس طرح اگرچہ اسلام کا متن نہیں مگر اسلام کا نظام تعلیم ٹھیک اسی غلطی کا شکار ہو گیا جس کا شکار عیسائیوں نے اپنی کتاب مقدس کو بنایا تھا۔

یہی وہ صورت حال ہے جس نے اسلام کے اس امکان کو بروئے کار آنے نہیں دیا کہ وہ موجودہ زمانہ میں ایک برتر فکری قوت کی حیثیت سے ظاہر ہو سکے۔ ہمارے دینی مدارس نہایت اخلاص کے ساتھ ایسے انسان تیار کرنے میں مصروف ہیں جو صرف پانچ سو برس پہلے کی دنیا میں کام کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ موجودہ بدلے ہوئے زمانہ میں اسلام کا فکری اظہار نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے ذہن و مزاج کی وجہ سے صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اسلام کی کمتر نمائندگی کر کے یہ ثابت کریں کہ اسلام دور سائنس سے قبل کی چیز ہے وہ آج کے انسان کے لئے نہیں ہے۔

موجودہ زمانہ میں اٹھنے والی بعض تحریکوں نے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر وہ تحریکیں جنھوں نے اسلام کی تعلیمات کو سیاسی اصطلاحوں میں بیان کیا۔ ان تحریکوں سے وقتی فائدے بھی ہوئے۔ مگر بدقسمتی سے ان تحریکوں میں آغاز ہی سے ایک خرابی شامل ہو گئی۔ یہ تحریکیں باعتبار حقیقت متکلمانہ تحریکیں تھیں جو انیسویں صدی کے مغربی افکار کے ہنگامہ میں اس لئے اٹھیں کہ اسلام کو لوگوں کے لئے قابل قبول بنائیں۔ مگر ان کے پرجوش داعیوں نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ اسلام کو سیاسی زبان میں بیان کرتے بلکہ انھوں نے تفسیر اور سیرت بھی اسی نہج پر مرتب کر ڈالی۔ حتی کہ یہ اعلان بھی کر دیا کہ مختلف زمانوں میں جو انبیاء آئے وہ اسی لئے آئے تھے کہ دنیا میں خدا کی حکومت قائم کریں۔ اس طرح انھوں نے اپنے کلامی لٹریچر کو دین کی تشریح کا عنوان دے دیا۔ یہ نہ صرف دین میں ایک جسارت تھی بلکہ اس کے ذریعہ سے انھوں نے اپنے پیروؤں کو دوبارہ اسی جمود میں مبتلا کر دیا جس میں ہمارے قدیم دینی ادارے مبتلا چلے آرہے تھے۔ انیسویں صدی کا سیاسی انداز فکر، جس میں یہ لٹریچر پیدا ہوا تھا، دوسری جنگ عظیم کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب ضرورت تھی کہ نئے ذہنی تقاضوں کی روشنی میں دوسرا کلامی لٹریچر تیار کیا جائے۔ مگر یہ گروہ آج بھی بے سود طور پر اسی سیاسی لٹریچر کی تلاوت میں مصروف ہے، جس طرح عربی مدارس یونانی معقولات کے درس د

تدریس میں۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے اس لٹریچر کو دین کی مطلق تشریح سمجھ رہا ہے نہ کہ محض وقتی طور پر پیدا شدہ علم کلام۔

صلیبی جنگوں کے زمانہ میں شام و مصر میں ہتھیار تیار کرنے کی جو بھٹیاں بنائی گئی تھیں، آج ان کا کہیں وجود نہیں ہے۔ کیونکہ وقت گزرنے کے بعد ان کی اہمیت ختم ہو گئی۔ اسی طرح قدیم معقولات کو بھی اسلام کی علمی فہرست سے خارج ہو جانا چاہئے تھا۔ جو چیز وقتی ضرورت کے تحت آتی ہے، وہ وقت ختم ہونے کے بعد خود بخود چلی جاتی ہے۔ مگر قدیم معقولات سے ہم ابھی تک نجات حاصل نہ کر سکے۔

اس کی وجہ قدیم معقولات کا ہماری فنون کی کتابوں میں شامل ہو جانا ہے۔ جس زمانہ میں یہ اجنبی علوم اسلام کے معاشرہ میں داخل ہوئے، یہ وہی زمانہ تھا جب کہ اسلامی علوم کی تدوین ہو رہی تھی۔ قدیم منطقی انداز لوگوں کے لئے اتنا مسحور کن ثابت ہوا کہ انھوں نے سمجھا کہ اسلامی علوم کی تدوین کے لئے بھی یہی انداز سب سے زیادہ موزوں ہے۔ چنانچہ اسلامی فنون کی کتابیں قدیم منطقی انداز میں لکھی جانے لگیں۔ اس واقعہ نے قدیم منطق کو اسلامی کتب خانہ کا لازمی جزو بنا دیا۔ کسی بھی عالم کو بآسانی اس رائے سے متفق کیا جا سکتا ہے کہ قدیم معقولات کو مدارس دینیہ کے نصاب سے خارج کر دیا جائے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ فوراً ہی یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہماری کتب فنون کو سمجھنے والے لوگ کیسے تیار ہو سکیں گے۔ قدیم معقولات کو دنیا سے مٹا دیا جائے تو قرآن و حدیث کو سمجھنے میں کسی کو زحمت نہ ہو گی۔ کیوں کہ قرآن و حدیث کی ترتیب قدیم منطق کی اصطلاحات میں کی ہی نہیں گئی ہے۔ مگر علم عقائد اور اصول فقہ کی بنیادی کتابوں کو کوئی شخص بخوبی طور پر سمجھ نہیں سکتا جب تک قدیم منطقی اصطلاحات سے اس کو آگاہی نہ ہو۔

یونانی معقولات، جس کو اب خود یونان بھی چھوڑ چکا ہے، دین کے ساتھ جوڑنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ دین میں تدبر اور دینی مسائل کو بیان کرنے کا ایک ایسا نہج بن گیا جو رسول اللہ کی سنت اور صحابہ کرام کے انداز سے بالکل مختلف تھا۔ حنفیہ نے امام کے پیچھے فاتحہ کی قرأت کے ترک کا فتویٰ دیا ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کے سامنے اس مسلک کے خلاف یہ حدیث پیش کی گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اصحاب سے کہا، شاید تم لوگ امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہوئے قرأت کرتے ہو۔ انھوں نے کہا ہاں یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا:

لا تفعلوا الا بام القرآن — نہ پڑھو سوا سورہ فاتحہ کے

مولانا رشید احمد گنگوہی نے حنفی مسلک پر اس اعتراض کو رد کرتے ہوئے جواب دیا:

هذا دليل الاباحة لا دليل الوجوب (نفحة العنبر) — یہ اباحت کی دلیل ہے نہ کہ وجوب کی دلیل

یہ ایک سادہ سی مثال ہے اس بات کی کہ بعد کے زمانے میں ہمارے یہاں مذہبی بحث و گفتگو کا جو انداز پیدا ہوا، وہ کس طرح اسلام کے ابتدائی سادہ اسلوب سے ہٹا ہوا تھا۔ چنانچہ وہی شخص آج "عالم" سمجھا جاتا ہے جو اس قسم کی فنی زبان اور منطقی اسلوب میں دینی مسائل کو بیان کر سکتا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی مباحث کا یہ انداز

فنی حیثیت سے بظاہر زیادہ وقیع معلوم ہوتا ہے مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ دین وہ نہیں جس کو عرب کے پیغمبر ہمارے لئے چھوڑ کر گئے تھے۔ آپ نے فخر کے ساتھ فرمایا تھا —— نحن امة امیۃ (ہم تو سیدھی سادی امت ہیں) بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ، (میں سہل دین کے ساتھ بھیجا گیا ہوں) مگر یہودیوں اور عیسائیوں کے اتباع میں ہم نے دین کو ایک پیچیدہ فن بنا ڈالا جس طرح انھوں نے موسیٰ اور عیسیٰ کے دین کو فن بنا دیا تھا۔ اس "فنی دین" کا غیر دینی ہونا اسی سے واضح ہے کہ صحابہ کرام میں سے کوئی بزرگ اگر آج زندہ ہوں تو وہ ہمارے مدارس عربیہ میں سے کسی مدرسہ میں "شیخ الحدیث" کے منصب پر فائز نہیں کئے جا سکتے۔ کیونکہ آج ان مدارس میں علم حدیث جس طرح پڑھایا جاتا ہے وہ اس کے لئے بالکل ناموزوں ثابت ہوں گے۔ حتیٰ کہ نعوذ باللہ شاید خود اللہ کے رسول بھی۔

خالص علمی اعتبار سے بھی بحث کا یہ طریقہ موجودہ زمانہ میں بے وزن ہو چکا ہے۔ قدیم منطق کی بنیاد ذہنی قیاس آرائیوں پر قائم تھی۔ مگر موجودہ زمانہ میں منطق کی بنیاد سائنس ہے جو حقیقی حوالوں اور واقعاتی تجربہ سے کسی بات کو ثابت کرتی ہے۔ مگر مدارس دینیہ میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، وہ چونکہ قدیم منطقی اسلوب پر لکھی گئی ہیں، اور اساتذہ اپنے درسوں میں اسی اسلوب پر مسائل کی تشریح کرتے ہیں، اس لئے ان اداروں سے جو افراد تربیت پاکر نکلتے ہیں، وہ اپنے طرز فکر اور انداز استدلال کے اعتبار سے موجودہ زمانہ کے لئے اجنبی ہوتے ہیں۔ وہ "منطقی اسلحہ" سے لیس ہونے کے باوجود آج کے انسان کو علمی اور منطقی طور پر اپنا دین سمجھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے آج کی دنیا میں جب وہ داخل ہوتے ہیں تو، احساس کمتری کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں یا جرأت کر کے اسلام کے داعی بننے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی اسلامی تشریحات آج کے علمی انسان کو یہ غلط تاثر دیتی ہیں کہ اسلام صرف قدیم دور کے انسان کو مطمئن کر سکتا تھا، آج کے انسان کے ذہنی اطمینان کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں۔

علم کلام کے بارے میں مزید گفتگو اگلے باب میں آرہی ہے۔

عقلیات اسلام

قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ تدبیر امر کر رہا ہے اور تفصیل آیات بھی (رعد ۔ ۲)۔ تدبیر امر سے مراد کائناتی انتظام ہے جس کے خارجی پہلوؤں کے علم کا نام سائنس ہے۔ تفصیل آیات سے مراد وحی ہے جس کا آخری اور مکمل متن قرآن کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ علم کلام اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ الہامی علم اور کائناتی علم کی وحدت کو سمجھا جائے، نامعلوم کائنات کو معلوم کائنات کی مدد سے قابل فہم بنایا جائے۔

اس حیثیت سے دیکھئے تو اسلامی علم کلام کا کوئی قدیم و جدید نہیں۔ یہ متکلمین اسلام کی ایک غلطی تھی جس نے علم کلام میں قدیم و جدید کی تقسیم پیدا کی۔ علم کلام حقیقۃً "قرآنی عقلیات" کو مرتب کرنے کا نام تھا۔ مگر عباسی دور کے متکلمین نے اس کو انسان کی وضع کردہ فلسفیانہ عقلیات پر ڈھالنے کے ہم معنی سمجھ لیا۔ یہی وہ غلطی ہے جس نے علم کلام میں قدیم و جدید کے تصورات پیدا کئے۔ کیونکہ فلسفیانہ عقلیات قیاسی ہونے کی وجہ سے تغیر پذیر تھیں، جب کہ قرآنی یا کائناتی عقلیات میں تغیر و تبدل کا کوئی سوال نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کا طریق استدلال تمام تر کائناتی ہے۔ وہ محسوس واقعات کے ذریعہ غیر محسوس حقائق پر استدلال کرتا ہے۔ قرآنی علم کلام کی بنیاد زمین وآسمان کے ان قوانین پر ہے جو اٹل ہیں، جن میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس لئے قرآنی علم کلام بھی اٹل ہے، اس میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ قرآنی علم کلام بھی، قرآنی اعتقادیات کی طرح، غیر تغیر پذیر ہے۔ مگر جب علم کلام کو انسان کے پیدا کردہ علوم کی بنیاد پر مرتب کیا گیا تو فی الفور علم کلام میں قدیم و جدید کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ کیونکہ یہ علوم تمام تر قیاس کی بنیاد پر تھے، وہ کبھی یکساں نہیں رہ سکتے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں، اگر کلی طور پر نہیں تو ایک خاص حد تک، ہم اس پوزیشن میں ہوگئے ہیں کہ علم کلام کو اس کی قطعی اور آفاقی شکل میں مرتب کر سکیں۔ قدیم زمانہ میں عالم افلاک اور علم افلاک دونوں الگ الگ چیزیں تھیں۔ عالم افلاک حقائق پر مبنی تھا اور علم افلاک قیاسات پر۔ آج یہ دونوں چیزیں ایک ہوتی جارہی ہیں۔ یہی معاملہ قرآن کا ہے۔ قدیم زمانہ میں قرآن اور علم کلام دونوں الگ الگ تھے۔ قرآن آیات محکمات پر مبنی تھا اور علم کلام فلاسفہ کے قیاسات پر۔ آج علم انسانی کے ارتقاء نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ قرآن اور علم کلام دونوں کو ایک کیا جا سکے۔ اگر کوئی چیز ہے جس کو "علم کلام جدید" کہا جائے تو وہ یہی علم کلام ہے جس کو مرتب کیا جانا چاہئے، اگرچہ وہ ابھی تک مرتب نہیں کیا گیا ہے۔

یہاں میں مختصر طور پر چند کاموں کا ذکر کروں گا جو علم کلام کی جدید ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ہم کو انجام دینا ہے۔

۱۔ سب سے پہلا کام قرآن کی بنیاد پر ایک نظریۂ علم کو مرتب کرنا ہے یعنی طریق استدلال کا علم۔ قدیم زمانہ میں قیاسی مفروضات و مسلمات پر استدلال قائم کیا جاتا تھا۔ تحقیق و تجربہ کے جدید طریقوں کے ظہور میں آنے کے ابتدائی زمانہ میں مشاہداتی استدلال پر زور دیا گیا۔ مگر آئن سٹائن کے بعد علم انسانی کا جو دور شروع ہوا ہے، اس میں زیادہ سے زیادہ یہ بات واضح ہوتی جارہی ہے کہ حقیقت اپنی آخری صورت میں انسان کے لئے ناقابل مشاہدہ ہے۔ اب یہ بات تقریباً مان لی گئی ہے کہ

انسان کی محدود صلاحیتوں کی وجہ سے، مشاہداتی استدلال اس کے لئے ممکن نہیں۔ ہم صرف اس پوزیشن میں ہیں کہ استنباطی استدلال قائم کرسکیں۔ ہم حقائق کو دیکھ نہیں سکتے، ہم صرف یہ کرسکتے ہیں کہ ظاہر اشیاء پر غور کرکے یہ مستنبط کریں کہ یہاں فلاں چیز پائی جانی چاہئے۔

اب موجودہ زمانہ میں ایک نیا نظریۂ علم وجود میں آیا ہے جو حیرت انگیز طور پر قرآنی نظریۂ علم کے عین مطابق ہے۔ قرآن میں کہا گیا تھا کہ انسان کو علم قلیل (بنی اسرائیل ـ ۸۵) دیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو بالواسطہ علم پر قناعت کرنی چاہئے نہ کہ وہ براہ راست علم کے لئے اصرار کرنے لگے۔ اس طرح وحی اور علم انسانی دونوں ایک نقطہ پر پہنچ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید نظریہ علم نے قرآنی طرز استدلال کو، جدید اصطلاح میں، عین سائنٹفک استدلال کا درجہ دے دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں علم کلام کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس اہم ترین دریافت کو مدوّن کرے۔

۲۔ دوسرا کام قرآنی علم الآثار کی تدوین ہے۔ قرآن میں پچھلے انبیاء اور گزری ہوئی تہذیبوں کا ذکر ہے۔ یہ قرآن کا وہ حصہ ہے جس کو ایام اللہ (ابراہیم ـ ۵) کہا گیا ہے۔ تاریخ انسانی کے یہ واقعات قرآن کے نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ وہ ہر دور میں اپنے نمائندے بھیجتا ہے اور اپنے اٹل قوانین کی بنیاد پر قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے۔

یہ اگرچہ تاریخ کا مضمون ہے۔ مگر قرآن میں اس کا ذکر معروف تاریخی انداز میں نہیں ہے، بلکہ دعوتی اور اجمالی انداز میں ہے۔ ان واقعات کے بارے میں قرآن سے باہر جو ریکارڈ ہے، وہ قدیم زمانے میں بڑی حد تک لامعلوم تھا۔ اس لئے قدیم زمانے میں قرآن کے ان اجزاء کی تدوین خالص تاریخی انداز میں ممکن نہ تھی۔ اب ان واقعات سے متعلق بے شمار دبے ہوئے ریکارڈ دریافت ہوگئے ہیں۔ اس طرح اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ایام اللہ کے بارے میں قرآنی حوالوں کو منضبط کیا جائے، قرآن کی دعوت کو تاریخ کی زبان میں مدوّن کردیا جائے۔

۳۔ تیسرا کام آیات آفاق (حٰم سجدہ ـ ۵۳) کو جدید دریافتوں کی مدد سے ترتیب دینا ہے۔ قرآن کے مطابق کائنات میں بے شمار نشانیاں ہیں جو اپنے خالق کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اور اس حکمت کو بتاتی ہیں جس کے تحت یہ کارخانہ بنایا گیا ہے۔ قرآن میں بار بار ان نشانیوں کے حوالے دیئے گئے ہیں اور ان سے قرآن کی دعوت کو مدلّل کیا گیا ہے۔ تاہم یہ حوالے اشاراتی زبان میں ہیں۔ قدیم زمانہ میں ایسی معلومات حاصل نہ تھیں جن سے ان اشارات کو تفصیلی انداز میں سمجھا جاسکے۔ اب سائنس کے ارتقاء نے یہ مواد، بڑی حد تک، جمع کردیا ہے۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو کہ سائنس موجودہ زمانہ میں اسلام کی تھیالوجی بن چکی ہے۔ تاہم اس کو مدوّن کرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ ضرورت ہے کہ خدا کی یہ نشانیاں، جو طبیعی دنیا میں چھپی ہوئی ہیں، جدید دریافتوں کی مدد سے ان کو مفصل شکل میں مرتب کیا جائے۔

۴۔ قرآن کے استدلالی حصہ کا ایک پہلو وہ ہے جس کو آیات انفس (حٰم سجدہ ـ ۵۳) کہا گیا ہے۔ یعنی نفسیات انسانی کے اندر خدا کی نشانیاں ـــ یہ جزو بھی قدیم زمانہ میں بڑی حد تک مخفی تھا۔ صوفیاء نے اس پہلو سے بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر وہ علمی حقائق سے زیادہ قیاسات پر مبنی ہے اور اس کا بڑا حصہ موجودہ زمانے میں بے قیمت ہوچکا ہے۔ تاہم علم النفس کی تحقیقات

نے موجودہ زمانے میں بہت سی ایسی معلومات فراہم کر دی ہیں جن کی روشنی میں قرآن کے اشارات کو، اگر پوری طرح نہیں تو بڑی حد تک، مفصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام اگر علمی سطح پر ہو جائے تو وہ قرآنی نظریات کے حق میں ایک عظیم نفسیاتی تصدیق ثابت ہوگا۔

۵۔ آخر میں میں ایک ایسے علمی کام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو رواجاً علم کلام میں شمار نہیں کیا جاتا۔ حالاں کہ مقاصد کے اعتبار سے اس کو علم کلام کا سب سے اہم جزو ہونا چاہئے۔ یہ ہے سائنٹفک انداز میں اسلام پر تعارفی لٹریچر تیار کرنا۔ موجودہ زمانہ میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر تقریباً تمام کتابوں پر کسی نہ کسی طرح، کلامی انداز غالب رہا ہے۔ تفسیر، سیرت، عام اسلامی لٹریچر کا جو ذخیرہ موجودہ زمانہ میں تیار ہوا ہے، تقریباً سب کا سب، علم کلام کے خانہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ان کتابوں کی علمی قدر و قیمت کیا ہے، خود یہ بات عصری تقاضے کے خلاف ہے کہ تفسیر اور سیرت کو علم کلام بنا دیا جائے۔

موجودہ زمانہ آزادیٔ فکر کا زمانہ ہے۔ آج کا انسان یہ چاہتا ہے کہ اصل بات کسی تعبیری یا کلامی اضافہ کے بغیر اس کے سامنے رکھ دی جائے۔ اور جانچنے پرکھنے کا معاملہ خود قاری کے اوپر چھوڑ دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کتابوں کے ہجوم کے باوجود ساری دنیا میں نئی اسلامی کتابوں کی مانگ ہے۔ آج کا انسان اسلام کو سمجھنا چاہتا ہے۔ مگر ایسی کتابوں کے ذریعہ جن میں اسلام کو اس اسلوب میں پیش کیا گیا ہو جس کو موجودہ زمانہ میں سائنٹفک اسلوب کہا جاتا ہے۔ آج کا انسان عقلیاتی اسلوب سے زیادہ سائنٹفک اسلوب کا دلدادہ ہے۔ مگر بدقسمتی سے کسی بھی اسلامی زبان میں اب تک سائنٹفک اسلوب رواج نہ پا سکا۔ سائنٹفک اسلوب سے مراد معروف کلامی اسلوب نہیں ہے۔ بلکہ ایسا سادہ اور مثبت اسلوب ہے جس میں زبان و بیان دونوں اعتبار سے حقیقت نگاری کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

موجودہ زمانہ میں ہمارے لکھنے والوں نے بے شمار کتابیں اسلام پر لکھی ہیں۔ مگر میرے علم کی حد تک کسی بھی زبان میں کوئی ایسا تعارفی سٹ تیار نہیں ہوا ہے جس میں سادہ، مثبت اور حقیقت پسندانہ انداز میں اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی سیرت کو مرتب کیا گیا ہو، حالاں کہ آج سب سے زیادہ ضرورت اسی قسم کی کتابوں کی ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ اگر ہم کچھ اور نہ کریں، صرف اتنا کریں کہ تعلیمات قرآن، سیرت، حدیث، حالات صحابہ اور تاریخ اسلام (نہ کہ تاریخ فتوحات) پر خالص علمی اسلوب اور حقیقت نگاری کی زبان میں کتابوں کا ایک سٹ تیار کر دیں اور اس کو تمام زبانوں میں چھاپ دیں تو ہم علم کلام کے مقصد کو، کم از کم آج کی دنیا میں، زیادہ بہتر طور پر حاصل کر سکیں گے۔

نوٹ: دسمبر ۱۹۷۶ کے آخری ہفتہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے زیر اہتمام ایک سمینار ہوا ــــــــــ عنوان تھا: "فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ"۔ اس موقع پر، ۲۷ دسمبر کی نشست میں یہ مقالہ پڑھا گیا۔

علوم اسلامی کی تدوین

عقبہ بن نافع تابعی (۶۲ھ) یزید بن معاویہ کی خلافت کے زمانہ میں افریقہ میں اسلامی فوجوں کے سپہ سالار تھے۔ وہ مغربی افریقہ کے ملکوں کو فتح کرتے ہوئے اٹلانٹک کے ساحل تک پہنچ گئے۔ شہر اسفی ان کی آخری منزل تھی۔ وہاں انھوں نے اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا اور اس کے پانی میں کھڑے ہو کر کہا:

اللھم انی لو اعلم وراء ھذا البحر بلداً لخضتہ الیہ حتی لا یعبد احد دونک

خدایا، اگر میں جانتا کہ اس سمندر کے اُس پار بھی کوئی ملک ہے تو میں سمندر میں گھس کر وہاں جاتا یہاں تک کہ تیرے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے۔

وہ لوگ جو دور اول میں قرآن پر ایمان لائے، اور جنھوں نے براہ راست پیغمبر خدا سے تربیت حاصل کی تھی، ان کے اندر سب سے زیادہ ابھرا ہوا جذبہ یہی تھا کہ وہ خدا کے پیغام کو خدا کے تمام بندوں تک پہنچا دیں۔ ان کا یہ جذبہ اس وقت تک تھمتا ہوا نظر نہ آتا تھا جب تک سارے جہان کے لوگوں کو اللہ کا بندہ نہ بنا لیں۔ بعد کی صدیوں میں اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھتا ہے کہ یہ جذبہ دھیرے دھیرے ختم ہو گیا۔ قریبی صدیوں میں جب اسلام کو زوال ہوا تو اس کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے کتنی ہی عالی شان تحریکیں اٹھیں۔ مگر کوئی بھی قابل ذکر تحریک دعوت الی اللہ کے مقصد کو لے کر اٹھنے والی نہیں ملتی۔

جو قرآن صحابہ و تابعین نے پڑھا تھا، وہی قرآن بعد کے لوگوں نے بھی پڑھا، پھر کیا وجہ ہے کہ جس قرآن نے اپنے اولین مخاطبین کے اندر دعوت اسلام کی آگ لگا دی تھی وہی قرآن بعد کے لوگوں کو دعوت کے عنوان پر کھڑا کرنے کا باعث نہ بن سکا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ صدر اول میں قرآن براہ راست طور پر لوگوں کے لئے علم دین کا ماخذ تھا۔ جب کہ بعد کے دور میں وہ انسانوں کے پیدا کردہ علوم کے ہالہ میں چھپ گیا۔

قرآن ایک اساسی کتاب ہے جس میں دین کے تمام بنیادی مسائل بتائے گئے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ان اساسات کی بنیاد پر اس کی مزید تبیین (نحل-۴۴) کرکے اس کو لوگوں کے لئے یسیر الفہم بنا دیا جائے۔ اس تبیین کا واضح نمونہ سنت رسول اللہ میں موجود تھا۔ مگر بعد کے دور میں قرآن کی تبیین و تفصیل نے سنت کے سادہ طریقے کے بجائے فنی طریقہ اختیار کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیدھے سادے دین محمدی کے بجائے ایک پیچیدہ قسم کا متوازی دین وجود میں آگیا جس کا تانا بانا منطقی اصطلاحات، متکلمانہ موشگافیوں اور متصوفانہ اسرار و رموز سے تیار ہوا تھا۔ تابعین، جنھوں نے اصحاب رسول سے دین کو پایا تھا، انھوں نے دین کو اس طرح فن بنانے پر سخت احتجاج کیا۔ ان کے نزدیک یہ یہود و نصاریٰ کی نقل تھی نہ کہ سنت محمدی کی پیروی۔ مگر عوام اور حکمراں چونکہ کیفیات دین سے خالی ہو چکے تھے، اس لئے متشکل دین ان کے زیادہ حسب حال تھا، ان کی تائید کے زور پر وہ بڑھتا رہا۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ جب طویل مدت گزر جائے تو ماضی

کی ہر چیز مقدس بن جاتی ہے۔ چنانچہ وقت گزرنے کے ساتھ اس متوازی دین میں تقدس کا عنصر بھی شامل ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اب کوئی شخص یہ سوچ نہیں سکتا کہ فقہ کی کتابوں میں کوئی مسئلہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو قرآن و سنت کی منشا کے مطابق نہ ہو۔ صوفیا کے ملفوظات اور قصوں میں کسی غلطی کا بھی امکان ہے۔ یا مروجہ معقولات میں بھی کوئی چیز ایسی ہو سکتی ہے جس کو غیر معقول کہا جائے ـــــــ اس کے بعد قرآن کو جہاں جگہ مل سکتی تھی، وہ صرف برکت کا خانہ تھا۔ وہ برکت کی حیثیت سے کتاب ملاوت بن کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے قرآن کی تفسیریں لکھیں، ان کے سامنے بھی یا تو "ثواب" حاصل کرنا تھا یا یہ تھا کہ فقہ، تصوف یا معقولات میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو خدا کی کتاب سے ثابت کر دکھائیں الا ماشاء اللہ۔

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فقہ اور تصوف اور علم کلام کی شکل میں جو اضافے اسلام میں ہوئے، ان کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ قرآن کا سرا امت کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ان اضافوں نے دین کو ایک قسم کا فن بنا دیا۔ کتاب الٰہی میں جو چیز سادہ اور فطری انداز میں بتائی گئی تھی، اس میں اپنی طرف سے موشگافیاں کرکے نئے نئے مسئلے پیدا کئے اور بطور خود بے شمار اصطلاحات وضع کیں تاکہ ان کو فنی انداز میں بیان کیا جاسکے۔ اس طرح دین خداوندی ایسے احکام و مسائل کا مجموعہ بن گیا جو صرف فنی کتابوں کے مطالعہ سے جانا جاسکتا ہو۔ کتاب الٰہی کے ذریعہ اس کو معلوم کرنا ممکن نہ ہو۔

آج کسی کو نماز کے "مسائل" جاننا ہوں تو اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ وہ اس مقصد کے لئے قرآن کا مطالعہ کرے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ نماز کے مسائل تو فقہ کی کتابوں میں ملیں گے۔ کسی کو روحانی ترقی مطلوب ہو تو اس کو کبھی یہ خیال نہیں آئے گا کہ خدا کی کتاب لے کر بیٹھے اور اس میں روحانی سلوک کے طریقے تلاش کرے۔ وہ صرف یہ کرتا ہے کہ کسی "بزرگ" کے پاس پہنچ جاتا ہے، کیونکہ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ فن روحانیت کے آداب تو فن روحانیت کے کسی ماہر ہی سے معلوم کئے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح کسی کو یہ شوق ہو کہ وہ اسلام کی دعوت کو عقلی طور پر مدلل کرے تو وہ قرآن میں اس کے نکتے نہیں ڈھونڈے گا بلکہ معقولات میں غرق ہو جائے گا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس فن کی باریکیاں صرف معقولات کی کتابوں سے حاصل کی جاسکتی ہیں ـــــــ قرآن اس لئے اتارا گیا تھا کہ لوگ اس میں تدبر (ص ـ ۲۹) کرکے اپنے لئے رہنمائی حاصل کریں۔ مگر قرآنی تعلیمات کو فن بنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن، کتاب تدبر نہ رہا، کتاب تلاوت بن گیا جس کا آخری استعمال یہ تھا کہ اس کو ہر روز یا ہر ہفتہ بس "ختم" کر لیا جایا کرے۔ لوگ اپنے دین کو اپنے احبار و رہبان سے اخذ کرنے لگے اور قرآن کو برکت کی چیز کی حیثیت سے جزدان میں لپیٹ کر رکھ دیا۔ ایسا ہونا بالکل فطری تھا کیوں کہ جن نکتوں اور موشگافیوں کو انھوں نے دین سمجھ رکھا تھا، وہ قرآن کے اندر موجود ہی نہ تھے۔

خدا کی کتاب سے محرومی کا یہ معاملہ اسی حد پر نہ رکا بلکہ وہ ہماری پوری زندگی پر چھا گیا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے تمام ضروری امور کی تفصیل بیان کر دی ہے (اسراء ـ ۱۲) وہ ہر معاملہ میں مومن کی ذہنی غذا ہے۔ مگر مذکورہ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ذہن ہی ختم ہو گیا کہ اسلام اور ملت اسلام کے تمام مسائل کو ہم قرآن میں تلاش کریں۔ قرآن کو خالی الذہن ہو کر دیکھئے تو بلا اشتباہ نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس بات کو جانے کہ مرنے کے بعد اسے

اپنے رب کے سامنے حساب کے لئے کھڑا ہونا ہے۔ اس آنے والے دن سے تمام قوموں کو باخبر کرنا ہی امت محمدی کا اصل مشن ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں اٹھنے والی بے شمار تحریکوں میں سے کوئی بھی قابل ذکر تحریک ایسی نہیں جو اس خاص مقصد کو لیکر اٹھی ہو۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ احیائے اسلام کے لئے اٹھے، وہ اگرچہ عالم تھے اور قرآن کو پڑھتے تھے مگر ان کا شاکلہ فقہ اور تصوف اور علم کلام نے بنایا تھا۔ یہی چیز ہے جس نے قرآن کی صراط مستقیم سے لوگوں کو ہٹا دیا۔ ان میں سے جس کے اوپر کلامیات کا غلبہ تھا، اس کے ذہن میں خدمت دین کے شوق نے مناظرہ کی صورت اختیار کر لی۔ جو لوگ متصوفانہ ذہن رکھتے تھے، وہ خانقاہی طرز کی تعلیم و تربیت میں ملت کا مستقبل تلاش کرنے لگے۔ اسی طرح جن کا ذہن فقہ کے سانچے میں بنا تھا، وہ اسلام کو بطور ایک "نظام" کے دیکھنے لگے، جس کو بروئے کار لانے کی واحد شکل یہ تھی کہ حکومت الٰہیہ قائم کرکے اسلام کے دیوانی اور فوجداری قوانین کو نافذ کیا جائے۔ یہ نقطۂ نظر عوام تک میں اس طرح سرایت کر گیا کہ اسلام کے اصل کام کے لئے ان کے اندر کوئی اپیل نہیں رہی۔ ان کی فہرست میں صرف دو کام ثواب کے کام کی حیثیت سے باقی رہ گئے ——— مسجدوں اور مدرسوں کی تعمیر کے لئے چندے دینا، یا "بزرگوں" کی خدمت میں نذرانے پیش کرنا۔ ان کے سوا کوئی اور کام انھیں دینی کام نظر نہیں آتا، اس لئے اس میں ان سے تعاون کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

ایک خالی الذہن شخص ہمارے اسلامی کتب خانہ کو دیکھے تو وہ حیرت انگیز طور پر ایک اختلاف کا مشاہدہ کرے گا۔ یہ دین منزّل اور دینِ مدوّن کا اختلاف ہے جو بہت بڑے پیمانہ پر اسلام کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ خدا کا دین قرآن و حدیث میں ایک سادہ اور فطری چیز نظر آتا ہے۔ وہ دلوں کو گرماتا ہے اور عقل میں جلا پیدا کرتا ہے۔ مگر یہی الٰہی علوم جب انسانی کتابوں میں مدون ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں تو اچانک وہ ایک ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس میں خشک بحثوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ ان میں نہ دلوں کے لئے گرمی ہے اور نہ عقل کے لئے روشنی۔ قرآن میں بھی فقہ ہے مگر وہ کنز الدقائق (ابوالبرکات نسفی) کی فقہ سے مختلف ہے۔ قرآن میں بھی تصوف ہے مگر ضیاء القلوب (حاجی امداد اللہ مہاجر مکی) کے تصوف سے اس کو کوئی مشابہت نہیں۔ اسی طرح قرآن میں بھی معقولات ہیں مگر شمس بازغہ (ملا جیون جونپوری) کی معقولات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ علوم اسلامی کی تدوین بذات خود کوئی غیر مطلوب چیز تھی۔ وہ بلاشبہ مطلوب تھی۔ مگر اس نے بعد کی صدیوں میں جو رخ اختیار کر لیا وہ صحیح نہ تھا۔ اسلامی علوم کی تدوین تذکیری طرز پر مطلوب تھی نہ کہ فنی طرز پر، جیسا کہ عملاً وقوع میں آیا۔ دین کو ذکر و نصیحت کی خاطر آسان (قمر — ۱۷) بنایا گیا تھا۔ مگر ہم نے اپنی پیچیدہ بحثوں سے اس کو مشکل بنا دیا۔

قرآن کو ذکر یعنی نصیحت (یٰس — ۶۹) کہا گیا ہے۔ قرآن میں غور و فکر (ص — ۲۹) اور علمی اضافہ (زمر — ۳۹) وہی مطلوب ہے جس سے ذکر اور نصیحت حاصل ہو۔ مزید یہ کہ علوم قرآنی کی تفصیل و تبیین کس طرح کی جائے، اس کا بھی واضح نمونہ سنت رسول میں موجود تھا۔ کیونکہ آپ اس کے لئے خدا کی طرف سے مامور تھے (نحل — ۴۴) اور آپ نے اس کو

انتہائی مکمل شکل میں انجام دیا۔ یہ تمام چیزیں ثابت کرتی ہیں کہ علوم اسلامی کی تدوین کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس میں فنی اضافہ کیا جائے یا اللہ اور رسول نے جو احکام دئے ہیں، ان میں مزید استخراج کر کے نئے نئے مسائل وضع کئے جائیں اور قرآن، جس میں امام غزالی کے نزدیک صرف پانچ سو احکام ہیں، اس کو پانچ سو ہزار احکام کا مجموعہ بنا دیا جائے۔ علوم اسلامی کی تدوین کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس میں بطور تبیین و تفصیل وہ چیزیں شامل کی جائیں جن میں ذکر اور نصیحت کا سامان ہو۔ قرآن میں ہم کو جو باتیں بتائی گئی ہیں، ان کے بارے میں جہاں یہ ہے کہ ان کو مضبوطی سے پکڑو، اسی کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن کے بیانات پر غور اور تدبر کرو (ص - ۲۹) قرآن میں تفصیلات اور معانی کی تلاش بجائے خود ایک پسندیدہ چیز ہے۔ مگر یہ تلاش تذکیر و نصیحت کے اجزاء تلاش کرنے کے لئے ہونا چاہئے نہ کہ فنی تعینات اور قانونی فروعات ڈھونڈنے کے لئے۔

آج اگر کسی بستی کے لوگ دار الافتاء کو یہ مسئلہ لکھ کر بھیجیں کہ ہماری مسجد کا مسقف حصہ نمازیوں کی بڑھی ہوئی تعداد کے لئے تنگ ہو رہا تھا اور مسجد کے موجودہ رقبہ میں اضافہ کی صورت نہ تھی۔ اس لئے ہم نے مسجد کے پورے صحن پر چھت ڈال دی۔ اب مشکل یہ پیش آگئی کہ مسجد میں صحن باقی نہ رہا۔ ایسی حالت میں کیا موسمی ضرورتوں کے تحت مسجد کی مکمل چھت کو نماز کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے، تو ہمارا مفتی فوراً ایک شرعی مسئلہ کی حیثیت سے اس کا جواب دینے بیٹھ جائے گا اور لکھے گا کہ فلاں فلاں شرطوں کے ساتھ مسجد کی چھت کو نماز کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ ہر چیز کو "شرعی مسئلہ" بنانا قطعاً اسلام کے خلاف ہے۔ یہ تو وہ یہودیت ہے جس کو مٹانے کے لئے نبی آخر الزماں کو مبعوث کیا گیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانے میں یہ حال تھا کہ جب اس قسم کا کوئی سوال کیا جاتا تو سائل کو کوئی متعین جواب نہ دیا جاتا بلکہ یہ کہا جاتا کہ یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ اپنے حالات کے لحاظ سے جیسا مناسب سمجھو ویسا کر لو۔ احادیث و سیر کی کتابوں میں کثرت سے اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں کہ کسی سوال کے جواب میں "مسئلہ" بتانے کے بجائے خود سوال کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ مگر آج کے فقیہ اور مفتی کے یہاں اس قسم کا کوئی خانہ نہیں۔ اس کے یہاں ہر چیز ایک شرعی مسئلہ ہے اور ہر بات کے جواب میں وہ اپنی فقہ کی کتابوں سے کوئی نہ کوئی جزئیہ دریافت کر لیتا ہے جس کی روشنی میں وہ سائل کو مسئلہ کی شرعی صورت بتا سکے۔ ؎

نزول قرآن کے وقت یہود سے کہا گیا تھا:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ اعراف ــــ ۱۵۷	یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

مطلب یہ کہ یہودی فقیہوں نے اپنی قانونی موشگافیوں سے اور ان کے روحانی مقتداؤں نے اپنے تورع کے مبالغوں سے ان کی زندگی کو جن بوجھوں کے نیچے دبا رکھا ہے اور جن خود ساختہ بندشوں میں انہیں جکڑ رکھا ہے، یہ پیغمبر ان سے انہیں آزاد کرتا ہے اور دین خداوندی کو اس کی بے آمیز شکل میں ان کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ آج پیغمبر آخر الزماں کی امت

؎ ابن عباس اور ابن مسعود سے مروی ہے: من افتی الناس فی کل ما یسألونه عنه لمجنون، جزء ۱ صفحہ ۱۳۳

خود اغفیں" اصر و اغلال " کے نیچے دب چکا ہے۔ ان کے فقہار و مشائخ نے اسلام میں وہ سارے اضافے کر ڈالے ہیں جو یہودی فقیہوں اور فریسیوں نے شریعت موسوی میں کئے تھے۔ آج اسلام کی تجدید کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اسلام کو ان تمام اضافوں سے پاک کر دیا جائے۔ جب تک یہ کام نہ ہو اسلام کو زندہ نہیں کیا جا سکتا۔

خدا کے دین کو فن بنانا بظاہر ایک حسین یا کم از کم بے ضرر چیز معلوم ہوتا ہے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے وہ نہایت سنگین ہے۔ یہ دلوں کے اندر قساوت پیدا کرتا ہے اور لطیف احساسات کو آدمی سے چھین لیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں خدا کا دین جس زبان میں ہے، وہ انذار و تبشیر کی زبان ہے، وہ تذکیر و نصیحت کی زبان ہے۔ یہ دونوں انداز ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف ہیں اور بالکل مختلف قسم کے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ قرآن و حدیث کا انداز آدمی کو حقائق و معانی کی طرف متوجہ کرتا ہے، جبکہ ہمارے فنی علوم اس کو جزئیات میں مشغول کر دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث کے انداز سے آدمی کے اندر تفکر و تدبر پیدا ہوتا ہے جب کہ فنی علوم بحث و جدال کے لامتناہی دروازے کھول دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث کا انداز آدمی کے احساسات کو اس طرح جگاتا ہے کہ یوم الحساب کا مسئلہ اس کو سب سے بڑا مسئلہ نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس فنی علوم آدمی کو لایعنی قسم کی منطقی موشگافیوں میں الجھا کر اس کو زندگی کے اصل سوالات سے دور کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ فنی علوم، بظاہر جائز علوم ہونے کے باوجود، باعتبار نتائج اس مقصد کے لئے قاتل بن گئے ہیں جس کے لئے اللہ نے قرآن آتارا اور اپنا رسول بھیجا تھا۔

اس صورت حال کی اصلاح کی کوئی بھی شکل اس کے سوا نہیں ہے کہ قرآن و حدیث کو حقیقی معنوں میں لوگوں کے لئے دین اخذ کرنے کا ذریعہ بنا دیا جائے جس طرح اب وہ فنون کی کتابوں سے اپنا دین اخذ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر نماز کے بارے میں تمام بنیادی باتیں قرآن میں موجود ہیں۔ اس کے بعد اس کے ضروری مسائل حدیث اور آثار صحابہ میں مل جاتے ہیں۔ اب مسائل نماز پر ہماری جو کتاب لکھی جائے، وہ بس انھیں تینوں چیزوں (قرآن، سنت، آثار صحابہ) پر مشتمل ہو۔ اس کے سوا کسی بھی چیز کو نماز کے مسائل میں شمار نہ کیا جائے۔ حتیٰ کہ ترجیح اور تفضیل کو بھی نہیں۔ کیونکہ صحابہ کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف ہونا اس مسئلہ میں دینی توسع کو بتاتا ہے۔ نہ یہ کہ ایک صحیح ہے اور دوسرا غلط، ایک افضل ہے، دوسرا غیر افضل۔

ہمارے عربی کتب خانہ کی "امہات کتب" کا بیشتر حصہ وہ ہے جو اسی فنی زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔ فن فقہ، فن معقولات اور فن تصوف، بعد کو پیدا ہونے والے اسلامی لٹریچر پر اسی طرح چھائے ہوئے ہیں جس طرح ہالہ چاند کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ نتیجۃً اگرچہ متن اسلام نہیں مگر عملی اور روایتی اسلام ٹھیک اسی طرح انسانی آمیزش کا شکار ہو گیا جس طرح دوسرے مذاہب اس کا شکار ہوئے تھے۔ جب تک یہ کتابیں علم دین کا ماخذ ہیں، کبھی یہ ممکن نہیں کہ صحیح تصور دین لوگوں کے دماغوں میں جگہ پا سکے۔ صحیح دینی فکر پیدا کرنے کے لئے ناگزیر طور پر ضروری ہے کہ قرآن و حدیث اور آثار صحابہ کو علم دین کا ماخذ بنایا جائے نہ کہ ان کتابوں کو جو ہمارے دارالعلوموں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے پہلا ناگزیر قدم یہ ہے کہ علوم قرآن، علوم حدیث اور آثار صحابہ کو از سرِ نو سادہ علمی انداز میں مرتب

کیا جائے اور فقہی اور معقولاتی اور متصوفانہ انداز کو ہمیشہ کے لئے ایک تاریخی چیز بنا دیا جائے۔ خدائی دین کو جب تک انسانی آمیزشوں سے پاک نہ کیا جائے، اسلام کا احیاء نہیں ہو سکتا۔

اسلام کی تدوین کا کام ایک دو شخص کے کرنے کا نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی مجلس ہی کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے جس میں معقول تعداد میں ایسے اہل علم جمع کئے جائیں جو نہ صرف قرآن و حدیث کو بخوبی جانتے ہوں بلکہ خالص علمی انداز سے مسائل کی تحقیق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس طرح کی ایک ٹیم ایک ادارہ میں اکٹھا ہو کر مسلسل کام کرے اور اُس کو اِس مقصد کی تکمیل کے لئے ہر قسم کے وسائل با فراط حاصل ہوں تو انشاءاللہ دس برس میں وہ ذخیرہ کتب تیار ہو سکتا ہے جو اسلام کو از سرِ نو زندہ کرنے کی ایک حقیقی جدوجہد کے لئے فکری بنیاد کا کام دے۔ یہ امت اگر چاہتی ہے کہ قیامت میں اس کو امت محمدی کی حیثیت سے شمار کیا جائے تو اس کا پہلا لازمی فریضہ ہے کہ "ہدیٰ محمدی" کو انسانی آمیزشوں سے پاک کر کے اس کی خالص شکل میں لوگوں کے سامنے رکھ دے۔ موجودہ حالت میں اگر ارادۃً نہیں تو علاوہ کتمان حق کی مجرم بن رہی ہے اور اس بات کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ کسی حامل کتاب گروہ کے لئے کتمان حق کے ساتھ کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول نہیں ہوتا۔

حکمت کا تقاضا ہے کہ اس کام کو اجتماعی اہتمام کے ساتھ انجام دیا جائے۔ وہ علوم جو اجتماعی اہمیت کے حامل ہوں ان کی تدوین اجتماعی سطح پر ہی ہونا چاہیے تاکہ پوری ملت کے اندر ان کو مستند مقام حاصل ہو اور سارے لوگ ان کو قبول کر سکیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے زمانہ میں جب ریاست کے تحت قرآن کی جمع و ترتیب کا کام انجام دیا گیا اور اس کے بعد جو نسخے بچے ان کو جلا دیا گیا، تو اس کے اندر یہی حکمت تھی۔ جمع قرآن کا کام اگر انفرادی شخصیتوں کے ذریعہ انجام پاتا تو سخت اختلاف ہو جاتا اور پھر قیامت تک ختم نہ ہوتا۔

حدیث کی جمع و تدوین کے لئے بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز نے غالباً یہی منصوبہ بنایا تھا۔ انھوں نے مدینہ کے گورنر محمد بن عمرو بن حزم اور دوسرے گورنروں کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث اور سنت ملے ان کو جمع کر کے ضبط تحریر میں لائیں۔ مگر ان کی جلد موت کی وجہ سے خلافت کی ماتحتی میں یہ کام انجام نہ پا سکا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ لوگ "ثواب" کے جذبہ کے تحت انفرادی طور پر اس کو کرنے میں لگ گئے۔ بہتر طریقہ یہ تھا کہ محدثین، خلفاء کے ذریعہ، جو ان کے بے حد عقیدت مند تھے، سرکاری انتظام کے تحت ایک ادارہ قائم کراتے جس میں محدثین کی منتخب جماعت اکٹھا ہو کر حدیث کی جمع و ترتیب کے سلسلے میں وہی کرتی جو قرآن کے سلسلے میں زید بن ثابت انصاری اور ان کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ اگر آغاز ہی میں معتبر احادیث کا ایک مجموعہ تیار کر کے باقی تمام "احادیث" کو نذر آتش کر دیا جاتا، تو امت بے شمار فتنوں سے بچ جاتی۔ فقہ کی تدوین کے سلسلے میں بھی صحیح طریقہ اسی اسوۂ صدیقی پر عمل کرنا تھا؛ بجائے اس کے کہ مختلف فقہاء الگ الگ اپنا مدرسہ فکر لے کر بیٹھ جائیں اور ایک خداوندی مذہب کو دس الگ الگ مذاہب میں تبدیل کر ڈالیں۔ اسی طرح علوم اسلامی کی تدوین کا جو کام ہمارے ذمہ ہے اس کو انجام دینے کا بھی صحیح طریقہ یہ ہے کہ اہل علم کی ایک ٹیم مقرر کی جائے اور وہ اپنی اجتماعی جدوجہد سے کتابوں کا ایک سٹ مرتب کرے۔ انفرادی طور پر اگر یہ کام کیا گیا تو اصل مدعا حاصل نہ ہوگا۔

ہمارے پاس اسلامی کتابوں کا ایک ایسا سسٹ ہونا چاہئے جو اسلام کے مکمل مطالعہ کے لئے کسی کو دیا جا سکے۔ اس سلسلہ میں علوم اسلامی کی تدوین کی ایک تجویز یہ ہو سکتی ہے:

قرآن

۱ غیر عربی دانوں کے لئے ترجمہ (بغیر تفسیر) شائع کرنا، مختلف زبانوں میں۔
۲ قرآن میں مذکور انبیاء اور قوموں کے حالات تاریخی انداز سے مرتب کرنا، قدیم معلومات اور جدید اثریات کی مدد سے۔
۳ قرآن میں مظاہر کائنات کے جو حوالے ہیں، ان کی تفصیلات جدید علوم کی مدد سے۔
۴ قرآن کی تعلیمات کتابی ابواب کی صورت میں۔

حدیث

ضعیف اور موضوع روایتوں کو الگ کر کے تمام قوی الاسناد روایات کو چند الگ الگ مجموعوں میں اکٹھا کر دیا جائے۔ مثلاً:

۵ تفسیری روایات
۶ واقعاتی روایات
۷ احکامی روایات
۸ تذکیری روایات

سیرت

۹ پیغمبر اسلام، صرف غزوات نہیں بلکہ مکمل سیرت، سادہ تاریخی اور واقعاتی انداز میں۔
۱۰ حالات صحابہ، مکمل حالات، صرف غزوات کے نہیں بلکہ پوری زندگی کے بارہ میں۔
۱۱ تاریخ اسلام (صرف فتوحات اسلام نہیں بلکہ مکمل تاریخ)

معاون کتابیں

۱۲ صحف سماوی (تاریخ اور تعارف)
۱۳ اعلام الاسلام (اسلامی شخصیتوں کی ڈکشنری)
۱۴ قاموس الاسلام (مختصر اسلامی انسائیکلوپیڈیا)
۱۵ معجم الحدیث (حدیث کے مندرجہ بالا مجموعوں کا مکمل انڈکس)
۱۶ تاریخ دعوت اسلام (آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام کے انداز پر زیادہ جامع کتاب)

اصلاحی و تجدیدی کوششیں

دور جدید اور اس کے مقابلہ میں اسلام کے مسئلہ کا آغاز سولھویں صدی عیسوی میں ہوتا ہے جبکہ پرتگالیوں نے یورپ اور ہندوستان کے درمیان سمندری راستہ دریافت کرکے بحر ہند اور بحر عرب پر قبضہ کرلیا اور عربوں کی تجارت مشرقی ایشیا سے کاٹ دی۔ سترھویں صدی میں اسٹیم انجن کی دریافت اور اٹھارویں صدی میں جدید سائنس کا وجود میں آنا یورپ کے لئے طاقت کا نیا میدان کھل جانے کے ہم معنی تھا۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ میں جب نہر سوئیز بنی اور اس نے بحر روم اور بحر احمر کے درمیان سیدھا راستہ کھول دیا تو عالم اسلام پر مغرب کے غلبہ کا عمل اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ جب تک یہ عمل تجارتی منڈیوں پر قبضہ اور غیر سیاسی میدانوں میں نفوذ کی صورت میں ہو رہا تھا، لوگ اس سے بے خبر رہے۔ مسلم رہنماؤں کو اس واقعہ کی خبر صرف اس وقت ہوسکی جب اس نے اپنے استیلا کو مکمل کرکے عالم اسلام کے اوپر اپنا سیاسی جھنڈا لہرا دیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں مسلم دنیا میں مختلف قسم کی تحریکوں کا ظہور ہوتا ہے۔ مگر اس پوری مدت میں جو بے شمار تحریکیں مسلمانوں کے درمیان اٹھیں، تقریباً سب کی سب ردعمل کی نفسیات کے تحت اٹھنے والی تحریکیں نظر آتی ہیں۔ ان میں کوئی تحریک ایسی نہیں ملتی جو ایجابی فکر کے تحت پیدا ہوئی ہو۔ خارجی طاقت کی دراندازی نے مسلم معاشرہ کے لئے جو مسائل پیدا کئے، ان سے متاثر ہوکر کچھ لوگ بس جوابی ذہن کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے وہ اصلاً خارجی حالات کی پیداوار تھے نہ کہ اسلامی تعلیمات اور سیرت رسول پر مثبت غور و فکر کی پیداوار۔

ردعمل کی یہ نفسیات جن جن صورتوں میں ظاہر ہوئی، ان کو سمجھنے کے لئے ہم چار عنوانات کے تحت ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں:

۱۔ مقابلہ آرائی
۲۔ تحفظ
۳۔ احیاء
۴۔ تعمیر و استحکام

مقابلہ آرائی کے ذہن نے سیاسی آزادی کی تحریکوں کی صورت اختیار کی۔ سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷ـ ۱۸۳۸) سے لے کر ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸ ـ ۱۸۸۸) تک بے شمار ایسے قائدین پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے پوری مسلم دنیا کو جوش و خروش سے بھر دیا۔ جمال الدین افغانی کا نعرہ تھا: مصر للمصریین (مصر مصریوں کے لئے)۔ لیبیا میں اٹلی کے سیاسی اقتدار (۱۹۴۳ ـ ۱۹۱۱) کے زمانہ میں سلیمان البارونی نے آواز لگائی: موتوا الیوم اعزاء قبل ان تموتوا غدا اذلاء (آج عزت کے ساتھ مرجاؤ قبل اس کے کہ کل تم ذلت

کے ساتھ مرو)۔ الفاظ بدل کر اس دور کے تمام سیاسی لیڈروں کا نعرہ یہی تھا۔ کروروں لوگوں نے اجنبی اقتدار سے رہائی حاصل کرنے کے نام پر اپنی جانیں دے دیں اور کھربوں روپے کے نقصانات کو برداشت کیا۔ آج یہ جدوجہد اپنے مقررہ نشانہ کے مطابق تقریباً تمام ملکوں میں کامیاب ہو چکی ہے۔ اگرچہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جس چیز نے مغربی استعمار سے آزادی کی جدوجہد کو کامیاب بنایا وہ بڑی حد تک خود مستعمرین کی باہمی لڑائیاں تھیں، جزئی طور پر جنگ عظیم اول (۱۹۱۴–۱۸) اور زیادہ بڑے پیمانے پر جنگ عظیم ثانی (۱۹۳۹ - ۴۴)

تاہم آزادی کی تحریکوں کی کامیابی ان امیدوں کو پورا نہ کر سکی جن کے لئے الجزائر میں ۲۵ لاکھ اور ہندستان میں دو لاکھ مجاہدین نے اپنے کو قربان کر دیا تھا۔ مسلم قوموں پر مغربی قوموں کا غلبہ آج بھی بدستور باقی ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ غلبہ فوجی اور سیاسی معنوں میں تھا، اب اس نے اقتصادی اور صنعتی روپ اختیار کر لیا ہے۔ یہ دوسرا غلبہ اتنا شدید ہے کہ مسلم ملکوں کی سیاسی پالیسیاں بھی حقیقی معنوں میں آزاد پالیسیاں نہیں ہیں۔ وہ عملاً انھیں مغربی قوموں کے ہاتھ میں ہیں جن سے ہتھیار خرید کر وہ اپنا دفاع کرتے ہیں، جن کی ٹکنکل امداد سے وہ اپنے تمدنی شعبوں کو چلا رہے ہیں۔ ان کے اثرات اب بھی اتنے گہرے ہیں کہ وہ جب چاہیں احمد دبلو (۱۹۶۶) یا شاہ فیصل (۱۹۷۵) کو قتل کرادیں۔ اردن (۱۹۷۱) اور شام (۱۹۷۶) کے ہاتھوں فلسطینی تحریک کو کچل ڈالیں۔ ایران کے عوامی انقلاب (۱۹۷۹) کو ناکام بنادیں۔ مصر کو اپنے اس دشمن سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیں جس کے بارہ میں جمال عبدالناصر (۱۹۱۸ – ۱۹۷۰) نے فخریہ کہا تھا: نحن ابناء الفراعنة سنرميكم في البحر (ہم فرعونوں کی اولاد ہیں، ہم تم کو سمندر میں پھینک دیں گے) وغیرہ۔

۲۔ تحفظ کی تحریکوں نے عام طور پر تعلیم دین کا رخ اختیار کیا۔ مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷–۱۹۱۴) نے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اپنی تقریر میں کہا تھا: " دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ وہ آگے بڑھیں، آگے بڑھیں۔ ہماری ترقی یہ ہے کہ ہم پیچھے ہٹیں، پیچھے ہٹیں۔ یہاں تک کہ دور نبوت سے جا ملیں "۔ اس ذہن کے تحت تمام ملکوں میں بے شمار مدارس قائم کئے گئے۔ ان مدارس کا مقصد یہ تھا کہ مسلم نسلوں کو عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم دی جائے اور ان کو، کم از کم ذہنی حیثیت سے، دور نبوت تک پہنچا دیا جائے۔ توقع یہ تھی کہ جو لوگ ان مدارس میں تربیت پا کر نکلیں گے، وہ زمانہ کے اثرات سے اپنے کو بچانے کے لائق بن سکیں گے۔

یہ تحریک ان معنوں میں پوری طرح کامیاب رہی کہ اس نے ساری مسلم دنیا میں دینی مدرسوں کا جال بچھا دیا اور کوئی بستی ایسی نہ رہی جو ان درس گاہوں میں تعلیم پائے ہوئے علماء و فضلاء سے خالی ہو۔ مگر جہاں تک اسلامی ذہن اور اسلامی طرز فکر کا سوال ہے، ان مدارس کی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے۔ ان مدارس سے فراغت کے بعد جن خوش نصیبوں کو خود ان مدارس یا ان سے ملتے جلتے کسی ادارہ میں جگہ مل گئی، انھوں نے بلاشبہ مدرسہ کے دیئے ہوئے ظاہری لبادہ کو باقی رکھا، کیونکہ ان اداروں میں قیام و ترقی کے لئے یہی لبادہ ان کی قیمت تھی۔ مگر جن لوگوں کے حالات انھیں ان اداروں سے باہر لے گئے، وہ کسی بھی معنی میں غیر دینی مدارس کے فارغین سے مختلف ثابت نہ ہو سکے ——— کیریرزم (CAREERISM) ان کا دین بھی رہا اور اُن کا بھی۔

اس کی دو بڑی وجہیں ہیں۔ اول یہ کہ دینی تعلیم کے رہنما اس واقعہ کا پوری طرح اندازہ نہ کرسکے کہ اسلامی تعلیم کا مسئلہ، موجودہ زمانہ میں، صرف اسلامی زبان یا اسلامی احکام سے واقف کرانے کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ نظام حاضر کے فکر میں اسلام کو اس کی جگہ دلانے کا مسئلہ ہے۔ انھوں نے اپنے اداروں میں جو نسل تیار کی، وہ اگرچہ اسلام کے روایتی علوم کی ماہر تھی، مگر اسلام اس کے حقیقی ذہن کا جز نہیں بنا تھا۔ کیونکہ وہ اس کو اس فکری مستوی کے مطابق دکھائی نہیں دیتا تھا جس کے اندر وہ عملاً سانس لے رہا تھا۔ جو اسلام اسے دیا گیا وہ اس کے لئے ایک قسم کا معلوماتی ضمیمہ تھا نہ کہ فکری غذا۔ ظاہر ہے کہ عالمی افکار کے سیلاب میں کوئی شخص اس قسم کے ذہنی ضمیمہ کو دیر تک باقی نہیں رکھ سکتا۔ دوسرے یہ کہ جدید تبدیلیوں نے مروجہ دینی تعلیم کا رشتہ اقتصادیات سے کاٹ دیا تھا۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کوئی تعلیمی نظام جو اقتصادی بنیادوں سے محروم ہو، زندگی کے نظام میں مؤثر مقام حاصل نہیں کرسکتا۔

۳۔ احیاء کی تحریکوں سے میری مراد وہ تحریکیں ہیں جو اسلامی نظام کے قیام کا مقصد لے کر اٹھیں۔ انڈونیشیا کی ماشومی پارٹی، مصر کی الاخوان المسلمون، پاکستان کی جماعت اسلامی اس کی مثالیں ہیں۔ ان تحریکوں کا کہنا تھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جتنے مسائل پیش آرہے ہیں، وہ صرف اس لئے ہیں کہ اسلامی قانون کی حکومت زمین پر قائم نہیں ہے۔ اگر مسلم ملکوں میں اسلامی قانون کی بنیاد پر معاشرہ کی تنظیم کر دی جائے تو نہ صرف ہمارے تمام اندرونی مسائل حل ہو جائیں گے بلکہ عالمی سطح پر مسلمان دوبارہ وہی مقام حاصل کرلیں گے جو ماضی میں ایک ہزار برس تک انھیں حاصل تھا۔

ان تحریکوں نے اسلام کی تعلیمات کو جس طرح سیاسی اصطلاحوں میں بیان کیا وہ، خاص طور پر موجودہ صدی کے نصف اول کے ماحول میں، بہت سے مسلمانوں کو اسلام کے حق میں وقت کا بہترین قصیدہ معلوم ہوا۔ وہ سیاسی شاعرہ کے اس اسلامی پنڈال میں آسانی سے جمع ہو گئے۔ تاہم یہ مشاعرہ دیر تک باقی نہ رہ سکا۔ ان تحریکوں کا ذہن چونکہ اسلام کی سیاسی تشریح سے بنا تھا، قدرتی طور پر ایسا ہوا کہ وہ بہت جلد اپنے ملکوں کی "غیر اسلامی" حکومتوں سے ٹکرا گئیں۔ یہ ٹکراؤ ہر ایک کے حق میں چھری اور خربوزے کا ٹکراؤ ثابت ہوا۔ مصر کے انور السادات نے اقتدار پر قبضہ کے بعد (۱۹۷۱) اپنے سیاسی حریفوں کو انتباہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ جو میری مخالفت کرے گا، میں اس کو قیمہ بنا دوں گا (ساُفرمہ)۔ مسلم حکمرانوں کے یہ ارادے سب سے زیادہ جن کے حق میں صحیح ثابت ہوئے ہیں، وہ یہی اسلامی نظام کی علم بردار جماعتیں ہیں۔ انھوں نے ہر ملک میں ان جماعتوں کو قیمہ بنا کر رکھ دیا ہے، اب کسی بھی ملک میں ان کا کوئی سیاسی مستقبل نہیں۔

اسلامی نظام کی علم بردار جماعتوں کی یہ ناکامی محض ان کے سیاسی حریفوں کی شقاوت کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس میں خود ان کے رہنماؤں کا یہ انتہائی غلط اندازہ شامل ہے کہ انھوں نے سمجھا کہ وہ مقامی مسلمانوں کے ووٹ سے اسلامی حکومت بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ وہ اس تاریخی حقیقت کو بھول گئے کہ حکومتیں ہمیشہ وقت کے غالب افکار

کے جلو میں بنتی ہیں۔ موجودہ زمانہ کا فکری ڈھانچہ تمام تر سیکولر بنیادوں پر قائم ہے۔ ایسی حالت میں کسی کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک میں اسلام کا سیاسی جزیرہ بنا سکے، جب تک وہ زمانی افکار کے ڈھانچہ کو توڑنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔

۳۔ تعمیر و استحکام سے میری مراد وہ فکری حلقہ ہے جس کا کہنا یہ تھا کہ اجنبی اقتدار سے براہ راست سیاسی تصادم نہ کیا جائے۔ اس کو بطور چھتری استعمال کرتے ہوئے غیر سیاسی دائروں میں اپنے کام کو جاری رکھا جائے۔

بدقسمتی سے یہی وہ ذہن ہے جو موجودہ دور کے مسلمانوں میں سب سے کم پایا گیا ہے۔ مفتی محمد عبدہ نے پیرس میں زمانہ قیام (۱۸۸۴) سے متعلق اپنے استاد جمال الدین افغانی کا ایک تاثر نقل کیا ہے۔ محمد عبدہ نے ایک گفتگو کے دوران اپنے استاد سے کہا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں سے سیاسی تصادم کا بظاہر کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ جب کہ دوسری طرف ہمارے لئے کام کا ایک ایسا میدان کھلا ہوا ہے جس میں ہم یقینی نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ہے یورپ اور امریکہ میں اسلام کی تبلیغ۔ ہم کیوں نہ ایسا کریں کہ اپنے کو سیاسی نشانہ سے ہٹا دیں اور خاموشی سے تبلیغ و تعلیم کے کام میں لگ جائیں۔ جمال الدین افغانی کی انقلابی طبیعت کو یہ تجویز حقیر معلوم ہوئی۔ انھوں نے کہا: انما انت مثبط (تم پست حوصلگی کی باتیں کرتے ہو)

اس پورے دور میں تعمیر و استحکام کے مقصد کے تحت اٹھنے والی کوئی قابل لحاظ تحریک نظر نہیں آتی۔ مسلم رہنماؤں کا حال یہ رہا کہ وہ — "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز" جیسے رومانی تصورات پر فدا ہوتے رہے۔ کسی کی سمجھ میں وہ حقیقت پسندانہ طریق کار نہ آسکا جس کو بدنام طور پر حالی (۱۸۳۷–۱۹۱۴) نے ان لفظوں میں بیان کیا تھا:

— چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔

ہندستان میں اس سلسلہ میں دو مستثنیٰ مثالیں ملتی ہیں، وہ بھی بدنام شخصیتوں کی۔ میری مراد سرسید احمد خاں (۱۸۱۷–۱۸۹۸) اور مرزا غلام احمد قادیانی (۱۸۴۰–۱۹۰۸) سے ہے۔ اول الذکر کا کہنا تھا کہ انگریز نے اگرچہ سیاسی کام کا راستہ بند کر رکھا ہے مگر سیاست کے علاوہ دوسرے میدانوں میں تعمیر و ترقی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

تعلیم اور اقتصادیات، جو بقیہ چیزوں کی اساس ہے، ان میں ہم کسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اسی امکان کو ایک اور میدان میں تلاش کیا۔ یہ دعوت و تبلیغ کا میدان تھا۔ ان کا خیال تھا کہ دعوت کی راہ سے ہم نہ صرف ملک کے طبقات میں اپنے لئے کام کے مواقع پا سکتے ہیں بلکہ حکمراں قوم کے اندر بھی ہمارے لئے جدوجہد کا میدان کھلا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ یہ کام خود اسلام کا اہم ترین مقصود ہے اور بالآخر اس غلبہ تک بھی پہنچانے والا ہے جہاں ہم سیاسی زور آزمائی کے ذریعہ ناکام طور پر پہنچنا چاہتے ہیں۔

یہ دونوں تحریکیں، اپنی ابتدائی شکل میں، نہایت مفید اور دور رس تحریکیں تھیں۔ مگر بدقسمتی سے وہ عام مسلمانوں کو اپنے ساتھ نہ لے سکیں۔ اس کی وجہ دو طرفہ تھی۔ ایک طرف ہمارے رہنماؤں کا ذہن سامراج دشمن خیالات سے اتنا زیادہ ماؤف ہو چکا تھا کہ کسی اور انداز سے سوچنا ان کے لئے ممکن نہ رہا تھا۔ ہر وہ شخص انھیں سامراج کا ایجنٹ

دکھائی دیتا تھا، جو سامراج سے سیاسی مقابلہ کی بات نہ کرے۔ اس کی آخری حد یہ ہے کہ علی گڑھ کے سابق استاد پروفیسر آرنلڈ کی قیمتی کتاب پریچنگ آف اسلام ہمارے رہنماؤں کو سامراجی اغراض کے تحت لکھی ہوئی کتاب نظر آئی۔ کیونکہ اس میں تلوار کے بجائے پرامن تبلیغ کو اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بتایا گیا تھا!

دوسری وجہ یہ ہوئی کہ اس نظریہ کے دونوں علم بردار اس اہلیت کا ثبوت نہ دے سکے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی صحیح وکالت کر سکتے ہیں۔ سرسید احمد خاں نے اپنے موقف کی حمایت کے لئے یہ نادانی کی کہ قرآن کو انیسویں صدی کے مغربی افکار پر ڈھالنا شروع کر دیا۔ ان کے اخلاص کے ثبوت کے لئے یہ کافی ہے کہ انھوں نے "تہذیب الاخلاق" کو اپنے ذاتی فکر کا نمائندہ قرار دے کر اس کو علی گڑھ کالج سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی۔ مگر یہ تقسیم عملی طور پر ممکن نہ ہو سکی اور ایک صحیح کام کے لئے غلط استدلال نے ان کے مشن کو لوگوں کی نظر میں مشتبہ بنا دیا۔

اسی قسم کی غلطی دوسری شکل میں مرزا غلام احمد قادیانی نے کی۔ انھوں نے اپنے کام کا آغاز کیا تو یہ وہ وقت تھا جبکہ سارے مسلم رہنما انگریز کے خلاف جہاد حریت میں مصروف تھے۔ ان پُرجوش مجاہدین کو محسوس ہوا کہ قادیانی مشن مسلمانوں کو مقدس جہاد کے محاذ سے ہٹا کر پُرامن تبلیغ کے میدان میں لگا دینا چاہتا ہے۔ مرزا صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ جہاد (بمعنی سیاسی مقابلہ) کوئی مستقل شرعی حکم نہیں ہے۔ وہ صرف دفاعی ضرورت کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ مگر ہمارے مجاہدین حریت کے لئے یہ جواب تسکین بخش ثابت نہ ہو سکا۔ انھوں نے فتویٰ دیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی انگریزوں کے ایجنٹ ہیں۔ اب مرزا صاحب نے ایک اور قدم بڑھایا۔ انھوں نے اپنی بات کو مستند ثابت کرنے کے لئے کہنا شروع کیا کہ ان پر وحی آتی ہے اور وہ جو کچھ بولتے ہیں خدا کی طرف سے بولتے ہیں۔ یہ دعویٰ اپنی تمام تر غلطی کے باوجود، قدیم زمانہ میں انوکھا نہ تھا کیونکہ ہمارے بہت سے بزرگ، مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ (۱۷۶۲ — ۱۷۰۳) بھی، العمنی ربی (میرے رب نے مجھ کو الہام کیا) جیسی زبان میں کلام کرتے ہیں۔ تاہم مرزا صاحب کی غلطی میں مزید شناعت اس لئے پیدا ہو گئی کہ انھوں نے صاف لفظوں میں اپنے رسول اللہ ہونے کا دعویٰ کر دیا جو، ختم نبوت کے بعد، اجماعی طور پر کفر کو مستلزم ہے۔

ان چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو فریقوں کے درمیان جو گفتگو "حالات کے لحاظ سے اسلامی عمل کی منصوبہ بندی" کے عنوان پر ہونی چاہئے تھی، وہ قرآن کی تفسیر جدید اور نبوت محمدی کے بعد دوسری نبوت جیسے مسائل پر مرکوز ہو گئی۔ آغاز میں اگر سرسید احمد خاں اور مرزا غلام احمد قادیانی کے مخالفین غلطی پر تھے تو آخر میں سرسید اور مرزا قادیانی شدید تر غلطیوں کا شکار ہو گئے اور ملت کے حصہ میں کفر و فسق کے فتووں کے سوا اور کچھ نہ آیا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام ۲۲ — ۲۵ جنوری ۱۹۷۰ کو ایک سیمینار ہوا۔ عنوان تھا:

ISLAM IN A CHANGING WORLD "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں"

یہ مقالہ اس موقع پر ۲۵ جنوری کی نشست میں پڑھا گیا۔

پہلا قدم : اسلامی درس گاہ

سر آرتھر کیتھ (۱۸۶۶ - ۱۹۵۵) نے مصر کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

THE EGYPTIANS WERE CONQUERED NOT BY THE SWORD, BUT BY THE KORAN

Sir Arthur Keith, A New Theory of Human Evolution
London, Watts & Co. 1950, P. 303

"مصریوں کو کسی تلوار نے فتح نہیں کیا بلکہ قرآن نے فتح کیا"۔ انگریز مبصر نے مصر کے سلسلے میں اسلام کی جس نظریاتی طاقت کا اعتراف کیا ہے، وہی ایشیا اور افریقہ کے اس پورے خطہ کے لئے صحیح ہے جس کو آج ہم اسلامی دنیا کے نام سے جانتے ہیں۔ ایسا کیوں کر ہوا کہ یہ ساری قومیں نہ صرف اپنا مذہب بلکہ زبان تک بدل کر اسلامی برادری میں شامل ہو جائیں۔ جواب یہ ہے کہ مدرسوں کے ذریعہ۔ دور اوّل کے مسلمان عرب سے نکل کر اطراف کے تمام ملکوں میں پھیل گئے۔ انھوں نے اپنی اسلامی مہم کے مرکز کے طور پر جگہ جگہ اسلامی مدرسے قائم کئے۔ ان مدرسوں میں لوگوں کو عربی زبان سکھائی جاتی تھی اور قرآن و حدیث پڑھایا جاتا تھا۔ ان مدرسوں سے جو لوگ پڑھ کر نکلتے، وہ اپنی اپنی بستیوں میں جاکر دوبارہ اسی قسم کے ادارے قائم کرتے۔ مدرسوں کو بنیاد بنا کر کام کرنے کا یہی طریقہ تھا جس نے ایک سو برس کے اندر اندر اس وقت کی آباد دنیا کے بڑے حصے کے مذہب، تہذیب اور زبان کو بدل ڈالا۔

قرآن ایک دائمی معجزہ ہے۔ خالق کائنات نے اس کے ذریعے اپنے بندوں سے کلام کیا ہے وہ اس دنیا میں خدا اور بندہ کا مقام اتصال ہے، وہ دلوں کو گرماتا ہے اور شعور کو بیدار کرتا ہے۔ اس کے اعلیٰ مضامین اور اس کا آسمانی ادب اتنا اثر انگیز ہے کہ جو شخص بھی قرآن کو سمجھ کر پڑھتا ہے، اس کی صداقت کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رسول کی زندگی اور آپ کے اصحاب کے حالات انسانی تاریخ کا انتہائی حیرت ناک انقلابی واقعہ ہیں جو زندگیوں کو گرمانے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ دور اول کے مدرسے بس انھی چیزوں کو زندہ کرنے کے ادارے تھے۔ وہ سادہ طور پر عربی زبان سکھا کر آدمی کو قرآن و حدیث سے وابستہ کر دیتے تھے۔ اس کے بعد آدمی ایمان اور حرارت کے ان خزانوں سے براہ راست اپنا دین اخذ کرنے لگتا تھا۔ علم دین اس کے لئے صحبت رسول اور صحبت صحابہ کے ہم معنی بن جاتا تھا۔ خدا کی کتاب اس کی فطرت کو جگاتی تھی۔ رسول اور آپ کے اصحاب کی انقلابی زندگیاں اس کے سینہ میں عمل کی آگ بھر دیتی تھیں۔ اس طرح زندہ انسانوں کی وہ فوج تیار ہوتی تھی جو کے لئے جینے اور خدا کے لئے مرنے کے سوا کوئی اور بات اس دنیا میں نہ جانتی تھی۔

آج ہمارے یہاں پہلے سے بھی زیادہ بڑی تعداد میں مدرسے قائم ہیں مگر آج ان مدرسوں کا وہ فائدہ ظاہر نہیں ہو رہا ہے جو دور اول میں ظاہر ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مدرسے اپنے ڈھانچے کے اعتبار سے اس سے بالکل مختلف ہیں جو صحابہ و تابعین نے قائم کئے تھے۔ موجودہ زمانہ کے مدرسوں میں تعلیم دین کو ایک فن بنا دیا گیا ہے۔ قرآن اس لئے اترا کہ اس کو پڑھ کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوں اور ان کے دل خدا کی یاد سے دہل اٹھیں۔ مگر ان مدرسوں کے نصاب میں قرآن کو صرف ضمنی مقام حاصل ہے۔ رسول کی زندگی اور صحابہ کے حالات جو تاریخ انسانی میں آتش فشاں کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو سرے سے پڑھایا ہی نہیں جاتا۔ احادیث و آثار کا مقام ہمارے مدارس میں صرف یہ ہے کہ ان کو عنوان بنا کر جزئیات فقہ کے کچھ خود ساختہ مسائل پر لامتناہی بحثیں جاری رکھی جا سکیں۔ اسی کے ساتھ "علوم آلیہ" کے نام پر جو فنون پڑھائے جاتے ہیں وہ اتنے فرسودہ

ہیں کہ ذہن کو جمود اور لایعنی موشگافیوں کا عادی بنانے کے سوا کوئی دوسری خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ اسلامی مدرسہ کی فضا کو اللہ کی بڑائی کے چرچے سے معمور رہنا چاہئے۔ مگر ہمارے موجودہ تعلیمی ادارے زوال کی جس سطح پر ہیں وہ یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنے کچھ زندہ یا مردہ اکابر بنالئے ہیں اور مدرسہ کی تمام سرگرمیاں بس انھیں بزرگوں کی کبریائی کا سبق دینے کے لئے وقف رہتی ہیں۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ یہاں لوگوں کو ایمانی حرارت کا سبق ملے، یہاں اعلیٰ انسانی کردار ڈھلیں۔ یہاں خدا وآخرت کی تڑپ رکھنے والے لوگ پیدا ہوں، یہاں سے اسلام کا وہ سیلاب اٹھے جو دور اول کے مدرسوں سے اٹھا تھا اور ایک عالم پر چھا گیا تھا۔

چڑیا گھر میں لوگ ہنسی خوشی گھوم رہے ہیں۔ اچانک ذمہ داروں کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ ایک شیر کٹہرے سے باہر آگیا ہے۔ اس وقت اس خبر کو جاننے کے معنے کیا ہوں گے۔ صرف ایک: جلد سے جلد بھاگ کر شیر سے بچنے کی کوشش کرنا۔ اس خبر کا علم ہوتے ہی چڑیا گھر کی تمام سرگرمیاں شیر کے مسئلہ کے گرد سمٹ آئیں گی۔ شیر کا علم اور شیر کا خوف، دونوں اس وقت ہم معنی الفاظ بن جائیں گے۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ دینی تعلیم کا مطلب کیا ہے۔ دینی تعلیم کا مقصد بندے کو اس کے خدا سے متعارف کرنا ہے۔ انسانی شعور کو تربیت دے کر اس سطح پر لانا ہے جہاں وہ اپنے خالق اور مالک کو جان سکے اور اس کے ساتھ وہ تعلق قائم کرے جو حقیقت واقعہ کے اعتبار سے مطلوب ہے۔ یہ آگہی اگر کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ وہی واقعہ بدرجہا زیادہ شدت کے ساتھ ظہور میں آئے گا جو شیر کے چھوٹنے کی خبر سن کر چڑیا گھر کے زائرین میں ہوتا ہے۔ شیر کا خالق شیر سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ ہم شیر کو گولی مار سکتے ہیں۔ کسی بند مکان میں گھس کر شیر سے بچ سکتے ہیں۔ مگر رب العالمین کی پکڑ سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ اس لئے حقیقی دینی تعلیم جس ماحول میں وجود میں آجائے، وہ خوف خدا کا ماحول بن جائے گا۔ خدا کا علم اور خدا کا خوف دونوں ہم معنی الفاظ بن جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس تعلیمی ادارہ میں خوف خدا کی فضا پیدا نہ ہو، وہ اور جو کچھ بھی ہو، دینی تعلیم کا ادارہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن کی رو سے عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرنے والا ہو:

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر-۲۸)	اللہ سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اعلمکم باللہ اشدکم لہ خشیۃ (تفسیر نسفی)	تم میں سب سے زیادہ عالم وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔

یہاں اس سلسلہ میں چند مزید اقوال نقل کئے جاتے ہیں:

ابن مسعود:	لیس العلم بکثرۃ الروایۃ انما العلم خشیۃ اللہ جامع بیان العلم وفضلہ۔ جزء ثانی، صفحہ ۲۵	علم کثرت روایت کا نام نہیں ہے۔ علم نام ہے اللہ سے خوف کا
مجاہد:	الفقیہ من خاف اللہ (۴۹)	فقیہ وہ ہے جو اللہ سے ڈرے
عطاء:	من خشی اللہ فھو عالم (۴۹)	جو اللہ سے ڈرے وہی عالم ہے

حسن بصری: العالم من سی الرحمن بالغیب (تعبیر ابن کثیر)   عالم وہ ہے جو دیکھے بغیر اللہ سے ڈرے

موجودہ اسلامی درس گاہوں کو اس معیار پر جانچا جائے تو وہ اس کیفیت سے بالکل خالی نظر آئیں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مدرسوں اور دارالعلوموں کی بنیاد "خوف خدا" پر رکھی ہی نہیں گئی۔ ان کا مقصد محض "فنون" کی تعلیم ہے اور ان فنون کے علماء بہر حال ان اداروں سے کثیر تعداد میں نکل رہے ہیں۔ اپنے تاسیسی مقصد کے اعتبار سے ممکن ہے وہ ناکام نہ ہوں۔ مگر حقیقی علم دین پیدا کرنے کے اعتبار سے بلاشبہ وہ مکمل طور پر وہ ناکام ہیں۔

امام مالک کا قول ہے: لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولہا (اس امت کے آخر کی اصلاح بھی اسی طریقہ کی پیروی سے ہوگی جس سے امت کے اول کی اصلاح ہوئی تھی) یہ قول موجودہ حالات کے لئے مکمل طور پر صادق آتا ہے۔ اس امت کے ابتدائی حصہ کے اندر جو زندگی اور انقلاب آیا تھا۔ وہ قرآن اور رسول کے ذریعہ آیا تھا۔ آج بھی قرآن اور رسول کی سنت کو بنیاد بنا کر دوبارہ امت کے اندر انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ آج اسلام کے احیاء کے لئے بہترین قابل عمل آغاز یہ ہے کہ قدیم طرز کی درس گاہیں قائم کی جائیں جن میں تعلیم کی بنیاد قرآن اور سیرت ہو نہ کہ بعد کے پیدا شدہ فنون۔

ضرورت ہے کہ دوبارہ دور اول کے طرز کے مدرسے قائم ہوں اور ان کو بنیاد بنا کر اصلاح امت کا کام کیا جائے۔ ان مدارس کا نصاب بالکل سادہ اور غیر فنی ہونا چاہئے۔ موجودہ حالات کے لحاظ سے ہم اس کو چار مرحلوں پر تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلا مرحلہ: عربی زبان اور قرآن

دوسرا مرحلہ: حدیث، سیرت رسول، حالات صحابہ، اسلامی تاریخ وغیرہ (عربی زبان میں)

تیسرا مرحلہ: عالمی زبانیں، دیگر مذاہب اور ان کی تاریخ۔ فلسفہ جدید، ضروری سائنسی معلومات

چوتھا مرحلہ: اختصاصی مطالعہ کسی ایک اسلامی موضوع پر (عربی میں ایک مقالہ تیار کرنا)

اس قسم کا ایک مدرسہ اعلیٰ معیار پر قائم ہو جائے تو بلاشبہ وہ دور جدید کا سب سے بڑا کام ہوگا۔

اس طریق تعلیم کے لئے ہم کو نئی نصابی کتابیں وضع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قدیم عربی کتابوں کے ذخیرہ سے بآسانی ایسی کتابیں منتخب کی جا سکتی ہیں جو مطلوبہ ضرورت کو پورا کرنے والی ہوں۔ جہاں تک دیگر زبانیں اور سیکولر علوم کا تعلق ہے، ان کے لئے بھی ہم کو اپنی الگ کتابیں تیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ دوسروں نے ان موضوعات پر جو کتابیں تیار کی ہیں، ان کا ایک انتخاب بخوبی طور پر ہماری اس ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔ البتہ اساتذہ کی فراہمی ایک مشکل کام ہوگا۔ تاہم اگر گروہی حد بندیوں سے اوپر اٹھ کر دیکھا جائے تو اساتذہ کی فراہمی کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے۔ صرف اس اہتمام کے ساتھ کہ ان کو حسب لیاقت معاوضہ دینے کا انتظام ہو، اور ان کے ساتھ وسعت ظرف کا معاملہ کیا جائے۔

Single Copy Rs. 2-00

Regd No. D (D) 532
Regd R.N No. 28822/76

June 1978

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qasimjan Street, DELHI-110006 (INDIA)

ظهور اسلام

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

مسافر سے جب ایک ٹرین چھوٹ جاتی ہے تو جلد ہی اس کے بعد دوسری ٹرین مل جاتی ہے جس سے وہ اپنا سفر جاری رکھ سکے ....

یہ پلیٹ فارم کا سبق ہے۔ مگر اکثر لوگ اس معلوم سبق کو اس وقت بھول جاتے ہیں جب کہ زندگی کی دوڑ میں ایک موقع ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہو۔

شمارہ ۲۰ | زر تعاون سالانہ ۲۴ روپیے | قیمت فی پرچہ
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپیے
جولائی ۱۹۷۸ | بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی | دو روپیے

الرسالہ

شمارہ ۲۰ جولائی ۱۹۷۸

جمعیۃ بلڈنگ • قاسم جان اسٹریٹ • دہلی ۶

قال الاوزاعی بلغنی ان اللہ اذا اراد بقوم شرا الزمھم الجدل ومنعھم العمل

ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ
جزء ثانی، صفحہ ۹۳
ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر

اللہ جب کسی قوم کے لئے شر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو جدال میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس کو عمل سے روک دیتا ہے۔

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ براہ کرم اپنا زر تعاون بذریعہ منی آرڈر بھیج کر شکریہ کا موقع دیں ——— منیجر الرسالہ

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ کوئی صحافتی کاروبار نہیں۔ وہ صرف اس بات کی چیتاونی ہے کہ لوگو، ہوشیار ہوجاؤ۔ کیونکہ وہ وقت بہت تیزی سے دوڑا چلا آرہا ہے جبکہ سارے لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے کردیئے جائیں گے۔ کسی کے لئے نہ کج بحثی کا موقع ہوگا اور نہ ہٹ دھرمی کا۔ ہر آدمی مجبور ہوگا کہ وہ سچائی کے آگے اپنی گردن جھکا دے۔ قبل اس کے کہ یہ وقت آئے، بہترین عقلمندی یہ ہے کہ ہم آج ہی سچائی کے آگے جھک جائیں، کیوں کہ کل کا جھکنا رسوائی ہے اور آج کا جھکنا عزت۔

ایسی حالت میں ہم سے زیادہ نادان اور کوئی نہ ہوگا اگر ہم اپنے خلاف تنقیدوں پر غور نہ کریں۔ مگر یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ ان تنقیدوں میں یا تو لفظی شور و غل ہے یا غیر متعلق بحثیں۔ کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ دو میں سے کوئی ایک ہی رویہ ان کے لئے صحیح ہے: علمی رد یا علمی اعتراف۔ بے معنی بحثیں کسی کو دنیا میں بچانے والی ہو سکتی ہیں مگر آخرت میں وہ کسی کو بچانے والی ثابت نہ ہوسکیں گی۔ خواہ اپنے طور پر وہ کتنی ہی خوش فہمی میں مبتلا رہے

زندگی کی سب سے زیادہ سنگین حقیقت یہ ہے کہ ہماری ہر بات خواہ وہ بظاہر ایک انسان کے سامنے ہو، حقیقۃً وہ خدا کے سامنے ہوتی ہے۔ کیونکہ آخری طور پر ہر آدمی کو خدا ہی کے سامنے جواب دہ ہونا ہے — کوئی بات اپنے منہ سے نکالنے سے پہلے اس کو انصاف کے ترازو پر تول لیجئے۔ اگر آج آپ نے ایسا نہ کیا تو کل کے دن خدا اس کو انصاف کے ترازو پر تولے گا اور جس کو خدا کے یہاں تولا گیا اس کے لئے ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں (من نوقش فقد هلك)

یہ سنتِ یوسفی نہیں

قرآن میں سابق اہل کتاب کی جن عادتوں کا ذکر ہے، ان میں سے ایک یہ ہے:

"ان کا ایک گروہ (علماء قائدین) کتاب میں زبان کو موڑتا ہے تاکہ تم ان کی کہی ہوئی بات کو خدا کی بات جانو۔ حالاں کہ وہ خدا کی کتاب سے نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ حالاں کہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں۔ وہ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں۔ حالاں کہ وہ خوب جانتے ہیں (آل عمران ۷۸)

زبان کو مروڑ کر بات کرنا (لیّ لسان) سے کچھ لوگ یہ مراد لیتے ہیں کہ زبان کی گردش سے الفاظ کو بدل دیا جائے۔ جزوی طور پر یہ مفہوم بھی اس میں شامل ہے۔ مگر اس کا اصل مفہوم تحریف معنوی ہے۔ (لوی لسانہ بکذا کنایۃ عن الکذب وتخرص الحدیث، راغب) مثلاً اپنے کسی غلط عمل کے ساتھ کتاب اللہ میں لفظی اشتراک ڈھونڈ کر یہ کہنا کہ یہ عمل فلاں حکم الٰہی کے مطابق ہے یا اس سے لیا گیا ہے۔ شیخ محمد عبدہ مصری نے کہا ہے کہ یہ بھی لیّ لسان کی ایک مثال ہے کہ حضرت مسیح ؑ نے اپنے مخاطبین کو سمجھانے کے لئے مجازی طور پر خدا اور بندے کے لئے اب اور ابن (باپ اور بیٹے) کے الفاظ استعمال کئے۔ بعد کو مسیحی علماء نے اس کو حقیقی طور پر لے لیا اور اس لفظی مشابہت سے فائدہ اٹھا کر گمراہی کی پوری عمارت کھڑی کردی۔ توحید کی دعوت سے شرک کا عقیدہ نکال لیا۔

کتاب میں زبان کو موڑنے کا مطلب کتاب کے الفاظ کو موڑنا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ لیّ لسان سے مراد تقریباً وہ

چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں غلط تعبیر (Misinterpretation) کہا جاتا ہے۔ یہ فعل اگر جان بوجھ کر ہو تو اللہ کے نزدیک وہ بدترین جرم ہے۔ تاہم جس طرح ہر فعل کے درجات ہیں، اسی طرح اس فعل کے بھی بہت سے درجے ہیں

کچھ باحوصلہ مسلمان "محمدی سیاست" کا نعرہ لے کر اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں سے لڑ جاتے ہیں اور ان کو اقتدار سے بے دخل (Unseat) کرنے کی تحریک چلاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں دونوں کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے۔ حکمران طبقہ اپنے سیاسی حریفوں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیتا ہے۔ اس کے بعد محمدی تحریک کے قائدین اپنی سالانہ "روداد جہاد" شائع کرتے ہیں جس میں فخر کے ساتھ یہ الفاظ درج ہوتے ہیں:

"ہماری تحریک کے مرکزی، صوبائی اور ضلع کی سطح کے عہدہ داروں میں سے شاید ہی کوئی شخص سنت یوسفی ادا کرنے سے محروم رہا ہو"

اس قسم کی قید کو "سنت یوسفی" کا نام دینا بھی لی لسان کی ایک قسم ہے۔ حضرت یوسفؑ بلاشبہ جیل میں ڈالے گئے جس طرح محمدی سیاست کے مجاہدین جیل میں ڈالے گئے۔ مگر دونوں میں لفظی اشتراک کے سوا اور کوئی نسبت نہیں۔ حضرت یوسفؑ کے جیل جانے کی وجہ یہ نہ تھی کہ انھوں نے اپنے وقت کے حکمراں کے خلاف اپوزیشن پارٹی بنائی تھی اور اس کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی پُرشور تحریک چلا رہے تھے اور حکمراں نے اپنے سیاسی حریف کو میدان سے ہٹانے کے لئے آپ کو جیل میں ڈال دیا۔ اس کی وجہ کمل طور پر غیر سیاسی تھی۔ حضرت یوسف یک طرفہ کارروائی کے تحت جیل بھیجے گئے تھے نہ کہ سیاسی حریف بننے کے جرم میں۔ حکمرانوں سے سیاسی منازعت چھیڑنا اور نتیجۃً مسلمانوں کا دو دھڑوں میں بٹ جانا تو اسلام میں صریح طور پر ممنوع ہے۔ اس قسم کی غیر اسلامی سیاست کے نتیجہ میں جیل جانا اور اس کو سنت یوسفی کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالے جو شریعت میں حرام ہے اور اس کے بعد اس کی نماز جنازہ ادا کر کے اپنے اخبار کے صفحہ اول میں یہ اعلان کرے:

"مقتول کی نماز جنازہ شرعی طریقہ پر ادا کی گئی۔"

یہی وہ چیز ہے جس کی بابت قرآن میں کہا گیا: کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور اس کے دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو (بقرہ ۸۵) مسلمانوں میں سیاسی دھڑے بندی پیدا کرنا جو پیغمبرانہ شریعت کے خلاف ہے اور جب طاقت ور فریق اپنے مخالف فریق کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دے تو اس کو اپنے لئے پیغمبرانہ سنت قرار دینا ——— یہ طریقہ خدا کے غضب کو بھڑکانے والا ہے نہ یہ کہ اس کے نتیجہ میں خدا کی رحمت ہمارے اوپر سایہ کرے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پختگی اس صلاحیت کا نام ہے کہ آدمی ان چیزوں کے ساتھ پرامن طور پر رہ سکے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔

پختگی انکساری کا نام ہے۔ ایک پختہ انسان یہ کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے کہ "میں غلطی پر تھا"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جب خدا کے عہد کو توڑ دیا جائے

سورہ مائدہ کی آیت ۱۲ میں بتایا گیا ہے کہ امت محمدی سے پہلے جو لوگ دین خداوندی کے حامل بنائے گئے تھے، ان سے اللہ نے کیا عہد لیا تھا اور کیا ذمہ داریاں ان کے اوپر ڈالی تھیں۔ وہ یہ تھا کہ ——— وہ اپنی زندگی میں نظم واتحاد قائم کریں گے۔ وہ نماز کی ادائگی کریں گے۔ اپنے مالوں میں زکوٰۃ دیں گے۔ دعوت حق کے ساتھ تعاون کریں گے اور اپنی جان ومال کو اس سے بچا کر نہ رکھیں گے۔

آیت نمبر ۱۳ میں بتایا گیا ہے کہ وہ اس عہد پر قائم نہ رہے۔ انھوں نے اس کو توڑ دیا۔ خدا کے مقرر کئے ہوئے راستہ کو چھوڑ کر وہ خود ساختہ راہوں پر چلنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے ان کو جو سزا ملی وہ ——— لعنت تھی۔ وہ خدا کی رحمت سے دور کر دیئے گئے۔

لعنت کی تشریح کرتے ہوئے مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں :

ابعدناهم عن الحق وطردناهم عن الهدیٰ

یعنی خدا نے ان کو ہدایت کے راستے سے ہٹا دیا اور حق سے دور کر دیا۔ اس "لعنت" کے بہت سے درجے ہیں۔ جب بھی خدا پرستی کا کوئی دعوے دار گروہ اپنے دعوے کے تقاضے پورے کرنا چھوڑ دیتا ہے تو اس کے اوپر اس عمل کی ابتدا ہو جاتی ہے اور مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ یہ عمل جب تک درمیانی مرحلوں میں ہوتا ہے واپسی کا امکان باقی رہتا ہے۔ مگر جب لوگ اپنے انحراف میں اس انتہائی درجے تک پہنچ جائیں جس درجے تک یہود پہنچ گئے تو خدا کی طرف سے ان کے اوپر لعنت کی تکمیل کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کا حق کی طرف واپس آنا ممکن نہیں رہتا۔

لعنت کا یہ عمل کن شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، اس کے پانچ خاص مظاہر قرآن میں بتائے گئے ہیں۔

۱۔ دل کا سخت ہو جانا ——— اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ خدا پر ایمان رکھنے کے باوجود اس کے تقاضوں کو مسلسل نظر انداز کرتا رہتا ہے تو اس کا ضمیر کند ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر سے وہ لطیف احساسات ختم ہو جاتے ہیں جو آدمی کو باطل کے خلاف بے چین رکھتے ہیں اور حق کی طرف اسے کھینچتے رہتے ہیں۔ حق پرستی کی قوی ترین دلیلیں اس کو بے وزن معلوم ہوتی ہیں، خدا ورسول کے صریح ارشادات سامنے آنے کے باوجود اس کے اندر یہ جذبہ نہیں ابھرتا کہ وہ اپنی غلط روش کو چھوڑ دے۔

۲۔ کلام الٰہی میں تحریف ——— یعنی ان کے اندر اتنی ڈھٹائی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بدلنے کے بجائے خدا کے کلام کو بدلنا شروع کر دیتے ہیں۔ کلام الٰہی کی حیثیت ان کے نزدیک یہ نہیں رہتی کہ وہ انھیں راستہ بتائے بلکہ اس کا کام یہ ہو جاتا ہے کہ وہ ان کے غلط اعمال کی تصدیق کرے۔ اس مقصد کے لئے وہ اس کی غلط تاویلیں کرتے ہیں، وہ خدا کے قانون کے ساتھ اس قسم کا عمل کرنے لگتے ہیں جو وکالت خانوں میں انسانی قانون کے ساتھ ہوتا ہے، وہ خدا کے کلام کو اس کی صحیح جگہ سے ہٹا دیتے ہیں۔

۳۔ تعلیمات الٰہی کے بڑے حصے کو بھلا دینا۔ یہاں بھلا دینے سے مراد ترک کر دینا ہے۔ یعنی دین کی بعض شکلیں تو ضرور اب بھی ان کے یہاں موجود رہتی ہیں، مگر اس کے بڑے حصے یا دوسرے لفظوں میں اس کی روح کو وہ چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ کسی صاحبِ کتاب گروہ کی یہ حالت اس وقت ہوتی ہے جب دین مقصدِ زندگی کی حیثیت سے ان کے درمیان باقی نہیں رہتا۔ جب ایمان ایک زندہ شعور کے بجائے ایک روایتی عقیدے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس وقت ان لوگوں کی زندگی کے حقیقی مسائل کچھ اور ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کے ذہن اور ان کے جذبات کسی اور سمت میں کام کرنے لگتے ہیں۔ البتہ دین کا اقرار اور دین کی بعض خارجی شکلیں اب بھی ان کے یہاں موجود رہتی ہیں، مگر وہ محض ایک نسلی اور روایتی چیز کی حیثیت سے ان کے اوپر چپکی ہوئی ہوتی ہیں، اس سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

۴۔ خیانت —— یہ چوتھی چیز ہے جس کو ان لفظوں میں ظاہر فرمایا ہے "اور تم برابر ان کی خیانتوں سے مطلع ہوتے رہتے ہو" خیانت کے معنی ہیں۔ کسی شخص سے جس عمل کی توقع کی جائے اس کے خلاف کام کرنا۔ مثلاً عربی میں کہتے ہیں ۔خَانَہٗ سَیْفُہٗ (اس کی تلوار نے خیانت کی) یعنی آدمی نے اپنے دشمن کے مقابلہ میں تلوار پر جو بھروسہ کیا تھا، اس میں تلوار پوری نہیں اتری۔ اس سے معلوم ہوا کہ لعنت زدہ گروہ سے اس کا کردار رخصت ہونے لگتا ہے، اس کے قول و فعل میں مطابقت باقی نہیں رہتی۔ وہ وعدہ کرتا ہے مگر اسے وفا نہیں کرتا۔ دوسروں سے فائدہ اٹھا کر دوسروں کے جو حقوق وہ اپنے اوپر عائد کرتا ہے ان کو پورا کرنے کی اسے کوئی فکر نہیں ہوتی۔ وہ نہ تو ان حقوق کو تسلیم کرتا جو مالک کی طرف سے بندے کے اوپر عائد ہوتے ہیں اور نہ اس اعتماد میں پورا اترتا جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے۔

۵۔ باہمی عداوت اور بغض —— یعنی جب انھوں نے خدا کی رسی چھوڑ دی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص کا قبلہ الگ الگ ہوگیا۔ وہ باہم جڑے رہنے کے بجائے باہم متفرق ہو گئے۔ دینی معاملات میں ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق اور دنیوی معاملات میں ایک دوسرے کی لوٹ کھسوٹ ان کا طریقہ بن گیا۔ ان میں سے ہر شخص کے سامنے صرف ذاتی اغراض ہیں۔ اور جب ذاتی اغراض کسی گروہ کا قبلہ بن جائیں تو اختلافات اور کشمکش کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ ذاتی اغراض کی پرستش کے ساتھ اتحاد باقی نہیں رہ سکتا۔ خدا کی رسی سے بندھا رہنا اتحاد و اتفاق پیدا کرتا ہے اور خدا کی رسی کو چھوڑ دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آپس میں بغض و عناد پھوٹ پڑے۔

اس تفصیل کے بعد بتایا گیا کہ جو لوگ ایسے کسی گروہ کی اصلاح کے لئے اٹھیں، ان کا اخلاق کس قسم کا ہونا چاہئے۔ فرمایا "ان کو معاف کرو اور ان سے درگزر کرو، اللہ یقیناً محسنین کو پسند کرتا ہے"۔ یعنی ایسے گروہ کی نفسیات اس قسم کی ہو جاتی ہیں کہ جب انھیں کچھ خدا کے بندے ان کے بھولے ہوئے سبق کی طرف بلاتے ہیں تو ان کی طرف سے جو جواب ملتا ہے وہ نہایت اشتعال انگیز اور داعی کے لئے سخت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ داعی خود بھی اسی قسم کا جواب نہ دینے لگے جو بگڑے ہوئے گروہ کی طرف سے اس کو مل رہا ہے بلکہ وہ ایسی باتوں کو نظر انداز کر کے اپنا کام جاری رکھے۔

آخر میں فرمایا۔ "بہت جلد اللہ انھیں بتائے گا کہ وہ کیا کر رہے ہیں"۔ یعنی داعی کو اپنے فرض کی ادائیگی کی فکر ہونی چاہیے، نہ کہ مخاطب کے انجام کی۔ یہ کام اللہ کے ذمہ ہے اور وقت آنے پر وہی اس کا فیصلہ کرے گا۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

لا تعتمد علی خلق رجل حتی تجربه عند الغضب

(العبقریات الاسلامیہ، ۵۰۵)

کسی آدمی کے حسن اخلاق پر بھروسہ مت کرو جب تک غصہ کے وقت اس کا تجربہ نہ کرلو۔

جواب کے دو طریقے

جب غصہ دلانے والی بات کی جائے تو اس کے جواب کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی بپھر اٹھے اور ناقد پر طعن کرنے لگے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ناقد کی بات کو بالکل ٹھنڈے ذہن سے سنا جائے۔ اس کی بات کے غیر متعلق پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے اصل بات کا جواب بالکل سادہ طریقے سے دے دیا جائے۔ دونوں طریقوں میں صرف دوسرا طریقہ اسلامی طریقہ ہے۔ اس سلسلے میں یہاں چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ ابن عبد البر اندلسی (م ۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:

رویناان طاؤساو وهب بن منبه التقيا فقال طاؤس لوهب يا ابا عبد الله بلغني عنك امر عظيم۔ فقال ماهو۔ قال تقول ان الله حمل قوم لوط بعضهم على بعض۔ قال اعوذ بالله، ثم سكتا قال فقلت هل اختصما قال لا۔

جامع بیان العلم وفضلہ، جزء ثانی، صفحہ ۹۵

ہم سے بیان کیا گیا کہ طاؤس اور وہب بن منبہ دونوں ایک دوسرے سے ملے۔ طاؤس نے وہب سے کہا۔ اے ابو عبد اللہ، آپ کے بارے میں مجھے ایک بڑی سنگین بات پہنچی ہے۔ انھوں نے پوچھا وہ کیا۔ طاؤس نے کہا، میں نے سنا کہ آپ کہتے ہیں کہ اللہ ہی نے تو قوم لوط کے بعض لوگوں کو بعض لوگوں پر چڑھایا تھا۔ یہ سن کر وہب نے کہا اللہ کی پناہ۔ پھر دونوں چپ ہو گئے۔ میں نے راوی سے پوچھا کیا دونوں میں بحث ہوئی۔ انھوں نے جواب دیا نہیں۔

۲۔ مولانا احمد علی لاہوری کے صاحبزادہ مولانا حبیب اللہ لاہوری نے مولانا سید حسین احمد مدنی (۱۸۷۹-۱۹۵۷) کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ دار العلوم دیوبند میں مولانا مدنی کے دورۂ حدیث میں شریک تھے۔ شرکاء درس میں سے کسی طالب علم کو شرارت سوجھی۔ اس نے مولانا کے پاس ایک رقعہ بھیجا اور اس کے ذریعہ تحریری طور پر یہ سوال کیا کہ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ حرامی ہیں۔ مولانا مدنی نے رقعہ لے کر رکھ لیا اور پہلی نشست میں کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری نشست میں جب طلبہ جمع ہوئے تو آپ نے فرمایا "کسی دوست نے مجھ کو رقعہ لکھا ہے کہ تو اپنے باپ سے نہیں ہے۔"

یہ سنتے ہی تمام مجلس میں ہیجان برپا ہو گیا۔ طلبہ غیظ وغضب سے بھر گئے کہ کس گستاخ نے یہ حرکت کی ہے۔ مولانا مدنی نے فرمایا "خبردار کسی کو غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا حق ہے کہ میں سوال کرنے والے کی تسلی کردوں" پھر سنجیدگی کے ساتھ فرمایا: "میں ضلع فیض آباد قصبہ ٹانڈہ کا رہنے والا ہوں۔ اس وقت بھی میرے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ ہیں۔ خط بھیج کر یا وہاں جاکر مجھ

کیا جائے۔"

ہفت روزہ خدام الدین لاہور۔ مدنی نمبر
جنوری ۱۹۵۸ء، صفحہ ۳۸

اب ایک برعکس مثال لیجئے۔

ایک بزرگ کی تقریروں اور اجتماعات میں ایک شخص کثرت سے آتا تھا۔ وہ بزرگ کا بہت معتقد ہوگیا۔ تاہم بعد کو وہ کسی وجہ سے بگڑ گیا اور بزرگ کے خلاف تنقیدیں کرنے لگا۔ اس سلسلے میں بزرگ موصوف لکھتے ہیں: "بات یہ ہے کہ اس شخص کے دل میں مرزا غلام احمد قادیانی کی عقیدت شدت کے ساتھ موجود تھی، میں نے اپنی ایک تقریر میں ڈنکے کی چوٹ کہا کہ جو شخص حضرت مسیح کی ولادت بن باپ کے نہیں مانتا، میرے نزدیک قرآن مجید پر ایمان ہی نہیں رکھتا۔ میری یہ بات اس شخص کے نہاں خانہ قلب کے بت خانہ پر ٹھیک نشانہ پر پڑی۔ اس نے میرے اجتماعات میں آنا بند کر دیا اور مرزائیانہ ہتھکنڈوں سے کام لے کر میرے خلاف لوگوں کو بھڑکانے اور اکسانے لگا۔"

اس کے بعد مذکورہ شخص کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ تیری وہ دبی ہوئی قادیانی رگ ہے جس کو چھیڑنے کا میں مرتکب ہوا ہوں، پھر اگر کوئی مردانگی کا شمہ بھی ہے تو سامنے آ اور اصل مسئلہ پر بات کر، یہ آبرو باختہ عورتوں کے مانند "بھائیوں" کا نام لے لے کر اصل میں "یاروں" کے لئے رونے سے کیا حاصل ؟۔۔۔

اب جو یہ جملہ قلم سے نکلا تو ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ یہ مردانگی کا "شبہ"، بھی اس شخص کے بارے میں کیسے ہوگیا؟ ہمیشہ کا ہڈیوں کی ٹی بی کا مارا ہوا اور چہرے اور سر دونوں کے اعتبار سے بالکل 'فارغ البال' اور خارش زدہ انسان جو ساری عمر شادی کے بارے میں سوچ بھی نہ سکا، اب آخری عمر میں کٹنیوں کا سا کردار اور بھس میں آگ لگا کر تماشا دیکھنے کا انداز نہ اختیار کرے تو آخر اور کیا کرے؟

ماہنامہ ۔۔۔ مئی ۱۹۷۸ء، صفحہ ۷۲

وہ انھیں کھلاڑیوں کی بی ٹیم ہوگی

Second Eleven

Mr T. A. Pai, ex-Cabinet Minister, when asked to comment on the "no-change" in the style of functioning and the poor performance of the Government, is said to have remarked: "Why should anyone have expected anything better from them? They are only our B team."

The Illustrated Weekly of India
May 14, 1978

مسٹر ٹی۔ اے۔ پائی اندرا حکومت میں وزیر کابینہ تھے۔ ان سے موجودہ جنتا حکومت کے بارے میں پوچھا گیا کہ سرکاری مشین کی سست رفتاری اور اس کا طریقہ جو پہلے تھا وہی اب بھی کیوں ہے۔ حکمراں پارٹی کی تبدیلی کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مسٹر پائی نے جواب دیا "لوگوں نے موجودہ حکومت سے کسی بہتر چیز کی توقع کیوں کرلی تھی۔ وہ آخر ہماری ہی "بی ٹیم"، تو ہیں۔

اس میں ان مسلمانوں کے لئے بھی سبق ہے جو ایک ملکی پارٹی کو ہٹا کر دوسری ملکی پارٹی کو برسراقتدار لانے میں ملت کے مستقبل کا سیاسی خواب دیکھا کرتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ایک کو ہٹا کر جس دوسرے کو وہ اوپر لائیں گے، وہ بھی پچھلے کھلاڑیوں ہی کی "بی ٹیم" ہوگی۔

کتاب "زلزلۂ قیامت" کا ایک صفحہ

موجودہ زمانہ کے بعض ملحد مفکرین نے دیکھا کہ انسان کسی طرح مذہب کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ انھوں نے مذہب کو ایک ناگزیر نفسیاتی ضرورت کے طور پر مان لیا۔ البتہ انھوں نے کہا کہ مذہب کی بنیاد خدائی الہام پر نہیں ہونی چاہئے۔ اس فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے جولین ہکسلے نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے:

RELIGION WITHOUT REVELATION

(مذہب بغیر الہام)۔ اس قسم کا مذہب تو ابھی عملاً وجود میں نہیں آیا۔ تاہم "اسلام بغیر آخرت" کے بہت سے نسخے ہمارے یہاں رائج ہو گئے ہیں۔ اس اسلام میں سب کچھ ہے مگر جہنم کا اندیشہ نہیں۔ اصحاب رسول کو جو اسلام ملا تھا، اس نے انھیں اس درجہ بے قرار کر دیا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جہنم کی آگ انھیں کے لئے بھڑکائی گئی ہے۔ اب اسلام کے مجاہدین نے ایسا اسلام دریافت کر لیا ہے جس کے خزانے میں صرف جنت ہی جنت ہے۔ جہنم کا اس میں کہیں گزر نہیں۔

کچھ لوگوں کے لئے ان کی دنیا کی کامیابی ہی اس بات کی یقینی علامت ہے کہ ان کی آخرت بھی ضرور کامیاب ہوگی۔ کچھ لوگوں نے ایسے زندہ یا مردہ بزرگ پالئے ہیں جن کا دامن تھام لینے کے بعد اب ان کے لئے آخرت کا کوئی خطرہ نہیں۔ کچھ لوگ اتنے خوش قسمت ہیں کہ معمولی معمولی باتوں پر صبح و شام ان کے لئے جنت کے محلات رزرو ہو رہے ہیں، پھر ان کو آخرت سے ڈرنے کی کیا ضرورت۔ کچھ لوگوں کو اسلام نے عالیشان سیاسی منصوبے دیئے ہیں اور وہ قائدانہ اعزازات کے زیر سایہ جنت کا راستہ طے کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اور بھی زیادہ آسان راستہ تلاش کر لیا ہے ——— جگمگاتے ہوئے پنڈالوں میں تقریر کے کرتب دکھاؤ اور سیدھے جنت الفردوس میں پہنچ جاؤ۔

اس قسم کا اسلام خواہ دنیا میں کتنا ہی دلفریب نظر آتا ہو، آخرت میں اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ آخرت میں کام آنے والا اسلام وہ ہے جو آدمی کی زندگی میں بھونچال بن کر داخل ہوا ہو۔ جو قیامت کے زلزلہ سے پہلے آدمی کے لئے زلزلہ ثابت ہو۔ اس قسم کا اسلام جب کسی کو ملتا ہے تو اس کے لئے ہر معاملہ خدا کا معاملہ بن جاتا ہے۔ "چھوٹے" کو بے عزت کرتے ہوئے اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ رب العالمین کے سفیر کو بے عزت کر رہا ہے۔ "بڑے" کی خوشامد کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ خدا کی غیرت کو چیلنج کر رہا ہے۔ حق واضح ہونے کے بعد اس کو نظر انداز کرنا اس کے نزدیک ایسا ہی بن جاتا ہے جیسے کوئی شخص جنت اور جہنم کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھے، پھر بھی جنت کو چھوڑ کر جہنم میں کود پڑے۔

زلزلۂ قیامت

از

مولانا وحید الدین خاں

ادارۂ الرسالہ کی تازہ پیش کش

جس کو پڑھ کر دل دہل اٹھیں

اور آنکھیں آنسو بہائیں

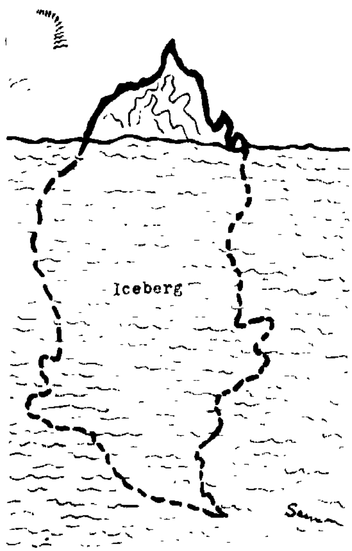
مکتبہ الرسالہ

جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی 110006

آخرت کی دنیا

قطب جنوبی کے سمندروں میں برف کے بہت بڑے بڑے تودے ہوتے ہیں جن کو آئس برگ (Iceberg) کہا جاتا ہے۔ یہ برفانی پہاڑ سطح سمندر پر تیرتے رہتے ہیں۔ ان کے حجم کا دس میں تقریباً نو حصہ پانی کے اندر ڈوبا رہتا ہے اور صرف ایک حصہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ ایسی ہی کچھ مثال ہماری زندگی کی ہے۔ خدا نے انسان کو ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ پھر اس کی عمر کا لگ بھگ سو سال موجودہ دنیا میں رکھ کر بقیہ تمام عمر کو موت کے بعد آنے والی دوسری دنیا میں ڈال دیا۔ ہم ماں کے پیٹ میں پرورش پاکر اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں۔ اور پھر بچپن، جوانی اور بڑھاپا کے مرحلوں سے گزر کر مرجاتے ہیں۔ تاہم موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں۔ موت ہم کو دوبارہ ایک نئے پیٹ، کائنات کے پیٹ میں ڈال دیتی ہے۔ اس کے بعد انسان ایک اور عالم میں آنکھ کھولتا ہے۔ یہ آخرت کا عالم ہے۔ موجودہ دنیا عارضی ہے، آخرت کی دنیا ابدی ہے۔ موجودہ دنیا کی تکلیفیں بھی معمولی ہیں اور لذتیں بھی معمولی ــــ مگر اگلی دنیا میں دونوں چیزیں اپنی آخری انتہا پر ہوں گی۔ وہاں جس کے حصہ میں تکلیف آئے گی، وہ بدترین عذاب میں ہمیشہ کے لئے تڑپتا رہے گا۔ جس کے حصے میں راحتیں آئیں گی، وہ کمال درجہ کی راحتوں میں ابدی طور پر خوشیوں اور لذتوں کا لطف اٹھاتا رہے گا۔

امتحان کی مصلحت کی بنا پر آخرت کی دنیا کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ مگر ہمارے گرد و پیش



آدمی اگر یہ جان لے کہ موت کے دوسری طرف بھی ایک دنیا ہے جو زیادہ مکمل ہے تو موجودہ زندگی اس کے لئے بے معنی ہو جائے گی۔ وہ اپنی جدوجہد کی منزل کو پا لے گا۔ اس کی زندگی ــــ آخرت رخی زندگی (Akhirat Oriented Life) ہو جائے گی، بالآخر ایک شاندار کامیابی پر ختم ہوگی۔ اس کے برعکس جو شخص موت کے بعد آنے والی دنیا کو نہ دیکھ رہا ہو اس کی زندگی دنیا رخی زندگی ہوگی۔ اس کی کوششیں اسی دنیا میں بھٹکتی رہیں گی۔ مرنے کے بعد جب وہ اگلی وسیع تر دنیا میں داخل ہوگا تو اچانک اس کو معلوم ہوگا کہ یہاں کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں وَمَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (بقرہ ..

ایسی نشانیاں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم آخرت کی دنیا کو سمجھ سکتے ہیں۔

ایک کمرہ ہے۔ اس میں کچھ آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ دیوار، فرنیچر، آدمی وغیرہ کی صورت میں جو چیزیں کمرہ کے اندر نظر آرہی ہیں، بظاہر وہی کمرہ کی کل دنیا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور دنیا وہاں موجود نہیں۔ لیکن جب کمرہ میں رکھا ہوا ٹیلی وژن سٹ کھولا جاتا ہے تو اچانک معلوم ہوتا ہے کہ ہماری اسی دنیا کے اندر ایک اور دنیا اپنے تمام اجزاء کے ساتھ موجود تھی۔ اس میں حرکت تھی، آوازیں تھیں۔ اس میں انسان جیسی ہستیاں تھیں۔ اس میں واقعات ہو رہے تھے۔ یہ سب مکمل طور پر موجود تھا مگر وہ دیکھنے والوں کے لئے غیر موجود بنا ہوا تھا۔ جب ٹیلی وژن کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ ہماری محسوس دنیا کے اندر ایک اور مکمل دنیا موجود تھی۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ ہم کو دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

یہ ایک معلوم مثال ہے جس سے آخرت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہماری دنیا ایک دہرا وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں ہماری محسوس دنیا کے اندر ایک اور دنیا چھپی ہوئی ہے۔ یہ آخرت کی دنیا ہے۔ ہم اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ نظر آنے والی دنیا میں گزارتے ہیں۔ اس کے بعد موجودہ دنیا میں ہماری آنکھ بند ہو جاتی ہے اور ہم کو ایک اور دنیا میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ وہ آئندہ آنے والی دنیا میں کامیابی حاصل کرے۔ کیوں کہ وہ دنیا ابدی بھی ہے اور حقیقی بھی۔ اس دنیا کی تکلیفوں اور راحتوں کے مقابلہ میں موجودہ دنیا کی تکلیفوں اور راحتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔

موجودہ دنیا میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر یہ آزادی صرف اس لئے ہے کہ انسان حالت امتحان میں ہے۔ یہاں آدمی کو جانچ کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا ہے، کون برا۔ اس جانچ کے لئے آزادانہ فضا ضروری تھی۔ ضروری تھا کہ آدمی کو اس بات کا کھلا موقع دیا جائے کہ وہ جس طرح چاہے رہے اور جس قسم کی چاہے زندگی گزارے۔ موجودہ ابتدائی دنیا اسی خاص ضرورت کے تحت خاص ڈھنگ سے بنائی گئی ہے۔ وہ تمام حالات یہاں جمع کئے گئے ہیں جو کسی آدمی کو عمل کا موقع دینے اور اس کے بعد اس پر حجت قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس طرح لوگوں کو کسوٹی پر رکھ کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اگلی دنیا میں عزت کی جگہ دیئے جانے کے قابل ہے اور کون اپنے ظلم اور نالائقی کی بنا پر اس کا مستحق ہے کہ اس کو ذلت کے گڑھے میں ڈال دیا جائے۔ موجودہ دنیا میں دونوں قسم کے آدمی ملے جلے ہیں۔ آخرت کی دنیا میں دونوں کو ان کے آج کے ریکارڈ کے مطابق چھانٹ دیا جائے گا۔ ایک طرف تکلیفوں اور مصیبتوں کا جہنم ہوگا اور برے لوگوں کو اس میں بُرے عذاب زندگی گزارنے کے لئے ڈال دیا جائے گا۔ دوسری طرف ہر قسم کی راحتوں اور خوشیوں کی جنت ہوگی اور نیک لوگوں کو اس کا دائمی وارث بنا دیا جائے گا کہ وہ اس میں اپنا ٹھکانا بنائیں اور خوشیوں بھری زندگی گزاریں۔

اب آخرت کے مسئلہ کو ایک اور پہلو سے دیکھئے۔

کسی درخت پر کوئی پھل لٹکا ہوا ہے، آپ اس کے نیچے سے گزرے، یکایک پھل آپ کے اوپر گرا اور آپ کا سر ٹوٹ گیا، کیا آپ اس درخت پر خفا ہوں گے اور اس سے لڑائی کریں گے۔ نہیں، بلکہ خاموشی سے اپنا سر پکڑے ہوئے گھر چلے جائیں گے یا اسپتال جاکر اپنا علاج کرائیں گے۔ اس کے برعکس اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر آپ کے اوپر ایک پتھر کھینچ مارے اور آپ کا چہرہ زخمی ہو جائے تو آپ اس کے اوپر برس پڑتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کا بھی سر توڑ ڈالیں جس طرح اس نے آپ کا سر توڑا ہے اور اگر خود اس کا سر توڑ نہیں سکتے تو معاملہ کو عدالت میں لے جاتے ہیں اور وہاں اس کو قانون کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔

اسی طرح ایک اور مثال لیجئے۔ آم کا ایک بڑا درخت ہے جس پر فصل کے موقع پر ہزاروں کی تعداد میں پھل آتے ہیں۔ یہ پھل پکتے ہیں اور ایک ایک کرکے گر جاتے ہیں یا توڑ لئے جاتے ہیں۔ خود آم اپنے ایک پھل کو بھی نہیں کھاتا، مگر کوئی شخص کبھی یہ کہتا ہوا نہیں سنا گیا کہ "افسوس کہ آم نے اتنے پھل پیدا کئے مگر وہ خود اپنے پھل کو نہ کھا سکا"۔ اس کے برعکس ایک آدمی زندگی بھر کی کمائی سے اپنے لئے ایک شاندار مکان بنائے اور مکان کی تعمیر مکمل ہوتے ہی مر جائے تو ہر دیکھنے والا شخص کہے گا کہ کیسا افسوسناک ہے یہ واقعہ کہ آدمی نے محنت کرکے ایک گھر بنایا اور اس کے اندر رہنا اس کو نصیب نہ ہوا۔

معلوم ہوا کہ درخت اور انسان میں بہت بڑا فرق ہے، درخت کوئی "برائی" کرتا ہے تو اس کو اس برائی کی سزا نہیں دی جاتی۔ اسی طرح درخت کوئی "نیکی" کرتا ہے تو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس کو اس کی نیکی کا انعام دیا جائے جب کہ انسان کے لئے ہم دونوں چیزیں چاہتے ہیں۔ ہمارا ذہن پکارتا ہے کہ انسان کوئی برا عمل کرے تو اس کو ضرور اس کی سزا دی جائے اور انسان کوئی اچھا عمل کرے تو ضرور اس کو اس کا انعام ملے۔

سارے انسانوں کی فطرت یہی مانگ رہی ہے اور تمام علوم متفقہ طور پر اس کی اہمیت کی تصدیق کرتے ہیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ یہی چیز اس دنیا میں حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ہٹلر نے ایک ایسی جنگ چھیڑی جس میں پانچ کروڑ آدمی ہلاک ہو گئے۔ کیا کوئی بھی حکومت ہٹلر کو اس کے اس جرم کی سزا دے سکتی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ ہٹلر کو گولی مار کر ختم کر دیں حالانکہ یہ جرم اتنا بڑا ہے کہ ہٹلر اگر ۵ کروڑ بار زندہ ہو اور ۵ کروڑ بار گولی مار کر ہلاک کیا جائے تب بھی اس کی سزا مکمل نہیں ہوگی۔ پھر یہ معاملہ ہٹلر اور اسٹالن جیسے ظالموں کا ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک معمولی آدمی بھی جب کوئی جرم کرتا ہے تو اس کے جرم کے اثرات اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ نہ کوئی دنیوی عدالت اس کے سارے پہلوؤں کی تحقیق کر سکتی اور نہ کوئی جیل خانہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دے سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص جو اس دنیا میں کوئی جرم کرتا ہے وہ اپنے جرم کی حقیقی سزا پائے بغیر مر جاتا ہے۔ حالانکہ ساری انسانیت پکار رہی ہے کہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دی جائے۔

یہی معاملہ انعام کا بھی ہے۔ ایک شخص کو اقتدار ملے مگر اقتدار پا کر وہ فرعون نہ بنے بلکہ عام

انسانوں کی طرح اپنے کو ایک انسان سمجھے اور اقتدار کو لوگوں کی حقیقی خدمت میں لگائے، کیا اس دنیا میں اس کو اس عمل کا بدلہ دیا جاسکتا ہے۔ ایک شخص اپنی محنت سے دولت کمائے اور اس دولت کو غریبوں اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں صرف کردے کیا اس کو اس عمل کا انعام دینا ممکن ہے۔ ایک شخص علم میں کمال پیدا کرتا ہے اور اس علم کو انسانیت کی تعمیر میں لگا دیتا ہے، کیا اس کو اس خدمت کا معاوضہ دیا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک شخص کے ایک چھوٹے سے نیک عمل کا انعام دینا بھی اس دنیا کے محدود حالات میں ممکن نہیں۔ جس طرح ایک برا عمل بے شمار طریقوں سے انسان کے لئے مصیبت بنتا ہے۔ اسی طرح ایک نیک عمل بے شمار طریقوں سے انسانیت کے لئے خیر و فلاح کا باعث ہوتا ہے۔ کون ہے جو اس کے اعداد و شمار جمع کرسکے اور اس کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دے۔

اسی کے ساتھ ایک بات اور بھی ہے۔ اس دنیا میں آدمی بیماری، بڑھاپا، موت اور اس طرح کے دوسرے ناموافق قوانین سے بندھا ہوا ہے۔ بالفرض کسی کے حسن عمل کا اندازہ کرکے اس کے لئے اس کے کارناموں کے مطابق ایک "جنت" بنا دی جائے، جب بھی وہ اس سے حقیقی طور پر لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ بے شمار انسانوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں بالفرض کسی کو مسرت مل جائے، جب بھی وہ چند لمحات سے زیادہ اس کا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ ہر انسان اپنے لئے ایک "جنت" چاہتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں جنت نہیں بن سکتی۔ جنت بنانے کے لئے کوئی اور دنیا درکار ہے جو موجودہ دنیا کی محدودیتوں اور نقائص سے پاک ہو۔

یہ صورت حال پکار رہی ہے کہ موجودہ دنیا نامکمل ہے اور اس دنیا کی تکمیل کے لئے ایک اور دنیا وجود میں آنی چاہئے۔

جب ہم کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ بے پناہ حد تک وسیع معلوم ہوتی ہے۔ اس کے امکانات لامحدود ہیں۔ یہ زمین، جس پر انسان اپنی زندگی بناتا ہے، وہ عظیم کائنات کے اتھاہ امکانات کا ایک بے حد حقیر حصہ ہے۔ ہماری زمین، کائنات کا اس سے بھی زیادہ چھوٹا حصہ ہے جتنا سارے سمندروں کے کنارے پائی جانے والی ریت کے مقابلہ میں ایک ذرہ۔

کائنات نے اپنے اتھاہ امکانات میں سے صرف ایک حقیر جزو ہی کو زمین پر کیوں ظاہر کیا۔ آخرت کا عقیدہ اسی سوال کا جواب ہے۔ انسان کے لئے یہاں جو امکانات ہیں، ان کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ موجودہ دنیا میں ہم کو مل رہا ہے اور اس کا آخری اور کامل حصہ آخرت کی دنیا میں دیا جائیگا۔

ضروری اعلان

معلوم ہوا کہ کچھ لوگ الرسالہ کی طرف سے اجازت نامہ دکھا کر رقم وصول کر رہے ہیں۔ ہم نے کسی کو اس قسم کا اجازت نامہ نہیں دیا ہے۔ ایسی کوئی تحریر محض فرضی ہے۔

منیجر

اللهم لا عيش الا عيش الآخرة (خدایا زندگی صرف آخرت کی زندگی ہے) حدیث کے یہ الفاظ صرف ناکام و نامراد لوگوں کے لئے نہیں ہیں ۔ بلکہ وہ ان لوگوں پر بھی پوری طرح صادق آتے ہیں جن کو دنیا میں ہر قسم کے بہترین مواقع ملے۔ جنھوں نے سمجھا کہ وہ اپنی خوشیوں کی بہار اسی دنیا میں دیکھ سکتے ہیں۔ مگر موت عین اس وقت ان کی تمناؤں کے محل کو ڈھا دیتی ہے جب کہ وہ اس کے دروازے پر پہنچ چکے ہوتے ہیں۔

آدمی دنیا کے دوسرے بہتر حصہ کو نہیں دیکھتا اس لئے وہ اپنی زندگی کی معنویت کو سمجھ نہیں پاتا۔ اگر وہ آخرت کو جان لے تو اس کو معلوم ہو کہ ایک مکمل اور ابدی دنیا یہاں موجود ہے۔ وہ اپنی مطلوب دنیا کو بھی پالے اور اپنی توجہات کے صحیح مرکز کو بھی۔

"ہماری دنیا مکمل کیوں نہیں"

آدمی اس سوال کا جواب نہیں پاسکتا

جب تک وہ آخرت کی دنیا کو نہ جان لے

۱۶ سالہ نندنی اپنے وجے نگر کے مکان میں آئینہ کے سامنے کھڑی تھی ۔ اسے نظر آیا کہ اس کی نازک گردن پر ایک گومڑا ابھر رہا ہے ۔ "زندگی زیادہ مکمل اور بے عیب کیوں نہیں"، اس نے اپنے دل میں کہا۔ وہ ایک کامیاب رقاصہ تھی اور اپنی دو ہم پیشہ بہنوں (پدما اور جے شری) کے ساتھ ابھی ابھی کشمیر کے ایک رنگا رنگ سفر سے یہ حوصلہ لے کر واپس آئی تھی کہ وہ اپنے پیشہ میں اور زیادہ توجہ دے کر اعلیٰ ترین رقاصہ بنے گی۔ اپنی بہنوں کے ساتھ اس نے ملک کے مختلف شہروں میں رقص کے ۱۵۰ مظاہرے کئے تھے۔ تینوں بہنیں "وجے نگر سسٹرس" کے نام سے مشہور ہو گئی تھیں۔ تاہم کل کی تقریب میں شرکت سے اس نے معذوری ظاہر کر دی۔ بدنما گردن کے ساتھ وہ آرٹ کی محفل میں کیسے شریک ہو سکتی تھی۔

مگر خلاف امید اس کا گومڑ بڑھتا گیا۔ گھر والوں کو پریشانی ہوئی۔ ڈاکٹروں اور اسپتالوں کی دوڑ شروع ہو گئی۔ بالآخر صرف یہ جاننے کے لئے کہ ان کی نندنی کینسر کے ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اسپتال میں داخلہ کے نویں دن اس کی موت کا پیغام آگیا۔ بستر پر ایک بے حس و حرکت جسم پڑا ہوا تھا اور دوست اور رشتہ دار چاروں طرف اس کو گھیرے ہوئے یہ سوچ رہے تھے "وہ ہنستی ہوئی روح آخر کہاں چلی گئی"۔

یہ جولائی ۱۹۶۹ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد نندنی کی بقیہ دو بہنوں نے "نرتیہ نندنی" کے نام سے ایک ڈانس اسکول کھولا۔ زندہ رہنے کے لئے کوئی مشغولیت ضروری تھی۔ دونوں باصلاحیت بہنوں کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ ان کو موقع ملا کہ وہ یورپ کے شہروں لندن، جنیوا، فرینکفرٹ، برلن، ایمسٹرڈم، پیرس وغیرہ میں اپنے کمال فن کی داد لے سکیں۔ ان کو اپنے پیشہ میں اتنی کامیابی ہوئی کہ ایک اخبار نے لکھا:

The gods of India can smile
when the bells on the
Vijayanagar sisters tinkle

Why life could not have been more perfect

ہندوستان کے دیوتا مسکرا اٹھتے ہیں جب وجے نگر بہنوں کے گھونگرو بجتے ہیں۔

فروری ۱۹۷۳ میں دونوں "رقص رانیوں" کی شادی روایتی جشن کے ساتھ ہوگئی۔

شادی کے صرف دو دن بعد جے شری کے آئینہ نے بتایا کہ اس کی ٹھوڑی کے پاس ایک گومڑا ابھر رہا ہے۔ دواؤں اور آپریشن کے بعد گھر والوں نے سمجھا کہ ان کی جے شری اچھی ہوچکی ہے۔ مگر مقررہ جگہ پر درد کا باقی رہنا جے شری کو پریشان کئے ہوئے تھا۔ "بے وقوف نہ بنو جے شری"، ڈاکٹر نے کہا "تمہارے جیسی جوان اور تندرست عورت کو کینسر کس طرح ہوسکتا ہے"۔ اس کے بعد گومڑ کا ایک ٹکڑا ٹاٹا میموریل اسپتال (بمبئی) کو جانچ کے لئے بھیجا گیا۔ رپورٹ نے بتایا کہ نندنی کے بعد اب اس کی بہن کو بھی کینسر ہوچکا ہے۔ مرض ٹھوڑی اور سینہ سے گزر کر پیروں تک پہنچ گیا۔ ہر قسم کے بہترین علاج کے باوجود تکلیف بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸ مارچ ۱۹۷۴ کو جے شری کی روح بھی ایک بھیانک جسم کو بستر پر چھوڑ کر اس سے جدا ہوگئی۔

"وجے نگر سسٹرس" کا جگمگاتا ہوا مکان اب تاریک ہوچکا ہے۔ دو جوان لڑکیوں کے کھونے کے بعد ماں باپ کو زندگی بے معنی نظر آتی ہے۔ ہر طرف مایوسی پھیلی ہوئی ہے۔ "نرتیہ نندنی" اسکول اگرچہ نومبر ۱۹۷۵ سے "جے شری آرٹس انٹرنیشنل" میں تبدیل ہوچکا ہے۔ مگر تیسری بہن پدما اپنی ظاہری کامیابیوں کے باوجود ہر آن اپنے کو اسی راستہ پر پاتی ہے جدھر اس سے پہلے اس کی دو محبوب بہنیں جا چکی ہیں۔ وہی سوال اس کو بھی بے چین کئے ہوئے ہے جس کو لے کر اس کی دونوں بہنیں اس دنیا سے چلی گئیں "وہ زندگی زیادہ مکمل اور بے عیب کیوں نہیں"۔ اس کی نفسیاتی حالت کو رپورٹر (مسٹر ایس۔ گنگولی) نے ایک جملہ میں اس طرح ادا کیا ہے:

A PS/CHOLOGICAL AMPUTATION IS NO LESS REAL THAN A PHYSICAL ONE.

Eve's Weekl/ (Bomba/) 2.6.1978

نفسیاتی قتل کسی بھی حال میں جسمانی قتل سے کم نہیں ہوتا۔

اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان (۸۶ھ - ۲۳ھ) کا انتقال ہوا تو اس کے ایک بیٹے نے یہ شعر پڑھا:

وَما کان قیس هلکه هلك واحد   ولكنه بنيان قوم تهدما

قیس کی موت ایک شخص کی موت نہیں۔ بلکہ قوم کی بنیاد گر گئی ہے۔

عبدالملک کے بیٹے ولید بن عبدالملک (۹۶ - ۵۰ھ) نے سنا تو اس نے اپنے بھائی کو تنبیہ کی اور کہا کہ یہ تو مایوسی کی باتیں ہیں تم کو یوں کہنا چاہئے۔

اذا سيد منا خلا قام سيد   قؤل لما قال الكرام فعول

جب ہمارا کوئی سردار اٹھ جاتا ہے تو دوسرا سردار اس کی جگہ لے لیتا ہے جو قول و عمل میں ہمارے بڑوں کا جانشین ہوتا ہے

عن ابی أمامة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه یقول: ما استفاد المؤمن بعد تقوی اللہ خیراً له من زوجة صالحة ان امرها اطاعته وان نظر الیها سرته وان اقسم علیها ابرته وان غاب عنها نصحته فی نفسها وماله (ابن ماجہ)	ابوامامہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ کے خوف کے بعد مومن جو سب سے بہتر چیز پاتا ہے وہ ایک صالح بیوی ہے۔ اگر وہ اس سے کوئی بات کہتا ہے تو وہ اس کی تعمیل کرتی ہے۔ اگر وہ اس کی طرف دیکھتا ہے تو وہ اس کو خوش کردیتی ہے۔ اگر وہ اس کے اوپر کوئی قول دے دیتا ہے تو وہ اس کو پورا کرتی ہے اگر وہ اس سے دور ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کی اور اس کے مال کی حفاظت کرتی ہے۔

oooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooo

● مکمل عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کی مکمل رفیق بن سکے ●

فرینک بورمن (FRANK BORMAN) ایک امریکی خلاباز ہیں۔ انھوں نے ایک ایسی خلائی کشتی میں پرواز کیا تھا جس میں ان کے علاوہ ایک خاتون خلاباز بھی سوار کرائی گئی تھی۔ مسٹر بورمن نے ایک بیان میں کہا:

HAVING WOMEN ON SPACE-CRAFT WAS OKAY EXCEPT THAT IT WOULD BE UPSETTING TO PUT A MALE AND A FEMALE TOO CLOSE TOGETHER FOR A LONG TIME.

خلائی کشتی میں عورت کو بٹھانا اچھا ہے۔ البتہ ایک عورت اور ایک مرد کو دیر تک اتنا زیادہ قریب رکھنا ابتری کا باعث ہوگا۔

مسٹر بورمن کے اس بیان نے مساوات مرد و زن کے بہت سے علم برداروں کو بوکھلا دیا ہے۔ ایک امریکی خاتون نے اپنی پرجوش تقریر میں کہا:

"مسٹر فرینک بورمن کا وجود کہاں ہوتا اگر ان کے ماں اور باپ اکٹھا نہ ہوتے ہوتے"

سائنسی تحقیقات نیز عملی زندگی کے حقائق نے مساوات مرد و زن کے قدیم تصور کو سخت جھٹکا پہنچایا ہے۔

ایک امریکی خاتون مسز مارگن (MARABEL MORGAN) دو بچوں کی ماں ہیں۔ انھوں نے حال ہی ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے: مکمل عورت (TOTAL WOMAN)

اس کتاب میں انھوں نے اپنی امریکی بہنوں کو "خوش گوار ازدواجی زندگی" کے لئے یہ سادہ گر بتایا ہے:

BE NICE TO YOUR HUSBAND, STOP NAGGING HIM AND UNDERSTAND HIS NEEDS.

اپنے شوہر کی اچھی رفیق بنو۔ اس کو ملامت کرنا چھوڑ دو، اس کی ضرورتوں کو سمجھو۔

یہ کتاب ایک سال سے بھی کم عرصہ میں تین ملین کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہے۔ موصوفہ کے نزدیک مرد کی رفیق بننا عورت کی تکمیل ہے نہ کہ آزادانہ زندگی کا مالک بننا۔ (ٹائمس آف انڈیا۔ ۸ فروری ۱۹۷۸)

مسلمان آسٹریلیا میں

١٨٦٠ میں ایک مسلمان آسٹریلیا میں داخل ہوا تھا۔ آج آسٹریلیا میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے۔ ملک میں جگہ جگہ نئی نئی مسجدیں بن رہی ہیں۔ ابتدا میں جو مسلمان آسٹریلیا پہنچے وہ شتربان CAMEL DRIVER تھے جو اونٹوں کی نگہداشت اور ساربانی کے لئے یہاں لائے گئے تھے۔ ٨٠ سال سے زیادہ عرصہ تک مسلمان اسی حیثیت سے آسٹریلیا میں رہے۔

پہلا مسلمان شخص جو آسٹریلیا پہنچا، اس کا نام دوست محمد تھا۔ وہ ایک کشمیری پٹھان تھا۔ اس کے ساتھ ٢٤ اونٹوں کا قافلہ ہوتا تھا اور وہ ملبورن اور برک کے درمیان اونٹوں کے ذریعہ سواری اور باربرداری کا کام کیا کرتا تھا۔ ١٨٦٦ میں سر تھامس ایلڈر نے ١٢٠ اونٹوں کا قافلہ بنایا۔ اس کو ساربانوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے کراچی سے ٣١ ساربانوں کو بلایا۔ اسی طرح افغانستان، ہندوستان اور موجودہ پاکستان سے ساربانی کے کام کے لئے مسلمان آسٹریلیا پہنچتے رہے۔

آسٹریلیا کے لوگ ان مسلمانوں کو عام طور پر "افغان" کہتے تھے جو مختصر ہوتے ہوتے بالآخر صرف غان (GHANS) رہ گیا۔ اونٹوں کے ذریعہ سواری اور باربرداری کا کام اتنا بڑھا کہ ایک بار بیک وقت پانچ سو اونٹ باہر سے منگائے گئے۔ یہ ساربان اپنے مخصوص پیشہ کے ساتھ بعض معمولی تجارتی کام بھی آسٹریلیا میں کرتے تھے۔

اونٹوں کے قافلے زیادہ تر ایڈیلیڈ، فارینا، ماری اوڈناڈٹا اور الائس کے راستوں پر چلتے تھے۔ اس پورے راستہ میں ان لوگوں نے جگہ جگہ عبادت کے لئے مسجدیں بنالیں۔ اسی طرح دوسرے جن راستوں پر وہ چلتے تھے، وہاں وہ مسجد بھی بنالیتے تھے۔ یہ لوگ ہمیشہ اپنے ساتھ چٹائیاں بھی رکھتے اور جہاں مسجد نہ ہوتی، راستہ کے کنارے چٹائی بچھا کر نماز پڑھ لیتے۔

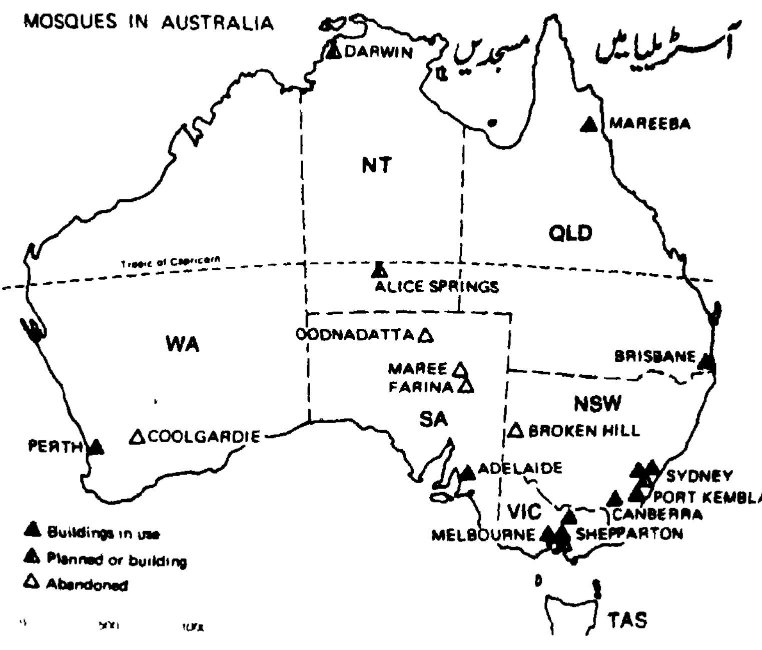
١٨٧٠ کے بعد آسٹریلیا کے صحراؤں میں ریلوے لائن کا منصوبہ بنا اور بالآخر ٹرانس آسٹریلیا ریلوے وجود میں آئی۔ اس ریلوے لائن کے لئے سروے کا جو کام برسہا برس تک ہوتا رہا، اس میں مسلم ساربانوں کے اونٹ بہت کارآمد ثابت ہوئے۔ ان اونٹوں کے ذریعہ

آسٹریلیا کا بڑا حصہ صحرا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب کہ یہاں ریلوے لائن نہیں تھی، صحرائی جہاز (اونٹ) یہاں کے راستوں کو طے کرنے کے لئے بہت مفید سمجھے گئے۔ صحرائی براعظم کی اس ضرورت نے مسلمانوں کو آسٹریلیا میں روزگار فراہم کئے۔ مگر جب آسٹریلیا میں ریلوے لائن بچھ گئی تو اس کے بعد مسلمانوں کے لئے وہاں کوئی روزگار نہ رہا۔ روایتی ماحول میں اونٹوں کی نکیل تھامنے کا کام تھا اور مسلمان اس کی بخوبی مہارت رکھتے تھے۔ غیر روایتی ماحول میں مشینوں کا ہینڈل پکڑنا تھا، مسلمان اپنے کو اس کا اہل ثابت نہ کر سکے —— قدیم دنیا میں جو لوگ انسانی قافلوں کے آگے چلتے تھے، جدید دنیا میں وہ صرف پیچھے چلنے والے ہو کر رہ گئے۔

سرکاری کارکن اور سامان صحراؤں میں سفر کرتے تھے۔ مگر جب ریلوے لائن بن گئی تو یہی ریلوے تھی جس نے آسٹریلیا میں اونٹوں کو اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کو بے جگہ کر دیا۔ اس کے بعد یہ کاروبار ختم ہونے لگا۔ مسلمان آسٹریلیا سے رخصت ہونے لگے۔ آدرمان خاں آخری مسلمان تھا جو ۱۹۵۰ میں آسٹریلیا کو چھوڑ کر اپنے وطن کراچی واپس آگیا۔ اس نے تقریباً ۵۰ سال آسٹریلیا میں گزارے۔

پھر بھی بعض خوش قسمت مسلمانوں کو آسٹریلیا میں روزگار ملتا رہا۔ مثلاً ۱۹۷۵ میں آسٹریلیا کی حکومت نے فیصلہ کیا کہ وہ چار اونٹ شاہ خالد (سعودی عرب) کی خدمت میں پیش کرے۔ اس کے لئے حکومت نے محمد عالم اور صالح محمد کی خدمات حاصل کیں، جنھوں نے سمپسن صحراؤں سے چار جنگلی اونٹ پکڑے اور ان کو تربیت دے کر اس قابل بنایا کہ وہ سعودی حکمراں کو بطور تحفہ پیش کئے جا سکیں۔

مسلم ساربانوں کی خاص شاہراہ وہ تھی جو ایڈیلیڈ سے الائس اسپرنگ کو جاتی ہے۔ اس راستہ پر اب جدید وضع کی ٹرینیں دوڑتی ہیں۔ تاہم قدیم "افغانی ساربانوں" کے نام پر اس کا نام غان (THE GHAN) رکھا گیا ہے۔ اس قسم کی اور بھی یادگاریں ہیں۔ ایڈیلیڈ میں "افغانوں" نے ۱۸۸۹ میں ایک مسجد بنائی تھی۔ اس علاقہ میں اب اگرچہ مسلمان نہیں ہیں۔ مگر بردکن ہل ہسٹاریکل سوسائٹی نے ۱۱۵ سال بعد بھی اب تک اس کو محفوظ رکھا ہے۔ اب مسجد کے ساتھ جلد ہی "افغان میموریل ہال"، حکومت کے اہتمام میں بننے والا ہے۔ یہ ہال اور اس قسم کی دوسری



مغربی دنیا میں اسلام

پہلے "اونٹوں" کے ذریعہ داخل ہوا تھا

اب وہ یہاں "پٹرول" کے ذریعہ

داخل ہو رہا ہے

چیزیں دراصل اس بات کا نشان ہیں کہ آسٹریلیا مسلم ملکوں خاص طور پر عربوں سے تعلقات بڑھا رہا ہے۔ پٹرول نے آج کی دنیا میں عربوں کی اہمیت بڑھا دی ہے اور اسی کے ساتھ اسلام کی بھی۔

۱۹۵۱ سے مسلمانوں کی نئی قسم آسٹریلیا میں داخل ہونا شروع ہوئی ہے۔ یہ مختلف مسلم ملکوں کے طلبہ ہیں۔ ۱۹۷۸ میں ان کی تعداد تقریباً پانچ ہزار تھی۔ اسی طرح مسلم سفارت خانوں کا عملہ بھی مسلمانوں کی تعداد بڑھا رہا ہے۔ برسبین (BRISBANE) میں ۱۹۰۷ میں ایک مسجد بنائی گئی تھی جو اب خستہ حالت میں تھی۔ اب یہاں کے مسلم طلبہ نے اس کی نئی تعمیر کا منصوبہ بنایا ـــــ اس کی لاگت کا اندازہ ۷۵ ہزار آسٹریلیائی ڈالر تھا۔ مسجد ۱۹۷۰ میں بن کر تیار ہو گئی مگر اس کی لاگت اصل اندازہ کے مقابلہ میں صرف نصف رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقامی مسلمانوں نے رضاکارانہ طور پر مزدوروں کا کام کیا۔

سڈنی نہ صرف آسٹریلیا کا سب سے بڑا شہر ہے بلکہ یہاں مسلم آبادی بھی سب سے زیادہ ہے۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۵۰ ہزار ہے۔ آسٹریلیا کی سب سے بڑی مسجد بھی جلد ہی یہاں مکمل ہو جائے گی۔ اس کی لاگت کا اندازہ پانچ لاکھ آسٹریلیائی ڈالر ہے۔ اسی طرح میلبورن میں پانچ لاکھ آسٹریلیائی ڈالر کی لاگت سے ایک مسجد تیار ہوئی ہے۔ اس کی لاگت زیادہ تر بیرونی مسلم ملکوں کے عطیات سے پوری کی گئی ہے۔ مثلاً صباح، سعودی عرب، بحرین، کویت۔

سعودی عرب نے آسٹریلیا میں مساجد کی تعمیر کے لئے خصوصی طور پر پچاس ہزار ڈالر کی رقم دی ہے۔ آسٹریلیا کے مختلف مقامات پر جو مساجد ہیں، ان کا نقشہ یہاں دیا جا رہا ہے۔

یہ معلومات آسٹریلین ہائی کمیشن کے ایک بلیٹن سے لی گئی ہیں جو اپریل ۱۹۷۸ میں دہلی سے شائع کیا گیا ہے۔ بلیٹن کا عنوان ہے:

MUSLIMS IN AUSTRALIA

کائنات میں ماورائے انسان ذہانت کے آثار مل رہے ہیں

آج کل سائنسی حلقوں میں بالائے خلا ذہانت (Extraterrestrial Intelligence) کا بہت چرچا ہے۔ مختلف شعبوں میں ایسے شواہد سامنے آرہے ہیں جو اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ زمین کے علاوہ خلا کے دوسرے حصوں میں بھی ذہین ہستیاں، اغلباً انسان سے زیادہ ذہین موجود ہیں۔ حتیٰ کہ بہت سے سائنس داں اس سنہری صبح کے منتظر ہیں جب کہ وہ خلائی ریڈیو کا پیغام (Extraterrestrial Radio Message) وصول کرسکیں گے۔

بالائے خلا ذہانت سے سائنس دانوں کی مراد یہ ہوتی ہے کہ زمین کے علاوہ کائنات کے دوسرے مقامات پر بھی ہماری جیسی مخلوقات پائی جاتی ہیں۔ دو امریکی فلکیات دانوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ہماری کہکشاں میں۔ ملین ستارے ایسے ہیں جو نظام شمسی کی کی مانند سیاراتی نظام رکھتے ہیں۔ ان نظامات میں زندگی کا وجود اسی طرح ممکن ہے جس طرح موجودہ زمین پر۔ اگرچہ عملاً ابھی تک ایسا کوئی کرہ دریافت نہیں ہوا ہے جہاں زمین جیسی زندگیاں پائی جاتی ہوں۔

سائنسی دریافتوں کا قافلہ بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ سائنس ماورائے انسان "ذہانت" تک پہنچ چکی ہے۔ اگر کسی دن وہ دریافت کرے کہ یہ ماورائے انسان ذہانت اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنی زیادہ ممتاز ہے کہ اس کو انسان جیسی ذہین ہستی کہنے کے بجائے خدا کہنا زیادہ صحیح ہوگا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

ooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooo

یہ داستانیں

مشہور ہے کہ مہلہل کے یہاں جب اس کی لڑکی لیلیٰ پیدا ہوئی تو اس نے اس کو زندہ درگور کر دینے کا حکم دے دیا۔ مگر بچی کی ماں نے اس کو چھپا دیا۔ رات کو مہلہل نے خواب دیکھا کہ ایک شخص اس کو بتا رہا ہے کہ اس کی لڑکی ایک قابل لڑکا جنے گی۔ صبح ہوئی تو اس نے لڑکی کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ اس کو بتایا گیا کہ وہ اس کے حکم کے مطابق زندہ دفن کر دی گئی ہے۔ مہلہل نے نہ مانا۔ اس نے مزید اصرار شروع کیا۔ آخر کار لڑکی اس کے سامنے پیش کی گئی۔ اس نے حکم دیا کہ اس کو عمدہ غذائیں کھلائی جائیں۔

اس لڑکی کی شادی کلثوم سے ہوئی۔ اب لڑکی اکثر خواب دیکھنے لگی کہ کوئی شخص آتا ہے اور اس کے ہونے والے بچہ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بتاتا ہے۔ بالآخر اس کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہی وہ مشہور شاعر ہے جس کو دنیا عمرو بن کلثوم کے نام سے جانتی ہے۔

تاریخ ادب کے ناقدین اس قصہ کو من گھڑت کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ قصہ عمرو بن کلثوم کی شہرت کے بعد فرضی طور پر بنا لیا گیا ہے۔ مگر اسی قسم کے، اس سے زیادہ من گھڑت قصے "بزرگوں" کے بارے میں تصنیف کر لئے گئے ہیں اور ان کو لوگ اس طرح پڑھتے اور سنتے ہیں جیسے وہ وحی آسمانی ہو۔ جس چیز کے ساتھ تقدس کا عنصر شامل ہو جائے وہ ہر جانچ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ بالکل بے اصل کہانیوں کو لوگ اس طرح ماننے لگتے ہیں جیسے وہ کوئی حقیقی تاریخ ہو۔

ایک سفر

مارچ ۱۹۷۸ کے آخر میں ریاست جموں وکشمیر کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اس سلسلے میں جموں، راجوری اور تھنہ منڈی جانا ہوا۔ زیادہ قیام تھنہ منڈی میں رہا۔ یہاں کی جامع مسجد میں ایک تقریر ہوئی جس میں مقامی لوگوں کے علاوہ اطراف کی بستیوں سے آئے ہوئے لوگ بھی شریک تھے۔ تھنہ منڈی میں تین دن (۳۰-۳۱ مارچ، یکم اپریل) گزرے۔ بستی کے بیشتر پڑھے لکھے لوگوں سے دینی امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ مدرسہ کاشف العلوم (قائم شدہ ۱۹۷۱) کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا جو جامع مسجد سے ملحق ہے۔ چند مخلص اور باہمت لوگ اس کو ترقی دینے میں مصروف ہیں۔

تھنہ منڈی ایک قصبہ ہے جو جموں کے اس حصہ میں واقع ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اقتصادی پس ماندگی اور جہالت عام ہے۔ اس سے بھی زیادہ بڑی بیماری وہ جذباتیت ہے جس میں کشمیری مسلمانوں کو وافر حصہ ملا ہے۔ توہماتی مذہب کا اتنا زور ہے کہ خدا سے بھی زیادہ "مدفون بزرگوں" کی پرستش ہوتی ہے۔ اس پر مزید اضافہ یہ کہ یہاں کی صحافت، قیادت اور مذہبی پیشوائی کو صورت حال کی اصلاح سے دلچسپی نہیں۔ وہ موجودہ صورت حال کو اپنے استحصال کی قیمتی زمین بنائے ہوئے ہیں۔

اس علاقہ کے مقبول اخبارات وہ ہیں جو ہر ہفتہ ان لوگوں کو جذباتی خبروں کی شراب پلاتے ہیں۔ یہاں کے مقبول پیشوا وہ ہیں جو بزرگوں کے طلسماتی قصے سنا کر ان کو جھوٹی تسلیوں کی ایک جنت میں غوطہ دیتے رہتے ہیں۔ یہاں کے قائدین وہ ہیں جو لفظ بازی کی سیاست میں ان کو اس طرح مدہوش رکھتے ہیں کہ حقیقت پسندانہ انداز سے سوچنے کا انھیں کبھی موقع ہی نہیں ملتا۔

اس اندھیرے میں امید کی صرف ایک کرن ہے۔ وہ یہ کہ ریاست میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک ایسا گروہ ابھر رہا ہے جو ان حالات سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے۔ اس قسم کے فکرمند اور حقیقت پسند نوجوان ہر جگہ ابھر رہے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک مثبت علامت ہے اور قوی امید ہے کہ مستقبل قریب میں ضرور اس کے نتائج برآمد ہوں گے۔

راقم الحروف کے لئے اس سفر کی سب سے زیادہ خوش آیند بات یہ تھی۔ یہاں کے لوگوں نے ایک بڑے اجتماع کا منصوبہ بنایا تھا جس کا نام انھوں نے "اسلامی کنونشن" رکھا تھا اور اس کے اشتہارات بھی چھپوا لئے تھے۔ کنونشن کی مجلس انتظامیہ کے جو رکن دہلی آئے تھے کہ مجھ کو ساتھ لے کر جائیں، ان سے میں نے کہا کہ میں جلسوں اور کانفرنسوں کو ایک قسم کا جرم سمجھتا ہوں۔ ان مواقع پر جب کوئی میرے گلے میں ہار ڈالتا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگاروں کا طوق مجھے پہنا رہا ہے۔ پنڈال کی روشنیوں کو جب میں دیکھتا ہوں تو مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہنم کے شعلوں سے روشن کی گئی ہیں۔ جو ایڈریس مجھ کو دیا جاتا ہے، وہ ایسا لگتا ہے جیسے مجھ کو مجرم قرار دے کر میرے خلاف عدالت کی سزا سنائی جا رہی ہے۔

اس لئے اگر آپ وعدہ کریں کہ آپ وہاں اس قسم کی کوئی کارروائی نہیں کریں گے حتی کہ جلسہ کی صورت ختم کر کے اس کو غور و فکر کی مجلس بنا دیں گے تو میں چلنے کے لئے تیار ہوں۔ وہ بخوشی اس کے لئے راضی ہوگئے اور اجتماع کی پوری نوعیت بدل دی۔ یہ اگرچہ ایک سہ روزہ اجتماع تھا۔ مگر بالکل نئی قسم کا اجتماع تھا۔

صرف جمعہ (۳۱ مارچ ۱۹۷۸) کی نماز سے پہلے ایک تقریر ہوئی۔ وسیع جامع مسجد پوری طرح بھری ہوئی تھی۔ مقامی بستی کے علاوہ کثرت سے باہر کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اور کوئی عمومی تقریر نہیں ہوئی۔ قیام گاہ پر رات دن کثرت سے لوگ آتے رہے اور گفتگوئیں ہوتی رہیں۔ ان گفتگوؤں کا موضوع تمام تر آخرت اور جنت اور جہنم ہوتا تھا۔ معروف قسم کے "ملی مسائل" پر کوئی گفتگو یا تقریر نہیں ہوئی۔

آج کل عام طور پر جس قسم کی کانفرنسوں کا رواج ہے، دور اول میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ یہ تمام تر بدعت ہے اور اسی لئے برکت اور افادیت سے بالکل خالی۔ دور اول میں جمعہ اور عیدین اور حج کے اجتماعات کو اسلامی اجتماع کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ جو چیز ہوتی تھی وہ ذکر و نصیحت کی مختصر غیر رسمی مجلسیں تھیں نہ کہ جگمگاتے پنڈالوں کی عظیم الشان کانفرنسیں۔

اس سفر کے تجربات میں سے ایک تجربہ یہ ہے کہ جلسوں اور پنڈال کے مقابلہ میں تذکیری مجلسیں کہیں زیادہ مفید ہیں۔ تحریر اور تقریر کے ذریعے سننے اور سنانے والے کے درمیان جو ربط قائم ہوتا ہے وہ بڑی حد تک مصنوعی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تذکیری مجلسوں میں جو انفرادی گفتگوئیں ہوتی ہیں، وہ زیادہ بہتر طور پر آدمی کی نمائندہ ہوتی ہیں۔ کیوں کہ ان میں اس کی پوری شخصیت شامل

آدمی کے اندر حرارت ہو تو ایک جملہ بھی زندگی بدل دیتا ہے

مرزا محمد اعظم (پیدائش ۱۹۴۰) راجوری (جموں کشمیر) میں فارسٹر ہیں۔ وہ باہر سے جب بھی گھر آتے تو اپنے بچوں کے لئے مٹھائی پھل وغیرہ لاتے۔ ستمبر ۱۹۷۵ کے ایک دن وہ گھر میں داخل ہوئے تو کسی وجہ سے بچوں کے لئے کچھ نہ لاسکے۔ حسب معمول بچے ان کے گرد جمع ہو گئے۔ جب معلوم ہوا کہ وہ کوئی کھانے پینے کی چیز نہیں لائے تو بچوں کو جھٹکا لگا۔ چھ سالہ ارشد محمود طارق نے اپنی پہاڑی زبان میں کہا:

" اگر تساں اساں وسطے کجھ نی آندہ پھر تُس کھانے وسطے آئے"
یعنی اگر آپ ہمارے لئے کھانے کی کوئی چیز نہیں لائے تو پھر کس لئے آئے ہو۔

یہ جملہ مرزا محمد اعظم صاحب کو تیر کی طرح لگ گیا "بہت جلد میں اسی طرح خدا کے یہاں جانے والا ہوں" انھوں نے سوچا "اگر خدا یہ کہہ دے کہ میرے لئے تم کچھ نہیں لائے تو پھر یہاں کس لئے آئے ہو، تو میرے پاس کیا جواب ہوگا" اس سے پہلے ان کی زندگی آزاد اور غیر مذہبی زندگی تھی۔ اس واقعہ نے ان کو بالکل بدل دیا۔ وہ جائز کمائی پر قناعت کرنے لگے۔ داڑھی رکھ لی۔ نماز روزے کی پابندی کرنے لگے حج کی سعادت حاصل کی۔ اپنے بچوں کے لئے دینی تعلیم کا انتظام کیا —— آدمی کے اندر حرارت ہو تو ایک جملہ بھی زندگی کو بدل دینے کے لئے کافی ہے۔ اور اگر حرارت نہ ہو تو دلائل کا انبار بھی اسی طرح بے معنی ہو جاتا ہے جس طرح جانور کے آگے تقریر کا ریکارڈ بجانا۔

ہو جاتی ہے۔ پھر یہ گفتگو اگر کمرہ میں یا شہروں کی مصنوعی فضا میں نہ ہو بلکہ قدرت کے کھلے ماحول میں ہو تو اس کے اندر ایسی جان آجاتی ہے جو کسی اور طرح ممکن نہیں۔

ہم ڈاک بنگلہ کے لان میں بیٹھے ہوئے ہیں جو ایک پہاڑی کو کاٹ کر بلندی کے اوپر بنایا گیا ہے۔ ایک طرف برف پوش پہاڑیاں ہیں۔ دوسری طرف دریاؤں اور درختوں کا منظر ہے۔ سنہری دھوپ، نیلا آسمان، چشمے کی قدرتی موسیقی اور ان سب کے مجموعہ سے بننے والی آفاقی فضا۔ ان کے درمیان تذکیر اور سوال وجواب کی مجلس چل رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم خدا کی گود میں ہیں۔ قبل اس کے کہ مجیب کسی سائل کے سوال کا جواب دے، کائنات اپنی خاموش زبان میں بول پڑتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے خود کچھ نہیں کہنا ہے بلکہ کائنات کے ساتھ ہم زبان ہو کر خدائی پیغام کو دہرا دینا ہے۔ کائناتی زبان میں نشر ہونے والی بات کو انسانی زبان میں نقل کر دینا ہے ـــــ

اس تجربہ سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اسلامی دعوت کا کام کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اس کو خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے درمیان بیٹھ کر انجام دیا جائے۔ انسانوں کی تعمیر کی ہوئی چھتوں یا شامیانوں کے نیچے یہ کام نہیں ہو سکتا

"میں آپ کی تقریباً تمام مجلسوں میں شریک ہوتا رہا ہوں" یہاں قیام کے آخری دن ایک صاحب نے کہا "آپ ہر گفتگو میں خوف خدا اور فکر آخرت پر زور دیتے رہے ہیں۔ اگر دین یہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کے لئے اس دنیا میں کچھ نہیں۔ اس قسم کا ذہن تو آدمی کو نکما بنائے گا اور کم از کم آج کی دنیا کے لئے اس کو بے کار بنا کر رکھ دے گا"

میں نے کہا کہ یہ بات تجربہ سے ثابت نہیں ہوتی۔ اصحاب رسول سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والے اور آخرت کی فکر کرنے والے لوگ تھے۔ مگر ان کے اس جذبہ نے ان کو دنیا کا سب سے زیادہ متحرک گروہ بنا دیا۔ حتی کہ انھوں نے تاریخ انسانی کو ایسی حرکت دی جیسی حرکت اس سے پہلے کسی قوم نے نہیں دی تھی۔

پھر میں نے کہا کہ خوف خدا کوئی منفی جذبہ نہیں۔ یہ انتہائی مثبت جذبہ ہے۔ اس کے بہت سے پہلوؤں میں سے ایک پہلو کو دیکھئے۔ دنیا میں کوئی بڑا انقلابی کام کرنے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے، وہ اتحاد ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہی چیز لوگوں میں سب سے کم پائی جاتی ہے اس کی وجہ ہے ایک دوسرے کے خلاف بغض و حسد اور نفرت وضد کے جذبات پیدا ہو جانا۔ ایک شخص دوسرے کو کسی پہلو سے بڑھتا ہوا دیکھے تو اس کے خلاف حسد کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔ کسی سے کوئی شکایت ہو جائے تو آدمی کو اس سے دائمی بغض و نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو اپنی کمی نظر نہیں آتی البتہ دوسروں کی کمیوں اور خامیوں کو وہ خوب جانتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں ہیں جنھوں نے لوگوں کے دلوں کو ایک دوسرے سے پھاڑ رکھا ہے، وہ ایک دوسرے سے مل کر کام نہیں کر پاتے۔ آدمی اپنی بہترین طاقت دوسرے کو گرانے اور بدنام کرنے میں صرف کرتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنی قوتوں کو مثبت تعمیر کی راہ میں وقف رکھے۔ اس مزاج کے ساتھ دس کروڑ آدمی بھی بے قیمت ہیں۔ ان کی طاقت "دس کروڑ" نہیں بلکہ صرف ایک ہے کیوں کہ ہر آدمی اکیلا اکیلا ہے۔

اس قسم کے منفی جذبات کے خاتمہ کا واحد نسخہ خدا کا خوف ہے۔ خدا سے ڈرنے والے آدمی کی نظر دوسروں کی خامیوں کے بجائے اپنی خامیوں پر ہوتی ہے۔ وہ تنقید

سے بپھرتا نہیں بلکہ اس سے اپنی اصلاح کا سبق لیتا ہے۔ وہ آخرت کی بہتری کی خاطر دنیا کی شکایتوں کو نظر انداز کرتا رہتا ہے۔ وہ کسی کے خلاف بے انصافی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کو کھٹکا ہوتا ہے کہ آج اگر میں بے انصافی کروں تو کل خدا مجھ کو بے نقاب کرکے سارے عالم کے سامنے رسوا کردے گا۔ وہ متکبرانہ روش اختیار نہیں کرتا۔ کیوں کہ وہ ہر معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھتا ہے نہ کہ اپنے جیسے انسانوں کا۔ وہ ایسا نہیں کرتا کہ اپنے لئے کچھ چاہے اور دوسروں کے لئے کچھ۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اس قسم کی دورنگی خدا کو پسند نہیں۔

خدا سے بے خوفی کے ماحول میں ہر آدمی دوسرے کی تخریب کاری میں مصروف رہتا ہے۔ اس کے برعکس خدا سے خوف کی فضا پیدا ہو جائے تو ہر آدمی کو دوسرے سے طاقت ملنے لگتی ہے۔ پورا گروہ اتحاد کی چٹان بن جاتا ہے۔ وہ نفسیاتی بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں جو ایک کو دوسرے سے دور کرنے والی ہیں — معاشرہ میں وسعت، فیاضی، بھائی چارہ، خیر خواہی اور حقیقت پسندی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ جس گروہ میں یہ اوصاف پیدا ہو جائیں اس کی طاقت اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ دنیا کا کوئی کام اس کے لئے مشکل نہیں رہتا۔ کوئی اس کو زیر نہیں کرسکتا۔

کیسی عجیب ہے وہ محرومی جو کامیابی کے چراغ جلاکر حاصل کی جارہی ہو

قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ کے پانچویں رکوع میں خدا کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، جو زمین و آسمان میں بکھری ہوئی ہیں — رات، دن، سورج، چاند، پانی، سبزہ وغیرہ۔ پھر ارشاد ہوا ہے:

"جو لوگ ہماری نشانیوں میں الحاد کرتے ہیں، وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں، کیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں ڈالا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن کے ساتھ آئے گا۔ جو جی چاہے کرلو، اللہ تمھاری تمام حرکتوں کو دیکھ رہا ہے (حم سجدہ — ۴۰)

الحاد کے معنی ہیں انحراف۔ بات سے اصل معنی لینے کے بجائے اس کو کسی اور طرف پھیر دینا (قال ابن عباس: الالحاد وضع الکلام علی غیر مواضعہ، ابن کثیر) پیغمبر اپنی بات کی صداقت ثابت کرنے کے لئے زمین و آسمان کی نشانیاں پیش کرتا تو منکرین کہتے: یہ نشانیاں تو فلاں فلاں دوسرے اسباب کے تحت ظاہر ہورہی ہیں، اس کا تمھارے پیغام کی صداقت سے کیا تعلق۔ ایک واقعہ جس سے حق کی تصدیق نکل رہی تھی، اس کو کسی اور طرف پھیر کر اپنے آپ کو حق سے محروم کرلیتے۔

جب بھی کوئی سچی دعوت اٹھتی ہے، اللہ اس کی تائید کے لئے اس کے گرد و پیش مختلف نشانیاں ظاہر کرتا ہے۔ مگر غافل اور سرکش انسان طرح طرح کی توجیہات کرکے اپنے کو مطمئن کرلیتا ہے۔ جس واقعہ سے ایمان کی غذا لینا چاہئے اس سے وہ "الحاد" کی خوراک حاصل کرتا ہے۔

کیسی عجیب ہے وہ محرومی جو کامیابی کے چراغ جلاکر حاصل کی جارہی ہو۔

کتنی مہنگی ہے

ترقی کی یہ قیمت

ناخوش گوار باتیں کرنا کچھ اچھا نہیں ۔ ہم کو اس سے زیادہ مصیبتیں گھیرے ہوئے ہیں کہ ہم اس کے ذکر سے اس میں مزید اضافہ کریں ۔ مگر وقت کے کچھ نہایت ذہین مفکرین کا خیال ہے کہ ایک برباد مستقبل کے سوا دنیا کا کوئی انجام نہیں ۔

زمین پر مشینی تہذیب کی عمر بمشکل چار سو سال ہے ۔ اگر واقعات کا سفر بدستور جاری رہے اور کوئی غیر متوقع حادثہ پیش نہ آئے تو ہماری تہذیب ممکن طور پر مزید ایک ملین سال تک زندہ رہے گی ۔ مگر ہر قسم کے مصائب، جن میں سے اکثر خود انسان کے پیدا کردہ ہیں، ہر ساعت بڑھتے جا رہے ہیں ۔ بڑی طاقتوں کے حربی ذخیرے کبھی اتنے خوفناک نہیں تھے جتنے کہ آج ہیں ۔ آبادی کا اضافہ، اندھا دھند تحضر (URBANISATION) ہر چیز کو ٹکنکل بنانے کا لغو شوق، فضا میں مضر گیسوں کا بڑھتا ہوا تناسب، یہ سب تباہی کی اس فہرست کے صرف چند اجزاء ہیں جو کسی بھی دن کرۂ ارض کو فنا کر سکتے ہیں ۔

ایک نئی مصیبت جس نے اس صورت حال کو اور بھی زیادہ خراب کیا ہے، ریڈیائی لہریں ہیں جو خاص طور پر شہری علاقوں پر چھاتی جا رہی ہیں — ریڈیو، ٹیلی وژن، راڈر، سٹلائٹ، مواصلاتی نظام، لیزر، الٹرا وائلٹ لیمپ ۔ ہائی ٹنشن والے بجلی کے تار، وغیرہ ان چیزوں سے جو برقی اور ریڈیائی لہریں نکلتی ہیں، ان کے اثرات غیر محسوس ہوتے ہیں مگر ان کا مسلسل اجتماع خاموش طور پر نسیجوں (TISSUES) کو ختم یا برباد کر دیتا ہے ۔ ریڈیائی لہروں سے جسمانی نظاموں پر جو برے اثرات پڑتے ہیں، ان کا ابھی تک اندازہ نہیں کیا گیا ہے ۔ کیا یہی چیزیں ہیں جو جدید دنیا میں بعض خاص قسم کی بڑھتی ہوئی بیماریوں کا سبب ہیں ۔ یہ مضحکہ خیز حد تک مہنگی قیمت ہے جو آج کا مشینی انسان نام نہاد ترقی کے لئے ادا کر رہا ہے ۔ ہمارا خاتمہ شاید اس قسم کا شاندار خاتمہ نہیں ہوگا جیسا ستاروں کے ٹکراؤ سے ہوتا ہے ۔ یہ زندگی کا بس ایک خاتمہ ہوگا، خاموش خاتمہ ۔

Without A Whimper

It isn't pleasant to be doomsayer—enough misery surrounds us without having to add to it by exercising the imagination—but some of the astutest thinkers of the day see nothing but a bleak future for the world. If all goes well, more or less, the technological civilisation on the earth, barely 400 years old, may expect to survive intact for possibly a million years. But perils of all kinds, most of them man-made, keep sprouting by the hour. The arsenals of the major powers have never been as deadly as today, the growth of population, with a marginal, perhaps "seasonal" fall, and the stresses consequent on mindless urbanisation and an absurdly runaway technological system; the continuing pollution of the biosphere with toxic chemicals and even more insidious carbon dioxide; the ever-mounting number of non-biodegradable synthetics and polymers—this is a short list of the catastrophes that may befall the planet any day. To make things even worse, a new peril has come on the scene: the intolerable levels of microwave radiation which blanket urban areas. The sources include radio and TV antennae, radar, microwave ovens, satellite communications system terminals, lasers, ultraviolet lamps and high-tension overhead electric cables. The effect is silent but cumulative and kills or destroys tissue without warning. High-frequency radiation, whether the intensity be low or high, has as yet unassessed effects on all biosystems. Would it be sheer pessimism to link this with the high rate of certain diseases in the United States? It doesn't seem so. So then this is the ridiculously high price technological man is being called upon to pay for his so-called progress. Perhaps the end won't be spectacular as in an interestellar collision; it will be a calm extinction of life, with not a whimper heard from any living thing.

The Times of India
April 22, 1978

تعارف وتبصرہ

۱۔ ایک منزل کئی قافلے از یعقوب سروش
صفحات ۱۶۰ قیمت دو روپے پچاس پیسے
پتہ : مکتبہ دوام، ٹانڈہ، فیض آباد

یہ کتاب مصنف کے سفر حج کے نقوش، مشاہدات اور تاثرات پر مشتمل ہے۔ مصنف لکھتے ہیں "میں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ طرز تحریر میں شگفتگی پیدا کردوں تاکہ پڑھنے والے اکتا نہ جائیں۔ اسی لئے میں نے افسانوی اسلوب کو اپنایا ہے۔ اور اسی تکنیک میں کتاب کی ابتدا کی ہے اور اختتام بھی۔"

"افسانوی اسلوب" کے بارے میں تبصرہ نگار کا نقطۂ نظر الرسالہ کے قارئین سے مخفی نہیں۔ تاہم کتاب میں متعدد "تراشے" درج ہیں جن میں مختلف اصحاب قلم نے کھل کر اس اسلوب کی داد دی ہے۔ اخبار صدق جدید لکھنؤ نے لکھا ہے۔ "سروش صاحب نے خود ہی سفر نہیں کیا ہے بلکہ ان کا قلم دوسروں کے دل میں شوق سفر کی آگ بھڑکانے والا ہے۔"

۲۔ آسان عربی زبان از مولانا شہاب الدین ندوی
قیمت حصہ اول دو روپے دوم چار روپے
پتہ : فرقانیہ اکیڈمی، ۸۹ داسرہلی، ٹمکور روڈ،
بنگلور نارتھ

مصنف دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ مجھے عربی زبان سیکھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ اس سلسلہ میں ہند و پاک کے مختلف کتب خانوں سے اس موضوع کی کتابیں منگوا کر دو تین سال تک ان میں سر کھپاتا رہا۔ مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر ۱۹۵۶ میں مجھ کو ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لینا پڑا۔ اپنے تجربہ کی روشنی میں یہ خیال ہوا کہ عربی زبان سکھانے والی ایسی کوئی کتاب ضرور ہونی چاہئے جو عام کاروباری یا ملازمت پیشہ لوگوں کے لئے رہنما ہو سکے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ میں نئے اور آسان طریقہ پر یہ کتاب لکھ کر تیار کی۔

۳۔ ایجوکیشن آف انڈین مسلمس (انگریزی)
از اختر الواسع
صفحات ۹۸، مجلد چالیس روپے
پتہ : پریس ایشیا انٹرنیشنل لمیٹڈ
۲ نظام الدین ویسٹ مارکیٹ۔ نئی دہلی ۱۳

اس کتاب میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (۱۹۴۷ - ۱۸۸۶) کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اسی تعلیمی تحریک نے ۱۸۷۷ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جس نے ۱۹۲۰ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صورت اختیار کی۔

۴۔ اونلی ون گاڈ (انگریزی)
صفحات ۱۶ قیمت دو روپے پچاس پیسے
پتہ : شاہین بک ایجنسی،
نزد پائدھونی پولیس اسٹیشن۔ بمبئی ۳

یہ انگریزی کتاب بچوں کے لئے ہے۔ اس میں توحید کے عقائد کو سوال و جواب کی صورت میں بتایا گیا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ اسی انداز میں رسالت کے بارے میں ہے۔

۵۔ امت کے لئے لمحہ فکریہ (شادی کی رسموں کے بارہ میں)
از مولانا جمیل احمد نذیری
صفحات ۳۲ قیمت ۷۵ پیسے
پتہ : ہلال بک ڈپو۔ مبارک پور۔ اعظم گڑھ

سائنسی الحاد اور سوشلسٹ الحاد

مذہب اور لامذہبیت کی کش مکش اگرچہ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسان کی تاریخ پرانی ہے۔ تاہم پچھلی صدی سے پہلے اس نے کبھی علمی الحاد کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ انیسویں صدی کا فکری انقلاب اور بالآخر ایک طرف ڈارون (۱۸۰۹ — ۱۸۸۲) اور دوسری طرف مارکس (۱۸۱۸ — ۱۸۸۳) کا ظہور انسانی تاریخ کا پہلا واقعہ تھا جب کہ الحاد نے یہ کامیابی حاصل کی کہ وہ علمی منطق اور منظم فلسفہ کے زور پر ایک پوری نسل کے ذہن پر چھا جائے اور مذہب کو دفاع کے مقام پر پناہ لینے کے لئے مجبور کر دے۔

الحاد کی ان دونوں لہروں کو الگ الگ سمجھنے کے لئے ہم ایک کو سائنسی الحاد اور دوسرے کو سوشلسٹ الحاد کہیں گے۔ اولاً سائنسی الحاد کو ابھرنے کا موقع ملا اور اس نے دنیا کے تقریباً تمام حصہ کو کسی نہ کسی طرح متاثر کر ڈالا۔ انیسویں صدی کے آخر تک سائنسی الحاد تعلیم یافتہ دنیا کے ذہنوں پر اس قدر چھا چکا تھا کہ کچھ لوگوں کو یہاں تک کہنے کی جرأت ہوئی کہ "خدا مر چکا ہے" اب، کم از کم علمی طور پر، اس کے دوبارہ زندہ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

مگر سائنسی الحاد "آزاد دنیا" کا الحاد تھا اور آزادانہ غور و فکر کی فضا میں جس طرح ایک نقطۂ نظر کو غلط قرار دینے کے مواقع ہوتے ہیں اسی طرح یہ امکان بھی رہتا ہے کہ دوبارہ نئے دلائل کے ساتھ اس کو صحیح ثابت کیا جا سکے۔ مذہب کے ساتھ یہی ہوا۔ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی گزری تھی کہ خود سائنس کی دنیا میں ایسی تحقیقات سامنے آنا شروع ہو گئیں جنھوں نے ان تمام مفروضات کو بالکل منہدم کر دیا جن کے اوپر علمی الحاد کی بنیاد کھڑی کی گئی تھی۔ جولین ہکسلے (۱۸۸۷-۱۹۷۵) کی کتاب انسان تنہا کھڑا ہوتا ہے (Man Stands Alone) کے اگلے ایڈیشن کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ امریکی سائنسداں کریسی مارسین (۱۸۸۴-۱۹۴۶) نے اعلان کیا: انسان تنہا نہیں کھڑا ہو سکتا۔ (Man does not Stand Alone)

وائٹ ہیڈ (۱۸۶۱ — ۱۹۴۷) اڈنگٹن (۱۸۸۲ — ۱۹۴۴) اور جیمز جینز (۱۸۷۷ — ۱۹۴۶) نے علمی الحاد کے خلاف جو کروسیڈ شروع کی تھی وہ اب اس نوبت کو پہنچ چکی ہے کہ ساری مغربی دنیا کی نئی نسل میں وہ جوابی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی ہے جس کو غلط طور پر "اینٹی سائنس" کہا جاتا ہے۔ کائنات کی ملحدانہ تعبیر بے دلیل ثابت ہو گئی۔ عقلی ذرائع سے اخلاقیات کا کوئی معیار تلاش کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ سماجی علوم کسی بہتر انسانی سماج کی تشکیل میں ناکام رہے۔ صنعتی تہذیب انسان کو حقیقی خوشی نہ دے سکی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ساری آزاد دنیا میں مذہب کی طرف واپسی کا رجحان پیدا ہو چکا ہے۔ تقریباً ۵۰ سال کے عارضی وقفہ کے بعد دوبارہ وہ مذہبی دور واپس آنا شروع ہو گیا ہے جو اس سے پہلے دنیا میں پایا جاتا تھا۔

مگر سوشلسٹ الحاد کا معاملہ مکمل طور پر مختلف ہے۔ سائنسی الحاد اگر فکری الحاد ہے تو سوشلسٹ الحاد جبری الحاد۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو دلیل سے ختم کرنا انتہائی دشوار ہے۔

پہلی عالمی جنگ نے سوشلسٹ الحاد کو موقع دیا کہ ۱۹۱۷ میں وہ دنیا کے ایک "سرحدی ملک" پر اپنا سیاسی اقتدار قائم کر لے۔ اس کے صرف ۳۰ سال بعد دوسری عالمی جنگ کے حالات نے اس کے رقبہ اور طاقت کو بہت زیادہ بڑھا دیا۔

۱۹۴۸ میں چین کا سرخ انقلاب اس کی تیسری بڑی چھلانگ تھی جس نے اس کو پوری "قدیم دنیا" میں سب سے بڑی طاقت کی حیثیت دے دی۔ اپریل ۱۹۷۸ میں افغانستان میں کمیونسٹ پارٹی کی حکومت قائم ہونا پوری غیر اشتراکی دنیا خاص طور پر مشرقی دنیا کے لئے سرخ انتباہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کمیونزم اپنی نظریاتی طاقت سے قوموں کو مسخر نہ کرسکا۔ اب وہ سازشوں اور ہتھیاروں کے ذریعہ ملکوں کو فتح کرنا چاہتا ہے۔ قدرتی طور پر سرخ منصوبہ کے اس دوسرے مرحلہ کا رخ پس ماندہ مشرق کی طرف ہے جب کہ پہلے مرحلہ میں اشتراکی مفکرین کو نظر آیا تھا کہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے اوپر سب سے پہلے سرخ انقلاب کا آفتاب طلوع ہوگا۔ مسلم ملکوں (مثلاً ایران، پاکستان) میں باہمی لڑائیوں نے اندرونی طور پر جو سیاسی عدم استحکام پیدا کر رکھا ہے، اس نے جدید کمیونسٹ منصوبہ کے لئے نہایت موافق حالات پیدا کر دیئے ہیں۔ امیر بخارا کی نادانیوں نے موجودہ صدی کے آغاز میں بخارا و سمرقند میں سرخ انقلاب کے لئے راستہ صاف کیا تھا، اب صدی کے اختتام پر اسلام کے نام پر اٹھنے والی تحریکیں دوبارہ نہایت اخلاص کے ساتھ ایسی سرگرمیوں میں مصروف ہیں جو صرف غیر اسلامی قوتوں کے لئے راستہ ہموار کرنے والی ہیں۔ بعض سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ افغانستان کی تاریخ مستقبل قریب میں پڑوس کے مسلم ملکوں میں بھی دہرائی جاسکتی ہے۔ ایک مبصر نے لکھا ہے:

> He has correctly analysed the Afghan coup as a significant advance of Soviet interests in Asia. I would go further and predict that within five to ten years (if the regime is not overthrown by the CIA or SAVAK) the Soviet Union will have militarily strengthened Afghanistan to the point at which it will be strong enough to provide military support to guerrila groups in Pakistan and Iran.
>
> The Times of India, May 31, 1978, P.6

انھوں نے درست طور پر اندازہ کیا ہے کہ افغانستان کا انقلاب ایشیا میں روس کی دل چسپی کی طرف ایک معنی خیز پیش قدمی ہے۔ میں اس سے آگے بڑھ کر یہ پیش گوئی کروں گا کہ اگر امریکہ یا ایران نے موجودہ افغانی حکومت کا تختہ الٹ نہ دیا تو روس پانچ سے دس سال کے اندر افغانستان کو فوجی اعتبار سے اتنا طاقت ور بنا دے گا کہ وہ اس قابل ہو جائے گا کہ ایران اور پاکستان کی گوریلا جماعتوں کی فوجی مدد کرسکے۔"

سوشلسٹ الحاد کے اندر یہ حیرت انگیز صلاحیت ہے کہ اس کا غلبہ صرف سیاسی غلبہ نہیں ہوتا۔ ایک بار غالب آنے کے بعد وہ انسان کے ذہن کو مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں لے لیتا ہے۔ اس کی منطق کے مطابق اس کے لئے نہ صرف پیداواری ذرائع کو سرکاری ملکیت میں لینا ضروری ہے بلکہ فکری اداروں کو بھی اپنے قبضہ میں لینے کا اسے پورا حق حاصل ہے۔ اس کی عملداری میں کسی کے لئے ممکن نہیں رہتا کہ سرکاری خطوط کے علاوہ کسی دوسرے ڈھنگ سے سوچ سکے۔ سوشلسٹ الحاد کو اگر جبری الحاد کہا جائے تو اس کے عملی مفہوم کے اعتبار سے بالکل درست ہوگا۔ کوپرنیکس کو جس جبریت فکر کی شکایت تھی وہ سوشلسٹ الحاد کے نظام میں دوبارہ شدید تر شکل میں لوٹ آئی ہے۔ یہاں سرکاری اعلان میں "زمین کی حرکت" مکمل طور پر رک جاتی ہے۔ خواہ اس کے باہر وہ مکمل طور پر گھوم رہی ہو۔

یہ جبری الحاد آج انسانیت کے تقریباً نصف حصہ کو نگل چکا ہے۔ اب وہ بقیہ نصف حصہ کو نگلنے کی طرف

خاموشی سے بڑھ رہا ہے۔ قدیم زمانہ میں یاجوج و ماجوج کے خلاف بند تعمیر کرنے کا کام اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین یا سائرس (۵۲۹ - ۶۰۰ ق م) سے لیا تھا جس نے بحیرۂ کیسپین اور بحیرۂ اسود کے درمیان پہاڑی دروں کو بند کر کے اس طوفان کو متمدن دنیا کے شمال میں روک دیا۔ موجودہ زمانہ میں سرخ سیلاب پر روک لگانے کا کام اب تک امریکہ انجام دیتا رہا ہے۔ تاہم یہ "چھتری" اب مشرقی دنیا کے لئے زیادہ قابل اعتماد نہیں رہی ہے۔ کیوبا میں صدر امریکہ مسٹر جان کنیڈی کے صرف ایک الٹی میٹم (۱۹۶۲) نے کمیونسٹ دراندازوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا جب کہ ویٹ نام میں چھ سالہ جنگ (۷۱ - ۱۹۶۵) کے بعد بھی وہ کمیونسٹ سیلاب کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ کی طاقت اٹلانٹک کے مغربی سمت میں جتنی کارآمد ہے، اٹلانٹک کے مشرقی سمت میں نہیں ہے۔

ان حالات میں فرض کے درجہ میں ضروری ہو چکا ہے کہ اس لاحاصل مشغلہ کو ترک کر دیا جائے جس کو ملی سیاست یا اسلامی سیاست کہا جاتا ہے۔ مسلم اکثریت کے ملکوں میں یہ کام نظام اسلام یا نظام مصطفیٰ کے نام پر حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی تحریکوں کی صورت میں ہو رہا ہے۔ اور اقلیتی ملکوں میں تحفظ حقوق کے نام پر احتجاج و مطالبات کی صورت میں جاری ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ان بے معنی ہنگامہ آرائیوں کا کوئی بھی تعلق اسلام یا مسلمانوں کے مفاد سے نہیں۔ اس قسم کے لوگ اجتماعی زندگی میں اسلام کی جڑیں مضبوط کرنے سے پہلے اسلامی انقلاب کا نعرہ لے کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ جب کہ اجتماعی استحکام سے پہلے اجتماعی انقلاب کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ یہ قرآن کے الفاظ میں، ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا ہے جس کو آدمی نے کیا نہیں (یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا) اس قسم کی نعروں کی سیاست نہ صرف وقت اور قوت کے ضیاع کے ہم معنی ہے، بلکہ وہ تخریبی عناصر کو ابھرنے کا موقع دے کر معاملہ کو پہلے سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ بنا دیتی ہے۔

بلاشبہ یہ مطلوب ہے کہ اجتماعی زندگی کے اوپر اسلام کا غلبہ ہو۔ مگر یہ غلبہ خاموش تعمیری عمل سے ہوگا نہ کہ محض سیاسی شور و غل سے۔ اخوانی رہنما شریف کامل نے کہا کہ مصر میں اخوان المسلمین کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ ہم قبل از وقت سیاست میں داخل ہو گئے (لقد دخلنا فی السیاسۃ قبل وقتہا)۔ مگر بات صرف اتنی نہیں ہے۔ جب بھی کوئی گروہ فیصلہ کن حیثیت حاصل کرنے سے پہلے عملی سیاست میں داخل ہوگا، وہ اپنی کمی کو دوسروں کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر ایسی تدبیروں کا نتیجہ ہمیشہ الٹا نکلتا ہے۔ اخوان المسلمین نے اپنی کمی کو فوجی افسروں کے ذریعہ پورا کرنا چاہا۔ مگر جب انقلاب آیا تو فوجی افسر اخوانیوں کو دھکیل کر خود اقتدار پر قابض ہو گئے۔ پاکستان میں محمد ایوب خاں کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے وہاں کے "اسلام پسند" شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار بھٹو کے ساتھ مل گئے۔ مگر جب انقلاب آیا تو ملک کے ایک حصہ پر شیخ مجیب الرحمٰن کا اور دوسرے حصہ پر مسٹر بھٹو کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہی ڈراما اب ایران میں ہو رہا ہے۔ شاہ ایران کو بے دخل کرنے کیلئے شیعہ علماء (Black Revolutionary) اور کمیونسٹ گروہ (Red Revolutionary) دونوں ایک ہو گئے ہیں۔ اگر بالفرض یہ اتحاد اپنے مقصد میں کامیاب ہو تو انقلاب آنے کے بعد ایران کی حکومت پر جس کا قبضہ ہوگا وہ کمیونسٹ گروہ ہوگا نہ کہ مذہبی علماء — اس طرح موجودہ زمانہ کی اسلامی سیاست نے ہر جگہ صرف غیر اسلامی سیاست کو غالب کرنے کا کام انجام دیا ہے۔

حالات کی نزاکت کا تقاضا ہے کہ اس قسم کی لاحاصل سرگرمیوں کو مطلق ترک کر دیا جائے اور اپنی ساری طاقت

تعمیری اور دعوتی کاموں میں لگا دی جائے۔

جہاں تک سائنسی الحاد کا تعلق ہے، اس کے مقابلہ کے لیے ہم کو صرف یہ کرنا ہے کہ سائنسی دریافتوں کے ان پہلوؤں کو جانیں جو دینی معتقدات کی تصدیق کرنے والی ہیں اور ان کو دین کے اثبات وحمایت میں استعمال کریں۔ سائنسی الحاد کو رد کرنے کے لیے سب سے بہتر ہتھیار وہی ہے جو خود سائنس نے موجودہ زمانہ میں فراہم کر دیا ہے۔

مگر اشتراکی الحاد کا معاملہ مکمل طور پر مختلف ہے۔ یہ تاریخ کا واحد نظام ہے جو انسان کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ وہ کلی جبر کی بدترین مثال ہے۔ اس لیے اس کا نظریاتی مقابلہ کرنے کے ساتھ یہ بھی کرنا ہے کہ اس کی عملی گرفت سے بچنے کی ہر ممکن تدبیر کی جائے۔ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی باہمی سیاسی لڑائیاں اشتراکی توسیع کے لیے زرخیز زمین فراہم کرنے کا کام کر رہی ہیں۔ اس کی تازہ مثال افغانستان کا انقلاب ہے۔ یہاں مسلمانوں کا ایک طبقہ مسلمانوں کے دوسرے طبقہ (شاہی خاندان) کا سیاسی مخالف بن گیا۔ اس باہمی اختلاف نے روس کو موقع دیا کہ وہ ایک طبقہ کی حمایت کے نام پر ملک میں گھس آئے۔ اس نے اس طبقہ کا ساتھ دے کر اس کو کامیاب بنایا اور پھر اس کے ذریعہ سے بالواسطہ طور پر ملک کے اوپر قابض ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ترک سیاست موجودہ زمانہ میں احیائے اسلام کی طرف سفر کا پہلا زینہ ہے۔ روایتوں میں بعد کے دور کے جو واقعات بتائے گئے ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو امام مسلم نے ابو ہریرہ رضی کے واسطے سے نقل کیا ہے:

قال لا تقوم الساعة حتى يغزوها سبعون الفا من بنى اسحٰق فاذا جاؤها نزلوا فلم يقاتلوا بسلاح ولم يرموا بسهم قالوا لا اله الا الله والله اكبر فيسقط احد جانبيها ـ ثم يقولون الثانية لا اله الا الله والله اكبر فيسقط جانبها الآخر ـ ثم يقولون الثالثة لا اله الا الله والله اكبر فيفرج لهم فيدخلوها فيغنموا (مسلم)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ بنی اسحاق (مسلمانوں) کے ستر ہزار آدمی ایک شہر پر حملہ نہ کریں۔ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو کسی ہتھیار سے جنگ نہیں کریں گے اور نہ کوئی تیر پھینکیں گے۔ وہ صرف لا الہ الا اللہ اللہ اکبر کہیں گے اور شہر کا ایک حصہ گر جائے گا۔ پھر وہ دوسری بار لا الہ الا اللہ اللہ اکبر کہیں گے اور شہر کا دوسرا حصہ گر جائے گا۔ پھر وہ تیسری بار لا الہ الا اللہ اللہ اکبر کہیں گے اور وہ ان کے لیے کھول دیا جائے گا۔ وہ اس کے اندر داخل ہو جائیں گے اور مال غنیمت حاصل کریں گے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کا مصداق کیا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ تاہم اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسا بھی کوئی دور امت پر آسکتا ہے جب کہ اس کی فکری اور نظریاتی طاقت ہی قوموں کو زیر کرنے کے لیے کافی ہو۔ سیاسی تصادم اور فوجی مقابلہ کی ضرورت باقی نہ رہے۔ موجودہ حالات اگر حقیقی طور پر اس کا مصداق نہ ہوں، تب بھی اعتباری طور پر یقیناً یہ پیشین گوئی اس پر چسپاں ہوتی ہے۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ نے پچھلے تمام زمانوں سے زیادہ اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ افکار کی طاقت سے قوموں کو مسخر کیا جا سکے۔

قرآن کے سلسلے میں اگر ہم ایسا کرسکیں کہ اس کے مذکورہ بالا دعوے کو اس جانچ کا معیار مان لیں تو یہ معیار حیرت انگیز طور پر یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ خدائی الہام ہے۔ پچھلی ۱۴ سو برس کی تاریخ میں قرآن اور اسلام کے بے شمار دشمن پیدا ہوئے۔ وہ اس چیلنج کے جواب میں قرآن جیسی ایک کتاب عربی زبان میں تیار کرکے نہایت آسانی سے اس کو شکست دے سکتے تھے۔ اور یقیناً بہت سے لوگوں نے اس کی کوششیں بھی کیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ مسیلمہ (۶۳۳ —) اور ابن مقفع (۷۲۴ — ۷۶۱) سے لے کر صلیبی جنگوں (۱۰۹۵ — ۱۲۷۱) کے بعد پیدا ہونے والے مسیحی مستشرقین تک کوئی بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اب تک کے مطالعہ نے ہمیں جہاں پہنچایا ہے، اس میں اگر ایک اور قرینہ کو ملا لیا جائے تو شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ زیر بحث مسئلہ بڑی حد تک قابل فہم ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ الٰہی قانون نے جو قانونی اصول اب سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے متعین کیے تھے، وہ حیرت انگیز طور پر اب بھی اپنی صحت کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس درمیان میں وضعی قانون نے اس کو رد کرکے جو متبادل اصول مقرر کیے تھے وہ دو سو سالہ تجربہ میں ناکام ثابت ہو گئے اور اب علم کا دریا دوبارہ اس سمت میں جا رہا ہے جہاں اس نے الٰہی قانون کو چھوڑا تھا۔ وضعی قانون کے مقابلہ میں الٰہی قانون کی یہ ابدیت اسی وقت قابل فہم ہو سکتی ہے جب کہ یہ مانا جائے کہ اس کا سرچشمہ انسانی ذہن کے باہر کسی ابدی ذہن میں پایا جاتا ہے۔

میں یہاں چند مثالیں دوں گا۔

۱۔ الٰہی قانون میں فرد کی آزادی کو خدائی حکم کے پابند کیا گیا ہے:

يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ — کہتے ہیں کیا امر کچھ ہمارے ہاتھ میں بھی ہے۔

قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ (آل عمران — ۱۵۴) — کہہ دو امر سب کا سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد عالمی ذہن میں جو انقلاب آیا، اس نے اس اصول کو غلامی سے تعبیر کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ آزادی سب سے بڑی انسانی قدر ہے۔ فرانس کے انقلاب (۱۷۸۹) سے لے کر اب تک اس اصول کو دو سو برس تجربہ کرنے کا موقع ملا۔ مگر اس تجربہ کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ اب ایسے محققین پیدا ہو رہے ہیں جو فرد کی آزادی کو بے معنی قرار دے رہے ہیں۔ پروفیسر اسکنر (— ۱۹۰۴) کا کہنا ہے کہ:

WE CAN'T AFFORD FREEDOM

(ہم آزادی کا تحمل نہیں کر سکتے)۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مفکرین کے برعکس اسکنر (B.F. SKINNER) کا کہنا ہے کہ آزادی کوئی خیر اعلیٰ (SUMMUM BONUM) نہیں۔ انسان کو لامحدود آزادی نہیں بلکہ پابند نظام (DISCIPLINED CULTURE) چاہیے۔ انسانی فکر کی یہ واپسی الٰہی قانون کی ابدیت کا بالواسطہ اعتراف ہے۔

۲۔ الٰہی قانون کی رو سے مرد اور عورت کا دائرہ کار الگ الگ ہے اور عملی زندگی میں مرد کو عورت پر فوقیت دی گئی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ (نساء-۳۴) مرد قوام ہیں عورتوں کے اوپر

وضعی قوانین نے اس اصول کو مکمل طور پر غلط قرار دیا۔ مگر سو برس کے تجربہ نے بتایا کہ الٰہی قانون ہی اس معاملہ میں حقیقت سے قریب تر ہے۔ آزادئ نسواں کی تحریک کی تمام تر کامیابیوں کے باوجود آج بھی "مہذب" دنیا میں مرد ہی جنس برتر (DOMINANT SEX) کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزادئ نسواں کے علم بردار یہ کہتے تھے کہ عورت اور مرد کا فرق محض سماجی حالات کی پیداوار ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں، مختلف متعلقہ شعبوں میں، اس مسئلہ کا جو گہرا مطالعہ کیا گیا ہے، اس سے ثابت ہوا ہے کہ صنفی فرق کے پیچھے حیاتیاتی عوامل (BIOLOGICAL FACTOR) کارفرما ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر جیروم کاگن (- ۱۹۲۹) کے مطالعہ نے اسے بتایا ہے:

SOME OF THE PSYCHOLOGICAL DIFFERENCES BETWEEN MEN AND WOMEN MAY NOT BE THE PRODUCT OF EXPERIENCE ALONE BUT OF SUBTLE BIOLOGICAL DIFFERENCES. (33)

مرد اور عورتوں میں بعض نفسیاتی فرق محض معاشرتی تجربات کی وجہ سے نہیں ہو سکتے بلکہ وہ لطیف قسم کے حیاتیاتی فرق کی پیداوار ہیں۔

ایک امریکی سرجن (EDGAR BERMAN) کا فیصلہ ہے کہ "عورتیں اپنی ہارمون کیمسٹری کی وجہ سے اقتدار کے منصب کے لئے جذباتی ثابت ہو سکتی ہیں":

BECAUSE OF THEIR HORMONAL CHEMISTRY WOMEN MIGHT BE TOO EMOTIONAL FOR POSITIONS OF POWER.

Time Magazine, March 20, 1972, (p.28)

امریکہ میں آزادئ نسواں کی تحریک کافی طاقت ور ہے۔ مگر اب اس کے حامی محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کی راہ کی اصل رکاوٹ سماج یا قانون نہیں بلکہ خود فطرت ہے۔ فطری طور پر ہی ایسا ہے کہ عورت بعض حیاتیاتی محدودیت (LIMITATIONS OF BIOLOGY) کا شکار ہے۔ میل ہارمون اور فیمیل ہارمون کا فرق دونوں میں زندگی کے آغاز ہی سے موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ تحریک نسواں کے پرجوش حامی کہنے لگے ہیں کہ فطرت ظالم ہے۔ ہمیں چاہئے کہ پیدائشی سائنس (SCIENCE OF EUGENICS) کے ذریعہ جینٹک کوڈ کو بدل دیں اور نئے قسم کے مرد اور نئی قسم کی عورتیں پیدا کریں۔ یہ ہے وہ آخری انجام جو امریکی عورت کے نعرہ پالیسی بناؤ کافی نہ بناؤ (MAKE POLICY NOT COFFEE) کا دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک میں ہوا ہے۔

یہ واقعہ اس بات کا ایک تجرباتی قرینہ ہے کہ وضعی قانون کے مقابلہ میں الٰہی قانون میں فطرت کی رعایت زیادہ پائی جاتی ہے۔

۳۔ الٰہی قانون میں سزا کا خاص مقصد نکال (دوسروں کے لئے عبرت) بتایا گیا ہے۔ اسی لئے الٰہی قانون نے بعض بڑے جرائم کی نہایت سخت سزائیں مقرر کی ہیں تاکہ ایک کا انجام دیکھ کر دوسرے اس سے

رک جائیں۔ مگر جدید دور میں اس کو رد کر دیا گیا۔ پہلا نمایاں شخص جس نے مجرمین کی سزا میں تخفیف کی وکالت کی وہ اٹلی کا ماہر جرمیات کیساری بیکریا (۱۷۹۴ـ ۱۷۳۸) تھا۔ اس کے بعد سے اب تک جرمیات (CRIMINALOGY) کے موضوع پر بہت کام ہوا ہے، ماہرین کا عام طور پر یہ خیال ہو گیا تھا کہ جرم کوئی "ارادی واقعہ" نہیں، اس کے اسباب حیاتیاتی ساخت، ذہنی بیماری، معاشی تنگی، سماجی حالات وغیرہ میں ہوتے ہیں۔ اس لئے مجرم کو سزا دینے کے بجائے اس کا "علاج" کرنا چاہئے۔ حتیٰ کہ تین درجن سے زیادہ ایسے ملک ہیں جنھوں نے موت کی سزا کو اپنے یہاں ختم کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ خاتمہ بھی صرف اخلاقی جرائم کی حد تک ہوا ہے۔ سیاسی اور فوجی جرائم کے سلسلے میں اب بھی ہر ملک ضروری سمجھتا ہے کہ مجرم کو سخت ترین سزا دی جائے۔

مگر جنگ عظیم ثانی کے بعد جرائم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کو روکنے کی تمام معالجاتی تدبیریں ناکام ہو چکی ہیں۔ چنانچہ کئی ملکوں مثلاً ڈیلاویر (DELAWARE) اور سری لنکا میں پہلے سزائے موت ختم کی گئی تھی اور اب اس کو دوبارہ بحال کر دیا گیا ہے۔ ماہرین قانون میں دوبارہ ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ایک بیرسٹر نے کہا ہے "لوگوں میں یہ عام تاثر ہونا کہ کسی بھی شخص کو قتل کرنا، مجرم کو موت کی سزا کا مستحق بناتا ہے، اپنے اندر بہت بڑی مانع قدر (DETERRENT VALUE) رکھتا ہے"

یہ تجربہ اس مفروضہ کی تصدیق کرتا ہے کہ جرم کی سزا کا مسئلہ جن پیچیدہ سوالات سے گہری واقفیت چاہتا ہے، الٰہی قانون میں اس کی رعایت وضعی قانون سے زیادہ پائی جاتی ہے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا، اس کا خلاصہ مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وضعی قانون کوئی قابل قبول اصول قانون دریافت کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہا ہے۔ مزید یہ کہ وہ آئندہ بھی ناکام ہی رہے گا۔ کیونکہ انسان کی محدودیت یہاں راہ میں حائل ہو رہی ہے۔

۲۔ وہ واقعہ جس نے انسان کے لئے اصول قانون کی دریافت کو ناممکن بنا دیا ہے، اسی میں الٰہی قانون کی صداقت کا قرینہ چھپا ہوا ہے۔ کیونکہ ایک طرف ذہن انسانی کی محدودیت اور دوسری طرف حقائق کی وسعت ظاہر کر رہی ہے کہ کوئی ایسا ذہن ہو جو انسانی ذہن سے برتر ہو اور جس کے اندر سارے حقائق موجود ہوں۔

۳۔ کائنات میں ایسے واقعات ہیں جو فطرت اور جبلت کی سطح پر الہام کا امکان ثابت کر رہے ہیں۔ الٰہی قانون اس میں صرف یہ اضافہ کرتا ہے کہ اس الہام کو انسان تک وسیع کر دیتا ہے۔ یہ واقعہ اس مفروضہ کو مزید مؤید کرتا ہے کہ موجودہ الٰہی قانون میں کچھ ایسی برتر امتیازی خصوصیات ہیں جو اسی وقت قابل فہم ہو سکتی ہیں جب کہ یہ مانا جائے کہ وہ ایسے ذہن سے نکلا ہے جو انسان کے مقابلہ میں زیادہ وسیع طور پر حقائق کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

چند سوالات

اگر یہ مان لیا جائے کہ الٰہی قانون ہی اصول قانون کی تلاش کا جواب ہے جب بھی چند سوالات باقی رہتے ہیں۔

۱۔ مختلف مذاہب "الٰہی قانون" کا حامل ہونے کے دعوے دار ہیں اور ان میں کافی اختلافات بھی ہیں۔ پھر وہ کون سا معیار ہو گا جس کی بنیاد پر کسی ایک مذہب کے قانون کو الٰہی قانون قرار دیا جائے گا۔

۲۔ کسی ایک مذہب کو معیار ماننے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان کے اندرونی اختلافات کو طے کرنے کی صورت کیا ہو گی۔

۳۔ یہ الٰہی قانون ہزار برس سے بھی زیادہ قدیم زمانہ میں آیا۔ اس دوران میں زندگی میں بے شمار تبدیلیاں ہو گئیں۔ پھر اس کو نئے حالات کے مطابق کس طرح بنایا جائے گا۔

یہ تین بڑے سوالات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں مختصراً عرض کروں گا۔

مذاہب کی کثرت سے یہ بات یقیناً ثابت ہوتی ہے کہ ہر زمانہ میں اور ہر قوم میں خدا کی طرف سے اس کا قانون بھیجا گیا۔ مگر ان کا باہمی اختلاف یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک ہی ہو گا جس کو الٰہی قانون کا صحیح نمائندہ قرار دیا جا سکے۔ تعدد (PLURALISM) عقلی طور پر ناقابل فہم عقیدہ ہے۔ اب یہ سوال ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو مستند نمائندہ کی حیثیت سے منتخب کرنے کی صورت کیا ہو۔ اس کا بالکل سیدھا سادا علمی طریقہ یہ ہے کہ ان کو تاریخ کے معیار پر جانچا جائے اور جس مذہب کا تاریخی طور پر محفوظ اور معلوم ہونا ثابت ہو جائے اس کو لے لیا جائے۔

اگر میں یہ کہوں تو یقیناً میں کسی صاحب علم کی معلومات میں اضافہ نہیں کروں گا کہ تاریخی جانچ کی کسوٹی پر صرف ایک ہی مذہب پورا اترتا ہے اور وہ اسلام ہے۔ آپ کوئی بایوگرافیکل ڈکشنری کھولیں تو تمام پیغمبروں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اکیلے ہوں گے جن کے نام کے آگے عام قاعدہ کے مطابق توسین میں (۶۳۲ - ۵۷۰) لکھا ہوا ہو گا جس طرح دوسری تاریخی شخصیتوں کے نام کے آگے ہوتا ہے۔ حضرت محمدؐ واحد پیغمبر ہیں جن کی زندگی تاریخ کے تحریری ریکارڈ میں شامل ہے۔ آپ کے متعلق ہر بات معلوم ہے اور آپ کے تبرکات اور مکتوبات تک اصلی حالت میں موجود ہیں۔ حتیٰ کہ معاصر مورخین کے یہاں بھی آپ کا نام ثبت ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر عین آپ کے زمانہ حیات میں ساتویں صدی عیسوی میں آرمینی زبان میں ایک کتاب (CHRONICLE OF SEBEOS) لکھی گئی۔ اس کتاب کا آرمینی متن پیٹرو گریڈ سے ۱۸۷۹ میں ۱۱۸ صفحات پر شائع ہوا۔ اس کے بعد روسی اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے مقالہ نگار پروفیسر مارگولیتھ (D.S. MARGOLIOUTH) (۱۸۵۸ - ۱۹۴۰) نے حضرت محمد کے بارے میں اس کے اندراجات کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے:

> HE WAS AN ISMAELITE WHO TAUGHT HIS COUNTRYMEN TO RETURN TO THE RELIGION OF ABRAHAM AND CLAIM THE PROMISES MADE TO THE DESCENDENTS OF ISMAEL.
>
> (Vol.8, p.872)

(وہ ایک اسمٰعیلی تھے جنھوں نے اپنے اہل ملک کو یہ تعلیم دی کہ وہ ابراہیم کے مذہب کو اپنائیں اور یہ دعویٰ کیا کہ خدا ان

وعدوں کو ان پر پورا کرے گا جو اس نے اسمٰعیل کی اولاد کے ساتھ کئے ہیں۔) یہ صرف حضرت محمدؐ کی خصوصیت ہے کہ جب کوئی محقق آپ پر قلم اٹھاتا ہے تو وہ لکھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کی کامل روشنی میں پیدا ہوئے:

----BORN WITHIN THE FULL LIGHT OF HISTORY (ENCYCLOPEDIA AMERICANA)

اسی طرح وہ قرآن جس کو حضرت محمدؐ نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ یہ میرے پاس خدا کی طرف سے آیا ہے، وہ بتمام و کمال محفوظ ہے۔ تمام محققین نے اس کو بطور واقعہ تسلیم کیا ہے۔ یہ صرف قرآن ہی کی خصوصیت ہے کہ اس کے بارے میں جب آپ کسی محقق کو پڑھتے ہیں تو اس کے یہاں لکھا ہوا ملتا ہے:

"THE QURAN APPEARS TO BE THE MOST PART AUTHENTIC"
"THE VERY WORDS THAT HE UTTERED AS A REVELATION
AND THAT WERE COLLECTED IN HIS LIFETIME".

Encychlopedia Britanica

یعنی قرآن بالکل مستند شکل میں محفوظ ہے۔ حضرت محمدؐ نے جو الفاظ بطور الہام اپنی زبان سے نکالے تھے۔ قرآن عین انھیں الفاظ پر مشتمل ہے جو آپ کی زندگی ہی میں مرتب کر دیا گیا تھا۔ مقدس کتابوں کی تاریخ میں یہ بات انتہائی عجیب ہے کہ ہرن کی کھال پر لکھا ہوا وہ قرآن آج بھی تاشقند کی لائبریری میں محفوظ ہے جو پیغمبر اسلام کے داماد اور خلیفہ ثالث عثمان غنی (۶۲۴ - ۶۵۶) کے زیر مطالعہ رہتا تھا۔ قرآن کے ابتدائی نسخہ اور موجودہ متداول نسخوں میں ایک لفظ کا بھی فرق نہیں۔

سر ولیم میور ( ) نے لکھا ہے:

"یہی ایک نکتہ کہ مسلمانوں کے فرقے ہر زمانہ میں قرآن کے ایک ہی نسخے کے پیرو رہے ہیں، قطعی طور پر ثابت کر دیتا ہے کہ جو قرآن آج ہمارے ہاتھوں میں ہے، وہی قرآن ہے جسے عثمان کے حکم سے جمع کیا گیا۔ میرا گمان ہے کہ قرآن کے سوا تمام دنیا میں کوئی کتاب نہیں جس کا متن بارہ صدیوں تک اتنا محفوظ اور آلائش سے پاک رہا ہو"

EXCEPT THE QUR'AN, THERE IS NO OTHER BOOK UNDER
THE SUN, WHICH FOR THE LAST TWELVE CENTURIES HAS
REMAINED WITH SO PURE A TEXT.

Life of Mohammed,
Introduction by Sir W. Muir,
London 1858

میں شاید یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ الٰہی قانون کی بنیادی صداقت کو تسلیم کرنے کے بعد ان میں سے کسی کو اختیار کرنے کا سب سے زیادہ غیر مشتبہ علمی معیار تاریخ ہی ہو سکتا ہے اور وہ بلاشبہ قرآن کے حق میں فراہم ہو گیا ہے۔

اب یہ سوال ہے کہ خود اسلام کے اندرونی اختلافات کو کس طرح طے کیا جائے۔

یہ مسئلہ جو بظاہر بھیانک معلوم ہوتا ہے اس وقت بالکل معمولی نظر آنے لگتا ہے جب ہم اس حقیقت کو سامنے رکھیں کہ انسانی طبائع میں اختلاف کی وجہ سے تعبیرات و تشریحات میں اختلاف ناگزیر ہے۔ یہ زندگی کی ایک حقیقت ہے نہ کہ زندگی کا ایک مسئلہ۔ اس کا نہایت سادہ حل قرآن نے یہ تجویز کیا ہے کہ جب کوئی اختلافی سوال کھڑا ہو تو ہر شخص اس پر طبع آزمائی نہ کرے بلکہ اس کو ان لوگوں کے پاس لے جایا جائے جو علم اور تحقیق کے مالک ہیں:

وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ، وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ نساء — ۸۳

اور جب ان کے پاس کوئی خبر پہنچتی ہے، امن کی یا خوف کی تو اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اگر یہ اس کو رسول تک اور اپنے اصحاب امر تک پہنچاتے تو اس کو وہ لوگ جان لیتے جو تحقیق کرنے والے ہیں۔

یہ اختلاف پیدا ہونے کی شکل میں پہلا قدم ہے۔ لیکن اگر اصحاب علم کی مجلس بھی کسی ایک رائے پر نہ پہنچ سکے تو آخری تدبیر یہ بتائی گئی کہ رائے شماری کے ذریعہ کسی ایک فیصلہ پر پہنچ کر اس کے مطابق عمل کرو:

وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰى بَیْنَھُمْ (شوریٰ — ۳۸) اور ان کا کام باہم مشورہ سے ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ الٰہی قانون کا اندرونی اختلاف صرف ایک علمی مسئلہ ہے، وہ کوئی عملی مسئلہ نہیں۔ الٰہی قانون میں چونکہ بنیادی اصول طے شدہ ہیں، اس لئے علمی بحثیں اسی کے دائرہ میں ہوں گی۔ ان بحثوں سے نہ صرف یہ کہ کوئی حقیقی خرابی نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ کئی پہلوؤں سے فکری ارتقاء میں مددگار ہیں۔ جہاں تک عملی ضرورت کے لئے کسی ایک تعبیر کی تعیین کا سوال ہے، وہ اجتماعی ادارہ یا پارلیمنٹ کے ذریعہ پوری ہو جاتی ہے۔

نئے پیدا شدہ حالات کے سلسلے میں الٰہی قانون کی رہنمائی کس طرح حاصل ہوگی، اس کا جواب اجتہاد ہے۔ اجتہاد کا مطلب سادہ طور پر یہ ہے کہ خدا نے جو بنیادی قانون (قرآن کی صورت میں) دیا ہے اور خدا کے رسول نے اس کی جو لسانی یا عملی تشریح کی ہے، اس کا گہرا علم حاصل کرنا اور اس کو سامنے رکھ کر پیش آمدہ مسائل میں الٰہی قانون کا انطباق تلاش کرنا۔ اس انطباق کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ قرآن و حدیث سے قانونی دفعات اخذ کرکے اس کو ہر زمانہ میں نافذ کیا جاتا رہے۔ بلکہ اس میں خود خارجی دنیا کے غیر متصادم قوانین کو الٰہی قانون کے ڈھانچہ میں قبول کرنا بھی شامل ہے۔ مثال کے طور پر خلیفہ ثانی عمر فاروق کے زمانہ میں عراق، مصر، شام فتح ہوئے تو آپ نے ان ملکوں میں سابقہ رومی، یونانی اور ایرانی قانون مال گزاری کو باقی رکھا۔ البتہ جو چیزیں ظلم نظر آئیں، ان میں اصلاح و ترمیم کر دی۔ اسی طرح درآمد و برآمد اور کسٹم کے لئے یہ قانون مقرر کیا کہ بیرونی ممالک میں مسلمان تاجروں کے ساتھ جو معاملہ کیا جاتا ہے وہی معاملہ وہاں کے تاجروں کے ساتھ اسلامی سلطنت میں کیا جائے۔

اجتہاد کا عمل اسلام کی ہزار سالہ تاریخ میں مسلسل جاری رہا ہے۔ مدینہ کی ابتدائی ریاست (۶۲۲ — ۶۳۲) ایک ایک سادہ عرب ریاست تھی جس میں پیغمبر اسلام نے الٰہی قانون کو نافذ کیا۔ اس کے بعد خلافت راشدہ کے زمانہ میں جب اطراف کے متمدن ممالک اسلامی ریاست میں شامل ہوئے تو بہت سے نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ اس وقت عمر فاروق (۶۳۴ — ۶۴۴) نے اجتہاد سے کام لے کر نئے حالات کے مطابق الٰہی نظام کو قائم کیا جس کی تفصیل مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ — ۱۹۱۴) کی کتاب الفاروق میں دیکھی جا سکتی ہے۔ پھر خلافت عباسیہ کے زمانے میں جب اسلامی سلطنت کو مزید وسعت ہوئی اور نظام زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہو گیا تو امام ابو یوسف (۷۳۱ — ۷۹۸) سامنے آئے جو نہ صرف وقت کی سب سے بڑی سلطنت کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھے بلکہ موجودہ زمانہ کی اصطلاح میں وزارت قانون کا عہدہ بھی انھیں حاصل تھا۔ انھوں نے الٰہی قانون کو نئے وسیع تر حالات سے ہم آہنگ کر دیا جس کا ریکارڈ خود ان کی

لکھی ہوئی "کتاب الخراج" میں موجود ہے۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں جب دنیا کے حالات میں دوبارہ انقلابی تبدیلیاں ہوئیں تو ترکی سلطان عبدالعزیز عثمانی (۱۸۷۶ - ۱۸۶۰) کے حکم سے ماہرین قانون، فقہاء اور عدلیہ کے اعلےٰ عہدہ داروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے وہ مجموعہ قانون مرتب کیا جو مجلۃ الاحکام الشرعیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مجلہ میں فقہ اسلامی کے اس حصہ کو، جس کو سول لا یا دیوانی قانون کہا جاتا ہے، دفعہ وار قوانین کی شکل میں مرتب کیا گیا ہے۔ یہ قانون ۱۹۱۸ تک خلافت عثمانیہ میں رائج رہا اور مصر، سوڈان، شام، حجاز، عراق اور شرق اردن کی عدالتیں اسی کے بموجب فیصلے کرتی رہیں۔ آج بھی اردن اور سعودی عرب میں یہی قانون کسی قدر ترمیم کے ساتھ رائج ہے۔ مجلۃ الاحکام الشرعیہ ابتداءً عربی اور ترکی زبانوں میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کے ترجمے انگریزی اور دوسری زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

اجتہاد کا یہی طریقہ اختیار کرکے آج بھی الٰہی قانون کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق بنایا جا سکتا ہے اور آئندہ بھی بنایا جاتا رہے گا۔

نوٹ: یہ مقالہ مذہب۔ اخلاق۔ قانون پر ہونے والے بین اقوامی سمینار (نئی دہلی ۱۱ - ۱۶ دسمبر ۱۹۷۳)

INTERNATIONAL SEMINAR ON RELIGION-MORALITY-LAW

کے موقع پر پڑھا گیا۔

۔۔۔ مگر ان کے دل مردار سے زیادہ متعفن ہوں گے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لا تقوم الساعۃ حتی یبعث اللہ امراء کذبۃ ووزراء فجرۃ واعوانا خونۃ وعرفاء ظلمۃ وقراء فسقۃ سیماھم سیمی الرھبان وقلوبھم انتن من الجیفۃ اھوائھم مختلفۃ فیفتح اللہ لھم فتنۃ غبراء مظلمۃ فیتھاوکون فیھا۔

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک وہ دور نہ آجائے جس میں جھوٹے حکمراں، برے وزراء، بد دیانت ملازمین حکومت، ظالم قائدین ظہور میں نہ آجائیں۔ اس زمانہ میں ایسے فاسق علماء ہوں گے جن کا ظاہر پارسا دکھائی دیتا ہوگا اور ان کے دل مردار سے زیادہ متعفن ہوں گے۔ ان کی خواہشات ایک دوسرے سے الگ ہوں گی۔ اس زمانہ میں اللہ ایک ایسا اندھا فتنہ برپا کرے گا جس میں لوگ حیران و سرگرداں ہوکر رہ جائیں گے۔

چند نئی کتابیں

تجدید دین

تجدید کا مطلب ہے خدا کے دین کو انسانی گرد و غبار سے پاک کرنا۔ آج اسلام پر وہ سارے "گرد و غبار" پڑ چکے ہیں جو پچھلی امتوں کے دین پر پڑے تھے۔ یہ گرد و غبار کیا ہے اور خدا کے دین کو کس طرح اس سے پاک صاف کیا جا سکتا ہے، "تجدید دین" میں اس کا مطالعہ کیجئے۔ صفحات ۴۸

مذہب اور جدید چیلنج

"علم جدید کا چیلنج" مولانا وحید الدین خاں کی مشہور کتاب ہے۔ "مذہب اور جدید چیلنج" اسی کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۷ میں اردو میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد عربی اور ترکی زبانوں میں اس کے درجن سے اوپر ایڈیشن شائع ہوئے۔ تمام عالم اسلام میں اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ۷ فروری ۱۹۷۶ کو مولانا وحید الدین خاں طرابلس میں صدر قذافی سے ملے تو لیبی لیڈر نے فوراً کہا: لقد قرأت کتابك الاسلام یتحدی (میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی پڑھ لی ہے)۔

الامام الاکبر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود (جامعہ ازہر قاہرہ) نومبر ۱۹۷۵ میں ہندستان آئے انھوں نے جامعہ ڈابھیل سورت میں تقریر کرتے ہوئے علماء سے کہا کہ آپ لوگ الاسلام یتحدی کا مطالعہ کیجئے۔ جس میں اسلام کے خلاف جدید شبہات کا کافی وشافی رد موجود ہے۔ صفحات ۲۲۶

ان کے علاوہ متعدد دوسری کتابیں تکمیل کے مرحلہ میں ہیں جو ان شاء اللہ جلد شائع ہوں گی۔ مثلاً "صفحات تاریخ کا سبق"، "ملت کی تعمیر"، "اسلام دور جدید میں"، "سائنسی مضامین"، "مستقبل کی طرف"، وغیرہ

"مذہب اور جدید چیلنج" کا پہلا صفحہ

فروری ۱۹۵۵ کا واقعہ ہے ۔ لکھنؤ کے مشہور امین الدولہ پارک میں جماعت اسلامی ہند کے زیر اہتمام ایک عمومی اجتماع ہوا ۔ اس موقع پر اسلام کے عقلی اثبات پر مصنف کتاب کی ایک تقریر ہوئی ۔ تقریر کے بعد جب اعلان کیا گیا کہ یہ تقریر چھپی ہوئی صورت میں اسٹال پر موجود ہے تو انسانوں کا ہجوم اس کو لینے کے لئے بک اسٹال پر ٹوٹ پڑا اور تقریر کے مطبوعہ نسخے آناً فاناً فروخت ہو گئے ۔ بعد میں یہ تقریر "نئے عہد کے دروازے پر" کی صورت میں اردو اور ہندی میں شائع ہوئی ۔

یہ پہلا موقع ہے جب کہ مصنف کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جدید الحاد کے جواب میں عصری انداز میں ایک کتاب تیار کرنی چاہئے ۔ اس کے لئے مطالعہ اور مواد جمع کرنے کا کام منظم طریقے سے اسی وقت سے شروع ہو گیا ۔ مطالعہ کے بعض اجزا متفرق طور پر بعض ماہناموں میں شائع ہوتے رہے ، جب کہ جمع شدہ مواد کی باقاعدہ ترتیب کا کام ۱۹۶۳ میں شروع ہوا اور اگست ۱۹۶۴ میں تحریری طور پر مکمل ہو گیا ۔ پہلی بار یہ کتاب ۱۹۶۶ میں ادارۂ تحقیقات و نشریات اسلام (ندوۃ العلماء لکھنؤ) سے شائع ہوئی ۔ اس کا عربی ترجمہ ۱۹۷۰ میں کویت کے ناشر دار البحوث العلمیہ سے الاسلام یتحدیٰ کے نام سے شائع ہوا ۔ اب تک اس کے تقریباً ایک درجن ایڈیشن بیروت اور قاہرہ سے شائع ہو چکے ہیں ۔ ترکی زبان میں بھی اس کا ترجمہ چھپ چکا ہے ۔ زیر نظر کتاب اسی کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ہے

اردو ، عربی ، ترکی زبانوں میں اشاعت کے بعد کتاب پر سیکڑوں تبصرے مختلف ملکوں میں شائع ہوئے ہیں ۔ ان میں سے ایک تبصرہ جزوی طور پر ٹائٹل کے آخری صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے ۔ یہ تبصرہ معروف مصری ادیب احمد بہجت کے قلم سے ہے اور وہ قاہرہ کے روزنامہ الاہرام (۲ جولائی ۱۹۷۳) میں شائع ہوا تھا ۔ تبصرہ نگار لکھتے ہیں:

> "مصنف کتاب نے اسلام کے مطالعہ کا ایک ایسا علمی انداز اختیار کیا ہے جو بالکل نیا اور انوکھا ہے ۔ جدید مادی فکر کے مقابلہ میں دین کو وہ اسی طرز استدلال سے ثابت کرتے ہیں جس سے منکرین مذہب اپنے نظریات کو ثابت کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ اسلام کے ظہور سے لے کر اب تک چودہ سو سالوں میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ اگر تاریخ کو چھانا جائے اور اللہ کی طرف بلانے والی عمدہ کتابوں کو چھلنی سے چھان کر نکالا جائے تو کتاب الاسلام یتحدیٰ بلاشک و شبہ ان میں سے ایک ہوگی ۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مصنف کتاب کے عمل کو قبول فرمائے ۔ ان کے دل کو نور سے ، ان کی عقل کو معرفت سے اور ان کی روح کو رضا سے بھر دے اور ان کے قلم کو ایسی روشنائی عطا کرے جو لکھنے سے کبھی ختم نہ ہو ۔"

ناشر

جس زندگی کی ہمیں تلاش ہے

فریڈرش انگلس نے کہا ہے ——— "آدمی کو سب سے پہلے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی چاہیے، اس کے بعد ہی وہ فلسفہ و سیاست کے مسائل پر غور کرسکتا ہے۔" مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے جس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے وہ یہ سوال ہے کہ "میں کیا ہوں؟ یہ کائنات کیا ہے، میری زندگی کیسے شروع ہوئی اور کہاں جاکر ختم ہوگی ———؟!؟" یہ انسانی فطرت کے بنیادی سوالات ہیں۔ آدمی ایک ایسی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے جہاں سب کچھ ہے مگر یہی ایک چیز نہیں۔ سورج اس کو روشنی اور حرارت پہنچاتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے اور کیوں انسان کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ ہوا اس کو زندگی بخشتی ہے مگر انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کو پکڑ کر پوچھ سکے کہ تم کون ہو اور کیوں ایسا کر رہی ہو؟ وہ اپنے وجود کو دیکھتا ہے اور نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں اور کس لیے اس دنیا میں آگیا ہوں۔ ان سوالات کا جواب متعین کرنے سے انسان کا ذہن قاصر ہے مگر انسان بہرحال ان کو معلوم کرنا چاہتا ہے۔ یہ سوالات خواہ لفظوں کی شکل میں متعین ہو کر ہر شخص کی زبان پر نہ آئیں مگر وہ انسان کی روح کو بے چین رکھتے ہیں اور کبھی کبھی اس شدت سے ابھرتے ہیں کہ آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں۔ انگلس کو دنیا ایک ملحد

انسان کی حیثیت سے جانتی ہے مگر اس کا الحاد اس کے غلط ماحول کا ردعمل تھا جو بہت بعد کو اس کی زندگی میں ظاہر ہوا۔ اس کی ابتدائی زندگی مذہبی ماحول میں گذری، جب وہ بڑا ہوا اور نظر میں گہرائی پیدا ہوئی تو رسمی مذہب سے بے اطمینانی پیدا ہو گئی۔ اپنے اس دور کا حال وہ ایک دوست کے نام اپنے خط میں اس طرح لکھتا ہے:۔

"میں ہر روز دعا کرتا ہوں اور شام دن یہی دعا کرتا رہتا ہوں کہ مجھ پر حقیقت آشکارا ہو جائے۔ جب سے میرے دل میں شکوک پیدا ہوتے ہیں یہی دعا کرنا میرا مشغلہ ہے میں تمہارے عقیدے کو قبول نہیں کر سکتا۔ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور میرا دل آنسوؤں سے امڈا چلا آرہا ہے۔ میری آنکھیں رو رہی ہیں لیکن مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں راندۂ درگاہ نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں خدا تک پہنچ جاؤں گا جس کے دیدار کا میں دل و جان سے متمنی ہوں اور مجھے اپنی جان کی قسم! یہ میری جستجو اور عشق کیا ہے یہ روح القدس کی جھلک ہے۔ اگر انجیل مقدس دس ہزار مرتبہ بھی اس کی تردید کرے تو میں نہیں مان سکتا۔"

یہ وہی حقیقت کی تلاش کا فطری جذبہ ہے جو نوجوان انگلس میں ابھرا تھا۔ مگر اس کو تسکین نہ مل سکی اور مروجہ مسیحی مذہب سے غیر مطمئن ہو کر وہ معاشی اور سیاسی فلسفوں میں گم ہو گیا۔

اس طلب کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک خالق اور مالک کا شعور پیدائشی طور پر پیوست ہے۔ وہ اس کے لاشعور کا ایک لازمی جزو ہے۔ "خدا میرا خالق ہے اور میں اس کا بندہ ہوں" یہ ایک خاموش عہد ہے جو ہر شخص اول روز سے اپنے ساتھ لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ ایک پیدا کرنے والے آقا و محسن کا تصور غیر محسوس طور پر اس کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنے اندر عظیم خلا محسوس کرتا ہے۔ اس کی روح اندر سے زور کرتی ہے کہ جس آقا کو اس نے نہیں دیکھا اسے پالے۔ اس سے لپٹ جائے اور اپنا سب کچھ اس کے

حوالے کردے۔

خدا کی معرفت ملنا گویا اس جذبے کے صحیح مرجع کو پالینا ہے اور جو لوگ خدا کو نہیں پاتے ان کے جذبات کسی دوسری مصنوعی چیز کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔ ہر شخص اپنے اندر یہ خواہش رکھنے پر مجبور ہے کہ کوئی ہو جس کے آگے وہ اپنے بہترین جذبات کو نذر کردے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان کی سرکاری عمارتوں سے یونین جیک اتار کر ملک کا قومی جھنڈا لہرایا گیا تو یہ منظر دیکھ کر ان قوم پرستوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے جو اپنے ملک کو آزاد دیکھنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ یہ آنسو در اصل آزادی کی دیوی کے ساتھ ان کے تعلق کا اظہار تھا۔ یہ اپنے معبود کو پالینے کی خوشی تھی جس کے لئے انہوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کردیا تھا۔ اسی طرح ایک لیڈر جب "قوم کے باپ" کی قبر پر جاکر پھول چڑھاتا ہے اور اس کے آگے سر جھکا کر کھڑا ہوجاتا ہے تو وہ ٹھیک اسی عمل کو دہراتا ہے جو ایک مذہبی آدمی اپنے معبود کے لئے رکوع اور سجدے کے نام سے کرتا ہے۔ ایک کمیونسٹ جب لینن کے مجسمے کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنی ہیٹ اتارتا ہے اور اس کے قدموں کی رفتار سست پڑجاتی ہے تو اس وقت وہ اپنے معبود کی خدمت میں اپنے عقیدت کے جذبات نذر کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص مجبور ہے کہ کسی نہ کسی چیز کو اپنا معبود بناتے اور اپنے جذبات کی قربانی اس کے آگے پیش کرے۔ مگر خدا کے سوا جن جن صورتوں میں آدمی اپنا یہ نذرانہ پیش کرتا ہے وہ سب شرک کی صورتیں ہیں۔ اور ان الشرک لظلم عظیم (شرک سب سے بڑا ظلم ہے) ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی اصل جگہ کے بجائے دوسری جگہ رکھ دینا۔ مثلاً ڈبے کے ڈھکن سے آپ بچے کی ٹوپی کا کام لینا چاہیں تو یہ ظلم ہوگا۔ گویا آدمی جب اپنے نفسیاتی خلا کو پُر کرنے کے لئے خدا کو چھوڑ کر کسی اور طرف لپکتا ہے، جب وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنی زندگی کا سہارا بناتا ہے تو وہ اپنے اصل مقام کو چھوڑ دیتا ہے، وہ ایک صحیح جذبے کا غلط استعمال کرتا ہے۔

یہ جذبہ چونکہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اس لئے ابتداءً وہ ہمیشہ فطری شکل میں ابھرتا ہے اس کا پہلا رُخ اپنے اصلی معبود کی طرف ہوتا ہے مگر حالات اور ماحول کی خرابیاں اس کو غلط سمت میں موڑ دیتی ہیں اور کچھ دنوں کے بعد جب آدمی ایک مخصوص زندگی سے مانوس ہو جاتا ہے تو اس میں اس کو لذت ملنے لگتی ہے۔ برٹرینڈ رسل اپنے بچپن میں ایک کٹر مذہبی آدمی تھا۔ وہ باقاعدہ عبادت کرتا تھا۔ اسی زمانے میں ایک روز اس کے دادا جان نے پوچھا — "تمہاری پسندیدہ دُعا کون سی ہے؟" چھوٹے رسل نے جواب دیا: "میں زندگی سے تنگ آگیا ہوں اور اپنے گناہوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہوں"۔ اس زمانے میں خدا برٹرینڈ رسل کا معبود تھا لیکن جب رسل تیرہ برس کی عمر کو پہنچا تو اس کی عبادت چھوٹ گئی اور مذہبی روایات اور پرانی قدروں سے باغیانہ ماحول کے اندر رہنے کی وجہ سے خود اس کے اندر بھی ان چیزوں سے بغاوت کے رجحانات ابھرنے لگے۔ اور بالآخر برٹرینڈ رسل ایک ملحد انسان بن گیا۔ جس کی محبوب ترین چیزیں ریاضی اور فلسفہ تھے۔ سنہ ۱۹۵۹ء کا واقعہ ہے۔ بی بی سی لندن پر ایک بات چیت پروگرام میں فری مین نے رسل سے پوچھا: "کیا آپ نے مجموعی طور پر ریاضی اور فلسفے کے شوق کو مذہبی جذبات کا نعم البدل پایا ہے؟" رسل نے جواب دیا — "جی ہاں، یقیناً میں چالیس برس کی عمر تک اس اطمینان سے ہم کنار ہو گیا تھا جس کے متعلق افلاطون نے کہا ہے کہ آپ ریاضی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ابدی دُنیا تھی۔ وقت کی قید سے آزاد دُنیا۔ مجھے یہاں مذہب سے ملتا جلتا ایک سکون نصیب ہو گیا"۔

برطانیہ کے اس عظیم مفکر نے خدا کو اپنا معبود بنانے سے انکار کر دیا مگر معبود کی ضرورت سے پھر بھی وہ بے نیاز نہ رہ سکا اور جس مقام پر پہلے اس نے خدا کو بٹھا رکھا تھا۔ وہاں ریاضی اور فلسفے کو بٹھانا پڑا — یہی نہیں بلکہ ریاضی اور فلسفے کے لئے وہ صفات بھی تسلیم کرنی پڑیں جو صرف خدا ہی کی صفت ہو سکتی ہے — ابدیت اور وقت کی قید سے آزادی! کیونکہ اس کے بغیر اسے مذہب سے ملتا جلتا وہ سکون نہیں مل سکتا تھا جو در اصل اس کی فطرت تلاش کر رہی تھی

ایسے لوگ جو خدا کو نہیں مانتے اور پرستش کو بے معنی چیز سمجھتے ہیں وہ اپنے خود ساختہ بتوں کے آگے جھک کر اپنے اندرونی جذبۂ عبودیت کو تسکین دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ "الٰہ" انسان کی ایک فطری ضرورت ہے اور یہی اس کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقی ہے۔ انسان اگر خدا کے سامنے نہ جھکے تو اس کو دوسرے الٰہوں کے سامنے جھکنا پڑے گا کیونکہ الٰہ کے بغیر اس کی فطرت اپنے خلا کو پُر نہیں کر سکتی۔

مگر بات صرف اتنی نہیں ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر میں کہتا ہوں کہ جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا معبود بناتے ہیں وہ ٹھیک اسی طرح حقیقی سکون سے محروم رہتے ہیں جیسے کوئی بے بچہ ماں پلاسٹک کی گڑیا خرید کر بغل میں دبا لے اور اس سے تسکین حاصل کرنا چاہے۔ ایک ملحد انسان خواہ وہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو۔ اس کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب وہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے سوا کچھ اور ہے جو میں نے پائی ہے۔

آزادی سے بارہ سال پہلے ۱۹۳۵ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو نے جیل خانے میں اپنی آپ بیتی مکمل کی تو اس کے آخر میں انھوں نے لکھا:

"میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی کا ایک باب ختم ہو گیا اور اب اس کا دوسرا باب شروع ہوگا۔ اس میں کیا ہوگا، اس کے متعلق میں کوئی قیاس نہیں کر سکتا۔ کتابِ زندگی کے اگلے ورق سربمہر ہیں۔"

P. 597

Nehru, an Autobiography London (1953)

نہرو کی زندگی کے اگلے اوراق کھلے تو معلوم ہوا کہ وہ دنیا کے تیسرے سب سے بڑے ملک کے وزیر اعظم ہیں اور دنیا کی آبادی کے چھٹے حصہ پر بلا شرکت حکومت کر رہے ہیں، مگر اس یافت نے نہرو کو مطمئن نہیں کیا اور اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی وہ محسوس کرتے رہے کہ کتابِ زندگی کے مزید کچھ اوراق ہیں جو ابھی تک بند ہیں اور وہی سوال آخر عمر میں بھی ان کے ذہن میں گھومتا رہا جس کو لے کر ہر انسان پہلے روز پیدا ہوتا ہے۔ جنوری ۱۹۶۴ء کے

پہلے ہفتہ میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس نئی دہلی میں ہوئی جس میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے بارہ سو ڈیلیگیٹ شریک ہوئے۔ پنڈت نہرو نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میں ایک سیاستدان ہوں اور مجھے سوچنے کے لئے وقت کم ملتا ہے پھر بھی بعض اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ آخر یہ دنیا کیا ہے، کس لئے ہے، ہم کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ کچھ طاقتیں ہیں جو ہماری تقدیر کو بناتی ہیں۔"

National Herald, January, 1964

یہ ایک عدم اطمینان ہے جو ان تمام لوگوں کے گردوں پر گہرے کہر کی طرح چھایا رہتا ہے جنہوں نے خدا کو اپنا الٰہ اور معبود بنانے سے انکار کیا۔ دنیا کی مصروفیتوں اور وقتی دلچسپیوں میں عارضی طور پر کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اطمینان سے ہم کنار ہیں مگر جہاں یہ مصنوعی ماحول ختم ہوا، حقیقت اندر سے زور کرنا شروع کر دیتی ہے اور انہیں یاد دلاتی ہے کہ وہ سچے اطمینان سے محروم ہیں۔

۲۔ میک گل یونیورسٹی کے پروفیسر مائیکل بریچر Michael Brecher نے پنڈت جواہر لال نہرو کی سیاسی سوانح حیات لکھی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے پنڈت نہرو سے ملاقات بھی کی تھی۔ نئی دہلی کی ایک ملاقات میں ۱۳ جون ۱۹۵۶ء کو انہوں نے پنڈت نہرو سے سوال کیا:

"آپ مختصر طور پر مجھے بتائیں کہ آپ کے نزدیک اچھے سماج کے لئے کیا چیزیں ضروری ہیں اور آپ کا بنیادی فلسفۂ زندگی کیا ہے۔"

ہندوستان کے سابق وزیراعظم نے جواب دیا:

"میں کچھ معیاروں کا قائل ہوں، آپ ان کو اخلاقی معیار Moral Standards کہہ لیجئے۔ یہ معیار ہر فرد اور سماجی گروہ کے لئے ضروری ہیں

اگر وہ باقی نہ رہیں تو تمام مادی ترقی کے باوجود آپ کسی مفید نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے ان معیاروں کو کیسے قائم رکھا جاتے، یہ مجھے نہیں معلوم۔ ایک تو مذہبی نقطۂ نظر ہے لیکن یہ اپنے تمام رسوم اور طریقوں کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہے۔۔۔۔۔۔
میں اخلاقی اور روحانی قدروں کو مذہب سے الگ کر کے بہت اہمیت دیتا ہوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کو ماڈرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک مسئلہ ہے۔"

Nehru : A Political Biography (London 1959) 607-8

یہ سوال درجواب جدید انسان کے اس دوسرے خلا کو بتاتا ہے جس میں آج وہ شدت سے گرفتار ہے۔ افراد کو دیانت و اخلاق کے ایک خاص معیار پر باقی رکھنا ہر ماجی گروہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اس کے بغیر تمدن کا نظام صحیح طور پر برقرار نہیں رہ سکتا مگر خدا کو چھوڑ دینے کے بعد انسان کو نہیں معلوم کہ وہ اس ضرورت کو کیسے پورا کرے۔ سینکڑوں سال کے تجربے کے بعد وہ ابھی بدستور تلاش کی منزل میں ہے۔ پبلک اور حکام کے درمیان عمدہ تعلقات پیدا کرنے کے لئے خوش اخلاقی کا ہفتہ Courtesy week منایا جاتا ہے مگر اس کے بعد بھی جب سرکاری ملازموں کی افسرانہ ذہنیت ختم نہیں ہوتی تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقصد اس طرح حاصل نہیں ہوتا کہ ہم ڈکشنری سے "اخلاق" کا لفظ نکال کر لوگوں کے سامنے رکھ دیں بے ٹکٹ مسافروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو روکنے کے لئے تمام اسٹیشنوں پر بڑے بڑے پوسٹر لگائے جاتے ہیں ـــــ "بے ٹکٹ سفر کرنا سماجی گناہ ہے۔"

Ticketless Travel is a Social evil.

مگر جب اس کے باوجود بے ٹکٹ سفر ختم نہیں ہوتا تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ "سماجی گناہ" کا حوالہ وہ احساس پیدا نہیں کر سکتا جو نظم و ضبط کی تعمیل کے لئے محرک بن سکے۔ پریس کے ذریعہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ جرم کا انجام اچھا نہیں ہوتا، مگر جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار

CRIME DOES NOT PAY

جاتی ہے کہ دنیوی نقصان کے اندیشہ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ آدمی کو جرم سے باز رکھے» تمام دفتروں کی دیواریں مختلف زبانوں کے ان الفاظ سے رنگین کر دی جاتی ہیں — "رشوت لینا اور رشوت دینا پاپ ہے"۔ مگر جب ایک شخص دیکھتا ہے کہ ہر محکمے میں عین انہیں الفاظ کے نیچے رشوت کا کاروبار پورے زور و شور سے جاری ہے تو وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس قسم کے سرکاری پروپیگنڈے رشوت کو روکنے میں کسی درجہ میں بھی مفید نہیں ہیں۔ ریل کے تمام ڈبوں میں اس مضمون کے کتبے لگائے جاتے ہیں کہ — "ریلوے قوم کی ملکیت ہے اس کا نقصان پوری قوم کا نقصان ہے"، مگر اس کے باوجود جب لوگ کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالتے ہیں اور بجلی کے بلب غائب کر دیتے ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ "قوم" کے مفاد میں اتنا زور نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ایک شخص اپنے ذاتی مفاد کو قربان کر دے —

"اجتماعی ذرائع کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرنا ملک و قوم سے غداری ہے"۔ ایک طرف لیڈروں اور حکمرانوں کی زبان سے یہ اعلان ہو رہا ہے۔ دوسری طرف بڑے بڑے قومی منصوبے اس لئے ناکام ہو رہے ہیں کہ سرمایہ کا بڑا حصہ اصل منصوبہ پر لگنے کے بجائے متعلقہ کارکنوں کی تحویل میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ساری قومی زندگی انتہائی کوشش کے باوجود ان معیاروں سے محروم ہو گئی ہے جو قومی تعمیر کے لئے ضروری ہیں اور ان معیاروں کو پیدا کرنے کے لئے جتنے ذرائع استعمال کئے گئے وہ سب کے سب قطعی ناکام ثابت ہوتے ہیں۔

یہ علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ بے خدا تہذیب نے انسانیت کی گاڑی کو دلدل میں لاکر ڈال دیا ہے اس کو اس پٹری سے محروم کر دیا ہے جس کے اوپر چل کر وہ اپنا سفر بحسن و خوبی طے کر سکتی ہے۔ زندگی کی کشتی بے لنگر اور بغیر بادبان ہو گئی ہے اس کا واحد حل یہ ہے کہ انسان خدا کی طرف پلٹے۔ وہ زندگی کے لئے مذہب کی اہمیت کو تسلیم کرے۔ یہی وہ تنہا بنیاد ہے جس پر زندگی کی بہتر تعمیر ممکن ہے اس کے سوا کسی بھی دوسری بنیاد پر زندگی کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ جو جی میں آئے کرے اور جو
چاہے منھ سے نکالے۔ مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ جائز حدود
میں زندگی گزارے اور ناجائز چیزوں سے ہمیشہ کے لئے "روزہ"
رکھ لے ـــــــ رمضان کے مہینے کا روزہ اسی قسم کی روزہ دار
زندگی کا ایک سبق ہے جو ہر سال مسلمانوں کو دیا جاتا ہے۔



الرسالہ

شمارہ ۲۱ اگست ۱۹۷۸

جمعیۃ بلڈنگ • قاسم جان اسٹریٹ • دہلی ٦

عن ابی قلابۃ عن ابن مسعود قال : ستجدون اقواما یدعونکم الی کتاب اللّٰہ وقد نبذوہ وراء ظهورهم

جامع بیان العلم ، جزء ثانی ، صفحہ ۱۹۳

عنقریب تم ایسے لوگ دیکھوگے جو تم کو کتاب اللہ کی طرف بلائیں گے۔ حالاں کہ انھوں نے کتاب اللہ کو بس پشت ڈال دیا ہوگا ۔

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔ براہ کرم اپنا زر تعاون بذریعہ منی آرڈر بھیج کر شکریہ کا موقع دیں ——— منیجر الرسالہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیر نظر شمارہ میں صفحہ ۱۶ کے بعد آخر تک جو مضمون شامل کیا گیا ہے، وہ ایک بے حد اہم مضمون ہے۔ اس بنا پر اس کو علیحدہ ٹائٹل لگا کر مستقل پمفلٹ کی صورت میں چھپوا لیا گیا ہے۔ اس کا نام ہے " دین کیا ہے " اس پمفلٹ کی عام قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے رکھی گئی ہے۔ تاہم عمومی اشاعت کے لئے جو لوگ اس کو زیادہ تعداد میں منگائیں، ان کو ادارہ کی طرف سے خصوصی کمیشن دیا جائے گا۔ ضرورت ہے کہ اس پمفلٹ کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے

ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ کچھ لوگ ادارہ الرسالہ کی طرف سے تحریری اجازت نامہ دکھا کر الرسالہ کے نام پر رقمیں وصول کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم نے کسی کو ایسا اجازت نامہ نہیں دیا ہے۔ ایسی کوئی بھی تحریر محض فرضی ہے۔ قارئین کرام نوٹ فرمائیں۔

ہم کو الرسالہ ماہ جولائی ۱۹۷۷ کے شماروں کی شدید ضرورت ہے۔ جن لوگوں کے پاس یہ شمارے ہوں اور وہ الگ کرنا چاہیں۔ براہ کرم اپنے شرائط سے ہم کو مطلع فرمائیں ۔

الرسالہ کے دفتر سے نمونہ کا پرچہ مفت روانہ کیا جاتا ہے۔ آپ اپنے کسی عزیز یا دوست کو اگر الرسالہ دکھانا چاہتے ہوں تو ان کا پتہ لکھ کر بھیج دیں۔ یہاں سے ان کو نمونہ کا پرچہ بھیج دیا جائے گا۔

آدمی اگر موت کے دوسری طرف دیکھ لے

ایک شخص نے دنیا بھر میں خودکشی کے واقعات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے ان لوگوں کے حالات کا بھی جائزہ لیا ہے جنھوں نے خودکشی کا اقدام کیا۔ مگر کسی وجہ سے مرنے سے محفوظ رہ گئے۔ مصنف نے پایا ہے کہ اس قسم کے لوگ عام طور پر اپنی بعد کی زندگی میں نہایت کامیاب رہے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ موت کے قریب پہنچ کر جب انھوں نے موت کے بھیانک روپ کو دیکھا تو زندگی ان کو بے حد قیمتی معلوم ہونے لگی۔ انھوں نے نئی لگن اور نئے اعتماد کے ساتھ زندگی کو قبول کر لیا۔ ان کی ناامیدی دوبارہ امید میں تبدیل ہوگئی۔

"اس سے اچھے تو ہم پہلے ہی تھے"، یہ احساس ان کے اندر زندگی اور عمل کی نئی امنگ پیدا کر دیتا ہے۔ "موت تو کامل بربادی ہے۔ جب کہ موت سے پہلے ہم اس پوزیشن میں تھے کہ بربادی سے نکلنے کی جدوجہد کر سکیں۔"

یہ صرف اس ابتدائی تجربہ کا نتیجہ ہے جو جسم سے جان کی علیحدگی کے وقت آدمی پر گزرتا ہے۔ اگر آدمی اس سے آگے بڑھ کر یہ دیکھ لے کہ علیحدگی کی تکمیل (موت) کے بعد آدمی جس دوسرے عالم میں داخل ہوتا ہے، وہاں اس پر کیا کچھ گزرے گا تو اس کی زندگی میں اس سے بھی زیادہ بڑا انقلاب آجائے۔ وہ اپنی زندگی کو تمام تر آخرت کی طرف موڑ دے۔ وہ ہر دوسرے پہلو کو چھوڑ کر آخرت کے پہلو کو ترجیح دینے لگے۔ آخرت کا معاملہ اتنا سخت ہے کہ آدمی جب اس سے دوچار ہوگا تو ہر وہ چیز اس کو ہلکی معلوم ہوگی جس کی خاطر آج وہ اپنی آخرت کو نظرانداز کر دیتا ہے۔

روزہ

اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، روزہ یہ ہے کہ آدمی علائق دنیا سے اپنے آپ کو کاٹ لے۔ اس قسم کی روزہ داری سے کیا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ انسانی وجود کا مادی پہلو کمزور ہو اور اس کی روحانیت بڑھے تاکہ عالم قدس سے اس کا اتصال ممکن ہو سکے۔ جسم کی مادی غذا کے مقابلہ میں روزہ کا مقصد روح کو معنوی غذا پہنچانا ہے۔

انسان بیک وقت دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک مادہ، دوسرے روح، جس کو موجودہ زمانے کے علمائے نفسیات ذہن سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسانی وجود کا مادی حصہ اس کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ موجودہ دنیا میں اپنے فرائض ادا نہیں کر سکتا۔ مگر اسی کے ساتھ انتہائی ضروری ہے کہ اس کی روح یا جدید نفسیاتی اصطلاح میں ذہن، اپنی مجرد حیثیت کو زیادہ سے زیادہ باقی رکھ سکے اور اپنی غیر مادی حیثیت میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرے تاکہ غیر مادی حقائق تک اس کی بے آمیز رسائی ممکن ہو۔

الرسالہ کے پیغام کو پھیلانے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قائم کریں

اعظم گڑھ (یوپی) میں ایک ڈگری کالج ہے جس کا نام شبلی نیشنل کالج ہے۔ ملک زادہ منظور احمد یہاں انگریزی زبان کے شعبہ میں لکچرر تھے۔ وہ ۱۹۵۲ سے ۱۹۶۴ تک یہاں استاد رہے۔ وہ کمیونسٹ تھے دن کو وہ کالج میں انگریزی کی کلاس لیتے اور شام کے وقت شہر کے چوراہے پر کھڑے ہو کر پارٹی کا اخبار بیچتے۔ سڑک پر ہاتھ میں اخباروں کا بنڈل لئے ہوئے جب وہ کہتے کہ "وہ پارٹی کیوں نہ کامیاب ہوگی جس میں میرے جیسا آدمی اخبار بیچے" تو سننے والوں پر عجیب تاثر ہوتا۔

اب ایک اور مثال لیجئے۔ چند ماہ پہلے ایک مسلم نوجوان مجھ سے ملے۔ انھوں نے ایک اسلامی اخبار نکالنا شروع کیا تھا۔ اخبار کی پہلی اشاعت پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا: "میری جوتوں کی دکان ہے اور اللہ کے فضل سے کامیاب بھی۔ مگر مجھ کو پسند نہیں آیا کہ میں زندگی بھر جن سیوک بنا رہوں۔ آدمی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سوسائٹی میں معزز مقام حاصل کرے۔"

موجودہ زمانہ میں مسلم قوم کے المیہ کی، کم از کم ایک بڑی وجہ وہی ہے جو مذکورہ واقعہ میں نظر آتی ہے۔ ہمارا ہر آدمی "لیڈر" کی سطح پر قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ "ہاکر" کی سطح پر قوم کی خدمت کرنے سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ مذکورہ مسلم نوجوان نے سادگی میں اپنے دل کی بات کہہ دی۔ مگر یہی سارے لوگوں کا حال ہے۔ وہ لیڈر اور ایڈیٹر، مقرر اور مصنف بن کر قوم کی خدمت کرنے کے لئے تو بہت بے قرار رہتے ہیں۔ مگر نچلی سطح پر خدمت قوم کا ان کے اندر کوئی جذبہ نہیں۔ اگرچہ ان میں ایسے لوگ بہت کم ملیں گے جو مذکورہ نوجوان کی طرح صاف لفظوں میں اس کا اقرار بھی کرلیں۔

الرسالہ جس تعمیری اور اصلاحی مقصد کے تحت نکالا گیا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی اشاعت

سفر ابتدا سے شروع ہوتا ہے نہ کہ درمیان سے

"We must start again from scratch . . ."

ہم کو ابتدائی نقطہ سے اپنا سفر شروع کرنا ہے
کوئی شخص اگلی منزل سے اپنے سفر کا آغاز نہیں کرسکتا۔

سفر کا آغاز جب بھی ہوگا وہیں سے ہوگا جہاں آدمی فی الواقع کھڑا ہوا ہے ـــــ ایک شخص دہلی میں ہے اور بمبئی پہنچنا چاہتا ہے، ایسے شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ دادر سے اپنا سفر شروع کرے۔ اس کو بہرحال دہلی سے چلنا ہوگا۔ دادر سے سفر شروع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سفر کبھی شروع ہی نہ ہو۔

زیادہ سے زیادہ بڑھائی جائے۔ اس سلسلہ میں ہم اپنے مسلم بھائیوں۔ ہم مذکورہ کمیونسٹ جیسے تعاون کی امید تو نہیں کر سکتے۔ تاہم اس سے کم تر درجہ کے ایک تعاون کی ہم ان سے اپیل کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ ہر شخص جو ہم سے ہمدردی یا اتفاق رکھتا ہے، وہ اپنے مقام پر رسالہ کی ایجنسی قائم کرے۔

تجربہ یہ ہے کہ یک وقت سال بھر کا چندہ دینا لوگوں کو مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے ہو تو ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اسے لے لیتے ہیں۔ اس صورت حال میں الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہر ہر جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ یہ کم سے کم تعاون ہے جو الرسالہ کے ہمدرد الرسالہ کے خیالات کو عام کرنے کے لئے ہمیں دے سکتے ہیں۔

ایجنسی لینے والے کے لئے اس کام میں کسی نقصان کا سوال نہیں ہے۔ کیوں کہ شرائط ایجنسی کے مطابق غیر فروخت شدہ پرچے واپس لے لئے جاتے ہیں۔ بہترین عملی صورت یہ ہے کہ کم تعداد سے ایجنسی شروع کی جائے ابتداءً پانچ یا دس پرچے منگائے جائیں اور پھر حالات کے مطابق بڑھایا جاتا رہے۔ تعاون کی یہ صورت ہلکی بھی ہے اور بے خطر بھی۔ اگر ہمارے ہمدرد اس پر عمل کریں تو چند سال میں اس کے عظیم نتائج نکل سکتے ہیں۔

(وحیدالدین)

زندگی بہت دور خلا میں پیدا ہوئی اور پھر وہاں سے زمین پر آئی

پچھلے سو برس سے ڈارونی ارتقائی نظریہ پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں پر حکومت کرتا رہا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق زمین پر طبیعی حالات کے عمل اور ردعمل سے زندگی پیدا ہوئی اور زمینی حالات میں ارتقا کے مراحل طے کرتی رہی۔ مگر موجودہ زمانہ میں جو نئی تحقیقات سامنے آئی ہیں، اس نے اس نظریہ کی اعتباریت ختم کر دی ہے۔

اس کی ایک تازہ مثال وہ تحقیق ہے جو پروفیسر چندرا وکرما سنگھے (سری لنکا) اور سرفریڈ ہوئل (برطانیہ) نے مشترکہ طور پر پیش کی ہے۔ ان دونوں کا کہنا ہے کہ ان کی دریافت حیاتیات اور فلکیات کے بارہ میں بہت سے مزعومات کو بدل دے گی۔ دونوں سائنس داں کارڈف یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ انھوں نے برطانیہ کی سائنس ریسرچ کونسل میں درخواست دی تھی کہ ان کو ۷۵۰۰ پونڈ کا عطیہ دیا جائے، تاکہ وہ اس میدان میں اپنی تحقیق کو جاری رکھ سکیں۔ کونسل نے اس درخواست کو رد کر دیا۔ کیوں کہ "ان کا نظریہ ڈارونی اصول کو چیلنج کر رہا ہے"۔

دونوں سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ زندگی بہت دور خلا میں کسی دمدار ستارہ پر پیدا ہوئی اور اس کے بعد کسی وقت زمین پر آئی۔ انھوں نے اپنے اس نظریہ کے حق میں مقالات شائع کئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ابتدائی زمانہ میں شمسی نظام میں جو دمدار ستارے تھے، انھوں نے عظیم تہذیبی مرکز کی حیثیت سے کام کیا۔ یہاں پیچیدہ قسم کے مالیکیول پانی سے ملے۔ ان کو گرمی ملتی رہی۔ اس طرح ابتدائی زندگی وجود میں آئی۔ پھر کسی وقت دمدار ستارے کا زمین سے ٹکراؤ ہوا اور اس کے بعد زندگی زمین پر پہنچی ——— سائنس مذہب کے تخلیقی نظریہ سے کتنی قریب آتی جا رہی ہے

ظہور اسلام

از

مولانا وحید الدین خاں

قیمت بارہ روپے

ایک تعلیم یافتہ شخص نے "ظہور اسلام" کو پڑھنے کے بعد کہا:
"مجھے معلوم نہ تھا کہ اسلام کے اوپر ایسی کتاب بھی لکھی جا سکتی ہے۔
میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ ایسی عجیب و غریب کتاب میں نے
آج تک نہیں پڑھی تھی۔"

اسلام کو عصری اسلوب میں سمجھنے کے لئے "ظہور اسلام" اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے

مکتبہ الرسالہ
جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

Times (London) March 5, 1978

اسلام فرانس کا دوسرا مذہب بن چکا ہے

In 20 years Muslims have become far more numerous than Protestants

Islam is France's second religion

From Charles Hargrove
Paris, May 2

It is surprising that in the past 20 years Islam has become the second most important religion in France after Roman Catholicism. It is far ahead of Protestantism and mosques served by permanent imams now stand in 17 provincial centres.

Roman Catholic churches are often three-quarters empty. But Friday prayers in the Paris Mosque attract between 5,000 and 6,000 people who spill out into adjoining halls and courtyards to listen to the prayers over loudspeakers.

For the feast of Aid-el-Saghir, which marks the end of Ramadan, the congregation swells to nearly 11,000, and all round the mosque people kneel in the streets.

It is estimated that there are 14 million practising Catholics in France as distinct from people baptized as Catholics who are far more numerous. The Muslims come next with about two million, then protestants with 1,250,000, Jews who number 900,000, and Buddhists, about 80,000.

Before 1939 the Muslim population of France was so small that there were no official statistics of their number.

But after the Second World War the Muslim population changed. Many families settled here, particularly from the former colonies in North Africa. Sometimes they had to live in appalling conditions.

The wave of immigration increased sharply after 1954 and lasted until 1970. In addition to the families from North Africa, large numbers arrived in France from black Africa.

Now the Muslim community consists of mainly working people and about 750,000 of them live in the Paris region. In Marseilles there are about 250,000, and in Lyons, about 300,000. Some are professors, others cannot read or write. The only thing they have in common is their faith in Islam.

Speaking about this disparate community, Si Hamza Boubakeur, rector of the Muslim Institute of the Paris Mosque said: "I realized that I could not afford to stress religious differences, but must give common spiritual nourishment to all, free from any sectarian spirit."

He was also confronted with many material problems: housing, jobs, education, and integration into the French community. The women on whom the family structure is based, at first found themselves in a "linguistic prison", unable to communicate.

On a wall of his study is a portrait of the Shah of Iran. "... was the only one that helped me materially", he said. "He gave me carpets for the mosque and money."

About three-fifths of France's Muslims practice their religion. "The social pressure to worship is not as strong as in a Muslim country and the conditions are not favourable", Si Hamza Boubakeur said. "But many Muslim workers observe Ramadan even on the assembly line".

یہ اچنبھے کی بات ہے کہ پچھلے ۲۰ برسوں میں اسلام فرانس کا دوسرا سب سے زیادہ اہم مذہب بن گیا ہے۔ وہ صرف رومن مسیحیت کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ پروٹسٹنٹ مسیحیت سے وہ بہت آگے ہے۔ فرانس کے ۱۷ صوبائی مرکزوں میں مستقل اماموں کے ساتھ مساجد قائم ہیں۔

رومن کیتھولک چرچ اکثر تین چوتھائی خالی رہتے ہیں مگر پیرس کی مسجد میں جمعہ کی نمازوں میں پانچ ہزار سے چھ ہزار تک آدمی جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ آنگن اور ملحقہ کمروں تک بھرے ہوتے ہیں تاکہ نماز اور خطبہ کو لاؤڈ اسپیکر پر سن سکیں۔

عیدالفطر کا تیوہار جو رمضان کے ختم پر ہوتا ہے، اس میں نمازیوں کا اجتماع گیارہ ہزار تک پہنچ جاتا ہے۔ مسجد کے چاروں طرف سڑکوں پر لوگ جھکے ہوئے عبادت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اندازہ ہے کہ فرانس میں ۱۴ ملین عامل کیتھولک ہیں، بمقابلہ بپتسمہ لینے والے کیتھولک کے کہ ان کی تعداد زیادہ ہے۔ مسلمان دوسرے نمبر پر ہیں جن کی تعداد تقریباً دو ملین ہے۔ اس کے بعد پروٹسٹنٹ ہیں جن کی تعداد ۱۲۵۰۰۰۰ ہے۔ یہودیوں کی تعداد نو لاکھ ہے اور بدھسٹ کی تعداد ۸۰ ہزار ہے۔

۱۹۳۹ء سے پہلے مسلم آبادی فرانس میں اتنی کم تھی کہ ان کے بارے میں کوئی سرکاری اعداد و شمار موجود نہ تھے۔ مگر دوسری عالمی جنگ کے بعد مسلم آبادی بڑھنا شروع ہوئی۔ بہت سے مسلم خاندان فرانس میں آباد ہوگئے، خاص طور پر شمالی افریقہ کے فرانسیسی مقبوضات کے بعض اوقات ان کو خوف و ہراس کی حالت میں رہنا پڑتا تھا۔

جس نے اسلامی ملکوں کو اپنی نوآبادی بنانا چاہا تھا ، وہ اب خود اسلام کی نوآبادی ہو رہا ہے ۔

۱۹۵۴ کے بعد مہاجرین کا سیلاب بہت تیزی سے بڑھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۰ء تک جاری رہا۔ شمالی افریقہ سے آنے والے مسلم خاندانوں کے علاوہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد سیاہ افریقہ سے بھی فرانس میں داخل ہوئی۔ اب فرانس کے مسلمان زیادہ تر مزدور طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ۲۵۰۰۰۰ پیرس کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ مارسیلز میں ۷۵۰۰۰ مسلمان ہیں اور لیونس میں ۳۰۰۰۰۔ ان میں سے کچھ پروفیسر ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ واحد چیز جو ان میں مشترک ہے وہ اسلام کا عقیدہ ہے۔

حمزہ ابوبکر پیرس کی مسجد کے مسلم انسٹی ٹیوٹ کے ریکٹر ہیں۔ مسلمانوں کے اس مختلف النوع طبقہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا: "میں نے محسوس کیا کہ میں ان لوگوں کے مذہبی اختلافات کو ختم نہیں کر سکتا۔ اس کے بجائے مجھے چاہئے کہ سب کو مشترک روحانی خوراک دینے کی کوشش کروں جو کسی ایک کے فرقہ وارانہ مزاج سے آزاد ہو۔

ان کے سامنے بہت سے مادّی مسائل بھی ہیں — رہائش، روزگار، تعلیم اور فرانس کے معاشرہ سے موافقت۔ عورتیں جن کے اوپر خاندانی ڈھانچہ قائم ہوتا ہے، وہ ابتداءً اپنے کو ایک قسم کی لسانی قید میں پاتی ہیں۔ وہ خارجی دنیا سے ربط قائم نہیں کر پاتیں۔

حسن ابوبکر کے کمرہ کی دیوار پر شاہ ایران کی ایک تصویر ہے۔ "شاہ کی حکومت پہلی حکومت تھی جس نے مادی طور پر میری مدد کی۔" انھوں نے کہا "انھوں نے مجھ کو مسجد کے لئے قالین اور پیسہ دیا۔"

فرانس کے مسلمانوں کی تھوڑی تعداد مذہبی فرائض ادا کرتی ہے۔ "عبادت کے لئے سماجی دباؤ یہاں اتنا زیادہ نہیں جتنا ایک مسلم ملک میں ہوتا ہے اور حالات زیادہ موافق نہیں ہیں۔" حسن ابوبکر نے کہا "مگر بہت سے مسلم مزدور رمضان کے روزے رکھتے ہیں حتی کہ پورے مہینے تک کے۔"

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جا است

"سر! ایک بات کہوں برا نہ مانئے گا" کالج کے طالب علم نے کہا "میں آج کل قرآن مجید کا ترجمہ پڑھ رہا ہوں۔ جہاں سے بھی کھول کر پڑھتا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہی سورہ پڑھ رہا ہوں۔ قرآن میں ہر جگہ آخرت اور جنت اور جہنم ہی کی باتیں ہیں۔"

ایک سادہ ذہن کے طالب علم کو جو بات قرآن میں اتنی زیادہ نظر آئی وہ بڑے بڑے اہل علم کو اس میں دکھائی نہیں دیتی۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن کی سب سے بڑی تعلیم یہ ہے کہ سیاست الٰہیہ کا جھنڈا اٹھاؤ اور تمام قوموں سے لڑ کر اسلام کی حکومت قائم کرو۔ حالاں کہ سارے قرآن میں کہیں بھی اس قسم کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ جو بات قرآن میں لکھی ہوئی نہیں ہے، وہی لوگوں کے لئے سب سے اہم بات بن گئی ہے:

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جا است

زندگی کا راز

ایڈجسٹمنٹ میں ہے

نہ کہ

مقابلہ آرائی میں

کہا جاتا ہے کہ جاپانی زبان میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو "کام" کے مفہوم کو بتاتے ہیں۔ مگر ابھی حال تک جاپانی زبان میں ایسا کوئی لفظ نہ تھا جو "فرصت" کے مفہوم کو ادا کرتا ہو۔ غالباً یہ واحد عامل ہے جس نے جاپانی قوم کو دنیا میں سب سے زیادہ محنتی قوم بنا دیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان کی اقتصادیات بالکل برباد ہوگئی تھیں۔ مگر جاپانی محنت نے معجزہ دکھایا۔ جنگ کے صرف ۲۰ سال بعد جاپان نے اقتصادی حیثیت سے دنیا کے چند انتہائی ترقی یافتہ ملکوں کی فہرست میں جگہ حاصل کرلی۔

مسلمانوں کا معاملہ ایک اور پہلو سے دل چسپ

Japanese did not have 'leisure'

There are plenty of words in the Japanese language meaning "work" but till recently it had no word for "leisure". This may be the one single factor to explain how Japan has emerged as a major economic power within the past two decades, says a report in The Times, London.

The Times of India, 9.11.1975

مثال پیش کرتا ہے۔ ہماری زبان میں اختلاف اور ٹکراؤ کے مفہوم کو بتانے کے لئے درجنوں الفاظ ہیں — مگر ADJUSTMENT کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ نہیں۔

پچھلے دو سو برس سے ہندستانی مسلمانوں پر احتجاج اور ٹکراؤ کی سیاست اتنی زیادہ چھائی رہی ہے کہ اردو زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ ہی نہ بن سکا جس کو انگریزی میں ADJUSTMENT کہا جاتا ہے۔ "بازمانہ ستیز" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہمارے یہاں درجنوں الفاظ ہیں۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ ADJUSTMENT کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے ہمارے یہاں کوئی ایک لفظ بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان آج سب سے زیادہ لڑنے جھگڑنے والی قوم بن گئے ہیں۔ حالات سے ہم آہنگی کرتے ہوئے اپنا راستہ نکالنا جیسے ان کو آتا ہی نہیں۔ ان کی جنگ جویانہ تحریکوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انھیں خبر ہی نہیں کہ زندگی کا راز ایڈجسٹمنٹ میں ہے نہ کہ مقابلہ آرائی میں۔

اس صورت حال کے نتیجہ میں ایک عجیب مشکل یہ پیدا ہوئی ہے کہ کوئی خدا کا بندہ اگر یہ کہتا ہے کہ ملی مقاصد کے حصول کے لئے جو منصوبہ بناؤ، حالات سے ہم آہنگ ہو کر بناؤ تو یہ بات ان کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ اس قسم کی آواز حقیقۃً ایڈجسٹمنٹ کی آواز ہوتی ہے مگر سننے والے اس کو "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کے ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ کیوں کہ جن الفاظ سے وہ مانوس ہیں انھوں نے ان کو دو ہی مفہوم سے آشنا کیا ہے: زمانہ سے لڑنا یا ہوا کے رخ پر چلنا۔ ان دو کے علاوہ کسی تیسرے رویہ کو وہ جانتے ہی نہیں۔

• "الرسالہ" کو میں شوق سے پڑھتا ہوں مگر ہر پرچہ میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوتی ہے جو طرز تعبیر کی وجہ سے میرے ذوق پر کچھ بار ہوتی ہے اور اس میں کئی کئی جگہ کھٹک پیدا ہوتی ہے، مثلاً مئی کے پرچہ میں سرورق آپ کا ملفوظ "ہمارے تمام قائدین" کا انداز قائدین کو اپنی کوتاہی پر متوجہ نہیں کرسکتا البتہ آپ کی دوسری باتوں کی طرح اسے بھی ناقابل توجہ ضرور بنا دے گا، نعرے، پوسٹر، جلسے، کانفرنس، خطابت ان میں کتنی چیزیں جس کو آپ نے شجر ممنوعہ بنا رکھا ہے اور صحافت کو بھی شامل کرلیجئے۔ تو پھر یہ کہوں گا کہ آپ صحافت کے ذریعہ نعرہ لگائیں، پوسٹر نکالیں جلسے اور کانفرنسوں کی روداد لکھیں تو صحیح اور دوسرے لوگ بھی یہی کریں تو "کاٹھ کی ہنڈیا" ہو جائے، تازہ پرچہ کی یہ عبارت "دعوت دین" جو دراصل بندوں کے ساتھ خیر خواہی کا اظہار ہے وہ تحریر و تقریر........ وغیرہ۔ کیا خیر خواہی کے اظہار کے لئے تقریر و تحریر بھی نہ ہونی چاہئے آخر آپ کون سی آسمانی آواز کو استعمال کر رہے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے من قال هلك الناس هلك الناس فهو اهلكهم اور دوسری حدیث میں ہے کہ آدمی دوسروں میں عیب نکالتا رہتا ہے یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک عیب میں مبتلا کر اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے، جب آپ اس طرح کی بات لکھتے ہیں تو مجھے اس خیر خواہی کی بنا پر جو آپ کے ساتھ ہے ڈر لگنے لگتا ہے کہ آپ خود ان باتوں میں گرفتار نہ ہو جائیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو خود اپنے گھریلو ماحول سے بھی کچھ سبق ضرور حاصل کرنا چاہئے کیا "انبیا کی آواز" کا یہی نتیجہ ہوتا ہے، معاف کیجئے گا آپ حسن البنا وغیرہ کے بارے میں یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ لوگ شہادت کا تمغہ لے کر شاندار قبروں میں لیٹ گئے وہ بے چارے تو اب تک گور غریباں میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ تو زبانی (s) لکھ دیتے ہیں انھوں نے علاؤ (s) کے بعد A بھی لکھ دیا ہے۔

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

بہرحال میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ یہ انداز چھوڑ دیں اگر کسی آدمی پر آپ کو تنقید کرنی ہے تو بالکل نام لے کر دلیل سے لکھئے مگر عمومی نشتر زنی اچھی چیز نہیں ہے۔

ابھی ابھی جون کا پرچہ ملا ہے اس میں بہت سی عمدہ باتوں کے ساتھ بعض باتیں انتہائی قابل اعتراض ہیں۔ آپ امت میں اتفاق پیدا کرنا چاہتے ہیں مگر بات اختلاف کی کرتے ہیں۔ آپ ان فقہی مسلکی اور ذوقی اختلافات کو دور نہیں کرسکتے البتہ اس میں نقطۂ اعتدال پیدا کرسکتے ہیں اور پیار و محبت کے انداز سے یہی کرنا چاہئے۔ ممکن ہے کہ اس تیز اور غیر ادب شناس انداز سے آپ کے نفس کو اور کچھ آپ کے نادان مداحوں کو تسکین ہو سکتی ہو اور وہ اسے انبیاء کی آواز بتائیں مگر امت میں جو فکر آپ پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ اس سے نہیں پیدا ہوگا۔

جہاد اصغر اور جہاد اکبر میں جو توازن صحابہ کرام کی زندگی میں بھی تھا وہ بعد میں نہیں رہ گیا۔ کچھ لوگ جہاد اصغر یعنی امت کے وقتی اور ہنگامی کاموں میں پڑے رہے اور کچھ لوگ جہاد اکبر کی انتہا پر رہے اور آج تک ہیں۔

آپ کی تحریروں میں اعتدال ہونا چاہئے۔ آپ وعظ تو اعتدال کا کرتے ہیں مگر آپ جہاد اصغر کو بالکل شجر ممنوعہ قرار دینے کے درپے ہیں حتیٰ کہ اب "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا وعظ کہتے ہیں اور غلام احمد قادیانی کی تحریک کو سراہتے ہیں اور ایک زمانہ میں آپ لکھ چکے ہیں کہ ہندستان کو سمجھنے کے لئے سنگھ اور ساندرا کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایک طرف آپ دین میں سادگی کی بات کرتے ہیں اور فقہ اور فنی علوم پر تنقید کرتے ہیں مگر دوسری طرف موجودہ دور کے علوم کے حصول کو سب سے بڑا کام دین کا سمجھتے ہیں اور اسی پر اپنے پورے ماحول کے ساتھ کاربند ہیں۔ آپ دوسروں کو جو چاہیں لکھ دیں مگر خود اپنے بارے میں کوئی بات انتہائی گراں گزرتی ہے جس کا اظہار (ناقدین کے بارے میں) آپ نے پچھلے خط میں قسی القلب کے لفظ سے کیا ہے۔

قرآن وسنت کی روشنی میں محقق صوفیا نے جو "کورس" مقرر کیا وہ عوام کے لئے ہے خواص کے لئے نہیں ذکر میں شخصیت کے گھٹنے کی کیفیت اخص الخواص میں پیدا ہو سکتی ہے عوام کی ذہنی سطح کو اس پر لانا نہ تو آپ کے بس کی بات ہے نہ اور کسی کے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔

اس سے پہلے کے بزرگ اگر لفظی ورزش میں مبتلا تھے تو آپ قلمی ورزش میں مبتلا ہیں میں کہاں تک لکھوں اگر میرا بس چلتا تو آپ کی تحریروں کے ایک ایک ٹکڑے کے بارے میں لکھتا کہ آپ کو اپنی "صحیح بات" کہنے کے لئے انداز یہ اختیار کرنا چاہئے۔

شاید میرے خط سے آپ کو ناگواری ہو مگر میں آپ کا بدخواہ نہیں ہوں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ کی تحریریں مقبول ہوں اور خدا نے آپ کو جو صلاحیت دی ہے وہ پادر ہوا ہو کر نہ رہ جائے جیسا کہ ابوالکلام اور عنایت اللہ مشرقی وغیرہ کی تحریروں کے ساتھ ہو چکا ہے، میرا مقصد یہ ہے کہ امت کے سارے کاموں پر خط نسخ پھیرنے کے بجائے اس کے مفید پہلو سے کام لیا جائے۔

جب سے "الرسالہ" نکلا ہے اس میں آخرت طلبی کے بار بار اظہار کے باوجود مجھے انتہائی خودنمائی کا مظاہرہ نظر آتا ہے آخرت طلب انسان کی تواضع اور فنائیت نظر نہیں آتی۔

آپ یہ بات نوٹ کرلیں کہ دین سے محبت اور چیز ہے اور دین میں غلو اور چیز ہے۔ اس زمانہ میں سب سے بڑا غلو دو ہے ایک یہ کہ امت کے عام (عوام نہیں) آدمیوں کو انبیاء کے معیار پر رکھ کر ان کے حسن و قبح کا فیصلہ کیا جائے دوسرے ان کی خوبیوں سے کام لینے کے بجائے ان کو بالکل بونا ثابت کیا جائے۔

زبانی یا کاغذ کے اوپر فاران کی چوٹی جیسا وعظ کہنا آسان ہے مگر عملی طور پر آپ کوئی چھوٹا سا کام بھی کریں تو آپ کو معیاری اور روایتی فرق معلوم ہو جائے گا اور شاید لیڈری اور بزرگی کی دوکان لگانے والوں کی یہ کچھ اہمیت آپ کے ذہن میں بیٹھ جائے، میں بحث کرکے آپ کو منوا نہیں سکتا اور نہ ضرورت ہے اور دل سے غلاف اٹھانے کی صلاحیت بھی اپنے اندر نہیں پاتا۔

نئے مداحوں کے ہجوم میں میری یہ سخت تنقید آپ کو اچھی نہیں لگے گی مگر اتنا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں اور اپنی تلخ نوائی کی معافی مانگتے ہوئے اپنا خط ختم کرتا ہوں۔

(مولانا) مجیب اللہ ندوی۔ رشاد نگر۔ اعظم گڑھ

۲ رجب ۱۳۹۸ (۹ جون ۱۹۷۸)

جواب الرسالہ

۱۔ ہم تقریری مظاہروں کے خلاف ہیں نہ کہ نصیحت کے۔ ملت کے مسائل پر "احتجاجی کانفرنس" کرنا تقریری مظاہرہ ہے۔ جب کہ افراد قوم کے اندر تعمیری اور دینی مزاج پیدا کرنے کی کوشش کرنا نصیحت ہے۔

۲۔ عیب نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر اس کی شخصیت کو مجروح کیا جائے۔ الرسالہ میں اساسی امور پر تنقید ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی تنقید بلاشبہ غیر مطلوب ہے۔ جب کہ دوسری قسم کی تنقید عین مطلوب۔

۳۔ موجودہ زمانہ کی انقلابی تحریکوں پر ہماری تنقید یہ ہے کہ اسلامی تحریک کو عملاً انھوں نے سیاسی تحریک بنا دیا۔ اور اسلامی تحریک کی یہ تصویر یقیناً خدا کے دین میں اجنبی ہے۔

۴۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم سیاست کو شجر ممنوعہ قرار دیتے ہیں۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ اجتماعی استحکام سے پہلے عملی سیاست میں کودنا صرف طاقت کے ضیاع کے ہم معنی ہے۔

۵۔ قادیانی تحریک کو سراہنے کی بات سراسر خلاف واقعہ ہے۔ ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اپنے آغاز میں باعتبار طریق کار اس کے اندر ایک صحیح رہنمائی تھی۔ وہ یہ کہ انگریز سے سیاسی تصادم نہ کرتے ہوئے غیر مسلموں اور خود انگریزوں میں دعوتی کام کیا جائے۔ ہم کو نہیں معلوم کہ اس طریق کار (نہ کہ موجودہ قادیانیت) کی درستگی کے خلاف کون سی عقلی یا نقلی دلیل قائم کی جا سکتی ہے۔

۶۔ "موجودہ دور کے علوم کے حصول کو سب سے بڑا دینی کام"، ہم نے کب قرار دیا ہے۔ ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف یہ کہ وہ جدید دریافتیں جو اسلامی معتقدات کی تائید کرتی ہیں، ہم کو چاہئے کہ ہم انھیں جانیں اور ان کے ذریعہ اسلام کو مدلل کریں۔ دوسری چیز جس کو اپنانے پر ہم نے زور دیا ہے وہ عصری اسلوب کلام (سائنٹفک اسٹائل) ہے۔ سائنٹفک اسلوب سے مراد حقیقت نگاری کا اسلوب ہے، بمقابلہ خطیبانہ یا شاعرانہ یا بیانیہ اسلوب کے۔

۷۔ اسلامی تربیت میں عوام و خواص کی تقسیم بلاشبہ درست ہے۔ مگر اس تقسیم کو اسی حد تک محدود رہنا چاہئے جس کا نمونہ سنت رسول میں موجود ہے۔ بطور خود کسی کے لئے کوئی عبادتی طریقہ وضع کرنا بلاشبہ بدعت ہے خواہ وہ ایجاد ہو یا استنباط۔

۸۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی صحیح اسلامی طریقہ نہیں ہے کہ آدمی "شاعر اسلام" بن جائے اور ایسی تقریریں کرے جس سے ہر مذاق کے لوگ خوش رہیں۔ سچی بات کہہ کر غیر مقبول ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ عام پسند باتیں کہہ کر عوامی مقبولیت حاصل کی جائے۔

۹۔ الرسالہ کی تنقیدوں کو "نشتر زنی" کہنا انصاف کے خلاف ہے۔ الرسالہ میں ہمیشہ علمی اسلوب میں مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ نشتر زنی کو ہم کمینہ پن سمجھتے ہیں جب کہ تجزیاتی تنقید اعلیٰ ترین دینی و ملی ضرورت ہے۔

۱۰۔ "تسکین نفس" اور "انتہائی خود نمائی کا مظاہرہ" وغیرہ کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حدود تنقید سے باہر قدم رکھنا ہے۔ یہ نیت کو زیر بحث لانے کی بات ہے جس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ آدمی صرف یہ کر سکتا ہے کہ خارجی حقائق کو دیکھے اور دلیل کی زبان

میں ان کا تجزیہ کرے۔

۱۱۔ آپ نے راقم الحروف کے "گھریلو ماحول" پر بھی اعتراض کیا ہے۔ اگرچہ متعین طور پر آپ نے نہیں بتایا کہ وہ کیا چیز ہے جو آپ کے نزدیک قابل اعتراض ہے۔ تاہم میں آپ کو یا کسی بھی مرد یا عورت کو یہ حق دیتا ہوں کہ وہ میرے گھر میں آکر ایک مہینہ یا اس سے زیادہ مدت تک قیام کرے اور دیکھے کہ میں اور میرے گھر کے لوگ کس طرح رہتے ہیں۔ جو دین میں نے قرآن و حدیث میں پڑھا ہے اس کے مطابق میں اس کو حرام سمجھتا ہوں کہ قطعی معلومات کے بغیر کسی کو اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں متہم کیا جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جو شخص اس قسم کی ذمہ داری لینا چاہتا ہے وہ اس سے پہلے اس کی براہ راست تحقیق بھی کرے۔

تعارف و تبصرہ

آسان قرآن (مترجم)

ناشر: ورلڈ قرآن سوسائٹی

۱۸ پیلا تالاب، رام پور (یوپی)

مذکورہ ادارہ ایک نان کمرشیل ادارہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ "قرآن کا ترجمہ مختلف قوموں کی زبان میں شائع کیا جائے۔ اور اس کام سے کوئی دنیوی فائدہ پیش نظر نہ ہو۔ مزید یہ کہ قرآن کا ترجمہ آسان زبان میں ہو۔ ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ آسان ہوتے ہوئے اصل کا اثر قائم رکھے"۔ زیر نظر "آسان قرآن" اسی کوشش کا پہلا جزء ہے۔ ادارہ کا منصوبہ یہ ہے کہ اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی اور دنیا کی دوسری زبانوں میں اسی طرح سادہ اور آسان ترجمے شائع کئے جائیں۔ ترتیب یہ ہے کہ دائیں صفحہ پر متن ہے اور بائیں صفحہ پر ترجمہ

اس میں شک نہیں کہ زیر نظر ترجمہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے، وہ سادہ بھی ہے اور موثر بھی۔ زیر نظر حصہ پانچ پاروں کے ترجمہ پر مشتمل ہے۔ اسی طرح بقیہ حصے شائع کئے جائیں گے۔ تبصرہ نگار کے لئے اس تجویز سے اتفاق مشکل معلوم ہوتا ہے۔ غالباً زیادہ بہتر صورت یہ ہوتی کہ پورا قرآن ایک ہی جلد کی صورت میں شائع کیا جاتا۔ کتابت کو کم جلی کر کے ضخامت گھٹائی جا سکتی ہے۔ عمدہ کتابت کے ساتھ باریک کاغذ پر ایک جلد کی صورت میں اگر اس کو شائع کیا جائے تو موجودہ صورت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مفید ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ اس پر مترجم کا نام درج نہیں ہے۔ ذاتی طور پر مجھے معلوم ہے کہ یہ ترجمہ مولانا محمد فاروق خاں ایم اے نے کیا ہے، موصوف اس سے پہلے قرآن کا ہندی زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ متعدد علمی و دینی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اگر ان کا نام ترجمہ میں دے دیا جائے تو یہ یقیناً اس کے استناد میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

اسلام میں حلال و حرام

صفحات: ۳۳۲   قیمت پندرہ روپے

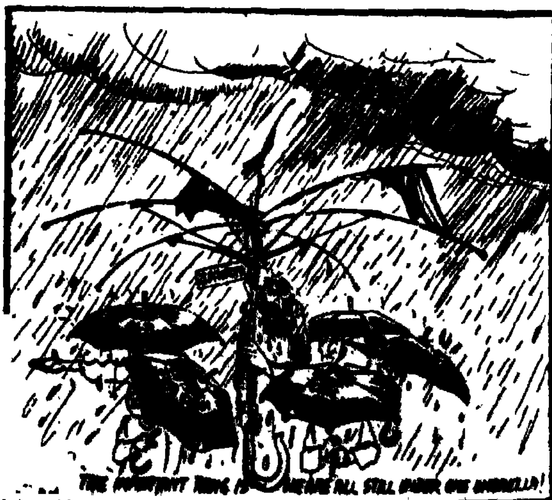
پتہ: الدار السلفیہ، حامد بلڈنگ، مومن پورہ
مولانا آزاد روڈ، بمبئی ۱۱

مشہور عرب عالم یوسف قرضاوی کی کتاب ہے جس کا نام ہے الحلال والحرام فی الاسلام۔ زیر نظر کتاب اس کا اردو ترجمہ ہے جو مولانا شمس پیرزادہ نے کیا ہے۔ کتاب اپنے موضوع پر نہایت جامع اور تحقیقی ہے۔

خدا کی خدائی کا کم تر اندازہ

بعض اسلامی حلقے اپنے افراد کو منع کر رہے ہیں کہ وہ الرسالہ کا مطالعہ نہ کریں۔ ایسا کرکے وہ دراصل اس بات کا اقرار کر رہے ہیں کہ الرسالہ کے دلائل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔ ان لوگوں کا تصورِ خدا بھی کیسا عجیب ہوگا جو اپنے اندر اس بات کی ہمت پاتے ہوں کہ وہ عالم الغیب کا سامنا اِس حال میں کریں کہ انھوں نے ایک ایسے دین کو پکڑ رکھا تھا جس کی بابت انھیں خود یہ شبہ تھا کہ کتاب و سنت کے کافی دلائل اس کے حق میں موجود نہیں ہیں اور اُس پیغام کی طرف سے انھوں نے آنکھیں بند کرلیں جو واضح دلائل کے ساتھ اُن کے سامنے آیا تھا۔ ایسے واضح دلائل جن کی بابت وہ محسوس کرتے تھے کہ اگر انھوں نے ان کو اپنے ذہن میں داخل ہونے دیا تو وہ اُن کے "عقائد" کو متزلزل کر دیں گے۔ اس قسم کے لوگوں کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ خدا کی خدائی کا حیرت ناک حد تک کمتر اندازہ کر رہے ہیں۔

۱۹۷۷ میں ہندستان میں مختلف سیاسی پارٹیوں نے مل کر جنتا پارٹی بنائی۔ اسی زمانہ میں پاکستان میں نو سیاسی پارٹیوں نے مل کر "پاکستان قومی اتحاد" قائم کیا۔ اول الذکر کا مقصد مسز اندرا گاندھی کو اقتدار سے ہٹانا تھا اور ثانی الذکر کا مقصد مسٹر بھٹو کو۔ جب تک اپنے سیاسی حریف کو "ہٹانے" کا سوال تھا، دونوں ملکوں کی جماعتیں باہم متحد رہیں۔ مگر جب یہ مرحلہ طے ہوگیا تو اب دونوں ملکوں کا سیاسی اتحاد، اختلاف و انتشار کا شکار ہو رہا ہے ——— منفی نعرہ انھیں متحد کر سکتا تھا۔ مگر مثبت مقصد ان کو متحد کرنے میں ناکام رہا۔



مختلف سیاسی چھتریوں کے ملنے سے اتحاد کی جو بڑی چھتری بنی تھی وہ پارہ پارہ ہو رہی ہے کیوں کہ ہر ایک اپنی اپنی چھتری کو الگ کرکے اس کے سایہ میں کھڑا ہونا چاہتا ہے۔

عورت اور مرد کا فرق

حیاتیاتی بناوٹ میں فرق

کا نتیجہ ہے

نہ کہ محض سماجی اسباب کا

Why Women Are Second-Rate

AS an ardent supporter of equal opportunities for women I am constantly nagged by doubts about their creative ability How is it that women have produced so few writers, poets, composers, artists of top calibre? How is it that even in professions which are traditionally regarded as theirs, e g cooking and dress-designing, men beat them to the second place All the famous chefs and dressmakers (even women's wear) are men Hitherto I had accepted the sociologist's point of view that it was tradition and environment that militated against them Somehow the sociological answer did not carry total conviction and I felt there was more than environment and lack of opportunity behind women's second-ratedness

Professor H J Eysenck who invented the Intelligence Quotient (I Q) tests and pronounced that the black and brown races had a lower I.Q. than the white has now proclaimed the same about women. Their genes make them what they are, from the time of conception their feminineness is programmed as in a computer It is not, as sociologists maintain, tradition or environment which makes a female child to play with dolls while her brother plays with toy soldiers but her biological constitution. Even within the womb, the female develops a broader pelvis than the male The broader the pelvis, the more feminine will its possessor be, says Eysenck. Males with broad pelvises tend to be feminine, passive, even homosexual Females with narrow pelvises tend to be masculine, aggressive, even lesbian. Random sampling amongst your own acquaintances will confirm some of Eysenck's postulates.

Eysenck had earlier brought the wrath of the champions of racial equality on his head. Now women libbers are out for his scalp with their rolling pins.

The Illustrated Weekly of India
April 2, 1978

عورتوں کو مساوی مواقع دیئے جانے کے ایک پرجوش حامی کی حیثیت سے میں مسلسل طور پر ان کی تخلیقی صلاحیت کے بارے میں شبہ کا شکار رہا ہوں ۔ ایسا کیوں ہے کہ عورتوں نے اعلیٰ درجہ کے ادیب، شاعر، آرٹسٹ اتنی کم تعداد میں پیدا کیے ۔ ایسا کیوں ہے کہ ان شعبوں میں بھی جو روایتی طور پر عورتوں کے شعبے سمجھے جاتے ہیں، مثلاً طباخی اور لباس سازی، وہ مردوں کے مقابلہ میں دوسرے درجہ پر ہیں ۔ تمام مشہور طباخ اور لباس ساز (حتی کہ عورتوں کے لباس کے بھی) مرد ہی ہیں ۔

اب تک میں سماجی علماء کے اس نقطۂ نظر کو مانتا رہا ہوں کہ یہ روایت اور ماحول ہے جس نے ان کے خلاف کام کیا ہے ۔ مگر سماجی توجیہہ سے مجھے پورا اطمینان نہ ہو سکا ۔ میں محسوس کرتا رہا کہ ماحول یا مواقع کے فقدان کے علاوہ بھی کچھ اسباب ہیں جنھوں نے عورتوں کو مردوں سے پیچھے کر رکھا ہے ۔

پروفیسر آئی سنک جنھوں نے ذہانت کا حسابی پیمانہ ایجاد کیا ہے، اور جن کا کہنا ہے کہ کالے اور سانولے رنگ کی نسلیں، سفید فام نسلوں کے مقابلہ میں کم تر ذہانت رکھتی ہیں، اب انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہی بات عورتوں کے لئے بھی صحیح ہے ۔ ان کے جین دراصل ان کو بناتے ہیں ۔ حمل کے وقت ہی سے ان کا زنانہ پن اسی طرح متعین اور مقرر ہوتا ہے جس طرح کسی کمپیوٹر میں ۔ علمائے سماجیات کے دعوی کے برعکس، یہ روایت اور ماحول کا اثر نہیں ہے کہ ایک چھوٹی بچی گڑیوں کے کھیلنے کا شوق رکھتی ہے اور ایک چھوٹا بچہ سپاہی کی صورت والے کھلونے سے کھیلتا ہے ۔ یہ حیاتیاتی بناوٹ کا اثر ہے ۔ حتی کہ ایک لڑکی جب کہ ابھی وہ رحم مادر میں ہوتی ہے وہ لڑکے کے مقابلہ میں زیادہ کشادہ پیڑو بنالے

گئی ہے۔ پیڑو جتنا زیادہ کشادہ ہوگا، اتنا ہی اس میں زنانہ پن زیادہ ہوگا۔ یہ بھی پایا گیا ہے کہ جن مردوں کے پیڑو چوڑے ہوتے ہیں ان میں زنانہ پن، انفعالیت، حتیٰ کہ ہم جنسی کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح جن عورتوں کے پیڑو کم چوڑے ہوتے ہیں ان میں مردانہ اوصاف جارحیت اور ہم جنسی کے رجحانات ہوتے ہیں۔ یہ تجربات اتنے قطعی ہیں کہ کوئی بھی شخص اپنے قریبی لوگوں کا جائزہ لے کر ان کی تصدیق کر سکتا ہے۔

آئی سنگ اس سے پہلے نسلی مساوات کے حامیوں کا نشانۂ تنقید رہا ہے۔ اب مساوات نسواں کے حامیوں نے بھی اس کے خلاف قلم اٹھایا ہے اور اس پر سخت تنقیدیں کی جا رہی ہیں ——— خشونت سنگھ

موت کے دوسری طرف

ہر شخص پر وہ دن آنے والا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو موت کے دروازہ پر کھڑا ہوا پائے گا۔ اس کے پیچھے وہ دنیا ہوگی جس کو وہ چھوڑ چکا۔ جس میں اب وہ واپس نہیں جا سکتا۔ اور سامنے وہ عالم ہوگا جس میں اب اسے داخل ہونا ہے۔ جس میں داخلہ سے وہ اپنے آپ کو روک نہیں سکتا۔

یہ فیصلہ کن روز ہر آدمی کی طرف دوڑا چلا آ رہا ہے۔ اس دن حیرت انگیز طور پر آدمی دیکھے گا کہ وہ اپنی اصل صورت میں بے نقاب کر دیا گیا ہے۔

قیامت کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ (جب پنڈلی کھولی جائے گی) عوفی نے اس آیت کی تشریح میں عبداللہ بن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے: حین یکشف الامر و تبدو الاعمال (ابن کثیر) جب معاملہ کھل جائے گا اور اعمال ظاہر ہو جائیں گے۔ دنیا میں ہر آدمی اپنے آپ کو ایک مصنوعی خول میں چھپائے ہوئے ہے۔ وہ اپنے ہر عمل کے اوپر خوبصورت الفاظ کا ایک پردہ ڈال لیتا ہے۔ آخرت میں یہ چیزیں ہٹ جائیں گی۔ ہر آدمی اپنی حقیقی صورت میں سامنے آ جائے گا۔

دنیا میں یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی جو حقیقۃً خود پرست ہو وہ اپنے کو خدا پرست ظاہر کرے۔ اس کو اپنے جاہ و مرتبہ سے دلچسپی ہو مگر دنیا کے سامنے وہ اپنے کو اس انداز میں پیش کرے، گویا وہ حق کا علم بردار ہے، ذاتی مصلحتیں اور ذاتی مفادات اس کی سرگرمیوں کا مرکز و محور ہوں مگر اپنی تقریر و تحریر سے وہ لوگوں پر ایسا جادو کرے کہ لوگ اس کو مجاہد اعظم سمجھنے لگیں۔

مگر موت انسانی زندگی کا وہ واقعہ ہے جو اس قسم کی تمام چیزوں کو باطل کر دیتا ہے۔ موت کے بعد آدمی جس دنیا میں پہنچتا ہے، وہاں اچانک اس قسم کے تمام لبادے اس کے اوپر سے اتر جاتے ہیں۔ وہ اپنی حقیقی اور اصلی صورت میں سامنے آ جاتا ہے، اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی۔

تین ڈالر کے سو ڈالر

ایک بیرل تیل جو خلیج فارس میں تین ڈالر کا خریدا جاتا ہے۔ وہ یورپ میں صارف کو ۴۵ ڈالر میں بیچا جاتا ہے اور کیمیائی مصنوعات کی صورت اختیار کرنے کے بعد اس کی قیمت سو ڈالر تک پہنچ جاتی ہے۔

اسلام کے خلاف جدید شبہات کو ڈھا دینے والی کتاب

مذہب اور جدید چیلنج

"علم جدید کا چیلنج" مولانا وحید الدین خاں کی مشہور کتاب ہے۔ "مذہب اور جدید چیلنج" اسی کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۷ میں اردو میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد عربی اور ترکی زبانوں میں اس کے درجن سے اوپر ایڈیشن شائع ہوئے۔ تمام عالم اسلام میں اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ۹ فروری ۱۹۷۶ کو مولانا وحید الدین خاں طرابلس میں صدر قذافی سے ملے تو لیبی لیڈر نے فوراً کہا: لقد قرأت كتابك الاسلام يتحدى (میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی پڑھ لی ہے)۔

الامام الاکبر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود (جامعہ ازہر قاہرہ) نومبر ۱۹۷۵ میں ہندستان آئے۔ انھوں نے جامعہ ڈابھیل سورت میں تقریر کرتے ہوئے علماء سے کہا کہ آپ لوگ الاسلام یتحدی کا مطالعہ کیجئے۔ جس میں اسلام کے خلاف جدید شبہات کا کافی و شافی رد موجود ہے۔

قاہرہ کے روزنامہ الاہرام نے اس کتاب کے عربی ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"مصنف کتاب نے اسلام کے مطالعہ کا ایک ایسا علمی انداز اختیار کیا ہے جو بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ جدید مادی فکر کے مقابلہ میں دین کو وہ اسی طرز استدلال سے ثابت کرتے ہیں جس سے منکرین مذہب اپنے نظریات کو ثابت کرتے ہیں ۔۔۔ اسلام کے ظہور سے لے کر اب تک چودہ سو سالوں میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر تاریخ کو چھانا جائے اور اللہ کی طرف بلانے والی عمدہ کتابوں کو چھلنی سے چھان کر نکالا جائے تو کتاب الاسلام یتحدی بلاشک و شبہ ان میں سے ایک ہوگی۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مصنف کتاب کے عمل کو قبول فرمائے۔ ان کے دل کو نور سے، ان کی عقل کو معرفت سے اور ان کی روح کو رضا سے بھر دے اور اللہ کے قلم کو ایسی روشنائی عطا کرے جو لکھنے سے کبھی ختم نہ ہو۔"

قیمت: تیرہ روپے پچاس پیسے

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

دین کیا ہے

از

مولانا وحید الدین خاں

قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے
سال اشاعت ۱۹۷۸

مکتبہ الرسالہ
جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

فہرست

دین کیا ہے

دین کے معنی ہیں ذلیل ہونا، فرماں برداری کرنا۔ قومٌ دینٌ: فرماں بردار لوگ۔ حدیث میں ہے۔ الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت (عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کو زیر کرے اور موت کے بعد کے لئے کرے) دین اسلام سے مراد زندگی گزارنے کا وہ طریقہ ہے جس میں آدمی اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکائے ہوئے؛ وہ خدا کا ایسا تابعدار بن جائے کہ اس کے جذبات و احساسات تک خدا کے آگے بچھ جائیں۔ نفسیاتی سطح پر دین جس چیز کا نام ہے، مندرجہ ذیل آیت اس کی مکمل تفسیر پیش کر رہی ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ
الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ فَاِذَا
رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ
فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ
اٰتَيْنٰهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ

عنکبوت ۶۴-۶۶

دنیا کی زندگی تو کھیل تماشا ہے اور اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اگر وہ اس کو جانیں۔ پھر جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو وہ اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کرکے اس کو پکارنے لگتے ہیں اور جب وہ ان کو بچا کر خشکی پر لاتا ہے تو فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں۔ تاکہ اللہ کے دیئے ہوئے پر کفر کریں اور فائدہ اٹھائیں عنقریب وہ جان لیں گے۔

جب آدمی کی کشتی سمندر میں ہوتی ہے اور موجوں کے درمیان گھر جاتی ہے۔ آدمی اپنے آپ کو بالکل بے یار و مددگار محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وجود مکمل طور پر خدا کے اوپر منحصر ہے۔ اپنی بے بسی کے سوا اس وقت اس کو کچھ یاد نہیں رہتا، وہ دل و جان سے خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اپنے پورے وجود کے ساتھ وہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ مگر جب وہ سمندر کی لہروں سے بچ کر نکل آتا ہے اور خشکی پر پہنچ جاتا ہے تو اس کا حال بالکل دوسرا ہو جاتا ہے۔ اب وہ دنیوی چیزوں میں گم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی عاجزانہ حیثیت کو بھول جاتا ہے۔ اور کبر و انانیت کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ خدا اور آخرت کے بجائے دنیا اور دنیا کے مشاغل اس کی دلچسپی کا مرکز بن جاتے ہیں —— پہلی حالت دین داری کی حقیقت کو بتا رہی ہے اور دوسری حالت بے دینی کی حقیقت کو۔ گویا دین یہ ہے کہ آدمی کا نفسیاتی وجود پوری طرح خدا کے آگے جھک گیا ہو۔ وہ خدا کو اپنا سب کچھ سمجھنے لگا ہو۔ اس کے مقابلہ میں بے دینی یہ ہے کہ آدمی کے اندر ڈھٹائی ہو۔ آج کی دنیا میں گم ہو کر وہ کل کی دنیا کو بھول جائے۔
دین کی اس حقیقت کو مزید واضح کرنے کے لئے یہاں قرآن کے چند حوالے درج کئے جاتے ہیں:

(یوسف نے کہا) میں نے ان لوگوں کا دین چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا دین اختیار کیا ہے۔ ہمارے لئے روا نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھیرائیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر۔ مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے قیدخانے کے

بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا اللہ اکیلا زبردست ۔ اللہ کو چھوڑ کر تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ تو بس نام ہیں کہ تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں ۔ اللہ نے ان کی کوئی سند نہیں اتاری ۔ حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہے ۔ اس نے فرمادیا ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی عبادت نہ کرو ۔ یہی درست دین ہے ۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ۔ (یوسف)

اور اہل کتاب واضح بیان آنے کے بعد متفرق ہو گئے ۔ حالاں کہ ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں اسی کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے ، بالکل یک سو ہو کر ۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں ۔ اور یہی ہے درست دین ۔ (بینہ ۵ ـ ۴)

تم سیدھا رکھو اپنا منھ دین کی طرف یک سو ہو کر ۔ وہی فطرت اللہ کی جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے ۔ بدلنا نہیں اللہ کے بنائے ہوئے کو ۔ یہی ہے درست دین ۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ۔ اللہ کی طرف رجوع ہو کر اس سے ڈرتے رہو ۔ اور نماز قائم کرو اور شرک کرنے والوں میں نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرلیا اور گروہ ہو ہیں بٹ گئے ۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے (روم ۳۲ ـ ۳۰)

ان آیات کے مطابق دین نام ہے اللہ کو دل سے ماننے کا ، ہر قسم کے شرک سے بچنے کا ، آخرت کو اپنی منزل مقصود بنانے کا ، اللہ کا شکر گزار بن جانے کا ، اللہ کو سارے اختیارات کا مالک جاننے کا ، صرف اسی کی عبادت کرنے کا ، نماز روزہ کی ادائگی کا ، خدا کی طرف یکسو ہونے کا ، فرقہ بندیوں سے بچنے کا ، اپنے خود ساختہ دین پر مگن رہنے کے بجائے اللہ اور رسول کے دین کو پکڑنے کا ۔ ان کیفیات و اعمال کے ساتھ جو زندگی بنے ، وہی سچی دینی زندگی ہے اور مختلف معاملات میں ان کیفیات و اعمال سے مطابقت رکھنے والا جو رویہ ابھرے وہی دینی رویہ ہے ۔ گویا دین یہ ہے کہ آدمی مکمل طور پر خدا کا ہو جائے ۔ اس کے سوا کوئی اور چیز اس کی عقیدت اور اعتماد کا مرکز نہ رہے ۔

ارکان خمسہ

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ دین اسلام کے ارکان پانچ ہیں : کلمہ توحید ، نماز ، روزہ ، زکوٰۃ اور حج ۔

دین میں داخلہ جہاں سے شروع ہوتا ہے ، وہ کلمہ کا اقرار ہے : لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔ اس کلمہ میں دو باتیں ہیں ۔ اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ۔ یعنی خدائی کی تمام اوصاف کے ساتھ اللہ ہی کو خدا ماننا ۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا وہ مستند نمائندہ ماننا جس سے حقیقت کی معرفت اور خدا کی مرضیات کا علم حاصل ہوتا ہے ۔ یہ کلمہ کوئی لفظی منتر نہیں ہے جس کا صرف لسانی تلفظ کرلینا کافی ہو ۔ یہ ایک سنجیدہ فیصلہ کا اعلان ہے ۔ یہ ایک طرف اپنے آقا (خدا) اور دوسری طرف اپنے رہنما (رسول) کو پالینے کا اظہار ہے ۔ یہ پوری زندگی کا عہد نامہ ہے جو بندہ اپنے خدا کو گواہ بنا کر کرتا ہے ۔ اسی لئے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک ایمان وہی ہے جو داخل القلب ایمان (حجرات) ہو ۔ محض زبان سے ان الفاظ کو بول دینا خدا کے یہاں معتبر نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں بہت سی ایسی چیزوں کو

" ایمان " میں شمار کیا گیا ہے جن کا تعلق بظاہر عمل سے ہے۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو۔" کلمہ کا اقرار اگر ایک سنجیدہ فیصلہ کے طور پر ظہور میں آئے تو وہ آدمی کی پوری زندگی میں رد رح بن کر شامل ہو جائے گا۔ بصورت دیگر اس کی حیثیت ایک ایسے لفظی ضمیمہ کی ہوگی جس کا آدمی کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

اس اقرار کے بعد سب سے پہلا فریضہ نماز ہے۔ نماز اسلام کی سب سے اہم عبادت ہے۔ اللہ نے اپنے بندوں پر روزانہ پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں۔ ہر نماز سے پہلے ہاتھ منھ اور پاؤں دھوئے جاتے ہیں جس کو وضو کہتے ہیں۔ نماز میں مختلف آداب اور کلمات اور دعاؤں کو ادا کرتے ہوئے بندہ اپنے مالک کے آگے جھکتا ہے۔ حتٰی کہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے۔ وہ خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنے چھوٹے ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ اپنی بندگی کے تعلق کو جوڑتا ہے۔ قیام اور رکوع اور سجدہ گویا خدا کے سامنے اپنی بندگی کا عملی اعتراف ہے۔ اس طرح بندہ اپنے آپ کو اس مقام عبدیت پر لے جاتا ہے جہاں اس کا خدا اس سے ملاقات کر سکے۔ بندہ اپنے رب کو عجز کی سطح پر پاتا ہے نہ کہ کبر اور انانیت کی سطح پر۔

روزہ سال میں ایک مہینہ کے لئے ماہ رمضان میں فرض کیا گیا ہے۔ روزہ کا وقت ابتدائے سحر سے شروع ہوتا ہے اور سورج ڈوبنے تک رہتا ہے۔ اس دوران میں کھانا پینا مطلق چھوڑ دیا جاتا ہے۔ قرآن کے مطابق روزہ اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ بندہ کے اندر تقویٰ اور شکر (بقرہ) کی کیفیت پیدا ہو۔ کھانا اور پانی آدمی کی سب سے بڑی ضرورتیں ہیں۔ جب پیاس سے آدمی کا حلق سوکھ جاتا ہے۔ جب بھوک سے آدمی کا سینہ کھرچنے لگتا ہے اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنا کمزور ہے اور خدا کی مدد کا کتنا زیادہ محتاج ہے۔ یہ تجربہ اس کو اللہ کی عظمت اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کا احساس دلاتا ہے جو کہ تقویٰ کا حاصل ہے۔ پھر شام کو جب وہ کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے تو وہ اس بات کا تجربہ کرتا ہے کہ اس کے خدا نے کتنی مکمل صورت میں اس کی ضرورتوں کا انتظام کر رکھا ہے۔ اس کا دل احسان مندی کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ اس کی زبان پر حمد اور شکر کے کلمات جاری ہو جاتے ہیں۔

زکوٰۃ مال اور پیداوار میں خدا کا حق ہے۔ ہم دنیا میں جو کچھ کماتے ہیں خواہ وہ مویشی اور زمین کے ذریعہ ہو یا کارخانہ اور دکان کے ذریعہ یا ملازمت اور مزدوری کے ذریعہ، اس میں "ہمارا" حصہ بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ ہمارے اندرونی نظام سے لے کر کائنات تک بے شمار اسباب جب ہماری موافقت میں اکٹھا ہوتے ہیں تب ہم کوئی کمائی کر پاتے ہیں۔ یہ اسباب براہ راست مالک ارض و سما کی طرف سے فراہم کئے جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ سال کے آخر میں جب ہم اپنی کمائیوں کا حساب کریں تو اس کا ایک حصہ خدا کی راہ میں نکال کر اس واقعہ کا اعتراف کریں کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ملا ہے۔ اگر وہ ہماری مدد پر نہ ہوتا تو ہم کسی قسم کی کوئی کمائی نہیں کر سکتے تھے۔ زکوٰۃ یا انفاق دراصل تعلق کی اس اعلیٰ کیفیت کا مظہر ہے جب کہ بندہ بے قرار ہو کر چاہنے لگتا ہے کہ اپنے آقا کے سامنے اپنے آپ کو خالی کر دے۔

اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ اہل ایمان جب کسی کو دے رہے ہوتے ہیں تو ان کی زبان حال پکار رہی ہوتی ہے: ہم تم سے کوئی بدلہ یا شکرانہ نہیں چاہتے۔ یہ تو ہم صرف اللہ کے لئے خرچ کر رہے ہیں۔ (انسان ۹)

حج ایک سالانہ عبادت ہے جو کسی شخص پر زندگی میں ایک بار کے لئے فرض ہے۔ یہ فرض بھی اس وقت ہے جب کہ وہ اپنے مقام سے سفر کرکے حجاز جانے اور وہاں سے واپس آنے پر قادر ہو۔ اور اس کے مواقع رکھتا ہو۔ بصورت دیگر اس پر حج فرض نہ ہوگا۔ حج کے مقامات وہ مقامات ہیں جہاں اسلام کی تاریخ بنی ہے۔ وہاں وہ جگہیں ہیں جہاں پیغمبروں نے خدا کی عبادت کی ہے۔ جہاں ان کی قربانیوں کی یادگاریں ہیں، جہاں سے شرک کو دائمی طور پر خارج کر دیا گیا ہے۔ وہ واحد مقام ہے جہاں تاریخ انسانی میں پہلی بار یہ واقعہ ہوا کہ لادینیت کو مغلوب کرکے دین کو قیامت تک کے لئے غالب کر دیا گیا۔ ان آثار سے بھرے ہوئے جغرافیہ کو اس بات کے لئے منتخب کیا گیا ہے کہ ساری دنیا کے اہل اسلام ہر سال یہاں جمع ہوں اور سب مل کر اللہ کی عبادت کریں۔ اسلامی اتحاد کا سبق لیں۔ وہاں کی فضاؤں سے نیا ایمانی عزم اور نیا دینی شوق لے کر اپنے وطن کو لوٹیں۔ حج بتاتا ہے کہ کس طرح سارے انسانوں کو اللہ کے گرد جمع ہو جانا چاہئے۔

روزمرّہ کی زندگی میں

مذکورہ پانچ ارکان قرآن کے الفاظ میں دین کے معلوم اور موقت ارکان ہیں۔ مگر جب ایک شخص کی زندگی میں دین شامل ہوتا ہے تو وہ صرف متعین اوقات کے اعمال تک محدود نہیں رہتا وہ اس کی پوری زندگی میں رچ بس جاتا ہے۔ اس کے ہر رویہ سے اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ قرآن وحدیث سے اس سلسلے میں جو چیزیں معلوم ہوتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

پہلی چیز ذکر ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے رہو (آل عمران ۱۹۱) حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ تمہاری زبان کو ہر وقت ذکر الٰہی میں تر رہنا چاہئے (لایزال لسانک رطبا من ذکر اللہ)۔

ذکر کے معنی یاد کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے خوف اور محبت کا تعلق اتنا بڑھا ہوا ہونا چاہئے کہ آدمی کو ہر وقت اس کی یاد آتی رہے۔ یہ ذکر وہ روحانی تار ہے جس کے ذریعہ سے کوئی بندہ اپنے رب سے دائمی ربط (CONSTANT TOUCH) میں رہتا ہے۔ کبھی دنیا میں اللہ کی کاریگری کو دیکھ کر وہ اللہ کی قدرت و کبریائی کا اعتراف کرتا ہے۔ کبھی اللہ کے احسانات کو یاد کرکے اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ کبھی قیامت کی باز پرس کا خوف اس کو تڑپاتا ہے اور وہ اللہ سے بخشش طلب کرنے لگتا ہے۔ کبھی اپنے عجز کا احساس اس کو ابھارتا ہے کہ وہ اللہ سے رحمت و نصرت کی درخواست کرے۔ غرض اس کے حساس قلب میں ہر آن کوئی نہ کوئی ایسی شورش برپا رہتی ہے جو اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے اپنے رب کو پکارتا ہے۔ (اعراف ۲۰۵)

اس ذکر کا نہ کوئی نصاب ہے۔ نہ اس کے الفاظ مقرر ہیں اور نہ اس کی کوئی لگی بندھی صورت ہے۔ یہ تو خدا کی اُس آفاقی دنیا میں غوطہ لگانا ہے جہاں تمام تعینات ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر اس کو متعین شکلوں میں محدود کس طرح

کیا جا سکتا ہے ——— اللہ کو یاد کرتے ہوئے قرآن میں تدبر کرتے ہوئے۔ کائنات میں غور کرتے ہوئے، اپنا احتساب کرتے ہوئے، موت اور آخرت کو سوچتے ہوئے بار بار مومن کا جی بھر آتا ہے اور کبھی دل میں اور کبھی زبان سے اس کے اثرات ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ الفاظ بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور اللہ کی یاد گرم گرم آنسوؤں کی صورت میں اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑتی ہے۔ یہ ہے ذکر اور یہ ذکر قرآن کے مطابق سب سے بڑی عبادت ہے (عنکبوت ۴۵)

دوسری چیز نصح (خیر خواہی) ہے۔ اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدین النصیحۃ (دین خیر خواہی کا نام ہے) مومن ہر قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے دل میں دوسرے انسانوں کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ نفرت، بغض، حسد، کینہ اور انتقام سے اس کا سینہ خالی ہوتا ہے۔ وہ ہوا کی مانند ہوتا ہے جو سب کے درمیان سے ٹکرائے بغیر گزر جاتی ہے۔ وہ سورج کی مانند ہوتا ہے جو کسی امتیاز کے بغیر ہر ایک کے اوپر چمکتا ہے۔ وہ چڑیوں کی مانند ہوتا ہے جن کے دل میں کسی کے خلاف غصہ اور انتقام نہیں ہوتا۔ مومن خدا کا وہ بندہ ہے جو اپنے کو خدا سے ملالے۔ وہ بندوں کو اس نظر سے دیکھنے لگتا ہے جس نظر سے لوگوں کا خالق انھیں دیکھ رہا ہے۔ ایسا شخص، حدیث کے الفاظ میں، اخلاق خداوندی کا پیکر بن جاتا ہے جس کو اپنے تمام بندوں سے یکساں پیار ہے نہ کہ شیطانی اخلاقیات کا جس کو صرف "اپنے لوگوں" سے دل چسپی ہوتی ہے۔ بقیہ انسانوں کے لئے اس کے پاس نفرت اور عداوت کے سوا اور کچھ نہیں۔

تیسری چیز قسط (انصاف) ہے۔ یعنی دوسروں کے ساتھ تعلقات اور معاملات میں ہمیشہ عدل وانصاف پر قائم رہنا۔ قرآن میں مسلمانوں کو انصاف کا حکم دیا گیا ہے (اعراف ۲۹) نیز فرمایا گیا کہ تم لوگ انصاف پر خوب قائم رہنے والے بنو (نساء ۱۳۵)۔ جو چیزیں آدمی کو انصاف کے راستہ سے ہٹاتی ہیں، ان کی نشان دہی کر کے تاکید کی گئی ہے کہ تم لوگ کسی حال میں انصاف سے نہ ہٹو۔ آدمی تعلقات کے پاس و لحاظ میں انصاف سے ہٹ جاتا ہے۔ فرمایا کہ قرابت داری کا معاملہ ہو تب بھی عدل وانصاف پر قائم رہو (انعام ۱۵۲) ذاتی مفادات و خواہشات کبھی آدمی کو انصاف سے ہٹا دیتی ہیں۔ فرمایا کہ خواہش نفس کا تقاضا ہو تب بھی انصاف کی روش کو نہ چھوڑو (نساء ۱۳۵)۔ بغض اور نفرت میں آدمی انصاف کے حدود کو بھول جاتا ہے۔ فرمایا کہ کسی سے تمھاری دشمنی ہو جائے تب بھی تم اس کے ساتھ انصاف ہی کرو۔ کیونکہ یہی روش تقویٰ کے مطابق ہے (مائدہ ۸)

انصاف کا سب سے زیادہ آسان اور قطعی معیار، حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی دوسرے کے ساتھ وہی سلوک کرے جو وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ حتیٰ کہ فرمایا کہ اس شخص کے اندر ایمان ہی نہیں جو اپنے لئے کچھ اور چاہے اور دوسرے کے لئے کچھ اور (لایومن احدکم حتی یحب لاخیہ مایحب لنفسہ)

اشاعت دین

دین کسی دین دار کے اندر جو خصوصیات پیدا کرتا ہے، ان میں سے ایک ہے —— دین کو دوسروں تک پہنچانا۔ اس پہنچانے کی دو صورتیں ہیں۔ قرآن میں ایک کو تذکیر اور دوسرے کو انذار (اعراف ۲) کہا گیا ہے۔ اول الذکر کا تعلق مسلمانوں سے ہے، دوسرے کا غیر مسلموں سے۔

تذکیر کے معنی ہیں یاد دلانا۔ اس سے مراد مسلمانوں کو نصیحت و موعظت کرنا ہے۔ مسلمان وہ لوگ ہیں جو دین کو قبول کئے ہوئے ہیں۔ ان کو دینی ذمہ داریوں سے باخبر کرنا، ان کو خود اپنے عہد کو یاد دلانا ہے۔ اسی لئے اس کو تذکیر کا نام دیا گیا ہے۔

تذکیر کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح (نساء ۱۱۴) ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس میں ان تمام آداب کو ملحوظ رکھا جائے جو اصلاحی مہم کو نتیجۃً فساد کی مہم نہ بنا دے —— غلطی پر گرفت میں نرمی کا انداز (آل عمران ۱۵۹) اختیار کیا جائے نہ کہ سخت سست کہنے کا۔ سورہ نحل آیت ۱۲۵ میں بتایا گیا کہ مدعو سے جو بات کہی جائے حکمت کے ساتھ کہی جائے، یعنی دلائل و براہین کی زبان میں ہو نہ کہ محض تحکمانہ انداز میں۔ وہ موعظت حسنہ ہو، یعنی گفتگو میں شفقت اور دل سوزی کی روح بھری ہوئی ہو۔ وہ جدال احسن کے پیرایہ میں ہو، یعنی بحث میں تفہیم اور احقاق حق کا انداز ہو نہ کہ ایک دوسرے پر الزام لگانے اور نیچا دکھانے کا۔

تذکیر کا کام اگر حکمراں طبقہ پر انجام دینا ہو تو مسئلہ اور زیادہ نازک ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ غلط انداز تذکیر سے اگر حکمرانوں کو مشتعل کر دیا جائے تو وہ مسلمانوں کا قتل وخون شروع کر دیں گے اور مسلمانوں کے درمیان باہمی لڑائی اور قتل کا وجود میں آنا اللہ تعالیٰ کو اتنا زیادہ ناپسند ہے کہ ہر قیمت پر اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حکمرانوں کے بارے میں خصوصیت سے تاکید کی گئی ہے کہ ان کو نصیحت کی جائے تو تنہائی میں کی جائے نہ کہ نعروں اور تقریروں کے ذریعہ:

سئل ابن عباس رضی اللہ عنهما عن امر السلطان بالمعروف ونهيه عن المنكر فقال: ان كنت فاعلا ولا بد ففيما بينك وبينه

ابن رجب حنبلی، جامع العلوم والحکم، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ قاہرہ ۱۹۶۲، صفحہ ۷۱

عبد اللہ بن عباس رض سے پوچھا گیا کہ بادشاہ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کا کیا حکم ہے۔ جواب دیا اگر تم کو کرنا ہی پڑے اور اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو بس اپنے اور اس کے درمیان۔

اس سلسلے کی دوسری چیز انذار ہے۔ انذار کے معنی ہیں کسی خطرہ سے آگاہ کرنا، چیتاونی دینا۔ اس سے مراد غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہے۔ چوں کہ اسلام کی پیغام رسانی میں سارا زور آخرت کے مسئلہ پر ہوتا ہے، اس لئے اس کام کو بتانے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا۔ قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت فرمایا کہ وہ تو صرف

ایک عذاب شدید کی چیتاونی دینے والے ہیں (سبا ۴۶)۔ ارشاد ہوا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ (شوری ۷)

اور ہم نے عربی قرآن اتارا تاکہ تو ڈرا دے مکہ والوں کو اور دوسروں کو اور ان کو جمع ہونے کے دن کی خبر دے دے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ اس دن ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ جہنم میں۔

انذار کے کام کے محرک قرآن کے الفاظ میں دو ہوتے ہیں۔ نصیحت (خیر خواہی) اور امانت (اعراف ۶۸)۔ بندۂ مومن دوسرے بندگان خدا پر دین پہنچانے کا جو کام کرتا ہے وہ تمام تر اس جذبہ کے تحت ہوتا ہے کہ لوگ اللہ کے عذاب سے بچ جائیں اور جنت کے راستہ پر چلنے لگیں۔ اللہ کا دین جو اس کے پاس ہے، اس کو وہ اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی امانت سمجھتا ہے اور اپنے اوپر خدا کا یہ فرض سمجھتا ہے کہ اس امانت کو وہ اس کے امانت داروں (عام انسانوں) تک پہنچا دے۔

ہجرت، جہاد

جب بھی کوئی خدا کا بندہ بے آمیز خدا پرستی کی دعوت دیتا ہے تو اس کا امکان رہتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرف سے اس کو ناموافق ردعمل کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ ردعمل ابتداءً الغاسی الکلام (فصلت ۲۶) کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی داعی کے کلام میں عیب نکالنا۔ حق کی دعوت کے ساتھ خدا کی نصرتیں ہوتی ہیں۔ وہ جب کسی ماحول میں اٹھتی ہے تو اتنی حقیقی اور اتنی مدلل ہوتی ہے کہ سننے والے اس میں کوئی واقعی خامی نکالنے میں اپنے کو عاجز محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت وہ عیب نکالنے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے شوشے نکال کر عوام کو اس سے بدگمان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ فکری کش مکش کبھی عملی ٹکراؤ تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ٹکراؤ اہل ایمان کے لئے جو صورتیں پیدا کرتا ہے انھیں کی آخری اور انتہائی صورتوں کا نام ہجرت اور جہاد ہے۔ گویا ہجرت اور جہاد دین کے وہ اجزاء ہیں جو مخالفین کے پیدا کردہ حالات کے نتیجہ میں ظہور میں آتے ہیں۔

ہجرت کے معنی ہیں چھوڑنا۔ ابتدائی طور پر اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے (مدثر ۵)۔ مگر اپنے آخری مرحلہ میں یہ کبھی گھر بار چھوڑنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ داعی کے مقابلہ میں مدعو ہمیشہ طاقت و حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اس لئے جب وہ مخالفت پر اترتے ہیں تو تمام دوسرے طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر یہ چیلنج دے دیتے ہیں کہ تم یا تو اپنے دین کو چھوڑ دو یا ہماری زمین سے نکل جاؤ (ابراہیم ۱۳) اس وقت اللہ کے بندے اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام پر چلے جاتے ہیں جہاں وہ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

جہاد کے معنے ہیں کوشش کرنا۔ حق کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے جو کوشش کی جاتی ہے، وہ بھی جہاد ہے (فرقان ۵۲)۔ تاہم مخالفین کی ضد اور ہٹ دھرمی کبھی بڑھ کر اس نوبت کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ حق کے داعیوں کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں، وہ ان کو بالکل مٹا دینے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اہل حق کو اپنے بچاؤ کے لئے اٹھنا

پڑتا ہے۔ اس طرح جو مقابلہ ہوتا ہے، اس کو جہاد کہتے ہیں۔

جہاد بمعنی قتال، وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ کی اصطلاح میں دفاعی جنگ کہا جاتا ہے۔ اس کے شرائط میں سے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ جنگ کی ابتدا اولاً دوسروں کی طرف سے کی گئی ہو (توبہ ۱۳)۔ اہل ایمان کے لئے ہر حال میں پرامن تبلیغ کا حکم ہے۔ جنگ کی اجازت ان کے لئے صرف اس صورت میں ہے جب کہ ان کو جنگ کے لئے مجبور کر دیا گیا ہو (حج ۳۹)۔ اسی کے ساتھ اور بھی شرطیں ہیں ـــــ مسلمانوں کی قوت مجتمع ہو، ان کا ایک امیر ہو۔ جس کی تمام لوگ اطاعت کرتے ہوں، وہ منکرین کی بستی سے الگ ہو کر اپنا ایک اجتماعی مرکز بنا چکے ہوں۔ وہ صبر کی صفت اس حد تک اپنے اندر پیدا کر چکے ہوں کہ قلیل تعداد ہوتے ہوئے مخالفین کی کثیر تعداد سے جم کر مقابلہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں مکی دور میں ہر قسم کے ظلم کے باوجود تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس کی اجازت صرف مدینہ میں ملی جب کہ مذکورہ شرائط پوری ہو چکی تھیں۔ عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے مطابق ستر سے زیادہ بار قتال کی ممانعت آتی رہی۔ اس کے بعد سورۂ حج میں اجازت قتال کی پہلی آیت نازل ہوئی۔

غلبۂ اسلام

دین کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے خوف و محبت کا تعلق جوڑے اور آخرت کی کامیابی کے لئے فکرمند ہو۔ مگر دنیا کی زندگی میں مومن کی ایک اور بھی پسندیدہ چیز (صف ۱۳) ہوتی ہے۔ اور وہ ہے اسلام کا غلبہ۔ یعنی اہل حق دوسری قوموں کے مقابلہ میں دبے ہوئے نہ ہوں بلکہ انھیں کو زمین کے اوپر سربلندی حاصل ہو۔

تاہم اہل ایمان کو یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ وہ براہ راست اسلامی اقتدار قائم کرنے کی مہم چلائیں۔ قرآن میں واضح لفظوں میں ارشاد ہوا ہے کہ اقتدار کا مالک اللہ ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے (آل عمران ۲۶)۔ انبیاء میں سے کسی نبی نے بھی حکومت قائم کرنے کی مہم نہیں چلائی۔ حضرت داؤد کو حکومت ملی۔ مگر قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ "اے داؤد تم کو یہ اقتدار ہم نے عطا کیا ہے (ص ۲۶)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی بابت قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ . وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ	اللہ کا وعدہ ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان کو وہ زمین میں حاکم بنائے گا جیسا کہ اگلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔ اور ان کے دین کو جما دے گا جس کو ان کے لئے پسند کیا ہے اور ان کے ڈر کو امن سے بدل دے گا وہ میری عبادت کریں گے کسی چیز کو میرا شریک نہ بنائیں گے اس کے بعد جو ناشکری کرے گا تو وہی لوگ فاسق ہیں۔ تم

وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (نور ۵۵)

لوگ نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

گویا مسلمان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نماز قائم رکھے، بالفاظ دیگر اللہ سے لپٹا رہے۔ زکوٰۃ ادا کرے، یعنی بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں مستعد ہو۔ رسول کی اطاعت کرے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ اپنے درمیان سمع وطاعت کے نظام کو انتہائی حد تک مضبوط کرے۔ یہی وہ اعمال ہیں جو رحمت الٰہی (عطیہ اقتدار) کا باعث ہوں گے۔ یہی وہ مومن گروہ ہے جس کو اللہ اقتدار سونپنے کے لئے منتخب کرتا ہے کیونکہ وہی اس کے اہل ہوتے ہیں کہ اقتدار ارضی کو منصوبۂ الٰہی کے مطابق چلائیں۔ ان کے لئے اقتدار کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کو بے خوف وخطر خدا کی عبادت کرنے کے مواقع مل گئے۔ وہ اللہ کے سوا کسی اور شے کو اپنا مرکز توجہ نہیں بناتے۔ وہ کبر اور ظلم سے اپنے آپ کو پاک رکھتے ہیں اور اقتدار کے ملے ہوئے مواقع کو تمکین دین کے لئے استعمال کرتے ہیں نہ کہ تمکین خویش کے لئے۔

خلاصہ

ایک تاجر کو آپ دیکھیں تو مختلف اوقات میں وہ مختلف سرگرمیاں کرتا ہوا دکھائی دے گا۔ کہیں خاموش کہیں بولتا ہوا، کہیں بیٹھا ہوا کہیں سفر کرتا ہوا، کہیں خرچ کرتا ہوا کہیں مقدمہ لڑتا ہوا۔ تاہم اس کی بظاہر مختلف سرگرمیوں کا حاصل صرف ایک ہے: دولتِ دنیا کو پانا۔ اسی طرح ایک مومن مختلف وقتوں میں بظاہر مختلف عبادات واعمال میں مصروف نظر آتا ہے۔ مگر ان سب کا مقصد ایک ہوتا ہے: دولتِ آخرت کو پانا۔

دولتِ آخرت کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی پورے معنوں میں موحد بن جائے اور ہر قسم کے شرک سے بچتا ہوا اپنے رب سے جا ملے:

عن جابر رض ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: من لقی اللہ لا یشرك به شيئا دخل الجنة ومن لقيه يشرك به شيئا دخل النار (مسلم)

جو شخص خدا سے اس طرح ملا کہ وہ کسی چیز کو خدا کے ساتھ شریک نہیں کر رہا تھا وہ جنت میں داخل ہوا۔ جو اس طرح ملا کہ وہ خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک کر رہا تھا وہ آگ میں داخل ہوا۔

توحید اور شرک کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ جو شخص خدا کے سامنے عبادتی رسوم ادا کرے وہ موحد ہے۔ اور جو شخص کسی بت کے سامنے عبادتی رسوم ادا کرتا ہو وہ مشرک ہے۔ یہ تو دونوں کی ظاہری علامتوں میں سے صرف ایک علامت ہے۔ توحید اور شرک دراصل طالب اور مطلوب (حج ۷۳) بننے کا معاملہ ہے۔ یہ آدمی کی پوری ہستی کا نذرانہ ہے۔ کسی شخص کا معبود وہی ہے جو اس کا حقیقی مطلوب ومقصود ہو، جس کی طرف وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ جھکا ہوا ہو۔ جس چیز کو آدمی عظمت کا مقام دے، جس پر وہ بھروسہ کرتا ہو، جس کے لئے اس کے احترام وتقدس کے جذبات وقف ہوں، جس کی یاد میں وہ غرق رہتا ہو، جس کے تصور سے اس کے نازک احساسات

ڑکتے ہوں، جس سے وہ سب سے زیادہ ڈرتا ہو اور جس سے سب زیادہ محبت کرتا ہو، جس کے ساتھ وہ
نے آپ کو اتنا زیادہ شامل (INVOLVE) کر دے کہ وہی اس کا سب کچھ اور وہی اس کی آخری امید بن جائے۔
ی کو اپنی زندگی میں اس قسم کا برتر مقام دینا ہی اس کو اپنا الٰہ (معبود) بنانا ہے۔ خواہ وہ کوئی دیوتا ہو یا آدمی
اپنا نفس۔ کوئی جاندار چیز ہو یا بے جان، کوئی زندہ ہستی ہو یا مردہ، اور وہ کئی ہوں یا صرف ایک۔

ساری شریعت کا حاصل یہ ہے کہ آدمی صرف خدا کو اپنا الٰہ بنائے۔ وہ شرک کی تمام قسموں سے بچ کر پورے
نوں میں توحید پرست بن جائے۔ ہر قسم کی عظمت و کبریائی کا مالک صرف ایک اللہ ہے۔ جو آدمی اختیار و اقتدار
ر کسی اور کو شریک کرے، وہ اسی واحد سہارے سے محروم ہو جاتا ہے جس کے سوا اس دنیا میں کوئی اور سہارا
ہیں۔ ایسے آدمی کی مثال اس شخص کی سی ہے جو آسمان سے گر پڑے (حج ۳۱) اور اس کے بعد ساری کائنات میں
س کے لئے بربادی کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ خدا کے سوا کسی کو عقیدت و اعتماد کا مرکز بنانا اس کو خدا کا برابر ٹھہرانا
ہے۔ ایسا عمل اس کائنات میں "ظلم عظیم" ہے اور اس کا انجام دائمی عذاب ہے (من مات وهو يدعو لله ندا
دخل النار، بخاری) حتیٰ کہ یہ بھی شرک، سب سے بڑا شرک ہے کہ آدمی اپنی ذات کی نمائش چاہتا ہو۔ اس کا احترام
کیا جائے تو وہ خوش ہو، احترام نہ کیا جائے تو وہ بپھر اٹھے۔ ایسا شخص خود اپنے آپ کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہے۔
وہ ایک ایسی برائی میں مبتلا ہے جس سے زیادہ بری چیز اس دنیا میں اور کچھ نہیں:

اخوفُ ما اخافُ علیکم الشركُ الاصغر فسئل عنه فقال الرياء (احمد، طبرانی، بیہقی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تمہارے بارے میں مجھ کو سب سے زیادہ جس چیز کا اندیشہ ہے وہ شرک اصغر ہے۔ پوچھا گیا شرک اصغر کیا ہے۔ فرمایا: ریار

دمی کی عبادت اور اس کی اسلامی سرگرمیاں اگر یہ نتیجہ پیدا کریں کہ وہ حقیقی معنوں میں اَلَّا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي وَكِيلًا
(اسراء ۲) کا مصداق بن گیا ہو، ذات خداوندی اس کی تمام یادوں اور توجہات کا مرکز بن جائے، خدا کو الٰہ بنانا
اس کے لئے سادہ معنوں میں صرف ایک عقیدہ کی چیز نہ ہو بلکہ وہی اس کا نفسیاتی آسرا ہو جس پر وہ جی رہا ہو ——
آدمی کی دینی زندگی اگر یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہو تو بلاشبہ وہ دین پر قائم ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو شدید اندیشہ ہے
کہ وہ ابھی تک دین کو نہ پا سکا۔ دین کے نام پر وہ کہیں اور اٹکا ہوا ہے۔

صریح نصوص سے ثابت ہے کہ عمل کا دار و مدار تمام تر نیت پر ہے۔ اللہ کو صرف وہی عمل مطلوب ہے جو خالصۃً اس کی
رضا کے لئے کیا گیا ہو۔ جس عمل میں کوئی اور غرض شامل ہو جائے، اللہ کی نظر میں اس کی کوئی قیمت نہیں —— جو لوگ خدا
کے دین کو تجارت بنائیں۔ جو دنیوی فائدوں اور مصلحتوں کے تحت کسی دینی عمل کو اختیار کریں۔ جو کسی دینی عمل کو بطور "کیریر" کے
شروع کریں۔ جو ایسی دینی سرگرمیوں میں دلچسپی رکھتے ہوں جن کے ذریعہ عزت و شہرت ملتی ہے۔ جن سے آدمی کی "امیج" میں
اضافہ ہوتا ہے۔ جن سے عوامی قیادت حاصل ہوتی ہے۔ ایسے لوگ شدید طور پر اس خطرہ میں مبتلا ہیں کہ ان کے اعمال قیامت
میں بے وزن قرار دے دیئے جائیں۔ خواہ ان میں یہ دنیوی محرکات شعوری طور پر داخل ہوئے ہوں یا غیر شعوری طور پر۔

دینی روح کیوں نہیں

مومن کون ہے۔ قرآن کے الفاظ میں مومن وہ ہے جس کا یہ حال ہو کہ جب اس کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس کی ہیبت سے اس کا دل دہل اٹھے۔ جب اس کو قرآن کی آیتیں سنائی جائیں تو اس میں اس کو اضافہ ایمان کی غذا ملنے لگے۔ جس کے لئے خدا ایک ایسی لازوال ہستی بن جائے جس پر وہ کامل بھروسہ کر سکتا ہو (انفال)۔ ایمان، خدا اور بندے کا مقام اتصال ہے۔ اس اتصال کا حقیقی طور پر وقوع میں آنا ہی ان کیفیات کے ظہور میں آنے کی یقینی ضمانت ہے۔ پاور ہاؤس اور بلب کا ملاپ اگر نتیجہ پیدا کئے بغیر نہیں رہتا تو خدا اور بندے کا ملاپ کیوں کر نتیجہ سے خالی رہ جائے گا۔

مگر موجودہ زمانہ میں اسلام کی ایسی عجیب وغریب قسم وجود میں آئی ہے جس میں سب کچھ نظر آتا ہے مگر وہی چیز نہیں جس کو حقیقۃً "اسلام" کہا گیا ہے۔ ہمارے زمانہ کے عجائب میں یہ عجوبہ سب سے زیادہ حیرت ناک ہے کہ ہر طرف اسلام کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ مگر حقیقی اسلام کا کہیں وجود نہیں —— نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے مگر "صلاۃ خشوع" سے مسجدیں خالی ہیں۔ اسلامی مدرسوں کی تعمیرات بلند ہو رہی ہیں مگر وہ لوگ نہیں پیدا ہو رہے ہیں جو اپنی زندگیوں میں بھی اسلام کی تعمیر کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔ اسلام کے نعروں سے فضائیں گونج رہی ہیں مگر اس اسلام کا وجود نہیں جو تنہائیوں میں آدمی کو بے چین کر دے۔ دوسروں کی پیٹھ پر اسلامی کوڑے لگ رہے ہیں مگر اپنی "پیٹھ" کو خدا کے حوالے کرنے والا کوئی نہیں۔ اسلامی تقریروں کی بہار آ رہی ہے مگر خدا کی زمین ایسے لوگوں سے خالی ہے جن کو خدا کے خوف نے بے زبان کر رکھا ہو۔ "احتساب کائنات" کے ہنگامے ہر طرف برپا ہیں مگر احتساب نفس کی ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے جسم سے اس کی روح نکال دی گئی ہے۔ خود ساختہ طور پر اسلام کا ایسا ایڈیشن تیار کر لیا گیا ہے جو بظاہر اسلام ہے مگر وہی چیز اس میں موجود نہیں جو خدا و رسول کے نزدیک اسلام کا اصل مقصود تھی۔

اس کو سمجھنے کے لئے یہود کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ کیونکہ جو قومیں کتاب الٰہی کی حامل ہوں، ان کے بگاڑ کے اسباب ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں۔ یہود کی بابت قرآن میں کہا گیا ہے کہ بعد کے دور میں ان کے اندر قساوت (سخت دلی) آ گئی۔ قساوت کی حالت یہ نہیں ہے کہ دین اپنی صورت کے اعتبار سے باقی نہ رہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ دین کی صورتیں ہمیشہ مکمل طور پر باقی رہتی ہیں۔ البتہ قوم کے اندر سے ان کی روح نکل جاتی ہے۔ قساوت دراصل ذکر اور خشیت کے خاتمہ کا نام ہے (زمر ۲۲-۲۳) نہ کہ ظواہر دین کے خاتمہ کا۔

قوم کے اندر یہ بگاڑ انکار دین کے نام پر نہیں آتا، بلکہ اقرار دین کے جلو میں آتا ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق شیطان ان کو ایسی ایسی تاویلات سجھاتا ہے جس کی روشنی میں ان کو اپنا انحراف عین دین نظر آنے لگے۔ وہ اپنے اعمال

خوبصورت الفاظ میں بیان کر کے اس کو اپنے لئے مزین کر لیتے ہیں (انعام - ۴۳) اس تزئین کی سب سے زیادہ معروف صورت وہ ہے جس کو قرآن میں یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (مائدہ - ۱۳) فرمایا گیا ہے۔ تحریف کے معنی ہیں پھیرنا۔ کلام کو اس کے محل سے پھیرنے کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا وہ مطلب و معنی بیان کیا جائے جو متکلم کی مراد نہ ہو۔ گویا یہود کی تزئین یہ تھی کہ وہ اپنی قساوت، بالفاظ دیگر اپنی بے روح دین داری، کو لفظی تاویلات سے ایسا خوش نما بنا لیتے تھے کہ وہی اصل دین نظر آنے لگے۔

تحریف کی صورت عام طور پر وہی ہوتی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں غلط تعبیر (MISINTERPRETATION) کہا جاتا ہے۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ یہود کو یہ خبر دی گئی تھی کہ تم کو تمام اقوام عالم پر فضیلت دی گئی ہے (بقرہ ۴۷) اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے تم کو دنیا میں اپنی نمائندگی کے لئے چن لیا ہے۔ تم کو اس مقام پر کھڑا کیا ہے کہ تم خدائی تعلیمات کے حامل بنو اور اس کو خدا کی طرف سے دوسری اقوام تک پہنچاؤ۔ اپنے اصل مفہوم میں یہ آیت نظریاتی فضیلت کے معنی میں تھی۔ مگر یہود نے اس کو نسلی فضیلت کے معنی میں لے لیا۔ یہود کی نسل میں پیدا ہونا اس بات کے لئے کافی بن گیا کہ آدمی اس فضیلت کا مستحق ہو اور خدا کے انعامات اس کو حاصل ہوں۔ کتاب الٰہی کی اس تحریف (لفظ کو اس کے موقع و محل سے پھیرنے) کو قرآن میں اس طرح واضح کیا گیا ہے:

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارٰى تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ
مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ
(بقرہ - ۱۳۵)

وہ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت یاب ہو جاؤ گے۔ کہہ دو نہیں۔ بلکہ ہم پیروی کرتے ہیں دین ابراہیم کی اور وہ شرک کرنے والوں میں نہ تھا۔

گویا ملت ابراہیمی کا فرد وہ ہے جو شرک سے اپنے کو بچائے اور سچی توحید پر قائم ہو۔ محض نسل ابراہیمی میں ہونے سے کوئی ملت ابراہیمی کا فرد نہیں بن جاتا۔ یہود کو جو "فضیلت" دی گئی وہ اپنے اصل مفہوم میں ایک سنگین ذمہ داری کو یاد دلانے والی چیز تھی۔ مگر موقع و محل سے ہٹانے کے بعد وہ بے خوفی کا محرک بن گئی۔ اللہ کا ایک حکم جو خشیت پیدا کرنے کا سبب بنتا، وہ قساوت پیدا کرنے والا بن گیا ——— یہ تھی یہود کی تحریف۔ اپنی اس قسم کی تحریفوں کے ذریعہ انھوں نے دین خداوندی کو ایک بے روح ڈھانچہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

حدیث میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ تم لوگ پچھلی امتوں کے راستہ پر چلو گے ——— (لتتبعن سنن من کان قبلکم) چنانچہ مسلمانوں میں آج وہ سارے انحراف دیکھے جا سکتے ہیں جو سابق اہل کتاب میں پائے جاتے تھے۔ جس طرح یہود نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اللہ کے خصوصی بندے ہیں اور وہ ضرور نجات پائیں گے۔ اسی طرح ہم نے یہ عقیدہ قائم کر لیا ہے کہ "مسلمان خیر امت ہیں اور وہ سب کے سب مرحوم و مغفور ہیں" یہ بات بجائے خود صدفی صد درست ہے۔ مگر وہ مسلم امت کے بارے میں ہے نہ کہ کسی مسلم نسل کے بارے میں۔ امت کو نسل کے معنی میں لینا بلاشبہ یحرفون الکلم من مواضعہ کا مصداق ہے۔ اپنے نظریاتی مفہوم میں یہ بات ذمہ داری کا احساس دلاتی ہے۔ مگر جب اس کو نسلی مفہوم میں لے لیا گیا تو وہ صرف قساوت اور بے خوفی کا محرک بن کر رہ گئی۔

حقائق کے بجائے خوش خیالیوں پر دین کی بنیاد

یہود کا نظریاتی فضیلت کو نسلی فضیلت کے معنی میں لینا یہ معنی رکھتا تھا کہ یہود کی نسل محض نسل کی حیثیت سے خدا کے نزدیک برگزیدہ ہے۔ اس کے بعد بالکل قدرتی طور پر یہ ہوا کہ خدا پرستی اور یہودیت ہم معنی الفاظ بن گئے۔ ان کا خیال یہ ہو گیا کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں (مائدہ۔ ۱۸) یہودی اور نصرانی پیدا ہونا ہی ہدایت یاب ہونا ہے — (بقرہ۔ ۱۳۵) ہمارا کوئی آدمی جہنم میں نہ جائے گا اور اگر گیا بھی تو اس کا جانا صرف چند روز کے لئے ہوگا (بقرہ ۸۰)۔ قرآن نے ان کی ان خوش خیالیوں کو امانی (بقرہ ۸۲) کہا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اس قسم کے امانی خواہ یہود قائم کریں یا مسلمان قائم کریں، خدا کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ خدا کا ابدی قانون تو یہ ہے کہ جو شخص جیسا کرے، اس کے مطابق اس کو بدلہ دیا جائے (نساء ۱۲۳)

امانی کے معنی ہیں بے بنیاد توقعات۔ عبداللہ بن عباس، مجاہد اور فراء نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ موضوع روایات اور بے سند قصے ہیں جو یہودی علماء و مشائخ نے وضع کئے اور پھر پوری قوم میں رائج ہو گئے (اکاذیب مختلقة سمعوها من علمائهم فقبلوها على التقليد، تفسیر نسفی) قوم یہود کے انتہائی مبالغہ آمیز فضائل، یہودیت سے تعلق رکھنے والی معمولی معمولی چیزوں کے مقدس اور متبرک ہونے کی طلسماتی داستانیں کثرت سے ان کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔ پوری کی پوری قوم حقیقی عمل سے غافل تھی اور انھیں موضوع روایات اور بناوٹی قصے کہانیوں پر جی رہی تھی مثلاً —— تورات کے الفاظ ایک بار بھی جس کے کان میں پڑ گئے اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ اسرائیلی بزرگوں کا نام جس نے احترام و محبت سے لے لیا، اس کے جنتی ہونے میں شبہ نہیں۔ "قیامت کے دن ابراہیمؑ دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہو جائیں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں گرنے نہ دیں گے"

Talmud (Every man's Liberary Series)
Edited by Dr. Kohen, P. 404

ٹھیک یہی حال آج مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ کتاب اللہ کے بجائے کتاب الامانی ان کے دین کا ماخذ بنی ہوئی ہے۔ فضائل اعمال کی بے اصل روایات اور بزرگوں کے کشف و کرامت کی فرضی داستانیں بے شمار تعداد میں قوم کے اندر پھیلا دی گئی ہیں اور قوم کی قوم انھیں خوش خیالیوں کے سہارے جی رہی ہے۔

اسلام کی تاریخ میں وضع حدیث کا سلسلہ ابتداءً سیاسی محرک کے تحت شروع ہوا۔ اپنی سیاست کے حق میں دینی تصدیق حاصل کرنے کے لئے ہر فرقہ نے بے شمار حدیثیں گھڑیں اور ان کو رسول اور اصحاب رسول سے منسوب کر کے عوام میں پھیلا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اہل بیت کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے جو حدیثیں وضع کی گئیں، صرف ان کی تعداد تقریباً تین سو ہزار ہے۔

یہی زمانہ ہے جب کہ مسلمانوں میں "فضائل اعمال" کی حدیثیں وضع کرنے کا رجحان ابھرا۔ اس کا محرک

یہی تھا جس نے اس سے پہلے عیسائیوں میں مقدس جھوٹ (Pious Fraud) کا نظریہ پیدا کیا تھا۔ حضرت مسیحؑ کے بعد ابتدائی صدیوں میں مسیحیت بڑی ابتر حالت میں تھی۔ اس زمانہ میں مسیحی بزرگوں نے سوچا کہ مسیحیت کی ترقی کی ایک تدبیر یہ ہے کہ اس کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے عجائب و غرائب باتیں گھڑی جائیں اور ان کو عوام میں پھیلایا جائے۔ اس مقصد کے لئے وضع حدیث کا ثبوت خود موجودہ مقدس انجیل میں موجود ہے۔ سینٹ پال نے رومیوں کے نام اپنے خط (رومیوں ۳ : ۷) میں لکھا:

"اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے۔ اور ہم کیوں برائی نہ کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو"

قرن اول کے بعد جب مسلمانوں میں باہمی لڑائیاں اور سیاسی جھگڑے بہت بڑھ گئے تو کچھ لوگوں نے "فضائل" کے نام پر جھوٹی حدیثیں وضع کرنی شروع کیں تاکہ لوگوں کو دینی اعمال کی طرف راغب کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ فضائل جہاد نفس اور انفاق مال جیسی چیزوں کے لئے کار آمد نہ تھے۔ چنانچہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے طلسماتی فوائد بتائے جانے لگے۔ مثلاً کوئی شخص فلاں سورہ روزانہ پڑھے تو وہ خدا کے مقابلہ میں آدمی کا حصار بن جاتی ہے۔ جہنم کے فرشتے جب اس کو عذاب دینے کے لئے آتے ہیں تو وہ ان سے لڑ کر ان کو بھگا دیتی ہے۔ ایک شخص نے سیکڑوں کی تعداد میں اس مضمون کی "حدیثیں" گھڑ کر پھیلائیں کہ فلاں سورہ فلاں وقت "پڑھو" تو تو اتنا ثواب ہے اور فلاں وقت پڑھو تو اتنا ثواب ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم نے دین کے معاملہ میں یہ جرأت کیسے کی۔ اس نے جواب دیا:

قصدتُ ان اشغل الناس بالقرآن عن غیرہ — میں نے چاہا کہ لوگوں کو دوسرے مشاغل سے ہٹا کر قرآن پڑھنے میں لگا دوں۔

کسی نے حدیث گھڑی کہ کسی شخص کے ایک اولاد ہو اور اس کا نام وہ محمد رکھے تو باپ بیٹا دونوں جنت میں جائیں گے (من ولد له مولود فسماه محمدا کان هو والولد فی الجنة) کسی نے حدیث بنائی کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہے اس کو جنت میں سات ہزار شہر ملیں گے۔ ہر شہر میں سات ہزار محل ہوں گے۔ ہر محل میں سات ہزار حوریں ہوں گی (من قال لا اله الا الله اُعطی فی الجنة سبعین الف مدینة فی کل مدینة سبعون الف قصر فی کل قصر سبعون الف حوراء) کسی نے کہا کہ جس شخص نے ۱۵ شعبان کو ۱۲ رکعتیں پڑھیں، اس طرح کہ ہر رکعت میں ۳۰ بار قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھا تو وہ نہ صرف خود جنت میں جائے گا بلکہ اپنے خاندان کے دس ایسے آدمیوں کو بھی خدا سے کہہ کر جنت میں لے جائے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی (من صلی لیلة النصف من شعبان ثنتی عشرة رکعة یقرأ فی کل رکعة ثلاثین مرة قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ شفع فی عشرة من اهل بیته قد استوجبوا النار)

سخاوی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے: القول البدیع فی الصلاة علی الحبیب الشفیع۔ یہ کتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کے بارے میں ہے۔ پوری کتاب عجائب و غرائب قصوں سے بھری ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک قصہ

سے وسیکون فی آخر امتی اناس یحدثونکم مالم تسمعوا انتم ولا آباؤکم فایاکم وایاھم (رواہ مسلم عن ابی ھریرہ)

ان کے بیان کے مطابق، یہ ہے :

" ایک عورت حسن بصری کے پاس آئی اور عرض کیا کہ میری لڑکی کا انتقال ہو گیا۔ میری تمنا ہے کہ میں اس کو خواب میں دیکھوں۔ حسن بصری نے کہا کہ عشاء کی نماز پڑھ کر چار رکعت نفل نماز پڑھ اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ پڑھ اور اس کے بعد لیٹ جا۔ اور سونے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتی رہ۔

اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے لڑکی کو خواب میں دیکھا کہ بے حد سخت عذاب میں ہے۔ تارکول کا لباس جسم پر ہے۔ دونوں ہاتھ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ پاؤں آگ کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں۔ عورت صبح کو اٹھ کر پھر حسن بصری کے پاس گئی۔ اور جو کچھ دیکھا تھا، ان کو بتایا۔

اگلے دن حسن بصری نے خواب میں دیکھا کہ جنت کا ایک باغ ہے۔ اس میں ایک بہت اونچا تخت ہے۔ اس میں ایک حسین وجمیل لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے سر پر ایک نور کا تاج ہے۔ وہ کہنے لگی حسن! تم نے مجھ کو پہچانا، کہا نہیں۔ بولی، میں وہی لڑکی ہوں جس کی ماں تم سے ملی تھی۔ حسن بصری نے کہا تیری ماں نے تو تیرا حال اس کے برعکس بتایا تھا جو میں دیکھ رہا ہوں۔ لڑکی نے جواب دیا، میری حالت وہی تھی جو ماں نے بیان کی۔ میں نے پوچھا، پھر یہ مرتبہ کیسے حاصل ہو گیا۔ اس نے کہا، ہم ستر ہزار آدمی اسی عذاب میں مبتلا تھے جو میری ماں نے آپ سے بیان کیا۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک بزرگ کا گزر ہمارے قبرستان پر ہوا۔ انھوں نے ایک دفعہ درود پڑھ کر اس کا ثواب ہم سب کو پہنچا دیا۔ ان کا درود اللہ کے یہاں ایسا قبول ہوا کہ اس کی برکت سے ہم سب اس عذاب سے آزاد کر دیے گئے اور ہم کو وہ رتبہ نصیب ہوا، جو تم دیکھ رہے ہو "

اس قسم کی بے شمار روایات گھڑ کر ساری امت میں پھیلا دی گئیں۔ اب اگر کچھ لوگ یہ کریں کہ ان "حدیثوں" کو جمع کر کے فضائل اعمال کا صحیفہ مرتب کریں اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو دین دار بنانا شروع کریں تو ایک عجیب وغریب قسم کا دین وجود میں آئے گا۔ لوگ بظاہر ذکر اور درود اور تلاوت اور نماز میں مشغول ہوں گے مگر یہ مشاغل ان کے سینہ میں خوف خدا سے کانپنے والا قلب نہیں بنائیں گے۔ بلکہ ایک ایسا قلب وجود میں آئے گا جو اپنے کو خدا کی پکڑ سے بالکل مامون سمجھے گا۔ معمولی معمولی باتوں سے جب ہر صبح وشام جنت کے محلات رزرو ہو رہے ہوں تو آخرت کے خوف سے کانپنے کی کیا ضرورت۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی "امانی" نے اللہ کے دین کو عملاً مذاق بنا کر رکھ دیا۔ وہ دین جس کا مقصد بندوں میں خشیت اور اندیشہ کی کیفیت پیدا کرنا تھا۔ وہ صرف قساوت میں اضافہ کا سبب بن گیا۔

خالق کے بجائے مخلوق کا سہارا پکڑنا

قرآن کی ایک آیت ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ (مائدہ ۳۵)	اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اس کا وسیلہ تلاش کرو۔

اس آیت میں "وسیلہ" کے لفظ کو کچھ لوگوں نے اس مفہوم میں لے لیا جس میں وہ اردو زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح دنیوی حکمرانوں کے یہاں ذریعے اور وسیلے ہوتے ہیں، اسی طرح خدا کے یہاں بھی وسیلے ہیں۔ یہ وسیلے انبیاء اور اولیاء ہیں۔ ان وسیلوں کو پکڑ لو، ساری خدائی تمھارے ہاتھ میں آ جائے گی۔ یہ عقیدہ چونکہ عوامی مزاج سے قریب تھا، اس کو خوب مقبولیت حاصل ہوئی۔ اب یہ حال ہے کہ خدا کے بالمقابل بے شمار زندہ اور مردہ "خدا" پیدا ہو گئے ہیں جن کا دامن لوگوں نے تھام رکھا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ یہ خدائی وسیلے دنیا سے لے کر آخرت تک ان کے سارے کام بناتے چلے جائیں گے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا قسم کے عقیدہ کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ عربی زبان میں "وسیلہ" کا یہ مفہوم سرے سے نہیں آتا۔ لفظ وسیلہ مذکورہ آیت میں، اردو (ذریعہ) کے مفہوم میں نہیں ہے، بلکہ اپنے عربی مفہوم (قرب) کے معنی میں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اس کی فرماں برداری اور اس کے پسندیدہ عمل کے ذریعہ اس کی قربت اور نزدیکی حاصل کرو (تقربوا الیہ بطاعتہ والعمل بما یرضیہ، قتادہ) ابن جریر طبری نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: اطلبوا القربۃ الیہ بالعمل بما یرضیہ (اللہ کی نزدیکی اس عمل کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کرو جس عمل کو وہ پسند کرتا ہے)

کسی بندے کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے قریب پہنچ سکے۔ اس آیت میں یہ راز کھولا گیا تھا کہ اس مطلوب کو پانا ہر بندہ کے لئے ممکن ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے کو اپنے رب کے پسندیدہ راستہ پر لگا دے۔ مگر غلط تعبیر نے آدمی کو اس خزانہ سے محروم کر دیا جو اس کے اندر رکھا گیا تھا۔ جس آیت میں خدا کو پانے کا راز بتایا گیا تھا، اس نے لوگوں کو صرف قبروں اور آستانوں تک پہنچانے کا کام انجام دیا۔ وہ آیت جس میں خوف خدا کی غذا تھی، ایک خود ساختہ تشریح کے ذریعہ اس میں بے خوفی کا سامان تلاش کر لیا گیا۔ جو قرآن اللہ کی پرستش کی تعلیم دینے آیا تھا، اس سے لوگوں نے غیر اللہ کی پرستش کا حکم نکال لیا۔ اس عقیدہ کے تحت جو مذہب بنا، قدرتی طور پر اس میں قبروں کی پرستش اور زندہ "بزرگوں" کی عقیدت نے خوب ترقی کی "اولیاء اللہ" کی فضیلت و کرامت کی بے شمار فرضی کہانیاں گھڑی گئیں۔ تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ یہ حضرات بھی اپنے اندر خدائی طاقتیں رکھتے ہیں۔ بزرگوں کی کراماتی داستانوں کی مقدس طلسم ہوش ربا تیار ہو گئی ہے اور ساری قوم اس کی تلاوت میں مشغول ہے۔ اس کے برعکس اللہ سے خوف و محبت، گناہوں سے بچنے کی تڑپ، آخرت کی بازپرس سے بچنے کا فکر بالکل ختم ہو گیا ہے۔ کیوں کہ "وسیلہ" حاصل کر لینے کے بعد ان چیزوں کے لئے فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔

اس قسم کے تمام عقائد دراصل خدا کی خدائی کا کمتر اندازہ (Underestimation) ہیں۔ جو لوگ زندہ یا مُردہ انسانوں سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں، انھیں خبر نہیں کہ یہ ہستیاں ایک مکھی پیدا کرنے پر بھی قادر نہیں (حج ۷۳) جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے "اکابر" کا دامن تھام کر جنت میں پہنچ جائیں گے، ان کو خدا کے قانون جزا و سزا کی سنگینی کا اندازہ نہیں (انعام ۹۱) جو لوگ آخرت کے دن کو اپنے "بڑوں" کی جلوہ گاہ سمجھتے ہیں، ان کو خبر نہیں کہ آخرت جب آئے گی

تو عالم یہ ہوگا کہ سارا آسمان، خدا کے ایک ہاتھ میں لپٹا ہوا ہوگا۔ اور زمین کو خدا اپنی مٹھی میں لے کر فرمائے گا:
انا الملک انا الجبار انا المتکبر، این الجبارون این المتکبرون این ملوک الارض (میں ہوں بادشاہ میں ہوں جبار، میں ہوں کبریائی والا، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ کہاں ہیں جبار کہاں ہیں متکبر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی مسجد میں خطبہ دیتے ہوئے یہ الفاظ دہرائے تو راوی کا بیان ہے کہ:

فرجف برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المنبر حتی قلنا لیخرن بہ (ابن کثیر)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ ہم نے کہا کہ آپ منبر سے گر پڑیں گے

دوسری طرف ہم نے ایسے ایسے "بزرگ" پیدا کر رکھے ہیں جو میدان حشر میں علین خدا کے سامنے ہماری طرف سے وکیل بن کر کھڑے ہو جائیں گے اور اس وقت تک کسی کو جنت میں جانے نہ دیں گے جب تک اپنے تمام معتقدین کو جنت میں نہ بھیج لیں۔

معانی کے بجائے صورتوں کو مطلوب سمجھ لینا

۱۔ قرآن کی سورہ نمبر ۵۴ میں کہا گیا ہے: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ۔ اس کا ترجمہ کچھ لوگوں نے ان الفاظ میں کیا: "ہم نے سہل کر دیا قرآن کو حفظ کرنے کے لئے، پھر کوئی ہے حفظ کرنے والا"۔ اس ترجمہ کے مطابق سمجھ لیا گیا کہ اس آیت میں قرآن کو رٹ کر یاد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اب بے شمار لوگ قرآن کو رٹنے میں مشغول ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اس آیت کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔ قرآن کی سورتوں کو یاد کرنا بجائے خود مومن کی ایک ضرورت ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مذکورہ آیت کا اس قسم کے عمل سے کوئی تعلق نہیں۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے آیت کا ترجمہ کیا ہے: "ہم نے آسان کیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا"۔ مطلب یہ کہ قرآن میں حقائق دینیہ کو مدلل اور قابل فہم انسانی زبان میں پیش کر دیا گیا ہے۔ پھر کوئی ہے جو اس پر دھیان دے اور اس سے اپنے لئے نصیحت اور اصلاح کا سامان حاصل کرے۔ اس آیت میں کتاب الٰہی پر غور و فکر کے لئے اکسایا گیا ہے۔ قرآن کے اندر آدمی کے قلب و دماغ کے لئے جو ربانی غذا رکھی گئی ہے، اس میں سے اپنا حصہ لینے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مگر ایک معنوی حقیقت کو لفظی تکرار کے معنی میں لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آیت آدمی کے لئے اس قسم کی غذا کا ماخذ نہ رہی۔ وہ الفاظ کو زبانی طور پر رٹنے کے ایک بے کیف عمل کے ہم معنی بن کر رہ گئی۔

۲۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ	جس نے کہا لا الٰہ الا اللہ وہ جنت میں جائے گا۔

اس قسم کی روایات میں لفظ "قول" کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے سمجھ لیا کہ بس کلمہ اسلام کا تلفظ ہی جنت میں داخلہ کے لئے کافی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آدمی کا ایک قول اس کے لئے جنت کا دروازہ کھولتا ہے۔ مگر قول سے مراد ایک حقیقی انسان کا قول ہے نہ کہ کسی کمپیوٹر کا قول۔ ایک حقیقی انسان کا قول اس کی پوری ہستی سے ٹپکتا ہے نہ کہ محض حرکت لسانی سے وجود میں آتا ہے۔ ایک بندہ جب فی الواقع یہ قول دیتا ہے کہ "اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں"، تو وہ محض کچھ رسمی

الفاظ نہیں بولتا۔ وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اس نے خدا کی قدرت کاملہ کے مقابلہ میں اپنے عجز کامل کو پالیا ہے۔ یہ بول اس کی اندرونی ہستی کا لفظی اظہار ہوتا ہے نہ کہ اس کی حقیقی ہستی سے الگ محض حرکت لسانی کی سطح پر چند کلمات کا تلفظ۔

"قول" کی یہ حقیقت قرآن و حدیث سے بخوبی واضح ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ مائدہ میں ایک گروہ کا ذکر ہے جس نے کہا تھا کہ "اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے۔ ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔" اس گروہ کے متعلق قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ان کے اس "قول" کی وجہ سے اللہ نے ان کو جنت دے دی (فاثابہم اللہ بما قالوا جنات - ۸۵) مگر قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول محض حرکت لسان نہ تھا بلکہ اعلیٰ نفسیاتی سطح پر عرفان حق کا معاملہ تھا۔ یہ ان کی پوری ہستی تھی جو لفظوں کی صورت میں ابل پڑی تھی۔ اس قسم کا واقعہ اگرچہ بظاہر ایک قولی اقرار ہوتا ہے مگر حقیقۃً وہ کائنات کا سنجیدہ ترین معاملہ ہوتا ہے جس کے ایک سرے پر عاجز اور حقیر بندہ ہوتا ہے اور اس کے دوسرے سرے پر وہ قادر مطلق ہستی ہوتی ہے جس کی تجلیات کو پہاڑ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ صورت حال اس اقرار کو بے حد سنگین واقعہ بنا دیتی ہے۔ اپنی ساری لطافت کے باوجود جب یہ "قول"، عالم واقعہ میں ظہور میں آتا ہے تو انسانی شخصیت کے لئے وہ اتنا سنگین ہوتا ہے کہ آنکھوں کی راہ سے آنسوؤں کا سیلاب پھٹ پڑتا ہے (تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ)

وہ اقرار ایمان جو آدمی کو جنت کا مستحق بناتا ہے، قرآن و حدیث کے مطابق، آدمی کی پوری ہستی کا نذرانہ ہے۔ مگر اس سے یہ مفہوم نکال لیا گیا کہ زبان سے کلمہ اسلام کا تلفظ کرو اور سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ۔

۳۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا (احزاب) اے ایمان لانے والو اللہ کو یاد کرو بہت زیادہ

اس آیت میں "ذکر کثیر" کے لفظ کو کچھ لوگوں نے گنتی کے معنوں میں لے لیا۔ وہ اس فکر میں لگ گئے کہ کتنا زیادہ ذکر ہو تو وہ کثیر کہا جائے گا۔ کچھ لوگوں نے تین سو کا نصاب بنایا۔ کسی نے پچاس ہزار کا، کسی نے ایک لاکھ کا۔ اس طرح کے عددی نصاب کا یہ بھی تقاضا تھا کہ ذکر کے لئے کوئی متعین لفظ یا فقرہ ہو۔ کیوں کہ الفاظ کے تعین کی صورت ہی میں اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مقررہ نصاب کا عدد پورا ہوا یا نہیں۔

مگر اس طرح کے کسی عمل کا مذکورہ آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں اللہ کے ذکر سے مراد اللہ کی یاد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کو بہت زیادہ یاد کرو۔ خدا کا اور خدا کی باتوں کا تصور اپنے اوپر اتنا زیادہ طاری کرو کہ وہ ہر وقت تم کو یاد آتا رہے۔ یہ ذکر در اصل گہرے تعلق باللہ کا نتیجہ ہے۔ وہ مصنوعی طور پر نہیں کیا جاتا بلکہ فطری طور پر اس وقت ظہور میں آتا ہے جب کہ آدمی کا اندرون خدا کے خوف و محبت سے بھر گیا ہو۔ بندہ نفسیاتی طور پر اپنے رب سے جڑ گیا ہو۔ ذکر حقیقی کی پہچان یہ ہے کہ تنہائیوں میں بندہ اپنے خدا کو یاد کرے اور شدت یاد سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑیں (ذکر اللہ خالیا ففاضت عیناہ) خدائے ذو الجلال کا ذکر آنسوؤں کے قطرات پر ہوتا ہے نہ کہ تسبیح کے دانوں پر۔

قرآن کا ایک حکم جس میں روح کو تڑپانے اور قلب کو پگھلانے کا سامان تھا، اس کو ورزش لسان کے ہم معنی سمجھ لیا گیا

جو قلب کو صرف سخت کرنے والا ہے نہ کہ وہ لطافتِ احساس کے اس مقام کو پہنچائے جس کو ذکر کہا گیا ہے۔

دعا کے بجائے عملیات

دعا (اللہ سے مانگنا) اہم ترین عبادت ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے الدعاء مخ العبادۃ (دعا عبادت کا مغز ہے) الدعاء ھی العبادۃ (دعا ہی عبادت ہے)۔ مگر یہود کے اثر سے مسلمانوں میں دعا کے بجائے عملیات کا رواج چل پڑا۔

دونوں کا فرق سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ ایک شخص حکومت کے کسی شعبہ میں جگہ حاصل کرنے کے لئے ملازمت کا فارم بھرتا ہے۔ دوسرا شخص اسی ملازمت کے لئے یہ کرتا ہے کہ اپنے گھر میں سر نیچے اور پاؤں اوپر کر کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ یقین کرتا ہے کہ اسی حال میں سات دن رہوں گا تو مجھ کو ملازمت مل جائے گی —— پہلی مثال درخواست کی مثال ہے۔ دوسری مثال کرتب یا عملیات کی مثال۔

خدا سے مانگنے کا طریقہ صرف دعا کا طریقہ ہے۔ دعا یا درخواست وہ چیز ہے جو بندے کو براہ راست خدا سے ملاتی ہے۔ وہ اس کے اندر عبودیت کے جذبات ابھارتی ہے۔ وہ اس کو دین کی حقیقت اعلیٰ سے آشنا کرتی ہے۔ دعا میں بندہ اپنے رب کو یاد کرتا ہے۔ وہ اس کو پکارتا ہے۔ اس سے روتا گڑگڑاتا ہے۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر ان ربّانی کیفیات کا تجربہ کرتا ہے جو کسی اور طرح آدمی کو نہیں مل سکتیں۔ اللہ سے مانگنے کی کیفیت ابھرنا سب سے بڑا دینی حاصل ہے۔ مگر عملیاتی کرتب دکھانا انتہائی بے معنی ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

عملیات کی دو قسمیں ہیں —— عبادتی عملیات اور ساحرانہ عملیات۔ عبادتی عملیات سے مراد وہ طریقے ہیں جن کے متعلق یقین کر لیا گیا ہے کہ ان کو دہرا لینے سے آخرت کی نعمتوں کے دروازے آدمی کے اوپر کھل جاتے ہیں۔ ساحرانہ عملیات وہ ہیں جو دنیا کی حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے گھڑے گئے ہیں۔

راقم الحروف کی ملاقات ایک عالم سے ہوئی۔ ملاقات کے دوران انھوں نے ایک کتاب کا ذکر کیا جس میں محدثین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ جملہ لکھا گیا تھا: "انھوں نے زبردست محنت کر کے تمام حدیثیں جمع کیں اور ان کو ہمیشہ کے لئے کتابی صورت میں محفوظ کر دیا"۔ موصوف نے انتہائی خفگی کے ساتھ اس فقرہ کا ذکر کیا۔ میں حیران تھا کہ اس فقرہ میں آخر وہ کون سی خرابی ہے جس پر وہ اتنے شدید ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر وہ بولے "آپ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ محدثین نے تمام کی تمام حدیثیں جمع کر ڈالی ہیں"۔ مزید پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ مثال کے طور پر صلاۃ معکوس کی روایت محدثین کو نہیں ملی۔ جب کہ فلاں بزرگ نے اس کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

صلاۃ معکوس کا مطلب ہے الٹی نماز۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ بستی کے باہر کوئی ایسا اندھا کنواں تلاش کیا جائے جس کے اوپر درخت اگا ہوا ہو۔ آدمی درخت سے رسی لگا کر اپنا پاؤں اس میں باندھ لے اور کنوئیں میں سر نیچے پاؤں اوپر کر کے لٹک جائے اور اسی حالت میں نماز ادا کرے۔ بتایا جاتا ہے کہ جو شخص ایک بار بھی یہ نماز پڑھ لے وہ دونوں

جہان کی سعادتیں سمیٹ لیتا ہے۔ میں نے کہا کہ بزرگ موصوف نے اس روایت کے ساتھ اس کی سند نقل نہیں کی ہے۔ اس لئے کیوں کر اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اس پر موصوف بگڑ گئے اور بات ختم ہو گئی۔

بعد کے دور میں، خصوصاً متصوفانہ حلقوں میں مسلمانوں کے درمیان بہت سے عملیاتی طریقے رائج ہوئے۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ ان پر اسرار شکلوں کو ان کے ظاہری آداب کے ساتھ دہرا دینے سے معجزاتی نتائج برآمد ہوں گے۔ اس قسم کے عملیات نے خدا کے دین کو اس سطح پر پہنچا دیا جہاں روایتی کہانی کا طلسماتی خزانہ تھا۔ وہ "سم سم" کہنے سے کھلتا تھا۔ دوسرا کوئی لفظ مثلاً جم جم یا دم دم کہنے سے نہیں کھلتا تھا۔ اسی طرح گویا اسلام کے بھی کچھ منتر یا کرتب تھے۔ آدمی نے اگر ان کو ظاہری صحت کے ساتھ دہرا دیا تو اس کے بعد نجات اور سعادت کے تمام دروازے اس کے لئے کھل جائیں گے، ٹھیک ویسے ہی جیسے "سم سم" کہنے سے طلسماتی خزانہ کے دروازہ کا کھل جانا۔ مگر یہ وہ اسلام ہے جو دوسری قوموں کے اثر سے لیا گیا ہے۔ قرآن وحدیث کے اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اسلامی عبادت انابت الی اللہ (زمر ۱۷) کا نام ہے۔ اس کی حقیقت خدا کے آگے دل کا جھکا ؤ ہے نہ کہ اعضاء وجوارح کے ذریعہ کوئی کرتب دکھانا۔

قرآن میں ساحرانہ عملیات کو کفر کہا گیا تھا (بقرہ ۱۰۲) مگر ایک خوبصورت تاویل کرکے اس کو اسلام میں داخل کر لیا گیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی مذکورہ آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> "سحر میں اگر کلمات کفریہ ہوں مثل استعانت بہ شیاطین یا کواکب وغیرہ تب تو کفر ہے۔ اور اگر کلمات مباحہ ہوں تو اگر کسی کو خلاف اذن شرعی کسی قسم کا ضرر پہنچایا جائے اور کسی غرض ناجائز میں استعمال کیا جاوے تو فسق اور معصیت ہے۔ اور اگر ضرر نہ پہنچایا جاوے نہ اور کسی غرض ناجائز میں استعمال کیا جاوے تو اس کو عرف میں سحر نہیں کہتے بلکہ عمل یا تعویذ گنڈہ کہتے ہیں اور وہ مباح ہے۔" (تفسیر بیان القرآن)

اس تاویل کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن جو فلاح آخرت کا راستہ دکھانے کے لئے آیا تھا، اس کو فلاح دنیا کا موضوع بنا لیا گیا۔ ہر قسم کے دنیوی مقاصد میں قرآن کو استعمال کیا جانے لگا۔ اسرائیلی روایات کے تحت عملیات کا جو علم سینہ بہ سینہ چلا آ رہا تھا، اس کے علاوہ خود "کتاب محفوظ" بھی طرح طرح کے عملیاتی نسخوں کا قیمتی ماخذ بن گئی۔

"اعمال قرآنی" کے نام پر مسلمانوں نے جو سفلی طریقے رائج کئے ان میں سے ایک وہ ہے جس کو قرآنی سورتوں کے "خواص" کہا جاتا ہے۔ یہ خواص سب کے سب دنیوی نوعیت کے ہیں۔ حتیٰ کہ یہود کی تقلید میں ہر سورہ کے اعداد مقرر کئے گئے ہیں اور ان کے نقوش بنا کر حاجات دنیا میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بے شمار لوگوں نے تعویذ گنڈوں کی دکانیں کھول لی ہیں اور قرآن کو ایک تجارت بنا کر رکھ دیا ہے۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ سورہ مریم کے اعداد دو لاکھ ننانوے ہزار چھ سو چوالیس ہیں۔ اس کے اعداد کا نقش حسب ذیل ہے۔

۹۶۵۵۱	۹۶۹۴۴	۹۶۵۴۹
۹۶۵۴۹	۹۶۵۴۸	۹۶۵۵۳
۹۶۵۴۷	۹۶۵۵۲	۹۶۵۴۵

ایک بہت بڑے بزرگ لکھتے ہیں ۔" اگر باغ ویران شدہ میں درختوں کے ساتھ سورہ مریم کا یہ نقش باندھ دیں تو باغ گلہائے شگفتہ اور ثمر سے بھرپور ہو جائے "۔ ان اعمال کے نتیجہ میں نہ صرف قرآن ایک سستا دنیوی نسخہ بن کر رہ گیا بلکہ وہ قوم کے اندر توہمات پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔ کیوں کہ اس قسم کے نقش تعویذ سے کبھی کوئی ویران باغ پھولوں اور پھلوں سے لدا ہوا نہیں بن سکتا۔ مزید یہ کہ جس قوم میں اس قسم کی عملیات کا رواج ہو جائے اس کے اندر کبھی صحیح معنوں میں خدا پرستانہ مزاج پیدا نہیں ہو سکتا۔ آدمی جب دعا کرتا ہے تو وہ اللہ سے مانگتا ہے اس کی توجہ تمام تر اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب وہ عملیات کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کی توجہ اس عمل کے پُر اسرار خواص پر لگی رہتی ہے۔ دعا میں آدمی اللہ سے جڑتا ہے اور عملیات میں خود عملیات سے یا ان پر اسرار اسباب سے جن کے متعلق اس کا گمان ہوتا ہے کہ وہ عملیات کے پیچھے کام کر رہے ہیں ——— صلاۃ التسبیح اور ختم خواجگان سے لے کر نقش تعویذ تک ـ جو بے شمار عملیات مسلمانوں میں رائج ہوئے، انھوں نے دین خداوندی کو دین یہودیت بنا کر رکھ دیا ہے ۔

ذاتی حکم کو خارج کی طرف موڑ دینا

قرآن میں اللہ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے: وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ (سیدھی ترازو تولو انصاف سے اور مت گھٹاؤ تول کو) اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ باہمی تعلقات میں عدل پر قائم رہیں۔ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے نہ کسی کا حق دبائے۔ ترازو کی طرح ہر ایک سے انصاف کا معاملہ کیا جائے۔ یہ آیت آدمی کو ابھارتی ہے کہ وہ اپنی ذات کو عدل و انصاف کی راہ پر ڈال دے۔ لیکن اگر کسی کے ذہن میں آیت کا یہ مطلب بیٹھ جائے کہ "لوگوں کے ترازو کو سیدھا کرو"، تو سارا معاملہ الٹ جائے گا۔ اب اس آیت میں اس کی اپنی ذات کے لئے کوئی غذا نہ ہوگی۔ وہ اس حکم کا مطلب یہ سمجھے گا کہ دوسروں کے اوپر "داروغۂ انصاف" بن کر کھڑا ہو جائے۔ وہ اپنی اصلاح کی فکر کرنے کے بجائے دوسروں سے لڑنا شروع کر دے گا۔ خواہ اس لڑائی کا نتیجہ عملاً شدید تر بے انصافی کو لانے کے ہم معنی کیوں نہ بن جائے۔

یہی صورت ان لوگوں کے ساتھ پیش آئی ہے جو دین کو "اسٹیٹ" کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ذہن کی وجہ سے دین کو ایک ریاستی نظام کے روپ میں دیکھنے لگے ہیں۔ دین ان کے لئے حکومتی امور کا موضوع ہے نہ کہ حقیقۃً ذاتی اصلاح کا موضوع۔ اپنی دینی ذمہ داری کا تصور ان کے ذہن میں یہ ہے کہ دین کو ایک ریاستی نظام کی حیثیت سے زمین پر جاری و نافذ کیا جائے۔ چوں کہ سارے قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں جس سے اس قسم کا دینی مشن اخذ ہوتا ہو۔ اس لئے ان کے ذہن نے نہایت آسان سبیل یہ نکالی کہ انفرادی احکام کو اجتماعیات کی طرف موڑ دیا۔ "ترازو صحیح تولو"، کو اس مفہوم میں لے لیا کہ "لوگوں کے ترازو صحیح کرو"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن احکام میں فرد کے لئے اپنی ذات کی غذا رکھی گئی تھی، وہ دوسروں کے خلاف تقریر اور ایجی ٹیشن کی خوراک لینے کا ماخذ بن کر رہ گئی۔

ا۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے ——— اَقِیْمُوا الدِّیْنَ (شوریٰ ۱۳) اس کا نشانہ آدمی کی اپنی ذات ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ اپنی زندگی کو پوری طرح دین کے سانچے میں ڈھال لو۔ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرو اور بندوں کے جو حقوق تمھارے اوپر آتے ہیں، ان کو ٹھیک ٹھیک پورا کرو۔ مگر جن لوگوں کے ذہن میں دین کا مذکورہ "انقلابی" مفہوم بیٹھا ہوا ہے، ان کے لئے یہ آیت اس قسم کی ذاتی غذا کا سبب نہ بن سکی۔ انھوں نے اپنے ذہنی شاکلہ کے مطابق اس کا مطلب یہ نکال لیا کہ ـــــــ دین کو بحیثیت ایک ریاستی نظام کے زمین پر نافذ کرو۔ وہ آیت جو آدمی کے اپنے اندرون کو جھنجوڑنے والی تھی، وہ صرف خارجی ہنگامہ آرائی کا عنوان بن کر رہ گئی۔ اس آیت کو پڑھ کر مذکورہ ذہن نے فوراً اس قسم کی تقریر شروع کر دی:

"قرآن مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا۔ اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے۔ بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دین حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی اور قانونی وسیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لئے جان لڑا دیں اور ان کو انسانی زندگی کی اصلاح کا وہ پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصہ پر صرف اسی صورت میں عمل کیا جاسکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہل ایمان کے ہاتھ میں ہو۔"

یہ تقریر صرف اس لئے وجود میں آئی کہ وہ حکم جس کا مطلب تھا "دین پر قائم ہو" اس کو اس معنے میں لے لیا گیا کہ ـــــ "دین کو دوسروں کے اوپر قائم کرو۔"

۲۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے: یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ (نساء ۱۳۵) اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان لانے والو! تم میں سے ہر شخص انصاف کو اختیار کرے، عدل کی روش پر خوب خوب قائم ہو جائے۔ اس حکم کا نشانہ آدمی کی اپنی ذات ہے۔ وہ انسان کو خود اپنی اصلاح کے بارے میں پوری طرح متحرک کرنا چاہتی ہے۔ مگر مذکورہ ذہن کے سامنے یہ آیت آئی تو اس نے اس کا ترجمہ کیا: "اے ایمان والو! انصاف کے علم بردار بنو۔" اور اس کے بعد اس نے ان الفاظ میں اس کی تفسیر شروع کر دی:

"یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو۔ بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علم بردار بنو۔ تمھارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے۔ تمھیں اس بات پر کمربستہ ہونا چاہئے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لئے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمھارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔"

اس تقریر کو پڑھنے والا اس آیت سے جو اثر لے گا وہ یہ کہ آدمی انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھے اور لوگوں کے اوپر انصاف کا نظام قائم کرے۔ بالفاظ دیگر یہ آیت، مذکورہ تشریح کے خانہ میں خارجی مشن کا پیغام بن جاتی ہے۔ حالاں کہ آیت کا اس قسم کے خارجی مشن سے کوئی تعلق نہیں۔ آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ: "اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے بنو"۔ یہ آیت ہر بندۂ مومن کو ذاتی طور پر خطاب کر رہی ہے اور اس کو خدا کا یہ پیغام پہنچا رہی ہے کہ تم اپنی زندگی کے معاملات میں انصاف کی روش پر قائم رہنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرو۔ اپنے آپ کو انتہائی

حد تک انصاف کا عامل بنا دے ـــــ آیت کے اگلے الفاظ مزید تاکید کر رہے ہیں کہ جب کسی سے اختلاف ہو جائے اس وقت بھی انصاف کی روش کو نہ چھوڑو۔ ایک حکم الٰہی جس میں ہدایت کی ذاتی غذا تھی، زاویہ نگاہ بدل جانے کی وجہ سے وہ خارجی دنیا کے خلاف تقریری کمال دکھانے کا عنوان بن گیا

۳۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً (بقرہ ـ ۲۰۸) یہ آیت بھی اہل ایمان کو انفرادی طور پر خطاب کر رہی ہے اور ہر شخص سے کہہ رہی ہے کہ تم اپنی زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگ لو، اپنے عقائد اور اپنے اخلاق و معاملات میں اسلامی تعلیمات کو پوری طرح اختیار کر لو۔ اس میں ہر بندۂ مومن کے لئے ذاتی ہدایت کا سامان ہے۔ اس آیت میں ہر شخص اپنے رب کو اپنے آپ سے خطاب کرتے ہوئے پاتا ہے۔ مگر مذکورہ دینی مزاج پیدا ہو جائے تو آیت کو پڑھتے ہی آپ کا ذہن خارجی دنیا کی طرف مڑ جائے گا۔ آپ اس کو تلاوت کر کے حسب ذیل تقریر شروع کر دیں گے :

"لوگو، قرآن کی یہ آیت ہمیں ایک عظیم انقلابی پروگرام دے رہی ہے۔ وہ مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ اٹھیں اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی حکومت کا نظام قائم کر دیں۔ خاندان سے لے کر پارلیمنٹ ہاؤس اور بین اقوامی زندگی تک کوئی گوشہ حکومت خداوندی سے باہر نہ رہے" بظاہر یہ تقریر بڑی شاندار معلوم ہوتی ہے۔ مگر وہ ایک ایسے تقریری ریکارڈ کی مانند ہے جو خالی میدان میں بجایا جا رہا ہو، جس کا نہ کوئی سننے والا ہو اور نہ اثر لینے والا۔

۴ ۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے : اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف ـ ۶۷)

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے : "حکم تو بس اللہ ہی کا ہے" ـــــ مطلب یہ کہ اس عالم میں طاقت و اقتدار کے تمام سرے خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان خواہ کچھ بھی سوچے اور کتنی ہی تدبیریں کرے۔ مگر وہی ہو گا جس کی اجازت خدا دے گا۔ خدا کی مرضی کے بغیر اس کائنات میں کوئی واقعہ نہیں ہو سکتا۔ یہ آیت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ وہ خدا کے مقابلہ میں کس قدر عاجز ہے۔ وہ یہ سبق دیتی ہے کہ انسان گھمنڈ کی روش ترک کر دے۔ وہ مکمل طور پر خدا پر بھروسہ کرے۔ اپنے معاملات میں اسی سے مدد کی درخواست کرے۔

مگر مذکورہ ذہن کے لئے آیت میں اس قسم کی ذاتی غذا نہیں ہو گی۔ آیت میں ایک ایسے اقتدار کا ذکر ہے جو بالفعل قائم ہے۔ مگر وہ اس سے ایک ایسا اقتدار نکال لے گا جو اسے اپنی انقلابی جدوجہد کے ذریعہ قائم کرنا ہے۔ وہ بس "حکم" کا لفظ لے گا اور پھر اپنی تقریر شروع کر دے گا:

"اقتدار صرف خدا کا ہے۔ کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں کہ زمین پر اپنا قانون جاری کرے۔ حکومتی اقتدار تمام تر خدا کا ہونا چاہئے۔ مومن کا مشن یہ ہے کہ غیر خدائی سیاست کی جتنی قسمیں زمین پر قائم ہیں ان کو ختم کر دے اور زندگی کے تمام شعبوں میں خدا کا اقتدار اعلیٰ قائم کر دے" ـــــ آیت کا مدعا یہ تھا کہ خدا کی برتری یاد دلا کر انسان کو اس کا عبادت گزار بننے پر اکسایا جائے۔ مگر فوق الفطری حکم کو سیاسی حکم کے معنی میں لے کر اس سے سیاسی مشن نکال لیا گیا ۔

۵ ۔ اسی طرح مثال کے طور پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ کو لیجئے۔

اِلٰہ کا مطلب ہے وہ ہستی جس کی طرف اپنی حاجتوں کے لئے رجوع کیا جائے ۔ اور عبادت کے معنی ہیں پرستش ۔ یہ مفہوم انسان کے اندر عجز و افتقار کا مزاج پیدا کرتا ہے ۔ اس میں اس کو یہ سبق ملتا ہے کہ بنانے بگاڑنے کا سارا اختیار صرف خدا کے پاس ہے ۔ مجھے اپنی فلاح و نجات کے لئے اسی کی طرف دوڑنا چاہئے اور اسی کے آگے اپنے کو ڈال دینا چاہئے ۔ لیکن مذکورہ ذہن اس آیت میں الٰہ کے معنی حاکم لے لے گا اور عبادت کو سیاسی اطاعت کے ہم معنی سمجھنے لگے گا ۔ اس آیت کو پڑھ کر اس کے اندر جو جذبہ ابھرے گا وہ یہ کہ خدا ہی سیاسی حکمراں ہے اور اسی کی سیاسی اطاعت زمین پر قائم ہونی چاہئے ۔" بظاہر یہ ایک اچھی اور صحیح بات معلوم ہوتی ہے ۔ مگر اس تشریح کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آیت سے عبودیت کی جو غذا ملنی چاہئے ، وہ آدمی کو نہیں ملے گی ۔ اس کو پڑھ کر اس کے اندر سیاست آرائی کا ذہن ابھرے گا ۔ وہ حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن چلانے کو کام سمجھے گا ۔ اس آیت سے اس کو سیاسی الکھیڑ پچھاڑ کی غذا ملے گی نہ کہ اللہ کے آگے اپنے کو جھکا دینے کی ۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین کے مذکورہ تصور کا نتیجہ کیا ہوگا ۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کے ذہن میں حکم الٰہی کا نشانہ بدل جائے گا ۔ اب اپنی ذات کے بجائے خارج کی دنیا وہ جگہ ہوگی جہاں وہ حکم الٰہی کی تعمیل کرنا چاہے گا ۔ وہ اپنی زندگی کو بدلنے کے بجائے "نظام" کو بدلنے پر اپنی ساری نظریں جما دے گا ۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ سے غافل ہوں گے ۔ مگر مسائل عالم کے موضوع پر گفتگو کرنے سے ان کی زبان کبھی نہیں تھکے گی ۔ نماز کی "اقامت" سے انھیں زیادہ دلچسپی نہ ہوگی مگر وہ حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا نعرہ بلند کریں گے ۔ ان کا گھر جہاں وہ آج بھی قوام کی حیثیت رکھتے ہیں ، اس میں اہل باطل کی روش کی تقلید ہو رہی ہوگی ۔ مگر ملک کے اندر وہ قوا بننے کا نعرہ لگائیں گے تاکہ ملک سے باطل نظام کو ہٹایا جا سکے ۔ ان کا سینہ خدا کی یاد سے خالی ہوگا مگر وہ براڈ کاسٹنگ اسٹیشن پر قبضہ کرنے کی تحریک چلائیں گے تاکہ دنیا بھر میں خدا پرستی کا چرچا کیا جا سکے ۔ "جزء دین" پر عمل کرنے میں وہ کوتاہ ہوں گے مگر "کل دین" کے نفاذ کے لئے وہ بین اقوامی کانفرنس کا انعقاد کریں گے ۔ خواہ اس کا انعقاد عملاً وقت اور مال کے ضیاع کے ہم معنی کیوں نہ ہو ۔

دینی اتحاد کے بجائے دینی اختلاف

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی تھی کہ سابق اہل کتاب ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے ، تم لوگ ۷۳ فرقوں میں بٹ جاؤ گے ۔ یہ تنبیہ آج واقعہ بن چکی ہے ۔ مسلمانوں میں مختلف ناموں سے بے شمار فرقے اور جماعتیں وجود میں آگئی ہیں ہر ایک نے اپنا علٰحدہ تنظیمی ڈھانچہ بنا رکھا ہے ۔ ہر ایک کا اپنا لٹریچر ہے ۔ حتیٰ کہ اپنی اپنی شرحیں اور تفسیریں تیار کر کے ہر ایک نے اپنا قرآن و حدیث بھی الگ کر لیا ہے ۔ یہ صورت حکم الٰہی کے سراسر خلاف ہے ۔ اللہ نے دینی اتحاد کی تاکید فرمائی تھی (آل عمران ۱۰۳) ہم نے اس کو دینی اختلاف میں تبدیل کر لیا ۔ ایسی صورت میں کیسے ممکن ہے کہ اللہ کی رحمتیں اور نصرتیں ہمارے اوپر نازل ہوں ۔

دینی اختلاف پیدا ہونے کی وجہ ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ دین کے کسی اضافی جزء کو اعتقاداً یا عملاً وہ اہمیت دینا جو دین کے حقیقی اور اساسی جزء کو ہونی چاہئے۔ دین کے حقیقی حصہ کو قرآن میں الدین (شوریٰ ۱۳) اور اس کے اضافی اجزاء کو شرعۃ اور منہاج (مائدہ ۴۸) کہا گیا ہے۔ الدین سے مراد وہ ابدی تعلیمات ہیں جو تمام پیغمبروں کو یکساں طور پر دی جاتی رہیں۔ مثلاً توحید، اخلاص وغیرہ۔ شرعۃ سے مراد قانونی تفصیلات اور منہاج سے مراد پیغمبر کی سنت یا تعامل ہے[ف]۔ یہ تفصیلات اور تعامل وقتی حالات کے تابع ہوتے ہیں، اس لئے ان میں مختلف انبیاء کے یہاں فرق پایا جاتا ہے۔ قرآن میں حکم دیا گیا کہ صرف پہلی چیز کو مدار دین قرار دو۔ دوسرے امور میں توسع کا طریقہ اختیار کرو۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل آیت پر غور کیجئے:

یا ایہا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحاً انی بما تعملون علیم۔ وان ھٰذہ امتکم واحدۃ وانا ربکم فاتقون	اے پیغمبرو پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو۔ میں جانتا ہوں جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور یہ تمہارے دین کے لوگ سب ایک دین پر ہیں۔ اور میں تمہارا رب ہوں۔ سو مجھ سے ڈرو۔
(مومنون ۵۲)	

اس آیت کے مطابق وہ واحد دین جو تمام پیغمبروں کے درمیان متفق علیہ ہے، یہ تھا ——— خوراک میں حلال و حرام کا لحاظ رکھنا، نیک عمل کرنا، اللہ کو علیم و خبیر جانتے ہوئے زندگی گزارنا، اللہ کو اپنا رب اور آقا بنانا، صرف اللہ سے ڈرنا۔ بعض دوسری آیتوں میں چند اور چیزوں کا اضافہ ہے۔ مثلاً حنیفیت، انابت الی اللہ، نماز، روزہ، شرک سے پرہیز (روم ۔ ۳۱) اوپر کی آیت میں "عمل صالح" ان سب چیزوں کے لئے جامع لفظ ہے۔ عمل صالح میں مذکورہ متعین اعمال کے علاوہ وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو قرآن کی دوسری آیات سے بالفاظ صریح ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً روزہ، عدل، ترک ظلم وغیرہ۔

یہی ثابت شدہ اور متفق علیہ دین "دین قیم" ہے۔ اور دین میں اصل اہمیت انھیں چیزوں کی ہے۔ انھیں کو مدار دعوت بنانا ہے اور انھیں کی بنیاد پر امر و نہی کی مہم چلانا ہے (آل عمران ۱۰۴) ان کے سوا جو چیزیں شریعت اور منہاج سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں اپنے حالات کے لحاظ سے اگرچہ لازماً کوئی نہ کوئی ضابطہ اور طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے ان کی حیثیت ہمیشہ اضافی ہوگی۔ اگر ان کے معاملہ میں وہ شدت اختیار کی جائے جو حقیقی امور کی ہے تو یہ سبل متفرقہ کا اتباع (انعام ۱۵۳) ہے جو صرف اختلاف امت پر منتج ہوتا ہے۔ کیوں کہ الدین ایک ہے۔ جب کہ شریعت اور منہاج میں فرق ہے اور لازماً فرق رہے گا۔ اس فرق کی وجہ سے ان کے معاملہ میں کلی اتحاد ممکن نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر آپ ایک ایسا کام کر رہے ہیں جس کی نوعیت شریعت اور منہاج کی ہے تو اس کو یہ عنوان مت

ف (شرعة ومنهاجا) عن ابن عباس سبيلاً وسنةً وكذا روى عن مجاهد وعكرمة وحسن البصري وقتادة والضحاك والسدي، ابن كثير

دیکھئے کہ ———— "یہی تمام انبیاء کا مشن تھا کہ شریعت اور منہاج میں مختلف طریقوں کا امکان ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ایسا ہوگا کہ کسی کے لئے ایک طریقہ قابل ترجیح ہوگا کسی کے لئے دوسرا۔ اب اگر اسی کو انبیاء کا اصل مشن بتایا جائے تو مختلف لوگ مختلف چیزوں کو انبیاء کا مشن سمجھنے لگیں گے اور نتیجۃً ایک دین میں کئی دین بن جائیں گے۔ اور وہ تفریق فی الدین وجود میں آئے گی جو اللہ کی نظر میں سخت مبغوض ہے۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے شرعۃ اور منہاج کی ایک ایک مثال لیجئے۔

سیکڑوں برس سے مسلمانوں میں بار بار ایسے لوگ اٹھتے رہے ہیں جن کا کہنا تھا کہ لوگو "نماز ادا کرو"۔ مگر ان کوششوں نے امت کے اندر کبھی کوئی نمازی فرقہ پیدا نہیں کیا۔ آج کوئی ایسا تنظیمی ڈھانچہ نہیں ہے جو اس لئے علیٰحدہ سمجھا جاتا ہو کہ وہ لوگوں کو نماز کی تاکید کرتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ اور لوگ اٹھے جنھوں نے اس قسم کے مسائل چھیڑے کہ نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی چاہئے یا نہیں۔ آمین دھیرے سے کہنا افضل ہے یا زور سے کہنا، رفع یدین کے ساتھ نماز درست ہے یا اس کے بغیر۔ اس قسم کی بحثوں نے ملت کو فرقوں میں بانٹ دیا۔ الگ الگ مدرسے، الگ الگ مسجدیں، الگ الگ جماعتی حلقے وجود میں آگئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو مسئلہ شرعۃ کی نوعیت کا تھا، اس کو انھوں نے الدین کی حیثیت دے دی۔ دین کا وہ حصہ جس میں ایک سے زیادہ طریقوں کی گنجائش تھی، اس کو دین کے اُس حصہ کی مانند بنانا چاہا جس میں کوئی ایک ہی طریقہ درست ہوتا ہے۔

اب منہاج کی ایک مثال لیجئے۔

مسلمان قرن اول سے لے کر اب تک ہر دور میں حکمرانوں سے نبرد آزما رہے ہیں۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان سیاسی مقابلوں کی وجہ سے امت میں کوئی علیٰحدہ فرقہ بن گیا ہو جو اس حیثیت سے جانا جاتا ہو کہ یہ "مسلم سیاسی فرقہ" ہے۔ ہماری تاریخ میں صرف دو مستثنیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ ایک شیعہ۔ دوسرے وہ لوگ جو موجودہ زمانہ میں اپنے کو حکومت الٰہیہ کا علم بردار کہتے ہیں۔ شیعہ گروہ پہلی صدی ہجری میں اسلامی سیاست کا جھنڈا لے کر اٹھا۔ مگر اس کی سیاست، دوسرے سیاسی لوگوں سے بنیادی طور پر مختلف تھی۔ دوسرے لوگوں نے سیاست کو صرف سیاست (بالفاظ دیگر عملی ضرورت) کے طور پر اختیار کیا تھا۔ جب کہ شیعہ حضرات نے سیاست کو مستقل عقیدہ قرار دیا۔ سیاست اپنی نوعیت کے اعتبار سے منہاج کے ذیل کی چیز تھی جس کی صورت وقتی حالات کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے۔ مگر شیعہ گروہ نے سیاست کو الدین کی طرح دائمی حکم ثابت کرنا چاہا۔ خاص طرح کے مزاج کے سوا عام لوگ ان سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امت کے اندر ایک نیا فرقہ وجود میں آگیا۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ حکومت الٰہیہ کے علم بردار ہیں، وہ ایک اور انداز سے اسی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان کی دائمی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کا سیاسی نظام قائم کرنے کے لئے "اپنی جان لڑائے" کیونکہ یہی اصل دینی مشن ہے اور اسی کے لئے خدا نے اپنے تمام رسول بھیجے تھے۔ اسلامی حکومت بجائے خود یقیناً ایک مطلوب چیز ہے۔ مگر وہ منہاج کے ذیل کی چیز ہے نہ کہ الدین کے ذیل کی۔ وہ دین کا اضافی جزء ہے نہ کہ حقیقی جزء۔ یہ کوئی علی الاطلاق مشن نہیں ہے بلکہ وقتی حالات یہ طے کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں اہل ایمان کی کیا ذمہ داری ہے۔ چنانچہ سارے قرآن میں کوئی ایک آیت ایسی نہیں ہے جس میں بالفاظ صریح اس طرح کا حکم دیا گیا ہو یا اس کو انبیاء کا مشن بتایا گیا ہو۔ ایسی حالت میں خاص طرح

کی ذہنی افتاد کے لوگ ہی اس اپج کا ساتھ دے سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اس عقیدہ کے گرد جمع ہوئے وہ عام امت سے الگ ایک قسم کا سیاسی فرقہ بن کر رہ گئے۔

اوپر کی آیات میں جن چیزوں کو "الدین" قرار دیا گیا ہے، اگر ان کی اقامت و پیروی کے لئے جدوجہد کی جائے تو امت میں کوئی نیا فرقہ وجود میں نہیں آئے گا۔ کیوں کہ یہ تمام کی تمام متفق علیہ چیزیں ہیں۔ ان کی تحریک سے اتحاد کی فضا ابھرے گی۔ اس کے برعکس شرعۃ اور منہاج کی نوعیت کی چیزوں کو لے کر اٹھنا اور کہنا کہ یہی الدین ہے، صرف تفرق فی الدین کا سبب بنے گا۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں اسی قسم کی چیزوں کو دعوت و تحریک کی بنیاد بنا کر اپنا وہ حال کر لیا ہے جس کی تصویر اس آیت میں دی گئی ہے:

الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (روم - ۳۲)	جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اور ہو گئے فرقے فرقے۔

یہ فرقہ بندی کوئی معمولی چیز نہیں۔ یہ دین کی اصل روح کو ختم کر دینے والی ہے۔ دینی اتحاد کی فضا ہو تو آدمی خدا سے جڑتا ہے۔ لوگوں کی توجہ دین کے حقیقی تقاضوں پر لگی رہتی ہے۔ اس کے برعکس دینی اختلافات کی فضا ہو تو اصل دینی تقاضے دب جاتے ہیں۔ لوگ اہم کو چھوڑ کر غیر اہم کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اپنے حلقے سے وابستگی کا نام لوگوں کے نزدیک دین بن جاتا ہے۔ ان کو اس اعلیٰ ایمانی سطح کا تجربہ ہی نہیں ہوتا جب کہ آدمی ہر چیز سے اوپر اٹھ کر "خدا کے حضور میں چلنے لگتا ہے"۔

ورنہ ہم سنت الٰہی کی زد میں آجائیں گے

سابق اہل کتاب (بنی اسرائیل) کو خدا کی طرف سے جو مشن سپرد ہوا، وہ تبیین کتاب (آل عمران ۱۸۷) تھا یعنی اللہ کے بندوں کو اللہ کا پیغام پہنچانا۔ بعد کے دور میں جب ان پر زوال آیا تو وہ اس کام کو چھوڑ کر دوسری راہوں پر چل پڑے۔ تاہم اپنے نعروں اور تقریروں میں اب بھی وہ تورات ہی کی زبان استعمال کرتے تھے۔ گویا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اقامتِ تورات کے لئے کر رہے ہیں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے موجودہ زمانہ کے یہودیوں کی صہیونی تحریک تمام تر ایک قومی تحریک ہے۔ مگر اس کے رہنما اپنی تقریروں اور تحریروں میں تورات کے حوالے دیتے ہیں۔ ایک ایسا کام جس کا خدائی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں، اس کو اس طرح پیش کر رہے ہیں گویا یہ سب کچھ خدائی احکام کی تعمیل میں کیا جا رہا ہے۔

یہود کے اس طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے:

ويحبون ان يحمدوا بما لم يفعلوا فلا تحسبنهم بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اليم (آل عمران - ۱۸۸)	وہ چاہتے ہیں کہ جو کام انھوں نے نہیں کیا، اس پر ان کی تعریف ہو۔ ان کو عذاب سے بچاؤ میں نہ سمجھو۔ اور ان کو دردناک سزا ہوگی۔

یہی معاملہ ہر اس قوم کا ہوتا ہے جس کو خدا کی کتاب کا حامل بنایا گیا ہو۔ بعد کے دور میں جب اس قوم پر زوال

آتا ہے اور وہ کتاب اللہ کو ایک چھوڑی ہوئی کتاب (فرقان ۳۰) بنا دیتی ہے تو یہ چھوڑنا صرف عملاً ہوتا ہے نہ کہ لفظاً۔ اس کی زندگی اور اس کی سیاست حقیقۃً دوسری راہوں پر چل رہی ہوتی ہے مگر اس کے رہنما اپنی غیر خدا پرستانہ تحریکوں کو ہمیشہ خدا پرستانہ اصطلاحات میں بیان کرتے ہیں۔ وہ ایک غیر دینی کام پر دین کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں۔" وہ چاہتے ہیں کہ ایک ایسے کام کے لئے ان کی تعریف کی جائے جس کو انھوں نے کیا نہیں۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ لمبی مدت گزرنے کی وجہ سے دینی الفاظ اور تصورات اس قوم کی روایات میں شامل ہو جاتے ہیں۔ قومی قیادت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ قوم کی مانوس دینی اصطلاحات میں کلام کرے۔ اس کے بغیر نہ رہنماؤں کا اعتماد قوم کے اندر قائم ہو سکتا اور نہ عوام کا پرجوش تعاون ان کو مل سکتا ——— یہی حال موجودہ زمانہ میں مسلم قیادت کا ہوا ہے۔ انھوں نے قومی جذبات کے تحت تحریکیں اٹھائیں اور ان کو اسلام کا تقاضا بلکہ انبیاء کا اصل مشن بتاتے رہے۔ انھوں نے ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا چاہا جس کو انھوں نے سرے سے انجام ہی نہیں دیا تھا۔

مسلم قیادت نے موجودہ زمانہ میں مغربی قوموں کے خلاف سیاسی آزادی کی تحریکیں چلائیں اور ان کو "جہاد" کا عنوان دیا۔ حالاں کہ جہاد خدا کے دین کی اشاعت و تبلیغ کے لئے جدوجہد کا نام ہے نہ کہ کسی ایسی سیاست کا جس کا مقصد یہ ہو کہ اجنبی حکمرانوں کو ہٹا کر ملکی لوگوں کو اقتدار کے تخت پر بٹھایا جائے۔ انھوں نے سیکولر مقاصد کے تحت متحدہ قومیت کا نعرہ لگایا اور اس کو جائز ثابت کرنے کے لئے "صحیفہ مدینہ" کا حوالہ دیا۔ حالاں کہ یہ صحیفہ مدینہ کے اوپر اسلام کے غلبہ کا اعلان تھا نہ کہ کسی مشترکہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کی شمولیت کا۔ یہ صحیفہ کوئی دو طرفہ معاہدہ نہ تھا۔ وہ "خدا کے پیغمبر محمدؐ کی طرف سے ایک نوشتہ تھا مہاجرین قریش اور اہل یثرب کے لئے۔" اس میں درج تھا: وانکم مھما اختلفتم فیہ من شیء فان مردہ الی اللہ والی رسولہ (اہل مدینہ کے درمیان جب کسی معاملہ میں اختلاف پیدا ہو تو اس کے فیصلہ کے لئے خدا اور اس کے رسول سے رجوع کیا جائے گا) کسی اکثریت کا سیکولر ضمیمہ بننے کی کوشش سے اس صحیفہ کا کیا تعلق۔ انھوں نے معاشی اور سماجی حقوق کے حصول کے لئے احتجاج و مطالبات کی تحریک چلائی اور اپنے منشور میں یہ لکھا کہ ہم خیر امت کا کردار ادا کرنے کے لئے اٹھے ہیں۔ حالاں کہ جن اقوام کے خلاف وہ حقوق طلبی کی مہم لے کر اٹھے تھے، وہ ان کے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی تھیں اور مدعو قوم سے "اجر" کا مطالبہ سراسر اسلام کے خلاف ہے۔ انھوں نے انسانی بھائی چارہ اور دنیوی امن کے لئے تقریری مہم چلائی اور کہا کہ یہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن تھا کیونکہ دور جاہلیت کے حلف الفضولؐ میں آپ شریک ہوئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مظلوموں کی مدد اور حقدار کو ان کا حق دلانے کے اس معاہدہ میں آپ نے اپنی پندرہ سال کی عمر میں شرکت فرمائی تھی۔ نبوت ملنے کے بعد آپ نے فرمایا: لو دعیتُ بہ فی الاسلام لاجبت (زمانہ اسلام میں بھی اگر مجھے اس کے لئے بلایا جائے تو میں لبیک کہوں گا) مگر

لہ اس معاہدہ کا نام حلف الفضول اس لئے پڑا کہ اس میں یہ جملہ تھا: تُردُّ الفضول الی اھلھا (سہیلی، روض الانف) یعنی مال ان کے مالکوں کو لوٹایا جائے گا۔

اولاً تو حلف الفضول تقریری دور دں کی کوئی مہم نہ تھی۔ وہ عملی وادرسی کا عہد نامہ تھا۔ دوسرے نبوت ملنے کے بعد آپ نے خود حلف الفضول کی تجدید نہیں کی بلکہ اس میں شرکت کو دوسروں کی پکار پر مشروط رکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حلف الفضول بجائے خود ایک جائز اور مطلوب کام ہونے کے باوجود بہرحال فلاح دنیا کے ذیل کا ایک پروگرام تھا۔ جب کہ نبوت کا اصل مشن فلاح آخرت کا پیغام ہوتا ہے۔ اسی طرح کچھ قائدین نے اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چھیڑدی اور اعلان کیا کہ شریعت اسلامی کے نفاذ اور قیادت صالحہ کے قیام کے لئے ہم ایسا کر رہے ہیں۔ حالاں کہ صریح ہدایات کے مطابق اسلام میں یہ جائز ہی نہیں کہ مسلم حکمرانوں سے سیاسی منازعت کی جائے۔

اس قسم کی تمام "اسلامی" مہمیں جن میں مسلمان موجودہ زمانہ میں مشغول رہے ہیں وہ سب کی سب يُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا کا مصداق ہیں۔ یہ ایک غیر اسلامی کام کے لئے اسلام کا کریڈٹ لینے کی کوشش ہے۔ اس قسم کی کوشش ہمیشہ خدا کی نصرت سے محروم رہتی ہے، اس لئے خواہ وہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کی جائے، وہ بہرحال بے نتیجہ رہے گی۔ وہ امت کے لئے کسی حقیقی کامیابی کا باعث نہیں بن سکتی۔ بائبل کی روایات کے مطابق دارا بادشاہ (پانچویں صدی قبل مسیح) کے زمانہ میں ایک حجّی نبی گزرے ہیں۔ انھوں نے یہود کی بگڑی ہوئی حالت پر ان کو تنبیہ کی۔ انھوں نے تمثیلی زبان میں کہا:

"رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی روش پر غور کرو۔ تم نے بہت سا بویا پر تھوڑا کاٹا۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ تم نے بہت کی امید رکھی اور دیکھو تھوڑا ملا اور جب تم اسے اپنے گھر میں لائے تو میں نے اسے اڑا دیا۔ کیوں۔ اس لئے کہ میرا گھر ویران ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے گھر کو دوڑا چلا جاتا ہے۔ اس لئے نہ آسمان سے اوس گرتی ہے اور نہ زمین اپنا حاصل دیتی ہے۔ (باب اول)

یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا انجام ہوا ہے۔ انھوں نے "بہت بویا پر تھوڑا کاٹا"۔ عالی شان تحریکوں اور دھواں دھار کانفرنسوں کا حاصل عملاً اتنا کم ہوتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمارا ہر قائد اپنی "محنت کی کمائی" کو سوراخ دار تھیلی میں جمع کر رہا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳ – ۱۷۶۲) نے احمد شاہ ابدالی کے ذریعہ مرہٹوں پر حملہ کرایا۔ سید احمد بریلوی (۱۷۸۶ – ۱۸۳۱) نے سکھوں سے جہاد کیا۔ مگر عملاً اس کا فائدہ صرف انگریز کو پہنچا۔ سید قطب مصری (۱۹۰۶ – ۱۹۶۶) اور ان کے ساتھیوں نے شاہ فاروق کے خلاف قربانیاں دیں۔ مگر اس کا فائدہ تمام تر فوجی افسروں کے حصہ میں چلا گیا۔ پاکستان میں اسلام پسندوں نے جمہوریت کے ذریعہ اسلام کا اقتدار لانے کے لئے ۳۰ سال تک سرفروشی کی۔ مگر اس کا فائدہ مسٹر بھٹو اور جنرل ضیاء الحق جیسے لوگوں کو ملا۔ ۱۹۴۴ میں جامعہ ازہر سے ایک جلوس نکلا جس کی قیادت شیخ حسن البنا (۱۹۰۶ – ۱۹۴۸) کر رہے تھے۔ ہزاروں پُرجوش مسلمانوں نے قاہرہ کی سڑکوں پر لبیک یا فلسطین (اے فلسطین ہم حاضر ہیں) کے نعروں کے ساتھ اسرائیل کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ پچھلے ۳۵ سال میں اس مہم میں جان و مال کی اتنی زیادہ

قربانیاں دی گئی ہیں جو تین سو سالہ صلیبی جنگوں کی مجموعی قربانی سے بھی زیادہ ہیں۔ مگر فلسطین کا مسئلہ نہ صرف یہ کہ حل نہیں ہوا۔ بلکہ جہاں وہ ۱۹۴۸ میں تھا، آج اس سے کہیں زیادہ دور جا چکا ہے۔

اس مدت میں ہمارے درمیان ایسے قائدین اٹھے جن کو بادشاہوں تک کا تعاون حاصل تھا (شاہ ولی اللہ، جمال الدین افغانی) ہم نے ایسی تحریکیں اٹھائیں جنھوں نے عظیم ترین آبادی والے ملک کے تقریباً تمام مسلمانوں کی تائید حاصل کر لی (مسلم لیگ) حتی کہ ہمارے درمیان ایسی بھی تحریکیں اٹھیں جن کو تمام عالم اسلام کی مشترکہ حمایت حاصل تھی (فلسطینی تحریک) اس کے باوجود صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ آج بھی یہ حال ہے کہ کسی جماعت کو یہ کہنے کا موقع مل رہا ہے کہ اس کے دینی اجتماعات میں دس دس لاکھ مسلمان شریک ہوتے ہیں (ہندستان) کسی اسلامی تحریک کے قائدین اپنی مقبولیت کو بتانے کے لئے یہ پُر فخر الفاظ بول رہے ہیں کہ ملک کا ہر فرد ان کے اسلامی نظام کے پروگرام سے اتفاق کرتا ہے (پاکستان) یہ سب کچھ ہے مگر وہی چیز حاصل نہیں ہوتی جو تمام قائدین اور جماعتوں کا مشترک مقصد ہے یعنی اسلام کا غلبہ۔

اصل یہ ہے کہ مسلمان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے نمائندہ کی ہے۔ وہ آسمانی کتاب کے حامل ہیں۔ ایسے کسی گروہ کی قسمت تمام تر اس کتاب کے ساتھ بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ خدا کی نظر میں ان کی قیمت اسی وقت ہے جبکہ وہ دنیا کی قوموں کے سامنے خدا کی کتاب کا اعلان و اظہار کر رہے ہوں۔ اس کام کو چھوڑنے کے بعد وہ خدا کی نظر میں اسی طرح بے قیمت ہو جائیں گے جس طرح پچھلے حاملین کتاب بے قیمت ہو گئے۔ کوئی دوسرا کام خواہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کیا جائے، خدا کی نظر میں ہم کو قیمت والا نہیں بنا سکتا۔

۱۹۶۲ میں چین نے ہندستان کی مشرقی سرحد پر حملہ کیا۔ چینی فوجیں آسام کے علاقہ میں گھس آئیں۔ اس وقت تیز پور (آسام) میں جو ہندستانی کمشنر تھا وہ اپنا دفتر چھوڑ کر بھاگ گیا اور اپنے وطن میں آکر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مقیم ہو گیا۔ حکومت کو معلوم ہوا تو اس نے کمشنر کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ اس پر سرکاری ڈیوٹی چھوڑنے کا مقدمہ چلایا گیا اور اس کو سخت سزا دی گئی۔ بچوں میں رہنا یا اپنے گھر کا انتظام سنبھالنا عام آدمیوں کے لئے کوئی غلط بات نہیں۔ مگر کمشنر کے لئے یہی بات ناقابل معافی جرم بن گئی۔ کیوں کہ کمشنر کی قیمت "تیز پور" میں تھی۔ گھر کے اندر نہ تھی۔ اگر وہ اپنے ڈیوٹی کے مقام پر جما رہتا تو اس وقت وہ حکومت کا نشان ہوتا۔ بلکہ وہ حکومت کے لئے عزت کا سوال بن جاتا۔ حکومت اس کو بچانے کے لئے اپنی پوری طاقت لگا دیتی۔ مگر جب اس نے اپنی وہ جگہ چھوڑ دی جہاں اس کو رکھا گیا تھا تو حکومت کی نظر میں اس نے اپنی قیمت کھو دی۔ اب وہ ہر حال میں مجرم تھا۔ خواہ کسی اور میدان میں وہ کتنی ہی سرگرمیاں دکھا رہا ہو، خواہ وہ بظاہر صحیح اور مفید ہی کام کیوں نہ کر رہا ہو۔

ہماری نجات اور کامیابی کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم خدا کی کتاب کی طرف لوٹیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اندیشہ ہے کہ ہم بھی اسی طرح سنت الٰہی کی زد میں آجائیں جس طرح اس سے پہلے یہود آگئے۔ اور اس کے بعد نہ دنیا میں ہماری کوئی قیمت ہو اور نہ آخرت میں۔ دوسرے دوسرے کاموں کو دعوت قرآن اور احیاء سنت کا نام دینا صرف ہمارے وزر (بوجھ) میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ کسی بھی حال میں ہماری نجات کا سبب نہیں بن سکتا۔

عصری اسلوب میں اعلیٰ ترین اسلامی کتابوں کا مکمل سٹ

دین کیا ہے	از	مولانا وحید الدین خاں	Rs. 1.50
الاسلام	//	//	12.00
تجدید دین	//	//	2.00
ظہور اسلام	//	//	12.00
حالات صحابہ	//	//	
زلزلۂ قیامت	//	//	3.00
تاریخ کا سبق	//	//	
تعمیر ملت	//	//	
مذہب اور جدید چیلنج	//	//	13.50
اسلامیات	//	//	
عقلیات اسلام	//	//	

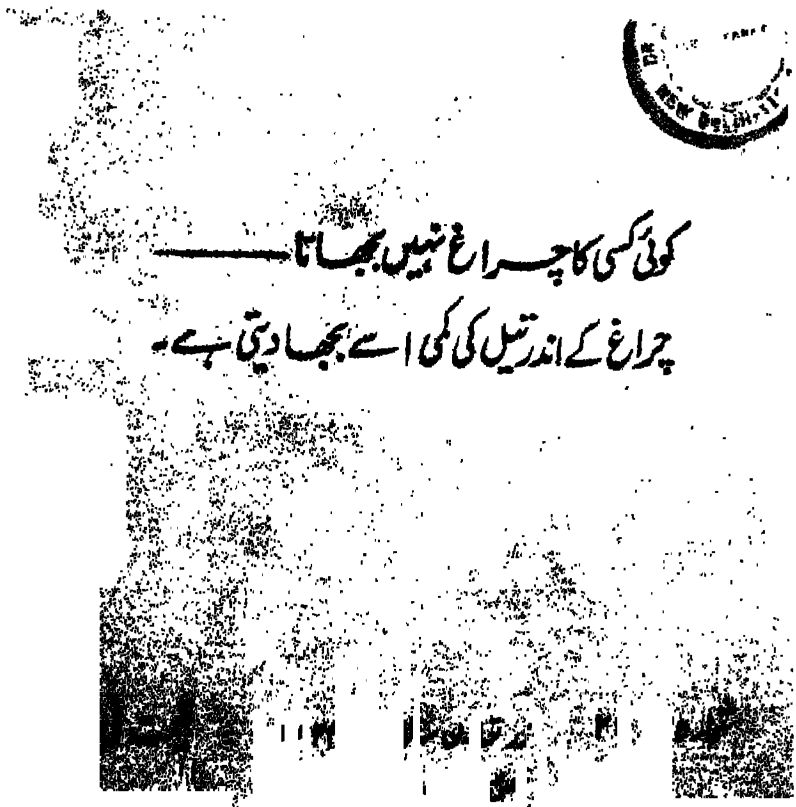
ماہنامہ **الرسالہ** تعمیری اور اصلاحی مضامین کے مستقل مطالعہ کے لئے زرتعاون سالانہ 24.00

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

MAKTABA AL-RISALA, JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 110006

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں



کوئی کسی کا چراغ نہیں بجھاتا ———
چراغ کے اندر تیل کی کمی اسے بجھا دیتی ہے۔

زلزلۂ قیامت

از

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ

جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی 110006

سال اشاعت ۱۹۷۸

ناشر مکتبہ الرسالہ
جمعیۃ بلڈنگ
قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

ایک شخص اپنے بچوں کے ساتھ باغ میں داخل ہوا۔ وہاں کیڑے مکوڑے تھے۔ چوہے اور چیونٹیاں تھیں۔ پھر سب کے بیچ میں ایک بھیانک بھیڑیا کھڑا ہوا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد اس کے منھ سے کیا چیخ نکلے گی۔ وہ بے ساختہ پکار اٹھے گا:

بچّو! بھیڑیا۔ بچاؤ اپنے کو بھیڑیے سے۔ بھیڑیے کے بھیانک چہرے کو دیکھنے کے بعد وہ دوسری تمام چیزوں کو بھول جائے گا۔ اس کو ایسا نظر آئے گا گویا سارا باغ بھیڑیا بن گیا ہے۔ اس کے سامنے اس کے سوا کوئی مسئلہ نہ ہوگا کہ بھیڑیے سے بچنے کی تدبیر کرے۔

ہم جس دنیا میں ہیں، اس میں بھی بہت سے مسائل ہیں۔ ویسے ہی جیسے باغ میں کیڑے اور چیونٹیاں۔ مگر انھیں کے بیچ میں ایک سب سے بڑا مسئلہ کھڑا ہوا ہے۔ یہ آخرت کا مسئلہ ہے۔ اگر ہم اس کو جان لیں تو ہم کو پوری کائنات میں آخرت کے سوا کوئی دوسری چیز دکھائی نہ دے۔ اس کے بعد ہم آخرت کے لئے پکاریں گے، نہ کہ "کیڑوں اور چیونٹیوں" کے لئے

طابع جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"قرآن کو پڑھ کر بڑا ڈر لگنے لگتا ہے" شری تیج پال سنگھ نے کہا "اس میں تو بس آگ کی اور جہنم کی باتیں ہیں" یہ دہلی کے ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم کے تاثرات ہیں۔ انھوں نے قرآن کا ہندی ترجمہ پڑھا تھا اور اس کے بعد دسمبر ۱۹۷۰ میں راقم الحروف سے مندرجہ بالا الفاظ کہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن میں سب سے زیادہ جس چیز کا بیان ہے، وہ آخرت کا عذاب ہی ہے۔ اسی کو قرآن کا مقصد نزول بتایا گیا ہے:

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ (شوریٰ ۷)	اور ہم نے عربی قرآن تمھارے اوپر اتارا تاکہ تو اس بڑی بستی اور اس کے آس پاس والوں کو خبردار کر دے اور جمع ہونے کے دن سے ڈرا دے جس میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ دوزخ میں۔

بار بار مختلف طریقوں سے انسان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ تمھارا اصل مسئلہ آخرت کا مسئلہ ہے۔ اس لئے وہاں کی پکڑ سے بچنے کی کوشش کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ (انعام ـ ۶)	اے ایمان والو اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن ہیں آدمی اور پتھر۔ اس پر سخت دل اور زور آور فرشتے مقرر ہیں۔

تمام انبیاء اسی لئے آئے کہ وہ لوگوں کو آنے والے دن کی چیتاونی دے دیں (انعام ۱۳۰)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس دعوت رسالت کا حکم دیا گیا، وہ قرآن کے الفاظ میں یہ تھی:

وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْآزِفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِينَ (مومن ـ ۱۸)	اور اس آنے والے دن سے ان کو ڈرا جب کہ کلیجے منہ کو آجائیں گے، غم سے بھرے ہوئے۔

قریش نے مکی دور میں اپنے ایک ہوشیار سردار عتبہ بن ربیعہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا کہ وہ آپ سے گفتگو کرکے معلوم کرے کہ آپ کا پیغام کیا ہے۔ واپسی کے بعد عتبہ نے اپنے ساتھیوں کو جو رپورٹ دی اس کے الفاظ یہ تھے:

مافهمت شيئا مما قال غير انه انذركم صاعقة مثل صاعقة عاد وثمود	انھوں نے جو کچھ کہا اس سے میں اس کے سوا اور کچھ نہیں سمجھا کہ وہ تم لوگوں کو عاد و ثمود جیسے عذاب سے ڈراتے ہیں

اسی احساس کے تحت یہ کتابچہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے تمام مضامین کا موضوع آخرت ہے۔ تاہم وہ معروف تصنیفی ترتیب کے مطابق تیار نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا انداز ترتیب شذرات یا خواطر کا سا ہے۔ اس کو جو چیز ایک مسلسل کتاب بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ہر صفحہ کا موضوع آخرت کی چیتاونی ہے۔ مختلف پہلوؤں سے اس سنگین مسئلہ کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے جو موت کے بعد آدمی کے سامنے آنے والا ہے

وحیدالدین ، ۱۵ مئی ۱۹۷۸

قال اللہ ، قال الرسول

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۔ جب ستارے بکھر جائیں گے۔ جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔ جب دس مہینے کی گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی۔ جب وحشی جانور اکھٹے ہو جائیں گے۔ جب دریا بھڑکائے جائیں گے۔ جب ایک ایک قسم کے لوگ اکھٹا کئے جائیں گے۔ جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی۔ جب اعمال نامے کھولے جائیں گے۔ جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا۔ جب دوزخ دہکائی جائے گی۔ جب جنت قریب لائی جائے گی۔ اس وقت ہر آدمی جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔ (تکویر)

جب آسمان پھٹ جائے گا۔ جب ستارے جھڑ جائیں گے۔ جب دریا بہہ پڑیں گے۔ جب قبریں کھول دی جائیں گی۔ اس وقت ہر شخص اپنے اگلے پچھلے اعمال کو جان لے گا۔ اے انسان تجھ کو کس چیز نے اپنے مہربان پروردگار کے متعلق بھول میں ڈال رکھا ہے۔ جس نے تجھ کو پیدا کیا۔ پھر تجھ کو درست کیا۔ پھر تجھ کو برابر کیا۔ اور جس صورت میں چاہا تم کو جوڑ دیا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ تم انصاف ہونے کو جھوٹ جانتے ہو۔ حالانکہ تمھارے اوپر نگہبان مقرر ہیں۔ معزز لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے۔ اور یقیناً برے لوگ دوزخ میں ہوں گے۔ انصاف کے دن اس میں داخل ہوں گے۔ وہ اس سے چھپ نہ سکیں گے۔ اور تم کو کیا خبر کہ وہ انصاف کا دن کیا ہے۔ اس دن کوئی کسی کا کچھ بھلا کرنے پر قادر نہ ہوگا۔ حکم اس روز صرف اللہ کا ہوگا (انفطار)

جب آسمان پھٹ جائے گا۔ وہ اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور یہی اسے واجب ہے۔ جب زمین پھیلا دی جائے گی۔ اور جو کچھ اس کے اندر ہے باہر اگل دے گی اور خالی ہو جائے گی۔ وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور یہی اسے واجب ہے۔ اے انسان تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔ پھر جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔ وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا۔ اور جس کا نامۂ اعمال اس کی پیٹھ پیچھے سے دیا جائے گا، وہ موت کو پکارے گا۔ وہ بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا۔ وہ اپنے لوگوں میں خوش خوش رہتا تھا۔ اس نے گمان کر رکھا تھا کہ خدا کی طرف لوٹنا نہیں ہے۔ کیوں نہیں۔ اس کا رب اس کو خوب دیکھ رہا تھا۔ (انشقاق)

ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں وہ چیزیں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ آسمان میں چرچراہٹ ہو رہی ہے اور حق ہے کہ اس میں چرچراہٹ ہو۔ آسمان میں چار انگل جگہ بھی نہیں مگر ایک فرشتہ اپنی پیشانی جھکائے ہوئے اللہ کے لئے سجدہ میں پڑا ہوا ہے۔ خدا کی قسم اگر تم وہ باتیں جانو جو میں جانتا ہوں تو تم ہنسو کم اور روؤ زیادہ۔ عورتوں میں تمھارے لئے لذت باقی نہ رہے۔ تم خدا کو پکارتے ہوئے میدانوں کی طرف نکل جاؤ۔ (ترمذی)

اسلام کا مطلب کیا ہے

اسلام کا مطلب ہے اپنے آپ کو خدا کے آگے سپرد (SURRENDER) کر دینا۔ مسلمان وہ ہے جو اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ وہ مرنے کے بعد ہر ایک سے اس کے کارنامہ زندگی کا حساب لے گا۔ اس کے بعد اپنے وفادار بندوں کے لئے دائمی جنت کا فیصلہ کرے گا، اور غیر وفادار بندوں کو دائمی جہنم میں ڈال دے گا۔ اس احساس کے تحت جو زندگی بنتی ہے، اس کو ایک لفظ میں آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کہہ سکتے ہیں۔

یہ احساس جب کسی دل میں پیدا ہو جائے تو اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ وہ ہر وقت خدا سے ڈرنے لگتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کو کھلے اور چھپے ہر حال میں دیکھ رہا ہے، بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ انصاف اور خیر خواہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ہر انسان کے پیچھے اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔ وہ کبھی اس بات کو نہیں بھولتا کہ بالآخر وہی چیز صحیح قرار پائے گی جس کو خدا صحیح کہے اور وہ سب کچھ غلط ٹھہرے گا جس کو خدا غلط ٹھہرائے۔

اسی کے ساتھ مسلمان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی اس حقیقت کو دوسری تمام قوموں تک پہنچائے۔ اس سنگین واقعہ سے لوگوں کو باخبر کرنے کے لئے پہلے انبیاء آتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری نبی آخر الزماں کی امت پر ڈال دی گئی ہے، مسلمان پر جس طرح خود عمل کرنے کی ذمہ داری ہے، اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔ ان میں سے کوئی ایک کام، دوسرے کام کے لئے خدا کے یہاں عذر نہیں بن سکتا۔

قیامت کا زلزلہ بڑا ہولناک ہے

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ یَوْمَ تَرَوْنَھَا تَذْھَلُ کُلُّ مُرْضِعَۃٍ عَمَّا اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَھَا وَتَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَمَا ھُمْ بِسُکٰرٰی وَلٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰہِ شَدِیْدٌ

لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی ہولناک چیز ہے۔ جس روز تم اس کو دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے اس بچہ کو بھول جائے گی جس کو دودھ پلایا تھا اور ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا۔ لوگ تم کو نشہ کی سی حالت میں دکھائی دیں گے۔ حالاں کہ وہ نشہ میں نہ ہوں گے۔ بلکہ اللہ کا عذاب بے حد سخت ہے۔ (حج ۱-۲)

ایک فرانسیسی مصنف نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے ۲۵ واں گھنٹہ (25th HOUR) مصنف نے دنیا کی تمام تہذیبوں کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ انسانیت اب اپنی بربادی کے آخری کنارے پر ہے۔ ہمارے ۲۴ گھنٹے ختم ہو چکے ہیں:

24th HOUR IS PAST

یہی بات دنیا کے آخری انجام کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قیامت بالکل اچانک آئے گی۔ گویا ہمارا ہر لمحہ آخری لمحہ ہے۔ ہر وقت یہ امکان ہے کہ انسانیت اپنی مہلتِ عمر پوری کر چکی ہو۔ انسان اپنے "۲۴ گھنٹوں" کو ختم کر کے ۲۵ ویں فیصلہ کن گھنٹے میں داخل ہو جائے۔

یہ دنیا امتحان گاہ ہے اور ہر آدمی امتحان میں کھڑا ہوا ہے۔ وہ کوشش کرے تو امتحان میں اعلیٰ امتیاز کے ساتھ اپنے کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اور اگر وہ غافل رہے تو دوسرے انجام کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آپ ہر آدمی کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے خواہ وہ اس کو کتنا ہی زیادہ ناپسند کرتا ہو۔

"زندگی صرف ایک بار ملتی ہے" کالج کے ایک استاد نے کہا "میں بی ایس سی کر کے ملازمت میں لگ گیا۔ ایم ایس سی نہیں کیا۔ اب کتنے اعلیٰ مواقع میرے سامنے آتے ہیں۔ مگر میں ان سے صرف اس لئے محروم رہتا ہوں کہ میرے پاس ماسٹر ڈگری نہیں"

یہی انجام زیادہ بڑے پیمانہ پہ آخرت میں ظاہر ہونے والا ہے۔ ہر آدمی کے سامنے عالی شان مواقع ہوں گے۔ مگر وہ ان سے محروم رہے گا۔ کیوں کہ ان کے لئے اس نے دنیا میں تیاری نہیں کی تھی۔

ساری پوتھی نہیں دیکھی جائے گی

ایک بزرگ راستہ چل رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے معتقدین کی ایک بڑی جماعت تھی۔ راستہ میں ایک فقیر نے روکا:

"آپ نے بہت کچھ پڑھا اور جانا ہوگا۔ ایک بات میری بھی سن لیجئے"۔ اس نے کہا اور پھر ایک وقفہ کے بعد بولا: "سنئے! وہاں کسی کی ساری پوتھی نہیں دیکھیں گے۔ آدمی پیچ بیچ جہاں ہے، بس وہیں انگلی رکھ دی جائے گی"۔ اتنا کہا اور خاموشی سے غائب ہوگیا۔

آدمی لوگوں کے درمیان اس سے جانا جاتا ہے کہ وہ مقرر ہے، مصنف ہے، فلاں عہدے اس کے پاس ہیں۔ فلاں فلاں ملکوں کی اس نے سیاحت کی ہے۔ اتنے آدمیوں کی جماعت اس کے ساتھ ہے۔ اس نے فلاں فلاں کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وغیرہ۔ مگر اکثر یہ تمام چیزیں مصنوعی ہوتی ہیں۔ انسان حقیقۃً کہیں اور ہوتا ہے، مگر دیکھنے میں کہیں اور نظر آتا ہے۔ اس کی تمام سرگرمیاں اپنی ذات کے گرد گھومتی ہیں۔ اگرچہ بظاہر یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے دین کے لئے سرگرم عمل ہے۔

کوئی انسان کہاں ہے، یہ ہم نہیں جان سکتے۔ مگر خدا اس کو اچھی طرح جانتا ہے۔ آخرت میں کسی آدمی کی زندگی کے ٹھیک اسی مقام پر وہ انگلی رکھ دے گا جہاں وہ حقیقۃً جی رہا تھا۔

ایک وزیر اعظم جب اقتدار کی کرسی پر ہو تو ملک کی تمام رونقیں اس کے جلو میں چلتی ہیں۔ ہر طرف بس اسی کے شاندار کارناموں کی دھوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس سے بڑھ کر انسانیت کا پیکر اور کوئی نہیں۔ مگر جب عوام کی عدالت اس کو بے نقاب کرتی ہے اور اس کو مصنوعی رونقوں کے تخت سے اتار کر وہاں رکھ دیتی ہے جہاں وہ فی الواقع تھا تو اچانک دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ اس کی بظاہر روشن زندگی مکمل طور پر ایک تاریک زندگی تھی۔ وہ تمام تر اپنی ذات کی سطح پر جی رہا تھا۔ اگرچہ اس کے تحت ابلاغ کے تمام محکمے رات دن اس پروپگنڈے میں مصروف تھے کہ وہ خدمت قوم اور تعمیر ملک کی سطح پر زندگی گزار رہا ہے۔ اسی مثال سے آخرت کے معاملہ کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اسلام وہی ہے جو زندگی میں بھونچال بن کر داخل ہو

موجودہ زمانہ کے بعض ملحد مفکرین نے دیکھا کہ انسان کسی طرح مذہب کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ انھوں نے مذہب کو ایک ناگزیر نفسیاتی ضرورت کے طور پر مان لیا۔ البتہ انھوں نے کہا کہ مذہب کی بنیاد خدائی الہام پر نہیں ہونی چاہئے۔ اس فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے جولین ہکسلے نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے:

RELIGION WITHOUT REVELATION

(مذہب بغیر الہام)۔ اس قسم کا مذہب تو ابھی عملاً وجود میں نہیں آیا۔ تاہم "اسلام بغیر آخرت" کے بہت سے نسخے ہمارے یہاں رائج ہو گئے ہیں۔ اس اسلام میں سب کچھ ہے مگر جہنم کا اندیشہ نہیں۔ اصحاب رسول کو جو اسلام ملا تھا، اس نے انھیں اس درجہ بے قرار کر دیا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جہنم کی آگ انھیں کے لئے بھڑکائی گئی ہے۔ اب اسلام کے مجاہدین نے ایسا اسلام دریافت کر لیا ہے جس کے خزانے میں صرف جنت ہی جنت ہے۔ جہنم کا اس میں کہیں گزر نہیں۔

کچھ لوگوں کے لئے ان کی دنیا کی کامیابی ہی اس بات کی یقینی علامت ہے کہ ان کی آخرت بھی ضرور کامیاب ہوگی۔ کچھ لوگوں نے ایسے زندہ یا مردہ بزرگ پالئے ہیں جن کا دامن تھام لینے کے بعد اب ان کے لئے آخرت کا کوئی خطرہ نہیں۔ کچھ لوگ اتنے خوش قسمت ہیں کہ معمولی معمولی باتوں پر صبح و شام ان کے لئے جنت کے محلات رزرو ہو رہے ہیں، پھر ان کو آخرت سے ڈرنے کی کیا ضرورت۔ کچھ لوگوں کو اسلام نے عالیشان سیاسی منصوبے دیئے ہیں اور وہ قائدانہ اعزازات کے زیر سایہ جنت کا راستہ طے کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اور بھی زیادہ آسان راستہ تلاش کر لیا ہے —— جگمگاتے ہوئے پنڈالوں میں تقریر کے کرتب دکھاؤ اور سیدھے جنت الفردوس میں پہنچ جاؤ۔

اس قسم کا اسلام خواہ دنیا میں کتنا ہی دلفریب نظر آتا ہو، آخرت میں اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ آخرت میں کام آنے والا اسلام وہ ہے جو آدمی کی زندگی میں بھونچال بن کر داخل ہوا ہو۔ جو قیامت کے زلزلہ سے پہلے آدمی کے لئے زلزلہ ثابت ہو۔ اس قسم کا اسلام جب کسی کو ملتا ہے تو اس کے لئے ہر معاملہ خدا کا معاملہ بن جاتا ہے۔ "چھوٹے" کو بے عزت کرتے ہوئے اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ رب العالمین کے سفیر کو بے عزت کر رہا ہے۔ "بڑے" کی خوشامد کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ خدا کی غیرت کو چیلنج کر رہا ہے۔ حق واضح ہونے کے بعد اس کو نظر انداز کرنا اس کے نزدیک ایسا ہی بن جاتا ہے جیسے کوئی شخص جنت اور جہنم کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھے، پھر بھی جنت کو چھوڑ کر جہنم میں کود پڑے۔

عمل کی حقیقی سطح پر آدمی ناکام رہتا ہے، اور مصنوعی سطح پر کامیابی کے جھنڈے لہرا رہا ہے

امریکہ میں انسانی حقوق کے عنوان پر ایک بین اقوامی سیمینار ہو، اس کے لئے آپ کے پاس دعوت نامہ آئے۔ آپ ہوائی جہاز سے اڑ کر امریکہ پہنچیں اور وہاں شاندار اسٹیج پر ایک تقریری ریکارڈ دہرا دیں۔ تو یہ خبر فوراً اخبارات میں چھپ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر آپ کو آخرت کا ڈر ہے۔ اور جہنم کے اندیشے کے تحت آپ لوگوں کے حقوق ادا کرتے ہیں تو یہ واقعہ کبھی اخبار کی سرخی نہیں بنے گا۔

آخر الذکر، عمل کی حقیقی سطح ہے۔ اول الذکر، عمل کی مصنوعی سطح۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ہر شخص، خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، عمل کی مصنوعی سطح پر زندگی گزار رہا ہے۔ وہ ان امور میں تو خوب کارنامے دکھاتا ہے جن میں "نیوز ویلو" ہو، جن سے اس کی امیج بنتی ہو، جن میں عزت و جاہ کے استقبالیے وصول ہوتے ہوں، جن میں حق کی علم برداری کا عالمی کریڈٹ ملتا ہو، جو اس کو اخبار کی سرخیوں میں جگہ دینے والے ہوں ـــــ مصنوعی سطح کی چمک دمک نے لوگوں کو اتنا زیادہ اپنی طرف کھینچ رکھا ہے کہ عمل کی حقیقی سطح کی طرف توجہ دینے کی کسی کو فرصت نہیں۔

دوسری طرف لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی معاملہ پڑ جائے تو وہ کچے ثابت ہوں، کسی سے اختلاف پیدا ہو تو انصاف پر قائم نہ رہ سکیں، ان کی غلطیاں روز روشن کی طرح واضح ہو جائیں جب بھی وہ اعتراف نہ کریں۔ ایک مظلوم ان سے بے لاگ فیصلہ کی امید نہ کر سکے۔ خدا کی کھلی کھلی نشانیاں ظاہر ہوں مگر وہ عبرت نہ پکڑیں۔ وہ اپنے دل کو حسد، بغض، کینہ، نفرت، عصبیت سے پاک نہ کریں۔ وہ طاقت کے آگے جھک جائیں، مگر دلیل کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ خدا کی آیتیں سن کر ان کے دل نہ دہلیں اور آخرت کی جواب دہی کے خوف سے ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے نہ ہوں۔

لوگ عمل کی مصنوعی سطح پر کامیابی کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ اور عمل کی جو حقیقی سطح ہے وہاں ناکامی کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں ـــــ جلسوں اور کنونشنوں کی دھوم ہے، جہاد اور انقلاب کے نعرے لگ رہے ہیں۔ دوسری طرف خاموش تعمیری کام کا سارا میدان خالی پڑا ہوا ہے اور اس کے لیے کوئی نہیں اٹھتا۔

دعا آدمی کی پوری ہستی سے نکلتی ہے

نہ کہ محض زبانی الفاظ سے

حضرت مسیح نے اپنے ایک وعظ میں فرمایا: مانگو تو تم کو دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمھارے واسطے کھولا جائے گا۔ کیوں کہ جو کوئی مانگتا ہے اسے ملتا ہے۔ اور جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے، اور جو کھٹکھٹاتا ہے اس کے واسطے کھولا جائے گا۔ تم میں ایسا کون آدمی ہے کہ اگر اس کا بیٹا اس سے روٹی مانگے تو وہ اس کو پتھر دے۔ یا اگر مچھلی مانگے تو اس کو سانپ دے۔ پس جب کہ تم برے ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینا جانتے ہو تو تمھارا باپ جو آسمان پر ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دے گا۔ (متی ۷: ۷-۱۲)

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا سے مانگنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔ مگر مانگنا صرف کچھ لفظوں کو دہرانے کا نام نہیں ہے۔ مانگنا وہی مانگنا ہے جس میں آدمی کی پوری ہستی شامل ہو گئی ہو۔ ایک شخص زبان سے کہہ رہا ہو "خدایا مجھے اپنا بنا لے" مگر عملاً وہ اپنی ذات کا بنا رہے، تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے مانگا ہی نہیں۔ اس کو جو چیز ملی ہوئی ہے، وہی دراصل اس نے خدا سے مانگی تھی، خواہ زبان سے اس نے جو لفظ بھی ادا کئے ہوں۔

ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں کہ ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دیدے۔ آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو خدا فراموشی میں مبتلا کر دے۔ آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور وہ آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے۔ آپ کیفیت سے بھری ہوئی دینداری مانگیں اور وہ آپ کو بے روح دین داری میں پڑا رہنے دے۔ آپ حق پرستی مانگیں اور وہ آپ کو شخصیت پرستی کی کوٹھری میں بند کر دے۔

آپ کی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔ اگر آپ کو دودھ خریدنا ہو اور آپ چھلنی لے کر بازار جائیں تو پیسے خرچ کرنے کے بعد بھی آپ خالی ہاتھ واپس آئیں گے۔ اسی طرح اگر آپ زبان سے دعا کے کلمات دہرا رہے ہوں مگر آپ کی اصل ہستی کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ ہو تو یہ کہنا صحیح ہو گا کہ نہ آپ نے مانگا تھا اور نہ آپ کو ملا۔ جو مانگے وہ کبھی پائے بغیر نہیں رہتا۔ یہ مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدایا میں نے تجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے نہ دی۔ بخدا یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح و شام اپنے تمام خزانوں کے ساتھ آپ کے قریب آکر آواز دیتا ہے —— "کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اسے دوں" مگر جنھیں لینا ہے وہ اندھے بہرے بنے ہوئے ہوں تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔

"میرے لئے ایک سائیکل خرید دیجئے" بیٹے نے باپ سے کہا۔ باپ کی آمدنی کم تھی۔ وہ سائیکل خریدنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اس نے ٹال دیا۔ لڑکا بار بار کہتا رہا اور باپ بار بار منع کرتا رہا۔ بالآخر ایک روز باپ نے ڈانٹ کر کہا "میں نے کہہ دیا کہ میں سائیکل نہیں خریدوں گا۔ اب آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات مت کرنا۔"

یہ سن کر لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے بعد روتے ہوئے بولا: "آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں۔" اس جملہ نے باپ کو تڑپا دیا۔ اچانک اس کا انداز بدل گیا۔ اس نے کہا۔ اچھا بیٹے اطمینان رکھو میں تمہارے لئے سائیکل خرید دوں گا۔ اور کل ہی خریدوں گا۔" یہ کہتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ اگلے دن اس نے پیسہ کا انتظام کر کے بیٹے کے لئے نئی سائیکل خرید دی۔

لڑکے نے بظاہر ایک لفظ کہا تھا۔ مگر یہ ایک ایسا لفظ تھا جس کی قیمت اس کی اپنی زندگی تھی، جس میں اس کی پوری ہستی شامل ہو گئی تھی۔ اس لفظ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے سرپرست کے آگے بالکل خالی کر دیا ہے۔ یہ لفظ بول کر اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے نقطہ پر کھڑا کر دیا جہاں اس کی درخواست اس کے سرپرست کے لئے بھی اتنا ہی بڑا مسئلہ بن گئی جتنا خود اس کے لئے۔

اس واقعہ سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ذکر الٰہی کی وہ کون سی قسم ہے جو میزان کو بھر دیتی ہے اور جس کے بعد خدا کی رحمتیں بندے کے اوپر امڈ آتی ہیں۔ یہ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی "نصاب" ہے۔ یہ ذکر کی وہ قسم ہے جس میں بندہ اپنی پوری ہستی کو انڈیل دیتا ہے۔ جب بندے کی آنکھ سے عجز کا وہ قطرہ ٹپک پڑتا ہے جس کا تحمل زمین و آسمان بھی نہ کر سکیں۔ جب بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے ساتھ اتنا زیادہ شامل کر دیتا ہے کہ "بیٹا" اور "باپ" دونوں ایک ترازو پر آجاتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب کہ ذکر محض لغت کا لفظ نہیں ہوتا بلکہ ایک شخصیت کے پھٹنے کی آواز ہوتا ہے۔ اس وقت خدا کی رحمتیں اپنے بندے پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ بندگی اور خدائی دونوں ایک دوسرے سے راضی ہو جاتی ہیں۔ قادر مطلق عاجز مطلق کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

مارشل اسٹالن (۱۹۵۴ــ۱۸۷۹) تاریخ کے پہلے ملحدانہ نظام کے سربراہ تھے۔ ان کو ۳۰ سال تک انتہائی مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرنے کا موقع ملا۔ مگر ان کی موت اتنے بھیانک حالات میں ہوئی کہ ان کی اکلوتی لڑکی سوتلانا نے الحاد کو چھوڑ کر مذہبی زندگی اختیار کر لی۔

"میرا باپ ایک مشکل اور بھیانک موت مرا" سوتیلانا لکھتی ہے "یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کسی شخص کو مرتے ہوئے دیکھا۔ ہیمورج آہستہ آہستہ اس کے دماغ کے بقیہ حصوں میں پھیل رہا تھا۔ چوں کہ اس کا دل صحت مند اور مضبوط تھا۔ اس نے سانس کے مرکز کو بتدریج متاثر کیا اور اس کی وجہ سے گلا گھٹنے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کی سانس کم سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ آخری بارہ گھنٹوں میں آکسیجن کی کمی بڑی سنگین تھی۔ اس کا چہرہ بدل گیا اور کالا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ بھی سیاہ پڑ گئے اور شکل پہچاننی مشکل ہو گئی۔ آخری لمحات میں اس پر اختناق کی حالت طاری تھی۔ موت کی تکلیف ہولناک تھی۔ دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔

بالکل آخری لمحات میں اچانک اس نے آنکھ کھول دی اور کمرہ کے ہر شخص پر ایک نظر ڈالی۔ یہ دیکھنے کا منظر بھی بڑا بھیانک تھا۔ وہ پاگلا ہو رہا تھا یا غصہ میں تھا۔ اس پر دہشت طاری تھی۔ شاید موت کے ڈر سے اور ڈاکٹروں کے نامانوس چہروں سے جو اس کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔ اس کی نظر ایک سکنڈ میں سب کے اوپر سے گزر گئی۔ تب ایک ہولناک اور ناقابل فہم واقعہ ہوا۔ جس کو آج تک نہ میں بھلا سکی ہوں اور نہ سمجھ سکی ہوں۔ اس نے اچانک اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا جیسے وہ اوپر کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتا تھا۔ اور کوئی آتا ہوا عذاب ہم سب پر ڈال دینا چاہتا تھا۔ اشارہ ناقابل فہم تھا اور خوف سے بھرا ہوا تھا۔ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس کی طرف یا کس چیز کی جانب اشارہ کرنا چاہتا تھا۔ اگلے لمحہ ایک آخری کوشش کے بعد، جھٹکا ہوا اور جان اس کے جسم سے نکل گئی۔ (انڈین ایکسپریس ۱۲ ستمبر ۱۹۶۷)

غیر اسلامی زندگی یہ ہے کہ آدمی کی سرگرمیوں کا رخ دنیا کی طرف ہو جائے — اس کو اپنے مادی مفادات سے دلچسپی ہو، وہ اپنے دنیوی مستقبل کی تعمیر میں لگا ہوا ہو۔ وہ انھیں چیزوں کے لئے متحرک ہوتا ہو جس میں اس کے دنیوی معاملات درست ہوتے ہوں، جس میں اس کی شخصیت نمایاں ہو، جس میں اس کے احساس برتری کو تسکین ملتی ہو۔

اس کے برعکس اسلامی زندگی آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) ہوتی ہے۔ مومن کی دلچسپیوں کا مرکز آخرت ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اخروی مستقبل کی فکر میں رہتا ہے۔ اس کو خدا کے یہاں سرخرو ہونے کا شوق رہتا ہے نہ کہ دنیا میں اپنی ایمج بنانے کا۔ اس کی توجہ، اس کی تمنائیں، اس کی سرگرمیاں سب آخرت کے گھر کو بنانے کی طرف لگی رہتی ہیں۔ مختصر یہ کہ غیر مومن دنیا میں زندگی گزارتا ہے اور مومن آخرت میں۔ غیر مومن مرنے کے بعد اپنی آخرت کو دیکھے گا اور مومن دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔

ہم میں سے ہر شخص زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہے۔ یہ احساس اگر زندہ ہو تو آدمی ہر موت کو اپنی موت سمجھے۔ وہ دوسرے کا جنازہ دیکھے تو ایسا معلوم ہو گویا خود اس کی لاش اٹھا کر قبر کی طرف لے جائی جا رہی ہے۔

۲۴ راگست ۱۹۷۷ کو دہلی کے اخبارات کا پہلا صفحہ بڑا عبرت ناک تھا۔ اس میں شری بنسی لال کی گرفتاری کی خبر تھی۔ اسی کے ساتھ ایک تصویر تھی جس میں ہندستان کے سابق وزیر دفاع کو پولیس کی حراست میں دکھایا گیا تھا۔ اپریل ۱۹۷۷ کے الکشن میں کانگرس کی شکست سے پہلے جو شخص وزیر اعظم کے بعد ملک کا دوسرا سب سے طاقت ور آدمی سمجھا جاتا تھا، وہ یہاں ہتھکڑی میں بندھا ہوا نظر آرہا تھا۔

اخبار پڑھنے والوں کے لئے یہ کوئی انوکھی خبر نہیں۔ اس قسم کی گرفتاری کی خبریں آئے دن اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں بتایا جاتا ہے کہ ایک شخص جو کل اعلیٰ اختیارات کا مالک تھا۔ آج اس کو ایک معمولی آدمی کی طرح پکڑ کر جیل کی کوٹھری میں بند

آدمی اگر خدا کی پکڑ سے ڈرتا ہو تو
ہر گرفتاری کو وہ اپنی گرفتاری سمجھے
دوسرے کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگتی ہوئی دیکھے
تو اس کو محسوس ہو گویا خود اسی کو باندھا جا رہا ہے

کر دیا گیا ہے۔ کل تک وہ وی وی آئی پی (VVIP) تھا آج وہ صرف ایک مجرم ہے، ایسا مجرم جس کو قانون نے اپنی تمام بے رحمیوں کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

موت بھی اسی قسم کی ایک گرفتاری ہے۔ وہ تمام دوسری گرفتاریوں سے زیادہ سخت ہے۔ کیوں کہ وہ زمین و آسمان کے مالک کی طرف سے اس کے بندوں کی گرفتاری ہے۔ گرفتاری کا یہ دن ہر آدمی کی طرف تیزی سے دوڑا چلا آرہا ہے۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ "بنسی لال" اور "بھٹو" کی گرفتاری سے تو خوب واقف ہیں۔ مگر خود اپنی گرفتاری کی انھیں خبر نہیں۔ وہ دوسروں کے پکڑے جانے کا خوب چرچا کرتے ہیں۔ مگر اس دن کو یاد نہیں کرتے جب کہ خدا کے فرشتے خود ان کو اس سے زیادہ بے رحمی کے ساتھ پکڑ کر خدا کی عدالت میں حاضر کر دیں گے۔

خدائی گرفتاری کا یہ دن اتنا ہولناک ہے کہ اگر آدمی کو اس کا واقعی احساس ہو جائے تو ہر گرفتاری کو وہ اپنی گرفتاری سمجھے۔ دوسرے کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگتی ہوئی دیکھے تو اس کو ایسا محسوس ہو گویا خود اسی کو باندھا جا رہا ہے۔ (۹ مئی ۱۹۷۸)

۱۷۷۵ میں یورپ کے ایک شہر میں تباہ کن زلزلہ آیا۔ چند روز بعد لوگوں نے دیکھا کہ ایک آدمی آواز لگاکر بھونچال روک گولی (ANTI-EARTHQUAKE PILL) بیچ رہا ہے۔ کسی نے پوچھا کہ تمہاری یہ گولی بھونچال کو کس طرح روکے گی۔ اس نے فوراً جواب دیا:

BUT WHAT IS THE ALTERN...

(پھر دوسری صورت کیا ہے)۔ بھونچال روک گولی کا یہ کاروبار اگرچہ آگے نہیں بڑھا۔ وہ محض لطیفہ بن کر رہ گیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ سب سے بڑے بھونچال (زلزلہ آخرت) کے لئے لوگوں نے اسی قسم کی گولیاں بنالی ہیں اور نہایت بڑے پیمانہ پر اس کا کاروبار ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔

بھونچال روک گولی کے ایک بہت بڑے مبلغ لکھتے ہیں:

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دو خصلتیں ایسی ہیں کہ جو مسلمان ان کا اہتمام کرے، جنت میں داخل ہو اور وہ دونوں بہت معمولی چیزیں ہیں۔ مگر ان پر عمل کرنے والے بہت کم ہیں۔ ایک یہ کہ سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر ہر نماز کے بعد دس دس مرتبہ پڑھ لیا کرے تو روزانہ ایک سو پچاس مرتبہ (پانچوں نمازوں کے بعد کا مجموعہ) ہو جائے گا اور دس گنا ہو جانے کی وجہ سے ۱۵۰۰ نیکیاں حساب میں شمار کی جائیں گی۔ اور دوسری چیز یہ کہ سوتے وقت اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ۔ الحمد للہ ۳۳ مرتبہ، سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ پڑھ لیا کرے تو ۱۰۰ کلمے ہو گئے جس کا ثواب دس گنا بڑھ کر ایک ہزار نیکیاں ہوگئیں۔ اب ان کی اور دن بھر کی نمازوں کے بعد کی میزان کل دو ہزار پانچ سو نیکیاں ہو گئیں۔ بھلا اعمال تولنے کے وقت ڈھائی ہزار برائیاں روزانہ کی کس کی ہوں گی جو ان پر غالب آجائیں" (۱۴۳) "ایک حدیث میں ارشاد نبوی ہے کہ کوئی شخص تم میں سے اس بات کو نہ چھوڑے کہ ہزار نیکیاں روزانہ کر لیا کرے۔ سبحان اللہ وبحمدہ سو مرتبہ پڑھ لیا کرے۔ (دس گنا بڑھ کر) یہ ہزار نیکیاں ہو جائیں گی۔ اتنے گناہ تو انشاء اللہ روزانہ کے ہوں گے بھی نہیں۔ اور اس تسبیح کے علاوہ جتنے نیک کام کئے ہوں گے ان کا ثواب علیحدہ نفع میں رہا" (۱۴۶)

مغفرت کا معاملہ اگر اس قسم کے سادہ حساب کا معاملہ ہوتا تو صحابہ کا یہ حال نہ ہوتا کہ وہ آخرت کے خوف سے بے قرار رہتے اور یہ کہتے کہ کاش میں ایک تنکا ہوتا، کاش میں ایک درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا۔

اس قسم کا عجیب و غریب اسلام اس لئے وجود میں آیا کہ ذکر کو ورد کے ہم معنی سمجھ لیا گیا۔ اب گناہ اور ثواب دونوں گنتی کی چیز بن گئے اور یہ ممکن ہو گیا کہ ایک گنتی کی کمی کو دوسری گنتی کی زیادتی سے برابر کر لیا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ذکر کوئی شماریاتی چیز نہیں۔ ذکر اپنی شعوری ہستی کا نذرانہ ہے۔ بندہ جب اپنے رب کو اس کی تمام عظمتوں کے ساتھ پالیتا ہے تو اس کا پورا وجود اس کی یاد میں غرق ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام ذکر ہے۔ یہ ذکر آدمی کے اندر قناعت یا بے خوفی پیدا نہیں کرتا، بلکہ وہ آدمی کو خوف و دہشت سے بھر دیتا ہے۔ خدا کے جلال و جبروت کی یاد جس کے اندر بے خوفی کی نفسیات پیدا کرے، اس نے خدا کو یاد ہی نہیں کیا۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ بندہ جب خدا کو یاد کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔ خدایا ہم کو آگ کے عذاب سے بچا (رَبَّنَا فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ، آل عمران)

جب کسی کے لئے یہ موقع نہ ہوگا کہ حق کو ٹھکرا کر بھی وہ حق کا چیمپین بنا رہے

کسی کے اسلام نے اس کو یہ اطمینان عطا کیا ہے کہ جنت کے محلات اس کے لئے ریزرو ہیں۔ کسی کے اسلام نے اس کو تقریر و خطابت کا شاندار عنوان دے رکھا ہے۔ کسی کا اسلام اس کو انقلاب عالم کا چیمپین بنائے ہوئے ہے۔

بخدا یہ وہ اسلام نہیں جس کو رسول اور اصحاب رسول نے پایا تھا۔ لوگ اگر اس اسلام کو پالیں تو ان کی زبانیں بند ہو جائیں۔ ان کی آنکھیں آنسو بہائیں اور ان کے دل خدا کے خوف سے لرز اٹھیں۔ روشنی کے بجائے تاریکی اور پر رونق مجالس کے بجائے تنہائیاں ان کی محبوب ترین چیز بن جائیں۔ دوسروں کے سامنے شاندار تقریروں کا کرشمہ دکھانا ان کو بے ہودہ فعل معلوم ہونے لگے۔ اپنی غلطیوں اور حماقتوں کا جائزہ لینے میں وہ اتنا مشغول ہوں کہ دوسروں کے پیچھے دوڑنے کی انھیں فرصت نہ رہے۔

آج کی دنیا میں آدمی کھاتا پیتا ہے۔ گھر بناتا ہے۔ عہدے اور مناصب حاصل کرتا ہے۔ اعزازات وصول کرنے کے لئے دوڑتا ہے۔ یہ صورت حال اس کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہے۔ وہ اپنی موجودہ حیثیت کو مستقل حیثیت سمجھ بیٹھا ہے۔ حالانکہ اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک بے زور کیڑا ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب کہ اس کی یہ تمام اضافی حیثیتیں چھین لی جائیں گی۔ حتیٰ کہ لباس بھی اتار لیا جائے گا جو آدمی کے اثاثہ کی آخری چیز ہوتا ہے۔ وہ اچانک اپنے آپ کو اس حال میں پائے گا کہ وہ "ننگے جسم، ننگے پاؤں اور غیر مختون" حالت میں رب العالمین کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔

اس دن ساری اونچ نیچ مٹ جائے گی۔ خوف و دہشت سے لوگوں کی زبانیں بند ہو چکی ہوں گی۔ آدمی کے اپنے وجود کے سوا ہر چیز اس کا ساتھ چھوڑ دے گی۔ کسی کے لئے یہ موقع نہ ہوگا کہ حق کے پیغام کو نظر انداز کر کے بھی حق کا ٹھیکیدار بنا رہے ——— اس آنے والے دن کو جو آج دیکھ لے، وہی کامیاب ہے۔ جو شخص اسے کل دیکھے گا، اس کے لئے اس کے سوا کوئی انجام نہیں کہ وہ "ابد تک روتا اور دانت پیستا رہے"۔

تعریف سے خوش ہونا اور تنقید سے بپھرنا، پستی کی علامتیں ہیں۔

فانی بدایونی (۱۹۴۱-۱۸۷۹) نے کہا ہے کہ دنیا کی رنگینیاں انتہائی بے حقیقت ہونے کے باوجود اپنے ظاہر میں اتنی پرکشش ہیں کہ انسان ان کو حقیقت سمجھ بیٹھتا ہے۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص دھوکا دینے والے ان مناظر سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے:

زیب جلوہ اور کتنا مکمل! اے معاذ اللہ
بڑی مشکل سے دل کو بزم عالم سے اٹھا پایا

اس میں شک نہیں کہ دنیا کی رنگینیوں سے اپنے کو اوپر اٹھا لینا سخت مشکل کام ہے۔ تاہم کم تعداد میں سہی، ایسے لوگ پھر بھی کچھ نہ کچھ مل جاتے ہیں۔ مگر اس سے بھی زیادہ مشکل ہے خود اپنی ذات سے اوپر اٹھنا۔ اس پہلو سے دیکھئے تو کامیاب افراد کی تعداد کم یابی سے گزر کر نایابی تک پہنچ جائے گی۔ یہ وہ مقام ہے جب کہ آدمی مقید فکر (CONDITIONED THINKING) سے باہر آجاتا ہے۔ ہر آدمی جن حالات میں پیدا ہوتا ہے اور بڑھتا ہے، اس کے لحاظ سے ماحول اور روایات کا ایک ہالہ اس کے گرد قائم ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک فکری مدار (ORBIT) بن جاتا ہے جس میں وہ گھومتا رہتا ہے۔ اس غیر محسوس مدار سے باہر آکر سوچنا اور مکمل طور پر آزادانہ رائے قائم کرنا اس قدر دشوار ہے کہ وہ لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں جو آزادانہ فکر کے علم بردار بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ خلائی راکٹ جب اپنی گردش کے دوران زمین کے مدار سے نکل کر دوسرے سیارہ کے مدار میں داخل ہوتا ہے تو تحول کے نقطہ پر دھماکہ کے ساتھ زبردست آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہی قانون شاید انسانی زندگی کے لئے بھی ہے۔ کوئی شخص اپنے مدار سے نکل کر آزاد شعوری مدار میں اس وقت داخل ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے اس فکری خول کو توڑنے کے لئے پوری طرح تیار ہو جائے جو روایات اور ماحول کے اثر سے محض اتفاقی طور پر اس کے گرد بن گیا ہے۔

کوئی شخص کب اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو روایتی مدار سے نکال کر آزاد مدار کی طرف لے جانے کا عمل شروع کر سکے، اس کا ایک ہی جواب ہے: جب وہ اپنے آپ کو ایسا بنانے میں کامیاب ہو جائے کہ نہ ذاتی تعریف سے اسے خوشی حاصل ہو اور نہ ذاتی تنقید اسے بری لگے۔ کوئی آدمی کس مقام پر ہے، اس کو جاننے کی یہ واحد یقینی پہچان ہے۔

اگر آدمی اپنی ذات کے مدار میں گھوم رہا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے نہیں بچا سکتا کہ ذاتی تعریف اس کو اچھی لگے اور ذاتی تنقید پر وہ بوکھلا اٹھے۔ مگر جو شخص اپنے ذاتی مدار سے بلند ہو جائے وہ کبھی اس بیماری میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ اس کو تعریف اور تنقید دونوں ہی بے معنی معلوم ہوں گی۔ کیوں کہ وہ حقائق کو ایسی بلند سطح سے دیکھ رہا ہوگا جہاں روایات اور ماحول کے اثرات اس کے لئے ایک خارجی چیز بن جاتے ہیں۔ بعض اعتبار سے ان میں ملوث ہونے کے باوجود وہ ان کو اس طرح دیکھ سکتا ہے جیسے کوئی شخص اپنے سے باہر کی ایک چیز کا دور سے مشاہدہ کر رہا ہو۔

اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ کیسا ہیبت ناک دن ان کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے تو
ان کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں اور ان کے پاس بولنے کے لئے الفاظ نہ رہیں

اس آئینہ میں آپ اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں

خدا کے وفادار بندوں کے مشیر فرشتے ہوتے ہیں اور خدا کے باغیوں کے مشیر شیطان۔ جو آدمی اختلاف کے وقت تواضع اختیار کرے، وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو یہ توفیق ملی ہے کہ خدا کے فرشتے اس کے مشیر بنیں۔ کیونکہ فرشتوں کی صفت یہ ہے کہ وہ استکبار نہیں کرتے۔

اس کے برعکس جو لوگ اختلاف کے وقت ظلم اور ناانصافی پر اتر آئیں اور متکبرانہ روش اختیار کریں، وہ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ انھوں نے شیطان کو اپنا مشیر بنا رکھا ہے۔ کیونکہ قرآن میں گھمنڈ اور سرکشی کو صرف شیطان کی صفت بتایا گیا ہے

کیا خدا کی دونوں دنیاؤں میں تضاد ہے

"انسانوں کی دنیا سے دور خدا کی دنیا کتنی حسین ہے" میری زبان سے نکلا۔ میں ایک ٹیلہ پر کھڑا تھا۔ قدرت کے آفاقی مناظر میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ "کیا خدا کی دونوں دنیاؤں میں تضاد ہے۔ بقیہ کائنات کو خدا انتہائی محکم بنیادوں پر چلا رہا ہے۔ مگر انسانوں سے اس کو مطلوب ہے کہ وہ کرامتوں کی ایک پر اسرار دنیا بنا کر اس کے اندر طلسماتی کارنامے دکھائیں۔ خدا کو شیشم یا چنار کا ایک درخت اگانا ہو تو وہ سو سال کا ہمہ گیر منصوبہ بناتا ہے۔ مگر اپنے بندوں سے وہ چاہتا ہے کہ نعروں اور تقریروں کا طوفان اٹھا کر آناً فاناً حالات کو بدل ڈالیں۔ کائناتی کارخانہ میں ہر طرف نفع رسانی اور منفعت بخشی کا سیلاب بہہ رہا ہے۔ مگر کائنات کا مالک اپنے بندوں سے جو کچھ چاہتا ہے وہ یہ کہ وہ دوسروں کو "نقصان پہنچانے" کا کمال دکھائیں اور خیرامت ہونے کا ٹائٹل حاصل کریں۔ ستاروں اور سیاروں کی دنیا میں وہ ہر آن متحرک ہے۔ مگر مدرسوں اور خانقاہوں میں وہ تقلید اور جمود پر راضی ہو گیا ہے۔ پھولوں اور پتیوں میں وہ خوش ذوقی کا دریا بہا رہا ہے۔ ہوا کے جھونکوں اور پانی کے جھرنوں میں وہ لطافت کا خزانہ بکھیر رہا ہے۔ آسمان کی وسعت اور پہاڑوں کی بلندی میں وہ خاموش عظمتوں کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ مگر انسانوں سے اس کو مطلوب ہے کہ وہ گدھے اور کوے کی طرح چیخیں اور احتجاج اور مطالبات کی غوغا آرائی کریں۔ ہری بھری گھاس سے لے کر نیلے آسمان تک ہر طرف اتھاہ حکمت نظر آتی ہے۔ ہر جگہ انتہائی بامعنی سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر اپنے بندوں سے خدا ایسی عبادات پر راضی ہے جس میں کچھ رٹے ہوئے الفاظ کو زبان سے دہرا لینے سے بڑے بڑے مقامات طے ہوتے ہیں اور عالی شان جنتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔

کائنات کی سطح پر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ خدا کی دنیا رنگ اور خوشبو بکھیرنے والے پھولوں اور پیار اور بے نفسی کا سبق دینے والی چڑیوں کے لئے ہے۔ مگر دین کے ٹھیکیدار آج جس دین کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی جنت گویا نکمے لوگوں کا کباڑ خانہ ہے یا مسخروں کی نمائش گاہ۔ حقیقت یہ ہے کہ جو دین آج مقررین اسلام اور مفکرین ملت ہر طرف تقسیم کر رہے ہیں، اس کو دین کہنا قرآن پر اتہام ہے۔ ایسا دین خدا کی اس عظیم اور حسین کائنات میں ایک مسخرہ پن کے سوا اور کچھ نہیں۔

خدا کی جنت لطیف ترین سرگرمیوں (بلس ۵۵) کی ایک دنیا ہوگی۔ موجودہ دنیا میں وہ افراد چنے جا رہے ہیں جو ان اعلیٰ سرگرمیوں میں شرکت کے اہل ثابت ہو سکیں۔ یہ اہلیت حدیث کے الفاظ میں یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر الٰہی اوصاف پیدا کرے (تخلقوا باخلاق اللہ) وہ ذاتی میلانات کی پست سطح سے اوپر اٹھ جائے اور خدائی شعور کی بلند سطح پر جینے لگے۔ تقریری جسارت یا عملیاتی کرشموں کو جنت کا دروازہ سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سرکس میں کمال دکھا کر سمجھے کہ وہ ملک کا وزیر اعظم بننے کا استحقاق پیدا کر رہا ہے۔

ایک لیڈر جب وزیر ہو جائے یا کسی بڑے سیاسی عہدہ پر پہنچ جائے تو اس کے بعد اس کے لئے اپنے محکمہ میں کوئی کام نہیں رہتا، اس کا کام ہمیشہ کسی ایسے مقام پر ہوتا ہے جو اس سے ہزاروں میل دور ہو۔ اس کے قدموں کے نیچے جو زمین ہے، وہ مسائل کا انبار لئے ہوئے کراہ رہی ہوگی، مگر یہ کراہ اس کو سنائی نہ دے گی، البتہ دور کے کسی مقام پر مسائل انسانی پر ایک سیمینار ہو رہا ہو تو اس کا افتتاح کرنے کے لئے اس کے پاس کافی وقت ہوگا۔ ہمارے حکمرانوں کی اسی روش کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک عظیم ملک اتنی لمبی مدت سے ان کے زیر انتظام ہے، مگر وہ ملک کو اس کے سوا کوئی اور تحفہ نہ دے سکے کہ اس کو مہنگائی، رشوت، بدعنوانی اور بے انصافی سے بھر دیں۔

یہی روایت ہمارے ملی رہنماؤں میں بھی گھس آئی ہے۔ ہمارے رہنماؤں کی پہنچ اتنی بلند نہیں جتنی ملک کے سیاسی عہدہ داروں کی ہو سکتی ہے۔ تاہم اپنے دائرہ میں وہ بھی ٹھیک اسی عمل کو دہرا رہے ہیں جس کا نمونہ ان کے حکمرانوں نے ۳۰ سال سے قائم کر رکھا ہے۔ ہمارے ہر رہنما کا یہ حال ہے کہ اس کے قدموں کے نیچے اس کے لئے کوئی کام نہیں۔ چھوٹے رہنماؤں کی پرواز چند سو میل کے دائرہ تک محدود ہے۔ جو اس سے بڑے ہیں ان کا کام ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہوتا ہے اور جو اور بڑے ہیں وہ بین اقوامی دائرہ میں اپنی خدمات انجام دینے کے لئے کام پا رہے ہیں۔ غرض ہر ایک کا کام دور کے کسی علاقہ میں واقع ہے جہاں وہ چند روز کے لئے مہمان بن کر جائے اور اعزازات کے ماحول میں شان دار تقریر کر کے اس طرح لوٹے کہ دوبارہ اسی قسم کے کسی دور دراز مقام پر واقع ایک اسٹیج اس کے جلووں کا انتظار کر رہا ہو۔

بخدا یہ کام کرنے کا طریقہ نہیں۔ اگر ہمارے رہنماؤں کی یہ روش باقی رہی تو ۱۹۴۷ء کے بعد کے دور کو بھی ہم اسی طرح کھو دیں گے جس طرح اس سے پہلے کے دور کو ہم کھو چکے ہیں۔ کام کا یہ طریقہ صرف عالی شان قیادتیں وجود میں لا سکتا ہے وہ عالی شان قوم وجود میں نہیں لا سکتا۔ اس قسم کی قیادتیں قوم کو جو آخری وراثت دے سکتی ہیں، وہ صرف شان دار مقبرے ہیں۔ وہ قوم کو شان دار مستقبل تک نہیں پہنچا سکتیں۔

کیا لوگوں کو یہ ڈر نہیں کہ خدا کے یہاں ان سے پوچھا جائے گا کہ جو مواقع انھیں دئے گئے تھے ان کو انھوں نے کہاں خرچ کیا۔ یا وہ اتنے نادان ہیں کہ انھیں خبر ہی نہیں کہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔

ہار آخرت کی ہار ہے اور جیت آخرت کی جیت

قرآن کی سورہ نمبر ۶۴ میں ارشاد ہوا ہے :

یَوْمَ یَجْمَعُکُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ — جب اللہ تم کو جمع کرے گا جمع ہونے کے دن ۔ یہی دن ہے ہار جیت کا ۔

تغابن کا لفظ ایسے معاملے کے لئے بولا جاتا ہے جب کہ ایک فریق نیچا رہے اور دوسرا فریق اونچا۔ ایک کو گھاٹا ہو اور دوسرا نفع اٹھالے جائے ۔ مطلب یہ کہ لوگ غلط فہمی سے اسی دنیا کو ہار جیت (تغابن) کا دن سمجھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہار جیت کا دن تو دراصل آخرت ہے ۔ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مقاتل بن حیان نے کہا ہے :

لاغبن اعظم من ان یدخل ھؤلاء الی الجنۃ ویذھب باولئک الی النار (ابن کثیر) — کوئی ہار جیت اس سے بڑی نہیں کہ ایک گروہ کو جنت میں داخل کیا جائے اور دوسرے گروہ کو جہنم میں ڈالا جائے ۔

دنیا میں شہرت ، عزت ، دولت ، اقتدار اور عیش کے بے شمار مواقع کھلے ہوئے ہیں ۔ ہر شخص اپنے اپنے حالات کے مطابق ان کی طرف دوڑ رہا ہے ۔ جو شخص ان مواقع میں سے کوئی حصہ اپنے لئے پالیتا ہے اس کے اندر فخر کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہیں ۔ وہ اپنے کو کامیاب سمجھنے لگتا ہے ۔ اس کے برعکس جو شخص ان کو نہیں پاتا ، اس کو لوگ حقیر سمجھنے لگتے ہیں ۔ عام خیال یہ ہو جاتا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ، شعوری یا غیر شعوری طور پر ، اسی دنیا کو ہار جیت کی جگہ سمجھتے ہیں ۔ ان کا ذہن یہ ہو جاتا ہے کہ اسی دنیا کی جنت ، جنت ہے اور یہیں کی دوزخ ، دوزخ ۔ قرآن نے بتایا کہ یہ محض دھوکا ہے ۔ ہار جیت تو دراصل وہ ہے جو اگلی زندگی میں سامنے آنے والی ہے ۔ وہ لوگ جو دنیا میں اپنے کو فاتح سمجھتے ہیں ، جب پردہ ہٹے گا تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ اصل حقیقت تو کچھ اور تھی ۔ وہاں جاکر معلوم ہوگا کہ کون گھاٹے میں رہا اور کون نفع کما لے گیا ۔ اصل میں دھوکا کس نے کھایا اور کون ہوشیار نکلا ۔ کون زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا اور کون آگے بڑھنے والا ثابت ہوا ۔ کس نے اپنی صلاحیتوں کو نتیجہ خیز کام میں لگایا اور کون تھا جس نے اپنی تمام توانائیوں کو وقتی تماشوں میں برباد کر ڈالا ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہار اسی کی ہے جو آخرت میں ہارا اور جیت صرف اس کی ہے جس کو آخرت میں جیت حاصل ہوئی ۔ وہ لوگ جو دنیوی مصلحتوں میں مہارت دکھا کر آج کی دنیا میں عزت اور ترقی حاصل کر رہے ہیں ، کل کی دنیا میں ان کی یہ مہارتیں بالکل بے کار ثابت ہوں گی ۔ مرنے کے بعد جب وہ آخرت کے عالم میں پہنچیں گے تو وہاں کے حالات میں عزت کی جگہ پانے کے لئے وہ اسی طرح اپنے آپ کو نا اہل پائیں گے جس طرح ایک قدیم طرز کا دستکار روایتی ماحول میں باکمال نظر آتا ہے لیکن اگر اس کو ٹکنکل معاشرہ میں پہنچا دیا جائے تو وہ بالکل بے قیمت ہو جائے گا ۔

ہمارے اور آخرت کے درمیان صرف ایک غیر یقینی دیوار حائل ہے

چسنالا (دھنباد) میں ایک پرانی کوئلہ کی کان تھی جو ۱۹۴۵ سے بند تھی۔ ساڑھے چار سو فٹ گہری اس کان میں دھیرے دھیرے پانی بھر گیا۔ اس سے ۸۰ فٹ کے فاصلہ پر دو سال پہلے ایک اور کان کھودی گئی۔ عالمی بنک اور بیرونی ماہرین کی مدد سے تیار کی ہوئی یہ کان جدید طرز کی مشینوں سے آراستہ تھی۔

۲۷ دسمبر ۱۹۷۵ کو اس کان میں ایک بھیانک حادثہ ہوا۔ دونوں کانوں کے درمیان ۸۰ فٹ کا فاصلہ کافی محفوظ فاصلہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر اچانک اس کے اندر تقریباً ۶ فٹ چوڑا اشگاف ہو گیا اور اس کے اندر سے پرانی کان کا پانی نئی کان میں اتنی تیزی سے داخل ہوا کہ صرف تین منٹ کے اندر نئی کان بھر گئی۔ ۳۷۲ مزدور اور انجنیئر جو اس وقت کان کے اندر کام کر رہے تھے ایک سو ملین گیلن سے بھی زیادہ پانی کے سیلاب میں غرق ہو گئے۔ صرف ایک شخص بھگوان سنگھ (مونگیر) بچا جو حادثہ سے صرف چند منٹ پہلے باہر آگیا تھا۔

یہ واقعہ حیرت انگیز طور پر ہماری زندگی کی تصویر ہے۔ ہماری موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا کے درمیان موت کی غیر یقینی دیوار حائل ہے۔ ہر آن یہ اندیشہ ہے کہ یہ دیوار ٹوٹ جائے اور آخرت کے حقائق ایک بے پناہ سیلاب کی طرح ہمارے اوپر پھٹ پڑیں۔ اس وقت کوئی زور اور کوئی لفظی بازی گری کام نہ آئے گی۔ آدمی بالکل بے سہارا ہو کر اپنے مالک کے سامنے کھڑا ہو گا۔ وہ سارے لوگ ناکامی اور بربادی کے دائمی جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے جو دنیا کی دلفریبیوں میں اس قدر گم تھے کہ کوئی نصیحت کی بات سننے کے لئے تیار ہی نہ ہوتے تھے صرف وہ شخص بچے گا جس نے مالک کائنات کے سامنے حساب کے لئے پیش ہونے سے پہلے خود اپنا حساب کر لیا ہو گا۔

> بہت سے دیوار اٹھانے والے اپنی دیوار کو گرا رہے ہیں۔
>
> بہت سے لوگ جو اپنے کو دوسروں سے بڑا سمجھ رہے ہیں، وہ دوسروں کے پیروں تلے روندے جائیں گے۔
>
> یہ اس دن ہو گا جب خدا اپنے فرشتوں کے ساتھ ظاہر ہو گا، جب سارے انسانوں سے پوچھا جائے گا کہ انھوں نے اپنے پیچھے کیا چھوڑا اور اپنے آگے کے لئے کیا روانہ کیا۔

آخرت کے لئے کوئی شخص جو کچھ کر سکتا ہے، اسی موجودہ زندگی ہی میں کر سکتا ہے۔ اور اس زندگی کی مدت بہت کم ہے۔ کتنے لوگ ہیں جن کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اسی طرح جو لوگ آج ہم کو دیکھ رہے ہیں، ایک وقت آئے گا کہ ہم ان کے دیکھنے کے لئے اس دنیا میں موجود نہ ہوں گے۔ ہم اپنی عمر پوری کر کے اپنے رب کے پاس جا چکے ہوں گے۔ ہماری موجودہ زندگی وہ پہلا اور آخری لمحہ ہے جب کہ انسان اپنے ابدی مستقبل کی تعمیر کے لئے کچھ کر سکتا ہے۔ نہ اس سے پہلے ایسا کوئی موقع انسان کو ملا تھا اور نہ اس کے بعد ایسا کوئی موقع انسان کو ملے گا۔ ہم ایک ایسے امتحان سے گزر رہے ہیں جس کا ایک لازمی نتیجہ سامنے آنے والا ہے۔ اور بہت جلد ہم ایک ایسے لازمی نتیجہ سے دوچار ہوں گے جس کے بعد پھر کسی تیاری کا کوئی موقع نہیں۔ زندگی کا ہر لمحہ جو آپ صرف کر رہے ہیں، آخری طور پر صرف کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ پھر واپس آنے والا نہیں ہے۔

میں نے سمجھا تھا ۔۔۔

- میں نے سمجھا تھا کہ دلیل میں وزن ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ طاقت اپنے اندر اس سے بھی زیادہ وزن رکھتی ہے۔
- میں نے سمجھا تھا کہ کارکردگی سے انسان تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ لیاقت کا سب سے بڑا سرٹیفکٹ موقع پرستی ہے۔
- میں نے سمجھا تھا کہ عہدے اور مناصب کام کرنے کے مواقع ہیں مگر معلوم ہوا کہ یہ سب محض اعزاز کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ لوگ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں وہی ان کے دل میں بھی ہوتا ہے مگر معلوم ہوا کہ ان دونوں میں کوئی تعلق نہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ لوگ مقاصد کے علم بردار ہیں مگر معلوم ہوا کہ اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے سوا لوگوں کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ جو لوگ خدا کی باتیں کرتے ہیں وہ خدا سے ڈرتے بھی ہیں مگر معلوم ہوا کہ خدا ان کے لئے ایک تجارتی عنوان کے سوا اور کچھ نہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ لوگ اصلاح چاہتے ہیں مگر معلوم ہوا کہ ہر شخص کو اپنا مفاد عزیز ہے خواہ وہ دوسروں کو برباد کر کے ہی کیوں نہ حاصل ہو۔
- میں نے سمجھا تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کا خیر خواہ ہے مگر معلوم ہوا کہ ہر ایک دوسرے کا استحصال کر رہا ہے۔
- میں نے سمجھا تھا کہ جنت کا راستہ وسیع اور جہنم کا راستہ تنگ ہے مگر معلوم ہوا کہ سب سے وسیع راستہ وہ ہے جو جہنم کی طرف جاتا ہے۔

سیاست جب نشہ بن جائے

مکھن بنانے والی کوئی کمپنی اگر اپنے مکھن کی پیکنگ پر لکھ دے: "یہ مکھن صحت کے لئے مضر ہے" تو اس کا مکھن کوئی بھی شخص نہیں خریدے گا۔ ایسی کمپنی چند ہی روز میں دیوالیہ ہو جائے گی۔ مگر جدید قوانین کے تحت سگرٹ کا ہر پیکٹ جو سگرٹ ساز کمپنی سے تیار ہو کر بازار میں آتا ہے، اس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے:

CIGARETTE SMOKING IS INJURIOUS TO HEALTH

(سگرٹ پینا صحت کے لئے مضر ہے) مگر اس سے سگرٹ کی خریداری میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سگرٹ پینے والوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔ سگرٹ سازی کا کاروبار آج بھی دنیا بھر میں سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار سمجھا جاتا ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکھن ایک مفید غذا ہے۔ اس کو آدمی صحت اور طاقت حاصل کرنے کے لئے کھاتا ہے۔ اس لئے جب کسی مکھن کی یہ حیثیت مشتبہ ہو جائے تو وہ فوراً اس کو چھوڑ دے گا۔ مگر سگرٹ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس کے ساتھ غذائی افادیت کا کوئی تصور وابستہ نہیں۔ سگرٹ صرف نشہ حاصل کرنے کے لئے پیا جاتا ہے اور نشہ کا فائدہ سگرٹ میں اس وقت بھی پوری طرح موجود ہوتا ہے جب کہ صحت کے اعتبار سے اس کا مضر ہونا ثابت ہو گیا ہو۔ جب اصل مقصد حاصل ہو رہا ہو تو کوئی شخص کیوں اُسے چھوڑے۔

اسی طرح اگر کچھ لوگوں کو "سیاست" کا چسکا لگ جائے تو خواہ کتنے ہی یقینی دلائل سے اس کا بے حقیقت ہونا ثابت کر دیا جائے بہرحال لوگ اس سے چمٹے رہیں گے۔ وہ کسی بھی طرح اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ دلائل کی کوئی بھی مقدار سیاست سے نشہ کی کیفیت چھین نہیں سکتی۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ سیاست تمام نشہ آور چیزوں میں سب سے زیادہ نشہ کی چیز ہے۔ سگرٹ اور بھنگ کا نشہ اتر سکتا ہے۔ مگر سیاست کا نشہ کبھی آدمی سے نہیں اترتا۔ آپ دلائل کا انبار جمع کر دیجئے۔ تجربات اس کے بے فائدہ ہونے کا عملی ثبوت دیتے چلے جائیں۔ مگر جن لوگوں کو سیاست کا نشہ لگ گیا ہے، تخیلات کی دنیا میں بدستور وہ اپنا سیاسی رومان جاری رکھیں گے۔ موت کے سوا کوئی طاقت نہیں ہے جو ان کے اور سیاست کے درمیان تفریق کرا سکے، اور اگر اتفاق سے سیاست میں کسی نے ملی ترقی کا راز دریافت کر لیا ہو یا کسی کو ایسی قرآنی ڈکشنری مل گئی ہو جس میں دین کے معنی سیاست لکھے ہوئے ہوں تو ایسے لوگوں کو سیاسی مشغلہ سے ہٹانا شاید اس وقت سے پہلے ممکن نہیں جب کہ خدا خود ظاہر ہو کر کہہ دے کہ یہ وہ دین نہیں جو مجھ کو مطلوب تھا۔ یہ تو وہ دین ہے جو تم نے خود سے گھڑ لیا تھا۔

4

ایسی شاندار چیزیں خدا کے یہاں کہاں!

نئی دہلی کے بین اقوامی صنعتی میلے (۱۹۶۱) میں امریکہ کی طرف سے ایک ہوائی موٹر کی نمائش کی گئی تھی۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ زمین پر بھی دوڑتی تھی اور ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا میں بلند ہو کر بھی اڑتی تھی۔ ایک نوجوان سادھو جب نمائش کے مختلف عجوبوں اور رنگینیوں کو دیکھتا ہوا امریکی پویلین کے پاس پہنچا اور اس جادوئی گاڑی کو اڑتے اور دوڑتے ہوئے دیکھا تو اس کے ذہن میں ایک نیا سوال پیدا ہو گیا۔ "کیا میں تیاگ اور قربانی کی زندگی کو چھوڑ کر مادی ترقیات کی دنیا میں اپنے حوصلوں کی تسکین ڈھونڈوں" سادھو نے کہا۔ گیروے کپڑے میں ملبوس اور لمبے بکھرے ہوئے بالوں والا یہ ہندستانی نوجوان ۲۰ منٹ تک اس امریکی موٹر کو دیکھتا رہا جس کو نمائش کے ذمہ داروں نے "مستقبل کی کار" کا نام دیا تھا۔ جب اس کے بارے میں سادھو کا تبصرہ پوچھا گیا تو اس نے گہرے تاثر کے ساتھ جواب دیا: "اس نے مجھے اس سوچ میں ڈال دیا ہے کہ دونوں دنیاؤں میں سے وہ کون سی دنیا ہے جس کو میں اپنے لئے زیادہ بہتر سمجھوں"۔ (ہندوستان ٹائمس۔ ۲۰ نومبر ۱۹۶۱ء)

اسی قسم کا ایک اور واقعہ پڑھئے۔

جولائی۔ اگست ۱۹۷۵ میں بہار میں ہولناک سیلاب آیا تھا۔ اس میں بہت سے خاندان بے گھر ہو کر مجبور ہوئے کہ کسی دوسری جگہ اپنے لئے پناہ گاہ تلاش کریں۔ انھیں مصیبت زدگان میں ایک غریب مسلم خاندان دہلی آیا۔ گھر کا مرد طوفان میں ختم ہو چکا تھا۔ ۱۲ سال کے یتیم لڑکے شریف اور اس کی دبلی اور بیمار ماں کو جو امید دہلی لائی، وہ یہ تھی کہ اس کا داماد یہاں رکشا چلا کر اپنی روزی کما رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ رکشا کھینچنے والا ایک شخص دو خاندانوں کی پرورش کس طرح کر سکتا تھا۔ شریف کو ملازمت تلاش کرنی پڑی۔ اولاً کچھ دنوں ایک معمولی ہوٹل میں پلیٹیں دھوتا رہا۔ اس کے بعد ایک خوش حال مسلم خاندان میں اس کو گھریلو کاموں کے لئے ۵۰ روپے ماہوار پر جگہ مل گئی۔

شریف ایک انتہائی غریب خاندان کا لڑکا تھا۔ اس دنیا میں آنکھ کھولنے کے بعد اسے جو بستر ملا وہ زمین پر بچھا ہوا ایک ٹاٹ تھا۔ اب تک کی زندگی اس نے اس طرح گزاری کہ نہ کبھی اس کے پاؤں میں جوتا پڑا اور نہ جسم پر پورا لباس پہننے کو ملا۔ سردیوں کی رات کے معنی اس کے نزدیک صرف یہ تھے کہ لکڑی کے ٹکڑے اور پتیاں جمع کر کے کچھ دیر آنچ اور دھوئیں میں گزارے جائیں اور اس کے بعد ایک پھٹا ہوا ٹاٹ بچھا کر دوسرا پھٹا ہوا ٹاٹ اوپر سے لپیٹ لیا جائے۔

دسمبر کی ایک صبح کو جب کہ شریف مالک مکان کا بستر سمیٹ رہا تھا۔ اچانک ایک خیال اس کے دماغ میں رینگا۔ مسہری کے اوپر بچھا ہوا موٹا نرم گدا، اس کے اوپر خوبصورت چادر اور مخملی کپڑے میں بنا ہوا شاندار لحاف، ان چیزوں نے اس کو تھوڑی دیر کے لئے مبہوت کر دیا۔ "آپا"، وہ مالک کی لڑکی سے بولا "کیا اللہ میاں کے یہاں ایسا بستر ہوگا۔" وہ اپنے اس سوال میں اتنا گم تھا کہ وہ یہ بھی نہ سن سکا کہ لڑکی یہ کہتی ہوئی چلی گئی ہے "بیوقوف وہاں تو اس سے بھی اچھے بستر ہوں گے"۔

گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو موجودہ زمانے میں سارے لوگ اسی نفسیات میں مبتلا نظر آئیں گے۔ چھوٹے بڑے امیر غریب، عالم جاہل، سب کے سب دنیا کی دلفریبیوں پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ لذت، دولت، شہرت، عزت، مرتبہ اقتدار، غرض دنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز کا ایک ذرہ بھی اگر کسی کے سامنے آگیا ہے تو وہ اس کی طرف اس طرح دوڑ رہا ہے

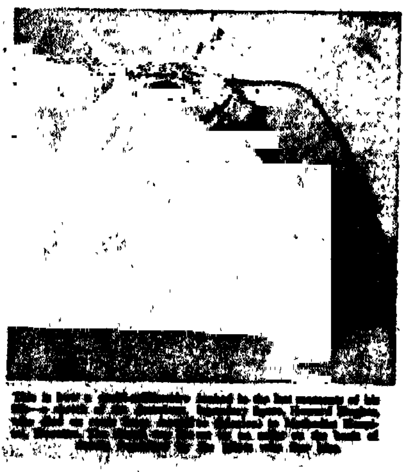
گویا زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہو "خدا کے یہاں بھلا ایسی شان دار چیزیں کہاں ملیں گی، پھر کیوں نہ اسی دنیا میں جو کچھ ملے اس کو حاصل کر لیا جائے"۔

سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں مذہبی لوگوں کا حال بھی وہی ہے جو دوسرے اہلِ دنیا کا ہے۔ موجودہ زمانے میں جو دنیوی امکانات ان کے لئے کھلے ہیں ان کی طرف دوڑ بھاگ میں وہ دوسروں سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہیں ——— عہدوں اور مناصب کی دھوم، صدارت و نظامت کے اعزازات، جلسوں اور جلوسوں کی نمائش۔ بین اقوامی کانفرنسوں کے لئے پرواز، ایڈریس اور استقبال کے تماشے، اخبارات کی سرخیوں میں چھپنا اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا شوق ان کو بھی اتنا ہی ہے جتنا کسی عام دنیا دار کو ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص آخرت پر تقریر کر رہا ہے اس کو بھی آخرت کا یقین نہیں۔ اگر ہے تو بہت کم۔

ایک کامیاب ترین انسان جب موت کے دروازہ پہ پہنچتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ دروازہ کے دوسری طرف اس کے لئے مایوسی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں

ہوورڈ ہیوز امریکہ کا ایک ممتاز ترین ارب پتی تھا۔ اپریل ۱۹۷۶ میں ایک ہوائی سفر کے دوران اس پر دل کا حملہ ہوا۔ اس کے ہوائی جہاز کو فوراً ہاؤسٹن میں اتارا گیا۔ مگر اسپتال پہنچنے سے پہلے وہ ختم ہو چکا تھا۔

اپنے قانون داں باپ سے اس کو ایک ملین ڈالر بطور وراثت ملے تھے۔ مگر اس نے اپنی غیر معمولی تجارتی صلاحیت سے اپنے سرمایہ کو ۲۰۰۰۰۰ کرور ڈالر سے بھی زیادہ بڑھا لیا۔ اس کے ہوائی جہاز کا عملہ جو اس کے ساتھ شریکِ سفر تھا اس نے اس کے آخری لمحات کے بارے میں جو چشم دید تاثرات بیان کئے اس کی بنیاد پر مشہور امریکی آرٹسٹ شرل سالومن نے اس کا خاکہ تیار کیا ہے۔ اس خاکہ میں اس کے سفرِ حیات کے آخری لمحات کو مصوّر کیا گیا ہے ——— امریکہ کا کامیاب ترین تاجر اس خاکہ میں وحشت، مایوسی، بے چارگی، ناکامی اور بے یقینی کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ امریکی تاجر کی یہ وحشت ناک تصویر اس کیفیت کو مجسم کر رہی ہے جو ایک آدمی کی اس وقت ہوتی ہے جب وہ موت کے دروازے پر پہنچ چکا ہو، اس کے پیچھے وہ زندگی ہو جس کو وہ چھوڑ چکا اور آگے وہ زندگی ہو جس میں اب وہ ہمیشہ کے لئے داخل ہو جائے گا۔



اپنے معاملہ میں ہوشیار

دوسرے کے معاملہ میں بیوقوف

یوگنڈا کے صدر عیدی امین نے وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی کو مبارک باد کا خط بھیجا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے نام بھی ایک خط روانہ کیا ہے جس میں اس بات کا شکریہ ادا کیا ہے کہ ان کی حکومت نے ہندوستان اور یوگنڈا کے درمیان اچھے تعلقات قائم رکھے۔

صدر عیدی امین نے اندرا گاندھی کے نام اپنے خط میں لکھا ہے:

I personally support those who have described you as a very intelligent leader, because soon after accepting defeat you and your government lifted at the right time the 21 month state of emergency imposed by yourself and which brought imprisonment without trial. This timely decision by yourself and your government to lift the emergency relieved our minds because it would have been possible for the same emergency regulations to be used against those who have now lost power.

Hindustan Times, March 30, 77

"میں ذاتی طور پر ان لوگوں سے اتفاق کرتا ہوں جن کی رائے یہ ہے کہ آپ نہایت ذہین لیڈر ہیں کیونکہ اپنی شکست تسلیم کرنے کے فوراً بعد آپ نے اور آپ کی حکومت نے نہایت صحیح وقت پر اکیس ماہ کی ایمرجنسی کو ختم کردیا جس کو آپ نے نافذ کیا تھا اور جس کے تحت لوگوں کو بغیر عدالتی کارروائی کے قید کیا جا سکتا تھا۔ ایمرجنسی کو ختم کرنے کے بارے میں آپ اور آپ کی حکومت کے اس بروقت اقدام کے بعد ہم نے اطمینان کا سانس لیا، کیونکہ یہ ممکن تھا کہ اسی ایمرجنسی کے قوانین کو نئی حکومت ان لوگوں کے اوپر استعمال کرے جنھوں نے اب اقتدار کھو دیا ہے۔"

اندرا حکومت سے الیکشن کا نتیجہ سامنے آنے سے پہلے ایمرجنسی ہٹانے کے لئے کہا جاتا تھا تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایمرجنسی کے جاری رہنے سے کسی کا کیا نقصان ہے۔ مگر ۲۰ مارچ کی شب کو جب الیکشن کے نتائج کا اعلان ہوا تو اس حکومت کو ایمرجنسی کی حقیقت سمجھنے میں ایک منٹ کی دیر نہیں لگی۔ اس نے راتوں رات میٹنگ کرکے ایمرجنسی کے مکمل خاتمہ کا اعلان کر دیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے معاملہ میں آدمی کتنا ہوشیار ہوتا ہے اور دوسرے کے معاملہ میں کتنا بے وقوف۔ آج کی دنیا میں جس شخص کا بھی تجربہ کیجئے، تقریباً بلا استثناء آپ پائیں گے کہ وہ اپنے موافق پہلو کو سمجھنے کے لئے انتہائی ذہین ہے۔ اس کے برعکس جب معاملہ دوسرے کے موافق پہلو کو سمجھنے کا ہو تو وہ ایسا بے وقوف بن جاتا ہے، جیسے اس کو کچھ آتا ہی نہیں۔ جیسے کہ وہ اینٹ پتھر ہے نہ کہ انسان۔

ہوشیاری کی یہ قسم آدمی کے اوپر بہت بڑا وبال ہے۔ ایسا کرکے دراصل وہ حاکم حقیقی کے آگے اپنے خلاف خود حجت قائم کر رہا ہے۔ اگر آدمی اپنی باتوں میں بھی بے وقوفی ظاہر کرتا تو شاید وہ خدا کی پکڑ سے بچ جاتا۔ مگر اپنی باتوں میں ہوشیاری اور دوسرے کی باتوں میں بے وقوفی اس کو خدا کی پکڑ سے بچا نہ سکے گی۔ کیونکہ اپنی باتوں میں ہوشیاری دکھا کر وہ ثابت کر چکا ہے کہ دوسرے کی باتوں میں بھی وہ اتنا ہی ذہین اور ہوشیار ہو سکتا تھا۔

جو اپنے کو جہنم کے دروازہ پر کھڑا ہوا پائے وہی جنت میں داخل ہوگا۔

جو چپ رہنے لگے اس کو بولنا آگیا ______

جو بے عزتی پر راضی ہو جائے اس نے اپنی عزت کو بچا لیا ______

جو خاموش آوازوں کو سننے لگے وہی کان والا ہے۔ ______

جس کو اپنی برائیاں دکھائی دینے لگیں وہی قابل تعریف ہے ______

جو اپنے سے آغاز کرے وہی دوسروں تک پہنچے گا ______

جو اپنی غلطی کو مان لے وہی صحیح راستہ پر ہے ______

جس کی نظر میں تمام چیزیں بے لذت ہو جائیں اس نے لذت کا راز پا لیا ______

جو اپنے کو بے علم جانے وہی علم والا ہے۔ ______

وہی آدمی باشعور ہے جس نے اپنے لاشعور کو جان لیا ______

جو کمزوروں سے ڈرے وہی طاقت ور کی پکڑ سے بچ سکتا ہے ______

جو دوسروں کو دیتا ہے اسی نے اپنے آپ پر خرچ کیا ______

جو اپنے معاملات میں نادان ہو جائے وہی ملت کے معاملات میں ہوشیار ثابت ہوگا۔

جس کو اپنے منافق ہونے کا اندیشہ ہو وہی ایمان والا ہے ______

جو کھونے والا ہے اسی نے در اصل پایا ______

جس کو ہارنا آجائے اس کو کوئی ہرا نہیں سکتا ______

اپنی محبوب شخصیتوں کے چرچے ہیں مگر خدا کے چرچے نہیں

کوئی تحریک کیسی ہے، اس کو جاننے کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس سے جو لوگ متاثر ہوتے ہیں ان میں کیسا مزاج بنتا ہے۔ دور اول میں قرآن نے صحابہ کے اندر جو مزاج پیدا کیا، وہ خدا پرستی اور آخرت پسندی کا مزاج تھا۔ ان میں کے چند آدمی جب ایک جگہ بیٹھتے تو وہ خدا و آخرت کے چرچے کرتے، ان کے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جاتا تو ان کو خدا یاد آتا۔ ہوا اگر تیز ہو جاتی، تب بھی وہ کانپ جاتے کہ کہیں قیامت نہ آگئی ہو۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر جو تحریکیں اٹھیں اور ان سے جو لوگ متاثر ہوئے، ان کو دیکھئے تو کسی میں یہ مزاج دکھائی نہ دے گا ——— کسی تحریک نے یہ مزاج پیدا کیا ہے کہ اس کے چند وابستگان جب کہیں اکٹھا ہوتے ہیں تو ان کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے بزرگوں کی فضیلتیں اور کرامتیں بیان کریں۔ کسی تحریک نے اپنے لوگوں کو ایک قسم کا عملیاتی اسلام تقسیم کر رکھا ہے اور اس کا ہر فرد اس کے طلسماتی فوائد کا ٹیپ ریکارڈ بنا ہوا ہے۔ کسی تحریک نے اسلام کے نام پر ایک عجیب و غریب قسم کا سیاسی مزاج بنایا ہے۔ اس کے متاثر افراد کا لذیذ ترین موضوع گفتگو صرف وہ چیزیں ہوتی ہیں جن میں سیاست کی چاشنی ہو ـــ وہ وہیں متحرک ہوتے ہیں جہاں کوئی سیاسی اقدام کا موقع ہو۔ خواہ یہ سیاسی اقدام عملاً سیاسی خندق میں چھلانگ لگانے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔

آج کل جس اسلامی گروہ کو دیکھئے سب کا یہی حال نظر آئے گا۔ ان کی مجلسوں میں اپنے "حضرت" کے چرچے ہیں۔ مگر خدا کے چرچے نہیں۔ ان کی زبانوں پر کرامات اسلام کی داستانیں ہیں۔ مگر اس اسلام کی گونج نہیں جو خدا کا خوف اور بندوں کی خیر خواہی پیدا کرتا ہے۔ ان کے یہاں سیاسی مسائل پر بحثیں ہیں۔ مگر قیامت میں قائم ہونے والی عظیم عدالت کے ذکر سے ان کی صحبتیں خالی ہیں۔ ان حالات میں بڑی بڑی اسلامی تحریکوں کے وجود میں آنے کے باوجود اگر اسلام سربلند نہ ہو رہا ہو تو تعجب کی کوئی بات نہیں، کیونکہ خدا کی نصرت خدا والے دین پر نازل ہوگی نہ کہ ہمارے اپنے بنائے ہوئے دین پر۔

خدا سے ڈر کی پہچان یہ ہے کہ آدمی انسان سے ڈرنے لگے۔ اس معنی میں نہیں کہ جو زور آور ہو یا جس سے کوئی مفاد وابستہ ہو، اس سے آپ ڈریں۔ یہ تو دنیا پرستی بلکہ شرک ہے۔ انسان سے ڈرنے کا مطلب صاحب حقوق سے ڈرنا ہے۔ یہ سمجھ کر لوگوں سے معاملہ کرنا کہ ہر آدمی کے پیچھے اس کا خدا کھڑا ہوا ہے اور وہ ہمیشہ اس کا ساتھ دیتا ہے جس کی حق تلفی کی جائے۔ جو شخص ایک کمزور صاحب حق کو اس بنا پر نظر انداز کر دے کہ اس کی طرف سے اس کو کسی نقصان کا خوف نہیں ہے، وہ یقیناً خدا کے خوف سے بھی خالی ہے۔

بہت سے چمک دار سکّے آخرت کے بازار میں کھوٹے ثابت ہوں گے خواہ دنیا میں وہ کتنے ہی کامیاب دکھائی دیتے ہوں

سعدی شیرازی کا ایک شعر ہے

بزرگ زادہ ناداں بہ شہروا ماند
کہ در دیار غریبش بہ ہیچ نستانند

"شہروا" کے معنی ہیں رواج دادۂ حکومت۔ اس سے مراد وہ نقود یا سکے ہیں جن کو کسی حکومت نے رائج کر رکھا ہو۔ ایسے سکے کی قیمت صرف اس حکومت کے حدود میں ہوتی ہے۔ اس سے باہر اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ سعدی شیرازی کہتے ہیں کہ بڑے آدمی کے کوئی صاحبزادے جو خود ناداں ہوں، وہ اپنے وطن میں اپنے باپ کی وجہ سے عزت دار بنے رہتے ہیں، مگر اپنے وطن سے باہر اسی طرح بے قیمت ہو جاتے ہیں جس طرح ایک ملک کا نوٹ دوسرے ملک میں اپنی قیمت کھو دیتا ہے۔

موجودہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے شیطان کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔ جو لوگ شیطان کے پسند کیے ہوئے راستوں پر چلتے ہیں، ان کو یہاں بہت جلد عزت اور ترقی حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر اس قسم کے لوگ جیسے ہی اگلی دنیا میں داخل ہوں گے وہ بالکل بے قیمت ہو جائیں گے۔ کیونکہ اگلی دنیا وہ ہے جہاں شیطان کی عمل داری مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ جو لوگ شیطان کی سرپرستی کی وجہ سے موجودہ دنیا میں عزت دار بنے ہوئے تھے وہ وہاں مکھی اور مچھر سے زیادہ بے قیمت ہوں گے کیوں کہ وہاں عزت صرف اس کے لئے ہے جس کو خدا اپنی سرپرستی میں لے لے۔

موجودہ صدی کے ربع اول کے آخر میں خلافت تحریک اٹھی اور سارے ملک میں طوفان کی طرح پھیل گئی۔ یہ تحریک اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے سیاسی تھی۔ مگر تحریک نے جو نعرے اور دلائل استعمال کیے وہ سب مذہبی تھے۔ چنانچہ جو لوگ اس تحریک سے متاثر ہوئے ان میں مذہبیت اتنے زور و شور کے ساتھ پیدا ہوئی کہ "قرآن کی تلاوتیں اور تہجد کی نمازیں بھی عام فیشن بن گئیں"۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ کس طرح ایک سیاسی تحریک بھی مذہبی اخلاقیات پیدا کر دیتی ہے۔ اگرچہ اس قسم کی اخلاقیات کی کوئی اسلامی قیمت نہیں۔ اسلامی قیمت صرف ان اخلاقیات کی ہے جو جہنم کے شعلوں کو دیکھ کر آدمی کے اندر ابھری ہو نہ کہ سیاسی مسائل کو دیکھ کر ——— دنیا کے لحاظ سے ان اخلاقیات کی اہمیت ہے جو دیرپا ہوں اور آخرت کے لحاظ سے وہ اخلاقیات اہمیت رکھتی ہیں جو خدا کے سامنے جوابدہی کے احساس سے ابھری ہوں۔ مگر ہنگامی تحریکوں میں دونوں میں سے کوئی قدر بھی موجود نہیں ہوتی۔

جب خیمے اکھاڑ دیئے جائیں گے

شریمتی اندرا گاندھی کی ہار (۱۹۷۷) میں لوگوں کو صرف سیاست کا منظر نظر آرہا ہے۔ لیکن اگر دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ سے لوگوں کو قیامت کا منظر دکھا دیا ہے۔

الہ آباد ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس جے۔ ایم۔ ایل سنہا نے ۱۲ جون ۱۹۷۵ کو ایک فیصلہ دیا جس میں سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے الکشن (۱۹۷۱) کو ناجائز قرار دیا گیا تھا۔ مگر اندرا گاندھی کی اولوالعزم طبیعت نے ہار نہیں مانی۔ انھوں نے اپنے عہدہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۲۵ جون ۱۹۷۵ کی رات کو ایمرجنسی لاگو کر دی۔

اب سارے ملک میں ایک نیا عمل شروع کر دیا گیا۔ تمام ناپسندیدہ افراد جیلوں میں بند کر دیئے گئے۔ مخالف جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ پریس پر سنسر قائم کر دیا گیا۔ ہر قسم کے اشاعتی ذرائع کو مکمل طور پر سرکاری پروپیگنڈے کے لئے وقف کر دیا گیا۔ عدالت کو ایک آزاد ادارہ کی حیثیت سے ختم کر دیا گیا۔ دستور میں ترمیمیں کر کے اس کو مکمل طور پر اپنے موافق بنا لیا گیا۔ ایسے قوانین جاری کئے گئے جن کے تحت حکومت کسی بھی شخص کو جرم بتائے بغیر گرفتار کر سکتی تھی اور نامعلوم مدت تک کے لئے اس کو جیل میں محبوس رکھ سکتی تھی۔ اپنی پوزیشن کو یہاں تک محفوظ کیا گیا کہ دستور میں چالیسویں ترمیم کے ذریعے طے کر دیا گیا کہ وزیر اعظم اپنے کسی بھی عمل کے لئے کسی بھی ملکی عدالت میں جواب دہ نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ حکومتی عہدہ سے الگ ہونے کے بعد بھی نہیں۔ اس طرح کی بے شمار تدبیروں کے ذریعہ سابق وزیر اعظم نے ملک میں اپنی پوزیشن کو اتنا زیادہ مضبوط کر لیا جتنا شاید پوری تاریخ میں کبھی کسی حکمراں نے نہیں کیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کو یہ اعلان کرنے کی جرأت ہوئی کہ "ایمرجنسی سے پہلے والے حالات اب کبھی واپس نہیں آئیں گے" ان کو یقین تھا کہ نہ صرف وہ آخر تک ملک کے اقتدار پر قابض رہیں گی بلکہ ان کے بعد ان کا خاندان اس کا وارث بنا رہے گا

مگر چھٹے عام الکشن نے ثابت کیا کہ تمام پیش بندیوں کے باوجود آخری عدالت کا فیصلہ ابھی باقی تھا۔ یہ ملک کے عوام کی عدالت تھی۔ مارچ ۱۹۷۷ میں سابق وزیر اعظم کا مقدمہ دیس کی جنتا کے سامنے آیا۔ اور اس کے ایک فیصلہ نے اچانک سارے استحکامات کو اس طرح ڈھا دیا جیسے کہ وہ ریت کی دیوار سے بھی زیادہ بے حقیقت تھے۔ نہرو خاندان کی پچاس سالہ عظمت کا وارث صرف ایک دن میں بے یار و مددگار ہو کر رہ گیا۔

یہ واقعہ آخرت میں ہونے والی عدالت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ دنیا میں آدمی اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لئے دلائل کے پہاڑ کھڑے کرتا ہے۔ وہ دولت و عزت اور جاہ و منصب کے قلعے تعمیر کرتا ہے۔ اقتصادی ذرائع پر قبضہ کر کے اپنے مستقبل کو محفوظ کرتا ہے۔ اپنے گرد بڑی بڑی عمارتیں بنا کر سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے بچاؤ کا آخری انتظام کر لیا ہے۔ مگر جب قیامت آئے گی تو سارے مضبوط خیمے اکھڑ جائیں گے۔ انسان اچانک پائے گا کہ وہ سب سے بڑی عدالت کے سامنے بالکل بے بس کھڑا ہوا ہے۔

زندگی کی سب سے زیادہ سنگین حقیقت یہ ہے کہ سارے انسان خدا کے بندے ہیں۔ ہر ایک کو بہرحال ایک دن خدا کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔ عقلمند وہ ہے جو اس آنے والے دن کی تیاری میں اپنے آپ کو لگا دے

وہ خوابوں کے فریب میں مبتلا ہے جو۔۔۔

چوتھی صدی ہجری کے آخر میں جب اسپین میں طوائف الملوکی شروع ہوئی اور صوبوں کے گورنر مرکز سے بغاوت کرنے لگے تو چھوٹی چھوٹی بہت سی آزاد حکومتیں بن گئیں۔ مثلاً قرطبہ میں بنو حمود، اشبیلیہ میں بنو عباد، بطلیوس میں ابن افطس، وغیرہ۔ اشبیلیہ میں بنو عباد کی حکومت ۴۱۴ھ میں قائم ہوئی اور ۸۰ برس رہ کر ختم ہوگئی۔ شاہ مراکش یوسف بن تاشفین نے جب اسپین پر چڑھائی کی تو اس کا آخری فرماں روا معتمد بن عباد اشبیلیہ کے تخت پر تھا۔ ۴۸۴ھ میں اس نے معتمد کو گرفتار کرلیا اور اس کو مراکش کے ایک مقام اغمات میں قید کردیا۔ چار سال قید میں رہ کر وہ ۴۸۸ھ میں مرگیا۔

معتمد بن عباد جس زمانہ میں قید میں تھا، عید کے دن اس کی لڑکیاں اس سے ملنے کے لئے آئیں، اس وقت اس کے غم انگیز تاثرات اشعار کی صورت میں ڈھل گئے۔ چند اشعار یہ ہیں:

فیما مضی کنت بالاعیاد مسرورا ۔۔۔ فساءك العید فی اغمات مأسورا

تری بناتك فی الاطمار جائعة ۔۔۔ یغزلن للناس ما یملکن قطمیرا

یطأن فی الطین والاقدام حافیة ۔۔۔ کانها لم تطأ مسکا و کافورا

قد کان دهرك ان تامره ممتثلا ۔۔۔ فردك الدهر منهیا و مامورا

من بات بعدك فی ملك یسر به ۔۔۔ فانما بات بالاحلام مغرورا

ماضی میں تو خوشی کے ساتھ عید مناتا تھا، مگر آج اغمات کے قید میں تیرے لئے عید کی کوئی خوشی نہیں۔
تو اپنی بیٹیوں کو دیکھ رہا ہے کہ وہ بھوکی، پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ وہ لوگوں کے لئے سوت کاتتی ہیں اور ان کے پاس کچھ بھی نہیں۔
وہ کیچڑ میں ننگے پاؤں چلتی ہیں، گویا کہ ان پیروں نے کبھی مشک اور کافور کو روندا ہی نہیں۔
ایک وقت وہ تھا کہ زمانہ تیرے حکم کا تابع تھا، آج زمانہ نے تجھ کو محروم و محکوم بنا دیا ہے۔
تیری اس حالت کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص حکومت پر خوش ہوتا ہے تو وہ خوابوں کے فریب میں مبتلا ہے۔

انسان دنیا کی عزت اور کامیابی حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ اور پھر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ وہ تھا ہی نہیں جس میں وہ ساری عمر مشغول رہا۔ اصل مسئلہ آخرت کا تھا نہ کہ دنیا کا ——— آخرت کی رسوائی، آخرت کی محرومی، آخرت کا عذاب، آخرت میں بے جگہ ہوجانا، یہ وہ مسائل ہیں جن کے لئے آدمی کو بے چین ہونا چاہئے۔ نہ یہ کہ وہ دنیا میں الجھا رہے۔ یہاں تک کہ جب اس کو موت آئے تو معلوم ہو کہ عزت اور کامیابی کے سارے سامان جمع کرنے کے بعد بھی اپنی زندگی کے اگلے مرحلہ میں وہ اس حال میں داخل ہو رہا ہے کہ وہاں کی ابدی دنیا میں اپنی جگہ بنانے کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں۔

قریب ہے کہ کسی بھی صبح و شام وہ انسانوں کے اوپر پھٹ پڑے

انڈے کے اندر زندہ بچہ کا وجود یہ معنے رکھتا ہے کہ ایک روز اس کے اوپر کا خول ٹوٹ جائے اور جیتا جاگتا بچہ خول کے باہر آجائے —— اسی قسم کی نسبت موجودہ دنیا کو آخرت سے ہے۔ آخرت موجودہ دنیا کے اندر سے ابلی پڑ رہی ہے۔ کائنات کے احوال پر گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو دل پکار اٹھے گا کہ بے شک آخرت آنے والی ہے (آل عمران ۱۹۱) بلکہ وہ آپ کو بالکل آتی ہوئی نظر آئے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ حاملہ کے پیٹ میں جس طرح اس کا حمل باہر آنے کے لئے بیتاب ہو، اسی طرح وہ کائنات کے اندر بوجھل ہو رہی ہے اور قریب ہے کہ کسی بھی صبح و شام وہ انسانوں کے اوپر پھٹ پڑے:

"یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ کہاں ہے قیامت۔ کہو اس کا علم تو صرف اللہ کو ہے۔ وہی اپنے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ وہ زمین و آسمان میں بھاری ہو رہی ہے۔ وہ بالکل اچانک تم پر آجائے گی (اعراف ۱۸۷)

وہ دن آنے والا ہے جب تمام اگلے پچھلے پیدا ہونے والے خدا کے پاس اس حال میں جمع کئے جائیں گے کہ ایک رب العالمین کے سوا سب کی آوازیں پست ہو چکی ہوں گی۔ اس دن صرف حق بات میں وزن ہوگا اور اس کے سوا تمام چیزیں اپنا وزن کھو دیں گی۔ یہ فیصلہ کا دن ہوگا۔ ہمارے اور اس دن کے درمیان صرف موت کا فاصلہ ہے۔ آج جو لمحات ہم گزار رہے ہیں۔ اس کے ہر لمحہ کا انجام ہم کو آئندہ کروروں سال تک بھگتنا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ایسے انجام کی طرف چلا جا رہا ہے جہاں اس کے لئے یا تو دائمی عیش ہے یا دائمی عذاب۔ ہر لمحہ جو گزرتا ہے وہ ہم کو اس آخری انجام سے قریب تر کر دیتا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے لئے مقدر ہے۔ ہم کو زندگی کے صرف چند دن حاصل ہیں۔ ایسے چند دن جن کا انجام لامحدود مدت تک بھگتنا پڑے گا جس کا آرام بے حد خوش گوار ہے اور جس کی تکلیف بے حد دردناک۔ ہر بار جب سورج غروب ہوتا ہے تو ہماری عمر میں ایک دن اور کم کر دیتا ہے، اس عمر میں جس کے سوا آنے والے ہولناک دن کی تیاری کا اور کوئی موقع نہیں۔ ہماری زندگی کی مثال برف بیچنے والے دکان دار کی ہے جس کا اثاثہ ہر لمحہ پگھل کر کم ہوتا جا رہا ہو۔ اور جس کی کامیابی کی صورت صرف یہ ہو کہ وہ وقت گزرنے سے پہلے اپنا سامان بیچ ڈالے۔ ورنہ آخر میں اس کے پاس کچھ نہ ہوگا اور دکان سے اس کو خالی ہاتھ اٹھ کر جانا پڑے گا۔ پھر قبل اس کے کہ موت آکر ہم کو اس عالم سے جدا کر دے جہاں صرف کرنا ہے اور اس عالم میں پہنچا دے جہاں کرنا نہیں بلکہ صرف پانا ہے، ہمارے لئے ضروری ہے کہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا صحیح مصرف سوچ لیں۔ ہم سب کو ایک روز مالک کائنات کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ کیسے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو خدا اپنے وفادار بندوں میں شمار کرے۔ کیوں کہ وہی لوگ اس دن عزت والے ہوں گے۔ کیسے بدبخت ہیں وہ لوگ جن کو خدا رد کرے۔ کیوں کہ اس کے بعد ان کے لئے ذلت اور حسرت کی زندگی کے سوا اور کچھ نہیں۔

زلزلہ

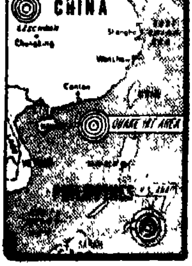
زمین کا اندرونی حصہ نہایت گرم سیال کی شکل میں ہے جس کا مشاہدہ آتش فشاں پہاڑ سے نکلنے والے لاوا کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ یہ مادہ زمین کی سطح کو متاثر کرتا ہے جس سے زمین کے اوپر زبردست گڑگڑاہٹ اور جھٹکے پیدا ہوتے ہیں —— اسی کا نام زلزلہ ہے۔

زلزلہ انسان کے اوپر قدرت کا ایسا حملہ ہے جس میں فیصلہ کا اختیار تمام تر دوسرے فریق کو ہوتا ہے۔ زلزلہ کے مقابلہ میں انسان بالکل بے بس ہے۔ یہ زلزلے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہم ایک سرخ پگھلے ہوئے نہایت گرم مادہ کے اوپر آباد ہیں جس سے صرف ۵۰ کیلو میٹر کی ایک پتلی سی چٹانی تہ ہم کو الگ کرتی ہے جو زمین کی پوری جسامت کے مقابلہ میں ایسی ہی ہے جیسے سیب کے اوپر اس کا باریک چھلکا۔ ایک جغرافیہ داں کے الفاظ میں، ہمارے آباد شہروں اور نیلے سمندروں کے نیچے ایک قدرتی جہنم دہک رہا ہے۔

زلزلہ گویا چھوٹے پیمانہ کی قیامت ہے۔ جب دہشت ناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ زمین پھٹ جاتی ہے۔ جب پکے مکانات تاش کے پتوں کے گھروندوں کی طرح گرنے لگتے ہیں۔ جب زمین کا اوپری حصہ دھنس جاتا ہے اور اندرونی حصہ اوپر آجاتا ہے۔ جب آبادترین شہر چند لمحوں میں وحشت ناک کھنڈر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جب انسان کی لاشیں اس طرح ڈھیر ہو جاتی ہیں جیسے مری ہوئی مچھلیاں زمین کے اوپر پڑی ہوں —— یہ زلزلہ کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ قدرت کے مقابلہ میں کس قدر بے بس ہے۔ یہ زلزلے بالکل اچانک آتے ہیں۔ درحقیقت زلزلہ کا المیہ اس امر میں پوشیدہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ پیشین گوئی نہیں کر سکتا کہ زلزلہ کب اور کہاں آئے گا۔

یہ زلزلے گویا آئندہ آنے والے بڑے زلزلہ (قیامت) کی پیشگی اطلاع ہیں۔ یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ زمین و آسمان کا مالک کس طرح اس دنیا کو ایک روز توڑ ڈالے گا اور اس کے بعد ایک نیا عالم بنائے گا۔

موت کے خوف نے ان سے زندگی کی راحتیں چھین لیں



۲۸ جولائی ۱۹۷۶ء کو شمال مشرقی چین میں زلزلہ آیا۔ چین کا تیسرا سب سے بڑا صنعتی شہر تنگشین جس کی آبادی دس لاکھ تھی، کھنڈر میں تبدیل ہو گیا۔ زلزلہ اتنا شدید تھا کہ اسکے جھٹکے جاپان اور کوریا تک محسوس کیے گئے۔

چین کی راجدھانی پیکنگ زلزلہ زدہ شہر سے تقریباً ۲۰۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ تاہم لوگوں کے خوف و ہراس کا عالم یہ تھا کہ پیکنگ کی ۷۰ لاکھ آبادی نے ممکنہ موت کے ڈر سے اپنے مکانات چھوڑ دیئے اور کئی راتیں سڑکوں اور پارکوں میں گزاریں جبکہ ان کے سروں پر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

جب مادی حالات کے اندر بھی روحانی دعائیں نکلنے لگیں

حضرت موسیٰؑ پر قتل کا الزام عائد کر کے جب مصری سرداروں نے مشورہ کیا کہ انھیں ہلاک کر دیں، تو آنجناب مصر سے مدین چلے گئے۔ مدین اس زمانہ میں، خلیج عقبہ کے مشرقی اور مغربی کناروں پر واقع علاقہ کو کہا جاتا تھا جہاں بنی مدیان آباد تھے۔ یہ مقام فرعونِ مصر کی سلطنت سے باہر تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰؑ نے مصر سے نکل کر مدین کا رخ کیا۔

قرآن پاک میں ہے کہ جب آپ خوف اور اندیشہ کی حالت میں سفر کر رہے تھے تو اللہ کو یاد کرتے ہوئے آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا:

عَسٰی رَبِّیٓ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ (قصص-۲۲) امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستہ کی طرف رہنمائی کرے گا۔

بعض مفسرینِ قرآن نے اس کو محض راستہ کی تلاش کے معنی میں لیا ہے۔ ایک مفسر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یعنی ایسے راستہ پر جس سے میں بخیریت مدین پہنچ جاؤں"

یہ الفاظ اس کیفیت کی ترجمانی کے لئے بہت ناقص ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ ایک مومنانہ کلمہ ہے نہ کہ عام معنوں میں محض ایک راستہ کے مسافر کی دعا۔ حضرت موسیٰؑ کو اگرچہ مادی حالات نے مصر سے نکال کر مدین کے راستہ پر ڈالا تھا، مگر بندۂ مومن کا یہ حال ہوتا ہے کہ مادی واقعات کے اندر بھی اس کی زبان سے روحانی دعائیں نکلتی ہیں۔ بظاہر وہ اسی زمین میں راستہ تلاش کر رہا ہوتا ہے مگر زمین میں راستہ کی تلاش اس کے لئے دوسری دنیا کی یاد دہانی بن جاتی ہے، وہ اس کے ذہن کو آخرت کی وادیوں میں پہنچا دیتی ہے۔ اس کے قدم دنیوی منزل کی طرف چل رہے ہوتے ہیں، مگر اس کے اندر کا طوفان پکار رہا ہوتا ہے ——— "خدایا! مجھے وہاں پہنچا دے جہاں میں تجھ کو پا سکوں۔ کیوں کہ انسان کی حقیقی منزل وہی ہے"

حضرت موسیٰؑ کا یہ کلمہ ایک نازک ایمانی کیفیت کا کلمہ ہے۔ اس کو سفر اور جغرافیہ کے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ حقیقی معنوں میں اپنے رب کو پالیں، ان کے جینے کی سطح بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت کی فضاؤں میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ آج کی لذتوں اور تلخیوں کو دیکھتے ہوئے کل کے جنت اور جہنم کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ مومن حقیقت میں وہی ہے جو دنیا میں آخرت کے عالم کو دیکھ لے۔ جو حالتِ غیب میں رہتے ہوئے حالتِ شہود میں پہنچ جائے۔ غیر مومن پر بھی وہ دن آئے گا جب کہ وہ عالمِ آخرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ مگر یہ اس وقت ہوگا جب کہ غیب و شہود کا فرق مٹ چکا ہوگا۔ جب قیامت کی چنگھاڑ سارے پردوں کو پھاڑ دے گی۔ مگر اس وقت کا دیکھنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیونکہ وہ بدلہ پانے کا وقت ہوگا نہ کہ ایمان و یقین کا ثبوت دینے کا۔

سرکس ہورہا تھا۔ تماشائیوں کو طرح طرح کے کھیل دکھائے جارہے تھے۔ اتنے میں ایک "انسان" لوگوں کے سامنے لایا گیا۔ اس نے عجیب عجیب تماشے دکھا کر لوگوں کو خوش کرنا شروع کردیا۔ ابھی کھیل ختم نہیں ہوا تھا کہ تماشائیوں میں سے ایک شخص نے اس "انسان" کی طرف ایک کنکر پھینک دیا۔ اس کے بعد "انسان" نے ایک زوردار چھلانگ لگائی۔ وہ شاید اپنے حملہ آور تک پہنچنا چاہتا تھا۔ مگر وہ چاروں طرف لگے ہوئے مائک سے ٹکرا گیا۔ اس کے ٹکراتے ہی اس کے چہرے کا مکھوٹا (MASK) گر گیا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ حقیقۃً ایک جانور تھا جو انسانی بھیس بدلے ہوئے تماشا دکھا رہا تھا۔

سرکس کے اسٹیج پر یہ واقعہ شاید ایک ہی بار پیش آیا ہو۔ مگر انسانی بستیوں میں ایسے واقعات ہر روز سامنے آرہے ہیں۔ لوگ بظاہر انسان جیسے چہروں کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی بات ان کو غصہ دلانے والی پیش آجائے تو اچانک وہ اپنا انسانی لبادہ اتار پھینکتے ہیں۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ دراصل حیوان تھے۔ البتہ انھوں نے اوپر سے انسانی مکھوٹا پہن رکھا تھا۔ خلاف مزاج بات پیش آتے ہی وہ اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوگئے۔

لاشعور (آدمی کی اصل ہستی) کو سمجھنے کا بہترین نفسیاتی وقت وہ ہوتا ہے جب کہ وہ ذہنی اختلال میں مبتلا ہو۔ اسی طرح شکایت اور اختلاف کا وقت آدمی کے دین و اخلاق کا امتحان ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی ٹھیک اسی وقت ناکام ہوجاتا ہے جب کہ اس کو سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت دینا چاہئے۔

دعا یا کرتب

ایک شخص حکومت کے کسی شعبہ میں جگہ حاصل کرنے کے لئے ملازمت کا فارم بھرے تو اس کا نام درخواست ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ ایسا کرے کہ اپنے گھر میں سر نیچے اور پاؤں اوپر کرکے کھڑا ہوجائے اور یہ یقین کرے کہ اسی حال میں سات دن رہوں گا تو مجھ کو ملازمت مل جائے گی، تو یہ کرتب ہے۔ درخواست دینا ایک بالکل معقول بات ہے۔ مگر کرتب اتنی ہی بے معنی چیز ہے۔

اسی طرح خدا سے مانگنے میں بھی ایک دعا کا طریقہ ہے اور دوسرا کرتب کا طریقہ۔ دعا یہ ہے کہ آدمی اپنے حاجات و مسائل میں خدا کی طرف رجوع کرے، اس سے روئے گڑگڑائے، اس سے حاجت روائی کی درخواست کرے۔ یہ عین مطلوب ہے۔ حدیث میں ہے کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کو بھی خدا سے مانگو۔

مگر کچھ لوگوں نے اسی کے ساتھ کرتب کے کچھ طریقے نکال رکھے ہیں ——— فلاں لفظ اتنی بار دہرادو تو بلا ٹل جائے گی، فلاں وقت میں فلاں عمل کرو تو حاجات پوری ہوجائیں گی، فلاں نقش کاغذ پر لکھ کر اتنے دن تک باندھے رہو تو دشمن ختم ہوجائے گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کرتب ہیں۔ دعا (اللہ کو پکارنا) جتنا بامعنی ہے، کرتب (عملیات) کے طریقے اتنے ہی بے معنی ہیں۔ پہلا عین اسلامی ہے اور دوسرا قطعاً غیر اسلامی۔

قبل اس کے کہ خدا کا سیلاب پھٹ پڑے

اعظم گڑھ شہر کے کنارے بہت بڑا باندھ ہے جو ۱۸۷۱ کے سیلاب کے بعد بنایا گیا تھا۔ ۱۹۵۵ کا سیلاب آیا تو اس نے تمام تاریخی ریکارڈ توڑ دیئے۔ شہر کی قسمت تمام تر اسی باندھ پر معلق ہو گئی۔ باندھ کے ایک طرف شہر تھا۔ دوسری طرف حد نظر تک پھیلا ہوا پانی جس کی بلندی چھتوں کے برابر ہو رہی تھی۔ بالآخر ایک مقام پر پانی نے باندھ کو توڑنا شروع کیا۔ کلکٹر نے سیکڑوں آدمی متعین کر دیئے جو رات دن باندھ کی مرمت میں لگے ہوئے تھے۔

ہر جگہ اسی کا چرچا تھا۔ ہر شخص کی زبان پر اسی کا تذکرہ تھا۔ یہاں تک کہ ۲۶ جولائی ۱۹۵۵ کی شام آگئی۔ رات کے درمیانی حصہ میں جب کہ سناٹا چھا چکا تھا۔ ایک آواز فضا کو چیرتی ہوئی پورے شہر میں گونج گئی۔ یہ ایک اعلان تھا جو کلکٹر کی طرف سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ کیا جا رہا تھا:

"لال ڈگی کے باندھ کی مرمت کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ باندھ ابھی ٹوٹنا چاہتا ہے۔ آپ لوگ اپنی جانوں کو بچانے کے لئے اونچی جگہوں پر چلے جائیں۔"

رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ سارا شہر جاگ اٹھا۔ عجیب سنسنی پھیل گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اسرافیل نے قیامت کا صور پھونک دیا ہو۔ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر باندھ کی طرف دوڑ پڑے تاکہ اس کو بچانے کی آخری کوشش کر سکیں۔ سیکڑوں آدمیوں نے پھاوڑا اور بوریہ سنبھال لیا اور اس مقام پر مٹی ڈالنی شروع کی جہاں باندھ پھٹ رہا تھا۔ پٹرومیکس کی روشنی میں ساری رات کام ہوتا رہا۔ اگلے دن دوپہر تک مٹی ڈالی جاتی رہی۔ مگر ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔ انجینئر نے اعلان کر دیا کہ باندھ قابو سے باہر ہو چکا ہے۔ ہماری کوئی بھی کوشش اس کو روک نہیں سکتی۔ دن کے بارہ بجے باندھ ٹوٹ گیا۔ پانی کا زبردست ریلا شہر کی طرف بہہ پڑا۔ لوگ اپنے ٹھکانوں کی طرف بھاگ رہے تھے اور پانی ان کے پیچھے سڑکوں اور گلیوں میں اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے وہ ان کا تعاقب کر رہا ہو۔ زندگی کے تمام مسائل سمٹ کر سیلاب کے گرد جمع ہو گئے۔

یہ سیلاب جب مجھے یاد آتا ہے تو اس میں مجھے قیامت کے عظیم تر سیلاب کا نقشہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت بھی اسی طرح کا ایک بہت بڑا سیلاب ہے۔ وہ جب آئے گا تو ہمارے تمام حفاظتی بند ٹوٹ جائیں گے۔ وہ اس طرح ہم کو گھیر لے گا کہ پہاڑ کی چوٹیاں بھی اس کے مقابلہ میں پناہ دینے سے عاجز رہیں گی۔

آج کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ قیامت کے اس آنے والے سیلاب سے دنیا کو آگاہ کیا جائے۔ جس طرح ضلع کلکٹر نے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اعظم گڑھ کے شہریوں کے سامنے سیلاب کا اعلان کرایا۔ اسی طرح ہم کو بھی "لاؤڈ اسپیکر" فراہم کرنا ہے تاکہ سیلاب کے آنے سے پہلے اس کی بابت لوگوں کو باخبر کر سکیں۔ خدا کے پیغمبر اسی آنے والے "سیلاب" سے لوگوں کو باخبر کرنے کے لئے آتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد امت مسلمہ اسی کام پر مامور ہے۔ اس کی لازمی ذمہ داری ہے کہ تمام قوموں کو اس سے خبردار کرے۔ قبل اس کے کہ خدا کا وہ سیلاب پھٹ پڑے اور پھر نہ کسی کے لئے خبردار کرنے کا موقع ہو اور نہ کسی کو خبردار ہونے کا۔

ڈرو اس سے جو وقت آنے والا

کسی مسافر کی ٹرین اسٹیشن پر سامنے کھڑی ہو اور وہ اس میں سوار ہونے کے بجائے پلیٹ فارم کی بنچ پر جگہ حاصل کرنے کے لئے کشمکش کرے، تو ہر آدمی اس کو بیوقوف کہے گا۔ مگر ایک اور سفر کے معاملہ میں ساری دنیا اسی قسم کی نادانی میں مبتلا ہے اور کسی کو اس نادانی کا احساس نہیں۔ حتیٰ کہ جو شخص "ٹرین" کو چھوڑ کر پلیٹ فارم کی بنچ پر اپنے لئے ایک کشادہ جگہ حاصل کر لیتا ہے، اس کو لوگ خوش قسمت کہتے ہیں اور عقل مند کا لقب دیتے ہیں۔

یہ دوسرا سفر موت کا سفر ہے۔ ہر روز لاکھوں آدمی مر کر ہم کو یہ سبق دیتے ہیں کہ زندگی کا اصل مسئلہ آخرت کا مسئلہ ہے، اس کی تیاری کرو۔ مگر انسان دنیا کی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں اس قدر الجھا ہوا ہے کہ اس کو آخرت کی دنیا کے لئے تیاری کا ہوش ہی نہیں۔

قبر دوسری زندگی کا دروازہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی شخص کے لئے اس دروازہ کو کھلتے ہوئے اور پھر اس کے اوپر اس کو بند ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ مگر ہم میں سے بہت کم لوگ ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ خود ان کے لئے بھی یہ دروازہ ایک روز کھولا جائے گا، اور پھر اسی طرح بند ہوگا جس طرح وہ دوسروں کے اوپر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔ آدمی کی یہ نفسیات بھی کتنی عجیب ہے کہ دوسروں کو وہ ہر روز مرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مگر خود اس طرح زندگی گزارتا ہے گویا اس کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ لوگ ایک ایک کر کے روزانہ خدا کے یہاں پیشی کے لئے بلائے جا رہے ہیں۔ مگر خود اپنے کو اس طرح الگ کر لیتا ہے گویا عدالت الٰہی میں حاضری کا یہ دن اس کے اپنے لئے کبھی نہیں آئے گا۔

خدا پرست ہونے کا مطلب کیا ہے

جاڑے کے موسم میں سانپ ٹھٹھر اپڑا رہتا ہے لیکن ذرا سا بھی دُم چھوئیے تو وہ فوراً پھن نکال کر کھڑا ہو جائے گا۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ ایک شخص بظاہر نہایت شریف اور معقول نظر آئے گا۔ لیکن اگر اس کی "انا" کو ضرب لگائیے۔ اس سے کسی معاملے میں اختلاف کر دیجئے تو اچانک وہ ایسا نامعقول بن جاتا ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شخص ہے جس سے اب تک آپ واقف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان اپنے اندر خدا بننے کی ایک تمنا چھپائے ہوئے ہے۔ جب آپ اس سے عقیدت مندی کے ساتھ ملتے ہیں۔ جب اس سے اس کی پسندیدہ باتیں کرتے ہیں تو اس کی خاموش تمنا کو تسکین ملتی رہتی ہے۔ اس کا لاشعور آپ کو قدردانی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک گویا آپ اس کے خدائی کے دعوے کو تسلیم کر رہے ہیں۔ مگر جب آپ ناقد کی حیثیت سے اس کے سامنے آئیں تو اس کا ردعمل بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اب وہ محسوس کرتا ہے کہ آپ اس کے دعوے کو چیلنج کر رہے ہیں، وہ غصہ سے بپھر اٹھتا ہے اور چاہتا ہے کہ آپ کو مٹا ڈالے جس طرح نمرود اور فرعون نے اپنے خدائی کے دعوے کا انکار کرنے والوں کو مٹا دینا چاہا تھا۔

بہت سے لوگ ہیں جو اپنی کسی تحریر میں اپنے نام کے ساتھ "خاکسار"، "ہیچمدان"، "احقر العباد" جیسے الفاظ کو لکھنا اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا تحریر کے آغاز میں بسم اللہ کو۔ لیکن اگر ان کی "انا" پر ضرب لگائیے تو ایسا معلوم ہوگا گویا انھوں نے "برعکس نہند نام زنگی کافور" کے اصول پر اپنے لئے یہ القاب تجویز کئے تھے۔ اپنے خلاف تنقید کو سن کر وہ جس ردعمل کا اظہار کرتے ہیں اس سے ہرگز یہ معلوم نہیں ہوتا کہ فی الواقع وہ اپنے کو حقیر یا خاکسار یا کچھ نہ جاننے والا سمجھتے ہیں۔

اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ یہ کبر ہے اور خدا کے یہاں کبر کی معافی نہیں۔

لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال حبة خردل من کبر، قیل وما الکبر قال: بطر الحق وغمط الناس۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں وہ شخص نہیں جائے گا جس کے اندر رائی کے دانہ کے برابر بھی کبر ہو، پوچھا گیا کبر کیا ہے۔ فرمایا: حق کو نظرانداز کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی خاطر پیدا کیا ہے۔ اس لئے اس کے اندر نفس بھی رکھ دیا ہے جو اس کو برائیوں پر اکساتا ہے۔ تاہم اسی کے ساتھ تمیز کی قوت بھی انسان کے اندر موجود ہے جو اس کو حق و ناحق بتاتی رہتی ہے۔ ایسا ہونا بالکل فطری ہے کہ کبھی کوئی ناموافق بات سن کر آدمی پر جھنجھلاہٹ اور غصہ طاری ہو جائے اور اس کی

زبان سے نامناسب الفاظ نکل جائیں۔ مگر مومن کی شان یہ ہے کہ ایسے واقعہ کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے کئے پر شرمندہ ہوتا ہے۔ اپنے رویے کی اصلاح کا عزم کرتا ہے۔ اس کی ذات سے کسی کو نقصان پہنچ گیا ہے تو اس کی تلافی کرتا ہے، جس کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کیا تھا اس سے معافی مانگتا ہے۔ جب وہ ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ صرف اس کا جرم بخش دیا جاتا ہے بلکہ خود جرم کو بھی نیکی کے خانہ میں لکھ دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس کیلئے ایک زیادہ بڑی نیکی کے کرنے کا سبب بنا۔ مگر جو لوگ اختلاف کو عناد اور کینہ کے مقام تک پہنچا دیں۔ جو اپنی "خدائی" تسلیم نہ کرنے والے شخص سے ہمیشہ کے لئے بدگمان ہو جائیں اور جنھیں یہ توفیق نہ ملے کہ اس سے معافی مانگ کر اس کی طرف سے اپنے دل کو صاف کر لیں، وہ بدترین مجرم ہیں، وہ کسی حال میں خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے خواہ دنیا میں اپنے اتفاقی حالات کی وجہ سے وہ اپنے دل کی گندگی کو چھپانے میں کامیاب ہو جائیں۔

خدا پرست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکا دے اس کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کے تمام احساسات کو بالکل ختم کر دے یہ احساس اگرچہ خدا کے مقابلہ میں مطلوب ہے مگر اس کا امتحان بندوں کے معاملات ہی میں ہوتا ہے۔ انسانوں کے ساتھ تعلقات میں جو شخص یہ ثابت کرے کہ اسکے دل میں جھکاؤ ہے۔ وہی دراصل خدا کے آگے جھکا ہوا ہے اسکے برعکس انسانوں سے ٹھیس پہنچنے کے وقت جو شخص ظالم اور متکبر بن جائے، وہ خدا کے مقابلہ میں بھی ایسا ہی ہے خواہ وہ فرائض و نوافل میں کتنا ہی تواضع کا اظہار کرتا ہو۔

حدیث میں ہے کہ آدمی کبھی ایک بھوکے اور پیاسے کو نظرانداز کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں ایک معمولی آدمی کو نظرانداز کر رہا ہوں۔ حالانکہ وہ رب العالمین کو نظرانداز کر رہا ہوتا ہے۔

اسی طرح آدمی کبھی ایک پیغام کو نظرانداز کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں ایک معمولی آدمی کی بات کو نظرانداز کر رہا ہوں۔ حالاں کہ وہ رب العالمین کی بات کو نظرانداز کر رہا ہوتا ہے۔

ایسے لوگوں کی نفسیات دنیا میں تو یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو ہوشیار اور کامیاب سمجھتے ہیں۔ اپنے عمل پر شرمندہ ہونے کے بجائے فاتحانہ انداز سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر جب وہ مرنے کے بعد آخرت کے عالم میں کھڑے کئے جائیں گے تو انھیں دکھائی دے گا کہ ان سے زیادہ نادان اور کوئی نہ تھا۔ ان کو ایسا محسوس ہوگا گویا زمین و آسمان نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اس وقت وہ جانیں گے کہ دنیا میں اپنی جس زندگی پر وہ نازاں تھے، خدا کی نظر میں اس کی کوئی قیمت نہ تھی۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی سنتِ امتحان تھی جس نے ان کو زمین میں زندگی کا موقع دے رکھا تھا۔ امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد ان کو اپنا وجود اس سے بھی زیادہ بے حقیقت نظر آئے گا جتنا کہ مکھی اور مچھر۔

یہ ایک خدائی منصوبہ تھا

تاکہ ظالموں اور متکبروں کا مجرم ہونا ثابت ہو جائے اور اللہ کے وفادار بندوں کو خدائی گواہ بننے کا اعزاز حاصل ہو

ہجرت کے تیسرے سال احد کا معرکہ پیش آیا۔ اس جنگ میں ابتداءً مسلمانوں کو کامیابی ہوئی، مگر بعد کو اہل ایمان کی ایک اتفاقی غلطی سے فائدہ اٹھا کر خدا کے دشمن ان کے اوپر ٹوٹ پڑے اور انھیں نقصان پہنچایا۔ اس واقعہ سے اہل ایمان کے درمیان طرح طرح کے سوالات پیدا ہونے لگے۔ انھوں نے کہا: ہم حق پر ہیں پھر یہ مصیبت کہاں سے آگئی (آل عمران۔ ۱۶۵) جواب ملا کہ یہ وقتی نقصانات ہیں، ان کی پروا مت کرو۔ خدا کی نصرت حق پرستوں کے ساتھ ہے اور آخری کامیابی بہر حال انھیں کو حاصل ہوگی۔

"یہ اس واسطے ہوا تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم کو ظالموں کے اوپر گواہ بنائے" (آل عمران۔ ۱۴۰) —— گویا احد کی جنگ میں مسلمانوں سے جو ایک اتفاقی غلطی ہوئی اور جس کی وجہ سے خدا کے دشمنوں کو موقع ملا کہ وہ بے گناہ مسلمانوں کے اوپر پیچھے سے چڑھ آئیں، وہ بھی خدائی منصوبہ کا ایک جزو تھا۔ اس طرح خدا ظالموں اور سرکشوں کو ننگا کرنا چاہتا تھا، ان کے ہاتھوں اہل ایمان کو زخمی کرکے ان کی درندگی اور سرکشی کا ثبوت فراہم کرنا مقصود تھا۔ اللہ چاہتا تھا کہ اس واقعہ کے ذریعہ ایک طرف ظالموں اور متکبروں کو مجرمین کے کٹہرے میں کھڑا کر دے، دوسری طرف اپنے وفادار بندوں کو ان کے مقابلہ میں عدالت الٰہی کا گواہ بننے کا اعزاز عطا کرے۔ یہ ایک خدائی معاملہ تھا نہ کہ محض ایک انسانی واقعہ (۲۰ جولائی ۷۷ ۱۹)

انسان صرف اچھا یا برا کریڈٹ لے رہا ہے

ایک سب سے بڑی بات جس کو انسان سب سے زیادہ بھولا رہتا ہے، یہ کہ اس دنیا میں کسی انسان کو کوئی ذاتی طاقت حاصل نہیں۔ کوئی شخص نہ کسی کو کچھ دیتا، نہ کوئی شخص کسی سے کچھ چھینتا۔ ہر واقعہ جو اس زمین پر ہوتا ہے وہ خدا کی اجازت سے ہوتا ہے۔ انسان کی ساری حیثیت یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں امتحان کے لئے ہے۔ ارادہ کے سوا انسان کے بس میں اور کچھ نہیں۔ واقعات اس لئے اس کے سامنے لائے جاتے ہیں کہ اس کی جانچ ہو تاکہ اس کا خدا یہ دیکھے کہ اس کا بندہ مختلف رویوں میں سے کس رویہ کا اپنے لئے انتخاب کر رہا ہے۔ واقعات کا اہتمام مالک کائنات کی طرف سے ہوتا ہے۔ انسان تو صرف اچھا یا برا کریڈٹ لے رہا ہے

چپ رہنا سیکھو، تاکہ تم فرشتوں کی سرگوشیوں کو سن سکو۔

اپنی قوتوں کو عمل میں لاؤ، تم خدا کی مدد کے مستحق ٹھہروگے۔

جس دل میں بندوں کی محبت نہ ہو، وہ خدا کی محبت سے بھی خالی ہوگا۔

لوگوں کو حقیر نہ سمجھو، ورنہ تم لوگوں کے خالق کی نظر میں حقیر ہو جاؤ گے۔

جو ارباب جاہ کی قربت ڈھونڈتا ہے، وہ خدا کی قربت سے دور ہو گیا۔

کوئی شخص تم کو پتھر مارے تو اس سے لڑنے میں وقت ضائع مت کرو، بلکہ اپنے آپ کو اتنا اونچا اٹھاؤ کہ پتھر مارنے والے کا پتھر وہاں تک پہنچ ہی نہ سکے۔

جو لوگ دوسروں کی شکایت کرتے ہیں وہ صرف اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ زندگی کی دوڑ میں وہ دوسروں سے پیچھے ہو گئے۔

جب خدا کے دین کو دنیا دارانہ زندگی میں ڈھال لیا جائے

اسلام کا مطلب یہ ہے کہ زندگی خدا اور آخرت کی یاد میں ڈھل جائے۔ یہاں بندہ اپنے رب سے روحانی سطح پر ملاقات کرتا ہے۔ مگر جب اسلام کے ماننے والوں کو زوال ہوتا ہے تو اسلام کی روح غائب ہو جاتی ہے اور صرف اس کے دنیوی پہلو باقی رہ جاتے ہیں، اسلام اپنی سطح سے اتر کر ماننے والوں کی سطح پر آجاتا ہے ــــ نظر نہ آنے والے خدا سے خوف و محبت کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے، البتہ نظر آنے والے خداؤں (احبار و رہبان) کی تقدیس و تحمید زوروں پر شروع ہو جاتی ہے۔ خدا کے لئے تنہائیوں میں رونا اور خاموشیوں میں اس سے گڑگڑانا باقی نہیں رہتا، البتہ لاؤڈ اسپیکر کے اوپر قرآن و اسلام کے ہنگامے خوب ترقی کرتے ہیں۔ نماز لوگوں کے دلوں کو روشن نہیں کرتی، البتہ مسجدوں کی روشنیاں پورے شباب پر پہنچ جاتی ہیں۔ روزہ سے صبر اور پرہیزگاری نکل جاتی ہے، البتہ افطار و سحر کی دھوم خوب بڑھ جاتی ہے۔ عید میں شکر اور سجدہ کی روح نہیں ہوتی، البتہ کپڑے اور میلے کے تماشے خوب رونق پکڑتے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے دین کو اپنی دنیا دارانہ زندگی میں ڈھال لیا جاتا ہے

ہر آدمی ایک فیصلہ کن انجام کی طرف بڑھ رہا ہے

ہندستان کی آزادی سے بارہ سال پہلے ۱۹۳۵ میں جب آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو نے انگریزی جیل میں اپنی آپ بیتی مکمل کی تو اس کے آخر میں انھوں نے لکھا:

"میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی کا ایک باب ختم ہو گیا اور اب اس کا دوسرا باب شروع ہوگا۔ اس میں کیا ہوگا، اس کے متعلق میں کوئی قیاس نہیں کر سکتا کتاب زندگی کے اگلے ورق سربمہر ہیں۔"

آٹو بیاگریفی (لندن ۱۹۵۳) صفحہ ۵۹۷

نہرو کی زندگی کے اگلے اوراق کھلے تو معلوم ہوا کہ وہ دنیا کے تیسرے سب سے بڑے ملک کے وزیر اعظم ہیں۔ انسانی آبادی کے چھٹے حصہ پر انھوں نے اپنی ساری عمر بلاشرکت حکومت کی۔ ان کا اقتدار اتنا مکمل تھا کہ اپنی وزارتی کابینہ کے طاقت ور ترین شخص سردار پٹیل سے جب ان کے اختلافات ہوئے تو ہندستان کے اس مرد آہن نے بالآخر نہرو کے آگے ہتھیار ڈال دئے اور لکھ کر دے دیا کہ اختلافی معاملات میں عملاً میں اسی رائے کا پابند رہوں گا جو آپ کی رائے ہوگی۔

اس قسم کے کامل اقتدار کے باوجود پنڈت نہرو اپنی آخری عمر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ شاید حقیقت کی کچھ اور منزلیں ہیں جہاں تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ جنوری ۱۹۶۴ میں مستشرقین کی بین اقوامی کانگرس نئی دہلی میں ہوئی تھی۔ اس میں ہندستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے بارہ سو ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ پنڈت نہرو نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میں ایک سیاست داں ہوں اور مجھے سوچنے کے لئے وقت کم ملتا ہے۔ پھر بھی بعض اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہوں کہ آخر یہ دنیا کیا ہے۔ کس لئے ہے۔ ہم کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ یہ میرا یقین ہے کہ کچھ طاقتیں ہیں جو ہماری تقدیر بناتی ہیں۔"

(نیشنل ہیرلڈ ۷ جنوری ۱۹۶۴)

پنڈت نہرو کے انتقال کے بعد، ایک مختصر وقفہ کو چھوڑ کر، ہندستان کا اقتدار دوبارہ ان کی صاحبزادی مسز اندرا گاندھی کے ہاتھ میں آیا اور گیارہ سال دو مہینے تک اتنی شان کے ساتھ انھوں نے حکومت کی کہ لوگ کہنے لگے کہ بیٹی باپ پر بھی بازی لے گئی ہے۔ مگر بالآخر قدرت نے ان کی سیاسی کتاب کو بھی اس طرح سربمہر کر دیا کہ وہ بھی دوبارہ اسی سوال سے دوچار ہیں جس سے ان کا باپ چالیس سال پہلے دوچار تھا ——

"زندگی کیا ہے اور بالآخر آدمی کا انجام کیا ہونے والا ہے۔"

تاریخ کے اندر بے شمار سبق ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ ہر آدمی ایک ایسی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں آدمی کی خوش فہمیاں اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی۔ کوئی اقتدار کسی کے کام نہ آئے گا۔ وہاں فیصلہ کا سارا اختیار دوسری طاقت کے ہاتھ میں ہوگا۔ دنیا میں انسان کا انجام آخرت کے اسی انجام کا ابتدائی نمونہ ہے۔

ہر شخص جس کو زندگی کے اسٹیج پر اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ملتا ہے، وہ انتہائی نادانی کے ساتھ اسی عمل کو دہراتا ہے جو پچھلے تجربہ میں مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے

جنّت والے

امام نسائی نے انس بن مالک سے نقل کیا ہے۔ ایک بار تین دن تک مسلسل یہ ہوتا رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس میں یہ فرماتے کہ اب تمھارے سامنے ایک ایسا شخص آنے والا ہے جو اہل جنت میں سے ہے۔ ہر بار یہ آنے والے انصار میں سے ایک شخص ہوتے۔ یہ دیکھ کر عبد اللہ بن عمرو بن عاص کو جستجو ہوئی کہ آخر وہ کون سا عمل کرتے ہیں جس کی بنا پر آپؐ نے ان کے بارے میں بار بار یہ بشارت سنائی ہے۔ چنانچہ وہ ایک بہانہ کر کے گئے اور تین روز تک مسلسل ان کے یہاں رات گزارتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شاید کوئی خاص عبادت کرتے ہوں گے جس کی وجہ سے ان کو یہ مقام ملا۔ مگر ان کی عبادت اور شب گزاری میں کوئی غیر معمولی چیز ان کو دکھائی نہ دی۔ آخر انھوں نے خود ہی ان سے پوچھا کہ بھائی، آپ کون سا ایسا عمل کرتے ہیں جس کی بنا پر ہم نے رسول اللہ کی زبان سے آپ کے بارے میں یہ عظیم بشارت سنی ہے۔ انھوں نے کہا، میری عبادت کا حال تو وہی ہے جو آپ نے دیکھا البتہ ایک بات شاید اس کا سبب بنی ہو، اور وہ یہ کہ:

لا اجد فی نفسی غلا لاحد من المسلمین

ولا احسد ہ علی خیر اعطاہ اللہ تعالی

میں اپنے دل میں کسی مسلمان کے خلاف کوئی کینہ نہیں رکھتا۔ اور نہ کسی ایسی بھلائی پر جو اللہ نے اسے دی ہو، اس سے حسد کرتا ہوں۔

زندگی کیا ہے، موت کی طرف ایک سفر۔ ہر شخص دوسروں کو اپنے سامنے مرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مگر خود اس طرح زندگی گزارتا ہے گویا اس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔

کوئی رصدگاہ اگر کسی دن یہ دریافت کرے کہ زمین کی جذب وکشش کی قوت ختم ہو گئی ہے تو اگلے دن یہی دریافت تمام اخباروں کی شاہ سرخی ہو گی۔ کیوں کہ اس قسم کی خبر زمین کے لئے موت کے سفر کے ہم معنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کا کرہ چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہو جائے اور چند ہفتوں کے اندر اپنے سے بارہ لاکھ گنا بڑے سورج کے الاؤ میں اس طرح جا گرے جیسے دنیا کے سب سے بڑے آتش فشاں کے اندر کوئی ایک تنکا۔

زمین کے لئے موت کے سفر کی خبر کسی دن اخبار میں چھپ جائے تو ساری دنیا میں کہرام مچ جائے گا۔ ہم میں سے ہر شخص اس قسم کے ہولناک تر سفر میں ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس سے چوکنا ہو اور اپنی زندگی کے آئندہ مراحل میں بربادی سے بچنے کی فکر کرے ـــــ سب سے بڑا مسئلہ "موت" کا مسئلہ ہے۔ مگر لوگ "زندگی" کے مسائل میں اتنا الجھے ہوئے ہیں کہ کسی کو موت کے مسئلہ پر دھیان دینے کی فرصت نہیں۔

جب زندگی کا رخ آخرت کی طرف ہو جائے

اہل ایمان کی تعریف قرآن میں یہ کی گئی ہے کہ جب ان کے سامنے خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل اٹھتے ہیں (انفال۔۲) اور جب ان کے سامنے خدا کا کوئی حکم بیان کیا جاتا ہے تو فوراً اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں خواہ وہ ان کی مرضی کے خلاف کیوں نہ ہو۔ (نساء۔ ۶۵)

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کہا کہ میرے پاس کچھ غلام ہیں جو میرے ساتھ خیانت کرتے ہیں اور میری نافرمانی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے میں ان کو برا بھلا کہتا ہوں اور مارتا ہوں۔ پھر ان کے معاملہ میں میرا حال کیا ہوگا۔ آپ نے جواب دیا: جب قیامت کا دن آئے گا تو ان کی خیانت اور ان کی نافرمانی کا شمار کیا جائے گا۔ پس اگر تمھاری سزا ان کے جرم کے مطابق ہوگی تو معاملہ برابر برابر ہو جائے گا اور اگر تمھاری سزا ان کے جرم سے زیادہ ہوگی تو ان کو اجازت دی جائے گی کہ اس کے بقدر تم سے بدلہ لیں۔ یہ سن کر وہ شخص چیخ پڑا اور رونے لگا۔ اور اس کے بعد کہا:

یارسول اللہ، ما اجد لی ولھولاء خیرا من مفارقتھم، اشھدک انھم کلھم احرار (احمد، ترمذی)

اے خدا کے رسول، میرے اور ان کے درمیان جدائی سے بہتر کوئی صورت نہیں۔ میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ وہ سب آج سے آزاد ہیں۔

مومن کون ہے۔ مومن دراصل وہ ہے جو اس واقعہ کو اپنی آنکھ سے دیکھ لے کہ اسرافیل صور لئے کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور پھونک مار کر سارے عالم کو تہ و بالا کر دیں۔ کافر اور مومن کا فرق، باعتبار حقیقت، اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کافر دنیا کی سطح پر جیتا ہے اور مومن آخرت کی سطح پر۔ ایک، ظاہر حیات میں گم رہتا ہے۔ دوسرا، آخر حیات میں اپنے لئے زندگی کا راز پالیتا ہے ——

یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (روم۔ ۷)

کسی بھی حال میں انصاف کو نہ چھوڑیئے

"ہم نے اپنے رسول نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری۔ تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں" (حدید ۲۵) قرآن کا یہ ارشاد بتاتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے کیا مطلوب ہے۔ وہ مطلوب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے دائرہ میں دوسروں کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرے جو انصاف کے مطابق ہے۔ اس کا ہر عمل خدا کی شریعت کی ترازو میں تلا ہوا ہونا چاہئے۔ لینا ہو یا دینا، دونوں حالتوں میں وہ لوگوں کے حقوق کی پوری پوری ادائگی کرے چنانچہ ارشاد فرمایا:

اے ایمان والو، انصاف پر خوب قائم رہو اور اللہ کی گواہی دینے والے بنو۔ اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو (نساء ۱۳۵) بندۂ مومن کی اگر کسی شخص سے ان بن ہو جاتی ہے، تب بھی اس کے عادلانہ رویہ میں فرق نہیں آتا۔ خدا کا ڈر اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہر حال میں وہی کرے جو حقیقۃً انصاف کا تقاضا ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (مائدہ ۔ ۸)

کسی کی عداوت کے باعث انصاف کو نہ چھوڑو، انصاف کرو۔ یہی بات تقویٰ سے لگتی ہوئی ہے۔

تاہم خود انصاف پر چلنا جتنا مطلوب ہے، اتنا ہی یہ بات غیر مطلوب ہے کہ آدمی دوسروں کے خلاف انصاف کا جھنڈا لے کر کھڑا ہو جائے۔ ہر شخص سے اپنی ذات کے بارے میں خدا کے یہاں پوچھ ہونی ہے اور ہر شخص کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں انصاف کو اپنائے۔ وہ خواہ حاکم کی پوزیشن میں ہو یا محکوم کی، ہر حال میں دوسروں کو اس سے انصاف ملے۔

اس کے بعد اگر کسی کو نظر آتا ہے کہ اس کا بھائی، خواہ وہ فرد ہو یا جماعت، بے انصافی کی روش پر چل رہا ہے، تو ان کے لئے اس کے اندر نصیحت (خیر خواہی) کا جذبہ ابھرنا چاہئے نہ کہ ایجی ٹیشن اور محاذ آرائی کا۔ اس کو چاہئے کہ اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح کے لئے اللہ سے دعا کرے حکمت اور خیر خواہی کے ساتھ ان کو بھلائی کی تلقین کرے۔ ان کی اصلاح کے لئے وہی مشفقانہ طریقہ اختیار کرے جو وہ اپنی عزیز اولاد کی اصلاح کے لئے کرتا ہے۔ اس کے بجائے احتجاجی سیاست چلانا اور انصاف کا جھنڈا لے کر کھڑا ہو جانا کسی طرح صحیح نہیں۔ اس قسم کا ہر اقدام صرف بگاڑ میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ کسی بھی درجہ میں حالات کو سدھارنے والا نہیں بن سکتا۔

پٹرول کی طاقت نے مسلمانوں کو نہ صرف اقتصادی اور سیاسی سہارا دیا ہے بلکہ وہ اعلان حق اور دعوت دین کے کام میں بھی مددگار ہو رہا ہے۔ دو بلین پٹرو ڈالر (۱۰۰ کروڑ روپے) کے خرچ سے ۱۹۷۶ میں لندن میں جو ورلڈ آف اسلام فیسٹیول (مہرجان العالمی الاسلامی) ہوا، اس کو دیکھ کر سیکڑوں یورپی باشندے مسلمان ہو گئے۔ ایک برطانوی اخبار نے اس مہرجان کی رپورٹ دیتے ہوئے اس کو یورپ کے اوپر اسلام کا حملہ قرار دیا تھا۔ (السٹریٹیڈ ویکلی ۱۰ جولائی ۱۹۷۶):

THE ISLAMIC INVASION IS UPON US

پٹرول کی اقتصادی قوت نے آج مسلم قوموں کو نئی اہمیت دے دی ہے۔ ساری دنیا میں عربی زبان کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں جگہ جگہ اسلامی مراکز کھل رہے ہیں۔ اسلامی لٹریچر کی اشاعت کا کام بہت بڑھ گیا ہے۔ دنیا بھر میں اسلامی شخصیتوں اور اسلامی اداروں کو پٹرول کے جادو نے نئی زندگی عطا کر دی ہے۔ بین اقوامی اسلامی اجتماعات اتنی زیادہ تعداد میں ہو رہے ہیں جن کا چند سال پہلے تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ افریقہ میں نہ صرف عوام میں اسلام پھیل رہا ہے بلکہ حالیہ برسوں میں دو عیسائی حکمراں اسلام قبول کر چکے ہیں —— یہ اور اس طرح کے دوسرے اسلامی اہمیت کے واقعات جو آج ساری دنیا میں ہو رہے ہیں وہ تمام تر اس دولت کے کرشمے ہیں جو خداداد پٹرول کے ذریعہ اچانک خلیج فارس کے مسلم ملکوں کو حاصل ہو گئی ہے۔ حتی کہ حالیہ برسوں میں مسلم قوموں کو اپنے مغربی آقاؤں کے مقابلہ میں جو جرأتِ اختلاف پیدا ہوئی ہے، وہ بھی تمام تر پٹرول کی خداداد طاقت کا کرشمہ ہے، مثلاً ترکی، سعودی عرب اور پاکستان کا امریکہ کے مقابلہ میں، اور مصر کا روس کے مقابلہ میں۔

مگر ان باتوں میں ہمارے لئے بہت زیادہ خوشی کا پہلو نہیں ہے۔ کیوں کہ "انسان" کا کام "پٹرول" انجام دینے لگے تو یہ خدا کی طرف سے انسان کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار ہے۔ جب خدا کی آواز بلند کرنے کے لئے انسانوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں، اس وقت دابہ (نمل — ۸۲) زمین سے نکل کر امر حق کا اعلان کرتا ہے۔ مگر جب دابہ ارضی کی زبان سے خدا اپنا اعلان کرانے لگے تو یہ خوشی کا نہیں غم کا وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد زمین و آسمان کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے۔ انسان سے زمین کا سرسبز کرہ چھین لیا جاتا ہے اور اس کو دھوئیں اور آگ کی دنیا کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے جہاں وہ ابدی طور پر "روتا اور دانت پیستا" رہے۔

مسیح سے یروشلم کے یہودی علماء نے کہا کہ اپنے شاگردوں کو منع کر دو کہ وہ ہمارے اوپر تبلیغ نہ کیا کریں۔ مسیح نے جواب دیا:

اقول لکم انہ ان سکت ھولاء فالحجارة تصرخ

میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر یہ چپ ہو جائیں تو پتھر چلا اٹھیں گے

(لوقا ۱۹ : ۴۰)

مطلب یہ ہے کہ خدا کے پیغام کو بہرحال بلند ہونا ہے۔ اگر وہ انسانوں کی زبان سے بلند نہیں ہو گا تو درخت اور پتھر چلا کر اسے لوگوں کو سنائیں گے۔ مگر جب درخت اور پتھر چلانے لگیں تو یہ انسانوں کے لئے موت کا وقت ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد عمل کی مہلت ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد دو ہی چیزیں باقی رہتی ہیں یا جنت یا جہنم۔ یہ امتحان کی کاپی چھین لینے کا وقت ہوتا ہے نہ کہ پرچہ حل کرنے کا۔

سورہ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے کہ پچھلے لوگوں کے حالات میں تمھارے لئے سبق ہے اور قرآن کی صورت میں ایک مکمل نصیحت نامہ تمھارے لئے بھیج دیا گیا ہے۔ کھلا کھلا حق آجانے کے بعد بھی جو اس سے اعراض کرے، قیامت کے دن اس کو بہت برا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔

اس دن جب کہ صور پھونکا جائے گا اور خدا تمام مجرموں کو اس طرح گھیر لائے گا کہ ان کی آنکھیں خوف و دہشت سے پتھرائی ہوئی ہوں گی۔ اس وقت دنیا کی زندگی ان کو اتنی حقیر اور مختصر معلوم ہوگی کہ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے: "دنیا میں مشکل سے ہم نے دس دن گزارے ہوں گے"۔ پھر کوئی بولے گا: "نہیں، تمھاری دنیا کی زندگی تو بس ایک دن کی زندگی تھی"۔

جب قیامت آئے گی تو پہاڑوں کو خدا دھول بنا کر اڑا دے گا اور ساری زمین کو ایسا چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں کہیں کوئی اونچ نیچ دکھائی نہ دے گی۔ اس دن تمام انسان پکارنے والے کی پکار پر سیدھے چلے آئیں گے۔ کوئی کسی قسم کی اکڑ نہ دکھا سکے گا۔ تمام آوازیں خدا کے آگے پست ہو جائیں گی۔ سارے لوگ خاموش ہوں گے۔ چلنے کی ہلکی پھسپھساہٹ کے سوا تم کوئی آواز نہ سنو گے۔ اس روز کوئی سفارش کسی کے لئے کارگر نہ ہوگی۔ تمام لوگوں کے سر اس حی و قیوم کے آگے جھک جائیں گے۔

اس دن وہ شخص ناکام و نامراد ہوگا جو کسی ظلم کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ اور جو خدا پر ایمان رکھنے والا ہو اور نیک عمل کرے، اس کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ اس دن نہ ہوگا۔

ورنہ ہم اپنی قیمت کھو دیں گے

مسلمان خدا کی طرف سے اس ذمہ داری پر مقرر کئے گئے ہیں کہ وہ تمام اہل عالم کو یہ بتا دیں کہ ان کا رب ان سے حساب لینے والا ہے۔ اس تقرر نے ان کے حال اور مستقبل کو اس کارِ خاص کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ خدا کی نظر میں ان کی قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ وہ خدائی پیغام رسانی کی اس خدمت کو انجام دیں۔ اگر وہ اس کے لئے نہ اٹھیں تو خدا کے نزدیک وہ اپنی قیمت کھو دیں گے۔

اس ذمہ داری کو چھوڑنے کے بعد کوئی بھی دوسرا عمل ان سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد خدا ان کو ان کے دشمنوں کے حوالے کر دے گا۔ ان کے اوپر دوسری قومیں غلبہ حاصل کریں گی۔ حتیٰ کہ دوسری بنیادوں پر اٹھائی ہوئی ان کی اسلامی تحریکوں پر بھی رولر چلا دیا جائے گا۔ خود ساختہ خیالات کی بنا پر اگرچہ وہ خوش فہمیوں میں مبتلا رہیں گے۔ مگر حالات کی بے رحم زبان چیخ رہی ہوگی کہ ان کا خدا ان کو چھوڑ چکا ہے۔

اقوام عالم کے سامنے اللہ کے دین کی گواہی دینے کے لئے اگر مسلمان نہیں اٹھتے تو ان کی کوئی قیمت خدا کے نزدیک نہیں ہے، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں ——

یہود کی تاریخ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے

ابولہب کو یہ بات غیر اہم نظر آئی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نبوت ملی اور خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ لوگوں کے درمیان حقیقت کا اعلان کرد تو آپ صفا کی پہاڑی پر چڑھے ، اس زمانہ میں کسی بڑے خطرے کے اعلان کے لئے مکہ میں اسی بلند مقام کو استعمال کیا جاتا تھا۔ آپ نے پکار کر لوگوں کو جمع کیا۔ جب لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے ایک مختصر تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا:

"لوگو آگاہ ہو جاؤ، جس طرح تم سوتے ہو، اسی طرح تم مروگے اور جس طرح تم جاگتے ہو اسی طرح دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے۔ اس کے بعد یا ہمیشہ کے لئے جنت ہے یا ہمیشہ کے لئے جہنم"

یہ آخرت کی حقیقت کا اعلان تھا جو دنیا پرست لوگوں کو سنایا جا رہا تھا۔ مگر آپ کے چچا ابولہب کی دنیوی فکر کے لئے یہ پیغام آخرت اتنا غیر مانوس ثابت ہوا کہ وہ فوراً مجلس سے اٹھ گیا اور چلا کر کہا:

تبالک سائر الیوم الھذا اجمعتنا

تمہارا برا ہو۔ کیا تم نے یہی بات سنانے کے لئے ہم کو جمع کیا تھا۔

دین کو جب دنیوی سانچہ میں ڈھال کر پیش کیا جائے تو وہ بہت جلد لوگوں میں مقبول ہو جاتا ہے۔

دین

آخرت طلبی کا نام ہے

مہاتما گاندھی بھی سوشلزم کو مانتے تھے، اور کمیونسٹ بھی۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ گاندھی جی اختیاری سوشلزم کے قائل تھے اور کمیونسٹ جبری سوشلزم کے۔ کمیونسٹوں کا سوشلزم عوام میں پھیل گیا، جب کہ گاندھی جی کے سوشلزم کو صرف چند ہی لوگ قبول کر سکے۔ وجہ بالکل سادہ ہے۔ کمیونسٹوں کا نظریہ عوام کی فکری سطح سے قریب تھا۔ اس کے برعکس گاندھی جی کا نظریہ، نسبتاً زیادہ بہتر ہونے کے باوجود، عوام کے لئے ناقابل فہم تھا۔ اس کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے تھے۔ جو سماجی مسائل پر زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچتے ہوں۔

یہی صورت حال مذہب کے ساتھ بھی پیش آتی ہے۔ کوئی مذہبی تحریک عوام میں مقبول ہو رہی ہو تو اس کا لازمی مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ صداقت پر مبنی ہے۔ بالکل ممکن

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

الرسالہ

شمارہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۸

جمعیۃ بلڈنگ • قاسم جان اسٹریٹ • دہلی ۶

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
ان اللہ تعالیٰ اوحیٰ الیّ ان تواضعوا حتی لا یبغی احدٌ علی احد ولا یفخرَ احدٌ علی احد (مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ نے مجھ پر وحی کی کہ تواضع اختیار کرو۔ کوئی شخص کسی پر زیادتی نہ کرے۔ کوئی کسی پر فخر نہ کرے۔

X یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ براہ کرم اپنا زر تعاون بذریعہ منی آرڈر بھیج کر شکریہ کا موقع دیں ——— مینجر الرسالہ

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعوت اسلامی کے لئے جدید طرز کے ایک اسلامی مرکز کے قیام کا تخیل راقم الحروف نے ابتداءً ہفت روزہ الجمعیۃ نومبر ۱۹۷۰ء میں شائع کیا تھا۔ یہ تحریر عربی میں ترجمہ ہو کر پہلی بار ۱۹۷۱ میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔ "نحو بعث اسلامی" کے نام سے یہ تعارفی کتابچہ قاہرہ اور بیروت سے اب تک چھ بار شائع ہو چکا ہے اور تمام عرب دنیا میں پھیلا ہے۔ مختلف عرب اخبارات نے اپنے کالموں میں اس کے تعارفی فیچر شائع کئے ہیں

ماہنامہ الرسالہ اسی اسلامی مرکز کا آرگن ہے جو اکتوبر ۱۹۷۶ء سے باقاعدہ شائع ہو رہا ہے۔ اس مدت میں اسلامی مرکز کی اشاعتی مہم کے ذیل میں حسب ذیل کتابیں شائع کی جا چکی ہیں

الاسلام	صفحات	۲۴۰
ظہور اسلام		۲۰۰
مذہب اور جدید چیلنج		۲۲۴
تجدید دین		۴۸
زلزلۂ قیامت		۶۴
عقلیات اسلام		۴۸
دین کیا ہے		۳۲

متعدد دوسری کتابیں بھی انشاء اللہ جلد شائع ہوں گی۔

ماہنامہ الرسالہ کے منتخب مضامین کا عربی ترجمہ قاہرہ اور بیروت سے تقریباً ہر ماہ شائع ہو رہا ہے۔ بیروت سے شائع ہونے والے ایڈیشن کا عمومی نام الاسلام والعصر الحدیث ہے اور قاہرہ سے شائع ہونے والے ایڈیشن کا نام — نحو وعی اسلامی (وحید الدین)

امریکہ کے ڈاکٹر میکائیل ہارٹ (۳۶ سال) ایک عالم فلکیات ہیں اور اسی کے ساتھ مورخ بھی۔ انھوں نے اور ان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ بیوی نے مل کر تاریخ عالم کا جو مطالعہ کیا ہے، اس کا ایک حاصل انھوں نے حال میں ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا ہے جس کا نام ہے: "ایک سو"۔ ۵۷۲ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ساڑھے بارہ ڈالر ہے۔

اس کتاب میں ایک سو ایسے آدمیوں کے حالات درج ہیں جنھوں نے مصنف کے نزدیک تاریخ پر سب سے زیادہ اثرات ڈالے۔ تاریخ میں جو کھربوں انسان پیدا ہوئے، مصنف کے نزدیک ان میں سب سے زیادہ عظیم انسان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے۔ کیوں کہ:

He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels.

"وہ تاریخ کے واحد انسان ہیں جو انتہائی حد تک کامیاب رہے، مذہبی حیثیت سے بھی اور دنیوی سطح پر بھی"۔ مصنف کے نزدیک آپ کی ذات صرف آپ ہی کی حد تک نہ تھی بلکہ ان کی عظمت کا اثر تمام نوع انسانی تک پہنچا۔ انسانی تاریخ پر آپ کی شخصیت کا غالب اثر ابھی تک جاری ہے۔

ایک سو عظیم ترین انسانوں کی اس فہرست میں نمبر ۳ پر مسیح علیہ السلام کا نام ہے، نمبر ۱۶ پر موسیٰ علیہ السلام کا اور نمبر ۵۱ پر خلیفہ ثانی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر غیر مسلموں کے قلم سے اس قسم کے مضامین اور کتابیں کثرت سے شائع ہو چکی ہیں۔ ان کو یکجا کیا جائے اور ان کا انتخاب چھاپا جائے تو اسلام کی اشاعت کے لئے بہت مفید ہوگا۔

پیغمبر اسلام تاریخ کے سب سے بڑے انسان

IDEAS

It's a game anyone can play and, at one time or another, almost everyone does. It's called, "Name the most influential people who ever lived," and if there are no hard rules, there is now at least "The 100" (*572 pages. Hart. $12.50*), a book in which astronomer Michael H. Hart ranks his own choices and invites readers to challenge his selections. According to Hart, who is also an amateur historian, the most influential person among the billions born thus far was Muhammad, the founder of Islam, because "he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels." By comparison, Jesus ranks third (behind Isaac Newton, "the greatest and most influential scientist") because, in Hart's view, he must share the founding of Christianity with Saint Paul.

42. Beethoven

four-stroke internal-combustion engine, gets Hart's nod over industrialist Henry Ford, who doesn't even make the list.

Comparative-history buffs will find plenty to argue about in the places Hart assigns to such empire builders as Umar ibn al Khattab (51), the second Muslim caliph; Asoka (52), a third-century B.C. monarch of India, and Chinese emperor Shih Huang Ti (18), whom Hart ranks ahead of Augustus Caesar (19). In general, Hart gives precedence to seminal ideas over action. Thus Marx (11) the intellectual precedes Lenin (15) the revolutionary in Hart's top 20. Nevertheless, philosophers may well dispute the low value Hart places on more speculative thought: Saint Thomas Aquinas, Immanuel Kant and Benedictus de Spinoza are all absent from his catalog.

HART'S HUNDRED

1. Muhammad
2. Isaac Newton
3. Jesus Christ
4. Buddha
5. Confucius
6. Saint Paul
7. Tsai Lun
8. Johann Gutenberg
9. Christopher Columbus
10. Albert Einstein
11. Karl Marx
12. Louis Pasteur
13. Galileo Galilei
14. Aristotle
15. V.I. Lenin
16. Moses
17. Charles Darwin
18. Shih Huang Ti
19. Augustus Caesar
20. Mao Tse-tung
21. Genghis Khan
22. Euclid
23. Martin Luther
24. Nicolaus Copernicus
25. James Watt
26. Constantine the Great
27. George Washington
28. Michael Faraday
29. James Clerk Maxwell
30. Orville and Wilbur Wright
31. Antoine Laurent Lavoisier
32. Sigmund Freud
33. Alexander the Great
34. Napoleon Bonaparte
35. Adolf Hitler
36. William Shakespeare
37. Adam Smith
38. Thomas Edison
39. Anton van Leeuwenhoek
40. Plato
41. Guglielmo Marconi
42. Ludwig van Beethoven
43. Werner Heisenberg
44. Alexander Graham Bell
45. Alexander Fleming
46. Simon Bolivar
47. Oliver Cromwell
48. John Locke
49. Michelangelo
50. Pope Urban II
51. Umar ibn al Khattab
52. Asoka
53. Saint Augustine
54. Max Planck
55. John Calvin
56. William T.G. Morton
57. William Harvey
58. Antoine Henri Becquerel
59. Gregor Mendel
60. Joseph Lister
61. Nikolaus August Otto
62. Louis Daguerre
63. Joseph Stalin
64. Rene Descartes
65. Julius Caesar
66. Francisco Pizarro
67. Hernando Cortes
68. Queen Isabella I
69. William the Conqueror
70. Thomas Jefferson
71. Jean Jacques Rousseau
72. Edward Jenner
73. Wilhelm Conrad Roentgen
74. Johann Sebastian Bach
75. Lao-tzu
76. Enrico Fermi
77. Thomas Malthus
78. Francis Bacon
79. Voltaire
80. John F. Kennedy
81. Gregory Pincus
82. Sui Wen Ti
83. Mani (Manes)
84. Vasco da Gama
85. Charlemagne
86. Cyrus the Great
87. Leonhard Euler
88. Niccolo Machiavelli
89. Zoroaster
90. Menes
91. Peter the Great
92. Mencius
93. John Dalton
94. Homer
95. Queen Elizabeth I
96. Justinian I
97. Johannes Kepler
98. Pablo Picasso
99. Mahavira
100. Niels Bohr

Newsweek, July 31, 1978

وہ لوگ جو دین کی خاطر دنیا میں بے حیثیت ہو گئے ہوں

عن حارثۃ بن وھاب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ الا اخبرکم بملوک اھل الجنۃ قالوا بلی یا رسول اللہ۔ قال کل ضعیف مستضعف اغبر اشعث

(متفق علیہ)

حارثہ بن وہاب کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا میں تمھیں بتاؤں کہ اہل جنت کے بادشاہ کون لوگ ہیں لوگوں نے کہا ہاں اے خدا کے رسول۔ فرمایا: وہ جو کمزور ہو اور جس کو کمزور سمجھ لیا گیا ہو۔ گرد آلود اور بکھرے ہوئے بال۔

وہ لوگ جو مصلحت پرستی کے بجائے اصول پسندی کو اپنا دین بناتے ہیں۔ جو دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دیتے ہیں۔ جو مفاد کو اہمیت دینے کے بجائے حق کو اہمیت دیتے ہیں۔ جو بندوں کے بجائے خدا کو اپنی توجہات کا مرکز بناتے ہیں، ایسے لوگ اکثر اوقات دنیا میں بے جگہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کا ثبوت نہیں دے پاتے جن کی دنیوی اہمیت ہو اور جو دنیا میں آدمی کو باعزت بنانے والی ہوں۔ ان کی اس حالت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ان کو بے حیثیت اور ناکام سمجھ لیتے ہیں۔ دنیوی نقشوں میں ان کو کہیں عزت کے مقام پر نہیں بٹھایا جاتا۔ مگر جب موجودہ دنیا کو توڑ کر آخرت کا عالم بنایا جائے گا تو اس کے اندر یہی لوگ سب سے زیادہ اونچا مقام حاصل کر لیں گے۔ وہی سب سے زیادہ کامیاب انسان قرار پائیں گے۔ آج کی دنیا کے بے زور کل کی دنیا میں بادشاہوں کی طرح زندگی گزاریں گے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے ڈکٹیٹرانہ نظام میں ایک جمہوری لیڈر ذلت اور گمنامی کے قید خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ مگر جب جمہوری حالات پیدا ہوتے ہیں اور عوامی رائے سے سیاسی مناصب کا فیصلہ ہوتا ہے تو وہی شخص اقتدار کی بلند ترین کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آتا ہے جو کل تک ایک معمولی سپاہی کے آگے بھی بے زور دکھائی دے رہا تھا۔

□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□

ناکافی تیاری کے ساتھ کیا ہوا اقدام ——

مسئلہ کو پہلے سے زیادہ سنگین بنا دیتا ہے

شیر اپنی فطرت کے اعتبار سے انسان خور نہیں ہوتا۔ کسی شیر کو انسان خور بنانے والے اکثر وہ غیر ماہر شکاری ہوتے ہیں جو شیر پر گولی چلاتے ہیں مگر ان کی گولی صحیح نشانہ پر پڑنے کے بجائے اچٹتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ اس قسم کا شیر انسان دشمن ہو جاتا ہے۔ وہ جہاں کہیں انسانی شکل کو دیکھتا ہے، اس پر حملہ کر کے اسے کھا جاتا ہے ——

اسی طرح اگر آپ اپنے حریف پر ایسے اقدامات کریں جو ناکافی تیاری کی وجہ سے فیصلہ کن نہ بن سکیں تو اس قسم کا ہر اقدام آپ کے حریف کو پہلے سے زیادہ مشتعل کر کے آپ کے مسئلہ کو اور زیادہ سنگین بنا دے گا۔

لائق اور صالح آدمی ہر چیز سے زیادہ قیمتی

بخاری نے تاریخ صغیر میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ زید بن اسلم اپنے باپ کے واسطے سے بتاتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے اصحاب سے کہا: تم لوگ اپنی تمنائیں بیان کرو۔ کسی نے کہا: میری تمنا ہے کہ یہ گھر میرے لئے درہم سے بھرا ہوتا تو میں اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا۔ کسی نے کہا: میرے پاس، اس گھر کے برابر سونا ہوتا تو میں اس کو اللہ کے راستہ میں دیتا۔ کسی نے کہا: میری تمنا ہے کہ یہ گھر میرے لئے موتیوں سے بھرا ہوتا اور میں اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا وغیرہ۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لکنی اتمنی ان یکون ملأ ھذا البیت رجالا مثل ابی عبیدۃ بن الجراح و معاذ بن جبل و حذیفۃ بن الیمان فاستعملھم فی طاعۃ اللہ	لیکن میری تمنا تو یہ ہے کہ اس گھر بھر میرے پاس ابوعبیدہ بن الجراح، معاذ بن جبل اور حذیفہ بن یمان جیسے آدمی ہوتے اور ان کو میں اللہ کے کاموں میں استعمال کرتا۔

امیر کے اوصاف

ابن سعد نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کی اتنی خدمت کی کہ ان کے گھر والوں میں سے بھی کسی نے اتنی خدمت نہیں کی۔ وہ مجھ کو اپنے پاس بٹھاتے اور میری عزت کرتے تھے۔ ایک روز میں ان کے گھر میں تنہائی میں ان کے ساتھ تھا۔ اچانک انھوں نے اتنے زور کی آہ بھری کہ مجھے گمان ہوا کہ اسی کے ساتھ ان کی جان نکل جائے گی۔ میں نے پوچھا: کیا آپ نے کسی ڈر کی وجہ سے آہ بھری ہے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ میں نے کہا وہ ڈر کیا ہے۔ فرمایا میرے قریب آجاؤ۔ میں قریب ہو گیا۔ پھر فرمایا: اس کام (خلافت) کے لئے میں کسی کو نہیں پاتا۔ میں نے چھ آدمیوں کا نام لے کر کہا: کیا آپ فلاں اور فلاں سے غافل ہیں۔ میں ایک ایک کا نام لیتا جاتا تھا اور وہ ہر ایک کے بارہ میں کچھ نہ کچھ کہتے جاتے تھے۔ آخر میں فرمایا:

انہ لا یصلح لھذا الامر الا شدید فی غیر عنف، لین فی غیر ضعف، جواد من غیر سرف، ممسک فی غیر بخل (کنز العمال جلد ۳)	اس کام کا اہل صرف وہی شخص ہے جو شدید ہو بغیر اکڑ کے، نرم ہو بغیر کمزوری کے، سخی ہو بغیر فضول خرچی کے، مال روکنے والا ہو بغیر بخل کے۔

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ صفات عمر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور میں جمع نہیں ہوئیں۔

امیر کے ہم نشینوں کو کیسا ہونا چاہئے

طبرانی نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے والد نے مجھ سے کہا: اے میرے بیٹے! میں دیکھتا ہوں کہ امیر المومنین (عمر رضی اللہ عنہ) تم کو اپنی مجلسوں میں بلاتے ہیں، تم کو اپنے قریب بٹھاتے ہیں اور تم سے دیگر اصحاب رسول ﷺ کے ساتھ مشورہ لیتے ہیں۔ تم مجھ سے تین نصیحتیں یاد کر لو:

اتق اللہ لا یجربن علیک کذبۃ، ولا تفشین لہ سرا، ولا تغتابن عندہ احدا	اللہ سے ڈرو، امیر المومنین تمہارے بارے میں کبھی جھوٹ کا تجربہ نہ کریں۔ ان کے بھید کو کبھی ظاہر نہ کرنا،

ان کے پاس کسی کی غیبت نہ کرنا۔

عامر کہتے ہیں۔ میں نے عبداللہ بن عباسؓ سے کہا۔ ان میں سے ہر نصیحت ہزار کے برابر ہے۔ انھوں نے کہا، ہر نصیحت دس ہزار سے بہتر ہے۔

خوشامدی ماتحتوں کا جمع ہونا بری علامت ہے

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ جب کسی صاحب امر کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو سچا وزیر دے دیتا ہے کہ اگر وہ بھول جائے تو وہ اس کو یاد دلائے۔ اور اگر یاد ہو تو اس کی مدد کرے۔ اور جب وہ کسی صاحب امر کے ساتھ اس کے برعکس ارادہ کرتا ہے تو اس کو برا وزیر دے دیتا ہے۔ اگر وہ بھول جائے تو یاد نہ دلائے، اور اگر یاد ہو تو مدد نہ کرے۔ (ابوداؤد)

لفظی عقیدت مندی حقیقی تعلق کا ثبوت نہیں

جبیر بن نفیر کہتے ہیں۔ میرے والد نے بتایا کہ ایک روز ہم مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص کا وہاں سے گزر ہوا۔ صحابی کو دیکھ کر اس نے کہا: کیسی خوش نصیب ہیں یہ دونوں آنکھیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ واللہ ہماری تمنا ہے کہ جو کچھ آپ نے دیکھا ہم بھی اسے دیکھتے اور جن مواقع میں آپ شریک ہوئے ہم بھی ان میں شریک ہوتے۔ مجھے اس آدمی کی بات پسند آئی۔ میں نے سوچا کہ اس نے جو کچھ کہا خیر کہا۔ مگر مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا: تم میں سے کسی کو ان مواقع میں حاضری کی تمنا نہ کرنی چاہئے جن سے اللہ نے اس کو بری رکھا ہے۔ کیا معلوم وہ اس موقع پر ہوتا تو کیا کرتا۔ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت سے ایسے لوگ آئے جن کو اللہ نے جہنم میں دھکیل دیا۔ انھوں نے نہ آپ کا کہا مانا اور نہ آپ کی تصدیق کی۔

کوفہ کے ایک آدمی نے حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے کہا: اے ابوعبداللہ کیا آپ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور ان کی صحبت میں رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا "ہاں اے میرے بھتیجے"۔ کوفی نے کہا آپ لوگ کیا کرتے تھے۔ حضرت حذیفہ نے کہا "خدا کی قسم ہم مشقتیں برداشت کرتے تھے"۔ کوفی نے کہا: خدا کی قسم اگر ہم آپ کو پالیتے تو آپ کو زمین پر چلنے نہ دیتے۔ اپنی گردنوں پر آپ کو اٹھائے پھرتے۔ حضرت حذیفہ کہا:

انت کنت تفعل ذلک (مسلم) تم ایسا کرتے!

وقتی جوش دکھانے کا نام اسلام نہیں

غزوۂ احد (۳ ھ) میں ایک مسلمان شریک ہوا اور لڑکر مارا گیا۔ اس کی ماں کو معلوم ہوا تو اس نے کہا واشہیداہ (ہائے شہید)۔ آپ نے سنا تو فرمایا:

مہ، ما یدریک انہ شہید۔ ولعلہ کان یتکلم فیما لا یعنیہ ویبخل بما لا ینقصہ (ترمذی)

ٹھیرو۔ کیا معلوم کہ وہ شہید ہوا۔ شاید وہ بے فائدہ باتیں کرتا رہا ہو اور اس چیز کو دینے میں بخیل رہا ہو جس کو دینے میں اس کا کوئی نقصان نہ تھا۔

اللہ کے ساتھ ادنیٰ شرکت گوارا نہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص نے کہا :

ماشاء اللہ وماشئت	خدا جو چاہے اور آپ جو چاہیں

رسول اللہ نے اس قول کو سخت ناپسند کیا اور فرمایا :

اجعلتنی للہ ندا ،	کیا تم نے مجھ کو اللہ کا برابر بنا دیا۔
بل ماشاء اللہ وحدہ	بلکہ یوں کہو : تنہا اللہ جو چاہے

آخر وقت تک اللہ پر یقین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے لئے مکہ سے نکلے تو پہلے تین دن تک غار ثور میں ٹھہرے۔ قریش کے لوگ آپ کو تلاش کرتے ہوئے اس غار تک پہنچ گئے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا : اے خدا کے رسول ! دشمن اتنے قریب آچکا ہے کہ ان میں سے کوئی اگر اپنے پیروں کی طرف نظر ڈالے تو وہ ہم کو اپنے قدموں کے نیچے دیکھ لے گا " آپ نے فرمایا :

یا ابابکر ماظنك باثنين اللہ ثالثہما	اے ابوبکر ! تمہارا کیا خیال ان دو کے بارے میں ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہو۔
(البدایہ والنہایہ جلد ۳)	

دنیوی مشکلات پر خدا کی یاد کا سہارا لینا

علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ فاطمہ رض کا یہ حال تھا کہ گھر کا سب کام انھیں کو کرنا پڑتا۔ چکی پیسنے کی وجہ سے ہاتھ میں چھالے پڑ جاتے۔ پانی باہر سے مشک میں بھر کر لانا ہوتا جس کی وجہ سے گردن میں نشان پڑ گیا تھا۔ جھاڑو دینے میں کپڑے میلے ہو جاتے۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ خادم آئے۔ میں نے فاطمہ سے کہا : تم اپنے والد کے پاس جاؤ اور اپنے لئے ایک خادم مانگ لو۔ فاطمہ رض گئیں۔ مگر وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ مل نہ سکیں اور واپس آگئیں۔ اگلے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر آئے اور پوچھا کہ کیا کام تھا۔ فاطمہ رض چپ رہیں۔ میں نے قصہ بتایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خادم نہیں دیا۔ بلکہ فرمایا :

اتقی اللہ یا فاطمۃ وادّی فریضۃ ربك واعمل عمل اھلك واذا اخذت مضجعك فسبحی ثلاثا وثلاثین واحمدی ثلاثا وثلاثین وکبری اربعا وثلاثین فذلك مائۃ ۔ ھی خیر لك من خادم (الترغیب والترہیب جلد ۳)	اے فاطمہ اللہ سے ڈرو۔ اپنے رب کے فرائض ادا کرو۔ اپنے گھر والوں کے کام کرو۔ اور جب بستر پر جاؤ تو ۳۳ بار اللہ کی تسبیح کرو۔ ۳۳ بار اللہ کی حمد کرو۔ ۳۴ بار اللہ کی تکبیر کرو۔ یہ پورا سو ہے یہ تمھارے لئے خادم سے بہتر ہے۔

انتہائی بغض کے باوجود مکمل انصاف

بیہقی نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ہر سال وصولی کے لئے خیبر جاتے تھے۔ وہ خیبر کے کھجوروں کا تخمینہ کرتے اور اپنے تخمینہ کے مطابق آدھا اہل خیبر پر مقرر کر دیتے۔ خیبر کے یہودیوں نے شکایت کی کہ وہ پیداوار سے زیادہ تخمینہ لگاتے ہیں۔ انھوں نے عبداللہ بن رواحہؓ کو رشوت کا لالچ بھی دیا۔ عبداللہ بن رواحہؓ نے کہا: اے اللہ کے دشمنو! تم لوگ مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو۔ خدا کی قسم میں تمھارے پاس ایک ایسی ذات کی طرف سے آیا ہوں جو مجھ کو ساری دنیا میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اور تم مجھے ایسا مبغوض ہو کہ تمھاری تعداد کے برابر سور اور بندر بھی اتنے مبغوض نہیں:

ولا یحملنی بغضی ایاکم وحبی ایاہ علی ان لا اعدل علیکم — مگر ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم سے بغض اور رسولؐ اللہ سے محبت کی وجہ سے میں تمھارے ساتھ انصاف نہ کروں۔

یہود نے کہا: اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں —

آخرت کا نام آتے ہی وہ اپنا دعویٰ بھول گئے

ابن ابی شیبہ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ انصار میں سے دو آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک جھگڑا لے کر آئے۔ یہ ایک پرانی میراث کا معاملہ تھا جس کے لئے دونوں میں سے کسی کے پاس گواہ موجود نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ میرے پاس اپنا جھگڑا لے کر آتے ہو اور میں اپنی رائے سے اس میں فیصلہ کرتا ہوں جس کے بارے میں وحی نہیں اتری ہے۔ اگر میں کسی کی حجت کی بنا پر اس کی موافقت میں ایسا فیصلہ دے دوں جس میں میں نے اس کے بھائی کا حق کاٹ کر اس کو دے دیا ہو تو وہ اس کو نہ لے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں میں نے اس کو آگ کا ایک ٹکڑا دیا جس کو لے کر وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ وہ ٹکڑا اس کی گردن میں چپکا ہوا ہوگا۔ یہ سن کر دونوں انصاری رو پڑے۔ ہر ایک نے کہا:

یا رسول اللہ حقی لہ — اے خدا کے رسول! میں نے اپنا حق اس کو دے دیا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم نے ایسا کیا ہے تو اب تم دونوں جاؤ اور حق و انصاف کا ارادہ کرو۔ میراث کے دو حصے بناؤ اور اس کے بعد قرعہ ڈالو۔ اس طرح تم دونوں میں سے ہر ایک کے حصہ میں جو آئے اس کا ساتھی اس کے لئے اس کو حلال کر دے۔ (کنز العمال جلد ۳)

اللہ کے ڈر کی وجہ سے کوڑا ہاتھ سے گر پڑا

ابومسعود بدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ ایک روز میں کسی بات پر اپنے غلام سے خفا ہو گیا اور اس کو کوڑے سے مارنے لگا۔ اتنے میں پیچھے سے آواز سنائی دی: "اے ابومسعود جان لو" مگر میں غصہ کی حالت میں تھا۔ آواز کو پہچان نہ سکا۔ آواز دینے والا جب میرے قریب آگیا تو میں نے دیکھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ فرما رہے تھے:

اعلم ابا مسعود ان اللہ اقدر علیک منک علی ھذا الغلام (مسلم) — ابومسعود! جان لو، تم کو جتنا قابو اس شخص پر ہے، اس سے زیادہ قابو اللہ کو تمھارے اوپر ہے۔

یہ سن کر کوڑا میرے ہاتھ سے گر گیا۔ میں نے کہا "اب کبھی میں کسی غلام کو نہ ماروں گا، میں اس غلام کو اللہ کی خوشی کے لئے آزاد کرتا ہوں"، آپ نے فرمایا:

اَمَا اِنَّه لو لم تفعل لمَسَّتْكَ النار (مسلم) اگر تم ایسا نہ کرتے تو آگ کی لپٹ تم کو چھو دیتی۔

خدا کی پکڑ سے ڈرنا خواہ کم زور کا معاملہ کیوں نہ ہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اہلیہ ام سلمہؓ کے مکان پر تھے۔ آپ کو کسی کام کے لئے خادمہ کی ضرورت پیش آئی۔ آپ نے اس کو آواز دے کر بلایا۔ خادمہ نے آنے میں دیر کی۔ آپ کے چہرے پر غصہ کے آثار ظاہر ہو گئے۔ ام سلمہؓ یہ دیکھ کر اٹھیں۔ پردہ کے پاس جا کر دیکھا تو خادمہ باہر بکری کے بچوں سے کھیل رہی تھی۔ ام سلمہ نے دوبارہ اس کو آواز دے کر بلایا۔ وہ آئی۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی، آپ نے خادمہ سے کہا:

لولا خشيةُ القودِ لاوجعتُكِ بهذا السواك (الادب المفرد) قیامت کے دن مجھے بدلہ کا ڈر نہ ہوتا تو میں تجھ کو اس مسواک سے مارتا۔

اللہ سے مانگنے کی سب سے بڑی چیز مغفرت ہے

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ انصار کے پاس سینچائی کے اونٹوں کی تنگی ہوئی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تاکہ آپ ان کے لئے اونٹوں کا انتظام کر دیں یا خوب بہنے والی نہر کھدوا دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ کر فرمایا: انصار کے لئے مرحبا، انصار کے لئے مرحبا، انصار کے لئے مرحبا۔ آج تم مجھ سے جس چیز کا بھی سوال کرو گے میں تمھیں ضرور دوں گا اور تمھارے لئے اللہ سے جو چیز بھی مانگوں گا وہ ضرور عطا فرمائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کلمات سن کر انصار کا دل پھر گیا۔ انھوں نے سوچا کہ مانگنے کی زیادہ بڑی چیز تو آخرت ہے پھر ایسے قیمتی موقع پر آپ سے دنیا کیوں مانگیں۔ انھوں نے ایک دوسرے سے کہا:

اغتنموها وسلوه المغفرة اس موقع کو غنیمت جانو اور آپ سے مغفرت کا سوال کرو

انھوں نے کہا: اے خدا کے رسول ہمارے لئے مغفرت کی دعا فرمائیں۔ آپ نے فوراً کہا: اے اللہ! انصار کی مغفرت فرما، ان کے لڑکوں کی مغفرت فرما، ان کی عورتوں کی مغفرت فرما (احمد)

غصہ نہ کر، غصہ نہ کر، غصہ نہ کر

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کہا: مجھ کو نصیحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا: لا تغضب (غصہ مت کر) اس نے دوبارہ کہا: مجھ کو نصیحت کیجئے۔ آپ نے پھر فرمایا: لا تغضب (غصہ مت کر) وہ بار بار اپنا سوال دہراتا رہا اور آپ بار بار یہی کہتے رہے: غصہ مت کر (بخاری)

دنیا سے بھرے ہوئے، آخرت سے خالی

قال ابو الدرداء: مالی اراکم شباعا من الطعام جیاعا من العلم (جامع بیان العلم، جزء ثانی، صفحہ ۲۰۲) حضرت ابو الدرداء نے کہا: یہ کیا ہے کہ میں تم کو کھانے سے شکم سیر دیکھتا ہوں اور علم دین سے تم بھوکے پڑے ہوئے ہو

وہ خدا کو دیکھ کر ہنسیں گے ، خدا ان کو دیکھ کر ہنسے گا

طبرانی نے حصین بن وحوح اور طلحہ بن مسکین سے روایت کیا ہے۔ طلحہ بن براء رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت ہونے کے لئے آئے۔ اس وقت وہ نوجوان تھے۔ انھوں نے کہا: یا رسول اللہ! جو کچھ آپ کو محبوب ہو مجھے حکم دیجئے، میں کسی امر میں نافرمانی نہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا: "اگرچہ میں تم کو حکم دوں کہ تم اپنے والدین سے قطع تعلق کرلو!" راوی کہتے ہیں کہ ان کے ایک ماں تھی اور وہ ان کے ساتھ بہت زیادہ سلوک کرتے تھے۔ طلحہ بن براء رضی آپ کے حکم کی تعمیل کے لئے تیار ہو گئے تو آپ نے فرمایا: "اے طلحہ! ہمارے دین میں قطع رحم نہیں۔ مگر میں نے چاہا کہ تمھارے دین میں کوئی شک نہ رہ جائے۔"

طلحہ بن براء رضی اسلام لائے اور ان کا اسلام بہت اچھا رہا۔ وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لئے آئے۔ آپ نے ان کو اس حال میں پایا کہ ان پر بے ہوشی طاری تھی۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا: جہاں تک میرا خیال ہے، طلحہ اپنی اسی رات میں اٹھا لئے جائیں گے۔ اس کے بعد آپ یہ کہہ کر واپس آگئے کہ جب یہ ہوش میں آئیں تو مجھ کو بلا لینا۔ ان کو آدھی رات کو ہوش آیا۔ مگر انھوں نے اطلاع کرانے کو منع کر دیا۔ انھوں نے کہا: ایسا نہ ہو کہ رات کے اندھیرے میں کوئی موذی جانور آپ کو کاٹ لے یا یہودی دشمنوں سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچے۔ رات ہی کو حضرت طلحہ کا انتقال ہو گیا۔ صبح کی نماز کے بعد آپ کو ان کی وفات کی خبر دی گئی تو آپ نے فرمایا:

اللھم القه یضحك الیك وانت تضحك الیه — خدایا! تو اس سے اس طرح ملاقات کر کہ وہ تجھ کو دیکھ کر ہنسے اور تو اس کو دیکھ کر ہنسے۔

اصل اعتبار اندر کے انسان کا

ابن عساکر نے زہری سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عبد اللہ بن حذافہ رضی کے بارے میں شکایت کی گئی کہ وہ مزاح اور تمسخر کی باتیں کرتے ہیں (انه صاحب مزاح وباطل) آپ نے فرمایا:

اتركوه فان له بطانة یحب الله ورسوله — ان کو چھوڑ دو۔ ان کا جو باطن ہے وہ اللہ اور رسول کو دوست رکھتا ہے۔

مسئلہ کھڑا کئے بغیر ساتھ دینا

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے غزوۂ روم کا ارادہ کیا تو صحابہ کرام کو جمع کر کے تقریر فرمائی۔ آپ نے کہا: میری رائے ہے کہ مسلمان ملک شام کی طرف رومیوں سے جہاد کے لئے نکلیں۔ اللہ ضرور مسلمانوں کی مدد فرمائے گا اور اپنے کلمہ کو بلند کرے گا۔ آپ کی تقریر کے بعد مشورہ ہوا۔ بعض مخالف رائیں بھی آئیں۔ تاہم کچھ دیر کی گفتگو کے بعد سب نے بالاتفاق کہا:

ما رأیت من رأی فامضه فانا لا نخالفك ولا نتهمك (ابن عساکر) — آپ کی جو رائے ہو اس کو کر گزریئے۔ ہم نہ آپ کی مخالفت کریں گے اور نہ آپ پر الزام رکھیں گے۔

ایمان یہ ہے کہ جب کوئی غیر معمولی بات پیش آئے تو آدمی کے اندر نفسانیت نہ جاگے بلکہ خدا پرستی جاگے

آدمی کی زندگی میں مختلف قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ کبھی آرام کبھی تکلیف، کبھی تعریف کبھی تنقید۔ کبھی خوشی کبھی غم ——— یہ اتار چڑھاؤ سب امتحان کے پرچے ہیں۔ کامیابی یہ ہے کہ ان واقعات سے آدمی کے اندر نفسانیت نہ جاگے بلکہ خدا پرستی جاگے۔ خوشی اور آرام ہو تو اس کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے۔ کسی سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس کے اندر عجز اور عبدیت کی روح پیدا ہو۔

۱۹۷۵ میں شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے کابینی رفقاء مسٹر تاج الدین احمد، مسٹر قمر الزماں، مسٹر نذر الاسلام اور دوسرے بہت سے لوگ قتل کر دیئے گئے تھے۔ اس واقعہ سے کسی قدر پہلے اپریل ۱۹۷۵ میں بنگالی صحافی مسٹر سکھ رنجن داس گپتا ڈھاکہ گئے تھے اور بنگلہ دیش کے لیڈروں سے ملے تھے۔ انھوں نے بنگلہ دیش کے خونیں واقعات پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے:

The Midnight Massacre in Dacca

مسٹر گپتا کے بیان کے مطابق اپریل ۱۹۷۵ میں جب وہ دوسرے ہندوستانی صحافیوں کے ساتھ ڈھاکہ پہنچے تو وہاں مجیب حکومت کو ختم کرنے کی افواہیں گرم تھیں۔ مسٹر قمر الزماں سے جب وہ ان کی رہائش گاہ پر ملے تو موصوف کے الفاظ میں:

The first thing he asked for was the tin of Zarda

پہلی چیز جو انھوں نے مجھ سے مانگی وہ زردہ تھا۔ میں نے بتایا کہ میں ان کے لئے زردہ کا ایک ڈبہ لایا ہوں۔

مسٹر تاج الدین سے جب وہ ان کے مکان پر ملے تو انھوں نے مسٹر گپتا سے فرمائش کی کہ وہ ایشور چند ودیا ساگر کی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہ کتابیں ان کو فراہم کر دی گئیں۔ مسٹر خوندکر مشتاق جو اس وقت ٹریڈ اور کامرس کے منسٹر تھے، انھوں نے شکایت کی کہ کلکتہ کے اخبارات نے اپنے صفحات میں ان کو اتنی جگہ نہیں دی جتنی انھوں نے مسٹر تاج الدین اور مسٹر نذر الاسلام کو دی۔ مسٹر داس گپتا لکھتے ہیں میں سمجھ نہ سکا کہ وہ شیخ مجیب کے خلاف اپنی شکایت کو میرے جیسے ایک غیر ملکی صحافی سے کیوں بیان کر رہے ہیں

"۲۵ مارچ ۱۹۷۱ کو پاکستانی فوج نے بنگلہ دیش میں مار دھاڑ کیوں شروع کی" مسٹر تاج الدین نے بتایا کہ الیکشن کے بعد ہم نے خفیہ منصوبہ بنایا کہ بنگلہ دیش کی مکمل آزادی کا اعلان کر دیں۔ یہ منصوبہ خوندکر مشتاق کے ذریعہ پاکستان کے لیڈروں تک قبل از وقت پہنچ گیا اور انھوں نے فوجی کارروائی شروع کر دی"۔

مذہب روس میں واپس آرہا ہے

اشتراکی فلسفہ تاریخ کا سب سے زیادہ جارح الحادی فلسفہ تھا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۱۷ میں جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو انقلابی حکمرانوں نے پوری طاقت سے مذہب کو کچلنا شروع کر دیا۔ مگر اب وہاں بھی حالات اسی طرح بدلے ہوئے نظر آتے ہیں جس طرح ترکی میں بدلے۔ آج کل روس کے بارے میں کثرت سے ایسی رپورٹیں شائع ہو رہی ہیں جن کا عنوان اس قسم کا ہوتا ہے:

God returns to the USSR

خدا روس میں واپس آرہا ہے۔

لینن گراڈ میں مذہبی تاریخ کا ایک میوزیم ہے۔ اس میوزیم میں آپ داخل ہوں تو سب سے پہلے آپ کو دو الماریاں نظر آئیں گی جن میں سائنس اور تاریخ کی قدیم کتابیں بند ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کا مطالعہ کسی وقت کیتھولک چرچ نے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اس کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اگر مذہب کا اقتدار باقی رہتا تو دنیا آج علمی اعتبار سے کس قدر پیچھے ہوتی۔ اسی لئے اس میوزیم کو "اینٹی گاڈ میوزیم" کہا جاتا ہے۔ اگرچہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ اینٹی کیتھولک ہے نہ کہ حقیقۃً اینٹی گاڈ۔

روس میں ۱۹۱۷ کے اشتراکی انقلاب کے بعد اس طرح کی بے شمار کوششوں کے ذریعہ مذہب کو آہنی قید میں بند کر دیا گیا۔ تاہم واقعات بتا رہے ہیں کہ ایک منظم اور طاقتور سلطنت کی ساری مخالفانہ تدبیروں کے باوجود مذہب قید خانہ سے باہر آگیا ہے اور آزادانہ طور پر "بے خدا روس" کی سڑکوں پر چل پھر رہا ہے۔

روس کے چرچ اور عبادت خانے دوبارہ بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں آنے والے صرف بوڑھے لوگ نہیں ہیں جو قدیم روایتی ماحول میں پلے تھے۔ بلکہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی کثیر تعداد میں عبادت خانوں میں جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ حتیٰ کہ مذہب کے عنوان پر فلمیں بھی بن رہی ہیں۔ مثلاً ایک فلم ہے جس کا نام ہے "نوح کی کشتی"۔ ایک اور فلم میں دیگر مذہبی معتقدات کے ساتھ مرے ہوئے انسان کو دوبارہ اگلی دنیا میں زندہ ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

جدید روس میں مذہب مختلف انداز سے زندہ ہو رہا ہے۔ مثلاً ایک روسی دوسرے روسی سے ملاقات کے بعد کہے گا Vootis Daroviya اس کا مطلب روسی زبان میں ہوتا ہے تمہاری صحت میں برکت ہو۔ اسی طرح وہ مواقع جب کہ اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے ہم کو کہنا پڑتا ہے واللہ اعلم۔ ایسے موقع پر روسی کہتا ہے Tolka Bog Znayete (خدا ہی کو معلوم ہے)۔ خدا کا لفظ روسیوں کی عام بول چال میں کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے۔ مسلمان عام طور پر اللہ کا لفظ بولتے ہیں۔ یہودی، عیسائی اور مسلمان کھلے طور پر عبادت کرتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ ٹالسٹائی، مہاتما گاندھی اور دوسرے مذہبی مصنفین کی کتابیں اور ان کے ترجمے کثرت سے روس میں چھپ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ "یوگا" بھی روسیوں میں مقبول ہو رہا ہے۔

روس میں خدا کی واپسی ایک عام آدمی کے لئے صرف ایک معنی رکھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ جس طرح فطرت کے دوسرے تقاضوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح خدا

آدمی کسی بات کو ماننا نہ چاہے تو اس کو رد کرنے کے لئے وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ الفاظ پالیتا ہے

کی طلب کو کبھی انسان کی فطرت سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ ایک عام مذہبی آدمی کے لئے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ اس کے نزدیک اشتراکی انقلاب کے ساٹھ سال بعد روسی معاشرہ میں مذہب کے دوبارہ زندہ ہونے کی دوسری توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔

مگر انسان کے پاس لفظوں کی کمی نہیں۔ جو لوگ خدا کا اقرار کرنا نہیں چاہتے۔ انھوں نے اس توجیہہ کو رد کرنے کے لئے نہایت خوبصورت الفاظ تلاش کر لئے۔ انھوں نے کہا:

The revival of interest in religion in the Soviet Union is a form of legalized dissidence.

یعنی سوویت روس میں مذہب کے رجحان کا دوبارہ ابھرنا مذہبی سچائی کی تصدیق سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ یہ عوام کے لئے صرف حکومت سے اختلاف کی ایک جائز صورت ہے —— ایک واقعہ جس میں اقرار خدا کا سامان تھا، اس سے انکار خدا کی دلیل نکال لی گئی۔

روزہ: آخرت میں نقصان دینے والی چیزوں سے بچنے کا سبق

آل انڈیا ریڈیو نے ۱۹ اگست ۱۹۷۸ کی شام کو ساڑھے نو بجے ایک پروگرام رکھا تھا۔ عنوان تھا "روزہ کیا ہے"۔ یہ آدھ گھنٹہ کی ایک ریڈیائی بات چیت تھی جس میں تین مذاہب کے نمائندے شریک تھے۔ اسلام کی نمائندگی راقم الحروف نے کی۔ دوسرے دو صاحبان یہ تھے: پنڈت سچیدانند شاستری اور آرک بشپ ناصر۔ ہر ایک نے اپنے مذہب کی روشنی میں روزہ کی حقیقت بیان کی۔

میں نے جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ روزہ اس بات کا سبق ہے کہ دنیا میں آدمی کو کچھ چیزوں سے بچ کر زندگی گزارنی ہے تاکہ اس کی آخرت کامیاب ہو۔ دنیا میں ایک تاجر اپنے کو فضول خرچی سے بچاتا ہے، ایک طالب علم اپنے کو ضیاع وقت سے بچاتا ہے، ایک مزدور اپنے کو کاہلی سے بچاتا ہے۔ اس طرح بچ بچاؤ کی زندگی گزارنے ہی کا نام دنیا کی کامیابی ہے۔ کاہلی، فضول خرچی، عیاشی، ضیاع وقت سے آدمی اپنے کو نہ بچائے تو وہ کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ آخرت کا ہے۔ آدمی کو اپنی آخرت کو کامیاب بنانے کے لئے ایک متقیانہ زندگی گزارنی ہے۔ کچھ چیزوں سے اپنے کو بچا کر رکھنا ہے۔ آخرت کو برباد کرنے والی چیزوں سے بچ کر اور ان کو چھوڑ کر زندگی گزارنے کا سبق دینے کے لئے روزہ فرض کیا گیا ہے۔ جو شخص دن بھر روزہ رکھتا ہے، اس کو شام کے وقت کھانے کی لذت ملتی ہے۔ اسی طرح جو شخص دنیا میں خدا کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچے گا وہی آخرت میں زندگی کی لذتوں کو پائے گا۔

ہماری زندگی کے دو رخ ہیں

ایک مرتبہ میں ایک بڑے سرکاری افسر سے ملا۔ شام کا وقت تھا۔ ہم لوگ ان کے شان دار بنگلہ کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ "مولانا صاحب" اچانک انھوں نے کہا "ہم لوگوں کی زندگی بھی کیسی بری زندگی ہے۔ اب دیکھئے۔ کل صبح کو سورج نکلنے سے پہلے مجھے ہوائی اڈہ پر جانا ہے۔ فلاں ملک کی اعلیٰ سیاسی شخصیت کا ہوائی جہاز ہماری زمین پر اترے گا۔ مجھ کو نہ صرف اپنی نیند کو چھوڑ کر ہوائی اڈہ پر پہنچنا ہے بلکہ دل میں نفرت کے باوجود مسکرا کر ان کا استقبال بھی کرنا ہے"

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے لوگوں کی زندگیاں کس طرح دو رخی ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک پہلو کار اور کوٹھی اور عزت اور اقتدار ہے۔ مگر اس کا ایک اور پہلو ہے جو اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ چیزیں انھیں کن باتوں کے نتیجہ میں ملتی ہیں۔ اگر آپ کسی بڑے آدمی کے اندر جھانک کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس چمک دمک کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو سطحیت پر راضی کیا ہے، خوشامد، موقع پرستی، مصلحت پسندی، زمانہ سازی، بے ضمیری ظاہرداری، دوغلی، یہی وہ چیزیں ہیں جن کی قیمت ان کو ایک شان دار زندگی کی صورت میں ملتی ہے۔ ہر بڑے آدمی کی زندگی کے دو رخ ہیں۔ ایک شان دار، دوسرا تاریک اور بے روح۔ وہ اپنے "انسانی وجود" کو قتل کرنے پر راضی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ "حیوانی وجود" کی سطح پر اس کو جاہ و حشم کی ایک زندگی حاصل ہو سکے۔

عام انسان کی زندگی کے بھی اسی طرح دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک مزدور مئی جون کی گرمی میں کھلی دھوپ میں کام کر رہا ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینہ میں شرابور ہے۔ مگر اپنا کام کئے جا رہا ہے۔ وہ کیوں اپنے آپ کو مشقت کی آگ میں جلاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس "دھوپ" کا ایک "سایہ" بھی ہے۔ اس کی مزدوری کا ایک پہلو گرمی اور لو میں جھلسنا ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ شام کو چند روپے حاصل کرے گا جس سے اس کے بیوی بچوں کی ضرورتیں پوری ہوں گی اور وہ رات کو اطمینان کی نیند سوئے گا۔

کسی عمل کے دو رخ ہونے کا یہ وہ پہلو ہے جو صرف دنیوی اعتبار سے پایا جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا اور آخرت کے اعتبار سے بھی عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ہر عمل جو آدمی اس دنیا میں کرتا ہے، اس کا ایک رخ وہ ہے جو دنیا میں نظر آتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو آخرت میں مترتب ہو رہا ہے۔ آج ہم اپنے عمل کے دنیوی پہلو کو بھگتتے ہیں۔ کل ہم اپنے عمل کے اخروی پہلو کو بھگتیں گے۔ آج ہم زندگی کے ایک سمت میں کھڑے ہیں۔ اس لئے ہم کو اعمال کا ایک ہی رخ دکھائی دیتا ہے۔ قیامت ہم کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دے گی جہاں دونوں رخ ہمارے سامنے آجائیں گے۔ جس طرح دیوار کے اوپر کھڑا ہوا آدمی دیوار کے دونوں طرف دیکھتا ہے اسی طرح قیامت کے عالم میں پہنچ کر آدمی حقیقت کے دونوں رخ کو دیکھنے لگے گا۔ ایک طرف پچھلی زندگی کی پوری تاریخ بچپن سے موت تک لمبی فلم کی طرح اس کے سامنے کھلی ہوئی ہوگی۔ دوسری طرف اس کی اس بنائی ہوئی تاریخ کے اخروی نتائج بالکل برہنہ ہو کر آنکھوں کے سامنے کھڑے ہوں گے:

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ (انفطار) اس دن آدمی جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے چھوڑا۔

فرد کو ایمانی غذا پہنچانا

دینی تحریک کا اصل مقصد

ایک دین دار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بزرگ لکھتے ہیں :

"تجدید دین پر آپ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ایک جرأت مند اور حقیقت سے لبریز قدم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی ٹھوس تعلیمات کو وزن دار پتھروں کے بوجھ کے نیچے دبا دیا گیا ہے۔ اس کو دوبارہ آشکارا کرنے کے لئے آپ نے جو "پہلا قدم" تجویز کیا ہے، وہ اگرچہ درست ہے۔ مگر یہ بڑا صبر آزما قدم ہے۔ اس راہ سے اسلام کو سربلند کرنے کے لئے صدی سے کم مدت درکار نہ ہوگی۔ بہرحال آپ نے "تجدید دین" میں صحیح نشان دہی فرما کر اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کوشش کو قبول فرمائے" (کشمیر ۱۴ جون ۱۹۷۸)

تجدید دین کو موجودہ زمانہ میں تجدید سیاست کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ اس لئے جب بھی تجدید کی بات کی جائے فوراً سیاسی غلبہ کی باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ حالاں کہ لفظی طور پر تجدید دین کا مطلب صرف دین کو نیا کرنا ہے۔ اس سے مراد دین کو فکری طور پر نکھارنا ہے، نہ کہ اس کو سیاسی طور پر غالب کر دینا۔ اسی غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلام جو دراصل خدا کی خاموش دنیا میں بندہ کے داخلہ کا دروازہ تھا، سیاسی شور وغل کا پنڈال بن کر رہ گیا۔

جس طرح دنیا میں طرح طرح کی مادی غذائیں پھیلی ہوئی ہیں اور ان میں حصہ دار بننے والا دنیوی حیثیت سے کامیاب سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات میں ایک اور دسترخوان کھولا ہے۔ یہ اخروی غذاؤں کا دسترخوان ہے جو نفسیاتی سطح پر آدمی کو ملتا ہے۔ قرآن میں اس کو خشوع وتضرع اور اخبات وانابت وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اسلام کے نزدیک آدمی کی اصل کامیابی یہ ہے کہ آدمی اس دوسرے دسترخوان سے اپنی غذا حاصل کرنے لگے۔ انسانی تعبیرات کے پردہ میں ڈھکا ہوا دین آدمی کے لئے اس خدائی دسترخوان سے غذا لینے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ وہ دین انابت کو دین سیاست بنا کر رکھ دیتا ہے۔ اس سے ضرورت ہوتی ہے کہ اس قسم کے تمام پردوں کو ہٹا دیا جائے تاکہ اللہ کا جو بندہ اللہ سے قریب ہونا چاہے وہ اس کی قربت سے محروم نہ رہے۔

◆ ◆ ◆

اعتراف

غالباً ۱۹۳۰ کا واقعہ ہے۔ جارج اسلامیہ ہائی اسکول گورکھ پور (جو بعد کو اسلامیہ کالج بنا) کے ایک استاد مسٹر شرف الدین تھے۔ بہت ذہین اور لائق استاد تھے۔ انگریز انسپکٹر ایک روز ان کی کلاس کا معائنہ کرنے کے لئے آیا۔ اس وقت وہ غالباً نویں کلاس کو انگریزی زبان پڑھا رہے تھے۔ انگریز انسپکٹر ان کی کلاس میں بیٹھ گیا اور ان کے درس کو سنتا رہا۔ بعد کو اس نے انسپکشن رپورٹ میں لکھا :

I did not inspect the class of Mr. Sharfuddin, actually I attended it. He is so learned a teacher.

میں نے مسٹر شرف الدین کی کلاس کا معائنہ نہیں کیا۔ بلکہ حقیقۃً ان کے کلاس میں شرکت کی۔ وہ واقعی ایک لائق استاد ہیں۔

ڈاکٹر محمود قادری (پیدائش ۱۹۱۴)
قاسم جان اسٹریٹ ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

گروہی عصبیت کہاں تک لے جاتی ہے

بنومضر اور بنو ربیعہ عرب کے دو حریف قبیلے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نسلاً قبیلہ مضر سے تعلق رکھتے تھے۔ مسیلمہ، جس نے آپ کے مقابلہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، قبیلہ ربیعہ سے تعلق رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تو قبیلہ ربیعہ کا سردار طلحۃ النمری مسیلمہ کے پاس آیا۔ گفتگو کے بعد طلحہ نے مسیلمہ سے کہا :
"میں گواہی دیتا ہوں کہ تو جھوٹا ہے اور محمد سچے ہیں۔ مگر ربیعہ کا کذاب مضر کے صادق سے مجھ کو زیادہ محبوب ہے"
یہ کہہ کر مسیلمہ کے ساتھیوں میں شریک ہو گیا۔ (طبری، جلد ۳، صفحہ ۲۴۶)

مسیلمہ نے قرآن کے جواب میں جو کلام بنایا تھا، اس کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآن کی عظمت کو خوب جانتا تھا۔ تاہم گروہی عصبیت کی بنا پر کچھ مسخرہ پن کے جملے وضع کر کے لوگوں کو سنایا کرتا تھا۔ مثلاً اس کا ایک کلام یہ تھا :

یا ضفدع نقی نقی، لا الشارب تمنعین ولا الماء تکدرین، لنا نصف الارض ولقریش نصف الارض، ولکن قریشا قوم یعتدون (طبری جلد ۳، صفحہ ۲۵۳)

اے مینڈک ٹرٹر کیے، تو نہ پانی پینے والوں کو روکتی ہے اور نہ پانی کو گدلا کرتی ہے۔ زمین عرب آدھی ہم ربیعہ والوں کی اور آدھی قریش کی۔ مگر قریش تو زیادتی سے کام لے رہے ہیں۔

چیخنا کام نہ آیا

جہاز چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہو چکا تھا۔
اس کے ٹوٹے ہوئے تختے سمندر کی موجوں میں ہچکولے کھا رہے تھے
سینکڑوں مسافر اپنی منزل کے بجائے سمندر کی تہ میں پہنچ چکے تھے۔
اور جہاز کا کپتان ایک تختہ کا سہارا لیے ہوئے چیخ رہا تھا ———

کتنی بے رحم ہے وہ قدرت جس نے سمندر میں چٹان ابھار دی
کیسی ظالم ہے وہ حکومت جس نے یہاں روشنی کا مینار تعمیر نہیں کیا
کتنے مجرم ہیں وہ جہاز ساز جنھوں نے جہاز کو حادثہ پروف نہیں بنایا

وہ چیخ رہا تھا، اور چیخ رہا تھا
مگر وہاں کوئی سننے والا نہ تھا جو اس کی چیخ کو سنے
اس کی آواز فضا میں تحلیل ہوتی رہی
یہاں تک کہ وہ بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ سمندر میں غرق ہو گیا
اس کا چیخنا اس کے کام نہ آیا اور نہ دوسروں کے۔

تنقید کی ایک قسم یہ بھی ہے

ایچ ایچ آچاریہ پنڈت پریم کشوا ہا (پیدائش ۱۹۰۸) ایک ہندو عالم ہیں۔ وہ عربی اور اردو زبانیں بھی اچھی جانتے ہیں اور الرسالہ کے مستقل قارئین میں سے ہیں۔ ۱۶ جون ۱۹۷۸ کی ایک ملاقات میں انھوں نے کہا: "آپ کی دعوت کے بارہ میں مسلم علماء کا ردعمل کیا ہے۔ میں نے کہا علماء کی ایک تعداد ہمارے ساتھ ہے۔ تاہم ایک طبقہ ہمارا مخالف بھی ہے۔ میں نے بتایا کہ ہندوستان کے ایک مشہور ترین مذہبی ادارہ کے ماہانہ آرگن میں "الاسلام" پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔ اس تبصرہ میں ہمارے اس مسلک پر گرفت کی گئی ہے کہ ہم موجودہ زمانہ کے مسلم مصلحین پر تنقید کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مذکورہ ماہنامہ ہمارے بارے میں لکھتا ہے:

"مصنف اسلامی دعوت اور اسلامی تاریخ کے بزعم خود بڑے مبصر ہیں۔ انھوں نے کس طرح اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں انبیاء سابقین اور ان کی دعوت و ہدایت کے احترام کا جذبہ موجود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سابق کسی نبی کا انکار نہیں فرمایا۔ کسی نبی کی دعوت و ہدایت پر تنقید نہیں کی بلکہ سب انبیاء کی تصدیق، سب کا احترام اور سب کی لائی ہوئی شریعتوں کو سچا مانا اور سچ بتایا"

دارالعلوم، اگست ۱۹۷۷

پنڈت جی یہ سن کر حیرت میں پڑ گئے۔ "یہ تنقید اگر چھپی ہوئی نہ ہوتی تو میں یقین نہ کرتا کہ کوئی عالم ایسی کم زور بات کہہ سکتا ہے۔ یہ تو ایک معلوم بات ہے کہ پیغمبر سارے معصوم ہوتے ہیں اور سب خدا کی طرف سے آتے ہیں۔ ان کا برسر حق ہونا یقینی ہوتا ہے۔ پھر ان پر تنقید کا کیا سوال۔ جب کہ عام مصلح کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک مجتہد کی ہے اور آپ کے یہاں طے شدہ ہے کہ — المجتہد یخطی ویصیب (مجتہد غلطی بھی کرتا ہے اور صحیح بھی)

اس کے بعد انھوں نے کہا۔ اس تنقید پر مجھ کو ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لطیفہ اس قسم کی تنقیدوں پر بہت خوبی سے چسپاں ہوتا ہے۔

جاٹ اور تیلی ایک ساتھ جا رہے تھے۔ تیلی نے کہا:

جاٹ رے جاٹ تیرے سر پہ کھاٹ

جاٹ نے یہ سن کر سوچا کہ تیلی تو بازی لے گیا۔ مجھے بھی اس کے توڑ میں کچھ کہنا چاہئے، وہ بولا:

تیلی رے تیلی تیرے سر پہ کولھو

تیلی نے کہا یہ تو کچھ تک نہیں بیٹھا۔ جاٹ نے فوراً کہا:

تک نہ ہو تو کیا۔ تو بوجھ کے نیچے تو مرے گا۔

"ظہور اسلام کا پہلا صفحہ غلط ہے مصنف کو شاہ ولی اللہ پر اعتراض ہے کہ وہ الہمنی ربی کی زبان میں کلام کرتے ہیں۔ اور ظہور اسلام کے دیباچہ میں انھوں نے خود اپنے بارہ میں یہی بات لکھ دی۔"

یہ تنقید بھی ویسی ہی ہے جیسے کوئی کہے "تیلی رے تیلی تیرے سر پہ پہاڑ"۔ تیلی پوچھے کہ میرے سر پہ پہاڑ رکھا کس نے۔ تو وہ جواب دے: کچھ بھی ہو تمھارا سر تو ٹوٹا۔

ظہور اسلام میں جو بات کہی گئی ہے وہ "القاء" کی نوعیت کی ہے نہ کہ وحی و الہام کی نوعیت کی۔ القاء کسی بھی شخص کو ہو سکتا ہے۔ جب کہ وحی و الہام صرف انبیاء کرام کے لئے مخصوص ہے۔ "میرے رب نے مجھ کو الہام کیا" صرف پیغمبر کہہ سکتا ہے جب کہ یہ کہنا ہر ایک کے لئے جائز ہے کہ "میرے ذہن میں وارد ہوا"

اللہ کی بڑائی کی یاد نے

ان کی زبانیں بند کر دی ہیں

عن عُقبۃَ بن عامرٍ قال لقیتُ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقلت ما النجاۃ ۔ فقال: اَملِكْ علیك لسانك ولیسعك بیتك وابكِ علی خطیئتك

عقبہ بن عامر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ نجات کا راستہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: اپنی زبان کو روکے رکھو، گھر میں بیٹھے رہو اور اپنی خطاؤں پر روؤ۔

اپنی زبان کو قابو میں رکھ کر بولنا، اپنے قریبی دائرہ کو اپنا میدان عمل سمجھنا اور اپنے "کارناموں" کے بجائے اپنی کوتاہیوں کو یاد رکھنا ——— ایمان کی علامتیں ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں نجات کے مستحق قرار پائیں گے۔

وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس کی آخر عمر میں جب کہ ان کی بینائی جاتی رہی تھی، میں ان کو لئے جارہا تھا۔ وہ مسجد حرام میں پہنچے۔ وہاں ایک مجمع کی طرف سے کچھ جھگڑنے کی آواز سنائی دی۔ فرمایا مجھے اس مجمع کی طرف لے چلو۔ میں ان کو وہاں لے گیا۔

وہاں پہنچ کر عبداللہ بن عباس نے سلام کیا۔ ان لوگوں نے بیٹھنے کے لئے کہا تو آپ نے انکار کیا اور یوں بولے: "تم کو معلوم نہیں کہ اللہ کے خاص بندے وہ لوگ ہیں جن کو اس کے خوف نے چپ کر رکھا ہے، حالانکہ وہ نہ عاجز ہیں، نہ گونگے، بلکہ فصیح لوگ ہیں، بولنے والے ہیں اور سمجھ دار ہیں۔ مگر اللہ کی بڑائی کی یاد نے ان کی عقلوں کو اڑا رکھا ہے۔ ان کے دل اس کی وجہ سے ٹوٹے رہتے ہیں۔ اور ان کی زبانیں چپ رہتی ہیں۔ جب اس حالت پر ان کو پختگی ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ سے وہ نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔ تم لوگ ان سے کہاں ہٹ گئے۔"

وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے دو آدمیوں کو بھی ایک جگہ اس طرح جمع نہیں دیکھا۔

آپس کی لڑائیاں ہلاکت کی طرف لے جاتی ہیں

عُقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

انی لستُ اَخشیٰ علیکم ان تُشرکوا ولکن اَخشیٰ علیکم الدنیا ان تنافسوا فیہا وتَقتَتِلوا فتَہلِکوا کما ہَلَكَ من کان قبلکم (متفق علیہ)

مجھے یہ اندیشہ نہیں کہ میرے بعد تم شرک کرنے لگو گے۔ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تم دنیا چاہنے لگو گے اور آپس میں ایک دوسرے سے لڑو گے۔ یہاں تک کہ اسی طرح ہلاک ہو گے جس طرح پچھلی امتیں ہلاک ہو گئیں۔

حلف الفضول کے بارے میں

قدیم عرب میں باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ طاقت ور کمزور کو ستاتا اور اس کو لوٹ لیتا تھا۔ کچھ سربر آوردہ لوگوں نے مل کر یہ عہد کیا کہ وہ کمزوروں کا ساتھ دیں گے اور مظلوم کو اس کا حق دلوائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر جو معاہدہ لکھا گیا، اس میں ایک جملہ تھا جس میں فضول کا لفظ تھا:

تُرَدُّ الفضول الیٰ اھلھا (سہیلی، روض الانف) — مال ان کے مالکوں کو واپس کیا جائے گا۔

اس وجہ سے اس عہد نامہ کا نام حلف الفضول پڑ گیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تقریباً پندرہ سال کی تھی کہ عرب کی مشہور لڑائی حرب فجار (۵۸۰ء) کا چوتھا اور آخری مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں ایک طرف قبائل کنانہ تھے اور دوسری طرف قبائل قیس، کافی نقصان اٹھانے کے بعد بالآخر دونوں فریقوں میں صلح ہو گئی۔ اس کے بعد آپ کے چچا زبیر بن عبد المطلب کی تحریک پر عبداللہ بن جدعان (رئیس قریش) کے مکان پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں یہ بات زیر غور آئی کہ کوئی ایسا انتظام ہونا چاہیے جس سے آئندہ ملک میں امن وامان قائم ہو سکے۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ حلف الفضول کی تجدید کی جائے جو اس کے ابتدائی معاہدین کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ بنو ہاشم، بنو المطلب، بنو اسد، بنو زہرہ، بنو تیم نے قسم کھا کر اقرار کیا کہ وہ ملک سے بدامنی کو دور کریں گے، مسافروں کی حفاظت کریں گے۔ غریبوں کی مدد کریں گے۔ مظلوموں کو ان کا حق دلائیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے خاندان والوں کے ساتھ اس معاہدہ میں شریک تھے۔ بعد کو زمانہ نبوت میں آپ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

لقد شھدت مع عمومتی حلفاً فی دار عبد اللہ بن جدعان ما احب لی بہ حمر النعم۔ ولو دعیت بہ فی الاسلام لاجبت

میں اپنے چچاؤں کے ساتھ معاہدہ میں شریک ہوا تھا۔ اس کے بدلے اگر مجھ کو سرخ اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں ان کو قبول نہ کرتا۔ اور اب زمانہ اسلام میں بھی اگر مجھے اس کے لئے بلایا جائے تو میں لبیک کہوں گا۔

اس معاہدہ کے سلسلے میں دو باتیں بالکل واضح ہیں۔

۱۔ حلف الفضول دوروں اور تقریروں کی کوئی مہم نہ تھی۔ یہ ایک عملی پروگرام تھا جس میں کچھ سربر آوردہ لوگوں نے قسم کھا کر اپنے آپ کو اس کا پابند کیا تھا کہ وہ مظلوم کی مدد کے لئے پہنچیں گے اور حق دار کو اس کا حق دلائیں گے۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پندرہ سال کی عمر میں اس عہد نامہ میں شریک ہوئے تھے تاہم نبوت ملنے کے بعد آپ نے جس چیز کو اپنا مشن بنایا وہ مذکورہ عہد نامہ نہ تھا۔ آپ کا مشن توحید و آخرت تھا۔ وہ چیز جس پر آپ نے پوری زندگی لگائی، وہ تھا شرک سے لوگوں کو ہٹا کر ایک خدا کا پرستار بنانا اور دنیا پرستانہ زندگی کے بجائے آخرت پسندانہ زندگی پیدا کرنا۔ آپ نے ایک موقع پر یہ ضرور فرمایا کہ آج بھی اگر کوئی مجھے حلف الفضول والے کام کی طرف پکارے تو میں لبیک

کہوں گا۔ مگر اس کو آپ نے دوسرے کی پکار پر مشروط رکھا۔ خود آپ نے اس کو اپنا مشن نہیں بنایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حلف الفضول جیسے کسی کام کی حیثیت زیادہ سے زیادہ دنیوی فلاح کے ایک پروگرام کی ہے۔ جب کہ نبی اس لئے آتا ہے کہ وہ لوگوں کو فلاح آخرت کا راستہ دکھائے۔ نیز یہ کہ خود دنیوی اخلاقیات بھی حقیقی معنوں میں خدا کے خوف ہی سے پیدا ہوسکتی ہیں نہ کہ اس سے آزاد ہو کر۔

خدا کا خوف حکمت کا خزانہ ہے

قرآن　　اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا　　(فاطر ۲۸)

اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

حدیث　　رأس الحکمة مخافة الله

دانائی کا سرا اللہ کا خوف ہے

بائبل　　مخافة الرب رأس المعرفة　　(امثال ۱ : ۷)

خدا کا خوف علم کا شروع ہے

THE FEAR OF THE LORD IS THE BEGINNING OF KNOWLEDGE

خدا کا خوف سادہ معنوں میں صرف "ڈر" کا نام نہیں ہے، وہ حقیقت کی اعلیٰ ترین یافت ہے۔ وہ آدمی کے اوپر عقل و دانش کا دروازہ کھولتا ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ نفسیاتی واقعہ ہے کہ اندیشہ کے احساسات آدمی کے اندرون کو جگاتے ہیں۔ جب کہ اطمینان اور قناعت کے احساسات اس کے اندرون کو سلا دیتے ہیں۔ جب آدمی اپنے کو خطرہ کی حالت میں محسوس کرے تو اس کی فکری قوتیں زیادہ گہرائی کے ساتھ کام کرنے لگتی ہیں اور جب وہ اپنے کو بے خطر محسوس کرے تو اس کا ذہن کند ہو جاتا ہے۔ سامنے کے حقائق بھی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ خوف سے مستقبل کے متعلق سوچنے کا ذہن پیدا ہوتا ہے اور بے خوفی سے حال کے اندر گم رہنے کا۔

مشہور بزرگ شبلیؒ نے کہا ہے: "جب بھی میں اللہ سے ڈرا ہوں تو اس کی وجہ سے مجھ پر حکمت و عبرت کا ایسا دروازہ کھلا ہے جو اس سے پہلے میرے اوپر کھلا ہوا نہ تھا۔" خوف خدا کے بغیر سچی دینداری پیدا نہیں ہوسکتی۔ حسن بصریؒ نے فرمایا: عالم وہ ہے جو دیکھے بغیر اللہ سے ڈرے۔ وہی چیز پسند کرے جو اللہ کو پسند ہے اور اس سے کوئی دلچسپی نہ رکھے جو اللہ کو ناپسند ہے (العالم من خشی الرحمٰن بالغیب ورغب فیما رغب اللّٰہ فیہ وزھد فیما سخط اللّٰہ فیہ (تفسیر ابن کثیر

کسی کے نزدیک اسلام ایک عملیاتی نسخہ ہے، اپنی زندگی کے ساتھ اسلام کے عملیاتی ضمیمہ کو جوڑ لو اور سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ۔ کوئی سارے معاملہ کو بزرگوں کا معاملہ سمجھتا ہے، کسی زندہ یا مردہ بزرگ کا دامن تھام لو اور ان کی برکت سے دونوں جہان کی نعمتیں سمیٹ لو۔ کچھ لوگ ہیں جن کو خوش قسمتی سے اور بھی زیادہ کامیاب طریقہ حاصل ہو گیا ہے، شان دار تقریریں کرو اور اس کے بعد دنیا میں لیڈری ہے اور آخرت میں جنت الفردوس۔

یاد رکھئے۔ جنت اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے کہ اس قسم کے سستے سکوں سے حاصل ہو جائے۔

کوئی شخص ایسا نہیں کرے گا کہ اپنے لڑکے کو "کامیاب ڈاکٹر" بنانے کے لئے اس کو عملیاتی وزشیں کرانے لگے۔ یا لڑکے کو کسی پہنچے ہوئے درویش سے بیعت کرائے اور ان کی برکت کے بھروسے پر بیٹھ جائے۔ یا "ڈاکٹر کانفرنس" کے پنڈال پر لڑکے کو ہار پہنا کر سمجھ لے کہ اس نے بیٹے کا کلینک کھولنے کا یقینی انتظام کر لیا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اسلام کے بارے میں لوگوں نے اسی قسم کے سستے نسخوں پر امیدوں کے عالی شان محل بنا رکھے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آخرت اسی طرح سرگرمیوں کی ایک زیادہ اعلیٰ جگہ ہے جس کا ایک اسفل نمونہ ہم موجودہ دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔ آج کی دنیا میں کوئی مقام اسی کو ملتا ہے جو اس کی قابلیت پیدا کرے۔ اسی طرح آخرت کے مناصب اور مقامات پر وہی لوگ فائز کئے جائیں گے جنھوں نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کیا ہو:

قد افلح من زکّٰها و قد خاب من دسّٰها شمس	مراد کو پہنچا جس نے اپنے جی کو سنوارا اور نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں ملایا (ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ)

قوم ثمود کے سامنے ایک اونٹنی ظاہر ہوئی۔ انھوں نے چاہا کہ اس کو ہلاک کر دیں۔ ان کے رسول نے ان کو متنبہ کیا کہ اس کو تم "اونٹنی" کا معاملہ نہ سمجھو۔ یہ ایک خدائی معاملہ ہے۔ مگر ان کی سمجھ میں بات نہ آئی۔ انھوں نے خدا کی نشانیوں کو دیکھنے کے لئے اپنی آنکھوں کو اندھا بنا رکھا تھا۔ ان کو "اونٹنی" دکھائی دی۔ مگر خدا نظر نہ آیا۔ انھوں نے بڑھ کر اونٹنی کو مار ڈالا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ برتری اور بہادری کا ٹائٹل لے رہے ہیں — حالاں کہ ایسا کر کے وہ اپنے اندھے پن کا ثبوت فراہم کر رہے تھے۔ وہ بھول گئے کہ آخرت کی دنیا ان لوگوں کے لئے ہے جو اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ "اونٹنی" سے گزر کر خدا کو دیکھنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ جن کو اونٹنی نظر آئے مگر خدا نظر نہ آئے، وہ خدا کے نزدیک صرف اندھے ہیں اور اسی حال میں وہ اگلی دنیا میں اٹھائے جائیں گے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

> "جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا، اس کے لئے تنگ گزران ہے۔ قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا اے میرے رب! کیوں تو نے مجھ کو اندھا اٹھایا، دنیا میں تو میں آنکھ والا تھا۔ جواب ملے گا کہ اسی طرح پہنچی تھیں تمھارے پاس ہماری نشانیاں پس تم نے ان کا کچھ خیال نہ کیا۔ اسی طرح آج تمھارا کچھ خیال نہ کیا جائے گا۔ (طٰہٰ)

دنیا میں جن لوگوں نے "اندھے پن" کا ثبوت دیا ہو وہ آخرت میں "بینائی" کے مناصب پر کیسے فائز کئے جا سکتے ہیں۔

اس منطق سے آپ ہر بات ثابت کر سکتے ہیں

سگمنڈ فرائڈ (۱۹۳۹ - ۱۸۵۶) نفسیات کا مشہور عالم ہے۔ اس کا نظریہ تھا کہ خواب کا انسانی ذہن سے باہر کوئی ماخذ نہیں۔ وہ زیادہ تر انسان کی دبی ہوئی خواہش (REPRESSED WISH) کو پورا کرنے کا ایک مظہر ہوتا ہے۔ انسان کی وہ تمنائیں جن کی وہ تکمیل نہ کر سکا، خواب میں ان کو پورا ہوتے دیکھ کر وہ تسکین حاصل کرتا ہے۔ اپنے اس نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لئے اس نے جو کتابیں لکھیں۔ ان میں اس کے نزدیک سب سے زیادہ اہم کتاب وہ تھی جس کا نام ہے:

تعبیر خواب (THE INTERPRETATION OF DREAMS)

اس کتاب میں اس نے بہت سے خوابوں کو جمع کرکے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ان کی تعبیر بیان کی ہے۔

فرائڈ کی یہ کتاب پہلی بار جرمن زبان میں صرف ۶۰۰ کی تعداد میں چھپی تھی۔ مگر اس کو فروخت ہونے میں آٹھ سال لگ گئے۔ تاہم بعد کو فرائڈ کے نظریات نے کافی شہرت حاصل کی۔ اگرچہ اس کو مقبولیت کے بہت کم سال ملے۔ کیوں کہ جلد ہی بعد علمائے نفسیات نے فرائڈ کے نظریات پر سخت تنقیدیں شروع کر دیں۔

کچھ ایسے خواب ضرور ہیں جن کو فرائڈ نے نہایت کامیاب طور پر اپنے نظریۂ تعبیر کے مطابق ثابت کیا ہے۔ مگر بیشتر خوابوں کی تعبیر محض دور از کار تاویل معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً ایک خواب کے مطابق ایک نوجوان ڈاکٹر رات کو دیکھتا ہے کہ اس نے انکم ٹیکس کا غلط حساب پیش کیا ہے جس کے نتیجہ میں اس کو سزا دی جا رہی ہے۔ فرائڈ کہتا ہے کہ نوجوان چاہتا تھا کہ وہ بہت زیادہ دولت کمانے والا ڈاکٹر بنے۔ اس کی یہی دبی ہوئی خواہش ہے جس نے مذکورہ خواب کے ذریعہ اپنی تسکین حاصل کی ——— اس قسم کا استدلال اگر صحیح ہو تو کسی دوسرے بالکل مختلف نظریۂ تعبیر کو بھی اتنی ہی کامیابی کے ساتھ ثابت کیا جا سکتا ہے۔

تاہم اس کتاب میں ایک اور بات ہے جو اس سے بھی زیادہ دل چسپ ہے۔ فرائڈ اپنی ساری ذہانت کے باوجود متعدد خوابوں کو اپنے نظریۂ تعبیر کے مطابق ثابت نہ کر سکا۔ ایسے واقعات میں اس نے ایک اور منطق ڈھونڈ نکالی ہے:

"یہ خواب میرے مخالفین کی اس دبی ہوئی خواہش کا نتیجہ ہیں کہ وہ میرے نظریہ کو غلط ثابت کر سکیں"

ایک شخص نے فرائڈ سے اپنا خواب بیان کیا۔ وہ ایک وکیل تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے مقدمات کے تمام فائل گم ہو گئے ہیں۔ فرائڈ اپنے نظریہ کے مطابق اس کی کوئی اطمینان بخش تعبیر بیان نہ کر سکا۔ بعد کو اس نے اپنی کتاب میں لکھا کہ اصل یہ ہے کہ خواب دیکھنے والا شخص اسکول کی تعلیم کے زمانہ میں آٹھ سال تک اس کا ساتھی تھا۔ اس زمانہ میں فرائڈ ہمیشہ فرسٹ آتا رہا۔ جب کہ مذکورہ شخص کا نتیجہ ہمیشہ اوسط درجہ کا ہوتا تھا۔ فرائڈ کے نزدیک اس وقت سے مذکورہ شخص کے دل میں یہ خواہش دبی ہوئی تھی کہ فرائڈ کو نیچا دکھائے۔ مگر عملاً وہ ایسا نہ کر سکا۔ اب اس کے لاشعور نے مذکورہ خواب دیکھ کر یہ تسکین حاصل کی کہ اس نے فرائڈ کو کم از کم اس کے نظریۂ خواب کے معاملہ میں غلط ثابت کر دیا ہے۔

فرائڈ کے اس طرزِ تعبیر پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک عالم نفسیات نے لکھا ہے:

With this kind of logic, all dreams cannot but be consistent with Freud's theory.

اس قسم کی منطق سے تو لازماً تمام خواب فرائڈ کے نظریہ کے مطابق ہی ثابت ہوں گے (۲۵ جون ۱۹۷۸)

منطق کی یہ قسم فرائڈ تک محدود نہیں۔ یہ بہت زیادہ عام ہے۔ حتی کہ وہ لوگ بھی اس کو اپنے لئے ایک قیمتی علمی ہتھیار سمجھتے ہیں جو فرائڈ کے "مخالف" ہیں۔ خود راقم الحروف کو متعدد بار اس منطق سے سابقہ پڑا۔ میں نے کسی کے نقطۂ نظر پر علمی تنقید کی۔ موصوف کو پورا حق تھا کہ وہ میری بات کو دلیل کے ذریعہ رد کرتے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے کہا: تم کو چونکہ مصنف سے "ضد" ہے، اس لئے تم اس کے خلاف تنقید کر رہے ہو۔ ایک بزرگ نے ایک بار لکھا: "آپ کے اندر میرے خلاف ایک ضد اور کد کی کیفیت پیدا ہو چکی ہے، اس لئے آپ کو میری بات غلط نظر آتی ہے"

اگر آدمی کے پاس اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لئے دلیل موجود نہ ہو تو یہ اس کے لئے بہترین قلعہ ہے جہاں وہ پناہ لے سکتا ہے۔ اگرچہ اپنے تمام تر حسن اور تقدس کے باوجود یہ ایک ایسا قلعہ ہے جو آدمی کے اپنے ذہن میں ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ اس کے معتقدین کے ذہن میں۔ ان کے باہر اس مضبوط قلعہ کا کہیں وجود نہیں ہوتا۔

ایمان ایک غذا ہے

غذا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی منھ میں کوئی چیز ڈال کر اس کو چبا رہا ہو۔ غذا وہ ہے جو آدمی کا گوشت اور خون بنے اور اس کی صحت و طاقت کا ذریعہ ہو۔ یہی معاملہ اسلام کا بھی ہے۔

مسلمان کے مسلمان ہونے کی پہچان محض ظاہری اعمال نہیں ہیں۔ نہ یہ ہے کہ وہ اسلامی تقریروں اور تحریروں کا کمال دکھا رہا ہو۔ اللہ کا مطلوب مسلمان وہ ہے جس کے اعمال اس کے سینہ میں قلب خاشع پیدا کر رہے ہوں۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ بظاہر اسلامی اعمال کی دھوم ہو، مگر آدمی کے سینہ میں قلب قاسی جنم لے رہا ہو تو دنیا والوں کی نظر میں خواہ اس کی کتنی ہی اہمیت ہو، اللہ کے نزدیک ایسے اسلام کی کوئی قیمت نہیں۔

قلب کی قساوت یہ ہے کہ آدمی کے دل سے نرمی نکل گئی ہو۔ وہ سچائی کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہوتا ہو۔ کوئی معاملہ پڑے تو وہ ایسا رویہ اختیار کرے گویا اس کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے (بقرہ ۷۴) آدمی کے دل سے لطیف احساسات اس طرح مٹ جائیں کہ شیطان جب اس کے دل میں اپنی بات ڈالے تو وہ اس کو پہچان نہ سکے اور شیطانی ترغیبات کا شکار ہو جائے (حج ۵۳) آدمی خدا کی نشانیاں دیکھے، اس کے سامنے حق کے دلائل آئیں مگر یہ چیزیں اس کے دل کو متاثر نہ کریں۔ خدا کی یاد سے خالی وہ کردہ زندگی گزار رہا ہے (زمر ۲۲) وہ حقائق کو نظر انداز کرے اور خوش فہمیوں پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھے (حدید ۱۶)

اسلام کے نادان دوست

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

ایک شخص تجارت کرے اور اپنی محنت سے کروڑپتی بن جائے تو اس سے کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوگا۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنے پڑوسی سے چھین جھپٹ کرکے کروڑپتی بننے کی کوشش کرے تو دونوں کے درمیان دشمنی وجود میں آتی ہے۔ تخریبی کارروائیاں ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ قتل تک کی نوبت آجاتی ہے۔ مزید یہ کہ سب کچھ لٹانے کے بعد بھی اصل مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

یہی معاملہ حکومتی تبدیلی کا بھی ہے۔ کسی سماج میں حکومت کی تبدیلی کا جو معروف طریقہ ہے، اگر اس کے ذریعہ حکومت بدلنے کی کوشش کی جائے تو سماج کے اندر کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ جیساکہ اپریل ۱۹۷۷ میں ہندوستان میں ہوا۔ جنتا پارٹی نے اندرا پارٹی کو ہٹانا چاہا۔ اس مقصد کے لئے اس نے عوام کی رائے کو ہموار کیا۔ حالات نے اس کا ساتھ دیا اور الکشن کے معروف اور مسلّم طریقہ کے مطابق اس نے اندرا حکومت کو ختم کر دیا۔ اندرا گاندھی نے اپنی شکست تسلیم کرلی اور جنتا پارٹی کے لئے جگہ خالی کردی۔

ٹھیک اسی زمانہ میں پاکستان میں نو پارٹیوں کا متحدہ محاذ وجود میں آیا۔ اس کا مقصد بھٹو حکومت کو ختم کرکے "نظام مصطفیٰ" قائم کرنا تھا۔ ساری کوششوں کے باوجود مارچ ۱۹۷۷ کے الکشن میں اسلامی محاذ ہار گیا۔ اب صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی ہار کو مان کر دوبارہ کوشش کرتا کہ اگلے الکشن میں زیادہ بڑے پیمانہ پر عوامی تائید حاصل کرے، جیساکہ ہندستان میں اندرا پارٹی کر رہی ہے۔ مگر اسلامی محاذ نے اس کے برعکس دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے شور مچانا شروع کیا کہ "بھٹو پارٹی دھاندلی کرکے الکشن جیتی ہے ورنہ عوام کی صدفی صد اکثریت ہمارے ساتھ ہے۔" اس نے صرف شور وغل پر بس نہ کیا۔ عوام کی منفی جذبات اور تخریب پسندی سے فائدہ اٹھا کر اس نے شہروں میں ہڑتال اور توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ یہ صورت حال فوجی افسروں کے لئے بے حد قیمتی تھی۔ انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر جولائی ۱۹۷۷ میں اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

مگر پاکستانی شہروں میں اسلامی محاذ کی توڑ پھوڑ اور فوجیوں کا اسلام آباد پر قبضہ دونوں ہی معروف و مسلّم طریقہ کے خلاف تھے۔ اس نے مسئلہ کو ختم نہیں کیا۔ بلکہ مسئلہ میں اضافہ کر دیا۔

فوجی افسران جو فوجی بیرک سے نکل کر اچانک صدارتی محل میں پہنچ گئے، عوام خاص طور پر دیہاتی عوام کی صورت حال سے بالکل بے خبر تھے۔ انھوں نے فوراً اعلان کر دیا کہ پاکستان میں ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۷ کو عام الکشن ہوگا۔ "بھٹو کی سب سے بڑی سزا یہ ہو سکتی تھی کہ اس کو دوبارہ الکشن لڑنے کا موقع دیا جائے اور اس کا بیلٹ بکس خالی رہ جائے۔ ایک سیاسی لیڈر کے لئے یہ سزا موت سے بھی زیادہ سخت ہے۔ مگر بھٹو کے نام پر ہونے والے جلسوں کی بھیڑ نے ثابت کر دیا کہ فوجی حکمرانوں کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ بھٹو کو اس قسم کی سزا دے سکیں۔ اب انھوں نے دوسرا فیصلہ کیا۔ وہ الکشن کے ذریعہ بھٹو کو قتل نہیں کر سکتے تھے،

انھوں نے طے کیا کہ وہ بندوق کی گولی سے بھٹو کو قتل کریں گے۔ اور اقتدار کی تبدیلی کے بعد یہ طاقت بہر حال فوجی حکمرانوں کے پاس موجود تھی۔

مگر معروف اور مسلّم طریقہ کو چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان میں نظام مصطفیٰ کے نام پر ایک ایسا نظام آرہا ہے جو نہ تو اسلامی نظام ہوگا اور نہ خالص سیاسی اور اقتصادی معنوں میں پاکستان کے لئے کسی بہتری کا باعث ہوگا۔ اس کا واحد انجام یہ ہے ——— لیاقت علی خاں کے قتل (۱۹۵۱) سے پاکستان میں جس بربادی کا آغاز ہوا تھا، مزید نامعلوم مدت تک اس میں اضافہ

اوپر کی سطریں ۲۵ مارچ ۱۹۷۸ کو لکھی گئی تھیں۔ ان کی کتابت ہو چکی تھی کہ بعض وجوہ سے ان کی اشاعت کو روک دیا گیا۔ اب اس کو مکمل کرکے شائع کیا جارہا ہے

محمد ایوب خاں نے اپنے زمانہ حکومت (۱۹۶۹ — ۱۹۵۸) میں بنیادی جمہوریت (یا محدود جمہوریت) کا نظام قائم کیا تھا۔ یہ اپنے ڈھانچے کے اعتبار سے اسلام سے قریب تر تھا، تاہم اسلام پسندوں کو نظر آیا کہ ملک میں اگر بالغ رائے دہی کا نظام قائم ہو جائے تو ان کے لئے اقتدار تک پہنچنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔ انھوں نے ملک کے مختلف سیاسی عناصر کے ساتھ مل کر "تحریک جمہوریت" چلائی اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے توڑ پھوڑ کی حد تک لے گئے۔ تاہم بالغ رائے دہی کی بنیاد پر پاکستان میں ہونے والے دو انتخابات (۱۹۷۰ء — ۱۹۷۷) میں ان کو مکمل ناکامی ہوئی

اب پاکستان میں جنرل ضیاء الحق اور اسلام پسند دونوں ایک مشترک مسئلہ سے دوچار تھے۔ وہ یہ کہ دونوں میں سے کسی کو یہ امید نہیں تھی کہ وہ بیلٹ بکس کے ذریعہ اقتدار کی کرسی پر پہنچ سکتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے اس کا حل یہ نکالا کہ انتخاب کے بجائے فوجی طاقت کے ذریعہ پاکستان کے اوپر مسلط ہو جائیں۔ تاہم انھیں ضرورت تھی کہ لوگوں کو دکھانے کے لئے ایک "وزارت" بھی پاکستان میں قائم ہو۔ یہاں اسلام پسندوں کی مایوسانہ نفسیات نے ان کا ساتھ دیا۔ یہ لوگ عوامی انتخابات کے ذریعہ اپنے سیاسی حوصلوں کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے جنرل ضیاء الحق سے سیاسی مصالحت کرکے عقب دروازہ سے ایوان حکومت میں داخلہ حاصل کر لیا۔ اطلاعات کے مطابق نام نہاد ۲۴ رکنی کابینہ میں تین وزارتیں اسلام پسند حلقے کو ملی ہیں ——— بھٹو مخالف عناصر کو "وزارت" کی کرسی پر بٹھا کر جنرل ضیاء الحق سمجھتے ہیں کہ وہ "بھٹو ازم" کو پاکستان سے ختم کر سکیں گے۔ مگر ان کو اور ان کے سیاسی دوستوں کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ منفی تدبیروں سے کبھی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

فوجیوں اور اسلام پسندوں کا یہ گٹھ جوڑ کسی بھی درجہ میں پاکستان کے سیاسی مسئلہ کو حل کرنے والا نہیں ہے۔ طویل اختلافی سیاست کے نتیجہ میں پاکستان میں عوامی جمہوریت کا جو ابال آچکا ہے اور جس کے لانے میں خود اسلام پسند بھی برابر کے شریک ہیں، وہ لاوا کی طرح اندر اندر پکتا رہے گا اور موقع پاکر جب ابلے گا تو نہیں معلوم کس کس چیز کو اپنے ساتھ بہالے جائے ——— جمہوری سیلاب کا واحد روک دائمی فوجی ڈکٹیٹرشپ ہے۔ مگر وہ ایسا ہی ہے جیسے کونین کے بجائے زہر سے ملیریا کا علاج کرنا۔ (۲۴ اگست ۱۹۷۸)

اسلام کا طریقِ دعوت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

شرع لکم من الدین ما وصّی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ کبر علی المشرکین ما تدعوھم الیہ (شوریٰ — ۱۳)

اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔ اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا، یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو۔ مشرکوں پر وہ بات بہت گراں ہے جس کی طرف تم ان کو بلاتے ہو

اقامت دین کی اس آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ "دین کو قائم کرو، باطل کو مت قائم کرو" بلکہ یہ فرمایا کہ "دین کو قائم کرو، دین میں متفرق نہ ہو"۔ جس حالت کو اختیار کرنے کا حکم ہے اور جس حالت سے منع فرمایا گیا ہے دونوں، آیت کے الفاظ کے مطابق، خود دین سے متعلق حالتیں ہیں۔ اور ان دونوں حالتوں میں سے ایک دینی حالت کو چھوڑنے اور دوسری دینی حالت کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا اس آیت میں جو حکم ہے وہ اقامتِ باطل کے مقابلہ میں اقامت دین کا نہیں ہے بلکہ تفرق فی الدین کے مقابلہ میں اقامتِ دین کا ہے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت میں دین سے مراد صرف اساسی دین ہے۔ کیوں کہ اساسی دین تمام انبیاء کے درمیان یکساں تھا اور اسی میں سب کی مشترک پیروی کی جا سکتی ہے۔ تفصیلی شریعت قرآن کی تصریح (لکل جعلنا منکم شرعۃ و منہاجا) کے مطابق ان کے درمیان مختلف تھی۔ اس لئے تفصیلی شریعت میں بیک وقت سارے نبیوں کی پیروی ممکن نہیں۔

تفصیلی شریعت میں نبیوں کے درمیان جو فرق تھا وہ کسی ارتقائی تشریع کی بنا پر نہ تھا۔ بلکہ حالات اور دعوتی مراحل میں فرق کی بنا پر تھا۔ یہ فرق مختلف مسلم گروہوں کے درمیان آج بھی ہے اور ہمیشہ پایا جاتا رہے گا۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دین کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ جو دائمی طور پر یکساں حالت میں مطلوب ہے۔ دوسرا وہ جو حالات کے تابع ہوتا ہے۔ پہلا حصہ اساسی تعلیم سے متعلق ہے اور اس کو قرآن میں الدین (شوریٰ) کہا گیا ہے۔ دوسرا حصہ شرعۃ اور منہاج (مائدہ ۴۸) کا ہے۔ یعنی فرعی قوانین اور طریق کار۔ پہلے حصۂ دین کو قرآن میں سبیل (راستہ) سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے حصۂ دین کو سُبل (راستے) کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلا حصہ ہمیشہ ایک رہتا ہے۔ وہ ہر زمانہ کے لئے واحد شاہ راہ ہے۔ اس کے برعکس دوسرے حصۂ دین کا تعلق حالات سے ہے اور اس میں ایک سے زیادہ صورتوں کی گنجائش رہتی ہے۔ حکم ہے کہ دعوت وا قامت کا موضوع الدین کو بناؤ، سُبل متفرقہ کو مت بناؤ۔ متفق علیہ دین کو قائم کرنے میں لگو، مختلف فیہ دین کے پیچھے پڑ کر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ۔

قرآن میں مختلف مقامات پر اہلِ ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے عمل کی ایک

شاہراہ مقرر کر دی ہے۔ تم اسی پر چلو، اِدھر اُدھر کے راستوں پر مت چلو۔ ورنہ تم اصل خدائی شاہراہ سے بھٹک جاؤ گے۔
اس شاہراہ کو قرآن میں دین قیم (بینہ) حبل اللہ (آل عمران) سواء السبیل (مائدہ) اور صراط مستقیم (انعام) وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ انعام کے ۱۹ ویں رکوع میں چند بنیادی چیزوں کا حکم دینے کے بعد ارشاد ہوا ہے:

وان هذا صراطی مستقیما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیله ذلکم وصکم به لعلکم تتقون (انعام۔۱۵۳)

کہہ دو کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ، سو تم اسی پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ تم کو اصل راہ سے جدا کر دیں گی۔ اللہ تم کو حکم دیتا ہے تاکہ تم متقی بنو۔

اس آیت میں متفرق راستے (سُبل) سے مراد کفر و شرک کے راستے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ راستے ہیں جو دین میں دین کے نام پر نکالے جاتے ہیں (قال مجاھد السبل البدع، قرطبی)۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے جو کچھ مطلوب ہے وہ واضح الفاظ میں قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ قرآنی تعلیمات عملاً زندگی میں کس طرح متشکل ہوتی ہیں، اس کا واضح نمونہ رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کی زندگیوں میں موجود ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے اسی ثابت شدہ الدین پر قائم رہے۔ اس کے سوا دین میں ایسی باتیں نکالنا جو قرآن اور سنت سے بلا اختلاف ثابت نہ ہوں، اِدھر اُدھر کے راستوں پر بھٹکنا ہے جو آدمی کو اصل خدائی راستہ سے دور کر دیتا ہے۔ بطور خود آدمی سمجھتا ہے کہ وہ دین پر چل رہا ہے، حالانکہ اصل خدائی دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

دین اور شریعت کا فرق

الدین کیا ہے۔ یہ توحید ہے۔ یعنی ایک ہستی کو خالق و مالک ماننا، اسی کو اپنی تمام توجہات کا مرکز و محور بنانا، اسی کو اپنا سب کچھ سمجھنا، اسی کے آگے اپنے آپ کو جھکا دینا۔ یہی دین کا اصل سرا ہے۔ اس کا ہاتھ آنا تمام چیزوں کا ہاتھ آنا ہے۔ یہ اگر چھوٹ جائے تو کوئی بھی چیز آدمی کے حصہ میں باقی نہیں رہتی۔ خواہ ظاہرداری اور جدال کی سطح پر وہ اپنے آپ کو کتنا ہی دین دار ثابت کر رہا ہو۔ قرآن میں اقامت دین کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اسی الدین سے متعلق ہے۔ سورہ شوریٰ کی اس آیت میں اقامت دین سے مراد دراصل اقامت توحید ہے۔ یعنی بندے کو حقیقی معنوں میں خدا سے جوڑنا۔ اس کو وحدہٗ لاشریک کا سچا پرستار بنانا۔ اگر کوئی گروہ عبادت کے جزئی اور اختلافی مسائل پر فقہی نزاع کھڑی کرے یا دین قائم کرنے کے نام پر حکمراں جماعت سے سیاسی مقابلہ آرائی شروع کر دے تو یہ اقامت دین نہیں ہوگا بلکہ قرآن کے الفاظ میں سُبل متفرقہ کا اتباع ہوگا جو دین میں قطعاً ممنوع ہے۔ اس قسم کے ذیلی اور اختلافی امور پر معرکے کھڑے کرنا امت کی وحدت کو ختم کر دیتا ہے۔ امت فرقوں فرقوں میں بٹ کر اللہ کی اجتماعی نصرت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اقامت دین متفق علیہ مسلہ کے لئے جدوجہد کرنے کا نام ہے نہ کہ مختلف فیہ مسائل کو لے کر مسلمانوں میں جدال و نزاع برپا کرنے کا۔

الدین سے مراد اصلاً اگرچہ توحید ہے۔ تاہم تبعاً اس میں وہ تمام مسائل شامل ہوتے چلے جائیں گے جو قرآن

سنت کے مطابق متفق علیہ ہوں اور جن میں ایک سے زیادہ رایوں کی گنجائش نہ ہو۔

مثلاً خدا کے وجود، اس کی وحدانیت، اس کی ربوبیت کو لوگوں کے سامنے لایا جائے تو اس سے اُمت میں کوئی اختلاف واقع نہیں ہوگا۔ کیوں کہ یہ عقائد محکم آیات و احادیث سے ثابت ہیں۔ اس کے برعکس اگر اس قسم کی بحثیں نکالی جائیں کہ خدا جسم رکھتا ہے یا نہیں۔ خدا کا عرش کہاں قائم ہے۔ خدا اپنا نظیر پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں۔ وغیرہ تو ان چیزوں میں کبھی تمام امت متفق الرائے نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ یہ تمام چیزیں استنباطی نوعیت کی ہیں۔ ان میں خوض کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی کا استنباط اس کو ایک رائے کی طرف لے جائے گا، کسی کا دوسری طرف۔ اس طرح مختلف تعبیرات وجود میں آئیں گی۔ ہر تعبیر کے گرد اہلِ ایمان کا ایک گروہ جمع ہو جائے گا۔ ایک دین کے اندر کئی دین بن جائیں گے ـــــــ اگر اول الذکر معتقدات کی تلقین کی جائے تو یہ اقامت دین ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ثانی الذکر قسم کی اعتقادی موشگافیاں کی جانے لگیں تو یہ قرآن کے الفاظ میں تفرق فی الدین ہے۔ پہلی چیز مطلوب ہے اور دوسری چیز غیر مطلوب۔

یہی معاملہ ان امور کا ہے جن کو عبادات کہا گیا ہے۔ مثلاً نماز کے لئے وضو کا لازمی ہونا ایک متفق علیہ مسئلہ ہے۔ مگر اس کے ارکان و شروط کی تعداد کے بارے میں ایک سے زیادہ رائیں ہیں۔ سنن و مستحبات کی تعداد تو درکنار فرائضِ وضو کی تعداد کے بارے میں بھی فقہاء متفق الرائے نہیں ہیں۔ حنفیہ کے نزدیک فرائض وضو چار ہیں، مالکیہ کے نزدیک سات، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک چھ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ) اب اگر ان اختلافی امور میں تعداد کے تعین کو بحث و مباحثہ کا موضوع بنایا جائے تو مسئلہ کے استنباطی ہونے کی وجہ سے ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ ان کی تعداد کے بارے میں سب کی رائیں ایک ہو جائیں۔ اس قسم کی کوشش اتحاد عملاً صرف اختلاف و انتشار پیدا کرنے کا سبب بنے گی۔ یہ ایک امت کو کئی امتوں میں تقسیم کر دے گی۔ اس لئے حکم دیا گیا کہ امورِ اتفاقی کو مدارِ دعوت بناؤ، امورِ اختلافی کو مدارِ دعوت نہ بناؤ۔

یہی معاملہ اسلامی سیاست کا ہے۔ اگر ایک شخص ایسا کرے کہ اپنے حکمرانوں کی اصلاح کے لئے اللہ سے دعا کرے، ان سے انفرادی ملاقات کر کے ان کو خدا پرستی اور آخرت پسندی کی تلقین کرے۔ سنجیدہ انداز میں تحریر و تقریر کے ذریعہ اسلامی سیاست کے پہلوؤں کو نمایاں کرے تو اس سے امت میں کوئی تفریق وجود میں نہیں آئے گی۔ اس کے برعکس اگر کچھ لوگ احتجاج و مطالبات کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں اور سیاسی محاذ بنا کر حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی تحریک چلانے لگیں تو اس کے نتیجہ میں لازماً یہ ہوگا کہ امت فرقوں فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ایک فرقہ حکمرانوں کا ساتھ دینے والوں کا ہوگا، دوسرا اس کو اقتدار سے ہٹانے والوں کا۔ اس طرح امت دو حصوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دے گی۔ اقامتِ دین کے نام پر تفریق فی الدین وجود میں آجائے گا۔

وضو کے آداب و قواعد کی "تعداد" کا معاملہ ایک استنباطی معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تعین کے بارے میں اہل علم کی کئی رائیں ہوگئی ہیں۔ یہی کیفیت امتِ مسلمہ کے سیاسی مشن کی ہے۔ یہ بھی تمام تر ایک استنباطی معاملہ ہے۔ کیوں کہ قرآن و حدیث میں کوئی نص ایسی موجود نہیں ہے جو سیاسی مشن کی نوعیت کو صراحۃً متعین کر رہی ہو۔ اسی کا

یہ نتیجہ ہے کہ اس باب میں اہل علم کی رایوں میں تعدد پایا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے ایک گروہ کا اصرار ہے کہ امت مسلمہ کا اصل نصب العین یہ ہے کہ حکومت اسلامی کے قیام کی جدوجہد کی جائے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ حکومت ایک امر موعود ہے۔ یعنی وہ اللہ کی طرف سے بطور انعام ملتی ہے نہ کہ اس کو نشانہ بنا کر براہ راست جدوجہد کرنے سے۔ ایک اور طبقہ یہ کہتا ہے کہ اصل کام اصلاح معاشرہ ہے نہ کہ اصلاح حکومت۔ معاشرہ کی اصلاح ہو جائے تو خود بخود صالح حکومت قائم ہو جائے۔ ان نظری اختلافات کے علاوہ حکومت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں شدید عملی نزاکتیں بھی شامل ہیں۔ جب بھی کسی برسر اقتدار گروہ کو اقتدار سے ہٹانے کی کوشش کی جائے گی، وہ لازماً اپنی طاقت کو اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف استعمال کرے گا۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر باہمی قتل وخون وجود میں آئے گا۔ "اقامت دین" عملاً تفریق فی الدین پر منتج ہوگا۔ شریعت کا ایسا معاملہ جس میں ایک سے زیادہ نقطۂ نظر قائم کرنے کی گنجائش ہو اس میں تمام لوگوں کو ایک جھنڈے کے نیچے لانے کی کوشش ہمیشہ یہ نتیجہ پیدا کرتی ہے کہ کئی جھنڈے وجود میں آجاتے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ کے لئے حکم دے دیا گیا کہ اختلافی امور کو مدار تحریک نہ بناؤ۔ صرف اتفاقی امور پر اپنی تحریکوں کی بنیاد قائم کرو۔

انھیں اسباب کی بنا پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صدر اول کے بعد خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور ہزار برس تک چلتی رہی مگر صلحائے امت نے کبھی اس کے خلاف خروج نہیں کیا۔ انھوں نے حکمرانوں کو انفرادی نصیحتیں کیں مگر ان کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے کوئی ایجی ٹیشن نہیں چلایا۔ یہ صرف عصر حاضر کی نظامی تحریکوں کی دین ہے کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں جو سیاسی انقلاب کو امت مسلمہ کا اصل مشن بتاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ہر مسلم ملک میں مسلمانوں کے دو حصے بن گئے ہیں۔ ایک حکمراں گروہ کا۔ دوسرا ان کے مخالف انقلابیوں کا۔ دونوں مسلم گروہوں کے درمیان لامتناہی سیاسی جنگ جاری ہے جو حرث اور نسل کی ہلاکت (بقرہ ۲۰۵) کے سوا کوئی اور تحفہ مسلمانوں کو نہیں دے رہی ہے۔ اور یہ سب کچھ ہو رہا ہے اقامت دین کے نام پر۔

سیاسی مشن کی نوعیت کے بارے میں علمائے امت کے درمیان کئی رائے کا پایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ سیاسی تحریکات کا مسئلہ "سُبل متفرقہ" کے ذیل کا مسئلہ ہے نہ کہ "الدین" کے ذیل کا مسئلہ۔ اس لئے ایک مصلح کے لئے یہ تو درست ہے کہ وہ مسلم حکمرانوں کے اندر بگاڑ دیکھے تو ناصحانہ انداز سے اس کو اصلاح حال کی تلقین کرے۔ مگر دین کی اقامت کا نام لے کر حکمرانوں سے سیاسی ٹکراؤ کرنا کتاب اللہ سے انحراف کے ہم معنی ہے۔ یہ سبل متفرقہ کا اتباع ہے نہ کہ حقیقۃً اقامتِ دین۔

اس تقسیم کا یہ مطلب نہیں کہ دین میں صرف کلیات مطلوب ہیں، جزئیات مطلوب نہیں ہیں۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ دین میں مطلوب حقیقی اور مطلوب اضافی کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ رکھا جائے۔ حقیقی حصہ میں تاکید و تشدید کرتے ہوئے اس کے اضافی اجزاء میں توسع اور رواداری کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کھانے کے سلسلہ میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ حرام و حلال کے درمیان فرق کیا جائے۔ صرف حلال چیزوں کو اپنی غذا بنایا جائے اور حرام چیز کو حلق کے نیچے نہ اتارا جائے۔ دوسرا مسئلہ آداب

طعام کا ہے۔ مثلاً ہاتھ سے کھایا جائے یا چمچہ سے۔ فرش پر کھایا جائے یا میز کرسی پر۔ جوتا پہن کر کھایا جائے یا جوتا اتار کر۔ وغیرہ۔ پہلا مسئلہ کلیات دین کا مسئلہ ہے۔ اللہ نے تام لے کر متعین طور پر بتا دیا ہے کہ بندے کے لئے کیا چیز حلال ہے اور کیا حرام۔ مگر جہاں تک دوسری چیز کا تعلق ہے، اس میں اس قسم کی تعیناتی زبان استعمال نہیں کی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ اور اصحاب کرام کی زندگیوں میں اس سلسلے میں ایک سے زیادہ نمونے ملتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ایک شخص حرام و حلال کے منصوص احکام کو تاکید و تشدید کا موضوع بنائے تو امت میں فرقہ بندی کی نوبت نہیں آئے گی۔ کیونکہ یہ عملاً انھیں چیزوں کی تاکید و تشدید ہوگی جو تمام علماء امت کے درمیان پہلے سے متفق علیہ ہیں۔ رائے کی حد تک ان کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس اگر آداب طعام کے مسائل پر تاکید و تشدید کی جانے لگے تو ساری امت کا کسی ایک مسلک پر متحد الرائے ہونا ممکن نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک شخص کہے گا کہ جوتا اتار کر کھانا ضروری ہے۔ کیوں کہ حدیث میں ہے اخلعوا نعالکم۔ دوسری طرف کسی اور کو یہ کہنے کا موقع ہوگا کہ یہ کوئی جائز ناجائز کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ضرورت کا معاملہ ہے۔ جس میں سہولت ہو ویسا کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ پوری حدیث اس طرح ہے: اخلعوا نعالکم فانہا اروح لاقدامکم (اپنے جوتے اتار دو کیونکہ اس میں تمھارے پیروں کے لئے زیادہ راحت ہے)۔ اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ کلوا من الطیبات واعملوا صالحا (مومنون ۵۱) پر تو خوب زور دیا جائے۔ مگر آداب طعام کی نوعیت کی چیزوں میں روا داری اور توسع کا طریقہ اختیار کیا جائے ـــــــ تحریک اہل حدیث اپنی اصلی اور ابتدائی شکل میں اسی کا نام تھی۔ اگرچہ بعد کو وہ اس مسلک پر قائم نہ رہ سکی۔ کم از کم عوام کی سطح پر یہی صورت حال ہے۔

دین کی تکمیل کیا ہے

موجودہ زمانہ میں "مکمل اسلامی انقلاب" کے علم برداروں اور "غیر مکمل حاملین دین" کے درمیان مختلف ملکوں میں جو تصادم جاری ہے، اس کی بنیاد دراصل "دین کامل" کا غلط نظریہ ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک کامل (تمدنی قوانین کے اعتبار سے کامل) دین ہے اس لئے دین کو قائم کرنے کا مطلب لازماً یہی ہے کہ اس کو ایک کامل تمدنی نظام کی حیثیت سے برپا کیا جائے۔ اگر کامل دین کا یہ مطلب ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ناقص دین تھا۔ کیوں کہ معلوم ہے کہ ان کو تمدنی ضوابط و قوانین سرے سے دیئے نہیں گئے اور اسی طرح دوسرے اکثر انبیاء کو۔ حالاں کہ قرآن میں صراحت ہے کہ تم کو بھی وہی دین دیا گیا ہے جو دوسرے نبیوں کو دیا گیا تھا اور اسی دین کو تمھیں قائم کرنا ہے (شوری ۱۳)

اصل یہ ہے کہ دین نام ہے پورے معنوں میں موحّد بننے کا۔ دین کا کامل ہونا دراصل توحید کا کامل ہونا ہے۔ کوئی شخص جتنا زیادہ اپنے رب کو پالے اتنا ہی اس نے اپنے دین کو کامل کیا اور جس نے اپنے رب کو جتنا کم پایا اتنا ہی اس کا دین ناقص رہا۔ قانونی دفعات خواہ کتنی ہی زیادہ لکھ دی جائیں پھر بھی وہ دین کو مکمل نہیں کریں گی۔ مثال کے طور پر

قرآن میں اگر ساتویں صدی عیسوی کی دنیا سے متعلق سارے احکام وضوابط بالتفصیل درج کر دیئے جاتے جب بھی بہت سی قانونی باتیں لکھنے سے رہ جاتیں، جیسے سمندری قوانین، خلائی ضوابط وغیرہ۔ کیوں کہ ان مسائل کا اُس وقت کوئی وجود ہی نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کامل کا یہ مطلب لیا جائے تو اسلام بھی دین کامل نظر نہ آئے گا۔

امیر ہمدانی کی مثال

مذکورہ اسلامی طریق کار کی ایک مثال کشمیر کی تاریخ میں پائی جاتی ہے۔ کشمیر کو عام طور پر لوگ اس کے قدرتی حسن کی وجہ سے جانتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں اس سے بھی زیادہ بڑی چیز موجود ہے۔ یہ اسلامی طریق کار کا وہ نمونہ ہے جو میر سید علی ہمدانی (۱۳۱۴-۱۳۸۴ء) کی زندگی میں ملتا ہے۔ موصوف نے، جن کو کشمیری عام طور پر "امیر کبیر" کہتے ہیں اپنے عمل سے ایک عظیم قابل تقلید نمونہ قائم کیا ہے جس کی مثال حالیہ صدیوں میں کم ملے گی۔ کشمیر اپنے قدرتی مناظر کی وجہ سے اگر جنت نظیر ہے تو اپنے تاریخی نمونہ کے ذریعہ وہ ہم کو اسلام کے طریق دعوت کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو اس سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸) نے امیر کبیر کی بابت کہا تھا:

دستِ او معمار تقدیر امم

امیر کبیر کی بابت یہ الفاظ صد فی صد درست ہیں۔ موجودہ مسلم کشمیر زیادہ تر آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مگر امیر کبیر نے یہ کام "شمشیر و سناں" یا "بازمانہ ستیز" کے ذریعہ نہیں کیا جو موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ رہا ہے۔ انھوں نے یہ کامیابی "شمشیر و سناں" کو ترک کر کے حاصل کی۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ ——— اسلام کو زندہ کرنا چاہتے ہو تو مقابلہ آرائی کے ذہن کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دو، مذہبی اور سیاسی جھگڑے کھڑے کرنے سے مکمل پرہیز کرو۔ اس کے بعد تم کو خدا کی نصرتیں ملیں گی اور اسلام اور مسلمانوں کو عزت و سربلندی حاصل ہوگی۔

میر سید علی ہمدانی ایران کے رہنے والے اور تیمور لنگ (۱۳۳۵-۱۴۰۵ء) کے ہم عصر تھے۔ شاہ تیمور ان سے کسی بات پر ناراض ہو گیا اور ان کو ایران سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اب امیر کبیر کے لئے ایک راستہ یہ تھا کہ وہ تیمور لنگ کے خلاف جہاد کا نعرہ لگائیں اور ایران میں حکومت صالحہ قائم کرنے کی جد وجہد کریں خواہ اس کے نتیجہ میں ان کو شہید ہو جانا پڑے۔ مگر امیر کبیر نے سیاسی تصادم سے پرہیز کیا۔ وہ اپنے چالیس ساتھیوں کو لے کر اپنے وطن ہمدان سے نکل پڑے۔ افغانستان ہوتے ہوئے یہ قافلہ ۷۸۱ھ میں کشمیر پہنچا جس کو امیر کبیر اس سے پہلے ۷۶۲ھ میں سیاحت کے دوران دیکھ چکے تھے۔

کشمیر پہنچ کر دوبارہ موقع تھا کہ یہاں سے شاہ تیمور کے خلاف سیاسی تحریک چلائی جائے۔ تیمور کے معاصرین میں ایسے لوگ تھے جو سیاسی وجوہ سے اس سے بغض رکھتے تھے۔ امیر کبیر ان کے ساتھ متحدہ محاذ بنا کر تیموری اقتدار کو ختم کرنے کی مہم جاری رکھ سکتے تھے۔ مگر امیر کبیر نے اس قسم کی کسی بھی کارروائی سے مکمل پرہیز کیا۔ اسی طرح قیادت کا ایک اور راستہ ان کے لئے پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ یہ اس وقت کے کشمیری مسلمانوں کی اقلیت کے معاشی اور سماجی حقوق کا مسئلہ تھا۔ اس وقت کشمیر میں اگرچہ ایک مسلم خاندان کا راج تھا۔ مگر کشمیری مسلمان ریاست میں ایک کمزور اور غریب اقلیت

کی حیثیت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ ان سے جبراً بت خانوں کے نذرانے وصول کئے جاتے تھے۔ امیر کبیر ان کی طرف سے حقوق طلبی کی مہم چلا کر فی الفور مسلمانوں کے قائد بن سکتے تھے۔ مگر امیر کبیر نے اس قسم کی "ملی سیاست" سے بھی کوئی سروکار نہ رکھا۔

اسی طرح امیر کبیر کے لئے ایک راستہ یہ تھا کہ وہ "انسانیت" کے پیام پر بن کر اٹھیں اور ریاست کے مختلف فرقوں کو امن کے ساتھ رہنے کا وعظ سنائیں۔ ایسا کر کے وہ بہت جلد دونوں فرقوں کے درمیان ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل کر سکتے تھے۔ کیوں کہ ہر وہ تحریک لوگوں کو بہت پسند آتی ہے جس میں حق و باطل کا مسئلہ چھیڑے بغیر رواداری اور میل جول کا اپدیش دیا گیا ہو۔ جس میں کوئی اپنے اوپر زد پڑتی ہوئی محسوس نہ کرے۔ مگر اس قسم کی تحریک جلسوں اور تقریروں کی سطح پر خواہ کتنی ہی کامیاب نظر آئے، عملی نتیجہ کے اعتبار سے وہ ہمیشہ بے فائدہ ثابت ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ اس کام کا اسلامی دعوت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کا کام، اپنی ظاہری خوش نمائی کے باوجود، صرف مسائل دنیا کی طرف متوجہ کرنے کا کام ہے۔ جب کہ اسلامی دعوت کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو مسائل آخرت کی طرف متوجہ کیا جائے۔

امیر کبیر کا پروگرام نہ شاہ تیمور کے خلاف ردعمل کے طور پر بنا اور نہ کشمیری مسلمانوں کے وقتی حالات سے متاثر ہو کر۔ اس وقت کشمیر میں ایک مسلم راجہ (سلطان قطب الدین) کی حکومت تھی۔ اس کے اندر بہت سی اعتقادی اور عملی خرابیاں موجود تھیں۔ آپ نے سلطان کو ناصحانہ انداز کے خطوط بھیج کر اصلاح حال کی طرف متوجہ کیا۔ تاہم آپ نے اس کو اقتدار سے ہٹانے اور اس کی جگہ صالح حکمراں لانے کی کوئی مہم نہیں چلائی۔ امیر کبیر نے ان تمام عوامل سے اوپر اٹھ کر سوچا اور خود اپنے مثبت فکر کے تحت اپنا پروگرام بنایا۔ پھر یہ پروگرام بھی کوئی کنونشن یا کانفرنس کا انعقاد نہ تھا۔ یہ تمام تر ایک خاموش عملی پروگرام تھا۔ وہ اور ان کے رفقاء ریاست کے مختلف حصوں میں پھیل گئے اور خاموشی کے ساتھ یہاں کے باشندوں میں اسلام کی تبلیغ کرنے لگے۔ انھوں نے کشمیریوں کی زبان سیکھی۔ یہاں کے حالات سے اپنے کو ہم آہنگ کیا۔ اجنبی دیس میں اپنے لئے جگہ بنانے کی مصیبتیں اٹھائیں۔ اس طرح صبر و برداشت کی ایک زندگی گزارتے ہوئے اپنے خاموش دعوتی مشن کو جاری رکھا۔

کشمیر میں اسلام

کشمیر میں اسلام کا ابتدائی داخلہ اگرچہ محمد بن قاسم (۹۶ - ۶۱ ھ) کے زمانہ میں ہوا۔ تاہم ریاست میں اسلام کی نمایاں اشاعت غالباً سید بلبل شاہ قلندر ترکستانی کے وقت سے شروع ہوئی۔ سات سو سال پہلے کشمیر میں ایک بودھ راجہ ریخن شاہ کی حکومت (۲۳ - ۱۳۲۰ء) تھی۔ یہ راجہ سید بلبل شاہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ اس زمانہ میں لوگ اپنے سرداروں کے دین پر ہوتے تھے۔ راجہ کو دیکھ کر کشمیریوں کی ایک تعداد مسلمان ہو گئی۔ حضرت بلبل شاہ صاحب فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے۔ چنانچہ اس وقت جو لوگ مسلمان ہوئے، ان کے اثر سے وہ حنفی مسلک کے مطابق عبادت کرنے لگے۔ میر سید علی ہمدانی کی تبلیغ سے جب کشمیری باشندے مسلمان ہونے لگے تو ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ "یہ نو مسلم کس فقہی مسلک پر عبادت کریں؟" حضرت امیر کبیر خود شافعی المسلک تھے اور اس وقت کشمیر میں جو مسلمان تھے وہ حنفی

المسلک۔ امیر کبیر اگر ان نومسلموں کو اپنے فقہی مسلک کی تلقین کرتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ مسلمانوں میں دو گروہ بن جاتے۔ ایک امیر کبیر کے ہاتھ پر اسلام لائے ہوئے لوگوں کا۔ دوسرا بقیہ کشمیری مسلمانوں کا۔ حنفی اور شافعی کا یہ جھگڑا نہ صرف دونوں کے مدرسوں اور مسجدوں کو الگ کر دیتا بلکہ اپنے اپنے فقہی مسلک کی صحت و افضلیت ثابت کرنے کی کوشش میں اصل تبلیغی کام پس پشت پڑ جاتا۔ کشمیری مسلمان دو جتھوں کی صورت اختیار کر کے ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیتے۔ وہ قوت جو دینِ حق کی اشاعت میں صرف ہوتی آپس کے جھگڑوں میں برباد ہو جاتی۔ نسلیں گزر جاتیں مگر یہ اختلاف کبھی ختم نہ ہوتا۔

میر سید علی ہمدانی نے صرف اساسات دین کی تبلیغ کی۔ انھوں نے فقہی مسالک کی کوئی بحث نہیں چھیڑی۔ انھوں نے یہاں تک احتیاط کی کہ اپنا شافعی المسلک ہونا اپنے پیروؤں سے پوشیدہ رکھا۔ عام مسلمانوں کے ساتھ خود بھی حنفی طریقہ پر نماز پڑھتے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اسی کے مطابق عبادت کرنے کی تلقین کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر میں ان کو کام کرنے کے مکمل مواقع ملے۔ ان کو ہر طبقہ کا تعاون حاصل رہا۔ غیر متعلق مسائل کے الجھاوؤں سے وہ بالکل محفوظ رہے۔ اپنی دعوتی جد و جہد میں ان کو اتنی کامیابی ہوئی کہ کشمیر دائمی طور پر مسلم اکثریت کا علاقہ بن گیا۔ امیر کبیر اگر یہاں حنفی مسلک اور شافعی مسلک کی بحثیں چھیڑتے تو ان کو یہ کامیابی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور۔ بالفرض اگر کوئی کامیابی ہوتی تو وہ بھی اس قیمت پر کہ ان کی آمد کشمیری مسلمانوں کو دو متحارب فریقوں میں بانٹ دینے کا سبب بن جاتی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو لوگ اس راہ پر چلیں ان کا کسی سے اختلاف نہیں ہوگا۔ بامقصد آدمی کے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ خود امیر کبیر کے حالات بتاتے ہیں کہ ۷۳ سال کی عمر میں موضع پکھلی (کشمیر) کے کچھ شریر لوگوں نے آپ کو زہر دے دیا۔ اور اسی میں آپ کا انتقال ہوا۔ تاہم اس قسم کا اختلاف محض ذاتی وجوہ سے ہوتا ہے اور وہ داعی کو صرف ذاتی نقصان پہنچاتا ہے جب کہ ایک غیر دینی مسئلہ کو دینی بنانا دین میں فرقہ بندی کو جنم دیتا ہے جو اتنا بڑا جرم ہے کہ کسی گروہ سے وہ تمام نعمتیں چھن جاتی ہیں جو کتاب الٰہی کا حامل ہونے کی حیثیت سے اس کے لئے مقدر کی گئی تھیں۔

امیر کبیر سید علی ہمدانی کی زندگی اسلامی طریق کار کی نہایت کامیاب عملی مثال ہے۔ اپنی دعوتی جد و جہد میں انھوں نے جس چیز کو مرکز توجہ بنایا وہ توحید و آخرت کا مسئلہ تھا۔ اس کے علاوہ سیاسی مسئلے، معاشی مسئلے، فقہی مسئلے انھوں نے بالکل نہیں چھیڑے۔ وہ اصل دین پر یکسو رہے نہ کہ متفرقات دین پر۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے نزدیک سیاست اور معاش دین سے خارج تھی یا عبادت کی ادائگی میں آداب اور مناسک کے لحاظ کو وہ غیر ضروری سمجھتے تھے۔ وہ ہر ایک کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے اور ہر چیز کو انھوں نے بالفعل اختیار کیا۔ تاہم انھوں نے جس چیز کو دعوت و اقامت کا عنوان بنایا وہ متفق علیہ دین تھا نہ کہ سبل متفرقہ۔

امیر کبیر فقہ کی تمام شرائط کے مطابق مکمل نماز پڑھتے تھے مگر فقہی اختلافات کے پیچھے پڑنا، ایک مسلک کو غلط ثابت کر کے اس کی جگہ دوسرے مسلک کی ترجیح قائم کرنا، انھوں نے اپنا مشن نہیں بنایا۔ اسی طرح معاشیات کے سلسلے میں انھوں نے ایک راستہ اختیار کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ اور ان کے ساتھی زندہ کیسے رہ سکتے تھے۔ مگر معاشی مسائل کو حل کرنے

یا اس کو پوری ملت کا مشترک مسئلہ بناکر اس کی بنیاد پر تحریک چلانے کا طریقہ انھوں نے اختیار نہیں کیا۔ اسی طرح سیاست کا نعرہ نہ لگانے کے باوجود ان کی ایک سیاست تھی، بلکہ نہایت گہری سیاست تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کشمیر کو یہ مقام نہ ملتا کہ یہاں صرف مسلم وزارت بنتی ہے۔ دوسری وزارت بننے کا یہاں کوئی سوال نہیں۔ کشمیر کو یہ سیاسی عطیہ تمام تر امیر کبیر کی دین ہے۔ اگرچہ معروف معنوں میں انھوں نے کوئی سیاسی پروگرام اپنی زندگی میں نہیں چلایا اور نہ کوئی ان کو "سیاسی لیڈر" کی حیثیت سے جانتا ہے —— امیر کبیر ہر چیز کے پیچھے نہیں دوڑے۔ انھوں نے صرف یہ کیا کہ حقیقت کا سرا پکڑ لیا۔ اس کے بعد سب چیزیں خود بخود ان کی طرف آتی چلی گئیں۔

خلاصہ

دین میں اصل اہمیت کی چیز یہ ہے کہ آدمی شرک سے مکمل طور پر بچے اور صرف خدائے واحد کو اپنا مرکز توجہ بنائے۔ اسی سے پوری زندگی سدھرتی ہے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ اسی کی سب سے زیادہ تاکید کریں اور اسی کو دعوت و تبلیغ کی بنیاد بنائیں۔ اس کے بعد تفصیلی معاملات میں دین کے جو تقاضے مطلوب ہیں ان میں حالات کے مطابق کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ تاہم ان چیزوں کو دعوتی مہم کے طور پر اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری نوعیت کے کسی مسئلہ کو جب آدمی مدارِ دعوت بناتا ہے تو گویا وہ ایک فرعی مسئلہ کو اساسی مسئلہ کے مقام پر رکھتا ہے۔ اس قسم کا کوئی عمل دین کے نظام کو درہم برہم کر دینے والا ہے۔

آپ ایک خاص فقہی مسلک کو اپنے لئے پسند کرتے ہیں تو کیجئے۔ مگر اس کی بنیاد پر مسجد اور مدرسہ نہ بنایئے۔ آپ ایک طریقہ کے تقدس کے قائل ہیں تو قائل رہئے۔ مگر اس کو دوسروں کی اسلامیت ناپنے کا پیمانہ مت قرار دیجئے۔ کسی مسلم حکمران نے "بنیادی جمہوریت" کا نظام قائم کر رکھا ہے اور آپ اس کے مقابلہ میں "عوامی جمہوریت" کو صحیح سمجھتے ہیں تو ناصحانہ انداز میں اپنی بات دوسروں تک پہنچایئے۔ مگر اس مسئلہ کو لے کر ملک کو سیاسی اکھاڑا مت بنایئے۔ اگر آپ کو نظر آتا ہے آپ کی ملت کے معاشی اور سماجی حقوق "پامال" ہو رہے ہیں تو لوگوں میں یہ جذبہ ابھاریئے کہ وہ قوت و امانت (قصص ۲۶) کے ذریعہ اپنا مسئلہ آپ حل کرنے کی کوشش کریں۔ مگر اس کو لے کر مفروضہ ظالموں کے خلاف احتجاج اور مطالبات کا طوفان برپا نہ کیجئے —— اس قسم کی ہر تحریک دین کے سبیلِ واحد کو چھوڑ کر سُبلِ متفرقہ پر دوڑنا ہے ایسی کوششیں خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ کی جائیں، عملاً صرف فساد برپا کرتی ہیں۔ وہ نہ صرف آدمی کو حقیقی خداپرستی سے دور کر دیتی ہیں، بلکہ امت کو مختلف ٹولیوں اور جماعتوں میں تقسیم کر دینے کا باعث بنتی ہیں۔ اور امت کا تقسیم ہونا اللہ تعالیٰ کو اتنا زیادہ ناپسند ہے کہ ایسے لوگوں سے اللہ کی اجتماعی نصرتیں اٹھالی جاتی ہیں اور وہ اس وقت تک واپس نہیں آتیں جب تک امت اپنی تفریقات کو ختم کر کے دوبارہ امتِ واحدہ نہ بن جائے۔

نوٹ: یہ مقالہ جمعیۃ اہل حدیث جموں و کشمیر کے سالانہ اجلاس بمقام سری نگر کے موقع پر ۳۰ جولائی ۱۹۸۰ کو پڑھا گیا۔

زلزلہ قیامت

از
مولانا وحید الدین خاں

جس کو پڑھ کر دل دہل اٹھیں
اور آنکھیں آنسو بہائیں

صفحات ۶۴ قیمت تین روپے

عقلیات اسلام

از
مولانا وحید الدین خاں

اسلام کے خلاف جدید اعتراضات کا
علمی و عقلی جواب

صفحات ۴۸ قیمت دو روپے

سوال و جواب

ایک بزرگ "ظہور اسلام" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"آپ نے سیاسی قوت کی فراہمی کو تکمیل دین قرار دیا ہے۔ گویا جب جب بھی سیاسی قوت اسلام کی پشت پر نہیں رہے گی، دین غیر کامل ہو جایا کرے گا۔ آپ لکھتے ہیں کہ ہر نبی کو اپنے زمانہ میں کامل دین دیا گیا۔ مگر سیاسی قوت سب کو نہیں دی گئی۔ پھر تطبیق کیسے ہوگی" (۔۔۔ بھوپال)

جواب

یہ تبصرہ ظہور اسلام کے صفحہ ۶ اور صفحہ ۱۰۱ سے متعلق ہے۔ مگر مذکورہ سوال میں ہماری بات کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ ہم نے جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ آیت کا فقرہ (الیوم یئس الذین کفروا من دینکم) بتا رہا ہے کہ اس موقع پر الیوم اکملت لکم دینکم سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد ہے منکرین خدا کا "تمھارے دین سے مایوس ہو جانا"۔ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ آیت فتح مکہ کے بعد اتری اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے غالب آجانے کی وجہ سے دشمنان دین مایوس ہو گئے کہ اب وہ اس دین کو باطل نہ کر سکیں گے۔

اسلام کا یہ غلبہ اتنے بڑے پیمانہ پر ہوا کہ مرکز اسلام (عرب) سے دوسرے تمام ادیان کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ نیز اس کے آس پاس ایشیا اور افریقہ کے درجنوں ممالک مسلم ممالک میں تبدیل ہو گئے۔ اس طرح جزیرۂ عرب اور اس کے اردگرد ایک ایسا اسلامی خطہ وجود میں آگیا جو دائمی طور پر اسلام کی حفاظت کا ضامن بن گیا۔ اس سیاسی اہتمام کے علاوہ دین کی حفاظت کی پشت پر دوسرے بہت سے تاریخی اسباب بھی جمع کر دیئے گئے جس کے بعد اب یہ امکان مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے کہ منکرین کسی بھی حال میں دین خدا کو باطل کر سکیں جس طرح خاتم النبین سے پہلے کے دور میں وہ کرتے رہے ہیں۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ قرآن چودہ سو برس بعد بھی ٹھیک اسی طرح محفوظ ہے جیسا کہ وہ دور اول میں نازل ہوا تھا۔ جب کہ یہی بات اس سے پہلے کسی آسمانی کتاب کے لئے ممکن نہ ہو سکی تھی۔

—— ۲ ——

ایک کرم فرما لکھتے ہیں کہ الرسالہ میں نقد لاذع ہوتا ہے" (یعنی تکلیف دہ تنقید)

جواب

ہمارے نزدیک تنقید کی دو قسمیں ہیں۔ ایک لفظی ریمارک۔ دوسرے علمی تنقید۔ لفظی ریمارک ہر حال میں غلط ہے۔ خواہ وہ سنجیدہ الفاظ میں ہو یا تیر ونشتر کی زبان میں۔ مگر علمی تنقید عین مطلوب ہے۔ علمی تنقید سے مراد وہ تنقید ہے جو جدید اصطلاح کے مطابق تجزیاتی ہو اور لازماً سنجیدہ زبان میں کی گئی ہو۔

ایک شخص جو اپنے خلاف تنقید سننا نہ چاہتا ہو، وہ جب ایسی تنقید پڑھے گا جس میں اس کے اوپر زد پڑ رہی ہو تو وہ اس کو "نقد لاذع" محسوس ہوگی۔ بلکہ تنقید اگر دلیل اور برہان کی زبان میں ہے تو وہ اس کے لئے اور زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوگی۔ کیوں کہ اس کو محسوس ہوگا کہ وہ اپنے خلاف ایسی تنقید سے دوچار ہے جس کو وہ دلائل کے ذریعہ رد نہیں کر سکتا۔

آدمی اگر صحیح معنوں میں حق پرست ہو تو وہ تنقید سے خوش ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ اس کے لئے سچائی کا پردہ کھولنے والی ثابت ہوتی ہے اور اگر وہ حق کے نام پر کسی اور چیز کی پرستش میں مبتلا ہو تو وہ تنقید

سن کر بگڑ اٹھتا ہے۔ کیوں کہ تنقید اس کے محبوب دیوتاؤں کو اس مقام بلند سے ہٹاتی ہوئی نظر آتی ہے جہاں اس نے انھیں بطور خود بٹھا رکھا ہے۔

—— ۳ ——

ستمبر کا الرسالہ پیش نظر ہے۔ اس سے پہلے آپ نے کسی کا قول — الدنیا مزرعۃ الآخرۃ کو رسول کریمؐ کی طرف منسوب کر دیا۔ میں نے آپ کو متوجہ کیا تھا کہ اگر یہ حدیث ہے تو آپ اس کا حوالہ دیں اور اگر نہیں ہے تو اس کا ذکر الرسالہ میں کر دیں۔ الرسالہ میں جہاں تاریخ پیدائش اور دوسرے حوالوں کا کافی اہتمام ہوتا ہے یہ بڑے افسوس کی بات ہوتی ہے کہ کسی قول کو نقل کر کے بلا تحقیق اس کو حدیث رسول کہہ دیا جائے۔ کم از کم یہ "آخرت رخی زندگی" کے حامل انسان کا کام تو نہیں ہوتا۔ ستمبر کے الرسالہ میں صفحہ ۱۸ پر آپ نے تخلقوا باخلاق اللہ کو حدیث کے الفاظ کہا ہے۔ آپ نے اس کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ جہاں تک میری تحقیق ہے یہ حدیث رسول نہیں ہے۔ اور الرسالہ میں جہاں ہر چیز تحقیق کی کسوٹی پر کہنے کا ڈنکا پیٹا جاتا ہے اور اس امتیاز کا پندار ہر جملہ سے ٹپکتا ہے وہاں حدیث کے معاملہ میں کوتاہیاں زیب نہیں دیتیں۔ مجھے یقین ہے کہ آخرت میں اگر ہر قول اور فعل کے حساب دینے کا یقین ہو تو آپ ان دونوں فقروں کے تعلق سے آئندہ شمارے میں حوالے کی تصریح کریں گے۔ یا یہ اعتراف کریں گے کہ یہ فقرے اقوال رسول میں سے نہیں ہیں۔ اور اس پر نشان دہی کئے جانے پر آخرت رخی زندگی کا ثبوت اس کے اعتراف سے قارئین کو دیں گے۔ (یکم ستمبر ۱۹۷۸)

(مولانا) محمد جمیل

تامل ناڈو اسلامک فاؤنڈیشن

تقی الدین خاں بہادر اسٹریٹ۔ مدراس ۵

جواب

الدنیا مزرعۃ الآخرۃ کے سلسلے میں آپ کے توجہ دلانے کے بعد تصحیح کر دی گئی تھی۔ تقابل کے لئے ملاحظہ ہو:

الرسالہ جنوری ۱۹۷۸ صفحہ ۱۰

ظہور اسلام صفحہ ۱۰۲

تخلقوا باخلاق اللہ کے سلسلہ میں آپ کے توجہ دلانے کا شکریہ۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں اس کی بھی تصحیح کر دی جائے گی۔

دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک خود اپنے لئے مفید ہوتا ہے

شیخ سعدی شیرازی (۶۹۱ — ۵۸۹ ھ) کی کتاب بوستاں کے شروع میں ایک حکایت درج ہے۔ اس کا عنوان ہے: "پند دادن کسریٰ ہرمزرا"۔ اس حکایت کے مطابق ایران کا بادشاہ نوشیرواں جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے اپنے جانشین ہرمز کو بہت سی نصیحتیں کیں۔ ان میں سے ایک نصیحت، سعدی کے الفاظ میں، یہ تھی:

مراعات دہقاں کن از بہر خویش — کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

یعنی چودھریوں اور سرداروں کے ساتھ رعایت کرو، اس سے خود تم کو فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ مزدور جب خوش دل ہو تو وہ کام زیادہ کرتا ہے۔

۔۔۔ مگر ان کے دل مردار سے زیادہ متعفن ہوں گے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لا تقوم الساعۃ حتی یبعث اللہ امراء کذبۃ ووزراء فجرۃ وامعوانا خونۃ وعرفاء ظلمۃ وقراء فسقۃ سیماھم سیمی الرھبان وقلوبھم انتن من الجیفۃ اھوائھم مختلفۃ فیفتح اللہ لھم فتنۃ غبراء مظلمۃ فیتھاوکون فیھا

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک وہ دور نہ آجائے جس میں جھوٹے حکمران، بُرے وزراء، بددیانت ملازمین حکومت، ظالم قائدین ظہور میں نہ آجائیں۔ اس زمانہ میں ایسے فاسق علماء ہوں گے جن کا ظاہر پارسا ؤں جیسا ہوگا اور ان کے دل مردار سے زیادہ متعفن ہوں گے۔ ان کی خواہشات ایک دوسرے سے الگ ہوں گی۔ اس زمانہ میں اللہ ایک ایسا اندھا فتنہ برپا کرے گا جس میں لوگ حیران و سرگرداں ہو کر رہ جائیں گے۔

یہ تاریخ کا نازک ترین دور ہوگا۔ اس دور کی پہچان یہ ہے کہ شخصی اور گروہی مصلحتوں کو سب سے زیادہ اہم سمجھا جانے لگے اور حق، اپنی تمام تابانیوں کے باوجود، انسانی آوازوں میں گڈمڈ ہو جائے۔ اس وقت کسی بندۂ خدا کو جو چیز بچائے گی وہ صرف خدا کی مدد ہے اور خدا کی مدد ملتی ہے تضرع اور انابت سے۔

ایک اقتباس

مسلمانوں کی تباہی کے سبب صرف دو ہیں
ایک، قرآن کو چھوڑ دینا۔ دوسرے، باہمی جنگ وجدال

شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب مالٹا کی چار سالہ جیل سے رہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے تو علماء کے ایک مجمع کے سامنے آپ نے بہت اہم بات ارشاد فرمائی۔ فرمایا:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لئے میں یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کردوں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی میں قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

وحدت امت، از مولانا مفتی محمد شفیع۔ شائع کردہ مکتبہ المنیر، فیصل آباد۔ پاکستان

روداد سفر

جمعیۃ اہل حدیث کی دعوت پر کشمیر کا سفر ہوا اور ان کے سالانہ اجلاس بمقام سری نگر (۲۹-۳۰ جولائی ۱۹۷۸) میں شرکت ہوئی۔ ایک ہفتہ قیام کے بعد ۱ اگست ۱۹۷۸ کو دہلی واپس آیا۔

جمعیۃ اہل حدیث کی کارروائیوں اور تقریروں میں زیادہ تر زور اثبات توحید اور رد شرک پر تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس خاص دینی خدمت کے معاملہ میں جمعیۃ اہل حدیث کو، دوسرے اسلامی حلقوں کے مقابلہ میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ جمعیۃ کے دفتر (بربر شاہ) پر بھی چند گھنٹے گزرے۔ کافی وسیع عمارت ہے جس میں جمعیۃ کے دفاتر کے علاوہ مسافر خانہ اور دار العلوم قائم کرنے کا منصوبہ ہے۔ جمعیۃ کے تحت مکتبہ مسلم عرصہ سے قائم ہے۔ اب اس کو از سر نو منظم کیا جارہا ہے۔ مکتبہ مسلم (بربر شاہ، سری نگر) نے ماہنامہ الرسالہ کی ایجنسی لے لی ہے۔ ادارہ الرسالہ کی دوسری تمام کتابیں بھی ان کے یہاں ہر وقت ملتی ہیں۔

انجمن اہل حدیث کا قیام سری نگر میں ۱۹۲۴ میں عمل میں آیا۔ اسی تنظیم نے ۱۹۴۳ میں جمعیۃ اہل حدیث جموں وکشمیر کی صورت اختیار کی۔ دستور کے مطابق اس کا مقصد توحید و سنت کی اشاعت ہے۔ مساجد کو مرکز بنا کر لوگوں کو فرائض و سنن سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ سال کے دوران مقامی اجتماعات کے علاوہ ہر سال ریاست کے کسی مقام پر سالانہ کانفرنس کی جاتی ہے۔ جمعیۃ کے اہتمام میں مختلف مقامات پر مدارس قائم ہیں۔ مرکزی درسگاہ کے طور پر الکلیۃ السلفیہ کا آغاز ۱۹۷۷ میں کیا گیا ہے۔ سری نگر میں ایک لائبریری بھی قائم ہے۔ جمعیۃ کا اخبار عرصہ سے نکل رہا ہے جس کا نام "مسلم" ہے۔ ۱۹۷۲ سے یہ ہفت روزہ کی صورت میں جاری ہے۔ جمعیۃ کا ۱۹۷۷-۷۸ کا بجٹ تین لاکھ روپے کا تھا۔

کانفرنس میں راقم الحروف نے ایک مقالہ مختصراً پڑھا۔ یہ مقالہ اپنی پوری شکل میں زیر نظر اشاعت میں شامل ہے۔

سری نگر میں داخل ہونے والے کسی باہر کے آدمی کو جو چیز چونکاتی ہے اس میں سے ایک وہ لال بورڈ ہے جو جگہ جگہ سڑکوں پر لگا ہوا ہے۔ اس پر سفید حرفوں میں لکھا ہوا ہے:

ہمارا مسلک: خود اعتمادی اور خدا اعتمادی

یہ دونوں باتیں جس قوم میں پیدا ہو جائیں اس کو ترقی اور کامیابی سے کوئی روک نہیں سکتا۔ اگرچہ یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ یہ الفاظ ابھی کشمیری قوم کے لئے "مسلک" سے زیادہ "منصوبہ" کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سری نگر میں کلیم اللہ خاں صاحب ایم۔ ایس۔ سی ایک سنجیدہ نوجوان ہیں۔ باقاعدہ سائنسی تعلیم کے علاوہ پرائیویٹ طور پر عربی زبان بھی سیکھی ہے۔ وہ شہر کے مختلف مقامات پر مطالعہ قرآن کے حلقے چلا رہے ہیں۔ اس میں شرکت کرنے والے زیادہ تر تعلیم یافتہ نوجوان ہیں، یہ لوگ روزانہ صبح یا شام کو جمع ہو کر قرآن کی تصحیح کرتے ہیں اور ترجمہ کے ذریعہ قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کے دو حلقوں کے اجتماع میں مجھے شرکت کا اتفاق ہوا۔ نوجوان لوگ جس دلچسپی اور سنجیدگی سے قرآن پر جھکے ہوئے تھے اس کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ امت کا سارا بگاڑ قرآن کو چھوڑنے کی وجہ سے ہے۔ یہ امت اگر دوبارہ قرآن کی رسی کو پکڑ لے تو یقیناً امت کے اندر ایک نیا انقلاب آ جائے۔

مجھ سے پوچھا گیا کہ مطالعہ قرآن کے رہنما اصول کیا ہیں۔ میں نے کہا یوں تو اس موضوع پر موٹی موٹی کتابیں لکھی گئی ہیں اور درجنوں علوم کی مہارت کو فہم قرآن کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ مگر قرآن کا اصل مقصد نصیحت ہے اور اس سے نصیحت حاصل کرنے کے لئے صرف ایک چیز کافی ہے، اور وہ ہے دعا۔ آپ قرآن کو اہتمام اور سنجیدگی کے ساتھ پڑھیں اور جہاں کوئی بات سمجھ میں نہ آئے، اللہ سے اس کے لئے دعا کریں۔

قرآن کا مصنف خود اللہ تعالیٰ ہے اور قرآن بتاتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے قریب ہے اور ہر وقت ان کی پکار کو سنتا ہے۔ پھر اس سے بڑی چیز اور کیا ہے جس پر قرآن فہمی کے سلسلے میں بھروسہ کیا جائے۔ قرآن کو سمجھنے کے لئے اللہ سے مدد طلب کرنا گویا خود کتاب کے مصنف سے کتاب کی تشریح پوچھنا ہے۔ اس سے بڑا خوش قسمت اور کون ہے جو کسی کتاب کا مطالعہ اس حال میں کر رہا ہو کہ کتاب کا مصنف ہر وقت اس کے پاس مراجعت کے لئے موجود ہو۔

یکم اگست کو چند گھنٹے اسلامک اسٹڈی سرکل کے مرکزی دفتر میں گزرے، نوجوان اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی بڑی تعداد جمع تھی۔ گفتگو زیادہ تر سوال و جواب کے انداز میں ہوئی۔ سوالات اگرچہ زیادہ تر تنقیدی نوعیت کے تھے تاہم ساری گفتگو اتنے خوش گوار ماحول میں ہوئی گویا ہم لوگ "کشمیری شہد" کے موضوع پر تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔ آخر میں میں نے کہا کہ قرآن و حدیث کے مطالعہ کے بعد ایمان و اسلام کی جو مختصر ترین تعریف میری سمجھ میں آئی ہے، وہ یہ کہ ابوجہل اور ابولہب کو جس خدا کے سامنے مرنے کے بعد کھڑا ہونا ہے، بندۂ مومن مرنے سے پہلے اپنے آپ کو اس خدا کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے۔ جنت انھیں لوگوں کے لئے ہے جو اپنے آپ کو اسی دنیا میں رب العالمین کے سامنے کھڑا کر دیں۔ جس کو آخرت میں عدالت الٰہی میں کھڑا کیا گیا، اس کے لئے ناکامی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

۲ اگست کا دن پہل گام میں گزرا۔ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر یہ خوبصورت پہاڑی مقام اپنے حیرت انگیز مناظر کے ساتھ جنت کی یاد دلاتا ہے۔ درختوں کی لامتناہی قطاروں کے درمیان جگہ جگہ خوبصورت مکانات، ان کے نیچے شفاف پانی کا بہتا ہوا دریا — گویا جنات تجری من تحتها الانهار اور مساکن طیبة فی جنات عدن کی تصویر ہے۔ خالص ہوا، سنہری دھوپ، نیلے آسمان کے اوپر مخمور بادلوں کے قافلے، اس قسم کے ناقابل بیان آفاقی مناظر کے درمیان ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جنت کی فضاؤں میں پہنچ گیا ہے، سارا وقت بے حد خوش گوار گزرا۔ مگر آخر میں کسی وجہ سے میرے سر میں درد شروع ہو گیا جو رفتہ رفتہ شدید ہو گیا۔ سری نگر واپس آ کر رات کو میں اپنی قیام گاہ پر لیٹا تو میری زبان پر یہ فقرہ تھا — "جنتی فضا اور ہر قسم کا سامان عیش کسی کو مل جائے جب بھی انسان اپنی کمیوں اور محدودیتوں کی وجہ سے ایک پورا دن بھی لطف و لذت کے ساتھ نہیں گزار سکتا۔ جنتی زندگی آخرت کی ابدی زندگی ہی میں ممکن ہے جہاں اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے "حزن اور خوف" کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گا۔

میں سری نگر میں ایک مقام پر تھا۔ ایک بوڑھے میاں آئے اور میرے ایک ساتھی کے قریب جا کر اس کے کان میں پوچھنے لگے: "یہ کوئی درویش ہیں؟"۔

درویش کا لفظ مسلمانوں میں اور خاص طور پر کشمیریوں میں خدا کے لفظ سے بھی زیادہ پرکشش ہے کیسی عجیب بات ہے۔ لوگ درویشوں کی تلاش میں مصروف ہیں۔ مگر اس خدا سے ملنے کی کوشش نہیں کرتے جو عین ان کے قریب موجود ہے اور جس کو ہر وقت پایا جا سکتا ہے۔

سری نگر میں ایک صاحب میری قیام گاہ پر آئے۔ میں ان کو پہچانتا نہ تھا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ میں ان کے مکان پر چلوں۔ میں نے کہا کہ میری زندگی بے حد سادہ ہے۔ کھانے پینے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ پھر آپ مجھ کو مکان پر لے جا کر کیا کریں گے۔ تاہم ان کے شدید اصرار پر ان کے گھر گیا۔ پہلے میں سمجھا کہ شاید وہ مجھ کو "درویش" سمجھ کر اپنے گھر لے جا رہے ہیں۔ لیکن گھر پہنچ کر انھوں نے بتایا کہ آپ کی کتاب "الاسلام"، میں نے تقریباً پندرہ بار پڑھی ہے اور اس وقت بھی وہ میرے زیر مطالعہ ہے۔ میں نے اسلام کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے مگر اس کتاب نے پہلی بار مجھ کو اسلام سے متعارف کیا۔" دوسری طرف اسی سری نگر میں بعض ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جنھوں نے الاسلام کے مضامین پر اس قسم کی بحثیں کیں گویا اس کتاب میں ان کے لیے صرف بحث و مباحثہ کا مواد تھا نہ کہ کوئی دینی غذا —— ذہنیت کا فرق کس طرح ایک ہی چیز کو دو مختلف چیز بنا دیتا ہے۔

یہاں کے مختلف دینی حلقوں میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ عجیب بات ہے کہ خواہ کشمیر ہو یا غیر کشمیر، ہر جگہ ایک ہی منظر دکھائی دیتا ہے۔ کسی دینی حلقہ کو اساسات دین سے دل چسپی نہیں۔ ہر ایک کی سب سے زیادہ دلچسپی متفرقات دین سے ہے۔ حالاں کہ یہ قرآنی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔

کسی دینی حلقہ کا یہ حال ہے کہ اس کو انھیں موضوعات سے دل چسپی ہے جن میں سیاسی چاشنی ہو۔ کوئی اولیاء اور بزرگوں کی کراماتی داستانوں میں مشغول ہے۔ کوئی فقہی جزئیات سے متعلق اختلافی بحثوں میں اس طرح پڑا ہوا ہے گویا سارا دین اس کے نزدیک یہی اختلافی مباحث ہیں۔ ہر ایک نے دین کا کوئی جزئی یا اختلافی حصہ کاٹ لیا ہے اور رات دن اسی پر طبع آزمائی کر رہا ہے۔ حالاں کہ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ کے چند بندے جہاں جمع ہوں وہ خدا کی خدائی کا چرچا کریں۔ وہ آخرت کے دن کو یاد کریں، وہ اسلام کے فرائض و واجبات پر گفتگو کریں۔ وہ متفق علیہ دین کا چرچا کریں نہ کہ مختلف فیہ دین کا۔

ایک مجلس میں دعوتی کام کی اہمیت پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ ضرورت ہے کہ ایک ادارہ قائم کیا جائے جس کا کام صرف یہ ہو کہ وہ دعوتی مقاصد کے تحت لٹریچر شائع کرے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر مندرجہ ذیل چیزیں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ قرآن و حدیث کے ترجمے اور رسول اللہ اور صحابہ کے واقعات سادہ زبان میں۔

۲۔ غیر مسلموں کی لکھی ہوئی اسلامی کتابیں۔ مثلاً پروفیسر آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام، کونستان ورژیل جارج کی پرافٹ آف اسلام۔ اس طرح کی بہت سی نہایت عمدہ کتابیں ہیں۔ ان کو مختلف زبانوں میں شائع کیا جائے۔

۳۔ قبول اسلام کے بعد بہت سے لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں جن میں اپنے اسلام سے متاثر ہونے کی روداد درج کی ہیں۔ اس قسم کی کتابیں منتخب کر کے شائع کی

جائیں۔

یہ ایک وسیع میدان ہے۔ ہم نے مناظرانہ انداز میں بے شمار کتابیں چھاپ رکھی ہیں۔ مگر مثبت انداز کی کتابیں ابھی ہماری توجہ کا انتظار کر رہی ہیں۔

پہل گام کے پہاڑ پائنس (Pinus) کے درختوں سے بھرے ہوئے ہیں، یہ درخت سیدھے لمبے ہوتے ہیں، اوران کی ایک سو سے زیادہ قسمیں دنیا کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی شاخیں چھوٹی اور بہت کم پھیلی ہوتی ہیں۔ تاکہ تھوڑی جگہ میں زیادہ درخت اُگ سکیں۔ چوں کہ یہ درخت ڈھلوانوں پر ہوتے ہیں جہاں بارش کا پانی ٹھہرتا نہیں۔ اس لئے ان کی جڑیں زمین میں گہری نہیں جاتیں بلکہ اوپر اوپر دور تک پھیلتی ہیں تاکہ زیادہ بڑے رقبہ سے پانی کھینچ سکیں۔ ان کی پتیاں عام درختوں کی طرح چوڑی نہیں ہوتیں۔ اگر چوڑی ہوں تو زیادہ مقدار میں پانی خارج کر کے درخت کے لئے پانی کی قلت کا مسئلہ پیدا کر دیں۔ اس اس لئے ان کی پتیاں سوئی کی طرح پتلی ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر ان کو اصطلاح میں پتی کے بجائے سوئی (Needle) کہا جاتا ہے۔

پائنس کی پتیاں سرو کی طرح گچھے دار ہوتی ہیں۔ حیرت انگیز بات ہے کہ ان میں کامل حسابی تناسب پایا جاتا ہے۔ بعض نسل کے گچھوں میں ایک ڈنٹھل میں صرف ایک "سوئی" ہوتی ہے۔ کسی میں دو، کسی میں تین، کسی میں چار، کسی میں پانچ۔ پہل گام میں جو پائنس پایا جاتا ہے وہ پانچ سوئیوں والا (Pinus Wallichiana) ہے۔ میں نے بہت سی پتیاں لے کر ان کی سوئیاں گنیں۔ ہر ڈنٹھل میں پانچ ہی سوئیاں ملیں۔ نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔ کھرب ہا کھرب پتیوں میں یہ مکمل حسابی تناسب کیا اتفاقاً ہو گیا ہے۔ کیا اس کے پیچھے کسی منصوبہ ساز کی طاقت کام نہیں کر رہی ہے۔

سری نگر سے پہل گام جاتے ہوئے ایک مقام پر میرے ساتھی نے بتایا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں کشمیر کا زعفران پیدا ہوتا ہے۔ سڑک کے کنارے زمین جوت کر تیار کی جا رہی تھی۔ ابھی اس پر فصل نہیں بوئی گئی تھی۔ بظاہر دیکھنے میں اس کی مٹی ویسی ہی تھی جیسی دوسری مٹی۔ مگر چند کیلومیٹر کا یہ قطعہ نہ صرف کشمیر بلکہ ساری دنیا میں اپنی خصوصیات کے اعتبار سے نرالا تھا۔ یہاں وہ قیمتی زعفران پیدا ہوتا ہے جو دنیا بھر میں کہیں اور پیدا نہیں ہوتا۔ دو کھیت بظاہر ایک ہی جیسے ہیں، مگر ایک میں جھاڑ جھنکاڑ اگتا ہے اور دوسرے میں زعفران۔

یہی حال انسانوں کا ہے۔ دو انسان بظاہر دیکھنے میں ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ایک کے سامنے حق کے دلائل آتے ہیں تو وہ اس کے قلب کو روشن کر دیتے ہیں۔ دوسرے کے سامنے آتے ہیں تو وہ صرف اس کے اندھیروں میں اضافہ کرتے ہیں۔ ایک کے یہاں اس سے حق کا چمنستان اُگ آتا ہے اور دوسرے کے یہاں صرف جھاڑ جھنکاڑ۔

×××××××××××××××××××××

زلزلۂ قیامت

از مولانا وحید الدین خاں

ظہور اسلام

از

مولانا وحید الدین خاں

قیمت بارہ روپے

"کتاب ظہور اسلام پڑھی گئی ۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں قرآن اور تاریخ اسلام پڑھ رہا ہوں ۔ برسوں سے اسلام سے متعلق کتابیں بازار میں آرہی ہیں مگر اس کے مقابلہ میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس کا تقابل کیا جاسکے۔ آپ کی فکر و نظر۔ قوت استدلال۔ تقابلی تعارف اور سائنٹفک معیار اس نوعیت کا ہے کہ جو کتابیں پڑھی گئیں وہ بالکل اکارت ہوگئیں۔
کسی کتاب یا لٹریچر کو پڑھنے کے لئے ایک خاص فہم کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ تعصب آگے آگے آکر کتاب کو بے معنی کر دیتا ہے۔ مگر یہ کتاب پڑھنے کے بعد کوئی طرز فکر کا آدمی کیوں نہ ہو بغیر داد دیئے نہیں رہ سکتا، اس لئے کہ اس کتاب میں تمام مذاق کا ذخیرہ موجود ہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد آدمی پر سکوت و محویت غالب ہوجاتی ہے اور آئندہ کے تعلق سے سوچ میں پڑ جاتا ہے۔
کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قرآن کے تاریخی واقعات ۔ غزوات ۔ سیرت، صحابہ کا عمل قیاس ۔ اجتہاد وغیرہ کے مسائل جمع ہوگئے ہیں۔ کتاب بلا مبالغہ اچھی نہیں بلکہ ایک نعمت ہے اور ایک بصیرت کا کام دے سکتی ہے ۔ اس کی افادیت کے لحاظ سے تمام زبانوں میں ترجمہ کیا جانا چاہئے اور ترجمہ اس انداز سے کیا جائے کہ اس کی معنویت برقرار رہے"

(مولانا) محمد فخر الدین خطیب، میدک ۹ جولائی ۱۹۷۸

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

تعارف وتبصرہ

اسلامی سیاست یا سیاسی اسلام

از مولانا حکیم ابوالحسن عبیداللہ خاں

صفحات ۳۰۴ قیمت چھ روپے

پتہ : محمد رمضان نیوز پیپر ایجنسی
نزد روزنامہ آفتاب۔ سری نگر۔ کشمیر
۲۔ مکتبہ مسلم۔ بربرشاہ۔ سری نگر
۳۔ غلام نبی ڈگہ۔ نئی سڑک۔ گڈ اہل میر۔ سری نگر

زیر نظر کتاب کا موضوع موجودہ زمانہ کی وہ تحریکیں ہیں جنھوں نے اسلام کی سیاسی تعبیر کی اور انتخابی سیاست کے ذریعہ اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کی۔

مذکورہ تحریکوں کا کہنا ہے کہ اسلام ایک ہمہ گیر نظام ہے۔ انفرادی، معاشرتی اور سیاسی تمام معاملات زندگی سے اس کا تعلق ہے۔ اور ضروری ہے کہ تمام شعبوں کے ساتھ اس کو قائم کیا جائے۔ مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ بات بجائے خود صحیح ہے کہ زندگی کا ہر شعبہ شریعت اسلامیہ کے اوامر و نواہی کی گرفت میں ہے۔ "مگر اللہ نے کسی ایک فرد امت کو اس بات کا مکلف نہیں کیا کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں قدم رکھے۔" کیا حضورؐ نے اپنی پوری زندگی میں وآتوا الزکوٰۃ یا وآتو حقہ یوم حصادہ پر عمل کیا۔ کتنے قرآنی احکام ہیں جن سے آپ کو زندگی بھر واسطہ نہیں پڑا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے شادی نہیں کی۔ وغیرہ۔ بات یہ ہے کہ فرد واحد شریعت کے جملہ احکام کا مخاطب نہیں ہوتا۔ کل دین کی پیروی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا تعلق جس خاص شعبہ زندگی سے ہے اس میں کتاب شریعت کے جملہ اوامر ونواہی کی پابندی کرے اپنے شعبۂ معیشت سے باہر قدم رکھنے کا شرعاً کوئی بھی مکلف نہیں (۱۷)

کتاب میں مفید علمی نکتے بھی آگئے ہیں، مثلاً غزوۂ بدر کے ستر قیدیوں کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب سے مشورہ فرمایا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے ہوئی کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب کو قتل کر دیا جائے۔ پہلی رائے کی مصلحت یہ تھی کہ مسلمانوں کے پاس مال نہ ہونے کی وجہ سے سامان جنگ کی کمی تھی۔ فدیہ کی رقم سے سامان جنگ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ دوسری رائے کی مصلحت یہ تھی کہ سرداروں کی گرفتاری کی وجہ سے گویا کفر کی پوری طاقت مسلمانوں کی مٹھی میں آگئی تھی۔ ان کا خاتمہ کرکے اسلام کے خلاف مزاحمت کا مکمل خاتمہ کیا جا سکتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اسیروں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد قرآن میں آیت اتری جس میں کہا گیا لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم (انفال ۶۸) اس آیت کی تفسیر میں بڑی لمبی بحثیں کی گئی ہیں۔ مصنف نے نہایت عمدہ اور فطری تشریح حسب ذیل الفاظ میں کی ہے۔ (صفحہ ۹۳)

"اگر اللہ کی کتاب تقدیر تمھاری سرفرازی و ظفرمندی کا فیصلہ پہلے ہی سے نہ کر چکی ہوتی تو تمھیں اس غلط سیاسی فیصلے (فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑنے) کے باعث (دنیا میں) سخت مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا۔"

سورج ایک بے حد روشن حقیقت ہے۔ مگر جو شخص اپنی آنکھیں بند کر لے، اس کے لئے سورج کا کوئی وجود نہیں۔

زندہ انسان کے مقابلہ میں لاش زیادہ پسندیدہ

"ایک زمانہ آئے گا کہ مومن کی نسبت لوگ مردار لاش کو زیادہ پسند کریں گے۔ اس لئے کہ مومن ان کو اچھے کام کی تلقین کرے گا اور برے کام سے روکے گا (حدیث)

"مردار لاش" سے مراد خوشامدی آدمی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تنقید کرنے والا لوگوں کی نظر میں مبغوض ہو جائے گا۔ ان کا سب سے زیادہ پسندیدہ شخص وہ ہوگا جو ان کے سامنے خوشامدی باتیں کرے اور ان کے خود ساختہ معبودوں کی شان میں تعریفی قصائد بنا بنا کر کے سناتا رہے۔

تاثر جتنا زیادہ شدید ہو الفاظ اتنے ہی کم ہو جاتے ہیں

مسٹر لزلی براؤن شمالی انگلستان کے ایک ٹرک ڈرائیور ہیں۔ وہ اولاد سے محروم تھے۔ ان کی بیوی کے جسمانی نظام میں بعض حیاتیاتی فرق کی وجہ سے دونوں کا مادۂ حیات رحم مادر میں یکجا نہیں ہوتا تھا وہ اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے کہ عین وقت پر سائنس نے ان کی مدد کی۔ لندن کے ڈاکٹر پیٹرک اسٹیپٹو جو برسہا برس سے اس میدان میں تجربہ کر رہے تھے انھوں نے اپنی لیبورٹری میں لزلی براؤن کا مادۂ تولید (اسپرم) نکالا اور مسز براؤن کے جسم سے ایک بیضہ لیا۔ دونوں کو انھوں نے ایک خصوصی قسم کے ٹسٹ ٹیوب میں رکھا۔ قدرتی قانون کے تحت وہ دونوں مل کر زرخیز ہو گئے۔ چار روز کے بعد ڈاکٹر نے اس کو مصنوعی طور پر رحم مادر میں پہنچا دیا۔ اب رحم مادر میں اس "بچہ" کی پرورش ہونے لگی۔ تجربہ کامیاب رہا۔ اگست ۱۹۷۸ میں تاریخ کا پہلا "ٹسٹ ٹیوب بے بی" وجود میں آگیا۔ اس پورے عمل کی تصویریں لی جاتی رہیں، اور پیدائش کے بعد اس کو مکمل طور پر ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔

ٹیوب بے بی (لوئی براؤن) کے باپ سے اس پورے واقعہ پر تبصرہ کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے کہا: "بیوٹی فل" یعنی بے حد حسین۔ اس ایک لفظ کے سوا وہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔

غم کی گھٹنا خوشی سے زیادہ بڑی گھٹنا ہوتی ہے۔ انڈین نیوی کے ایک افسر کی اہلیہ مسز ادما چوپڑہ کو ۲۶ اگست ۱۹۷۸ کو جب معلوم ہوا کہ ان کے دونوں بچے گیتا (۱۷) اور سنجے (۱۵) کو نئی دہلی میں وحشیانہ طور پر کسی نے قتل کر دیا ہے تو اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ سات گھنٹے تک وہ ایک لفظ نہ بول سکیں۔

اسلام کے خلاف جدید شبہات کو ڈھا دینے والی کتاب

مذہب اور جدید چیلنج

"علم جدید کا چیلنج" مولانا وحید الدین خاں کی مشہور کتاب ہے۔ "مذہب اور جدید چیلنج" اسی کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۷ میں اردو میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد عربی اور ترکی زبانوں میں اس کے درجن سے اوپر ایڈیشن شائع ہوئے۔ تمام عالم اسلام میں اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ۸ر فروری ۱۹۷۶ کو مولانا وحید الدین خاں طرابلس میں صدر قذافی سے ملے تو لیبی لیڈر نے فوراً کہا: لقد قرأت کتابك الاسلام یتحدی (میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی پڑھ لی ہے)۔

الامام الاکبر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود (جامعہ ازہر قاہرہ) نومبر ۱۹۷۵ میں ہندستان آئے انھوں نے جامعہ ڈابھیل سورت میں تقریر کرتے ہوئے علمار سے کہا کہ آپ لوگ الاسلام یتحدی کا مطالعہ کیجئے۔ جس میں اسلام کے خلاف جدید شبہات کا کافی وشافی رد موجود ہے۔

قاہرہ کے روزنامہ الاہرام نے اس کتاب کے عربی ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"مصنف کتاب نے اسلام کے مطالعہ کا ایک ایسا علمی انداز اختیار کیا ہے جو بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ جدید مادی فکر کے مقابلہ میں دین کو وہ اسی طرز استدلال سے ثابت کرتے ہیں جس سے منکرین مذہب اپنے نظریات کو ثابت کرتے ہیں۔۔۔ اسلام کے ظہور سے لے کر اب تک چودہ سو سالوں میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر تاریخ کو چھانا جائے اور اللہ کی طرف بلانے والی عمدہ کتابوں کو چھلنی سے چھان کر نکالا جائے تو کتاب الاسلام یتحدی بلاشک وشبہ ان میں سے ایک ہوگی۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مصنف کتاب کے عمل کو قبول فرمائے۔ ان کے دل کو نور سے، ان کی عقل کو معرفت سے اور ان کی روح کو رضا سے بھر دے اور ان کے قلم کو ایسی روشنائی عطا کرے جو لکھنے سے کبھی ختم نہ ہو۔"

قیمت: تیرہ روپے پچاس پیسے

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

"مذہب اور جدید چیلنج" پر
ایک یادگار تبصرہ

"مذہب اور جدید چیلنج" کا پہلا ایڈیشن جو علم جدید کا چیلنج کے نام سے ۱۹۶۶ء میں چھپا تھا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا محمد عامر عثمانی مرحوم نے اپنے رسالہ تجلی کے "آغاز سخن" میں مفصل نوٹ شائع کیا تھا۔ اس کا ایک جزء یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"اس کتاب کا تذکرہ کرنا آج ہمیں ہر دوسرے موضوع سے زیادہ محبوب نظر آرہا ہے۔ خدا مصنف کو بہترین اجر عطا فرمائے۔ ہمارے علم کی حد تک یہ کتاب اپنے موضوع پر دنیا کی واحد کتاب ہے۔ اس کا موضوع فقط یہ نہیں کہ سائنس کے مقابلہ پر مذہب کا اثبات کیا جائے۔ بلکہ اس کے موضوع کا تشخص تقریباً ان الفاظ میں ہوسکتا ہے کہ ——— ملحد سائنس دانوں اور فلسفیوں کا رد ٹھیک اسی علم کلام کے ذریعہ جسے یہ لوگ مذہب کی تردید میں استعمال کرتے ہیں۔

اس کتاب کی تعریف کا حق محض یہ کہہ کر ادا نہیں ہوسکتا کہ یہ ٹھوس ہے نافع ہے، قیمتی ہے۔ اس طرح کی باتیں تو اس سے کمتر کتابوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہیں۔ ہمیں کہنا چاہئے، اور یہ ہمارے دل کی آواز ہے کہ یہ کتاب وہ فرض کفایہ ہے جسے مصنف کی سعادت مندی اور توفیق اور خداداد صلاحیت نے پوری امت کی طرف سے ادا کیا ہے۔

نہیں۔ یہ بھی ہم نے غلط کہا۔ فرض کفایہ فرائض کی بہت ہلکی قسم ہے۔ فکر نو کے مذہب دشمن اور خدا بیزار طوفان کے آگے فولادی دلائل کا بند باندھنا، ملحد مفکرین کے تباہ کن علم کلام کا توڑ مہیا کرنا اور مذہبی عقائد و اقدار کو خیرہ کن سفسطوں کی یلغار سے بچانا آج اتنا بڑا فریضہ ہے جسے افرض الفرائض بھی کہہ دیں تو مبالغہ نہیں۔

مصنف نے اگر ڈیوٹی انجام دی ہے تو ملت کے دیگر اہل افراد کے ذمے سے یہ ڈیوٹی ساقط نہیں ہوجاتی۔ اگر ہمیں حقیقت اور واقعات کا احساس وادراک ہوتا تو جس طرح ہم مدرسے اور مکتب چلانے کے لئے قوم سے چندہ لیتے اور بڑے بڑے خرچ پورے کرتے ہیں، اسی طرح اس کتاب کو اردو، ہندی، انگریزی اور دنیا کی تمام قابل ذکر زبانوں میں بھاری تعداد میں چھاپتے، پھیلاتے، مفت بانٹتے۔

مصنف نے اپنی کتاب میں جوابی بحث کے ذیل میں جو سائنسی معلومات جمع کی ہیں وہ بجائے خود اس کتاب کو بہت قیمتی بنا دیتی ہیں۔ اللہ اکبر، کیا کیا ایمان تازہ ہوتا ہے ان جدید تر سائنسی اکتشافات کو دیکھ کر جن سے یہ کتاب روشناس کراتی ہے۔ کتنی قطعیت کے ساتھ ہر تازہ سے تازہ تر انکشاف گواہی دے رہا ہے کہ مذہب اٹل ہے، مذہب برحق ہے، مذہب سے بے تعلق ہوکر انسانی معاشرہ نہ پہلے کبھی فلاح کو پہنچا نہ آج پہنچ سکتا ہے۔

مصنف کی کتاب پڑھ کر ہم ایسی کیفیت محسوس کر رہے ہیں کہ اگر وہ ہمارے سامنے ہوں تو ہم والہانہ انداز میں ان انگلیوں کو چوم لیں جن کی جنبش اس کتاب کو ظہور دینے کا ذریعہ بنی ہے۔

(ماہنامہ تجلی دیوبند۔ جولائی۔ اگست ۱۹۶۶ء)

Regd. No. D (D) 532
Regd. R.N. No. 28822/76

October 1978

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qasimjan Street, DELHI-110006 (INDIA)

اسلام کو عصری اسلوب میں سمجھنے کے لئے

الاسلام	از	مولانا وحید الدین خاں	12.00
ظہور اسلام		"	12.00

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

الرسالہ

شمارہ ۲۴ نومبر ۱۹۷۸

جمعیۃ بلڈنگ ٭ قاسم جان اسٹریٹ ٭ دہلی ٦

عن بقية قال سمعت الاوزاعي يقول: العلم ما جاء عن اصحاب محمد وما لم يجئ عن واحد منهم فليس بعلم

(دارمی ۲۹)

بقیہ کہتے ہیں۔ میں نے اوزاعی کو یہ کہتے ہوئے سنا: علم وہی ہے جو اصحاب رسول سے پہنچا ہو۔ جو ان میں سے کسی کے ذریعہ نہ ملے وہ علم ہی نہیں۔

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ براہ کرم اپنا زر تعاون بذریعہ منی آرڈر بھیج کر شکریہ کا موقع دیں —— منیجر الرسالہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پڑھے لکھے لوگوں کی ایک نشست میں راقم الحروف کو کچھ باتیں کہنے کا موقع ملا۔ میں نے کہا: ہمارا اصل مسئلہ زندگی کا مسئلہ نہیں، ہمارا اصل مسئلہ موت کا مسئلہ ہے۔ زندگی میں ہم بہت سی چیزوں کے مالک نظر آتے ہیں — عہدہ، مکان، جائداد، حیثیت، اعوان وانصار۔ مگر موت ان تمام چیزوں کو باطل کر دے گی۔ اچانک ہم اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پائیں گے جہاں ہمارے پاس اپنا کچھ بھی نہ ہوگا اور سارا فیصلہ مکمل طور پر اللہ کے اختیار میں ہوگا۔ اس لئے بہترین عقلمندی یہ ہے کہ اس آنے والے دن کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی کا نظام بنایا جائے۔ کیونکہ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب بہت سی وہ باتیں بالکل بے قیمت ہو جائیں گی جن کو آج ہم قیمتی سمجھ کر ان کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔"

میری باتیں ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھیں کہ ایک مسلم لیڈر بولے: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ذہن کنفیوزن کا شکار ہے۔ آپ کوئی بات نہیں پا رہے ہیں جو لوگوں سے کہیں"۔ مذکورہ لیڈر کے دل میں جو بات تھی وہ انھوں نے صفائی سے کہہ دی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آج اکثر قائدین کا یہی حال ہے۔ آخرت کی بات کو وہ کوئی دعوتی اشو نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے کوئی نظر نہیں آتا جو دنیا کو آخرت کی خبر دینے کے لئے بیتاب ہو۔ ہر ایک کے پاس دنیوی فلاح اور سیاسی انقلاب کے نعرے ہیں۔ آخرت کی چیتاونی کو کوئی شخص کام ہی نہیں سمجھتا۔ یہ قائدین اگر خاموش ہو کر بیٹھ جائیں تو وہ زیادہ بہتر طور پر بندگان خدا کی خدمت کریں گے۔ کیونکہ یہی لوگ ہیں جو انسان کو غیر حقیقی مسائل میں الجھا کر اصل حقیقت سے دور کر رہے ہیں۔

اس میں نصیحت ہے

انگلستان میں یہ قانون ہے کہ جانور کو ذبح نہ کیا جائے بلکہ کرنٹ کے ذریعہ ہلاک کیا جائے۔ اور اگر ذبح کیا جائے تو پہلے جانور کو بیہوش کر لیا جائے۔ مگر دونوں صورتوں میں ذبح کے اسلامی حکم پر عمل نہیں ہوتا۔ تاہم پچھلے دس سال سے برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کو ذبیحہ کی اجازت مل گئی ہے، برمنگھم میں ۱۹۷۰ سے ایک حلال میٹ کمپنی قائم ہے۔ اس کا کام اب اتنا بڑھ چکا ہے کہ اس وقت روزانہ تین ہزار سے چار ہزار تک جانور اور ۱۸ ہزار مرغیاں ذبح کی جاتی ہیں۔ اس کا اسٹاف ۷۵ لوگوں پر مشتمل ہے۔

برطانیہ میں مسلمانوں کو یہ سہولت کیونکر حاصل ہوئی، برطانیہ کے ایک مسلمان اقبال مسعود ندوی لکھتے ہیں:

> "یہاں ایک اور فرقہ ہے جو اپنے طریقہ کے مطابق جانور ذبح کرتا ہے۔ یہ یہود کا فرقہ ہے۔ حکومت ان سے تعرض نہیں کرتی۔ ایک وجہ ان کی اقتصادی سیاسی اہمیت ہے۔ ان کا معیار بھی خاصا اونچا ہے۔ بلکہ دراصل اس فرقہ کے ساتھ رعایت ہی کی وجہ سے یہاں پر ذبیحہ کی اجازت مل سکی ہے۔"

الحسنات رام پور فروری ۱۹۸۰ صفحہ ۲۷

یہ واقعہ اس بات کی مثال ہے کہ اغیار کے پیدا کردہ حالات کس طرح کبھی اسلام کے لئے مفید بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کبھی اس کے برعکس صورت حال بھی پیش آتی ہے۔ یعنی مسلمان اپنی نادانی سے ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ اسلام کے لئے موافق حالات برباد ہو جائیں۔ ایک ایسی جدوجہد جو اسلام کے نام پر کی گئی ہو، بالآخر وہ غیر اسلامی نتیجہ پر ختم ہو۔

ایسی بحثیں نہ چھیڑو جو لوگوں کو اللہ سے غافل کر دے

؍الناس من یشتری لہو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم ویتخذ ھا ھزوا اولئک لھم
اب مھین۔ واذا تتلی علیہ آیتنا ولی مستکبراً کان لم یسمعھا کان فی اذنیہ وقرا فبشرہ
ذاب الیم (لقمان ۶-۷)

لوگوں میں کوئی ایسا ہے کہ مول لیتا ہے غافل کرنے والی بات کو تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے بھٹکا دے اور اس ہنسی اڑائے۔ ایسے لوگوں کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ اور جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی تی ہیں تو وہ گھمنڈ کے ساتھ اس طرح منہ موڑ لیتا ہے جیسے اس کو سنا ہی نہیں۔ جیسے اس کے کان بہرے ہیں۔ ؍کو خبر دے دو دکھ والے عذاب کی۔

اس آیت میں لہو الحدیث سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں بعض واقعات تفسیر کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مداللہ بن مسعود رض نے اس کی تفسیر غنا رے کی ہے اور ضحاک نے شرک سے (ابن کثیر) مگر مفسرین کے اصول کے مطابق، اس کا شان نزول گو خاص ہو تاہم عموم الفاظ کی وجہ سے اس کا حکم عام رہے گا۔ جو لہو یا شغل بھی بیل اللہ سے ہٹانے کا سبب بنے وہ سب درجہ بدرجہ اس میں شامل ہوگا۔ ابن جریر نے کہا ہے کہ ہر وہ کلام ھو الحدیث ہے جو اللہ کی آیتوں سے روکے اور اس کے راستہ کے اتباع سے ہٹائے (کل کلام یصد عن آیات للہ واتباع سبیلہ) حسن بصری نے کہا کہ ہر وہ چیز لھو الحدیث ہے جو اللہ کی عبادت اور اس کی یاد سے ہٹانے والی ہو مثلاً فضول قصہ گوئی، ہنسی مذاق کی باتیں، بے کار مشغلے، گانا بجانا وغیرہ (کل ما شغلک عن عبادۃ اللہ وذکرہ من السمر والاضاحیک والخرافات والغناء ونحوھا، روح المعانی)

موجودہ زمانہ میں کون سی چیزیں ہیں جو لھو الحدیث کا مصداق ہیں ۔۔۔۔ وہ تمام تفریحی تماشے اور وہ سستا لٹریچر اس میں شامل ہے جو اپنی سنسنی خیزی اور رومانیت کی وجہ سے لوگوں کے لئے ذہنی شراب بنا ہوا ہے۔ اس میں وہ مقدس حلقے بھی شامل ہیں جنھوں نے بناوٹی قصے کہانیوں کی ایک مذہبی طلسم ہوش ربا تیار کر رکھی ہے اور اس کو سنا سنا کر لوگوں کو مدہوش رکھتے ہیں۔ وہ شعر و شاعری اور خطابت بھی اس میں شامل ہے جو لفظ بازی کے کے کرتب دکھا کر لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس میں وہ سیاسی تحریکیں بھی شامل ہیں جو سیاست کی چاشنی تقسیم کرکے لوگوں کو اپنی طرف مائل کئے ہوئے ہیں۔ پھر اس میں وہ تمام مذہبی مناظرے بھی شامل ہیں جو لوگوں کے ذہنوں کو غیر متعلق بحثوں میں الجھا کر سواد اعظم سے دور کر دیتے ہیں۔ غرض وہ تمام آوازیں جو عوامی دل چسپی کا سامان پیدا کرکے لوگوں کو حق کی سنجیدہ دعوت سے ہٹائیں اور اللہ کے سیدھے سادے دین سے بے رغبت کریں۔ وہ سب درجہ بدرجہ اس میں شامل رہیں گی۔ خواہ اپنے اس مشغلہ کو انھوں نے ارادۂ حق سے روکنے کے لئے جاری کیا ہو یا ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے بطور واقعہ یہ نتیجہ برآمد ہو رہا ہو۔

نماز ابدی فلاح کا ربانی نسخہ ہے۔ مگر نماز پڑھنے والے اس کو رسمی پرستش سمجھتے ہیں اور نماز نہ پڑھنے والے اس کو رسمی بوجھ خیال کرتے ہیں۔

پانچ نمازوں کا حکم قرآن میں

نماز کی ادائگی میں کوتاہ ہونا بے عملی ہے اور نماز کے حکم کو بدلنا سرکشی

فرض نمازوں کا پانچ ہونا روایات سے بتواتر ثابت ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور دوسری کتب حدیث میں کثرت سے ایسی روایات ہیں جن میں الصلوات الخمس کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے صراحۃً یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں جو مخصوص اوقات میں مقرر کی گئی ہیں۔ تاہم قرآن میں نماز کی بے حد تاکید کے باوجود "پانچ" کا لفظ نہیں آیا ہے۔ اس سے کچھ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ فرض نمازوں کی تعداد پانچ نہیں ہے بلکہ تین یا اس سے کم ہے۔ وہ اولاً حدیث کی حجیت کا انکار کر دیتے ہیں اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ قرآن کے مطابق پانچ وقت نماز ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر یہ محض دھوکا ہے۔ اگر کوئی شخص سنجیدہ ہو اور فی الواقع مسئلہ کو سمجھنا چاہتا ہو تو قرآن سے بھی بلا اشتباہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں اور مقررہ وقت پر ان کی ادائگی ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔

اس سلسلے میں قرآن کی حسب ذیل آیت پر غور کیجئے۔

حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ (بقرہ ۲۳۸) پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو بیچ کی نماز کی

جملہ کی ترکیب بتا رہی ہے کہ اس آیت میں صلوٰۃ وسطیٰ کا لفظ جس نماز کے لئے آیا ہے وہ صلوات سے علیحدہ نماز ہے۔ یعنی یہ کہا گیا ہے کہ "نمازوں" کی پابندی کرو اور اسی کے ساتھ اس نماز کی جس کا وقت "نمازوں" کے بیچ میں آتا ہے۔ صلوٰات جمع کا لفظ ہے جو عربی قواعد کے مطابق کم از کم تین نمازوں کے لئے ہے۔ مگر استعمال بتاتا ہے کہ یہاں اس سے تین سے زیادہ نمازیں مراد لینا ضروری ہے۔ کیوں کہ تین کے عدد میں کوئی چوتھی چیز رکھی جائے تو وہ اس کا "بیچ" نہیں بن سکتی۔ کم سے کم عدد جو یہاں صلوات سے مراد ہو سکتا ہے وہ چار ہے۔ چار کا عدد لینے کی صورت ہی میں یہ ممکن ہے کہ ایک اور نماز اس میں اس طرح شامل کی جائے کہ وہ اس کا بیچ بن جائے۔ گویا صلوٰۃ وسطیٰ وہ بیچ کی نماز ہے جس کے دونوں طرف دو دو نمازیں ہیں۔ باعتبار مفہوم آیت کا ترجمہ یہ ہوگا ———

"بیچ کی نماز کی پابندی کرو۔ اور بیچ کی نماز سے پہلے دو نمازوں کی اور بیچ کی نماز کے بعد دو نمازوں کی۔" اس سے صاف طور پر یہ نظام معلوم ہوتا ہے کہ رات میں دو نمازیں مقرر کی گئی ہیں اور پھر دن میں دو نمازیں۔ اور ان کے

ہیں ایک نماز ہے۔ رات کی دو نمازوں سے مراد مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں۔ دن کی دو نمازوں سے مراد فجر اور ظہر
ر بیچ کی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اس طرح کل پانچ نمازیں ہو جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو نقشۂ ذیل:



پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو اس نماز کی جو نمازوں کے بیچ میں ہے (قرآن)

پھر یہ بات بھی قرآن میں بالکل واضح ہے کہ نماز اہل ایمان پر معین اوقات کے ساتھ فرض کی گئی ہے (ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتا، نساء ۱۰۳) اس سلسلے میں جو پانچ اوقات حدیث سے معلوم ہوتے ہیں، ٹھیک وہی اوقات خود قرآن سے بھی ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں:

۱۔ سورج نکلنے سے پہلے	(قبل طلوع الشمس، طٰہٰ ۱۳۰)	فجر
۲۔ دوپہر ڈھلنے کے وقت	(لدلوک الشمس، بنی اسرائیل ۷۸)	ظہر
۳۔ غروب آفتاب سے پہلے	(وقبل غروبہا، طٰہٰ ۱۳۰)	عصر
۴۔ جب شام ہوتی ہے	(حین تمسون، روم ۱۷)	مغرب
۵۔ جب رات تاریک ہو جائے	(الی غسق اللیل، بنی اسرائیل ۷۸)	عشاء

اس طرح قرآن سے پانچ نمازیں مع تعیین اوقات ثابت ہو جاتی ہیں۔

اوپر جو باتیں عرض کی گئیں، وہ ایسے شخص کے لئے بالکل کافی ہیں جو حقیقۃً بات کو سمجھنا چاہتا ہو اور اس بات کی تمنا رکھتا ہو کہ جب وہ اللہ کے یہاں پہنچے تو اللہ اس سے راضی ہو جائے۔ مگر جو لوگ بحث وجدال کی سطح پر ہیں ان کو کسی بھی دلیل سے چپ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اسی وقت چپ ہوں گے جب کہ اللہ اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے اور ان سے بولنے کی مہلت چھین لے۔

نماز کا اصل مقصد اللہ کی یاد ہے۔ مگر اس کا نظام اتنی حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے کہ زندگی کے تمام تقاضے نہایت جامعیت کے ساتھ اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ نماز اتحاد اور اجتماعیت کا سبق ہے۔ وہ بندے کو اپنے رب سے جوڑتی ہے۔ وہ ہمارے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہے۔ وہ ہمارے اوقات کو منظم کرتی ہے۔ وہ ہلکی جسمانی ورزش کا فائدہ دیتی ہے۔ وہ باربار ہماری صفائی کرتی رہتی ہے، وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز ہر قسم کی روحانی اور جسمانی برکتوں کا مجموعہ ہے۔ مسلمان اگر حقیقی شعور کے ساتھ نماز پر قائم ہو جائیں تو ان کی دنیا بدل جائے اور وہی ان کے تمام مسائل کے حل کے لئے کافی ہو جائے۔

A Muslim Village in England

ایک مسلم بستی انگلستان میں

The Society of Islam in England is a group of Muslims totalling about one hundred men, women and children, who at present live on the outskirts of London. The majority of the group are English or American, but there are also five Malays, four Belgians, four Spaniards and French, Morocan and Mexican Muslims living together in Bristol Gardens, Maida Vale

The Community was started ten years ago by two Englishmen who embraced Islam in Morocco and returned to London, and it has grown from that small beginning Five and a half years ago a house in Bristol Gardens was obtained and was converted into a Mosque and the centre of Muslim activities All the members of the Society live as Muslims, following the *Sunnah* of the Holy Prophet Muhammad (*Sallallahu alaihi wa sallam*) as closely as they can The Quran and Arabic are taught daily and the *Hadith* and other aspects of Islam are studied regularly. The Five Daily Prayers are said in the Mosque

Members of the Society have the full support of the Islamic Cultural Centre in Central London, and the Society is a member of the Union of Muslim Organisations in England and Islamic Council of Europe. Sixteen members of the Society have University Degrees, and many of these are qualified to teach. It is they who teach the childern. There is also a Publisher from the 'Diwan Press' which publishes the Journal of the Society, called 'Islam', which will be published quarterly in English in London

Members of the Society now intend to found a Muslim Villa[ge] in the centre of England This village will, it is hoped, serve as a focus for the Muslims in England, and as a centre of Islamic Studies and *Da'wa* in England From this village it is hoped that the already extensive programme of *Da'wa* will be extended to reach many more English people The village will also serve as a centre of Islamic education in England, and there will be summer camps, weekend visits, and short courses Muhammed Nazeem, a New Zealander, who has studied for four years at the Madrasah of Shaikh Bin noori in Karachi (Pakistan) is coming to teach Arabic Three men and two women from the Society are now studying at Al Azhar University in Cairo. They will return to teach at the Muslim Village.

It is intended to make the village life a dynamic learning arena, in which the teaching of The Book (Quran Majeed) is practiced and lived The Mosque will be the centre of the village life and from there teachers will go out across England to spread the teachings of Islam

The Society needs thirty thousand pounds with which to buy land for this village. Assistance for the whole project has been promised by His Majesty King Khalid of Saudi Arabia, and enthusiastic support has been received from the Muslim community of Great Britain £ 10,000 has been given by the Ruler of Sharjah, United Arab Emirate, and the Minister of Religious Affairs in Pakistan has also promised assistance

Individual contributions are welcome and should be sent to 'The Muslim Village Project' at 33, Bristol Gardens, Maida Vale, London W 9

اسلام پھیل رہا ہے

Conversion wave sweeps Arab countries

BEIRUT, September 15 (UNI): A wave of conversions to Islam is sweeping through the thousands of South Korean engineers, technicians and workers on projects in Arab countries, it is reported, says DPA.

According to Kuwaiti officials, 130 Koreans have embraced Islam in the Persian Gulf emirate.

Conversions to Islam are said to facilitate stay and work permits in the normally orthodox Muslim countries. The influx of many thousands of Koreans has already caused protests and political controversies.

The Times of India,
September 16, 1978

دس سال پہلے کی بات ہے۔ دو انگریزوں نے مراکش میں اسلام قبول کیا۔ وہ اپنے وطن واپس آئے۔ لندن کے کنارے برسٹل گارڈن میں انھوں نے زمین حاصل کی۔ یہاں مسجد اور مکان بنایا۔ یہ آبادی بڑھتی رہی۔ انگلستان اور دوسرے مغربی ملکوں کے نومسلم یہاں آباد ہونے لگے۔ اب اس بستی نے ایک "مسلم گاؤں" کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہاں تقریباً ایک سو مرد اور عورتیں رہتی ہیں۔ یہ مسجد اس بستی کی اسلامی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ یہاں روزانہ قرآن و حدیث اور عربی زبان کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس بستی کے باشندے بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ یہاں "اسلام" کے نام سے انگریزی زبان کا ایک سہ ماہی پرچہ بھی نکلتا ہے۔

یہ لوگ اب وسط انگلستان میں منصوبہ بند طرز پر ایک "مسلم بستی" تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مسلم بستی مغربی دنیا میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا مرکز ہوگی۔ سعودی عرب کے شاہ خالد نے اس مسلم بستی کے تمام اخراجات ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس بستی کی صرف زمین ۳۰ ہزار پونڈ میں خریدی جائے گی۔

خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل ساری دنیا میں اسلام دوبارہ ابھر رہا ہے۔ جنوبی کوریا کے ہزاروں باشندے عرب ملکوں میں کام کر رہے ہیں۔ ان میں انجنیئر ٹیکنیشین اور عام کارکن شامل ہیں۔ ان کوریائی باشندوں میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔ کویت کے ایک افسر نے بتایا کہ صرف کویت میں ۱۳۰ کوریائی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ ہزاروں کوریائی کے عرب ملکوں میں داخل ہونے سے کچھ اعتراضات اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ قبول اسلام کی اس لہر کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس طرح ان غیر ملکیوں کو عرب دنیا میں کام کرنے اور ٹھہرنے کی آسانیاں مل جائیں گی۔

اس طرح کی خبریں آج کل روزانہ آتی رہتی ہیں۔ عرب پٹرول کی دولت نے اسلام کو دوبارہ ایک نئی زندگی عطا کر دی ہے۔ شاید اسلام پھر ایک بار دنیا کی غالب قوت بننے والا ہے۔

سیرالیون (مغربی افریقہ) کے گاؤں "یورکلڈو" کے تمام لوگ پچھلے ماہ (مارچ ۱۹۷۷) میں اپنے مشرکانہ مذہب کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گئے ہیں۔ گاؤں کے باشندوں کی تعداد ۵۳۲ ہے۔ یہ لوگ لیبیا کی جمعیت الدعوة الاسلامیة کے بھیجے ہوئے مبلغ ابوبکر باہ احمد کی کوششوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ (روزنامہ الفجر الجدید، طرابلس، ۱۶ مارچ ۱۹۷۷)

فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمان نہیں مرتے۔ جو چیز مرتی ہے وہ دعوتِ حق کا امکان ہوتا ہے۔

مولانا اسعد اسرائیلی سنبھلی

جب آدمی انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آجائے

حضرت سلیمانؑ کے زمانہ حکومت (۹۷۳ - ۱۰۱۳ ق م) میں بحر قلزم کی مشرقی شاخ کے کنارے ایلات (Elath) کے مقام پر یہودیوں کی آبادی تھی۔ انھوں نے قانون سبت کی خلاف ورزی کی۔ ان کی شریعت میں سبت (سنیچر) کے دن معاشی سرگرمیاں ممنوع تھیں۔ مگر وہ اس دن مچھلی کا شکار کرنے لگے۔ سنیچر کے دن مچھلیاں کثرت سے دریا میں آتی تھیں اور بقیہ دنوں میں پانی کے نیچے چلی جاتی تھیں۔ یہود نے یہ شرعی تدبیر کی کہ دریا کے کنارے گڑھے بنائے۔ وہ دریا کا پانی کاٹ کر گڑھے میں ملا دیتے۔ سنیچر کے دن جب مچھلیاں گڑھے میں آجاتیں تو وہ نکلنے کا راستہ بند کر دیتے۔ اگلے دن اتوار کو ان مچھلیوں کو پکڑ لیتے۔ یہ تدبیر وہ اس لئے کرتے تھے تاکہ ان پر یہ بات صادق نہ آئے کہ وہ سبت کے دن شکار کرتے ہیں۔ دین کے نام پر یہ بے دینی اللہ کو اتنی زیادہ ناپسند ہوئی کہ ان پر اللہ کی لعنت ہوئی۔ وہ بندر اور سور بنا دئے گئے (مائدہ ۶۰) —— عملاً یہی حالت اگرچہ پوری قوم یہود کی تھی۔ تاہم ایک خاص مقام کے یہودیوں کے باطن کو ظاہری طور پر بھی مجسم کر دیا گیا تاکہ دوسروں کے لئے عبرت ہو (بقرہ ۶۶)

بے دینی کو دین کے نام پر کرنا بدترین جرم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے آدمی کے اندر سے صحیح اور غلط کا فرق مٹ جاتا ہے۔ وہ ایک بے حس انسان بن جاتا ہے۔ دین اور بے دینی دونوں اس کو یکساں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وہ انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آجاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ نوبت آتی ہے جب کہ اس میں بندر اور سور کی اخلاقیات پیدا ہو جاتی ہیں۔

بندر کی خصوصیت کیا ہے۔ فساد اور بے حیائی۔ کسی مکان میں بندروں کا غول داخل ہو جائے تو وہ فوراً بے معنی اچھل کود اور توڑ پھوڑ شروع کر دے گا۔ ایسا ہی کچھ حال اس قوم کا ہو جاتا ہے۔ وہ زبان سے خدا کا انکار نہیں کرتی۔ تاہم عملاً وہ خدا کی زمین پر اس طرح رہنے لگتی ہے جیسے اس زمین کا کوئی مالک نہیں ہے۔ جیسے نہ کبھی خدا سے اس کا سامنا ہونا ہے اور نہ اپنے کئے کا حساب دینا ہے —— بدنظمی، غیر ذمہ دارانہ زندگی، بے معنی کارروائیاں، آپس کی چھین جھپٹ، ایک دوسرے پر غرانا، ہمدردی اور انصاف کے بجائے ظلم و فساد کو اپنا شیوہ بنا لینا، یہ اس کی عام زندگی ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ بظاہر انسان مگر عملاً بندر صفت ہو جاتے ہیں۔

سور کی خصوصیت کیا ہے۔ ستھری چیز کو چھوڑ کر گندی چیز کو اپنی خوراک بنانا۔ اس کی ایک صورت وہ ہے جو کمائی اور لین دین میں ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی حلال ذرائع پر قانع نہ رہ کر حرام سے اپنا پیٹ بھرنے لگتا ہے (مائدہ ۶۲)۔ دوسری صورت وہ ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ بنا لیں (اعراف ۱۴۶)

ایسے لوگوں کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ مثبت چیزوں کے بجائے منفی چیزوں کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ ان کو اصلاح کے کاموں کی طرف رغبت نہیں ہوتی۔ البتہ ایسے کاموں کی طرف وہ تیزی سے لپکتے ہیں جن کا نتیجہ نسلوں اور کھیتوں

کی ہلاکت ہو۔ ان کے سامنے تعمیری کام کے مواقع کھلے ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان کو چھوڑ کر تخریب کے راستوں میں تیزی دکھاتے ہیں۔ ابنائے نوع کے لئے نفع بخش بننے کا شوق ان میں نہیں ابھرتا۔ البتہ ان کو نقصان پہنچانے کے نعرہ پر وہ بآسانی جمع ہو جاتے ہیں۔ خاموش خدمت میں ان کے لئے اپیل نہیں ہوتی البتہ نمائشی ہنگاموں میں وہ خوب دلچسپی دکھاتے ہیں۔ حقیقی فائدہ کے منصوبوں میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں ہوتی۔ البتہ بے فائدہ مشغلوں میں وہ اپنا وقت اور مال خوب خرچ کرتے ہیں۔ حتی کہ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ان کو خدائے واحد کی پرستش کی طرف بلائیے تو وہ لبیک نہیں کہیں گے البتہ زندہ یا مردہ شخصیتوں کی پوجا کے نام پر جوق در جوق اکٹھا ہو جائیں گے۔

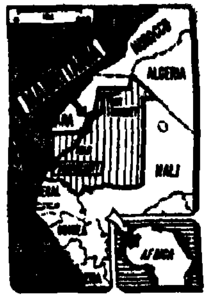
★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★

ستاروں کی دنیا

کائنات میں بہت سے کہکشانی مجموعے ہیں۔ رات کے وقت ہم جن ستاروں کو دیکھتے ہیں وہ ان میں سے ایک کہکشاں کے ستارے ہوتے ہیں۔ کھربوں ستاروں کا یہ مجموعہ ایک پلیٹ کی مانند ہے۔ ہمارا سورج اسی کا ایک نسبتاً چھوٹا ستارہ ہے۔ وہ بڑا صرف اس لئے دکھائی دیتا ہے کہ وہ دوسرے ستاروں میں سب سے زیادہ ہم سے قریب ہے۔ کہکشاں کا پھیلاؤ کتنا زیادہ ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے مرکز اور ہمارے سورج کے درمیان ..... ۳۰ ٹریلین کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ یہ کہکشانی نظام کائناتی گرد و غبار سے بننے والے بادلوں کے ایک پردہ کے پیچھے ہے، اس لئے ہم براہ راست اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ کہکشاں کے بارے میں ہمارے تصورات تمام تر انفرارڈ شعاعوں، ایکسریز اور ریڈیو ریڈی ایشن کے مطالعہ پر مبنی ہیں جو پردہ کو پار کر کے ہم تک پہنچتی ہیں۔ گویا کہکشاں کا مشاہدہ ہم بالواسطہ کر سکتے ہیں۔ اس کو براہ راست نہیں دیکھ سکتے۔

فلکیات دانوں کا ایک قیاس یہ ہے کہ کہکشاں کا مرکز غالباً بلیک ہول ہے۔ بلیک ہول ان ستاروں کو کہا جاتا ہے جو آگ [illegible] ہے مگر ان کو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ ان کا مادہ بے حد کثیف حالت میں ہے۔ ان کے مادہ کی ایک چمچہ بھر مقدار ہزاروں ٹن وزن کے برابر ہے۔ اس بنا پر ان اجسام کی قوت کشش اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ روشنی تک ان سے نکل نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ کہکشاں کا مرکز کسی بھی دوربین سے ہمارے مشاہدہ میں نہیں آتا۔ ہم کسی چیز کو اس سے آنے والی روشنی کی مدد سے دیکھتے ہیں اور کہکشاں کے مرکز سے روشنی آتی ہی نہیں۔

موریطانیہ میں انقلاب!



ہمارے تمام لیڈر سیاسی انقلابات لانے میں مشغول ہیں
قوم کے اندر فکری اور عملی انقلاب لانے سے کسی کو دلچسپی نہیں

موریطانیا، افریقہ کے شمال مغربی ساحل پر ایک صحرائی ملک ہے۔ اس کا رقبہ گیارہ لاکھ مربع کیلومیٹر ہے، فرانس اور اسپین کے مجموعی رقبہ کے برابر۔ مگر آبادی صرف پندرہ لاکھ ہے۔ زیادہ تر باشندے مسلمان ہیں۔

۱۹۶۰ میں یہ ملک فرانس کے قبضہ سے آزاد ہوا۔ اس وقت سے یہاں صدر مختار اولد داداہ (۵۴) کی حکومت تھی۔ ۱۰ جولائی کو فوجی انقلاب ہوا اور کرنل مصطفےٰ اولد سالک (۴۲) نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ کرنل مصطفےٰ موریطانیہ کی فوج کے سربراہ اعلیٰ تھے۔

موریطانیہ کی اقتصادیات کا انحصار زیادہ تر لوہے کی کانوں پر ہے جو یہاں بڑی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ ان کانوں کا سارا انتظام فرانسیسی کمپنی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کمپنی خام لوہا نکال کر اس کو نہایت سستی قیمت پر حکومت موریطانیہ سے خریدتی ہے اور اس کو مہنگی قیمت پر باہر فروخت کرتی ہے۔ فرانس کے کارخانوں میں پہنچ کر جب یہ خام لوہا مشینوں اور سامانوں کی صورت اختیار کرتا ہے تو اس کی قیمت، ابتدائی قیمت کے مقابلہ میں کئی سو گنا بڑھ جاتی ہے۔

آزادی کے بعد ہی سے موریطانیہ میں صدر مختار کے خلاف سیاسی تحریک چل رہی تھی جو بالآخر فوجیوں کے ہاتھوں اٹھارہ برس بعد کامیاب ہوئی۔ مگر اس مدت میں سارے موریطانیہ میں کوئی ایسا رہنما نہ اٹھا جو موریطانیہ کے باشندوں کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس قابل بنانے کی کوشش کرتا کہ وہ اپنی لوہے کی دولت کو فرانسیسیوں سے "چھین" سکیں۔ اپنی قومی حکومت سے سیاسی اقتدار چھیننے میں انھوں نے تیزی دکھائی۔ مگر فرانسیسیوں سے اقتصادی اقتدار چھیننے کا کوئی منصوبہ وہ نہ بنا سکے۔

یہی تقریباً تمام مسلم ملکوں کا حال ہے۔ ہر رہنما سیاسی کارروائیوں میں دلچسپی دکھا رہا ہے۔ مگر ملک و قوم کی تعمیر و استحکام کے منصوبوں سے ان کو دلچسپی نہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سیاسی کارروائی کے لئے شور و شر کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ جب کہ قومی تعمیر کے لئے خاموش محنت کی ضرورت ہے۔ پہلی صورت میں فی الفور آدمی کی اپنی شخصیت چمکتی ہے جب کہ دوسری صورت میں آدمی کو اپنے آپ کو گمنامی میں دفن کرنا پڑتا ہے۔

ذاتی نقصان کا اندیشہ ہو تو آدمی فوراً حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنے لگتا ہے۔ مگر ملی معاملات میں دلائل کا انبار بھی کسی کو حقیقت پسند بنانے کے لئے کافی نہیں۔

اسلامی نصب العین کا ماخذ : آیت عبادت یا آیت خلافت

سوال : آج کل مسلمانوں میں دو قسم کے مذہبی فکر چل رہے ہیں۔ ایک گروہ حکومت پر زور دیتا ہے، دوسرا گروہ عبادت پر۔ اس سلسلے میں آپ کا خیال کیا ہے۔

جواب : ہمارا خیال ہے کہ دونوں قسم کے گروہوں میں جو فرق ہے وہ دین اور بے دینی کا فرق نہیں ہے۔ بلکہ تصور دین یا تعبیر دین کا فرق ہے۔ وہ فرق ایک لفظ میں یہ ہے کہ ایک گروہ اپنے نصب العین کا تصور آیت خلافت سے اخذ کرتا ہے اور دوسرا گروہ آیت عبادت سے۔ ایک کے نزدیک اِنّی جاعل فی الارض خلیفۃ (اللہ نے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں) وہ قرآنی آیت ہے جس سے اسلام کا نصب العین معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے کے نزدیک جس آیت سے اسلامی نصب العین اخذ ہوتا ہے وہ یہ آیت ہے :

وماخلقت الجنّ والانس الا لیعبدون میں نے جن وانس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں

خلافتی فکر کے مطابق زمین خدا کی سلطنت کا ایک حصہ ہے اور اس حصہ پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب سلطنت مقرر کیا ہے تاکہ وہ اس کے اوپر خدا کے قوانین کا نفاذ کرے۔ دوسری طرف عبادتی فکر کے سوچنے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا کا عبد (بندہ) ہے۔ اس کے لئے اپنے رب کی رضامندی حاصل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کرے، وہ اس کے آگے اپنے آپ کو بچھا دے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ خلافتی فکر رکھنے والے عبادت کو نہیں مانتے۔ یا عبادتی فکر رکھنے والوں کے یہاں "خلافت" کا کوئی مقام نہیں ہے۔ یہ فرق صرف اس معنی میں ہے کہ کوئی گروہ دینی تعلیمات کے مجموعہ کو کس رخ سے دیکھتا ہے۔ قرآن کو اگر کوئی شخص آیات قتال کے ذریعہ سمجھنا چاہے تو قرآن اس کو کتاب جنگ نظر آسکتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کو جو شخص آیات خشیت کی روشنی میں دیکھے، اس کو قرآن کتاب تقویٰ نظر آئے گا۔ ایسا ہی کچھ فرق مذکورہ دونوں گروہوں میں پایا جاتا ہے۔ خلافتی گروہ خلافت سے چل کر عبادت کو لیتا ہے۔ وہ عبادت کی معنویت کو اسی وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ وہ اس کو حکومت وسیاست کے خانہ میں بٹھالے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ عبادت کی نگاہ سے خلافت کو سمجھنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک عبادت بجائے خود مقصود ہے اور بقیہ تمام چیزیں اسی وقت بامعنی ہیں جبکہ وہ عبادت کے سرچشمہ سے نکلی ہوں۔

اس فرق کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ خود خلافت وعبادت کے تصور میں دونوں گروہوں کے درمیان فرق ہوجاتا ہے۔ خلافتی گروہ کے نزدیک حکومت اسلامی کا قیام دین کا مکمل ظہور ہے اور عبادت کی حیثیت یہ ہے کہ وہ حکومت اسلامی کے داعیوں یا کارکنوں کی تربیت واصلاح کا ذریعہ ہے۔ جب کہ عبادتی گروہ کا ذہن یہ ہے کہ اللہ کا حقیقی عبادت گزار بننا ہی مکمل مسلمان اور مکمل دین دار بننا ہے۔ جہاں تک خلافت یا حکومت کا تعلق ہے، اس کی حیثیت ایک دنیوی ذمہ داری کی ہے جو خاص حالات میں مسلمانوں سے مطلوب ہوتی ہے۔ نیز یہ ذمہ داری بھی، بہت سی دوسری شرعی ذمہ داریوں کی طرح، مشروط ذمہ داری ہے اور کبھی عائد ہوتی ہے اور کبھی عائد نہیں ہوتی۔

آدمی ہر بات کا ایک جواب تلاش کر لیتا ہے (کہف ۵۴)

ایک شخص بے معنی شور و غل کر رہا تھا
دوسرا شخص آہستہ سے بولا : میرے بھائی چپ رہو۔
پہلے شخص نے کہا : مجھ سے چپ ہونے کو کہتے ہو اور تم خود چیخ رہے ہو۔

سڑک پر ایک راہ گیر صحیح سمت میں چلا جا رہا تھا۔
پیچھے سے ایک نوجوان تیزی سے سائیکل دوڑاتا ہوا آیا اور راہ گیر سے ٹکرا گیا
راہ گیر نے سائیکل والے سے کہا "گھنٹی کیوں نہیں بجائی "
سائیکل والا غصہ سے بولا : "گھنٹی نہ ہو تو ۔ ۔ ۔ "
" پھر بریک کیوں نہیں دیا " راہ گیر نے دوبارہ کہا
" بریک نہ ہو تو " سائیکل والے نے کہا اور راہ گیر کو تیز نظروں سے دیکھتا ہوا آگے روانہ ہو گیا۔

ایک شخص قبر پر سجدہ کر رہا تھا
دوسرا شخص بولا : "میرے بھائی خدا کو سجدہ کرو۔ قبر کو سجدہ کرنا جائز نہیں"
پہلا شخص ڈنڈا لے کر دوسرے کے اوپر پل پڑا
"میرے بھائی آخر مجھ کو مارتے کیوں ہو" دوسرے شخص نے کہا
پہلا شخص بولا : اور تم کیا میرے اوپر پھول برسا رہے تھے۔

ایک شخص ایک ادارہ میں رہائشی ملازم تھا
ادارہ کے انچارج نے اچانک ایک روز اس سے کہا : کل سے آپ اپنا کمرہ خالی کر دیں
ملازم نے کہا : میرا کمرہ ہی تو میرا دفتر بھی ہے۔ اگر میں کمرہ چھوڑ دوں تو کام کہاں کروں
" میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کمرہ خالی کر دیں اور آپ مجھ سے بحث کر رہے ہیں " انچارج نے جواب دیا۔

" یہ کون سا اسلام ہے کہ سینما ہاؤس میں آگ لگا کر چار سو مسلمانوں کو جلا دیا جائے " ایک شخص نے ایرانی لیڈر سے کہا
" ہم نے کب آگ لگائی ہے۔ یہ تو شاہ کے ایجنٹوں نے ہماری تحریک کو بدنام کرنے کے لئے کیا ہے "

لوگ انسانی عدالت کے بارے میں سنجیدہ ہیں مگر خدائی عدالت کے بارے میں نہیں

ایک صاحب وکیل تھے اور اسی کے ساتھ شاعر بھی۔ وہ دیوانی میں وکالت کرتے تھے۔ ایک مقدمہ میں ان کے فریق مخالف کا نام عبدالباقی تھا۔ بحث کے دوران انھوں نے جج سے کہا: "حضور! ان کا نام عبدالباقی ہے۔ اسی سے یہ ثابت ہے کہ ان کے ذمہ ہمارا باقی ہے"۔ جج نے کہا: "مسٹر وکیل! یہ عدالت کا کمرہ ہے۔ یہ کوئی مصرعہ طرح کا مشاعرہ نہیں ہے"۔ یہ سنتے ہی وکیل صاحب فوراً سنجیدہ ہو گئے اور قانونی انداز میں گفتگو شروع کر دی ——

اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وکیل صاحب کو معلوم تھا کہ فیصلہ کا اختیار ان کو نہیں ہے بلکہ عدالت کو ہے اور عدالت جو فیصلہ کرے گی، قانون کی بنیاد پر کرے گی نہ کہ ادبی نکتوں کی بنیاد پر۔

اسی قسم کے واقعات دین کے معاملہ میں بھی پیش آتے ہیں۔ آدمی بطور خود ایک نظریہ گھڑتا ہے یا ایک دینی عقیدہ بناتا ہے اور کہتا ہے کہ یہی اللہ اور رسول کا دین ہے۔ اس کے سامنے قرآن وحدیث کے حقائق لائے جاتے ہیں جو صریح طور پر ثابت کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی بتائی ہوئی صراط مستقیم سے ہٹا ہوا ہے۔ مگر وہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بے بنیاد بحث کو بدستور جاری رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو یقین نہیں کہ فیصلہ "دوسری عدالت" میں ہونا ہے نہ کہ اس کی اپنی عدالت میں۔ اگر وہ اللہ کی عدالت کو اسی طرح دیکھنے لگے جس طرح مذکورہ وکیل کو انسانی عدالت کھلی آنکھوں سے دکھائی دے رہی تھی تو وہ فوراً سنجیدہ ہو جائے۔ وہ بحث و جدال میں پڑنے کے بجائے خدا کی کتاب اور رسول کی سنت میں غور کرنے لگے اور بالآخر اس حقیقت کو مان لے جس کو موت کے بعد ہر ایک ماننے پر مجبور ہوگا۔

ایسے زندہ انسان ہمارے اندر کیوں نہیں

ہندوستانی انجینیر غیر ضروری تعمیرات اور غیر ضروری ڈرائنگوں پر کروروں روپیہ ضائع کرتے ہیں، اس کی مثال دیتے ہوئے مسٹر کے۔ ڈی۔ مالویہ (سابق وزیر پٹرولیم) نے بتایا کہ مشرقی ہندستان میں ایک پل پر کام ہو رہا تھا۔ اس دوران ڈرلنگ مشین کو پل پر لے جانے کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت موقع پر دو انجینیر تھے۔ ایک روسی اور دوسرا ہندوستانی۔ ہندستانی انجینیر نے کہا کہ ڈرل کرنے کی بھاری مشین پل کے اوپر لے جائی گئی تو پل ٹوٹ کر گر جائے گا۔ اس لئے مشین اس وقت تک پل پر نہ چڑھائی جائے جب تک اس کے استحکام کا مزید انتظام نہ کر لیا جائے۔

روسی انجینیر کو اس سے اختلاف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈرلنگ مشین کو ہم پل پر لے جا سکتے ہیں اور اس سے پل کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بحث بڑھی یہاں تک کہ یہ مسئلہ متعلقہ وزیر تک پہنچا۔ روسی انجینیر نے اپنے نقطۂ نظر کی وکالت کرتے ہوئے وزیر سے کہا: "روس میں میری بیوی اور بچے ہیں، اور میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ مگر میں اس کے لئے تیار ہوں کہ پل کے نیچے کھڑا ہو جاؤں جب کہ مشین پل کے اوپر چڑھائی جائے"۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے روسی انجینیر نے فی الواقع ایسا ہی کیا اور بے ضرر نکل آیا۔

کے۔ سی۔ کھنا، مطبوعہ اسٹیٹسمین دہلی ۲۱ ستمبر ۱۹۷۰

محمد علی
فروری
۱۹۷۸
میں
اپنے
حریف
سے
شکست
کھا گئے



Leon Spinks catches Muhammad Ali with a right hook in their world heavyweight title bout at Las Vegas on Wednesday. The 24-year-old Spinks became the new world champion in a 15-round points decision.

محمد علی
نے
ستمبر
۱۹۷۸
میں
دوبارہ
اپنے
حریف پر
فتح
حاصل کی



Leon Spinks ducks low as Muhammad Ali lands a left during their heavyweight title bout at the Superdrome in New Orleans on Friday night. Ali regained the title.—AP radiophoto.

جو شخص ہار کو مان لے وہی تیاری کر کے دوبارہ اپنے حریف کے مقابلہ میں کامیاب ہوتا ہے

۱۵ فروری ۱۹۷۸ کو ساری دنیا نے حیرت کے ساتھ یہ خبر سنی کہ باکسنگ کے مشہور چیمپین محمد علی کو ایک غیر معروف کھلاڑی لیون اسپنکس نے ہرا دیا۔ اب محمد علی کے لئے ایک راستہ وہ تھا جو عام طور پر ہارے ہوئے سیاستداں اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایک اخبار نکال کر ججوں کی "دھاندلی" کا شور مچاتے۔ اپنے پرجوش حامیوں کو لے کر اسپنکس کے خلاف ایجی ٹیشن چلاتے اور اس کو قتل کرنے یا اس پر مقدمہ چلانے کی کوششیں کرتے۔ خود ساختہ طور پر ایک لقب وضع کر کے اپنے نام کے ساتھ لگا لیتے اور سمجھتے کہ وہ اب بھی کھیل کی دنیا کے "امام" ہیں۔ محمد علی اگر اس قسم کا راستہ اختیار کرتے تو اس کے لئے ان کے پاس پیسہ بھی تھا اور اعوان و انصار بھی۔ مگر اس قسم کے تمام طریقوں کو چھوڑ کر انھوں نے محنت و مشقت اور خاموش تیاری کا طریقہ اختیار کیا۔

ہارنے کے بعد پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت، محمد علی نے فروری ۱۹۷۸ کے تیسرے ہفتہ میں بنگلہ دیش کا پانچ روزہ دورہ کیا۔ ان کو بنگلہ دیش کی اعزازی شہریت دی گئی اور ان کو امریکہ میں بنگلہ دیش کا اعزازی قونصل جنرل بنانے کا اعلان کیا گیا۔ اس موقع پر ۲۲ فروری کو ڈھاکہ کی ایک پریس کانفرنس میں ایک اخباری نمائندہ نے محمد علی سے پوچھا کہ لیون اسپنکس سے مقابلہ میں ججوں کے فیصلہ کو کیا وہ صحیح فیصلہ سمجھتے ہیں۔ محمد علی نے صاف لفظوں میں کہا:

It was a fair decision.

یہ ایک بے لاگ فیصلہ تھا۔ علی نے صاف لفظوں میں اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:

I misjudged the man (Spinks) and fought a wrong battle. my planning was not correct because I did not know much about Spinks

The Times of India, 23.2.1978

میں نے اپنے حریف کو سمجھنے میں غلطی کی اور اس سے غلط جنگ لڑی۔ میری منصوبہ بندی صحیح نہیں تھی کیوں کہ میں اسپنکس کے بارے میں کچھ زیادہ جانتا نہ تھا۔

محمد علی نے اب اپنی زندگی کا نیا نظام بنایا اور باقاعدہ تیاری میں لگ گئے۔ وہ دن بھر دوڑتے، پہاڑیوں پر چڑھتے۔ بھری ہوئی بوری میں گھونسے مار مار کر اپنے ہاتھوں کی تربیت کرتے۔ اپنے ساتھیوں سے آزمائشی مقابلے کرتے، اور اسی کے ساتھ عبادت کر کے دعا بھی کرتے کہ خدا انھیں اگلے مقابلہ میں کامیاب کرے ——

محمد علی کی عمر ۳۶ سال ہے اور ان کے حریف لیون اسپنکس کی عمر ۲۵ سال، یعنی دونوں کی عمر میں گیارہ سال کا فرق ہے۔ مبصرین کا خیال تھا کہ محمد علی کی عمر ان کے لئے فیصلہ کن بن چکی ہے اور اب وہ اپنے نوجوان حریف سے دوبارہ جیت نہیں سکتے۔ مگر محمد علی نے پورے جوش اور اہتمام کے ساتھ اپنی تیاریاں جاری رکھیں۔ وہ روزانہ صبح ۵ بجے اٹھ کر تین میل پہاڑی راستہ پر دوڑتے جب کہ ابھی اندھیرا چھایا ہوا ہوتا اور لوگ اپنے نرم بستروں پر سوئے ہوئے ہوتے۔ اس کے بعد سارے دن سخت ترین

قسم کی ورزشوں میں لگے رہتے ۔

اگست میں، مقابلہ کی تاریخ سے کچھ پہلے، انھوں نے ڈیرلیک (پنسلوانیا) میں اپنے کھیل کا مظاہرہ کیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ ۱۵ ستمبر کے مقابلہ میں میں دوبارہ ٹائٹل جیت لوں گا۔ اخباری رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ۳۶ سالہ علی آج کل اپنے باکسنگ سنٹر پر زبردست تیاری میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ بے حد سنجیدہ ہو گئے ہیں۔

اخباری رپورٹ کا ایک جملہ یہ تھا۔

Members of the Ali entourage insist that they have never seen Ali work so hard.
The Times of India 17.8.78

محمد علی کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے محمد علی کو اتنا سخت محنت کرتے ہوئے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

اس طرح محنت اور تیاری کے چھ سخت مہینے گزارنے کے بعد محمد علی نے ۱۶ ستمبر ۱۹۷۸ کو دوبارہ لیون اسپنکس سے مقابلہ کیا اور اس کے اوپر شاندار فتح حاصل کی۔ اسپنکس فتح کے بعد عیاشیوں میں پڑ گیا حتی کہ ٹریفک قواعد کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں پولس نے اس کا چالان کیا۔ جب کہ محمد علی برابر اپنی تیاری میں مشغول رہا۔

ہار کو مان لینا اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے۔ یہ حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ یہ جھوٹ کو چھوڑ کر سچائی کا راستہ اختیار کرنا ہے۔ جو شخص اپنی ہار مان لیتا ہے، اس کے اندر حقیقت پسندانہ نفسیات ابھرتی ہیں۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے لگتا ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں کو سمجھ کر دوبارہ اپنی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ وہ حریف کے خلاف لفظی طوفان اٹھانے کے بجائے حقیقی میدان میں اس کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کرتا ہے۔ ایک طرف اس کا حریف فتح کی خوشی میں مگن ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ اپنی شکست کے احساس کو لئے ہوئے سنجیدہ تیاریوں میں مصروف ہوتا ہے ـــــ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص مقابلہ کے میدان میں ہار گیا تھا وہ دوبارہ اپنے حریف کو شکست دے کر کامیاب ہو جاتا ہے۔

یہ وقت ہم میں سے ہر شخص کے لئے مقدر ہے

کینیا کے صدر جوموکنیاٹا ۲۱ اگست ۱۹۷۸ کی رات کو سمندر کے کنارے اپنے صدارتی محل میں سوئے۔ اگلی صبح کو وہ اپنے بستر پر مردہ پائے گئے۔ ان کی عمر تقریباً ۸۵ سال تھی۔ مشہور انگریز ایکٹر رابرٹ شا ۲۸ اگست ۱۹۷۸ کو اپنی کار میں اپنی رہائش گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ راستہ میں ان کے دل میں درد اٹھا۔ وہ کار کھڑی کرکے باہر سڑک پر نکل آئے اور اچانک گر کر ختم ہو گئے۔ ان کی عمر ۵۱ سال تھی۔

اسی طرح ہر ایک کا ایک وقت مقرر ہے۔ کسی پر سوتے ہوئے وہ وقت آجاتا ہے، کوئی راہ چلتے پکڑ لیا جاتا ہے اور کوئی بستر پر بیمار ہو کر مرتا ہے۔ یہ وقت بہرحال ہر ایک پر آنا ہے۔ خواہ وہ ایک صورت میں آئے یا دوسری صورت میں۔

مولانا وحیدالدین خاں صاحب کے طرزِ تحریر کی اس خوبی سے کسی کو انکار نہیں کہ موصوف کا قلم اسلام کے اعتقادی اور عباداتی مسئلہ کو عصرِ حاضر کے موثر اسلوب میں آج کے سائنسی ذہن کو مطمئن کرنے کی کامیاب کوشش کرتا ہے۔ موصوف مسلمانوں کے ذہنی جمود، رسم پرستی اور اسلامی سیاست کے نام پر ہڑبونگ بازی اور استحصال پسندی پر بھرپور وار کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ مسائل اجتہادی ہیں اور مولانا کو بھی ان مسائل پر ایک رائے رکھنے کا پورا پورا حق پہنچتا ہے۔ لیکن علمار کرام کو زیادہ شکایت اس معاملہ میں ہے کہ موصوف جمال الدین افغانی سے لے کر مودودی صاحب تک تمام انقلابی رہنماؤں پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور یہ لکھتے ہیں کہ یہ لوگ "قوم کو ایک لامتناہی جنگ میں الجھا رہے ہیں" (۱۷۵)

یہ بات چوٹی کے مسلم رہنماؤں کے بارے میں ہمیں کتنی ہی ناگوار گزرے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ۹۹ فی صد مسلم رہنما وہ ہیں جو اسلام کی سربلندی اور اعلار کلمۃ الحق کے نام پر مسلمانوں کے خون کی تجارت کر رہے ہیں۔ وہ ابتدا میں خود بھی اسی تصور کے حامی تھے۔ موصوف کے سامنے اس قسم کی تحریکات کے نقصان دہ نتائج واضح ہیں اور وہ ملت اسلامیہ کو بھی دکھانا چاہتے ہیں۔ تعلیمی اور سماجی تعمیر و اصلاح کا کام نہایت صبر آزما ہے اور حکومت الٰہیہ اور اقتدار اسلامی کے احیار و قیام کا نعرہ نہایت جذبات انگیز ہے، اس نعرہ پر آپ قوم کی تھیلیاں خالی کرا سکتے ہیں اور کرانے والے کرا رہے ہیں۔ لیکن کسی ٹھوس تعلیمی اور دینی کام کے لئے آپ مارے مارے پھرتے ہیں لیکن کوئی توجہ دینے والا

آپ کو نظر نہیں آتا:

ہر صاحب بصیرت عالم اس صورت حال پر ماتم کرتا ہے۔ مولانا وحیدالدین خاں صاحب ایسی ہی جذباتی ذہن کو للکارتے ہیں اور اس ذہن کی پیدائش کا جو سرچشمہ ہے اس پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔

راقم کے سامنے "ظہور اسلام" کتاب ہے، اس کے ۴۷ اور ۱۷۵ صفحات کو غور سے دیکھئے، مؤلف کی نکتہ چینی کا انداز آپ کو ضرور سخت لگے گا، لیکن مؤلف کے اخلاص دینی اور ملی بہی خواہی کے جذبہ سے انکار ممکن نہیں۔

بعض احباب کہتے ہیں کہ خاں صاحب مسلم سامراج کے وکیل ہیں، یہ نیت پر حملہ کی بات ہے، کیونکہ یہی مؤلف اطاعت امیر کی احادیث کے تحت یہ بات بھی لکھتا ہے "اس ہدایت کا مطلب امت کو ظالم حکمرانوں کی بے زبان رعیت بنانا نہیں" (۱۷) آزاد ہندوستان میں ہر صاحب عقل آدمی کو خاں صاحب کی اس رائے کا وزن محسوس ہو رہا ہے۔

مؤلف محترم جب رواجی تصوف پر تنقید کرتے ہیں تو موصوف کے سامنے مذہبی پیشواؤں کی وہ دکانیں ہوتی ہیں جو ان لوگوں نے مسجدوں اور خانقاہوں میں لگا رکھی ہیں۔ جو مقامات توہم پرستی کا قلع قمع کرنے اور اس کی جگہ توحید پرستی قائم کرنے کے لئے بنائے گئے تھے وہاں آج کیا ہو رہا ہے؟ مشرکانہ جادو ٹونے کی تجارت۔ فقہ کے معاملہ میں مؤلف دور رسالت و صحابہ کی سادگی کی طرف بلاتے ہیں اور نفلی عبادات اور اس کے فقہی مسائل نے آج دین دار طبقہ کو جن لاطائل بحثوں اور گروہ بندیوں میں پھنسا رکھا ہے اس سے نجات دلا

کہ اصول اسلام اور فرائض شریعت پر پورا زور صرف کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور یہ وہ مسئلہ ہے جس پر امام شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں بہت کچھ لکھا ہے، خان صاحب اگر لکھتے ہیں تو ان پر ناراض ہونا بے کار ہے۔

"الاسلام" اور "ظہور اسلام" کے مؤلف محترم نے شریعت کی عام اصطلاحات کو چھوڑ کر بعض مسائل میں خود اپنی وضع کردہ اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ اگر مؤلف ان سے گریز کرتے تو علماء عصر کو ان سے زیادہ شکایت نہ ہوتی۔ اپنی اصطلاحوں کے مسئلہ نے شیخ ابن عربی کی شخصیت اور ان کے خیالات کو کس قدر نزاعی بنا دیا ہے۔

مولانا نے ظہور اسلام (۱۰۷) میں لکھا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو خارق عادت معجزات نہیں دیئے گئے"۔ ظاہر ہے کہ حضور کو معجزات عطا کئے گئے، مولانا بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔ پھر اس نفی کا کیا مطلب ہے؟ یہی حال بعض تاریخی توجیہات کا ہے۔

حضرت عثمان غنی کی شہادت پر مؤلف محترم لکھتے ہیں کہ "یہ دراصل شریعت کے حکم کی تعمیل تھی۔" (ظہور اسلام ۶۹) اور اس کے لئے مثال ہابیل قابیل کی دی ہے، لیکن یہ بات وضاحت طلب ہے کہ حضرت عثمان کا قتل ایک فرد واحد کا قتل تھا یا ملت کی اجتماعیت کا قتل تھا، ایک خلیفہ وقت ملت کی شیرازہ بندی کا نشان ہوتا ہے اگر وہ کسی فتنہ کو دفع کرنے کی طاقت رکھتا ہے تو اس وقت اس کا فرض کیا ہونا چاہئے؟ اپنے آپ کو قتل کے حوالہ کرکے ملت کو انتشار کے حوالے کرنا یا بزور شمشیر اس فتنہ کو ختم کرکے ملی اجتماعیت کی حفاظت کرنا۔ کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ خون عثمان کے حربے نے بنی امیہ کی خاندانی عصبیت کو فتنہ انگیزی کا موقع دیا اور پھر صفین اور کربلا اور مابعد تک جو معرکے برپا ہوئے سب اسی کے ثمرات تھے۔

(مولانا) اخلاق حسین قاسمی۔ صدر جمعیۃ علماء صوبہ دہلی

عرض الرسالہ

۱۔ معجزات کے سلسلے میں ہم نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔ معجزہ کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ ـــ وہ خارق عادت واقعہ جو نبوت کے اثبات کے لئے منکرین کے مطالبہ پر پیش کیا جائے۔ قرآن کی صراحت ہے کہ اس قسم کا فرمائشی معجزہ یا بالفاظ قرآن "آیت" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیا گیا (بنی اسرائیل ۵۹) منکرین کی طرف سے جب آیت (نشانی، معجزہ) کا مسلسل مطالبہ ہوا تو کہا گیا کہ یہ قرآن جو اتارا گیا ہے یہی ہماری طرف سے آیت ہے (عنکبوت ۵۱) صحیحین کی یہ روایت ظہور اسلام صفحہ ۱۸۲ پر نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نبی کو زمانہ کے لحاظ سے کوئی آیت (دلیل رسالت) ضرور دی گئی ہے۔ مگر مجھ کو جو چیز دی گئی، وہ صرف قرآن ہے (وانما کان الذی اوتیتہ وحیا اوحاہ اللہ الی)

مولانا سید سلیمان ندوی اور دوسرے حضرات نے آپ کے جو خارق عادت واقعات جمع کئے ہیں، ان کے برحق ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ مگر ان کو جو لوگ معجزہ کہتے ہیں وہ مجازی طور پر کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ سب نصرت کے واقعات ہیں نہ کہ حقیقتہً معجزہ کے واقعات۔ امت کے متفقہ عقیدہ کے مطابق قرآن ہی آپ کا دائمی معجزہ ہے۔ شق قمر کے بارے میں کچھ لوگوں کو شبہ ہوا ہے کہ

وہ مطالبہ کفار پر پیش آیا تھا۔ مگر یہ غلط فہمی ہے۔ کیونکہ روایات میں جو الفاظ آئے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ یہ واقعہ فلکیاتی اسباب کے تحت بطور خود پیش آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چاند پھٹا تو آپ نے لوگوں سے کہا کہ یہ دیکھ لو (انشق القمر علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم شقتین حتی نظروا الیه فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم اشهدوا، ابن کثیر)

۲۔ خلیفہ سوم رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں یہ ثابت ہے کہ آپ کا رویہ کسی کمزوری کی بنا پر نہ تھا بلکہ تمام تر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی تعمیل میں تھا۔

یوم الدار (محاصرہ کے زمانہ) میں جب آپ سے کہا گیا کہ آپ ان مسلمانوں سے جنگ کیوں نہیں کرتے تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد لیا ہے کہ میں جنگ نہ کروں (ان رسول الله صلی الله علیه وسلم عهد الی عهدا وانی صابر نفسی علیه، احمد عن عائشہ) محاصرہ کے وقت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مسئلہ پوچھا تو انھوں نے کہا: الکف الکف، البدایہ والنہایہ) ایسی حالت میں "ظہور اسلام" میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف ایک حکم رسالت کی توجیہہ ہے، نہ کہ کوئی ذاتی رائے۔ ●●

عالی ظرفی

مظفر حلیم (متوفی ۹۳۲ھ) والی گجرات اور محمود خلجی والیٔ مانڈو (احمد آباد) دونوں ہم زمانہ تھے ان میں باہم لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ محمود خلجی اکثر گجرات پر حملہ کرتا تاکہ اس "خوبصورت اور سرسبز" ملک کو اپنی قلمرو میں شامل کرلے۔ تاہم اسے اپنے اس ارادہ میں کامیابی نہ ہوسکی۔ اس درمیان میں ایسا ہوا کہ محمود خلجی کے وزیر منڈلی رائے نے موقع پاکر سلطان کو تخت سے بے دخل کردیا اور خود ملک پر قابض ہوگیا۔

سلطان محمود خلجی کو معلوم تھا کہ سلطان مظفر حلیم اگرچہ اس کا حریف ہے مگر ایک شریف انسان ہے۔ وہ جرأت کرکے اس کے پاس پہنچا اور اس سے اپنے وزیر کے خلاف مدد کی درخواست کی۔ سلطان مظفر فوراً اس کی مدد کے لئے تیار ہوگیا اور اپنی فوج لے کر مانڈو پہنچ گیا۔ زبردست مقابلہ کے بعد منڈلی رائے کی فوج نے ہتھیار ڈال دیے اور گجرات دوبارہ فتح ہوگیا۔ سلطان مظفر کے فوجی سرداروں نے کہا کہ اس ملک کو ہم نے لڑ کر فتح کیا ہے۔ اب اس کو محمود خلجی کے حوالے کرنا مناسب نہیں۔ آپ اس کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کا اعلان کردیں۔ سلطان مظفر حلیم نے اس کو اپنی حمیت و غیرت کے خلاف سمجھا اور اس مشورہ کو ماننے سے قطعاً انکار کردیا۔ تاہم اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی فاتح فوج کوئی مسئلہ کھڑا کردے۔ اس نے اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ کوئی بھی شخص مفتوحہ شہر میں داخل نہ ہو اور سب کو فوری طور پر اپنے وطن کی طرف واپسی کا حکم دے دیا۔

(آصفی کی عربی تاریخ "ظفر الوالہ")

اسلام کے خلاف جدید شبہات کو ڈھا دینے والی کتاب

مذہب اور جدید چیلنج

"علم جدید کا چیلنج" مولانا وحید الدین خاں کی مشہور کتاب ہے۔ "مذہب اور جدید چیلنج" اسی کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۶ میں اردو میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد عربی اور ترکی زبانوں میں اس کے درجن سے اوپر ایڈیشن شائع ہوئے۔ تمام عالم اسلام میں اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ۱۰ فروری ۱۹۷۶ کو مولانا وحید الدین خاں طرابلس میں صدر قذافی سے ملے تو لیبی لیڈر نے فوراً کہا: لقد قرأت کتابك الاسلام يتحدى (میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی پڑھ لی ہے)۔

الامام الاکبر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود (جامعہ ازہر قاہرہ) نومبر ۱۹۷۵ میں ہندستان آئے انھوں نے جامعہ ڈابھیل سورت میں تقریر کرتے ہوئے علماء سے کہا کہ آپ لوگ الاسلام یتحدی کا مطالعہ کیجئے۔ جس میں اسلام کے خلاف جدید شبہات کا کافی وشافی رد موجود ہے۔

قاہرہ کے روزنامہ الاہرام نے اس کتاب کے عربی ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"مصنف کتاب نے اسلام کے مطالعہ کا ایک ایسا علمی انداز اختیار کیا ہے جو بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ جدید مادی فکر کے مقابلہ میں دین کو وہ اسی طرز استدلال سے ثابت کرتے ہیں جس سے منکرین مذہب اپنے نظریات کو ثابت کرتے ہیں۔ ۔ ۔ اسلام کے ظہور سے لے کر اب تک چودہ سو سالوں میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر تاریخ کو چھانا جائے اور اللہ کی طرف بلانے والی عمدہ کتابوں کو چھلنی سے چھان کر نکالا جائے تو کتاب الاسلام یتحدی بلاشک و شبہ ان میں سے ایک ہوگی۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مصنف کتاب کے عمل کو قبول فرمائے۔ ان کے دل کو نور سے، ان کی عقل کو معرفت سے اور ان کی روح کو رضا سے بھر دے اور ان کے قلم کو ایسی روشنائی عطا کرے جو لکھنے سے کبھی ختم نہ ہو۔"

قیمت: تیرہ روپے پچاس پیسے

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

"مذہب اور جدید چیلنج" پر
ایک یادگار تبصرہ

"مذہب اور جدید چیلنج" کا پہلا ایڈیشن جو علم جدید کا چیلنج کے نام سے ۱۹۶۶ میں چھپا تھا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا محمد عامر عثمانی مرحوم نے اپنے رسالہ تجلّی کے "آغاز سخن" میں مفصل نوٹ شائع کیا تھا۔ اس کا ایک جزء یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"اس کتاب کا تذکرہ کرنا آج ہمیں ہر دوسرے موضوع سے زیادہ محبوب نظر آرہا ہے۔ خدا مصنف کو بہترین اجر عطا فرمائے۔ ہمارے علم کی حد تک یہ کتاب اپنے موضوع پر دنیا کی واحد کتاب ہے۔ اس کا موضوع فقط یہ نہیں کہ سائنس کے مقابلہ پر مذہب کا اثبات کیا جائے۔ بلکہ اس کے موضوع کا تشخص تقریباً ان الفاظ میں ہو سکتا ہے کہ —— ملحد سائنس دانوں اور فلسفیوں کا رد ٹھیک اسی علم کلام کے ذریعہ جسے یہ لوگ مذہب کی تردید میں استعمال کرتے ہیں۔

اس کتاب کی تعریف کا حق محض یہ کہہ کر ادا نہیں ہو سکتا کہ یہ ٹھوس ہے، مفید ہے، قیمتی ہے۔ اس طرح کی باتیں تو اس سے کمتر کتابوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہیں۔ ہمیں کہنا چاہئے، اور یہ ہمارے دل کی آواز ہے کہ یہ کتاب وہ فرض کفایہ ہے جسے مصنف کی سعادت مندی اور توفیق اور خداداد صلاحیت نے پوری امت کی طرف سے ادا کیا ہے۔

نہیں۔ یہ بھی ہم نے غلط کہا۔ فرض کفایہ فرائض کی بہت ہلکی قسم ہے۔ یہ فکر نو کے مذہب دشمن اور تمرد آمیز طوفان کے آگے فولادی دلائل کا بند باندھنا، ملحد مفکرین کے تباہ کن علم کلام کا توڑ مہیا کرنا اور مذہبی عقائد و افکار کو خیرہ کن سفسطوں کی یلغار سے بچانا آج اتنا بڑا فریضہ ہے جسے افرض الفرائض بھی کہہ دیں تو مبالغہ نہیں۔

مصنف نے اگر ڈیوٹی انجام دی ہے تو ملت کے دیگر اہل افراد کے ذمے سے یہ ڈیوٹی ساقط نہیں ہو جاتی۔ اگر ہمیں حقیقت اور واقعات کا احساس و ادراک ہوتا تو جس طرح ہم مدرسے اور مکتب چلانے کے لئے قوم سے چندہ لیتے اور بڑے بڑے خرچ پورے کرتے ہیں، اسی طرح اس کتاب کو اردو، ہندی، انگریزی اور دنیا کی تمام قابل ذکر زبانوں میں بھاری تعداد میں چھاپتے، پھیلاتے، مفت پہنچاتے۔

مصنف نے اپنی کتاب میں جوابی بحث کے ذیل میں جو سائنسی معلومات جمع کی ہیں وہ بجائے خود اس کتاب کو بہت قیمتی بنا دیتی ہیں۔ اللہ اکبر، کیا کیا ایمان تازہ ہوتا ہے ان جدید تر سائنسی اکتشافات کو دیکھ کر جن سے یہ کتاب روشناس کراتی ہے۔ کتنی قطعیت کے ساتھ ہر تازہ سے تازہ تر انکشاف گواہی دے رہا ہے کہ مذہب اٹل ہے، مذہب برحق ہے، مذہب سے بے تعلق ہو کر انسانی معاشرہ نہ پہلے کبھی فلاح کو پہنچا نہ آج پہنچ سکتا ہے۔

مصنف کی کتاب پڑھ کر ہم ایسی کیفیت محسوس کر رہے ہیں کہ اگر وہ ہمارے سامنے ہوں تو ہم والہانہ انداز میں ان انگلیوں کو چوم لیں جن کی جنبش اس کتاب کو ظہور دینے کا ذریعہ بنی ہے۔"

(ماہنامہ تجلّی دیوبند۔ جولائی۔ اگست ۱۹۶۶)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ ایک شخص نے ناجائز طور پر دوسرے کی زمین پر قبضہ کر لیا تھا مگر اس کی قانونی خانہ پری "اتنی مکمل تھی کہ ظاہری طور پر اس کے خلاف فیصلہ دینا بھی مشکل تھا۔ آپ نے فرمایا" تمہاری ہوشیاری کی بنا پر اگر عدالت نے تمہاری موافقت میں فیصلہ دے دیا تو سمجھو کہ اس نے تم کو آگ کا ایک ٹکڑا دیا" گویا اس آدمی کے عمل کا نتیجہ دنیوی اعتبار سے تو زمین کا ایک محبوب ٹکڑا تھا۔ مگر آخرت کے اعتبار سے وہ بھڑکتی ہوئی آگ کا ایک شعلہ تھا۔ وہ اپنے عمل سے پیچھے کی دنیا میں زمین چھوڑ رہا تھا اور آگے آخرت کی دنیا میں آگ بھیج رہا تھا۔

اسی طرح نیک اعمال کا معاملہ بھی ہے۔ امام احمد نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول غصہ کے بارے میں نقل کیا ہے:

مانجرع عبد جرعة من لبن او عسل خير من جرعة غيظ	کسی بندہ نے غصہ کے گھونٹ سے بہتر دودھ یا شہد کا گھونٹ نہیں پیا۔

غصہ کو پی جانا دنیا کے اعتبار سے انتہائی کڑوا گھونٹ ہے۔ مگر اس عمل کا جو اخروی نتیجہ ہے، وہ دودھ اور شہد سے بھی زیادہ میٹھا اور لذیذ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ گرمی کی شدت جہنم کی سانس کی وجہ سے ہوتی ہے (ان شدة الحر من فيح جهنم) اسی طرح حدیث معراج میں ہے کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو وہاں آپ نے چار نہریں دیکھیں۔ دو نہریں اندر بہتی تھیں اور دو باہر۔ جبریل نے بتایا کہ اندر اندر بہنے والی نہریں تو بہشت کے دریا ہیں اور اوپر اوپر بہنے والے نیل اور فرات۔ گویا موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا ایک ہی واقعہ کے دو پہلو ہیں۔ دنیوی پہلو حقیر اور عارضی ہے۔ اخروی پہلو بہتر اور مستقل۔ آج ہم دنیوی پہلو سے دوچار ہیں۔ موت کے بعد ہم اخروی پہلو سے دوچار ہوں گے۔

انسانی عمل کے اس دوگونہ پہلو کو حدیث معراج میں مختلف تمثیلات کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔

○○○

انسانوں کی ایک قسم یہ بھی ہے

عمر بن ربیعہ (۹۳ — ۲۳ھ) ایک شاعر تھا جو زیادہ تر عشقیہ مضامین نظم کرتا تھا۔ حتی کہ شریف خاندان کی عورتوں کا نام لے کر ان کے بارے میں عریاں اشعار کہنے لگا۔ اس کے خلاف شکایات حکومت تک پہنچیں۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کو دھلک میں جلا وطن کر دیا جو یمن اور حبشہ کے درمیان بحر احمر کا ایک جزیرہ تھا۔ وہ عین اس رات کو پیدا ہوا جس رات کو حضرت عمر فاروق نے انتقال فرمایا۔ لوگ اس کے بارے میں کہا کرتے تھے "کتنا بڑا حق اٹھ گیا اور کیسا باطل اس کی جگہ آ گیا"

عمر بن ربیعہ کا ایک شعر یہ ہے:

الا ليت ام الفضل كانت قرينتي ‏ ‏ ‏ هنا او هنا في جنة او جهنم

کاش ام الفضل کسی صورت سے بھی میری رفیقہ بن جائے، یہاں یا وہاں۔ جنت میں یا جہنم میں۔

الرسالہ کے پیغام کو پھیلانے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قائم کریں

اعظم گڑھ (یوپی) میں ایک ڈگری کالج ہے جس کا نام شبلی نیشنل کالج ہے۔ ملک زادہ منظور احمد یہاں انگریزی زبان کے شعبہ میں لکچرر تھے۔ وہ ۱۹۵۲ سے ۱۹۶۴ تک یہاں استاد رہے۔ وہ کمیونسٹ تھے دن کو وہ کالج میں انگریزی کی کلاس لیتے اور شام کے وقت شہر کے چوراہے پر کھڑے ہو کر پارٹی کا اخبار بیچتے۔ سڑک پر ہاتھ میں اخباروں کا بنڈل لئے ہوئے جب وہ کہتے کہ "وہ پارٹی کیوں نہ کامیاب ہوگی جس میں میرے جیسا آدمی اخبار بیچے" تو سننے والوں پر عجیب تاثر ہوتا۔

اب ایک اور مثال لیجئے۔ چند ماہ پہلے ایک مسلم نوجوان مجھ سے ملے۔ انھوں نے ایک اسلامی اخبار نکالنا شروع کیا تھا۔ اخبار کی پہلی اشاعت پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا: "میری جوتوں کی دکان ہے اور اللہ کے فضل سے کامیاب ہے۔ مگر مجھ کو پسند نہیں آیا کہ میں زندگی بھر چپل سیوک بنا رہوں۔ آدمی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سوسائٹی میں معزز مقام حاصل کرے۔"

موجودہ زمانہ میں مسلم قوم کے المیہ کی، کم از کم ایک بڑی وجہ وہی ہے جو مذکورہ واقعہ میں نظر آتی ہے۔ ہمارا ہر آدمی "لیڈر" کی سطح پر قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ "ہاکر" کی سطح پر قوم کی خدمت کرنے سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ مذکورہ مسلم نوجوان نے سادگی میں اپنے دل کی بات کہہ دی۔ مگر یہی سارے لوگوں کا حال ہے۔

الرسالہ جس تعمیری اور اصلاحی مقصد کے تحت نکالا گیا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی اشاعت زیادہ سے زیادہ بڑھائی جائے۔ اس سلسلہ میں ہم اپنے مسلم بھائیوں سے مذکورہ کمیونسٹ جیسے تعاون کی امید تو نہیں کر سکتے۔ تاہم اس سے کم تر درجہ کے ایک تعاون کی ہم ان سے اپیل کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ ہر شخص جو ہم سے ہمدردی یا اتفاق رکھتا ہے، وہ اپنے مقام پر رسالہ کی ایجنسی قائم کرے۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا چندہ دینا لوگوں کو مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے ہو تو ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اسے لے لیتے ہیں۔ اس صورت حال میں الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہر ہر جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ یہ کم سے کم تعاون ہے جو الرسالہ کے ہمدرد الرسالہ کے خیالات کو عام کرنے کے لئے ہمیں دے سکتے ہیں۔

ایجنسی لینے والے کے لئے اس کام میں کسی نقصان کا سوال نہیں ہے۔ کیوں کہ شرائط ایجنسی کے مطابق غیر فروخت شدہ پرچے واپس لے لئے جاتے ہیں۔ بہترین عملی صورت یہ ہے کہ کم تعداد سے ایجنسی شروع کی جائے ابتداءً پانچ یا دس پرچے منگائے جائیں اور پھر حالات کے مطابق بڑھایا جاتا رہے۔ تعاون کی یہ صورت ہلکی بھی ہے اور بے خطر بھی۔ اگر ہمارے ہمدرد اس پر عمل کریں تو چند سال میں اس کے عظیم نتائج نکل سکتے ہیں۔

ادارہ الرسالہ

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

ہمارا مقصد

- اسلامی تعلیمات کو عصر حاضر کے اسلوب میں بیان کرنا
- مسلمانوں کے اندر حقیقی دینی روح زندہ کرنا
- ملی مسائل کے حل کیلئے مثبت اور تعمیری ذہن پیدا کرنا
- تمام بندگان خدا تک اسلام کا پیغام پہنچانا
- اسلام کو وقت کا غالب فکر بنانے کی کوشش کرنا
- مسلمانوں میں باہمی اتحاد اور خیر خواہی کا جذبہ ابھارنا
- اردو اور دوسری زبانوں میں اسلامی لٹریچر شائع کرنا
- مسلمانوں کو آخرت پسندانہ زندگی گزارنے کی تلقین کرنا
- رسمی دینداری کے بجائے حقیقی دینداری پیدا کرنا
- جدید تقاضوں کے مطابق اسلامی تعلیم کا انتظام کرنا

ادارۃ الرسالہ کے ساتھ تعاون آپ کے وقت اور سرمایہ کا بہترین مصرف ہے

وحیدالدین خاں

صدر اسلامی مرکز

سرپرست ادارۃ الرسالہ

علمی جہاد — انفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف

ہم سے پوچھا گیا ہے کہ کیا زکوٰۃ کی مد سے ادارۂ الرسالہ کی اعانت کی جاسکتی ہے۔ جواب ہے کہ یقیناً کی جاسکتی ہے اور یہ اعانت بلاشبہ زکوٰۃ کا اہم ترین مصرف ہوگی۔

قرآن میں زکوٰۃ کے جو مصارف بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک فی سبیل اللہ (توبہ ۶۰) ہے۔ یعنی اللہ کے راستہ میں دینا۔ اس سلسلے میں فی سبیل اللہ کا مفہوم متعین کرنے کے لیے بہت سی علمی وفقہی بحثیں کی گئی ہیں۔ شیخ یوسف القرضاوی (قطر) نے اس موضوع پر اپنی تحقیقی کتاب "فقہ الزکوٰۃ" میں مفصل اور مدلل گفتگو کی ہے اور آخر میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد صرف قتال نہیں ہے، نہ شخصی تملیک اس کے لئے ضروری ہے، بلکہ عمومی نوعیت کا تربیتی اور علمی جہاد بھی اس میں داخل ہے۔ اور شاید آج مسلمان اس کے سب سے زیادہ ضرورت مند ہیں" ذیل میں شیخ یوسف القرضاوی کی بحث کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے۔ شیخ موصوف لکھتے ہیں:

"موجودہ حالات میں فی سبیل اللہ سے جو اولین اور اہم ترین چیز مراد لی جائے گی وہ ہے صحیح اسلامی زندگی کے احیاء کا وہ پروگرام جو اسلام کے جملہ احکام، عقائد، تصورات، شعائر، شرعی قوانین اور اخلاق وآداب کو بروئے کار لانے کے لئے ہو۔

یہ کام اس قدر اہم اور ضروری ہے کہ اسلام کے غیرت مندوں کو اپنی زکوٰۃ کا مال اور اپنی اعانتیں اس پر صرف کرنی چاہئیں۔

ہماری رائے یہ ہے کہ بحالات موجودہ زکوٰۃ کے اس مصرف کو ثقافتی، تربیتی اور علمی جہاد کے لئے استعمال کرنا بہتر ہوگا۔ بشرطیکہ وہ خالص اور صحیح اسلامی جہاد ہو۔

عصر حاضر میں اسلام کے پیغام کو عام کرنے کے لئے جن سرگرمیوں کی ضرورت ہے۔ اس کی چند مثالیں ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا شمار بجا طور پر فی سبیل اللہ میں کیا جاسکتا ہے۔

صحیح اسلام کو پیش کرنے کے لئے دعوتی مراکز قائم کرنا جن کے ذریعہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ادیان و مذاہب کی کشمکش کے درمیان غیر مسلمین تک اسلام کا پیغام پہنچایا

سورہ توبہ (آیت ۶۰) میں صدقات کے آٹھ مصارف بیان کئے گئے ہیں جن میں سے پہلے چار مصارف (فقراء، مساکین، عاملین، مولفۃ القلوب) کے لئے حرف لام استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ کہا گیا کہ صدقات "ان کے لئے" ہیں۔ مگر بعد کے چار مصارف (غلام، قرضدار، سبیل اللہ، مسافر) کے لئے حرف فی استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہا گیا کہ صدقات ان کی مد میں صرف کرنے کے لئے ہیں۔ پہلے چار مستحقین کے لئے لام ہے جو تملیک کا معنی دیتا ہے۔ بقیہ چار مستحقین کے لئے فی ہے جو عربی زبان میں ظرفیت کے لئے آتا ہے —— حکم کے الفاظ میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلی چار اصناف کو زکوٰۃ اس طور پر ملتی ہے کہ وہ اس کی مالک ہو جاتی ہیں جب کہ بقیہ چار اصناف کی حیثیت چار مدات کی ہے (فقہ الزکوٰۃ از شیخ یوسف القرضاوی ملخصاً)

جائے یقیناً جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

اسلامی ممالک کے اندر ایسے اسلامی مراکز قائم کرنا بھی جہاد فی سبیل اللہ میں شامل ہے جو مسلم نوجوانوں کی صحیح تربیت کریں۔ اسلام کے اعتدال پسندانہ نقطۂ نظر کے مطابق ان کی رہنمائی کریں، الحاد، فکری انحراف اور عملی بے راہ روی سے انہیں بچائیں اور انہیں اسلام کی حمایت و نصرت اور اس کے دشمنوں سے نبرد آزمائی کے لئے تیار کریں۔

اسی طرح خالص اسلامی پرچہ کا اجراء جو گمراہ صحافت کے درمیان اللہ کا کلمہ بلند کرنے حق بات کا اظہار کرنے، اسلام پر عائد کئے جانے والے جھوٹے الزامات کی تردید کرنے، شبہات کا ازالہ کرنے، اور اسلام کو ہر قسم کی حاشیہ آرائی اور شائبوں سے پاک کر کے صحیح شکل میں پیش کرنے کی خدمت انجام دے ـــ بلاشبہ جہاد فی سبیل اللہ ہے

ایسی دینی کتاب کی وسیع پیمانہ پر اشاعت جو بنیادی اہمیت کی حامل ہو اور جو اسلام کو یا اس کے کسی پہلو کو اس خوبی کے ساتھ پیش کرے کہ اس کے پوشیدہ جواہر پر سے پردہ اٹھ جائے۔ اس کی تعلیمات کی خوبیاں نمایاں ہوں اور اس کے حقائق بے نقاب ہوں جہاد فی سبیل اللہ کے مترادف ہے۔

پختہ کار، امانت دار اور مخلص افراد کو فارغ کرنا تاکہ وہ دین کی خدمت کریں، اس کی روشنی چار دانگ عالم میں پھیلائیں، اس کے دشمنوں کی چالوں کو بے اثر کر کے رکھ دیں۔ فرزندان اسلام میں بیداری پیدا کریں اور عیسائی مشن، الحاد اور اباحیت کے طوفان کا مقابلہ کریں من جملہ جہاد فی سبیل اللہ کے ہے اور دین حق کے داعیوں کی معاونت کرنا جن پر خارج سے اسلام دشمن طاقتیں داخلی عناصر۔ مرتد اور سرکش افراد۔ کی مدد سے مسلط ہو جاتی ہیں اور انہیں طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دینے لگتی ہیں۔ ان کی معاونت کرنا تاکہ وہ کفر اور سرکشی کے مقابلہ میں ثابت قدم رہیں سراسر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ زکوٰۃ کے صرف میں ایسے کاموں کو اولین اہمیت دیں کیوں کہ اسلام کے مددگار اللہ کے بعد فرزندان اسلام ہی ہیں اور خاص طور سے ایسے دور میں جب کہ اسلام غربت سے دوچار ہے۔

فقہ الزکوٰۃ / ترجمہ از مولانا شمس پیرزادہ۔ بمبئی □□

وہ مسئلہ جو ابھی تک

لوگوں کو معلوم نہیں

فجر کی نماز سے فارغ ہو کر میں مسجد کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا کہ ایک بزرگ نے کہا "آپ نے دیکھا نہیں اس آدمی کو" اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بولے "نماز پڑھ رہا تھا اور کہنیاں یہاں تک کھلی ہوئیں۔ شیطان بھی خوش، رحمان بھی خوش، اللہ بچائے ایسے نمازیوں سے" وہ کہہ رہے تھے اور نفرت اور حقارت ان کے لفظ لفظ سے ٹپک رہی تھی۔

میں نے سوچا ـــ لوگوں کو کہنیاں کھلنے کا "مسئلہ" معلوم ہے۔ مگر یہ مسئلہ معلوم نہیں کہ ایک مسلمان کے لئے حرام ہے کہ وہ دوسرے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے اور اس کا ذکر نفرت کے ساتھ کرے۔

ایک سفر

مرادآباد، دہلی سے ۱۶۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک صنعتی شہر ہے۔ ۵ اکتوبر ۱۹۷۸ کی شام کو یہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ ۷ اکتوبر کی شام کو دہلی واپسی ہوئی۔

مرادآباد کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ ہے جس میں مسلمان ۵۵ فی صد ہیں۔ یہاں بے روزگاری کا وجود نہیں۔ ہندستان میں اس قسم کے متعدد شہر ہیں جہاں مسلمان نہ صرف تعداد میں کافی ہیں بلکہ معاشی حیثیت سے بھی بہتر حالت میں ہیں۔ اگر وہ سمجھ داری سے کام لیں تو ان مقامات پر وہ ایک قسم کی "شہری ریاست" قائم کر سکتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ زیادہ بہتر پوزیشن میں ہونے کا استعمال ان کے نزدیک صرف یہ ہے کہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اس کی بربادی کا مظاہرہ کریں ——— بے معنی احساس برتری، سہل انگاری، آپس کے اختلافات، اسراف، مواقع کو احمقانہ طور پر برباد کرنا، لایعنی بحثوں اور مناظروں میں مشغول رہنا، ایسے مقامات پر ان کی زندگی بس اسی قسم کے مشاغل میں گزرتی ہے۔ شادیوں میں بے پناہ دولت برباد کریں گے۔ مگر تعلیمی اداروں کو ترقی دینے سے انھیں کوئی دل چسپی نہ ہوگی۔

مرادآباد اور دوسرے شہروں کے سفر کے بعد راقم الحروف کو ایک تجربہ یہ ہوا کہ ہر جگہ لوگوں نے کچھ خاص مسئلے گھڑ لئے ہیں اور بس اسی کے بحث مباحثہ میں مشغول رہتے ہیں۔ کہیں مذہبی اور اعتقادی جھگڑے ہیں اور کہیں سیاسی اور نظریاتی جھگڑے۔ ساری ذہنی طاقت بس انھیں جھگڑوں میں برباد ہو رہی ہے۔ ان جھگڑوں کے باقی رہنے کی دو بڑی وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے درمیان کثرت سے ایسی تحریکیں اٹھیں جن کا مزاج سیاسی تھا۔ دوسرے دینی تحریکیں وہ ہیں جو اگرچہ غیر سیاسی ہیں مگر گہرائی کے ساتھ اصلاح کی کوشش نہیں کرتیں۔ وہ ان کو ایسے دینی نسخے فراہم کر دیتی ہیں جس میں انھیں اپنی اصل زندگی کو بدلنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کیوں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ یہاں ان کو دنیا سلائی کی ڈبیہ سے بھی زیادہ سستی قیمت پر جنت مل رہی ہے۔

۶ اکتوبر کو وارث منزل (طویلہ اسٹریٹ) میں ایک اجتماع ہوا جس میں شہر کے سنجیدہ اور تعلیم یافتہ حضرات شریک ہوئے۔ میں نے اپنی تقریر میں دو باتوں پر زور دیا، ایک، دین کو قرآن و سنت سے اخذ کرنا۔ دوسرے، وقت کے حالات کا گہرا جائزہ لے کر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرنا۔ اس اجتماع کے علاوہ قیام گاہ پر تقریباً ہر وقت لوگ آتے رہے اور ان سے دینی موضوعات پر گفتگو جاری رہی۔ میں نے خصوصیت سے آخرت پسندانہ طرز فکر پر زور دیا۔ ایک صاحب نے آخر میں فرمایا: "آپ آخرت کی بات کرتے ہیں، یہاں تو لوگوں کو اس کا یقین بھی نہیں کہ کل انھیں مرنا ہے"

تاہم مرادآباد میں کچھ ایسے دردمند مسلمان بھی ملے جو صورت حال کا واقعی احساس رکھتے ہیں اور اگر انھوں نے وقت کے فتنوں سے بچ کر اپنی صلاحیت کو تعمیری انداز پر لگانے کی کوشش کی تو ان شاء اللہ مستقبل قریب میں مفید نتائج برآمد ہوں گے ——— الرسالہ مرادآباد میں ایک سو سے زیادہ تعداد میں جا رہا ہے۔ ایک شخص نے کہا: فلاں شمارہ میں نے پڑھا تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور رات بھر نیند نہیں آئی۔ الرسالہ میں کچھ لوگوں کو "ضلالت" نظر آ رہی ہے اور کچھ لوگوں کو اس سے "ہدایت" مل رہی ہے۔ یہ صورت بھی کیسی عجیب ہے۔

بہتر اخلاق یہ ہے کہ غصہ نہ کرے

ابوالعلاء بن الشخیر نے روایت کیا ہے۔ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سامنے سے آیا اور کہا: اے خدا کے رسول! کون سا عمل افضل ہے۔ آپ نے فرمایا اچھا اخلاق۔ پھر وہ دائیں سے آیا اور پوچھا: اے خدا کے رسول! کون سا عمل افضل ہے۔ آپ نے فرمایا اچھا اخلاق۔ پھر وہ بائیں سے آیا اور پوچھا اے خدا کے رسول! کون سا عمل افضل ہے۔ آپ نے فرمایا اچھا اخلاق۔ پھر وہ پیچھے سے آیا اور پوچھا اے خدا کے رسول! کون سا عمل افضل ہے۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

مالک لا تفقہ حسن الخلق۔ ھو ان لا تغضب ان استطعت (محمد بن نصر المروزی، کتاب الصلاۃ)	تم کو کیا ہو گیا کہ تم اچھے اخلاق کو نہیں سمجھتے۔ وہ یہ ہے کہ اگر تم سے ہو سکے تو تم غصہ نہ کرو

جنت میں پہنچانے والے اعمال

طبرانی نے حمید طویل سے روایت کی ہے کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے۔ کچھ لوگ ان کی عیادت کے لئے آئے۔ آپ نے اپنی خادمہ سے فرمایا: ہمارے ساتھیوں کے لئے کچھ لاؤ۔ اگرچہ روٹی کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے:

مکارم الاخلاق من اعمال الجنۃ (الترغیب والترہیب جلد ۳) — اچھے اخلاق جنت کے اعمال میں سے ہیں۔

سب کے ساتھ رحم کا برتاؤ

سہیل بن عمرو کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مقام سے گزرے تو آپ نے ایک اونٹ کو دیکھا جس کا پیٹ اس کی پیٹھ سے لگ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا۔

اتقوا اللہ فی ھذہ البھائم المعجمۃ۔ فارکبوھا صالحۃ وکلوھا صالحۃ (ابوداؤد)	ان بے زبان چوپایوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ ان پر صالح طریقہ سے سواری کرو اور ان کو صالح طریقہ سے کھلاؤ۔

داعی کا اخلاق کیسا ہوتا ہے

عمرو بن المرۃ الجہنی نے سنا کہ مکہ میں ایک نبی کا ظہور ہوا ہے۔ وہ اپنی سواری پر بیٹھ کر مکہ پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ آپ نے فرمایا: "اے عمرو بن مرہ! میں خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں تمام انسانوں کی طرف۔ ان کو اسلام کی طرف بلاتا ہوں۔ ان کو یہ تعلیم دیتا ہوں کہ خون نہ بہاؤ، رشتہ داروں کے حقوق ادا کرو۔ ایک اللہ کی عبادت کرو، بتوں کو چھوڑ دو، بیت اللہ کا حج کرو، رمضان کے مہینے کے روزے رکھو۔ جس نے ان باتوں کو مان لیا اس کے لئے جنت ہے اور جس نے نہ مانا اس کے لئے آگ کا عذاب ہے۔ اے عمرو! ایمان لاؤ، اللہ تم کو جہنم کی ہولناکیوں سے بچائے گا"۔ عمرو بن مرۃ پہلی ہی ملاقات میں متاثر ہو گئے اور کہا: اشھد ان لا الہ الا اللہ و انک رسول اللہ آمنت بکل ما جئت بہ من حلال و حرام وان رغم ذلک کثیر من الاقوام (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔ میں ہر اس حلال و حرام پر ایمان لایا جس کو آپ لے کر آئے ہیں۔ خواہ بہت سے لوگوں کو یہ بات

برہ گئے) پھر انھوں نے کہا: اے خدا کے رسول! مجھ کو میری قوم کی طرف بھیج دیجئے۔ شاید اللہ میرے ذریعہ سے ان پر احسان کرے جس طرح اس نے آپ کے ذریعہ میرے اوپر احسان کیا ہے۔ آپ نے ان الفاظ میں نصیحت کرتے ہوئے ان کو روانہ کیا:

علیک بالرفق والقول السدید ولا تکن فظا ولا متکبرا ولا حسودا (کنز العمال)	ہمیشہ نرمی اختیار کرنا، سیدھی بات کہنا، تندخو مت بننا، تکبر اور حسد نہ کرنا۔

چار اہم ترین نصیحتیں

ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھ دن تک روزانہ مجھ سے کہتے رہے۔ "اے ابوذر! خوب سمجھ لو جو تم سے کہا جانے والا ہے"۔ جب ساتواں دن آیا تو آپ نے فرمایا:

اوصیک بتقوی اللہ فی سر امرک وعلانیته، واذا اسأت فاحسن، ولا تسئلن احدا شیئا وان سقط سوطک، ولا تقبضن امانة (الترغیب والترہیب جلد ۲)	میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کھلے اور چھپے ہر حال میں اللہ سے ڈرنے کی۔ اور جب تم سے کوئی برائی ہو جائے تو اس کے بعد بھلائی کرو کسی سے کوئی چیز نہ مانگو خواہ تمہارا کوڑا گر گیا ہو۔ اور کسی کی امانت پر قبضہ مت کرنا۔

انسان کے ساتھ رعایت

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ ایک اعرابی آیا اور مسجد میں پیشاب کرنے لگا۔ لوگ اس کو مارنے کے لئے دوڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو منع کیا اور فرمایا:

دعوہ واریقوا علی بوله سجلا من الماء او ذنوبا من ماء۔ فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین (بخاری)	اس کو چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر پانی کا ڈول لے کر ڈال دو کیوں کہ تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو سختی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

جو دھوکہ دے وہ مسلمانوں میں سے نہیں

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بازار سے گزر رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص غلہ کا ڈھیر لگائے ہوئے اس کو فروخت کر رہا ہے۔ آپ نے غلّہ کے ڈھیر میں اپنا ہاتھ ڈالا تو آپ کی انگلیاں تر ہوگئیں۔ آپ نے غلّہ کے مالک سے کہا کہ اس میں یہ تری کیسی ہے۔ اس نے کہا کہ بارش میں بھیگ گیا۔ آپ نے فرمایا:

افلا جعلته فوق الطعام حتی یراہ الناس۔ من غشنا فلیس منا (متفق علیہ)	تم نے اس بھیگے ہوئے کو اوپر کیوں نہ رکھا تاکہ لوگ دیکھ لیتے۔ یاد رکھو جو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

صحابی کا سب سے زیادہ محبوب عمل

ابونعیم نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے کہا:

لان اعول اهل بیت من المسلمین شهرا او جمعة او ما شاء الله احب الیّ من حجة بعد حجة۔ ولطبق	اگر میں مسلمانوں میں سے کسی کے گھر کی خبر گیری کروں، ایک مہینہ یا ایک ہفتہ تک تو یہ مجھ کو حج پر حج کرنے سے

بدانق اهديه الى اخ لى فى الله عزوجل احب — زیادہ محبوب ہے۔ اگر میں ایک طبق دانق (پیسے) اپنے
الیّ من دینار انفقه فی سبیل الله عزوجل — بھائی کو ہدیہ کروں تو یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ
(حلیۃ الاولیاء جلد ۱) — میں ایک طبق دینار فی سبیل اللہ خرچ کروں۔

بے فائدہ بات نہ کرنا ، کسی کا برا نہ چاہنا

زید بن اسلم کہتے ہیں۔ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ لوگ ان کے پاس آئے، وہ بیمار تھے مگر ان کا چہرہ چمک رہا تھا، لوگوں نے پوچھا: کیا بات ہے کہ آپ کا چہرہ اس قدر چمک رہا ہے۔ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

ما من عمل شیئ اوثق عندی من اثنتین۔ اما — میرے عمل میں میرے نزدیک دو چیزیں سب سے زیادہ
احداهما فکنت لا اتکلم فیما لا یعنینی۔ واما — قابل اعتماد ہیں۔ ایک یہ کہ میں بے فائدہ بات نہیں کرتا تھا۔
الاخری فکان قلبی للمسلمین سلیما (ابن سعد جلد ۳) — دوسرے یہ کہ میرا دل مسلمانوں کی طرف سے ہمیشہ صاف رہا۔

اسلام میں نزاکت احساس

عبد اللہ بن عباس رض کہتے ہیں۔ ایک شخص نے ذبح کی غرض سے ایک بکری کو پہلو کے بل لٹا رکھا تھا اور اپنی چھری تیز کر رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا:

اترید ان تمیتها موتتین۔ هلا احددت — کیا تم بکری کو دو موت مارنا چاہتے ہو۔ تم نے اس کو پہلو
شفرتك قبل ان تضجعها (طبرانی، احمد) — کے بل لٹانے سے پہلے اپنی چھری کیوں نہ تیز کرلی۔

خادم کی کوتاہیوں پر اس کو معاف کرنا

عبد اللہ بن عمر رض کہتے ہیں۔ ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے پوچھا: "اے خدا کے رسول! اپنے خادم کو میں روزانہ کتنی بار معاف کروں۔ آپ نے فرمایا: سبعین مرۃ (ستر بار معاف کرو) ترمذی، ابوداؤد

کسی انسان کے ساتھ وحشیانہ سلوک جائز نہیں

غزوۂ بدر کے بعد جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا۔ یہ قریش کا بہت مشہور خطیب تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہایت سخت تقریریں کیا کرتا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس شخص کے اگلے دو دانت توڑ دوں، تاکہ آئندہ یہ اسلام کے خلاف تقریریں نہ کر سکے۔ آپ نے کہا:

لا امثل به فیمثل الله بی وان کنت نبیا — میں اس کا چہرہ نہیں بگاڑوں گا ورنہ اللہ میرا بھی چہرہ
(من اخلاق النبی) — بگاڑ دے گا۔ اگرچہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

اجرت ادا کرنے میں دیر نہ کرو

ابن ماجہ نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اعطوا الاجیر اجره قبل ان یجف عرقه — مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ سوکھنے سے پہلے دے دو

برائی کرنے والے کے حق میں اچھی دعا کرو

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شرابی کو لایا گیا۔ آپ کے حکم سے اس کو کوڑے مارے گئے۔ جب وہ چلا گیا تو کچھ لوگوں نے کہا: اے اللہ اس شخص کو رسوا کر۔ اے اللہ! اس شخص پر لعنت کر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاتقولوا ھکذا ولا تکونوا للشیطان علی اخیکم۔ ولکن قولوا اللھم اغفرلہ اللھم اھدہ (ابن جریر)

اس طرح مت کہو اور اپنے بھائی کے خلاف شیطان کے ساتھی نہ بنو۔ بلکہ اس طرح کہو: اے اللہ اس کو معاف فرما۔ اے اللہ اس کو ہدایت دے۔

مسلمان کو لعنت کرنا بہت بڑا گناہ ہے

طبرانی نے سلمہ بن اکوع رض سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب ہم کسی کو دیکھتے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی پر لعنت بھیج رہا ہے تو ہم سمجھتے تھے کہ وہ بڑے گناہوں کے دروازہ میں سے ایک دروازہ میں داخل ہوگیا ہے (کنا اذا رأینا الرجل یلعن اخاہ رأینا ان قد اتی بابا من ابواب الکبائر)

مومن کو حقیر سمجھنا بے دینی تک لے جا سکتا ہے

عروہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حج میں تھے۔ آپ نے عرفات سے کوچ کرنے میں اسامہ بن زید رض کی وجہ سے دیر کر دی۔ آپ ان کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک لڑکا آیا جو کالے رنگ اور چپٹی ناک والا تھا۔ اہل یمن جو آپ کے ساتھ تھے، یہ دیکھ کر بولے:

انما حبسنا من اجل ھذا (ابن سعد جلد ۳)

اسی کی وجہ سے ہم روکے گئے تھے

عروہ رض کہتے ہیں کہ اہل یمن اپنے اسی قول کی وجہ سے کافر ہوئے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ میں نے یزید بن ہارون سے پوچھا عروہ رض کے اس قول کا کیا مطلب تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اہل یمن کا مرتد ہونا۔

اولاد کسی آدمی کی سب سے بڑی کمزوری ہے

بزار نے اسود بن خلف رض سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن بن علی رض کو اٹھایا اور ان کا بوسہ لیا۔ پھر صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

ان الولد مبخلۃ مجھلۃ مجبنۃ (ہیثمی جلد ۸)

لڑکا آدمی کو بخیل بناتا ہے، نادانی کے کام کراتا ہے، بزدل بنا دیتا ہے۔

طبرانی نے عبداللہ بن عمر سے ایک روایت نقل کی ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

قاتل اللہ الشیطان ان الولد فتنۃ

اللہ شیطان کو ہلاک کرے۔ بے شک اولاد آدمی کیلئے فتنہ ہے۔

گھریلو معاملات میں گھر کے بڑے کا کردار

بیہقی نے حسن بن علی رض سے روایت کیا ہے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رض کی صاحبزادی ام کلثوم

سے نکاح کا پیغام دیا جو آپ سے عمر میں بہت چھوٹی تھیں۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹوں حسن اور حسین سے کہا کہ اپنے چچا کے ساتھ اپنی بہن کی شادی کا انتظام کر دو۔ دونوں نے کہا:

ھی امرأۃ من النساء تختار لنفسھا (کنز العمال جلد ۸) — وہ عورتوں میں سے ایک عورت ہے۔ اس کو اپنی ذات کے بارے میں اختیار ہے۔

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ یہ سن کر غصہ ہو گئے اور اٹھ کر جانے لگے۔ حسن رضی اللہ عنہ نے آپ کا کپڑا پکڑ لیا اور کہا: "اے باپ! آپ کی جدائی کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔" پھر دونوں نے عمر رضی اللہ عنہ سے اپنی بہن کا نکاح کر دیا۔

کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو حقیر نہ سمجھے

حسن بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ مسلمانوں کی ایک جماعت ابوموسیٰ اشعری رضہ کے پاس آئی جو خلافت فاروقی میں گورنر کے عہدہ پر تھے۔ ابوموسیٰ اشعری رضہ نے عربوں کو عطیے دیئے اور ان کے ساتھ جو عجمی تھے ان کو چھوڑ دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ اشعری رضہ کو لکھا:

الا سویت بینھم۔ بحسب امرئ من الشر ان یحقر اخاہ المسلم (کنز العمال جلد ۲) — تم نے دونوں کے درمیان برابری کیوں نہ کی۔ آدمی کے برا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔

مسلمان بھائی کو گھبراہٹ میں ڈالنا جائز نہیں

طبرانی نے سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک اعرابی آیا اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ اس کے پاس ایک سینگ تھی۔ کچھ لوگوں نے اس کی سینگ لے کر چھپا دی۔ نماز ختم ہوئی تو اعرابی سینگ نہ پاکر گھبرا گیا۔ اس نے کہا: میری سینگ کیا ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یروعن مسلما (ہیثمی جلد ۶) — جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ ہرگز کسی مسلمان کو نہ ڈرائے۔

نکاح — دعوت ناموں کی تقسیم کے بغیر

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضہ ہجرت کرکے مدینہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مواخاۃ سعد بن ربیع انصاری رضہ سے کرائی۔ سعد رضہ نے عبدالرحمٰن بن عوف رضہ سے کہا: اے میرے بھائی! میں اہل مدینہ میں سب سے زیادہ مالدار ہوں۔ میرے مال کو دیکھ کر تم اس میں سے آدھا مال لے لو۔ میری دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے جو تم کو پسند ہو اس کو میں طلاق دے دوں اور تم اس سے نکاح کر لو۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضہ نے کہا: اللہ تمھارے اہل اور مال میں برکت دے۔ مجھے تم بازار کا راستہ بتا دو۔ انھوں نے تجارت شروع کر دی اور بہت نفع کمایا۔

کچھ دنوں بعد ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ ان کے کپڑے پر زعفران کا اثر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمانی زبان میں فرمایا مَہْیَم (یہ کیا) انھوں نے کہا: میں نے ایک عورت سے نکاح کر لیا ہے۔ آپ نے فرمایا، کتنا مہر مقرر کیا۔ انھوں نے کہا، ایک گٹھلی کے وزن کے برابر سونا۔ آپ نے فرمایا:

اولم ولو بشاة (احمد) ولیمہ کرو اگرچہ ایک بکری سے۔

گھر کی ذمہ داریوں کو ادا کرنا جہاد فی سبیل اللہ سے کم نہیں

طبرانی اور بزار نے عبد اللہ بن عباس رض سے نقل کیا ہے۔ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا: اے خدا کے رسول! میں عورتوں کی طرف سے قاصد بن کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ ان عورتوں میں سے ہر عورت، خواہ آپ اس کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، آپ کے پاس آکر یہ سوال پوچھنا چاہتی ہے۔ اللہ مردوں کا رب ہے اور عورتوں کا بھی۔ وہ دونوں کا الٰہ ہے۔ آپ مردوں کے بھی رسول ہیں اور عورتوں کے بھی۔ اللہ نے مردوں کے لئے جہاد رکھا ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہوتے ہیں تو اجر پاتے ہیں۔ اور اگر مارے جاتے ہیں تو اللہ کے یہاں زندہ ہوکر رزق حاصل کرتے ہیں۔ پھر ہم عورتوں کے لئے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

ان طاعة الزوج واعترافا بحقه يعدل ذلك، وقليل منكن من يفعله (الترغیب والترہیب)

شوہر کی فرماں برداری اور اس کے حقوق کا پہچاننا تمھارے لئے جہاد کے برابر ہے۔ اگرچہ عورتوں میں بہت کم ہیں جو ایسا کرتی ہوں۔

دوسروں کو تکلیف دینے سے پرہیز

مالک نے ابن ابی ملیکہ سے روایت کیا ہے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حج کے موقع پر ایک عورت کو دیکھا۔ وہ کوڑھ کی بیماری میں مبتلا تھی اور بیت اللہ کا طواف کر رہی تھی۔ آپ نے اس سے کہا:

يا امة الله لا تؤذي الناس لو جلست في بيتك

اے اللہ کی بندی۔ لوگوں کو تکلیف نہ دے۔ بہتر ہے کہ تو اپنے گھر میں بیٹھے۔

وہ عورت گھر میں بیٹھ گئی۔ کچھ عرصہ بعد ایک آدمی کا اس مجذومہ عورت پر گزر ہوا۔ اس نے کہا: وہ خلیفہ جنھوں نے تجھ کو طواف سے منع کیا تھا وہ وفات پا گئے۔ اب تو گھر سے نکل۔ خاتون نے جواب دیا:

ما كنت لا طيعه حيا واعصيه ميتا (کنز العمال جلد ۳)

میں ایسی نہیں کہ زندگی میں ان کی اطاعت کروں اور مرنے کے بعد ان کی نافرمانی کروں۔

گھر میں داخلہ کے لئے اجازت طلب کرنے کے آداب

طبرانی نے سفینہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا۔ علی ابن طالب رضی اللہ عنہ آئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے بہت آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا (فدق الباب دقا خفیفا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کے لئے دروازہ کھول دو — طبرانی نے ایک اور روایت میں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے آئے انھوں نے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی اور دروازہ کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ سے فرمایا کہ کنارے کھڑے ہو جاؤ۔ پھر کچھ دیر میں اندر بلایا اور فرمایا: هل الاستئذان الا من اجل النظر (اجازت طلب کرنا دیکھنے سے بچنے ہی کے لئے تو ہے)

دستر خوان پر کس کو بلایا جائے

ابن سعد نے معن سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جب کوئی کھانا تیار کرتے اور ان کے پاس سے کوئی حیثیت والا آدمی گزرتا تو اس کو نہ بلاتے۔ البتہ ان کے لڑکے اور بھتیجے اس کو بلاتے۔ اور جب کوئی مسکین آدمی گزرتا تو عبداللہ بن عمر رضہ اس کو بلاتے۔ مگر ان کے لڑکے اور بھتیجے اس کو نہ بلاتے۔ انھوں نے فرمایا:

یدعون من لا یشتھیہ ویدعون من یشتھیہ — یہ لوگ اس کو بلاتے ہیں جو خواہش نہیں رکھتا۔ اور جس کو خواہش ہے، اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔

گھر والوں کی خواہش پر چلنا دینی مزاج کے خلاف

بیہقی نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ملاقات ہوئی اور میں نے ایک درہم کا گوشت خریدا تھا اور اس کو لے کر گھر جا رہا تھا۔ انھوں نے پوچھا یہ کیا ہے۔ میں نے کہا:

قرم اھلی فابتعت لھم لحما بدرھم (الترغیب والترہیب جلد ۳) — میرے گھر والوں کی بڑھی ہوئی خواہش ہے۔ میں نے ان کے لئے ایک درہم کا گوشت خریدا ہے۔

سن کر عمر رضہ میرے لفظ (قرم اھلی) کو بار بار دہراتے رہے یہاں تک کہ مجھے یہ تمنا ہوئی کہ یہ درہم مجھ سے کہیں گر جاتا، عمر رضی اللہ سے میری ملاقات نہ ہوتی۔ بیہقی کی ایک اور روایت میں یہ ہے کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے اپنے گھر والوں کے لئے ایک درہم کا گوشت خریدا ہے۔ اس کے کھانے کی انھیں بہت خواہش ہوئی ہے۔ عمر رضہ نے یہ سن کر فرمایا:

کلما اشتھیتم شیئا اشتریتموہ — کیا جب بھی تم کو کسی چیز کی خواہش ہوتی ہے تو تم اس کو خرید لیتے ہو۔

آیت تم سے کہاں چلی گئی: اذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بھا (احقاف)

خواہش پر قابو رکھنا مسلمان کے لئے ضروری ہے

احمد اور عبدالرزاق اور ابن عساکر نے حسن بن علی رضہ نے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ اپنے لڑکے عبداللہ رضہ کے گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے یہاں گوشت آیا ہوا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا یہ کیسا گوشت ہے۔ صاحبزادہ نے جواب دیا: مجھ کو اس کے کھانے کی خواہش ہوئی ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

کلما اشتھیت شیئا اکلتہ۔ کفی بالمرء سرفا ان یاکل ما اشتھاہ (منتخب الکنز جلد ۴) — جب بھی تم کو کسی چیز کی خواہش ہوتی ہے تو تم اس کو کھاتے ہو۔ آدمی کے اسراف کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جس چیز کی خواہش پیدا ہو اس کو کھائے۔

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے قطع تعلق اس کو قتل کرنے کے برابر ہے

عن ابی خراش السلمی رضی اللہ عنہ انہ سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: من ھجر اخاہ سنۃ فھو کسفک دمہ — نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنے بھائی سے ایک سال تک جدائی رکھی تو یہ اس کا خون بہانے کی مانند ہے۔ (ابوداؤد)

ایسے مسئلہ میں نہ پڑو جس سے نمٹنے کی طاقت نہ ہو

بزار نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حجاج نے خطبہ دیا اور ایسی بات کہی جو مجھے ٹھیک معلوم نہ ہوئی (فذکرکلا ما انکرتہ) میں نے ارادہ کیا کہ میں اس کا رد کردوں۔ مگر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول یاد آگیا جس کی وجہ سے میں چپ رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا: لا ینبغی للمومن ان یذل نفسہ (مومن کے لئے مناسب نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے) میں نے پوچھا: اے خدا کے رسول! کوئی مومن کیسے اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ایسی چیز سے مقابلہ چھیڑ دے جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو — (یتعرض من البلاء لما لا یطیق)

چھوٹے شر پر راضی نہ ہونے والے کو بڑے شر پر راضی ہونا پڑتا ہے

طبرانی نے ابو جعفر خطمی سے نقل کیا ہے۔ ان کے دادا عمیر بن حبیب بن حماشہ رضی اللہ عنہ نے اپنے لڑکے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: نادانوں کی صحبت سے بچو اور نادانوں کی طرف سے ڈالی ہوئی تکلیفوں کو برداشت کرو۔ کیوں کہ جو شخص نادان کے چھوٹے شر پر راضی نہیں ہوگا اس کو نادان کے زیادہ بڑے شر پر راضی ہونا پڑے گا — (ومن لا یرضی بالقلیل مما یاتی بہ السفیہ یرضی بالکثیر)

ٹکراؤ کی حالت ختم کرنے کے لئے ہر قیمت پر صلح کرلی

صلح حدیبیہ کا معاہدہ لکھا جانے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالبؓ سے کہا: لکھو بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ سہیل بن عمرو اس وقت قریش کے نمائندہ تھے، انھوں نے کہا: خدا کی قسم ہم نہیں جانتے کہ "رحمٰن" کیا ہے! آپ تو ہمارے معروف طریقہ کے مطابق باسمک اللہم لکھئے۔ مسلمانوں نے کہا ایسا نہیں ہوسکتا۔ رسول اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لکھو: باسمک اللہم۔ پھر آپ نے کہا: لکھو "یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ نے طے کیا"۔ سہیل بنؓ نے دوبارہ کہا: خدا کی قسم اگر ہم جانتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو ہرگز نہ روکتے اور نہ آپ سے جنگ کرتے۔ مسلمانوں کو یہ بات بھی سخت ناگوار ہوئی۔ مگر آپ نے کاتب کو حکم دیا کہ لکھو: "محمد بن عبداللہ"۔ اس سے پہلے محمد رسول اللہ کا لفظ لکھا جا چکا تھا۔ علی بن ابی طالبؓ اس کو اپنے ہاتھ سے مٹانے پر تیار نہ ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ سے اس کو مٹایا۔ پھر آپ نے کہا کہ لکھو: "قریش ہمارے اور بیت اللہ کے درمیان سے ہٹ جائیں گے تاکہ ہم اس کا طواف کرسکیں"۔ سہیل بن عمروؓ نے کہا: "نہیں۔ اس وقت آپ واپس جائیں اور اگلے سال آکر طواف کریں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی مان لیا۔ پھر سہیل بن عمرو نے یہ شرط کی کہ قریش کا کوئی آدمی مسلمان ہوکر مدینہ جائے تو اس کو مسلمان لوٹا دیں گے۔ اور اگر مدینہ کا کوئی مسلمان قریش کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کو واپس نہیں کریں گے"۔ اس پر مسلمان بے حد مشتعل ہوگئے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی مان لیا۔ آپ نے قریش کی تمام شرطوں کو مان کر ان سے دس سال کے لئے ناجنگ معاہدہ کرلیا۔ (بخاری ومسلم)

اسباب کے قانون سے پیغمبر کی اولاد بھی مستثنیٰ نہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی زینب رضی اللہ عنہا آپ کی ہجرت کے بعد مکہ میں رہ گئی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا کہ وہ حضرت زینب کو مکہ سے مدینہ لے آئیں۔ وہ مکہ گئے اور حضرت زینب کو اونٹ پر بیٹھا کر روانہ ہوئے۔ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ قریش کے دو آدمیوں نے ان کا پیچھا کیا اور مکہ سے کچھ فاصلہ پر ان کو پکڑ لیا، یہ دونوں آدمی زید بن حارثہ رضی سے لڑے اور ان پر غالب آگئے۔ پھر ان دونوں نے حضرت زینب کی سواری کو بدکایا۔ وہ اونٹ سے گر پڑیں۔ حضرت زینب کو اس وقت حمل تھا۔ ان کو اسقاط ہوگیا اور خون بہنے لگا۔ اس کے بعد لوگ ان کو ابوسفیان کے مکان پر لے گئے۔ وہاں بنی ہاشم کی عورتیں آئیں اور ابوسفیان نے ان کو ان عورتوں کے حوالے کر دیا۔ کچھ دن کے بعد وہ ہجرت کرکے مدینہ پہنچیں۔ مگر اس حادثہ نے انہیں مستقل مریض بنا دیا، حتیٰ کہ اسی میں انتقال ہوگیا (فلم تزل وجعة حتی ماتت من ذلک الوجع، طبرانی)

نازک موقع پر حکیمانہ جواب

ہجرت کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ غار ثور میں تین رات رہے۔ اس کے بعد نکلے اور معروف راستہ کو چھوڑ کر سمندر کے کنارے کا راستہ اختیار کیا۔ دونوں دو اونٹوں پر سوار تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کبھی آپ کے آگے چلتے اور کبھی آپ کے پیچھے۔ آپ نے پوچھا "ابوبکر تمہیں کیا ہوا کہ تم کبھی آگے چلتے اور کبھی پیچھے؟" ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "جب مجھے تعاقب کرنے والوں کا خیال ہوتا ہے تو میں آپ کے پیچھے چلنے لگتا ہوں اور جب گھات میں بیٹھنے والوں کو سوچتا ہوں تو آپ کے آگے چلنے لگتا ہوں" ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے تجارتی تعلقات اور تجارتی سفروں کی وجہ سے لوگوں میں معروف تھے، راستہ میں کوئی جاننے والا مل جاتا جو پوچھتا کہ یہ تمہارے ساتھ کون ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کو مختصر جواب دیتے: ھادٍ یھدینی (ایک رہبر جو مجھ کو راستہ بتاتا ہے۔ طبرانی)

دنیا دے کر آخرت کا سفر جاری رکھنا

صہیب رومی رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مکہ سے ہجرت کی۔ وہ مکہ میں لوہاری کا کام کرتے تھے۔ وہ مکہ سے روانہ ہوئے تو قریش کے کچھ لوگوں نے ان کا پیچھا کیا اور راستہ میں انکو پکڑ لیا۔ انھوں نے کہا: "صہیب! تم ہمارے یہاں ایسی حالت میں آئے کہ تمہارے پاس کچھ مال نہ تھا۔ اب تم بھی جاؤگے اور اپنا مال بھی لے جاؤگے۔ خدا کی قسم ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔" صہیب رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: اگر میں اپنا مال تم کو دے دوں تو کیا تم میرا پیچھا چھوڑ دوگے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ صہیب رضی اللہ عنہ کے پاس چند اوقیہ سونا تھا۔ انھوں نے یہ سونا ان کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد وہ ان کو چھوڑ کر چلے گئے۔ صہیب رومی رضی مدینہ پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قصہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا:

صہیب کی تجارت کامیاب رہی، صہیب کی تجارت کامیاب رہی (ربح صھیب ربح صھیب، تفسیر ابن کثیر جلد اول)

پسپائی میں بھی نئے اقدام کا راز ہوتا ہے

موتہ موجودہ اردن کی ایک بستی ہے۔ اسی مقام پر ۸ ھ میں غزوۂ موتہ واقع ہوا۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی اور رومی فوج میں ایک لاکھ مسلح افراد تھے۔ جنگ ہوئی تو ایک کے بعد ایک تین سردار (زید بن حارثہ، جعفر طیار، عبداللہ بن رواحہ) شہید ہو گئے۔ اس کے بعد خالد بن ولید مسلمانوں کی فوج کے سردار مقرر ہوئے۔ انھوں نے نئی فوجی تدبیر سے حملے کئے اور رومیوں پر رعب طاری کر دیا۔ وہ میدان جنگ سے پیچھے ہٹ گئے۔ حضرت خالد رضؓ نے اس کے بعد آگے بڑھنا مصلحت کے خلاف سمجھا اور ایک ہزار بچی ہوئی فوج کو لے کر مدینہ واپس آ گئے۔ مدینہ میں کچھ مسلمانوں نے ان کی طرف خاک پھینکی اور کہا: یا فرار! فررتم فی سبیل اللہ (اے بھاگنے والو! تم اللہ کے راستے سے بھاگے ہو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا: وہ بھاگنے والے نہیں ہیں۔ انشاءاللہ وہ حملہ کرنے والے ہیں۔ (لیسوا بالفرار ولکنھم الکرار انشاءاللہ تعالیٰ، رواہ احمد بن حنبل)

اسلام میں علم کی اہمیت

بدر کی جنگ میں ستر مشرکین گرفتار ہوئے۔ ان میں سے جو لوگ فدیہ نہیں دے سکتے تھے، ان کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ وہ انصار میں سے دس آدمیوں کو لکھنا سکھا دیں۔ زید بن ثابت انصاری نے اسی طریقہ پر کتابت سیکھی۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب مقرر ہوئے اور انھوں نے بڑی عمر میں کئی اور زبانیں سیکھیں۔ وہ چھ زبانیں جانتے تھے۔

غصہ کا علاج یہ ہے کہ غصہ کے وقت چپ ہو جائے

امام احمد نے عبداللہ بن عباس رضؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کسی کو جب غصہ آئے تو وہ چپ ہو جائے۔ آپ نے یہ جملہ تین بار فرمایا (اذا غضب احدکم فلیسکت، قالھا ثلاثا)

معاملات میں حکمت کا طریقہ اختیار کرنا

فتح مکہ کے موقع پر انصار کے دستہ کے سردار سعد بن عبادہ رضؓ تھے۔ جب وہ مکہ میں داخل ہوئے تو انھوں نے بلند آواز سے کہا: آج گھمسان کا دن ہے۔ آج حرمت حلال کی جائے گی۔ آج اللہ نے قریش کو نیچا کر دیا۔" ابوسفیان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ سعد بن عبادہ اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سن کر فرمایا: نہیں، آج کا دن رحمت کا دن ہے۔ آج اللہ قریش کو عزت دے گا۔ آج اللہ کعبہ کو عظمت دے گا۔ (بل الیوم یوم المرحمۃ الیوم یعز اللہ قریشا ویعظم اللہ الکعبۃ، فتح الباری، جلد ۸، صفحہ ۷)

اس کے بعد آپ نے سعد بن عبادہ سے انصار کے دستہ کا جھنڈا لے لیا اور اس کو ان کے بیٹے قیس کو دے دیا۔ ابن قیم جوزی لکھتے ہیں کہ سعد بن عبادہ کو کوئی احساس نہیں ہوا۔ کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ جھنڈا اب بھی انھیں کے لڑکے کے ہاتھ میں ہے (ورأی ان اللواء لم یخرج عن سعد اذ صار الی ابنہ، زاد المعاد)

دین میں تنگی نہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

جب بھی دو چیزوں میں سے ایک کو لینا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کو اختیار کرتے۔ اور اگر وہ گناہ کی بات ہوتی تو آپ سب سے زیادہ اس سے دور رہنے والے تھے (ماخیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی امرین قط الا اختار الیسر ھما، مالم یکن اثما۔ فان کان اثما کان ابعد الناس، مسلم)

ناکافی تیاری کے ساتھ اقدام سے پرہیز

خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رومیوں سے جہاد کا ارادہ کیا تو صحابہ کو جمع کیا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ مختلف لوگوں نے اپنی اپنی رائیں دیں۔ خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے کہا "اے خلیفۂ رسول! ہم آپ کی مخالفت کرنے والے نہیں ہیں اور نہ آپس میں اختلاف کرنے والے ہیں۔ جب آپ نکلنے کے لئے کہیں گے تو ہم نکل پڑیں گے اور جب حکم دیں گے تو ہم اس کی اطاعت کریں گے"۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کی باتوں سے خوش ہوئے۔ آپ نے بلال رضی اللہ عنہ سے کہا لوگوں میں اعلان کر دو کہ وہ رومیوں سے جہاد کے لئے نکلیں۔ لوگ جمع ہونا شروع ہوئے، یہاں تک کہ بڑی تعداد جمع ہوگئی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک روز لشکر گاہ میں آئے۔ آپ کے ہمراہ دوسرے کئی اصحاب تھے۔ جمع ہونے والوں کی تعداد اگرچہ کم نہیں تھی۔ مگر رومیوں سے مقابلہ کے لئے آپ کو وہ کم نظر آئی۔ آپ نے دوبارہ مشورہ کیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اس تعداد کو رومیوں سے مقابلہ کے لئے کافی نہیں سمجھتا (ما ارضی ھذہ العدۃ لجموع بنی الاصفر کنزالعمال جلد ۳) چنانچہ کوچ کو روک کر یمن خط لکھا گیا تاکہ ان کی مدد سے تیاری مکمل کی جائے۔

فریق مخالف سے وہی مطالبہ کرنا جو اس کے لئے قابل قبول ہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران کی طرف اپنا مکتوب روانہ کیا تو انھوں نے باہم مشورہ کیا اور تین آدمیوں کا وفد مدینہ روانہ کیا تاکہ وہ تحقیق حال کرے۔ یہ شرحبیل بن وداعہ، عبداللہ بن شرحبیل اور جبار بن فیض تھے۔ یہ لوگ مدینہ پہنچے اور حالات کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد شرحبیل نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا: میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ معاملہ بہت سخت ہے۔ خدا کی قسم اگر یہ شخص واقعی پیغمبر ہے اور ہم اس کی بات کو رد کر دیتے ہیں تو تمام عرب میں ہم پہلے لوگ ہوں گے جو اس کی نظروں میں کھٹکیں گے۔ وہ اور ان کے ساتھی ہم کو کبھی معاف نہ کریں گے"۔ دونوں ساتھیوں نے کہا: پھر تمہاری کیا رائے ہے۔ شرحبیل نے کہا: میرا خیال ہے کہ میں ان سے مصالحت کی بات کروں کیوں کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک ایسے آدمی ہیں جو کبھی زیادہ بڑی چیز کا حکم نہیں دیتے۔ (اری ان اکلمہ فانی اری رجلا لا یحکم شططا ابدا، البدایہ والنہایہ، جلد ۵، صفحہ ۵۵)

لوگوں کے ساتھ نرمی اور برداشت کا رویہ اختیار کرو

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی مدینہ آیا اور مسجد نبوی میں پیشاب کرنے لگا۔ لوگ اس کو مارنے کے لئے دوڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو منع فرمایا اور کہا کہ اسے چھوڑ دو۔ البتہ جہاں اس نے پیشاب کیا ہے وہاں پانی کا ایک ڈول بہا دو تاکہ صفائی ہو جائے۔ پھر آپ نے فرمایا: تم سختی کے لئے نہیں بھیجے گئے ہو، تم اس لئے بھیجے گئے ہو کہ آسانی پیدا کرو۔ (انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین، بخاری)

معاملات میں باقاعدگی

ابن سعد اور بیہقی نے ابو ہریرہ رضہ سے نقل کیا ہے۔ وہ ابو موسیٰ اشعری رضہ کے یہاں سے آٹھ لاکھ درہم لے کر مدینہ آئے۔ صبح کی نماز کے بعد عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا: رات میرے پاس وہ مال آیا ہے کہ ابتدائے اسلام سے اب تک اتنا مال کبھی نہیں آیا۔ میری رائے ہے کہ میں اس کو کیل سے ناپ ناپ کر لوگوں میں تقسیم کر دوں۔ اس معاملہ میں تم لوگ اپنی رائے دو (فاشیروا علیّ) عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: میرا خیال ہے کہ تمام لوگوں کے لئے مال کثیر کی ضرورت ہوگی اگر لوگوں کا شمار نہ کیا جائے جس سے یہ پہچان ہو جائے کہ کس نے لیا اور کس نے نہیں لیا تو اندیشہ ہے کہ یہ کام منتشر ہو جائے۔" (اری مالاً کثیرا یسع الناس وان لم یحصوا حتی یعرف من اخذ ممن لم یاخذ خشیة ان ینتشر الامر) یہ سن کر ولید بن ہشام بن مغیرہ نے کہا: اے امیر المومنین، میں ملک شام گیا، وہاں کے بادشاہوں کو میں نے دیکھا کہ انھوں نے رجسٹر بنائے ہیں اور اس کام پر کارندے مقرر کئے ہیں۔ اس لئے آپ بھی رجسٹر اور کارندے مقرر کیجئے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اس مشورہ کو مان لیا اور عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل، جبیر بن مطعم کو رجسٹر تیار کرنے پر متعین فرمایا۔ (طبقات ابن سعد، جلد ۳، صفحہ ۲۱۶)

چپ رہنا سیکھو جس طرح تم بولنا سیکھتے ہو

ابن عساکر نے ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ انھوں نے لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: تم چپ رہنے کو اسی طرح سیکھو جس طرح تم بولنے کو سیکھتے ہو۔ کیوں کہ چپ رہنا بہت بڑی بردباری ہے۔ اور بات کرنے سے زیادہ سننے کے حریص بن جاؤ۔ کسی ایسی چیز کے بارے میں بات نہ کرو جو تمھارے لئے بے فائدہ ہو۔ تعجب کے بغیر ہنسنے والا نہ بن اور ضرورت کے بغیر چلنے والا نہ بن۔ (تعلموا الصمت کما تعلمون الکلام فان الصمت حلم عظیم وکن الی ان تسمع احرص منك الی ان تتکلم ولا تتکلم فی شیء لا یعنیك ولا تکن مضحاکا من غیر عجب ولا مشاء الی غیر ارب، کنز العمال جلد ۲، صفحہ ۱۵۹)

نصیحت کا راستہ تکلیفوں کا راستہ ہے

طبرانی نے ابو جعفر خطمی سے نقل کیا ہے۔ ان کے دادا عمیر بن حبیب بن حماشہ رضی اللہ عنہ نے اپنے لڑکے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: تم میں سے کوئی شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرنا چاہے تو وہ اپنے آپ کو لوگوں کے آزار پر صبر کرنے کے لئے تیار کرلے۔ وہ اللہ کی طرف سے ملنے والے اجر پر بھروسہ رکھے۔ کیوں کہ جس نے اللہ کے اجر پر بھروسہ کیا، اس کو لوگوں کا آزار کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا (اذا اراد احدکم ان یامر بالمعروف وینهی عن المنکر فلیوطن نفسه علی الصبر علی الاذی ولیثق بالثواب من الله تعالیٰ۔ فانه من وثق بالثواب من الله عز وجل لم یضره مس الاذی)

رسول اللہ کی جنگ اشاعت اسلام کے لئے تھی نہ کہ اقتدار کے لئے

خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں میں جو باہمی لڑائیاں ہوئیں، حضرت عبداللہ بن عمر رضہ ان میں شریک نہیں تھے۔ لوگوں نے

کہا: آپ فتنہ کو ختم کرنے کے لئے جنگ کیوں نہیں کرتے۔ سعید بن جبیر کی روایت کے مطابق عبداللہ بن عمر رضؓ نے جواب دیا: تم جانتے ہو کہ فتنہ کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین سے لڑتے تھے اور اس کا مقصد ان میں اسلام داخل کرنا تھا۔ تمھاری طرح آپ کی جنگ اقتدار کے لئے نہ تھی (ولیس بقتالکم علی الملک، تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۳۰۸)

اختلاف کی قیمت پر اقتدار حاصل کرنا درست نہیں

خالد بن سُمیر کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ سے کہا گیا: بہتر ہو کہ آپ خلافت کا کام سنبھالنے کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ کیوں کہ آپ کے ساتھ تمام لوگ راضی ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم بتاؤ اگر ایک آدمی مشرق میں مخالفت کر دے۔ لوگوں نے کہا۔ کسی نے مخالفت کی تو اس کو قتل کر دیا جائے گا اور امت کی بہتری کے لئے ایک آدمی کا قتل کر دیا جانا کیا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے کہا: خدا کی قسم مجھے یہ پسند نہیں کہ امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک نیزے کا ڈنڈا پکڑے اور میں اس کی نوک پکڑے ہوئے ہوں اور اس نیزے سے مسلمانوں میں سے ایک شخص قتل کر دیا جائے اور اس کے بدلے میں میرے لئے دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، وہ سب ہو۔" حضرت قطن کی روایت میں ہے کہ ایک آدمی حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ کے پاس آیا اور کہا: تم سے زیادہ برا امت محمدؐ کے لئے اور کوئی نہیں (ما احد شر لامۃ محمد منک) آپ نے کہا کیوں؟ میں نے تو خدا کی قسم نہ ان کا خون بہایا ہے اور نہ ان کی جماعت میں تفریق ڈالی ہے اور نہ ان کے عصا کو توڑا ہے۔" آدمی نے کہا: اگر آپ چاہیں تو امت کے دو آدمی بھی آپ کے بارے میں اختلاف نہ کریں۔ حضرت ابن عمر رضؓ نے فرمایا: مجھے پسند نہیں کہ خلافت مجھے ملے اور ایک آدمی کہے نہیں۔ دوسرا کہے ہاں (ما احب انہا اتتنی ورجل یقول لا وآخر یقول بلی، طبقات ابن سعد)

تبدیلی حکومت کے نام پر مسلمانوں کا قتل درست نہیں

حاکم نے ابوعریف کے واسطے سے نقل کیا ہے۔ معاویہ رضؓ کے مقابلہ میں حسن بن علی رضؓ کی جو فوج تھی، میں اس کے مقدمۃ الجیش میں تھا۔ ہم بارہ ہزار تھے اور ہماری تلواریں اہل شام سے جنگ کے لئے گویا ابھی سے خون ٹپکا رہی تھیں۔ ہمارے سردار ابوعمرطہ تھے۔ جب ہم کو یہ خبر پہنچی کہ حسن بن علی رضؓ اور معاویہ رضؓ کے درمیان صلح ہو گئی تو گویا غصہ اور گرمی کی وجہ سے ہماری کمریں ٹوٹ گئیں۔ حضرت حسن بن علی رضؓ جب کوفہ آئے تو ہم میں سے ایک آدمی نکل کر ان کی طرف گیا۔ اس کا نام ابوعامر سفیان بن لیل تھا۔ اس نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: السلام علیک یا مذل المومنین (السلام علیک اے مسلمانوں کو ذلیل کرنے والے) حضرت حسن بن علی رضؓ نے فرمایا: اے ابو عامر! ایسا مت کہو۔ میں نے مسلمانوں کو ذلیل نہیں کیا۔ بلکہ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی کہ میں اقتدار کے لئے لوگوں کو قتل کروں (لم اذل المومنین ولکنی کرہت ان اقتلہم فی طلب الملک، البدایہ والنہایہ، جلد ۸)

اپنی خواہشات سے مقابلہ کرنا زیادہ بڑا جہاد ہے

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ ایک غزوہ سے لوٹے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو۔ لوگوں نے پوچھا بڑا جہاد کیا ہے۔ فرمایا: بندے کا اپنی خواہش کے خلاف جہاد کرنا (مجاہدۃ العبد لہواہ، جامع العلوم والحکم صفحہ ۱۷۱)

ہر آدمی کا شیطان اس کے ساتھ لگا ہوا ہے

ابن ابی شیبہ نے حضرت سلیم بن حنظلہ رضہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تاکہ ان سے کچھ سنیں۔ پھر حضرت ابی بن کعب رضؓ اٹھے اور ہم بھی اٹھے اور ان کے پیچھے چلنے لگے۔ راستہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فرمایا: کیا تم کو نہیں معلوم کہ یہ آگے چلنے والے کے لئے فتنہ اور پیچھے چلنے والے کے لئے ذلت ہے (اما تری فتنة للمتبوع ذلة للتابع، کنزالعمال جلد ۸)

اللہ کو وہی عمل پسند ہے جو مستقل کیا جائے

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چٹائی تھی۔ دن کو آپ اس پر بیٹھتے اور رات کو اس پر کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ لوگ آپ کے پاس آنے لگے اور آپ کے ساتھ نماز پڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہوگئی۔ آپ نے فرمایا: اے لوگو! اتنا ہی عمل کرو جس کی تم طاقت رکھتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتا یہاں تک کہ تم اکتا جاؤ۔ اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے جس کو مستقل کیا جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہو (وان احب الاعمال الی اللّٰہ مادام وان قل) ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والے جب کوئی عمل کرتے تو وہ اس پر قائم رہتے تھے (وکان آل محمد اذا عملوا عملا اثبتوہ، بخاری ومسلم)

خدا اکثر اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس کو حقیر سمجھ کر آدمی نظر انداز کر دیتا ہے

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن اللہ کہے گا اے ابن آدم! میں بیمار ہوا اور تو میری عیادت کے لئے نہیں آیا۔ بندہ کہے گا۔ اے میرے رب میں تیری عیادت کیسے کر سکتا ہوں تو تو رب العالمین ہے۔ اللہ کہے گا کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا مگر تو اس کی عیادت کو نہیں گیا۔ کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ تو اگر اس کی عیادت کو جاتا تو تو مجھ کو اس کے پاس پاتا (اما علمت انک لو عدتہ لوجدتنی عندہ) پھر اللہ کہے گا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا مگر تو نے مجھ کو کھانا نہیں دیا۔ بندہ کہے گا۔ اے میرے رب، میں کیسے تجھ کو کھانا کھلا سکتا ہوں تو تو رب العالمین ہے۔ اللہ کہے گا۔ کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا مگر تو نے اس کو نہیں کھلایا۔ کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو تو مجھ کو اس کے پاس پاتا۔ پھر اللہ کہے گا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے مجھ کو پانی نہیں پلایا۔ بندہ کہے گا، اے میرے رب، میں کیسے تجھ کو پانی پلا سکتا ہوں تو تو رب العالمین ہے۔ اللہ کہے گا۔ میرے فلاں بندہ نے پانی مانگا مگر تو نے اس کو پانی نہیں پلایا۔ کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اگر تو اس کو پانی پلاتا تو مجھ کو اس کے پاس پاتا۔ (صحیح مسلم)

جس نے دنیا میں اپنے کو چھپایا وہ آخرت میں نمایاں ہوگا

ابن ابی الدنیا نے نقل کیا ہے کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اپنی ذات کو اس طرح چھپا دو کہ تمھارا تذکرہ نہ کیا جائے اور خاموشی اختیار کرو، تم سلامت رہو گے (وادفن شخصک لاتذکر واصمت تسلم، کنزالعمال جلد ۲ صفحہ ۱۵۰)

آدمی کے مال میں دوسرے کا بھی حق ہے

طبرانی نے جعدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ بڑے پیٹ والا تھا۔ آپ نے اپنی انگلی اس کے پیٹ پر رکھی اور فرمایا:

لوکان ھذا فی غیر ھذا المکان لکان خیرا لك (احمد، طبرانی)

یہ کھانا اگر دوسرے کے پیٹ میں ہوتا تو تیرے لئے زیادہ بہتر تھا۔

باپ کی ذمہ داریاں

ابونعیم نے ابو رافع رض (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام) سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا: کیف بك یا ابا رافع اذا افتقرت (اے ابو رافع! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم محتاج ہو جاؤ گے) میں نے کہا: کیوں نہ ابھی سے میں اس سے بچنے کی تیاری کروں۔ آپ نے فرمایا ضرور ایسا کرو۔ پھر پوچھا تمہارے پاس کتنا مال ہے۔ میں نے کہا چالیس ہزار۔ اور یہ اللہ عز وجل کے لئے ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ ایک حصہ اللہ کے راستہ میں دو اور ایک حصہ روک کے رکھو۔ اور اس سے اپنی اولاد کی اصلاح کرو۔ میں نے کہا: اے خدا کے رسول کیا ان کا ہمارے اوپر حق ہے جس طرح ہمارا ان کے اوپر حق ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ باپ کا حق اپنے بیٹے پر یہ ہے کہ وہ ان کو کتاب اللہ کی تعلیم دے۔ تیر اندازی اور تیراکی سکھائے:

وان یورثه طیبا (حلیۃ الاولیاء جلد ۱)

اور ان کو خوشبو (دینی اخلاق) کا وارث بنائے۔

بہت سی شکایتوں کا سبب غلط فہمی ہے

معاویہ رض کی خلافت کے زمانہ میں ایک شخص سہل بن سعد رض کے پاس آیا اور کہا کہ امیر مدینہ (مروان بن حکم) علی رض کو سب وشتم کرتا ہے۔ سہل نے پوچھا وہ کیا کہتا ہے۔ آنے والے نے کہا وہ ان کو ابو تراب کہتا ہے (یقول له ابو تراب) سہل یہ سن کر ہنس پڑے اور بولے: واللہ ما سماہ الا النبی صلی اللہ علیہ وسلم وما کان له اسم احب الیه منه خدا کی قسم اس نام سے تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پکارا ہے۔ اور آپ کے نزدیک ان کا اس سے پیارا نام کوئی نہ تھا۔ (بخاری کتاب المناقب، باب مناقب علی)

مُردہ کو برا بھلا کہنے سے پرہیز

عکرمہ بن ابوجہل کی بیوی ام حکیم بنت الحارث بن ہشام فتح مکہ کے دن اسلام لائیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے شوہر عکرمہ یمن کی طرف بھاگ گئے ہیں۔ انھیں اندیشہ ہے کہ آپ ان کو قتل کرا دیں گے۔ میری درخواست ہے کہ آپ انھیں امن دے دیں۔ آپ نے فرمایا ان کو ہماری طرف سے امن ہے۔ ام حکیم اپنے رومی غلام کو لے کر عکرمہ کی تلاش میں نکلیں۔ عکرمہ اس وقت تہامہ کے ساحل پر پہنچ چکے تھے۔ اور کشتی پر سوار ہو کر سمندر پار چلے جانا چاہتے تھے۔ عین اس وقت ام حکیم وہاں پہنچ گئیں اور کہا کہ میں اس ہستی کی جانب سے آرہی ہوں جو تمام لوگوں میں سب سے بہتر ہے۔ تم اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو" انھوں نے بڑی مشکل سے ان کو واپسی کے لئے تیار کر لیا۔ ام حکیم نے کہا: میں

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تمھارے لئے امان طلب کرلی ہے۔ عکرمہ نے کہا "تم نے"۔ انھوں نے کہا: ہاں میں نے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ واپس روانہ ہوئے۔ مکہ کے قریب آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے کہا:

یاتیکم عکرمۃ بن ابی جہل مومنا مھاجرا فلا تسبوا اباہ فان سب المیت یوذی الحی ولا یبلغ المیت

عکرمہ بن ابوجہل مومن اور مہاجر ہو کر آرہے ہیں۔ تم لوگ ان کے باپ کو برا نہ کہنا۔ کیوں کہ مردہ کو برا کہنے سے زندہ کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ مردہ کو نہیں پہنچتی۔

تعلقات میں دوسروں کی عزت کا لحاظ رکھنا

ہجرت کا سفر طے کر کے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو لوگوں نے بستی سے باہر نکل کر آپ کا استقبال کیا۔ راستوں میں اور چھتوں پر مردوں اور عورتوں اور بچوں کا ہجوم تھا۔ وہ کہہ رہے تھے اللہ اکبر جاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اللہ اکبر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگئے) انصار میں آپس میں اس بات پر نزاع ہونے لگی کہ کون آپ کو اپنے یہاں ٹھہرائے۔ مدینہ میں آپ کے ننہالی رشتہ کے لوگ رہتے تھے۔ آپ نے ان کی خاطر کے لئے اولاً انھیں کے یہاں قیام پسند فرمایا۔ آپ نے کہا:

انزل اللیلۃ علی بنی النجار اخوال عبد المطلب لاکرمھم بذلک (البدایہ والنہایہ، جلد ۳)

اس وقت میں عبد المطلب کے ماموں بنو نجار کے یہاں ٹھہروں گا تاکہ ان کو میرے ٹھہرنے سے عزت حاصل ہو۔

ابو ایوب انصاری (خالد بن زید نجاری خزرجی) جن کے یہاں آپ ابتدائی چند مہینے ٹھہرے، اسی خاندان بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ مسجد نبوی اور اس کے گرد حجروں کی تعمیر کے بعد آپ اس میں منتقل ہو گئے۔

شبہ پر رائے شیطان کی رائے ہوتی ہے

ام المومنین صفیہ بنت حی رضی اللہ عنہا کہتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں تھے۔ رات کو میں آپ سے ملنے گئی۔ میں نے آپ سے باتیں کیں پھر واپس آنے کے لئے اٹھی۔ آپ بھی مجھے رخصت کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں انصار کے دو آدمی ادھر سے گزرے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں دیکھا تو چاہا کہ تیز چل کر جلدی سے نکل جائیں۔ آپ نے ان کو آواز دے کر فرمایا: "جلدی نہ کرو۔ یہ میری بیوی صفیہ بنت حی ہیں"۔ وہ دونوں آدمی بولے "سبحان اللہ! اے خدا کے رسول"۔ آپ نے فرمایا:

ان الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم۔ وانی خشیت ان یقذف فی قلوبکما شرا او قال شیئا (متفق علیہ)

شیطان آدمی کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ شیطان تمھارے دلوں میں میری طرف سے کوئی برا گمان نہ ڈال دے۔

جس نے دنیا میں اپنے کو چھپایا وہ آخرت میں نمایاں ہوگا

ابن ابی الدنیا نے نقل کیا ہے کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا اپنی ذات کو اس طرح چھپا دو کہ تمھارا تذکرہ نہ کیا جائے اور خاموشی اختیار کرو، تم سلامت رہو گے (وار شخصک لا تذکر واصمت تسلم، کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۱۵۰)

اسلامی مرکز کی اشاعتی مہم : عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

دین کیا ہے	از	مولانا وحید الدین خاں	Rs. 1.50
الاسلام	"	"	12.00
تجدید دین	"	"	2.00
ظہور اسلام	"	"	12.00
اسلامی زندگی	"	"	
زلزلۂ قیامت	"	"	3.00
تاریخ کا سبق	"	"	
تعمیر ملت	"	"	
مذہب اور جدید چیلنج	"	"	13.50
اسلامیات	"	"	
عقلیات اسلام	"	"	2.00
اسلام دین فطرت	"	"	
تعلیمات قرآن	"	"	
قرآن کا مطلوب انسان	"	"	

ماہنامہ الرسالہ — تعمیری اور اصلاحی مضامین کے مستقل مطالعہ کے لئے — زر تعاون سالانہ 24.00

MAKTABA AL-RISALA, JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 110006

Regd No. D (D) 532
Regd. R N. No. 28822/76

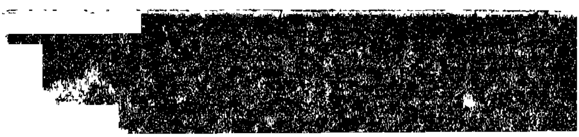
November 1978

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qasimjan Street, DELHI-110006 (INDIA)

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں



تاریخ کا سبق

از

مولانا وحید الدین خاں

سال اشاعت ۱۹۷۸
قیمت دو روپے

مکتبہ الرسالہ
جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ٦

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عروج وزوال کے تاریخی قانون کو قرآن میں مختصر طور پر اس طرح بیان کیا گیا ہے: اللہ کسی گروہ کے مابقوم (حالت قومی) کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے ما بانفس (حالت نفسی) کو نہ بدلے (انفال ۵۳، رعد ۱۱)

ان آیات میں ما بانفس کی تبدیلی سے مراد وہ تبدیلی ہے جو افراد کی سطح پر ہوتی ہے۔ کیونکہ "نفس" افراد ہی کی سطح پر پایا جاتا ہے نہ کہ اجتماع کی سطح پر۔ مطلب یہ ہے کہ قوموں کا زوال اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان کے افراد میں بگاڑ آگیا ہو۔ اسی طرح قوموں کا عروج اس وقت ہوتا ہے جب کہ افراد کی سطح پر ان میں زندگی پیدا ہو جائے۔ اس سنت الٰہی کے مطابق اصلاح قوم کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اصلاح افراد سے شروع کیا جائے نہ کہ انقلاب حکومت سے۔ انقلاب حکومت کے نعرہ سے کام کا آغاز کو یا کسی گروہ کے مابقوم کو مابقوم سے بدلنے کی کوشش کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوشش ایک ایسی دنیا میں نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جس کے پیدا کرنے والے نے اس کے مابقوم کی تبدیلی کو اس کے ما بانفس کی تبدیلی کے ساتھ جوڑ دیا ہو۔ یہ باغ کو باغ سے نکالنے کی کوشش ہوگی۔ جب کہ اس دنیا میں باغ کو صرف بیج سے نکالا جا سکتا ہے۔

"تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ کسی نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا" ـــــ یہ قول جس طرح دوسری قوموں کے لئے صحیح ہے ٹھیک اسی طرح وہ ہمارے اوپر بھی صادق آتا ہے۔ ہماری طویل تاریخ ہر قسم کے سبق آموز واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ مگر ہم میں سے کوئی شخص جب کام کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو اکثر وہ انھیں ناکام تجربات کو دہراتا ہے جو اس سے پہلے بار بار پیش آچکے ہیں۔ وہ تاریخ کے قانون کو جانتے ہوئے اپنے آپ کو، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس سے الگ کر لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ صرف دوسروں کے لئے تھا، ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔

تاریخ مسلسل طور پر یہ سبق دیتی رہی ہے کہ کوئی قوم اس وقت ترقی کرتی ہے جب کہ اس کے افراد میں کیرکٹر کی طاقت پیدا ہو جائے۔ مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم افراد میں کیرکٹر پیدا کئے بغیر ترقی کی طرف چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ ساری تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی سربلندی کا راز ابتدائی سطح پر تعمیر و استحکام ہے۔ مگر لوگ موقع ملتے ہی سیاسی ادارہ سے مقابلہ آرائی شروع کر دیتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ افراد قوم کے درمیان باہمی اتحاد، خواہ جس قیمت پر بھی ہو، باقی رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ مگر معمولی معمولی باتوں پر لوگ ایک دوسرے کے خلاف محاذ بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کہتی ہے کہ حقیقت پسندی کسی بھی کامیابی تک پہنچنے کا واحد زینہ ہے۔ مگر ہمارے رہنما نہایت بے دردی کے ساتھ قوم کو جذباتی ہنگاموں میں مشغول کر دیتے ہیں۔ ملت کو اٹھانے کا کوئی منصوبہ اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کہ ملت کے افراد کو اٹھایا جا چکا ہو ـــ ملت کی ترقی کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو بولنے سے زیادہ چپ رہنا جانتے ہوں جو الفاظ سے زیادہ معانی کی زبان سمجھتے ہوں۔ جو طاقت سے زیادہ دلیل کے آگے جھکنے والے ہوں۔ جو کہنے سے زیادہ کرنا جانتے ہوں۔ جو آگے بڑھنے سے زیادہ پیچھے ہٹنے کے بہادر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ جو دنیا سے زیادہ آخرت کو دیکھ رہے ہوں۔ ایسے افراد کے بغیر ملت کی سربلندی کا نعرہ لگانا ایسا ہی ہے جیسے دلدل کے اوپر دیوار کھڑی کرنا۔

خدا کا کلمہ ان کے حق میں پورا ہو کر رہا

حضرت موسیٰ علیہ السلام (۱۴۰۰ - ۱۵۲۰ ق م) کی آمد سے ساڑھے تین ہزار برس پہلے یہ واقعہ ہوا کہ فلسطین اور شام کے علاقے کے کچھ عرب، جن کو "عمالیق" کہا جاتا تھا، مصر میں داخل ہوئے اور وہاں کے مقامی حکمرانوں کے آپس کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر مصر کی سلطنت پر قابض ہو گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام (۱۷۹۶ - ۱۹۰۶ ق م) جب نوجوانی کی عمر میں فلسطین سے مصر پہنچے تو اس وقت مصر پر اُن کے انھیں ہم قوموں کی حکومت تھی۔ ایک عورت کی پیدا کردہ بعض ابتدائی مشکلات کے بعد آپ کو مصر میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ ایک شان دار شخصیت کے مالک تھے اور آپ کے اندر غیر معمولی انتظامی صلاحیت تھی۔ مصری حکمرانوں کو نسلی قربت کی وجہ سے آپ کی صلاحیتوں کے اعتراف میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ آپ کے زمانہ کے عرب بادشاہ ابوفیلیس نے آپ کے دین کو قبول نہ کرتے ہوئے بھی حکومت کا تمام کاروبار آپ کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد حضرت یوسف نے اپنے والد حضرت یعقوب (اسرائیل) اور دیگر اہل خاندان کو مصر بلا لیا۔ یہ لوگ تقریباً چار سو سال تک مصر کی حکومت پر چھائے رہے۔ مصر کے آئینی حکمران اگرچہ اب بھی مشرک عمالیق تھے مگر حکومت پر عملاً بنی اسرائیل ہی کا قبضہ تھا۔

بنی اسرائیل ابتداءً جب مصر آئے تو ان کو یہاں کی انتہائی زرخیز زمینوں میں بسایا گیا اور حکومت کے اعلیٰ ترین مناصب ان کے لئے مخصوص رہے۔ مگر یہ اکثریت کے اوپر اقلیت کی حکومت تھی۔ بائبل کے بیان کے مطابق یعقوب (اسرائیل) کا گھرانا جو ملک مصر منتقل ہوا، ان کی تعداد حضرت یوسف کو ملا کر ۶۸ تھی۔ توالد و تناسل نیز تبلیغ کے ذریعے دور قدیم کے ان "مسلمانوں" کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ پانچ سو برس بعد جب حضرت موسیٰ نے مردم شماری کرائی تو صرف ان کے مردوں کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اگرچہ اس زمانے کی مصری آبادی کے قطعی اعداد و شمار معلوم نہیں ہیں، تاہم تخمینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصر کی اس زمانے کی آبادی میں بنی اسرائیل کی تعداد تقریباً ۱۰ فی صد ہوگی۔

حضرت یوسف نے ۱۱۰ سال کی عمر پائی۔ آپ کے تین چار سو سال بعد مصر میں عرب حکمرانوں کے خلاف ردعمل ہوا لمبے خون خرابے کے بعد بالآخر قبطی غالب آئے۔ "بیرونی حکمرانوں کو تخت سے بے دخل کر دیا گیا اور مصر پر ایک قبطی خاندان کی حکومت قائم ہو گئی جس کے حکمرانوں نے "فرعون" کا لقب اختیار کیا۔

قبطی حکومت کے قیام کے بعد اگرچہ ڈھائی لاکھ عربوں کو مصر سے نکال دیا گیا تھا۔ تاہم بنی اسرائیل اب بھی وہاں رکھے گئے تاکہ نئے حکمرانوں کے لئے بیگار کا کام دے سکیں۔ بائبل کے الفاظ میں: "مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انھوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی۔ اور ان کی ساری خدمت جو وہ ان سے کراتے تھے مشقت کی تھیں" خروج ۱: ۱۳-۱۴

حضرت موسیٰؑ تشریف لائے تو بنی اسرائیل اسی دورِ مشقت سے گزر رہے تھے۔ آپ نے قبطی فرعونی تہذیب کے مقابلہ میں مغلوب حیثیت اختیار کرنے کے بجائے خود ان کے اوپر اقدام کا طریقہ اختیار کیا۔ آپ نے دعوت دینی شروع کی کہ دینِ خداوندی کو اختیار کرو، ورنہ تم سب کے سب تباہ کر دیئے جاؤ گے۔ یہ چیز فرعون کے غصہ میں صرف اضافہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے لئے مصر کی زندگی آپ کے آنے کے بعد تلخ تر ہو گئی۔ حتیٰ کہ اس میں مزید یہ اضافہ ہوا کہ شاہی حکم کے تحت بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے بیٹوں کو قتل کیا جانے لگا تاکہ ان کی نسل دھیرے دھیرے مصر سے ختم ہو جائے۔ قدیم مصری آثار کی کھدائی کے دوران ۱۸۹۶ میں ایک کتبہ ملا ہے جس میں حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا فرعون منفتاح فخر کے ساتھ کہتا ہے "اور اسرائیل کو مٹا دیا گیا، اس کا بیج تک باقی نہیں"

اس وقت بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے شکایت کی: "آپ کے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جا رہے تھے اور اب آپ کے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں" (اعراف ـ ۱۲۹)

اس انتہائی نازک مرحلہ میں بنی اسرائیل کو جو جواب دیا گیا، وہ قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

وَاَوْحَيْنَا اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ یونس ـ ۸۷	اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو وحی کی کہ تم دونوں اپنی قوم کو مصر میں ٹھہراؤ اور اپنے گھروں کو مرکزِ عمل بناؤ[1] اور نماز قائم کرو اور مومنین کو بشارت دے دو

اس آیت میں جو پروگرام دیا گیا ہے، اس کو حسبِ ذیل طریقے پر بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جہاں ہو، وہاں جمے رہو۔ اپنے اندر خوف و انتشار کو جگہ مت دو۔ یہ وہی چیز ہے جس کو حضرت مسیحؑ نے ان لفظوں میں کہا تھا: جب تک عالم بالا سے تم کو قوت کا لباس نہ ملے اس شہر میں ٹھہرے رہو (لوقا ۲۴ : ۴۹)

۲۔ اپنے گھر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بناؤ، یعنی باہمی اتحاد، اندرونی استحکام، آپس کے صبر و نصیحت اور ذاتی ذرائع پر انحصار، یہ وہ چیزیں ہیں جن پر تمہیں موجودہ حالت میں اپنی توجہات کو مرتکز رکھنا چاہئے۔

۳۔ نماز قائم کرو۔ یعنی اللہ سے اپنے تعلق کو مضبوط کرو، اس کی یاد، اس سے مانگنا، اس کے آگے اپنے آپ کو بالکل جھکا دینا، ان صفات کو زیادہ سے زیادہ اپنے اندر پیدا کرو۔

۴۔ یہی وہ طریقِ عمل ہے جس میں تمہارے لئے دنیا و آخرت کی تمام خوش خبریاں چھپی ہوئی ہیں۔ پوری یکسوئی کے ساتھ ان کی تکمیل میں لگ جاؤ۔ اس سہ نکاتی پروگرام کو مختصر طور پر اس طرح کہہ سکتے ہیں ـــــ استقامت، داخلی تعمیر تعلق باللہ۔ اس پروگرام پر عمل کرنے کا بالآخر جو نتیجہ نکلا، وہ قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

اور جو لوگ کمزور کر دیئے گئے تھے، ہم نے ان کو زمین کے مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت دی ہے۔ اور تمہارے رب کا بہترین کلمہ بنی اسرائیل کے لئے پورا ہو کر رہا۔ اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو اس کی صنعتوں اور اس کے فارموں کے ساتھ مٹا کر رکھ دیا۔ اعراف ـ ۱۳۷

---

[1] تبوّا لقومكما بمصر بیوتا کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے: ساکن کنید قوم خود را بشہر مصر در خانہا قبلہ کا لفظ قِبَلَ کا اسم نوعی ہے۔ اس کا اصل مفہوم ہے "مرکزِ توجہ"۔ کہتے ہیں قبلت الماشیۃ الوادی: جانور وادی کی طرف متوجہ ہوئے

ان کے ناموافق حالات نے ان کے لئے ایک نیا موافق امکان پیدا کر دیا

مادہ جب "برباد" کیا جاتا ہے تو وہ انرجی بن جاتا ہے جو مادہ کی زیادہ وسیع اور طاقت ور صورت ہے۔ یہی خدا کی اس کائنات کا عام قانون ہے۔ یہاں ہر محرومی کے اندر ہمیشہ ایک نئی یافت کا امکان چھپا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ صفتِ خاص جس کا ظہور عالم مادی میں ہوا ہے، اس کا وعدہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اہل ایمان کے لئے کیا گیا ہے۔ ان کے لئے ان کا رب ناموافق حالات میں بھی موافق پہلو پیدا کر دیتا ہے، بشرطیکہ وہ فی الواقع خدا کے ہو چکے ہوں۔ ان کی منصوبہ بندی خالص خدائی مشن کے لئے ہو نہ کہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لئے۔

مکہ میں جب مسلمانوں کے حالات سخت ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا: "تم لوگ حبش چلے جاؤ۔ وہاں کا بادشاہ نجاشی عیسائی ہے اور نیک نفس ہے۔ وہ تم لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا"۔ چنانچہ ۶۱۵ء میں پندرہ آدمی جدہ پہنچے اور کشتیوں پر سوار ہو کر حبش چلے گئے۔ دوسری بار ۶۱۷ء میں ایک سو مسلمان حبش گئے۔

بظاہر یہ ایک ناپسندیدہ واقعہ تھا۔ مگر اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک خیر کی صورت پیدا کر دی۔ مکی مسلمانوں کا حبش پہنچنا وہاں اسلام کو موضوع بحث بنانے کا سبب بن گیا۔ پیغمبر اسلام کی بعثت اور آپ کی دعوت کی خبریں حبش میں پھیلنے لگیں۔ قریش کا ایک مخالفانہ وفد حبش پہنچنے کے نتیجہ میں حضرت جعفر کو موقع ملا کہ دربار شاہی میں اسلام کی دعوت پر مفصل تقریر کر سکیں۔ اس طرح کے واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ حبش سے ۲۰ عیسائیوں کا ایک وفد مکہ آیا تاکہ اصل معاملہ کی تحقیق کر سکے۔

جب یہ لوگ مکہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں تھے۔ وہ وہاں گئے اور آپ سے مل کر مختلف سوالات کئے اور پوچھا کہ آپ کیا تعلیم لائے ہیں۔ آپ نے بتایا کہ خدا نے میرے اوپر اپنا کلام اتارا ہے اور قرآن کی کچھ آیات پڑھ کر سنائیں۔ یہ لوگ چونکہ تعصب سے خالی تھے، قرآن سن کر بہت متاثر ہوئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ انھوں نے تصدیق کی کہ بلاشبہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اور اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔

جس وقت یہ واقعہ ہو رہا تھا، قریش کے بہت سے لوگ وہاں جمع تھے اور سارا ماجرا دیکھ رہے تھے۔ انھیں حیرت بھی تھی اور غصہ بھی آ رہا تھا کہ جس دین کو انھوں نے

رد کر دیا ہے، اس کو باہر کے لوگ آ آکر اپنا رہے ہیں۔ حبش کے یہ لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھے تو ابوجہل اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر ان سے راستہ میں ملا۔ اس نے ان لوگوں کو ملامت کرتے ہوئے کہا:

"ہمارا خیال ہے کہ تم سے زیادہ احمق قافلہ یہاں کبھی نہیں آیا۔ تمہارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لئے یہاں بھیجا تھا کہ تم اس شخص کے حالات کی تحقیق کرو اور واپس جا کر اپنے ساتھیوں کو بتاؤ۔ مگر ابھی تم اس سے ملے ہی تھے کہ اپنے دین کو چھوڑ بیٹھے۔"

جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے یہ بنی اسرائیل کے علما تھے (شعراء - ۱۹۷) انھوں نے ابوجہل وغیرہ سے کوئی بحث نہیں کی۔ بلکہ صرف یہ جواب دیا: "سلام ہے بھائیو تم کو، ہم تمہارے ساتھ جہالت نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔ ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔" (ابن ہشام)

انھیں لوگوں کے بارے میں قرآن میں آیا ہے:

"جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، یہ بلاشبہ خدا کی طرف سے ہے۔ ہم تو پہلے ہی سے اس کو ماننے والے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو دہرا اجر دیا جائے گا، ان کے صبر کے بدلے۔ وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انھیں دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ انھوں نے جب لغو بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے الگ ہو گئے: ہمارے اعمال ہمارے ساتھ اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔"
قصص ۵۵-۵۲

ناموافق حالات میں موافق امکان کن لوگوں کے لئے ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو صبر کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ صبر یہ ہے کہ رد عمل کی نفسیات کے تحت اقدام کرنے سے پرہیز کیا جائے اور جو فیصلہ کیا جائے غیر متاثر ذہن سے سوچ سمجھ کر کیا جائے۔ ایسا انسان اپنی رفتار سفر کو خدا کی رفتار سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ اس کو ان خدائی بخششوں میں حصہ ملنے لگتا ہے جو جلد بازی سے بچنے والوں کے لئے مقدر ہیں۔

ایک درخت کاٹ دیا جائے تو ظاہر بیں کے لئے گویا درخت ختم ہو گیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ اس کی باقی ماندہ جڑوں سے نئی پتیاں نکل رہی ہیں۔ حتیٰ کہ انتظار کو طویل کیا جا سکے تو دیکھنے والا دیکھے گا کہ جہاں درخت بظاہر "ختم" ہو گیا تھا وہاں دوبارہ ایک نیا درخت کھڑا ہو گیا ہے۔ خدا کا یہی معاملہ انسانوں کے ساتھ بھی ہے۔ ہر بار جب کسی قوم یا شخص کے لئے ایک امکان ختم ہوتا ہے تو قانون قدرت کے تحت ایک دوسرے امکان کی کونپلیں اس کے لئے نکلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ مگر جلد باز انسان صبر نہیں کرتا۔ وہ فوری نتیجہ حاصل کرنے کے شوق میں ایک الل ٹپ چھلانگ لگا دیتا ہے۔ اس کی جلد بازی اس کو موقع نہیں دیتی کہ وہ نئے ابھرنے والے امکانات کو دیکھ سکے اور ان کے مطابق اپنے اگلے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک کے بعد ایک لاحاصل اقدامات میں اپنی قوتوں کو ضائع کرتا رہتا ہے اور اس کی نوبت ہی نہیں آتی کہ وہ اس "دوسرے" دروازہ میں داخل ہو سکے جو "پہلا" دروازہ بند ہونے کے بعد اس کے رب نے اس کے لئے کھولا تھا۔ صبر سب سے بڑا دین ہے۔ مگر بہت کم ہیں جو اس پہلو سے دیندار بننے کی ضرورت محسوس کرتے ہوں

جب تاریخ کا رخ موڑ دیا گیا

قدیم عرب کے شمال اور جنوب کے زرخیز حصے اس زمانہ کی دو بڑی شہنشاہیتوں ساسانی سلطنت اور اور بازنطینی سلطنت کے قبضہ میں تھے۔ شمال میں عمارت غساسنہ اور امارت بُصریٰ تھی۔ یہ دونوں بازنطینی سلطنت (رومیوں) کے ماتحت تھیں اور یہاں ان کی طرف سے عرب سردار حکومت کرتے تھے۔ رومی اثرات کے تحت یہاں کی اکثر آبادی مسیحی مذہب اختیار کر چکی تھی، عرب کے جنوب میں امارت بحرین، امارت عمان، امارت یمامہ تھی۔ یہ ریاستیں ساسانی سلطنت (ایرانیوں) کے ماتحت تھیں اور ان کے اثر سے یہاں کے باشندوں میں مجوسیت پھیلی ہوئی تھی۔

۶ھ میں جب حدیبیہ میں قریش سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ ہوا اور حالات پرامن ہوگئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے اطراف میں واقع سلطنتوں کو دعوتی مراسلے بھیجنے شروع کئے اس سلسلے میں ایک مراسلہ حارث بن ابی شمر غسانی کے نام تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر شجاع بن وہب آپ کا مراسلہ لے کر اس کے پاس گئے۔ اس مراسلہ میں یہ بھی تھا کہ اللہ پر ایمان لاؤ تمہاری حکومت باقی رہے گی (یبقیٰ لک ملکک) اس نے مکتوب نبوی میں یہ جملہ پڑھا تو اس کو غصہ آ گیا۔ اس نے خط کو زمین پر پھینک دیا اور کہا: میری حکومت مجھ سے کون چھین سکتا ہے (من ینزع ملکی منی)

حاکم بُصریٰ شرجیل بن عمرو غسانی نے اس سے بھی زیادہ بیہودہ سلوک کیا۔ اس رومی گورنر کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حارث بن عمیر ازدی آپ کا خط لے کر گئے تھے، وہ سرحد شام پر قصبہ موتہ میں داخل ہوئے تھے کہ حاکم بصریٰ کے اشارہ پر ایک اعرابی نے آپ کے سفیر کو قتل کر دیا۔

بین اقوامی روایات کے مطابق یہ واقعہ ایک ملک پر دوسرے ملک کی جارحیت کے ہم معنی تھا۔ مختلف قرائن یہ بھی ظاہر کر رہے تھے کہ شام کی فوجیں پیش قدمی کرکے مدینہ میں داخل ہوجانا چاہتی ہیں۔ رومی شہنشاہیت اس کو برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ عرب میں کوئی آزاد حکومت قائم ہو اور ترقی کرے۔

حارث بن عمیر کے قتل کی خبر مدینہ پہنچی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فوجی جواب دینا ضروری سمجھا۔ آپ نے حکم دیا کہ مسلمان اپنے ہتھیار لے کر موضع حرف میں جمع ہو جائیں۔ چنانچہ تین ہزار کی تعداد میں اسلامی لشکر اکٹھا ہو گیا۔ آپ نے اس لشکر پر زید بن حارثہ کو سردار مقرر کیا اور ضروری نصیحتیں کرنے کے بعد ان کو شام کی طرف روانہ کیا۔

اسلامی لشکر نے معان (شام) پہنچ کر قیام کیا۔ دوسری طرف حاکم بصریٰ بھی جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کی حوصلہ افزائی اس واقعہ سے بھی ہوئی کہ اتفاق سے ہرقل انھیں دنوں مآب (بلقاء) میں آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لاکھ مسلح فوج تھی۔ نیز اس علاقے کے عیسائی قبائل لخم، جذام، قین، بہراء، بلی بھی مسیحی حمیت کے جوش میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بنی بلی کے سردار مالک بن زافلہ کی قیادت میں لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس طرح شامی محاذ پر ایک لاکھ سے بھی زیادہ کا لشکر جمع ہو گیا جبکہ مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔

یہ جنگ جو جمادی الاولیٰ ۸ھ میں ہوئی، اس میں زید بن حارثہ دشمنوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اس کے بعد

جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ بھی قیادت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ مسلمانوں کا جھنڈا گر جانے سے انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس وقت لشکر اسلام کے ایک سپاہی ثابت بن اقرم نے بڑھ کر جھنڈا اٹھا لیا اور بلند آواز سے کہا:

"مسلمانو! کسی ایک شخص کو امیر بنانے پر اتفاق کر لو"

مسلمان فوجیوں کی طرف سے آواز آئی رضینا بک (ہم تمہاری سرداری پر راضی ہیں) ثابت ابن اقرم نے جواب دیا: ما انا بفاعل فاتفقوا علی خالد بن الولید (میں یہ کام نہ کر سکوں گا تم لوگ خالد بن ولید کو اپنا سردار بنا لو) اب آواز بلند ہوئی: ہم کو خالد بن ولید کی سرداری منظور ہے۔ یہ سنتے ہی خالد بن ولید نے آگے بڑھ کر جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور رومی لشکر پر حملہ کر کے اس کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس جنگ میں دو ہزار مسلمان شہید ہوئے۔

تاہم یہ جنگ فیصلہ کن طور پر ختم نہیں ہوئی تھی۔ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ رومیوں کی مدد سے غساسنہ مدینہ پر چڑھ آئیں اور اس نومولود ریاست کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ ذی الحجہ ۵ھ میں بنو قریظہ کے خاتمہ کے بعد جب مدینہ میں بعض معاشی مسائل پیدا ہوئے اور ازواج رسول نے اضافہ نفقہ کا مطالبہ کیا تو آپ کو بہت رنج ہوا اور آپ نے ایک مہینہ تک گھر کے اندر نہ آنے کی قسم کھالی۔ اس سلسلے میں تاریخ میں آتا ہے کہ جب ایک صحابی عمر فاروق سے ملے اور ان سے کہا: "کچھ سنا آپ نے" تو عمر فاروق کی زبان سے فوراً نکلا: "کیا غساسنہ آ گئے" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں غسانیوں کی طرف سے مدینے کے لئے کتنا خطرہ لاحق تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مسئلہ کا شدید احساس تھا۔ چنانچہ اپنی عمر کے آخری ایام میں جن امور کے لیے آپ نے شدت سے اہتمام کیا، ان میں غساسنہ یا بالفاظ دیگر رومیوں سے مقابلہ کے لئے فوج کی تیاری بھی تھی۔ آپ نے اس مقصد کے لئے ایک فوج ترتیب دی۔ اس فوج میں اگرچہ ابوبکر و عمر جیسے بڑے بڑے اصحاب تھے مگر آپ نے انتہائی دانش مندی سے کام لیتے ہوئے اس لشکر کا سردار اسامہ بن زید کو مقرر کیا۔ اسامہ نہ صرف ایک بہادر نوجوان تھے بلکہ ان کے دل میں رومیوں سے انتقام کا شدید جذبہ بھی موجزن تھا۔ کیونکہ موتہ کی جنگ میں رومیوں نے ان کے والد زید بن حارثہ کو قتل کیا تھا۔

تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں یہ لشکر روانہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ عین وقت پر آپ کے اوپر مرض الموت کا غلبہ ہو گیا۔ آپ کی وفات کے بعد صدیق اکبر نے خلیفہ اول کی حیثیت سے اس لشکر کو شام کی طرف روانہ کیا۔

یہ روانگی بھی اسلامی تاریخ کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہر طرف سے ارتداد کی خبریں آنے لگیں۔ لوگوں نے خلیفہ اول کو مشورہ دیا کہ اب جبکہ مرکز اسلام خطرہ میں پڑ گیا ہے اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں اس لشکر کی روانگی کو ملتوی کر دیا جائے مگر صدیق اکبر کا یہ جواب لوگوں کو خاموش کرنے کے لیے کافی تھا:

"اگر مجھ کو یقین ہو کہ لشکر کی روانگی کے بعد مجھ کو مدینہ میں کوئی درندہ تنہا پا کر پھاڑ ڈالے گا، تب بھی میں اس لشکر کی روانگی کو ملتوی نہیں کر سکتا جس کو خود رسول اللہ نے ترتیب دیا ہو" صدیق اکبر کی یہ ایمانی جرأت کام آئی۔ اسامہ کا لشکر نہ صرف رومیوں کے مقابلہ میں کامیاب ہوا بلکہ رومی شہنشاہیت کے مقابلہ میں مسلمانوں کی فتح نے مرتدین کی بھی حوصلہ شکنی کی اور

نسبتاً آسانی کے ساتھ وہ مغلوب کر لیے گئے۔

اس واقعہ میں ایک اور بہت بڑی حکمت شامل تھی، عرب قبائل ہمیشہ سے آپس میں لڑتے چلے آرہے تھے شدید اندیشہ تھا کہ اپنی قوتوں کے اظہار کا دوسرا میدان نہ پاکر وہ دوبارہ آپس میں لڑنے لگیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت عرب طاقت کو رومی شہنشاہیت سے متصادم کرکے اس کا جواب فراہم کر دیا۔ اب عربوں کی جنگجو فطرت کے لیے ایک بہترین میدان مل چکا تھا۔ چنانچہ تاریخ نے دیکھا کہ وہ لوگ جو اپنے ہم وطنوں کی قتل و غارتگری کے سوا کچھ نہ جانتے تھے انھوں نے ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں ایک پوری دنیا کو فتح کر ڈالا۔

جان بیگٹ گلب پاشا نے اپنی کتاب دی لائف اینڈ ٹائمز آف محمد میں اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"عرب نامعلوم زمانے سے ایک دوسرے کے ساتھ جنگ وجدل میں زندگی بسر کرنے کے عادی رہے تھے۔ یہ جنگ وجدل کسی خاص سبب کا نتیجہ نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ ان کی طرز زندگی میں داخل تھی۔ اب جبکہ وہ بحیثیت مسلمان ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے سے روک دیئے گئے تھے یہ کیسے ممکن تھا کہ فوجی ذہنیت کے قبائلی آدمیوں کو ہمیشہ کے لیے پرامن زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جائے؟ پیغمبر اسلام نے خود اس مہم کو روانہ کرکے جس نے موتہ میں شکست کھائی تھی اس سوال کا حل پیش کر دیا تھا۔

۶۳۴ء کے سرما میں تین عرب کالموں نے فلسطین اور شام پر حملہ کر دیا اسی اثناء میں مشرقی عرب کے قبیلوں نے جوحیرہ کی لخمی ریاست کی ضبطی کے بعد سے ایران کے دشمن بنے ہوئے تھے، فرات کی طرف پیش قدمی کرکے حیرہ پر قبضہ کر لیا۔ ۲۰ اگست ۶۳۶ء کو بازنطینی (رومی) قوت نے یرموک کے میدان میں مکمل شکست کھائی اور شام کا تمام علاقہ طبریہ تک عربوں کے قبضہ میں آگیا۔ فروری ۶۳۷ء میں ایرانی فوج قادسیہ کے مقام پر جوحیرہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھا مکمل طور پر تباہ کر دی گئی اور قدیم عراق بشمول ایرانی دارالسلطنت مدائن جو دجلہ کے جنوب میں موجودہ بغداد کے قریب واقع تھا، عربوں کے زیر تسلط آگیا۔ ۶۴۰ء میں مصر پر حملہ ہوا اور ایک بار پھر بازنطینی حکومت شکست یاب ہوئی اور ستمبر ۶۴۲ء تک پورے مصر پر عرب قبضہ مکمل ہو گیا۔ اسی سال بچی کھچی ایرانی فوج نہاوند کے مقام پر تباہ کر دی گئی اور ایرانی سلطنت کا پورے طور پر خاتمہ ہو گیا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد پہلے خلیفہ راشد رضی اللہ عنہ نے، انتہائی نازک حالات کے باوجود حضرت اسامہ کے لشکر کو رومیوں کی طرف بھیجا۔ یہ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے لئے ایک عظیم سبق تھا: مسلمانوں کیلئے طاقت آزمائی کا میدان خارجی دنیا ہے نہ کہ داخلی دنیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ اہم ترین سبق بعد کے زمانہ میں مسلمان بھول گئے۔ خاص طور پر موجودہ زمانہ میں تو یہ حال ہے کہ مسلم ممالک دو گروہوں (ترقی پسند اور قدامت پسند) میں بٹ کر ایک دوسرے کے حریف بنے ہوئے ہیں۔ ان کی مسلح فوجیں اپنے ہی ملکوں کو "فتح" کرنے میں مشغول ہیں، مسلم جماعتیں خود اپنے ملکوں کی حکومتوں سے نبرد آزما ہیں۔ باہر کے حریفوں سے مقابلہ کے لئے ہر ایک عاجز ہے اور اپنے بھائیوں سے لڑنے کے لئے ہر ایک بہادر بنا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اگر اسلام کی توسیع و اشاعت کا کام رک جائے تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔

یہ کامیابی محض پُرجوش اقدام کا نتیجہ نہ تھی بلکہ سوچے سمجھے منصوبہ کے ذریعہ حاصل کی گئی

"بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے" اس طرح کے الفاظ نے مسلمانوں میں ناعاقبت اندیشانہ اقدام کا ذہن پیدا کیا ہے۔ حالاں کہ خود اس شعر میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ ایک سوچی سمجھی پیش قدمی تھی نہ کہ محض ایک پرجوش چھلانگ۔

۱۶ھ میں اسلامی فوج سعد بن وقاص کی قیادت میں عراق کے علاقوں کو فتح کر رہی تھی۔ بہرہ شیر کو فتح کرکے جب وہ آگے بڑھی تو سامنے دریائے دجلہ تھا اور اس کے دوسری طرف مدائن جو ایرانیوں کا ایک اہم شہر تھا اور وہاں انھوں نے زبردست قلعہ بنا رکھا تھا۔ ایرانیوں نے بہرہ شیر سے بھاگتے ہوئے دجلہ کے پل کو توڑ دیا تھا اور دور تک کوئی کشتی بھی نہ چھوڑی تھی جس سے اسلامی لشکر دریا کو عبور کر سکے۔

سعد بن ابی وقاص اگلے دن اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور یہ کہہ کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا:

نستعین باللہ ونتوکل علیہ حسبنا اللہ ونعم الوکیل ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العظیم

ہم اللہ سے مدد چاہتے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔ عظیم و برتر خدا کے سوا کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں۔

آپ کو دیکھ کر دوسروں کو بھی جرأت ہوئی اور پورا لشکر اپنے گھوڑوں کے ساتھ دریا میں تیرنے لگا۔ یہ لوگ نصف سے زیادہ دریا پار کر چکے تھے کہ ایرانی تیراندازوں نے تیروں کی بارش شروع کر دی جو دریا کے دوسرے کنارے پہلے سے موجود تھے۔

دریا میں تیرتا ہوا لشکر اس ناگہانی آفت کا خود مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر کیا چیز تھی جس نے فوج کو برباد ہونے سے بچایا۔ یہ کوئی اتفاق نہ تھا اور نہ محض جوشش کا کرشمہ تھا۔ یہ سوچی سمجھی منصوبہ بندی تھی۔ جو کچھ ہوا، وہ عین اس نقشہ کے مطابق ہوا جو پہلے سے طے کر لیا گیا تھا۔

صورت حال پیش آنے کے بعد سعد بن وقاص نے باقاعدہ مشورہ کیا۔ سعد بن وقاص جہاں نصرت الٰہی پر یقین کرتے ہوئے دریا میں کود پڑے، وہیں انھوں نے حالات کا مکمل جائزہ لے کر اس آنے والی آفت کا بھی پیشگی اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب انھوں نے گھوڑا دریا میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو لشکریوں سے فرمایا کہ "تم میں کون ایسا بہادر سردار ہے جو اپنی جمعیت کے ساتھ اس بات کا وعدہ کرے کہ وہ ہم کو دریا عبور کرنے کے وقت دشمن کے امکانی حملہ سے بچائے گا۔ عاصم بن عمرو نے اس کی ذمہ داری لی اور چھ سو تیراندازوں کی ایک جماعت لے کر دجلہ کے اس کنارے ایک اونچے مقام پر کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی ایرانی تیراندازوں نے دجلہ میں تیرتے ہوئے اسلامی لشکر پر تیر پھینکنے شروع کئے، عاصم بن عمرو کا دستہ فوراً متحرک ہو گیا۔ اس نے ایرانی تیراندازوں پر اتنی قوت کے ساتھ مسلسل تیر برسائے کہ انھیں دفاع کی پوزیشن میں ڈال دیا۔ کثرت سے ایرانی مجروح اور ہلاک ہونے لگے حتیٰ کہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس درمیان میں اسلامی لشکر دریا پار کرکے دوسرے کنارے پہنچ گیا اور ایرانی لشکر پر سخت حملہ کرکے مدائن پر قبضہ کر لیا۔

کبھی پیچھے ہٹنا سب سے بڑا اقدام ہوتا ہے
مگر اس کو وہی لوگ جانتے ہیں
جو بڑے دل والے ہوں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۱۱ھ) کے بعد ۲۰ سال تک فتوحات اسلام کا زبردست سلسلہ جاری رہا۔ ہر مہینے کسی نہ کسی بڑے علاقہ کے فتح کی خبر آتی تھی۔ مگر تیسرے خلیفہ کی شہادت (۳۵ھ) کے ساتھ جو باہمی لڑائیاں شروع ہوئیں، انھوں نے تقریباً ۱۰ سال تک فتوحات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ وہ شخص جس نے اس بند دروازہ کو دوبارہ کھولا، وہ حضرت امام حسنؓ تھے جنہوں نے ۴۱ھ میں آپ کی خلافت سے دست برداری بظاہر میدان عمل سے واپسی کا ایک فیصلہ تھا۔ مگر اس واپسی نے اسلامی تاریخ میں اقدام و عمل کے نئے امکانات کھول دیئے۔

حسن بن علی بن ابی طالب شعبان ۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ربیع الاول ۵۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کے والد حضرت علیؓ کی شہادت ۱۷ رمضان ۴۰ھ کو کوفہ میں ہوئی تو آپ کی عمر ۳۷ سال تھی۔ اس وقت صرف عراق اور ایران حضرت علیؓ کے زیر خلافت رہ گئے تھے۔ اس کے علاوہ یمن، حجاز، شام، فلسطین، مصر وغیرہ میں امیر معاویہ کی حکومت قائم تھی۔ حضرت علیؓ کے زیر خلافت علاقہ میں بھی بہت سے لوگ درپردہ آپ کے مخالف تھے۔ حضرت علی کی شہادت کے بعد لوگوں نے امام حسن کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی جو آپ کے سب سے بڑے صاحب زادے تھے۔

حضرت حسن نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے خلافت کی ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ مگر ان کے اندر چونکہ اقتدار کی ہوس نہ تھی، انھوں نے بہت جلد اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ موجودہ حالات میں ان کا خلافت پر اصرار کرنا صرف ملت کے انتشار میں اضافہ کے ہم معنی ہوگا۔ انھوں نے ایک حقیقت پسند انسان کی طرح ایک بار اپنے چھوٹے بھائی حضرت حسین سے کہا تھا:

"میں جانتا ہوں کہ نبوت و خلافت دونوں ہمارے خاندان میں جمع نہیں رہ سکتیں"

اسی نزاکت کی وجہ سے آپ نے بیعت کے وقت لوگوں سے یہ اقرار لے لیا تھا کہ "میں جس سے جنگ کروں تم اس سے جنگ کروگے، میں جس سے صلح کروں تم اس سے صلح کروگے"

حضرت علیؓ کے بعد کوفہ کے لوگوں نے حضرت حسن کو خلیفہ بنایا۔ دوسری طرف حضرت امیر معاویہ کے لئے حضرت علی کا اس دنیا سے جانا گویا راستہ صاف ہونے کے ہم معنی تھا۔ انھوں نے حضرت علی کی شہادت کی خبر ملتے ہی اپنے لئے "امیر المومنین" کا لقب اختیار کر لیا اور یہ منصوبہ بنایا کہ بقیہ اسلامی علاقوں (عراق و ایران) کو بھی اپنے ماتحت کرکے اپنی حکومت کو مکمل کر لیں۔ امیر معاویہ تجدید بیعت سے فارغ ہونے کے بعد ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر دمشق سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کوفہ میں داخلہ سے پہلے انھوں نے امام حسن کو پیغام بھیجا کہ جنگ سے بہتر یہ ہے کہ آپ مجھ سے صلح کر لیں اور مجھ کو خلیفہ وقت تسلیم کر لیں۔ امام حسن کے پاس بھی اس وقت ساٹھ ہزار کا لشکر تھا جو لڑنے مرنے پر تیار تھا۔ مگر امام حسن نے مسلمانوں کو باہمی خوں ریزی سے بچانا زیادہ ضروری سمجھا۔ وہ اپنے حق خلافت سے از خود دست بردار ہو گئے اور صرف چھ ماہ خلیفہ رہ کر امیر معاویہ کے ہاتھ کوفہ کی مسجد میں بیعت کرلی۔

امام حسنؓ کے پرجوش حامیوں کے لئے یہ "ذلت" ناقابل برداشت تھی۔ انھوں نے اس فیصلہ کے خلاف بہت شور وغل کیا۔ آپ کو عار المسلمین (مسلمانوں کے لئے ننگ) کا خطاب دیا۔ کہا کہ آپ کافر ہو گئے ہیں۔ آپ کے کپڑے نوچے، حتی کہ آپ پر تلوار سے حملہ کیا۔ مگر آپ کسی بھی حال میں مقابلہ آرائی کی سیاست اختیار کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ بلکہ فرمایا:

"خلافت اگر معاویہ بن ابو سفیان کا حق تھا تو ان کو پہنچ گیا۔ اور اگر یہ میرا حق تھا تو میں نے ان کو بخش دیا۔"

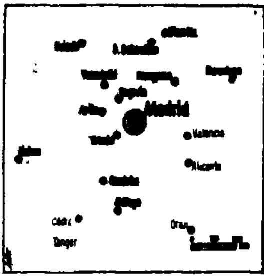
ایک شخص کے پیچھے ہٹ جانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کا باہمی اختلاف باہمی اجتماعیت میں تبدیل ہو گیا اور ۴۱ھ جو اسلامی تاریخ میں صفین وجمل کے بعد تیسری سب سے بڑی باہمی خوں ریزی کا عنوان بنتا، عام الجماعت کے نام سے پکارا گیا۔ وہ اختلاف کے بجائے اتحاد کا سال بن گیا۔ مسلمانوں کی قوت جو آپس کی لڑائیوں میں برباد ہوتی، اسلام کی اشاعت وتوسیع میں صرف ہونے لگی۔

حقیقت یہ ہے کہ کبھی پیچھے ہٹنے ہی کا نام آگے بڑھنا ہوتا ہے اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

حضرت حسنؓ کا یہ عمل کسی قسم کی پسپائی یا فرار نہ تھا۔ یہ انتہائی مکمل سیاست تھی اور عین وہی چیز تھی جس کا نمونہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی سے قائم فرمایا ہے۔

اجتماعی زندگی کا معاملہ انتہائی نازک معاملہ ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اقدام اور مقابلہ کی اصطلاحوں میں سوچنا جانتا ہو تو وہ کبھی اجتماعی اصلاح کے میدان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اجتماعی زندگی مختلف الخیال قوتوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس میں ناقابل قیاس حد تک مختلف صورتیں پیش آتی رہتی ہیں۔ اس لئے اجتماعی زندگی میں طریق عمل کا کوئی ایک معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ ضروری ہے کہ ان طاقتوں کو سمجھا جائے جو بالمقابل محاذ میں مصروف کار ہیں اور اپنی اور دوسروں کی حقیقی صورت حال کا موازنہ کرکے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کی جائے۔ یہ کام بیک وقت نہایت گہری نگاہ کا طالب ہے اور اسی کے ساتھ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ذہن کا بھی۔ اجتماعی مقابلہ میں کبھی اپنے آپ کو مکمل طور پر نظریاتی تبلیغ کے دائرہ میں محدود رکھنا پڑتا ہے۔ اس کی مثال مکہ کے ابتدائی بارہ سال ہیں۔ کبھی حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ فریق مخالف کے چیلنج کو میدان جنگ میں قبول کیا جائے۔ اس کی ایک مثال غزوۂ بدر ہے۔ کبھی دوررس نتائج کو پانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ فریق ثانی سے براہ راست تصادم کرنے سے بچا جائے خواہ اس کی قیمت یہی کیوں نہ ہو کہ فریق ثانی کے یک طرفہ مطالبات مان لینے پڑیں۔ اس کی ایک مثال معاہدۂ حدیبیہ ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں یہ سیاست کا صبر ہے۔ جو شخص سیاست میں صابرانہ طریق کار کا یوتہ نہ رکھتا ہو اس سے اسلام کا کم سے کم مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو سیاست کے میدان میں داخل نہ کرے۔

کامیاب اقدام وہی کر سکتا ہے جو کامیاب پسپائی کا راز جانتا ہو۔ پیچھے ہٹنا بزدلی نہیں حکمت عمل ہے۔ اقتدار سے نہ ٹکرانا ظلم کو برداشت کرنا نہیں بلکہ ظلم کو جڑ سے مٹانے کی طاقت فراہم کرنا ہے۔ سیاست کو ترک کرنا سیاسی خودکشی نہیں بلکہ معاشرہ کے دیگر عوامل کو بروئے کار آنے کا موقع دینا ہے۔ احتجاج سے گریز کرنا مسئلہ سے صرف نظر کرنا نہیں بلکہ اپنی قوتوں کو مثبت تعمیر کی راہ میں لگانا ہے۔ جو شخص فوری ردعمل کے تحت سیاست کے میدان میں کود پڑتا ہے اس سے زیادہ سیاست سے ناواقف اور کوئی نہیں۔



تاریخ انسانی عمل کا ریکارڈ ہے۔ لیکن تاریخ کو اگر افسانہ بنا دیا جائے تو وہ ایک ایسا ذہنی کارخانہ بن جاتی ہے جس میں صرف خوش فہمی کی مہلک گولیاں تیار ہوتی ہوں ——

یہ ایک سوچا سمجھا ہوا منصوبہ تھا نہ کہ محض پرجوش اقدام

طارق بن زیاد رمضان ۹۱ھ میں اسپین کے ساحل پر اترے تو ان کے ساتھ سات ہزار کا لشکر تھا۔ ساحل افریقہ اور اسپین کے درمیان دس میل کی آبنائے کو ان کے لشکر نے چار کشتیوں کے ذریعہ پار کیا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ زمانہ کے ایک "مورخ اسلام" لکھتے ہیں:

"اس سے اس زمانہ کے جہازوں کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کتنے بڑے تھے۔"

موصوف نے قیاس کیا کہ پورا لشکر ایک ہی بار چار کشتیوں پر لد کر دوسری طرف پہنچ گیا ہوگا۔ حالاں کہ یہ صحیح نہیں۔ اس زمانہ میں ایسی کشتیاں وجود میں نہیں آئی تھیں جن پر دو ہزار فوجی اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ بیک وقت بیٹھ سکیں۔ اصل یہ ہے کہ ان لشکریوں نے کئی پھیروں میں آبنائے طارق کو پار کیا تھا۔

ساتویں صدی عیسوی کے آخر تک مسلمانوں نے افریقہ کو بحر روم کے آخری ساحل تک فتح کر لیا تھا۔ بازنطینی سلطنت ایشیا اور افریقہ سے ختم ہو چکی تھی۔ تاہم مراکش کے ساحل پر سبطہ اور اس کے مضافات کے علاقے اب بھی اسپینی گورنر یلیان (کاؤنٹ جولین) کے قبضہ میں تھے۔ یہاں رومیوں نے زبردست قلعہ بنایا تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے اس کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی طاقت دیکھ کر بالآخر انھوں نے مصلحت یہ سمجھی کہ جولین سے صلح کر لیں اور اس ساحلی قلعہ کو اس کے قبضہ میں چھوڑ دیں۔ افریقہ سے بازنطینی سلطنت کے خاتمہ کے بعد جولین نے اپنے سیاسی تعلقات اسپین کی عیسائی حکومت سے قائم کر لئے۔ سبطہ اس وقت اندلس کا ایک سمندر پار صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ اندلس سے برابر کشتیوں کے ذریعہ اس کو مدد پہنچتی رہتی تھی۔

یہاں یہ سوال ہے کہ جو مسلمان اسپین کے ایک ماتحت گورنر سے خود اپنے مفتوحہ براعظم میں صلح کرنے پر مجبور ہوئے تھے، انھوں نے سمندر پار کر کے خود اسپین پر حملہ کرنے کی جرأت کس طرح کی۔ اس کا جواب زیر بحث مسئلہ کے تاریخی مطالعہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

سنہ ۴۸۶ء میں قوط (گاتھ) قبائل اسپین میں گھس آئے اور پانچ سو سالہ رومی سلطنت کو ختم کرکے وہاں اپنی حکومت قائم کرلی۔ بعد کو ان لوگوں نے ٹھیک اسی طرح مسیحی مذہب کو اختیار کرلیا جس طرح ترکوں کے ایک گروہ بنوسلجوق نے مسلم دنیا پر قابض ہونے کے بعد اسلام قبول کرلیا۔ گاتھ کا مقصد اس تبدیلی مذہب سے یہ تھا کہ مقامی عیسائیوں کو مطمئن کرکے اسپین میں اپنے سیاسی اقتدار کو مستحکم کریں۔ جس زمانہ میں مسلمانوں نے بازنطینی اقتدار کو شام، مصر، فلسطین سے ختم کیا طلیطلہ (ٹالیڈو) پر گاتھ کا آخری بادشاہ وٹیکا (غیطشہ) حکمراں تھا۔ وٹیکا کی بعض کمزوریوں سے اس کے ایک فوجی افسر رذریق (RADRICK) کو موقع ملا کہ وہ اس کی حکومت کا تختہ الٹ دے اور خود اسپین کا حکمراں بن جائے۔

سبطہ کا گورنر جولین اگرچہ وٹیکا کا رشتہ دار تھا۔ تاہم اس نے مصلحت کے تحت اپنی وفاداریاں رذریق سے وابستہ کردیں۔ مگر بعد کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اس کو بے حد مشتعل کردیا۔ اور اس کو اپنے بادشاہ کا مخالف کرکے مسلمانوں کے قریب کردیا جو افریقی براعظم میں اس کے جغرافی پڑوسی تھے۔

اس زمانہ میں اسپین کا حکمراں طبقہ بدترین قسم کی عیاشیوں کا شکار تھا۔ رواج کے مطابق امراء کی لڑکیاں عرصہ تک شاہی محل میں رکھی جاتی تھیں تاکہ شاہی آداب وقواعد کو سیکھ سکیں اور بادشاہ کی خدمت کریں۔ رذریق کے عہد میں جولین کی لڑکی فلورنڈا بھی اسی رواج کے مطابق شاہی محل میں داخل ہوئی۔ لڑکی جوان ہوئی تو رذریق اس پر فریفتہ ہوگیا اور جبریہ طور پر اس کی عصمت دری کی۔ لڑکی نے کسی طرح اس واقعہ کی اطلاع اپنے باپ کو دی۔

جولین کو اس واقعہ کا انتہائی صدمہ ہوا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک رذریق کی سلطنت کو دفن نہ کرلے، چین سے نہ بیٹھے گا۔ اولاً وہ طلیطلہ گیا اور لڑکی کی ماں کی بیماری کا بہانہ کرکے اس کو سبطہ واپس لایا۔ اس کے بعد وہ موسیٰ بن نصیر سے ملا اور اس کو اکسا کر تسخیر اندلس پر آمادہ کیا۔ اس نے موسیٰ کو اندلس کی اندرونی کمزوریاں بتائیں اور وعدہ کیا کہ وہ اور خود اندلس کے بہت سے لوگ اس مہم میں اسلامی فوج کا ساتھ دیں گے۔ یہ واقعہ ۹۰ھ کا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جولین نے اسلام قبول کرلیا تھا اور اپنا نام مسلم رکھا تھا۔

اس کے بعد موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے خط وکتابت کی۔ کئی خطوط کے بعد ولید نے لکھا:

"مسلمانوں کو خوفناک سمندر میں نہ ڈالو۔ اگر تم پر امید ہو جب بھی ابتداءً تھوڑی سی فوج بھیج کر صحیح اندازہ کرو"

موسیٰ نے رمضان ۹۱ھ میں ایک شخص طریف کو، جس کی کنیت ابوزرعہ تھی پہلی مہم کے طور پر پانچ سو آدمیوں کے ساتھ اسپین روانہ کیا۔ جولین بھی ان کے ساتھ تھا۔ شمالی افریقہ کے ساحلی ملک مراکش اور اسپین کے درمیان صرف دس میل کا آبی فاصلہ ہے۔ ان لوگوں نے چار کشتیوں کے ذریعہ اس کو عبور کیا اور دوسری طرف ساحل پر اتر گئے۔ یہ لوگ ساحلی علاقوں میں رہے اور وہاں کے حالات کا اندازہ کرکے دوبارہ واپس آگئے۔

اس کے بعد اگلے سال رمضان ۹۲ھ میں طارق بن زیاد کی سرکردگی میں سات ہزار کا لشکر تیار کیا گیا۔ دس میل کی آبنائے کو پار کرکے جب وہ لوگ اسپین کے ساحل پر اترے تو کہا جاتا ہے کہ طارق نے اپنی تمام کشتیاں جلادیں۔ مگر کشتیاں جلانے کا واقعہ بعد کا اضافہ شدہ افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں، اور آج بھی، فاتح

کی داستانوں میں اس قسم کے اضافے عام رہے ہیں۔ ہمارے اس خیال کے لئے ایک قرینہ یہ ہے کہ تاریخ اندلس کی بعض قدیم کتابوں، مثلاً "اخبار مجموعہ فی فتح الاندلس" میں یہ واقعہ سرے سے مذکور نہیں ہے۔

بتایا گیا ہے کہ سمندر کو پار کرکے جب طارق بن زیاد اسپین کے ساحل پر اترے تو انھوں نے اپنے فوجیوں کو للکارا:

ایہا الناس! العدو امامکم والبحر وراءکم ولیس لکم واللہ الا الجلد والصبر

اے لوگو دشمن تمھارے سامنے ہے اور سمندر تمھارے پیچھے ہے۔ تمھارے لئے خدا کی قسم اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ صبر کرو اور جم کر مقابلہ کرو۔

سپہ سالار کے یہ جوشیلے الفاظ سن کر شکری چیخ اٹھے:

انا وراءک یا طارق   طارق ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔

تمام تاریخوں کے متفقہ بیان کے مطابق مخالف فوجوں سے مقابلہ ساحل پر اترتے ہی فوراً پیش نہیں آیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ تقریر بعد کو اس وقت کی گئی ہے جب کہ عملاً مقابلہ پیش آیا ہے۔ اور فتح اندلس کے بعد جب تقریر کے الفاظ "سمندر تمھارے پیچھے ہے" لوگوں میں عام ہوئے تو قصہ گویوں نے اس میں اپنی طرف سے یہ اضافہ کر دیا کہ یہ تقریر کشتیوں کو جلانے کے بعد کی گئی تھی۔ شاید ان کے نزدیک سمندر کے پیچھے ہونے کے لئے ضروری تھا کہ سمندر اور فوجیوں کے درمیان سے کشتیوں کو ہٹا یا جا چکا ہو!

وائرلیس کے دور سے ایک ہزار سال پہلے سمندر پار کے ملک میں اترنے والا ایک کمانڈر اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا کہ اسپین کے ساحل پر اترنے کے بعد یہی کشتیاں وہ واحد ذریعہ ہیں جن سے وہ اپنے مرکز سے مربوط رہ سکتا ہے۔ طارق اور موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے درمیان پیغام رسانی کا دوسرا کوئی ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ یہ صرف قیاس نہیں ہے بلکہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ ساحل اسپین پر اترنے اور مقابلہ پیش آنے کے درمیان تقریباً دو ماہ تک، یہی کشتیاں تھیں جو دونوں کے درمیان باہمی ربط اور پیغام رسانی کا ذریعہ بنی رہیں۔

طارق جس مقام پر اترے اس کا نام قلعۃ الاسد LION'S ROCK تھا۔ بعد کو وہ جبل الطارق (جبرالٹر) کے نام سے مشہور ہوا۔ طارق اسپین کے جس ساحل پر اترے وہ اس وقت ایک غیر آباد علاقہ تھا۔ وہاں ایک دشوار گزار پہاڑی کو جائے پناہ قرار دے کر وہ لوگ اکٹھا ہو گئے، تاکہ حالات کو سمجھ کر آئندہ کا نقشہ بنا سکیں۔ اسپین کا بادشاہ رذریق ان دنوں پنبلونہ (PAMPLONA) کی ایک جنگ میں مشغول تھا، جہاں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی تھی۔ اس کو جب طارق کے اسپین میں داخلہ کی خبر ملی تو اس نے حکم دیا کہ ایک لاکھ فوج جمع کی جائے تاکہ مداخلت کاروں کو باہر نکالا جا سکے۔ طارق کا جاسوسی نظام بھی کام کر رہا تھا۔ انھیں جب رذریق کی تیاریوں کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً اپنا ایک قاصد موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے یہاں روانہ کیا اور مزید کمک کی درخواست کی۔ ادھر موسیٰ بھی خاموش نہ تھے۔ بلکہ مسلسل تیاریوں میں مشغول تھے۔ چنانچہ انھوں نے کشتیوں کے ذریعہ پانچ ہزار مزید سپاہی بھیج دیئے۔ اس طرح طارق کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار ہو گئی۔

طارق نے پیغام رسانی کا یہ تمام کام کشتیوں کے ذریعہ کیا۔ کوئی دوسرا ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ اور پھر یہ کشتیاں ہی تھیں جنھوں نے پانچ ہزار فوجیوں کی دوسری قسط کو اسپین کے ساحل پر اتارا، جس کے بعد طارق اس قابل ہو سکے کہ وہ اسپین پر حملہ کر سکیں۔ طارق اگر اسپین کے ساحل پر اترتے ہی اپنی کشتیوں کو جلا دیتے تو یہ پیغام رسانی ممکن نہ ہوتی۔ اور نہ مقابلہ کے وقت فوری کمک پہنچ سکتی۔

اس معرکہ میں جولین بھی پوری طرح طارق کے ساتھ تھا۔ اس نے شاہ رذریق کے خلاف مقامی باشندوں کی ناراضگی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تعلقات کی بنیاد پر اسپینی شہریوں کی ایک جماعت طارق کی خدمت میں حاضر کر دی۔ ان لوگوں نے دشمن کی خبریں فراہم کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور فوجی اعتبار سے کمزور مقامات کی اطلاع مسلمانوں کو دی اور مسلمانوں کی رہبری کرتے رہے۔ یہ واقعہ بھی مسلمانوں کے لئے ایک نعمت ثابت ہوا کہ تین سال (۹۰ - ۸۰ھ) تک اندلس میں سخت قحط پڑا تھا، اس کی وجہ سے اتنے لوگ مرے کہ کہا جاتا ہے کہ اندلس کی آبادی آدھی رہ گئی۔

مزید یہ کہ رذریق کی ایک لاکھ فوج میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جو سابق شاہ اسپین سے عقیدت رکھنے کی وجہ سے باغی رذریق کا اندر اندر مخالف تھا۔ ان کے فوجی سرداروں میں شسرت اور ابتہ بھی تھے جو سابق شاہ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے اپنی خفیہ میٹنگ کی اور کہا:

"رذریق خبیث ہمارے ملک پر خواہ مخواہ مسلط ہو گیا ہے، حالاں کہ شاہی خاندان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ہمارے یہاں کے کمینوں میں سے ہے۔ رہے مسلمان، وہ تو صرف وقتی لوٹ مار کے لئے آئے ہیں۔ اس کے بعد اپنے وطن کو واپس چلے جائیں گے۔ اس لئے مقابلہ کے وقت اس خبیث کو زک دینے کے لئے ہم کو خود شکست کھا جانا چاہئے۔"

رذریق کی فوج کے ایک حصہ نے نہایت سخت جنگ کی۔ مگر غیر مطمئن فوجیوں نے جنگ میں زور نہیں دکھایا۔ بالآخر شکست ہوئی اور رذریق میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد وہ نہ زندہ مل سکا نہ مردہ۔ کہا جاتا ہے کہ بھاگنے کے دوران وہ ایک دلدل میں پھنس کر مر گیا۔

اسپین کے بعض علاقوں کو طارق نے فتح کیا۔ بعض کو مغیث رومی نے، بعض کو موسیٰ بن نصیر نے، جو بعد کو ۱۸ ہزار فوج کے ساتھ اندلس میں داخل ہوئے تھے۔ رعایا کی اپنے بادشاہ اور سرداروں سے بیزاری کی وجہ سے ان کو خود اسپینیوں میں مددگار اور جاسوس ملتے چلے گئے۔ تمام مورخین لکھتے ہیں کہ غیر مسلم جاسوسوں نے اسپین کی ابتدائی فتوحات میں بہت مدد کی تھی۔

خدا کی یہ دنیا کوئی طلسماتی کارخانہ نہیں ہے۔ یہ نہایت محکم اصولوں پر قائم ہے۔ یہاں کوئی واقعہ ان قوانین سے مطابقت کرنے کے نتیجہ ہی میں ظاہر ہوتا ہے جن پر دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ جو شخص یا قوم اپنے لئے کوئی حقیقی مستقبل دیکھنا چاہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ فطرت کی اٹل بنیادوں پر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو خدا کی اس دنیا میں اس کا کوئی انجام نہیں۔ خواہ اپنے طور پر وہ اپنے بارے میں کتنا ہی زیادہ خوش فہمی میں مبتلا رہے۔

ہماری زندگی کا ایک دردناک پہلو

سابق وزیر اعظم ملیشیا تنکو عبد الرحمٰن نے بتایا کہ ملیشیا میں جو غیر مسلم آباد ہیں، وہ اسلام کے بارے میں جاننے کے بہت شائق ہیں، مگر مسلمانوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ ان کو اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ البتہ الیکشن کے موقع پر غلط قسم کی سیاست بازی کے ذریعہ وہ غیر مسلموں کو اسلام سے کچھ متوحش کر دیتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی جماعت "پرکم" کی کوششوں سے ملیشیا میں تقریباً ۳۰ ہزار اور صباح میں ایک لاکھ آدمی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ سراوک میں ہر دن لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ مگر مسلمان ان کو اپنے معاشرہ میں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حتیٰ کہ بعض لوگ ان نومسلموں سے مصافحہ تک نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق "ان کے ہاتھ سور کی چربی سے گندے ہو چکے ہیں"

تنکو عبد الرحمٰن لکھتے ہیں:

TODAY I AM FIGHTING A LONE BATTLE TO GET THESE MUSLIM CONVERTS ACCEPTED INTO THE MALAY COMMUNITY.

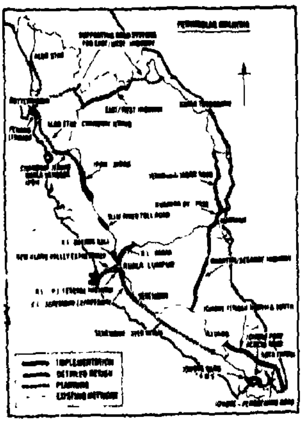
ان نومسلموں کو ملایا کے مسلم معاشرہ میں شامل کرنے کے لئے میں ایک تنہا جنگ لڑ رہا ہوں

اسلامک ہرالڈ، کوالالمپور، دسمبر ۱۹۷۵

تنکو عبد الرحمٰن اپنی سیاسی زندگی کے زمانہ میں ملیشیا کی مقبول ترین شخصیت تھے۔ مگر جب انھوں نے سیاست کی ہنگامی زندگی کو چھوڑ کر تعمیری کام کرنا چاہا تو اب وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ تنہا ہیں۔ ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔

یہی موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مسلمانوں کا حال ہے۔ وہ کسی قائد کا ساتھ صرف اس وقت دیتے ہیں جب کہ وہ ان کو جذباتی سیاست کی شراب پلا رہا ہو۔ خاموش کام کرنے والوں کا ساتھ دینے کا ان کے اندر حوصلہ نہیں۔ اس مشکل کا واحد حل یہ ہے کہ ہمارے درمیان کچھ قائد ایسے نکلیں جو عزت و شہرت کی قربانی پر اپنے آپ کو خاموش تعمیری کاموں میں لگا دیں۔ جب قائدین کی ایک نسل اس طرح اپنے آپ کو گمنامی کے قبرستان میں دفن کر چکی ہوگی، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ملت کو حقیقی معنوں میں دنیا کے اندر عزت و سربلندی کا مقام حاصل ہو۔ اگر ہمارے قائدین شہرت و عزت کی فضاؤں میں پرواز کر رہے ہوں اور عوام کو تعمیری کام کا وعظ سنائیں، تو یہ کام کبھی انجام نہیں پا سکتا۔

بدقسمتی یہ ہے کہ تنکو عبد الرحمٰن جیسے تعمیری کام کا ذوق رکھنے والے ہمارے یہاں صرف استثناء کا درجہ رکھتے ہیں۔



ملیشیا کی حکومت نے جزیرہ نما میں نئی سڑکوں کی تعمیر کے لئے ایک بلین ڈالر کا منصوبہ بنایا ہے۔

اقدام سے پہلے تحقیق ضروری ہے

عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ۲۳ھ میں خلیفہ منتخب ہوئے اور ۳۵ھ میں آپ کو شہید کر دیا گیا جب کہ آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔ امام مسلم عائشہ رضؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے مکان میں لیٹے ہوئے تھے۔ آپ کی پنڈلیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اتنے میں ابوبکر رضؓ آئے، آپ اسی حال میں لیٹے رہے اور باتیں کیں۔ پھر عمر رضؓ آئے۔ آپ اب بھی اسی طرح لیٹے رہے اور باتیں کیں۔ اس کے بعد عثمانؓ آئے۔ اب آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے کو ٹھیک کر لیا۔ جب تینوں چلے گئے تو میں نے عرض کیا۔ اے خدا کے رسول! ابوبکر آئے مگر آپ نہیں اٹھے۔ عمر آئے پھر بھی آپ اسی طرح رہے۔ مگر عثمان آئے تو آپ اُٹھ گئے اور اپنے کپڑے کو درست کر لیا۔ آپ نے فرمایا عثمان سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔

امام ترمذی عبدالرحمن بن) خبابؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں اس وقت مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا جب کہ آپ جیش عسرہ (تبوک) کی تیاری کے لئے لوگوں کو ابھار رہے تھے۔ عثمان بن عفان کھڑے ہوئے اور کہا: اے خدا کے رسول، ایک سو اونٹ مع کجاوہ اور پالان کے میں خدا کے راستہ میں دیتا ہوں"۔ آپؐ نے پھر لوگوں کو ابھارا۔ عثمان بن عفان دوبارہ کھڑے ہوئے اور کہا، "دو سو اونٹ معہ کجاوہ اور پالان کے اللہ کے راستہ میں"۔ آپ نے پھر لوگوں کو ابھارا۔ عثمان بن عفان تیسری بار کھڑے ہوئے اور کہا، اے خدا کے رسول تین سو اونٹ مع کجاوہ اور پالان کے اللہ کے راستہ میں"۔ راوی کہتے ہیں، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اتر پڑے۔ اور آپ کی زبان پر یہ کلمہ جاری تھا:

ما علی عثمان ما عمل بعد هذه، ما علی عثمان ما عمل بعد هذه

اس کے بعد عثمان جو بھی کریں ان پر کوئی مواخذہ نہیں۔ اس کے بعد عثمان جو بھی کریں ان پر کوئی مواخذہ نہیں۔

امام ترمذی انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں۔ حدیبیہ میں جب بیعت رضوان ہوئی، اس وقت عثمان بن عفان رسول اللہ کے سفیر کی حیثیت سے مکہ گئے ہوئے تھے۔ جب تمام لوگ بیعت ہو چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عثمان اس وقت اللہ اور اس کے رسول کے کام پر ہیں"۔ پھر آپؐ نے اپنے ایک ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا اور خود اپنے ایک ہاتھ سے اپنے دوسرے ہاتھ پر عثمان کے لئے بیعت کی:

فکانت ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعثمان خیرا من ایدیھم لانفسھم

پس عثمان کے لئے رسول اللہؐ کا ہاتھ لوگوں کے لئے ان کے اپنے ہاتھ سے بہتر تھا۔

امام ترمذی مرۃ بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کا حال بیان کیا جو آپ کے بعد آئیں گے، اتنے میں ایک صاحب سامنے سے گزرے جو کپڑا لپیٹے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا: هذا یومئذ علی الهدی (یہ شخص اس دن حق پر ہوگا)۔ میں اٹھ کر ان کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ وہ عثمان بن عفان ہیں۔ (ترمذی) حضرت عثمان نے اپنے مال سے مشکل وقتوں میں اتنی زیادہ اسلام کی مدد کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللهم انی قد رضیت عن عثمان فارض عنه، اللهم انی قد رضیت عن عثمان فارض عنه

اے اللہ! میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہوجا، اے اللہ میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہوجا۔

ایک بار حضرت عثمان کے ایثار و قربانی سے آپ اتنا خوش ہوئے کہ دعا کا یہ کلمہ دن بھر آپ کی زبان سے نکلتا رہا۔

تاہم یہی عثمان بن عفان تھے جن کے خلاف ان کی خلافت کے بعد کے سالوں میں سارے ممالک اسلامی میں شورش برپا ہوگئی۔ اس شورش کے پیدا کرنے میں متعدد مخلص اور مقدس لوگ بھی شریک تھے۔ یہ شورش اتنی بڑھی کہ ہزاروں کی تعداد میں بلوائی مختلف ملکوں سے جمع ہوکر مدینہ میں گھس گئے۔ انھوں نے حضرت عثمان کے مکان کا محاصرہ کرلیا۔ آپ کے گھر میں پانی کا داخلہ روک دیا۔ آپ کے لئے مسجد نبوی میں جاکر نماز پڑھنا ناممکن بنادیا۔ جب شدت بہت بڑھ گئی تو آپ اپنے مکان کی چھت پر چڑھے اور بلوائیوں کو خطاب کیا:

عن ثمامة بن حزن القشیری، قال شهدت الدار حین اشرف علیهم عثمان فقال: انشدکم الله والاسلام هل تعلمون ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قدم المدینة ولیس بها ماء یستعذب غیر بئر رومة۔ فقال من یشتری بئر رومة فیجعل دلوه مع دلاء المسلمین بخیر له منها فی الجنة۔ فاشتریتها من صلب مالی، وانتم الیوم تمنعونی ان اشرب منها۔ فقالوا اللهم نعم۔ فقال انشدکم الله والاسلام هل تعلمون ان المسجد ضاق باهله فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم من یشتری بقعة آل فلان فیزیدها فی المسجد بخیر له منها فی الجنة فاشتریتها من صلب مالی، فانتم الیوم تمنعونی ان اصلی فیها رکعتین۔ فقالوا اللهم نعم۔۔۔ قال الله اکبر، اشهدوا ورب الکعبة انی شهید، ثلاثا۔

(ترمذی۔ نسائی، دار قطنی)

ثمامہ بن حزن القشیری کہتے ہیں۔ عثمان بن عفان کے محاصرہ کے وقت میں ان کے گھر کے پاس موجود تھا۔ وہ مکان کے اوپر چڑھے اور لوگوں سے کہا۔ میں تم کو اللہ کی اور اسلام کی قسم دلاتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ آئے اور یہاں صرف ایک (یہودی کا) کنواں بئر رومہ تھا جس سے میٹھا پانی لیا جاسکے (وہ بہت مہنگی قیمت پر فروخت کرتا تھا) رسول اللہ نے کہا۔ کون بئر رومہ کو خریدتا ہے کہ وہ بھی اس سے پانی لے اور مسلمان بھی پانی لیں۔ جنت میں اس کو اس سے بہتر ملے گا۔ میں نے (۳۵ ہزار درہم) کے عوض اس کو خریدا۔ اور تم مجھ کو اس سے پانی پینے سے روکتے ہو۔ لوگوں نے جواب دیا۔ خدایا ہاں۔ پھر عثمان بن عفان نے کہا۔ میں تم کو قسم دلاتا ہوں اللہ کی اور اسلام کی۔ کیا تم جانتے ہو کہ مسجد نبوی تنگ پڑ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کون فلاں زمین کو خرید کر مسجد میں اضافہ کرتا ہے، جنت میں اس کو اس سے بہتر ملے گا۔ میں نے اس کو اپنے مال سے خریدا۔ اور تم مجھ کو اس میں دو رکعت نماز پڑھنے سے روکتے ہو۔ لوگوں نے کہا خدایا ہاں۔ عثمان بن عفان نے کہا اللہ اکبر۔ رب کعبہ کی قسم، تم لوگ گواہ رہو کہ میں شہید ہوں۔

ان سب کے باوجود لوگوں نے حضرت عثمان کو قتل کردیا۔ اور قتل کرنے والے اور ان کا ساتھ دینے والے سب کے سب نماز روزہ والے تھے۔ اور اپنے کو مکمل معنوں میں مسلمان سمجھتے تھے۔

خلیفہ سوم کے خلاف اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہونے کی وجہ کیا تھی جس نے بالآخر ان کی جان لے لی۔ مورخین کے بیان کے مطابق یہ ایک چھوٹا سا واقعہ تھا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے بارے میں بعض وجوہ سے عوام میں ناراضگی پائی جاتی تھی۔ اسی بیچ میں یہ واقعہ ہوا کہ مصر کے عامل عبداللہ بن ابی سرح کی زیادتیوں سے اہل مصر کو شکایت ہوئی۔ لوگ مدینہ آئے اور مطالبہ کیا کہ اس کو معزول کیا جائے۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کے مشورہ سے عبداللہ بن ابی سرح کو معزول کر دیا۔ اور محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے لئے مصر کی امارت کا فرمان لکھ دیا۔ مصری اس فرمان کو لے کر اپنے ملک کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ محمد بن عبدالرحمٰن بھی تھے۔ راستہ میں انھوں نے دیکھا کہ حضرت عثمان کا غلام خلیفہ کے اونٹ پر سوار ہو کر تیزی سے مصر کی طرف جا رہا ہے۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ وہ خلیفہ کی طرف سے ایک خط لے کر مصر کے حاکم (عبداللہ بن ابی سرح) کے پاس جا رہا ہے۔ انھوں نے زبردستی کر کے غلام سے خط چھین لیا۔ اس میں لکھا تھا کہ محمد اور ان کے ساتھی مصر پہنچیں تو ان کو قتل کر دیا جائے اور تا حکم ثانی عبداللہ بن ابی سرح مصر کا حاکم رہے۔

یہ خط حضرت عثمان کے چچا زاد بھائی مروان بن حکم نے لکھا تھا اور خلافت کی مہر لگا کر اس کو غلام کی معرفت مصر روانہ کر دیا تھا۔ مگر مصریوں نے اس کو خود خلیفہ سوم کی جانب سے سمجھا اور یہ رائے قائم کی کہ ان کے ساتھ غداری کی گئی ہے کہ ایک طرف تو عبداللہ بن ابی سرح کی معزولی کا حکم نامہ ہم کو دیا گیا اور دوسری طرف عبداللہ کو خفیہ خط روانہ کر دیا کہ ان سب لوگوں کو قتل کر دو اور تم اپنے عہدہ پر بحال رہو۔ چنانچہ وہ راستہ سے لوٹ آئے اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ دوبارہ مدینہ میں داخل ہو گئے۔ ان کا ردعمل اتنا شدید تھا کہ کسی کے سمجھانے بجھانے سے کم نہ ہو سکتا تھا۔ انھوں نے حضرت عثمان کے مکان کو گھیر لیا اور بالآخر انھیں قتل کر ڈالا۔ اسی لئے قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ جب کوئی خبر ملے تو اس پر کارروائی کرنے سے پہلے خوب تحقیق کر لو:

یا یھا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علیٰ ما فعلتم ندمین (حجرات ۶)	اے ایمان والو اگر کوئی شریر آدمی تمھارے پاس خبر لائے تو خوب تحقیق کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم نادانی سے کسی قوم پر جا پڑو پھر تم کو اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو قبیلہ بنی المصطلق کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ قبیلہ کے لوگ ان کی آمد کو سن کر ان کے استقبال کے لئے نکلے۔ ولید کی اس قبیلہ سے زمانہ جاہلیت میں کچھ شکایت تھی، وہ سمجھے کہ یہ لوگ میرے قتل کے لئے نکلے ہیں، اس لئے وہ بستی میں داخل ہونے سے پہلے مدینہ واپس آ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ قبیلہ کے لوگ میرے قتل کے درپے ہو گئے اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ آپ نے ارادہ کیا کہ ان کی سرکوبی کے لئے حضرت خالد کی سرکردگی میں ایک فوجی دستہ روانہ کریں۔ اسی درمیان میں قبیلہ بنی المصطلق کے سردار حارث بن ضرار آ گئے جو ام المومنین جویریہؓ کے والد بھی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم نے زکوٰۃ جمع کر رکھی تھی مگر ولید بن عقبہ ہمارے یہاں پہنچے ہی نہیں۔ ہم تو اسلام پر قائم ہیں اور اللہ کے حقوق ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ (ابن کثیر) اس پر حکم دیا گیا کہ جب کسی کے متعلق کوئی خبر ملے تو کارروائی کرنے سے پہلے پوری تحقیق کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ خبر غلط ہو اور اس کی بنا پر تم غلط اقدام کر بیٹھو۔

اختلاف کا نقصان کہاں تک جاتا ہے

عرب کے جزیرہ نما سے اسلام کا جو سیلاب اٹھا تھا، وہ اطراف کے تمام ملکوں پر اس طرح چھایا کہ ان کی زبان اور تہذیب تک بدل گئی۔ اس میں صرف ایک استثنا ہے، اور وہ ایران کا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک اہم سوال ہے کہ وہ اسلام جس نے اپنے تمام پڑوسی ملکوں کی زبان اور تہذیب بدل دی، وہ ایران میں مذہبی تبدیلی کی حد تک کامیاب ہونے کے باوجود وہاں کی زبان کو کیوں نہ بدل سکا۔

اس سوال کا جواب ہم کو امویوں اور عباسیوں کی سیاسی لڑائی میں ملتا ہے۔ اموی خلافت کی جگہ عباسی خلافت قائم کرنے کی تحریک جو دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئی۔ اس میں ایک طرف وہ لوگ تھے جو سیاسی عزائم کے تحت یہ کام کر رہے تھے۔ اس گروہ کے سردار محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن مطلب تھے۔ دوسری طرف مذہبی لوگ تھے جو اصلاحی جذبہ کے تحت اس مہم میں شریک ہو گئے۔ عبداللہ بن محمد بن حنفیہ بن علی بن ابی طالب کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔ محمد بن علی کے لڑکے ابراہیم ہیں جو ۱۲۴ ہجری میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اس تحریک کے "امام" مقرر ہوئے۔ ابو مسلم خراسانی جس نے عباسی سلطنت کے قیام میں اہم حصہ ادا کیا ہے، ایک معمولی مزدور تھا جو چار جامہ سینے کا کام کرتا تھا۔ اس کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی صلاحیت کو دیکھ کر امام ابراہیم نے اس کو اپنے کام کے لئے چن لیا اور اس کو اپنا نائب مقرر کر کے خراسان بھیج دیا۔

جب عباسیوں کو غلبہ حاصل ہوا تو انھوں نے چن چن کر بنو امیہ کے افراد کو قتل کرنا شروع کیا تاکہ مستقبل میں ان کے سیاسی اقتدار کو چیلنج کرنے والا کوئی باقی نہ رہے۔ اس زمانے میں امام ابراہیم نے ابو مسلم کو تاکید کے ساتھ لکھا کہ "خراسان میں کسی عربی بولنے والے کو زندہ نہ رکھنا" خراسان میں بنو امیہ کے طرف دار وہی عرب قبائل تھے جو خراسان کی فتح کے بعد وہاں جا کر مقیم ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ جو خراسانی باشندے تھے، وہ سب نو مسلم تھے اور بآسانی عباسی اقتدار کو قبول کر سکتے تھے۔ جب کہ عرب قبائل سے یہ اندیشہ تھا کہ ان کی عربیت انھیں بنو امیہ کا حامی بنا کر نئے ارباب اقتدار کے لئے مسئلہ نہ پیدا کر دے۔

ابو مسلم ایرانی النسل ہونے کی وجہ سے خود بھی اپنے ملک سے عربوں کے استیصال کا دل سے خواہش مند تھا۔ امام ابراہیم عباسی کی ہدایت پانے کے بعد وہ پوری طرح اس محبوب مہم کے لئے سرگرم ہو گیا۔ اس نے خراسان میں آباد سارے عرب باشندوں کا ایک طرف سے صفایا کر دیا۔ یہ عرب قبائل جو اس وقت خراسان میں آباد تھے، دوسرے پڑوسی ملکوں کی طرح یہاں کی زبان، معاشرت، تمدن کو عربی بنانے میں مصروف تھے۔ ان کے مذہب کو بدلنے میں انھوں نے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اب زبان اور تہذیب کو بدلنے کا عمل کامیابی کے ساتھ جاری تھا، مگر ابو مسلم کی طرف سے ان کے قتل عام کے بعد یہ عمل یکایک رک گیا۔ ایرانی زبان اور ایرانی تہذیب مرتے مرتے دوبارہ زندہ ہو گئے۔ ایران و خراسان جو مصر و شام و عراق وغیرہ کی مانند آج عرب دنیا کا ایک حصہ ہوتا۔ دوبارہ فارسی ملک بن گیا۔

تاریخ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ سیاسی حوصلہ مندوں کی سیاست بازیوں کی وجہ سے ضروری قسم کے تعمیری کام ہوتے ہوتے رک گئے جس کے نتائج بعد کو اندوہناک صورت میں برآمد ہوئے۔ چند افراد کے وقتی عزائم کی قیمت قوموں اور ملکوں کو صدیوں تک انتہائی بھیانک شکل میں دینی پڑی۔

ایک خاندانی جھگڑا جو پوری تاریخ پر چھاگیا

جنگ قادسیہ (۱۴ھ) میں جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی تھیں۔ ایرانی لشکر ان کا ایک مشہور پہلوان گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا۔ اسلامی لشکر سے عاصم بن عمرو اس کے مقابلہ کے لئے باہر آئے۔ ا ایک دو دار ہی ہوئے تھے کہ ایرانی شہ سوار بھاگا۔ عاصم بن عمرو نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ اپنے لشکر کی صف اول کے ق تک جا چکا تھا کہ عاصم بن عمرو پہنچ گئے۔ انھوں نے اس کے گھوڑے کی دم کو پکڑ کر اس کو روک لیا۔ سوار کو اس کے سے اٹھایا اور زبردستی اپنے گھوڑے پر اپنے آگے بٹھا لیا اور اس کے بعد گھوڑا دوڑاتے ہوئے اپنے لشکر میں آگئے۔

اس قسم کے بہادر لوگ صفین و جمل (۳۶ھ) کی باہمی لڑائیوں میں ۹۰ ہزار کی تعداد میں کٹ گئے۔ حقیقت یہ ہے اگر خلافت راشدہ کے آخر میں آپس کی لڑائیاں شروع نہ ہو گئی ہوتیں تو طاقت و قوت کا بے پناہ سیلاب جو عرب سے تھا، ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تمام علاقوں کو توحید کا علاقہ بنا دیتا۔ صرف آسٹریلیا اور امریکہ ہی ممکن طور پر ا سے مستغنیٰ رہ جاتے جو وسیع سمندروں کے دوسری طرف قدیم زمانہ میں ناقابل عبور تھے۔

وہ کیا چیز تھی جس نے اس سیلاب کے رخ کو باہر کے بجائے خود اپنی طرف موڑ دیا۔ یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہ کہ یہ ایک خاندانی جھگڑا تھا جس نے بڑھ کر قومی جھگڑے کی شکل اختیار کر لی اور بالآخر ساری اسلامی تاریخ پر چھا گ

۲۰۷ء میں سیل عرم سے یمن میں عام تباہی آئی۔ یہاں کے باشندوں نے اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں رخ کیا۔ ان میں سے قبیلہ خزاعہ مکہ آیا اور حضرت اسمٰعیل (۱۹۳۲-۲۰۷۴ ق م) کی اولاد کو بے دخل کر کے مکہ پر قا ہو گیا۔ اس کے بعد مقامی باشندے ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ تقریباً ڈھائی سو سال تک قبیلہ خزاعہ مکہ پر قابض ر قصی بن کلاب پہلا شخص ہے جس نے قریش کی بکھری ہوئی طاقت کو دوبارہ منظم کیا اور ۴۴۰ء میں لڑ بھڑ کر خزاعہ مکہ کی سرداری چھین لی۔

قصی نے خانہ کعبہ کی مرمت کی۔ رفادہ، سقایہ، حجابہ اور قیادہ کے عہدے قائم کئے۔ قومی نشان کے طور لوار بنایا۔ قومی اسمبلی قائم کی جس کو دارالندوہ کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد قدرتی طور پر قصی کو تمام قبائل قریش کی حاصل ہو گئی۔

قصی کے بعد قریش کی سرداری ان کی اولاد میں جاری رہی۔ تاہم تیسری نسل میں قصی کے خاندان میں پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ قصی کا پوتا ہاشم نہایت لائق اور شان دار شخصیت کا آدمی تھا۔ اس نے تجارت کر کے نہ اپنے مال میں اضافہ کیا بلکہ قریش کو بھی بین اقوامی تاجر کے مقام پر پہنچا دیا۔ اس نے اپنے بھائیوں کی مدد سے ر غسان، شاہ حبش، امرا یمن اور عراق و فارس کی حکومتوں سے تجارتی معاہدے کئے اور خصوصی مراعات حاصل کی وہ قیصر روم سے یہ پروانہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ قریش کا تجارتی مال شام و فلسطین میں بغیر کسی ٹیکس

داخل ہوتا رہے گا۔ اب قریش کے تجارتی قافلے گرمی کے زمانہ میں شام کی طرف جانے لگے، کیونکہ وہ ٹھنڈا اور شاداب علاقہ تھا اور جاڑے میں یمن کی طرف سفر کرنے لگے جو کہ گرم علاقہ ہے۔ (قریش - ۲) ہاشم کے حسن تدبر سے قریش کی اقتصادیات نے بہت تیزی سے ترقی کی اور نتیجۃً سارے قبیلہ میں ان کی عظمت قائم ہو گئی۔

ہاشم کی اس عزت و ترقی نے خاندان کی دوسری شاخ کے اندر ان کے خلاف منافست پیدا کر دی۔ ہاشم کے بھائی عبد شمس اور ان سے زیادہ ان کے بیٹے امیہ کو ہاشم کی سرداری ناپسند تھی۔ امیہ نے اس کو اپنے چچا سے چھیننے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے حتیٰ کہ اسی رنج و غم میں وہ ایک بار مکہ چھوڑ کر شام چلے گئے اور دس سال تک وہاں پڑے رہے۔

ہاشم کے بعد دوبارہ ان کے بیٹے عبد المطلب اپنی وجاہت و صلاحیت کی بنا پر قریش کے سردار ہو گئے اور امیہ کی اولاد اس سے محروم رہی۔ اس طرح سرداری قصی کی ہاشمی شاخ میں چلتی رہی اور اس کی اموی شاخ کو حاصل نہ ہو سکی۔

سنہ ۸ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار اصحاب کے ساتھ فتح مکہ کے لئے روانہ ہوئے تو آپ نے ایک موقع پر اپنے چچا عباس رضؓ سے کہا کہ ابوسفیان کو لے کر راستہ میں کسی گھاٹی پر بیٹھ جائیں تا کہ ابوسفیان، جو بدّ کے بعد قریش کے سب سے بڑے لیڈر تھے، اسلامی فوج کو گزرتے ہوئے دیکھیں۔ حضرت عباس نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ ابوسفیان کو لے کر ایک تنگ پہاڑی راستہ کی طرف گئے اور وہاں بیٹھنے کے لئے کہا تو ابوسفیان کو اندیشہ ہوا۔ ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا :

غدراً یا بنی ھاشم   بنی ہاشم! کیا غداری کا ارادہ ہے۔

اس کے بعد جب دس ہزار کی تعداد میں مسلح فوج سامنے سے گزری، تو ابوسفیان پر ہیبت طاری ہو گئی۔ انھوں نے کہا:

لقد اصبح ملک ابن اخیک الغداۃ عظیما   تمھارے بھتیجے کی حکومت آج بہت عظیم ہو گئی۔

خاندان عبد مناف کی ان دو شاخوں میں یہ چپقلش اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ زمانہ جاہلیت میں یمن کا ایک شخص کچھ سودا لے کر مکہ آیا۔ ایک شخص نے اس کا سودا خریدنے کے لئے لیا اور پھر اس کو نہ قیمت دی اور نہ سودا واپس کیا وہ ایک ٹیلہ پر چڑھ کر چیخنے لگا۔ یہ واقعہ عرب آن کے انتہائی خلاف تھا، چنانچہ بنو ہاشم کے کچھ لوگ اس کی مدد کے لئے اٹھے۔ انھوں نے آپس میں عہد کیا کہ مکہ میں اگر کسی مسافر اور اجنبی کو ستایا گیا تو وہ اس کی پوری حمایت کریں گے۔ بنو ہاشم کے ساتھ اس معاہدہ میں بنو اسد، بنو زہرہ، بنو تیم بھی شریک ہو گئے۔ مگر عبد شمس کا خاندان بنو ہاشم کے خلاف اپنی جلن کی وجہ سے معاہدہ میں شریک نہیں ہوا۔

اس طرح کے واقعات جو تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں، وہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کے درمیان اسی خاندانی کشمکش کے مظاہر ہیں۔

قصی بن کلاب کے خاندان کی دو شاخوں میں سرداری کی منافست جاری رہی، اکثر چھوٹے چھوٹے جھگڑے بھی ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ہاشم کے خاندان میں پیغمبر پیدا ہو گئے۔ اب اموی خاندان کی جلن اپنے شباب پر پہنچ گئی۔

پہلے انھوں نے نبوت کی مخالفت کر کے بنی ہاشم کو زیر کرنا چاہا۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام مخالفین کو شکست دے کر مکہ پر قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ظاہر ہو گیا کہ نبوت کی مخالفت کرنا فضول ہے۔ ابوسفیان کے لڑکے معاویہ اور دوسرے امویوں نے اسلام قبول کر لیا۔ تاہم یہ احساس لوگوں کے اندر باقی رہا کہ نبوت کے بعد سیاسی اقتدار بنی ہاشم کے ہاتھ میں نہ جانے دیں گے۔

حضرت عمرؓ اپنے بعد علیؓ بن ابی طالب کو خلافت کے لئے موزوں ترین شخص سمجھتے تھے۔ مگر غالباً اسی اندیشہ کی بنا پر وہ آنجناب کو نامزد نہ کر سکے۔ حضرت عثمان جو خاندان امیہ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے، ان کی شہادت کے بعد جب حضرت علیؓ کو خلیفہ بنایا گیا تو بنو امیہ کے لئے یہ بالکل ناقابل برداشت تھا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد قصاص کے مسئلہ نے ان کو فوری طور پر ایک کامیاب سیاسی حربہ دے دیا۔ اس جذباتی نعرہ پر انھوں نے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا۔ اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے کہ خلیفہ چہارم کو منصب خلافت سے ہٹا دیں۔ تاہم معاویہ بن ابی سفیان بن حرب بن امیہ نے اپنی گورنری سے فائدہ اٹھا کر مملکت اسلامی کے نصف سے زیادہ حصہ کو سیاسی طور پر کاٹ لیا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے نام پر عوام میں ایسی آگ بھڑکائی کہ کچھ لوگوں نے مجنونانہ طور پر حضرت علی کو قتل کر دیا۔ جنگ جمل اور جنگ صفین جس میں ۹۰ ہزار مسلمان کٹ گئے اور دس سال کے لئے اسلامی تحریک کا سیلاب رک گیا، وہ دراصل امویوں اور ہاشمیوں کی اسی خاندانی لڑائی کا شاخسانہ تھا جس نے پوری ملت مسلمہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

حسن بن علی اس راز کو اچھی طرح سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی حسین بن علی کو بھی مشورہ دیا کہ خلافت کے معاملہ سے بالکل الگ ہو جائیں کیونکہ لوگ اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ نبوت اور خلافت دونوں کو علوی خاندان میں جمع ہونا برداشت کر لیں۔ مگر حضرت حسین کی رائے یہ تھی کہ حق کے لئے جان دے دینا باطل کے آگے سر جھکانے سے زیادہ بہتر ہے۔ انھوں نے خلافت کی راہ میں اپنی جان دے دی یہ واقعہ ۶۱ھ کا ہے۔

اس کے بعد اموی حکومت قائم ہو گئی۔ مگر بنو امیہ کو بنو ہاشم کے خلاف جو بغض و عناد تھا، وہ ان کے انتظام ملکی میں ظاہر ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ ان کا ذہن یہ بن گیا کہ ہاشم کی اولاد کا خاتمہ کر دو تاکہ مستقبل میں کوئی خلافت کا دعوے دار باقی نہ رہے۔ ان وجوہ سے وہ فضا پیدا نہ ہو سکی جس میں بنو ہاشم اپنی سیاسی حق تلفی کو بھول جاتے۔ اندر اندر ان کے دل میں مخالفت کی آگ سلگتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۳۲ھ کے خاتمہ نے یہ دوسرا انقلاب دیکھا کہ بنو عباس نے ایرانیوں کی مدد سے بنو امیہ کا خاتمہ کر دیا۔

بنو امیہ کا فتنہ انتہائی شدید تھا۔ مگر وہ تمام تر سیاسی تھا۔ اس لئے سیاست کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر بنو ہاشم سے یہ جوابی غلطی ہوئی کہ خلافت کو اپنا حق ثابت کرنے کے لئے انھوں نے خلافت کو عقیدہ کا مسئلہ بنا دیا۔ اس غلطی نے ایک سیاسی قضیہ کو مذہبی حیثیت دے دی اور اس امکان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا کہ دوسرے سیاسی

جھگڑوں کی طرح یہ جھگڑا صرف وقتی نقصان پہنچائے اور بعد کی نسلوں کے لئے محض تاریخ کا موضوع بن کر رہ جائے۔
سیاست کو مذہب بنانے کی اس غلطی نے اسلام کو جو نقصانات پہنچائے ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر وضع حدیث کا فتنہ سب سے پہلے اسی محرک کے تحت شروع ہوا۔ بے شمار حدیثیں دونوں طرف سے گھڑی گئیں ایک طرف بنو ہاشم نے حضرت علی کی فضیلت میں یہ حدیث نکالی:

انا مدینۃ العلم وعلی بابھا — میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں

دوسری طرف فریق ثانی نے ایک روایت گھڑی اور کہا کہ پوری حدیث دراصل اس طرح ہے:

انا مدینۃ العلم وابوبکر اساسھا وعمر حیطانھا وعثمان سقفھا وعلی بابھا

میں علم کا شہر ہوں، ابوبکر اس کی بنیاد ہیں، عمر اس کی دیوار ہیں، عثمان اس کی چھت ہیں، علی اس کا دروازہ ہیں

اس قسم کی چیزوں سے اسلام کو جو علمی نقصان پہنچا، اس کی تلافی اب ممکن نہیں۔ تاہم یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنی رحمت خاص سے قرآن کو محفوظ کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان جھگڑوں اور ان کے پیدا کردہ فتنوں میں دین حق گم ہو جاتا اور اللہ کے بندے قیامت تک کے لئے بے آمیز سچائی کو جاننے سے محروم ہو جاتے

تاریخ کی تمام کامیابیاں باہمی اتفاق کا نتیجہ ہیں اور تاریخ کی تمام ناکامیاں باہمی اختلاف کا نتیجہ۔ انسان، خواہ ذاتی طور پر نیک اور مخلص کیوں نہ ہوں، ان میں ایک دوسرے سے شکایت پیدا ہونا بالکل ناگزیر ہے۔ کسی نہ کسی وجہ سے، حتیٰ کہ بعض اوقات بلا وجہ بھی، دو افراد یا دو گروہوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اتحاد کی واحد صورت یہ ہے کہ اختلاف کو برداشت کیا جائے۔ کیونکہ اختلاف سے خالی انسانی معاشرہ اس زمین پر ممکن ہی نہیں۔ وہی لوگ کوئی بڑا کام کر سکتے ہیں جو ذاتی اعتبارات پر قومی اعتبارات کو ترجیح دے سکیں۔ جو اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھا چکے ہوں کہ اختلافی باتوں کو نظر انداز کر کے عملی اتحاد پر قائم رہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہیں بنتی۔ کسی دشمن کی سازش یا عداوت ان کو نقصان پہنچانے والی ثابت نہیں ہوتی۔ ان کا ہر حال میں متحد رہنا ایک ایسی طاقت بن جاتا ہے جو ہر امکانی صورت حال سے نمٹنے کی یقینی ضمانت ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جو لوگ ذاتی شکایتوں سے اوپر اٹھ کر سوچنا نہ جانتے ہوں، جو ذاتی اختلافات کو اجتماعی مفاد پر قربان نہ کر سکیں، وہ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔ ان کی کوششیں یا تو محدود ہو کر رہ جاتی ہیں یا خود اپنے بھائیوں کو نقصان پہنچانے میں استعمال ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ اپنے وسائل اور مواقع کو اپنے اندرونی جھگڑوں میں برباد کرتے رہتے ہیں۔ ان کے اندر ہمیشہ ایسے کمزور گوشے باقی رہتے ہیں جہاں سے ان کا دشمن ان کے اندر گھس آئے اور ان کے بارے میں اپنے خطرناک منصوبوں کو پورا کر سکے ——— یہ اختلافی سیاست اس وقت اور زیادہ مہلک ہو جاتی ہے جب کہ اس کو عقیدہ بنا لیا جائے۔ سیاسی اختلاف کبھی نہ کبھی ختم ہو جاتا ہے۔ مگر جب اس کو اعتقادی اختلاف کا درجہ دے دیا جائے تو اس کے ختم ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ یہاں تک کہ خدا خود ظاہر ہو کر فیصلہ فرما دے۔

دو تاریخی تجربے

سلیمان بن عبدالملک (م ۹۹ھ) کی منقبت کے لیے یہ کافی ہے کہ اس نے خلافت راشدہ کی زریں فہرست میں پانچویں خلیفہ راشد (عمر بن عبدالعزیز) کا اضافہ کیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اسی اموی حکمراں کے خانہ میں تاریخ ان واقعات کو بھی لکھتی ہے جن کا آخری نتیجہ ان دو عظیم ترین المیوں کی شکل میں برآمد ہوا جن میں سے ایک کا نام اسپین اور دوسرے کا نام ہندوستان ہے۔ اگر سلیمان بن عبدالملک نے اسپین میں طارق کو اور ہندوستان میں محمد بن قاسم کو معتوب کرکے واپس نہ بلایا ہوتا تو شاید ان دونوں ملکوں کی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جو بعد کے دور میں ہمیں نظر آتی ہے۔

اسپین میں کیا ہوا

سلیمان بن عبدالملک نے تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ محض ایک ذاتی شکایت کی بنا پر موسیٰ بن نصیر گورنر افریقہ اور اس کے سپہ سالار طارق بن زیاد (فاتح اسپین) کو ان کے عہدوں سے معزول کرکے واپس بلالیا۔ اور اول الذکر کو قید اور دوسرے کو نظر بند کردیا۔ اس کے قدرتی نتیجہ کے طور پر اسپین کی مسلم حکومت اور مرکز خلافت کے درمیان آغاز ہی میں حریفانہ جذبات پیدا ہوگئے۔ ۱۳۲ھ میں جب ایک خون آشام انقلاب کے بعد دمشق کی اموی سلطنت ختم ہوئی اور نئے دارالخلافہ بغداد میں عباسی خلافت قائم ہوئی تو اموی خاندان کا ایک لٹا ہوا شہزادہ عبدالرحمن الداخل اسپین پہنچا اور وہاں کے حالات سے فائدہ اٹھاکر اسپین میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ بنوامیہ کے ایک فرد کی یہ کامیابی عباسیوں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس طرح اسپین اور مرکز خلافت کے درمیان رقابت کی ایک اور وجہ پیدا ہوگئی اور نتیجۃً باہمی آویزشوں کا وہ لاتناہی سلسلہ چلا جو صرف اس وقت ختم ہوا جب اسپین میں خود مسلم سلطنت ختم ہوگئی۔

مرکز خلافت اور اسپین کی یہ رقابت یہاں تک بڑھی کہ جس خلافت نے طارق بن زیاد کو بھاری کمک دے کر اسپین کی مہم پر بھیجا تھا اسی خلافت نے فرانس کے بادشاہ شارلیمین کو اکسایا کہ وہ اسپین پر حملہ کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین میں ایک عام خانہ جنگی اور بغاوت کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ہر علاقہ کا گورنر خود مختاری کا خواب دیکھنے لگا۔ امیر قرطبہ کے رشتہ داروں نے اس نازک وقت کو اسپین کے تاج و تخت کے لیے سازش کرنے کا سنہری موقع سمجھا۔ مقامی عیسائیوں کو شہ ملی کہ وہ باغی مسلمانوں کو ساتھ لے کر ہر جگہ شورش پیدا کرتے رہیں۔ اسپین کی اموی خلافت کے بعد اسپین کا ملک چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں میں تقسیم ہوگیا جنھوں نے قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، بلنسیہ، طلیطلہ، بالقاوغیرہ شہروں کو اپنا اپنا دارالحکومت بنالیا۔

طارق بن زیاد ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں اسپین میں داخل ہوا تھا اور ۸۹۷ھ (۱۴۹۲ء) میں اسپین سے مسلم

اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ آٹھ سو برس کی اس طویل مدّت کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا جو بغاوتوں اور شورشوں سے خالی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ اسپین کو اکثر بہت لائق مسلم حکمراں ملے۔ عدل و انصاف کے اعتبار سے بھی اور تمدن و سیاست کے اعتبار سے بھی۔ اور بلا شبہ انھوں نے مشکل حالات کے باوجود تمدن اور سیاست دانی کے اعتبار سے اسپین میں ایک عظیم تاریخ بنائی۔ مگر اندرونی حالات اور مرکز خلافت کی شہ کی بنا پر ملک کی عیسائی رعایا مسلسل بغاوتوں پر مائل رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ ماحول نہ بن سکا جس میں اس اہم ترین کام کی بنیاد پڑتی جس کے لیے اسلام نے کشور کشائی اور جہاں بانی کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ یعنی اشاعت دین کا کام۔ عرب اور اطراف عرب کے اکثر ممالک جتنی مدّت میں مکمل طور پر اسلامی آبادی کے ملک بن گئے اس سے بہت زیادہ مدت پانے کے باوجود اسپین اسلامی آبادی کا ملک نہ بن سکا۔

اسپین میں مسلم حکومت کی مثال تقریباً ویسی ہی ہے جیسے آزادی سے قبل ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی مثال۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے سو سالہ دورِ حکومت میں ملک کو زبردست تمدنی ترقیات سے مالا مال کیا۔ اگرچہ انھوں نے وہ غلطی نہیں کی جو اسپین کے مسلمانوں نے کی تھی۔ انھوں نے سارے ملک میں عیسائی مشنریوں کا جال بچھا دیا اور ان کو بے پناہ سہولتیں عطا کیں مگر مسیحی مذہب میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اس ملک کی آبادی کو اپنا ہم عقیدہ بنا لیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہندوستان سے انگریزوں کی ہوا اکھڑی تو عالی شان عمارتیں اور بڑے بڑے پل ان کے کام نہ آسکے اور انھیں ہندوستان چھوڑ کر وطن واپس جانا پڑا۔

طارق بن زیاد نے جس اسلامی جذبے کے تحت اسپین کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اگر وہ جذبہ جاری رہتا اور وہاں مستحکم حکومت کی روایت قائم ہو سکتی تو اسپین میں مسلمانوں کے سوا کسی کا وجود نہ ہوتا۔ دریا پار کرنے کے بعد اپنی طویل دعا میں اس نے رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا کی آیت بطور بددعا نہیں دہرائی تھی۔ بلکہ یہ اپنے اس عزم کا اظہار تھا کہ وہ اس ملک کو کفر و شرک سے خالی کرکے اسلام کا گہوارہ بنا دینا چاہتا ہے۔ مسلم اسپین کی ابتدائی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مگر چند ہی برس بعد وہاں کی سیاست کا رخ اس طرح بدلا کہ تبلیغ دین کا کام پس پشت پڑ گیا۔ ۱۳۲ھ میں جب مرکز خلافت میں تبدیلی ہوئی اور بنو امیہ کی جگہ بنو عباس کی سلطنت قائم ہوئی تو اس ذہن کو مزید تقویت ملی۔ کیونکہ عباسیوں کو جتنی دلچسپی تمدن اور علوم و فنون کی ترقی سے تھی اتنی دین کی اشاعت سے نہیں تھی۔ اس طرح بغداد کے اثر سے قرطبہ تمدن اور علوم و فنون کا مرکز تو بن گیا مگر وہ اشاعت دین کا مرکز نہ بن سکا۔

چنانچہ اسپین میں جب حالات بدلے تو وہاں کی مسلم اقلیت پر عیسائی اکثریت آناً فاناً غالب آگئی اور الحمرا کا بے مثال محل مسلمانوں کے کچھ کام نہ آسکا۔ چونکہ مسلم آبادی میں عیسائیوں کو غلبہ حاصل تھا اس لیے ۹۰۴ھ میں قرطبہ کو زیر کرنے کے بعد جب مسلمانوں کے خلاف دار و گیر شروع ہوئی تو ان کے لیے وہاں چھپنے کی

بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ عیسائیوں نے غالب آتے ہی تمام ملک میں اپنی مذہبی عدالتیں قائم کردیں جن میں ہر روز ہزاروں مسلمان گرفتار کرکے لائے جاتے اور طرح طرح کے جھوٹے الزامات لگا کر آگ میں جلا دیے جاتے۔ ۱۵۰۲ء میں ایک عام حکم جاری کیا گیا کہ ہر وہ شخص جو مسلمان ہے وہ دین مسیحی قبول کرلے ورنہ جہاں اس کو پایا جائے گا قتل کردیا جائے گا۔ کچھ مسلمان جہازوں پر سوار ہوکر افریقہ کے لیے روانہ ہوئے مگر ان کو ساحل افریقہ تک پہنچنے سے پہلے ہی سمندر میں غرق کردیا گیا۔ آخر کار کوئی ایک بھی توحید پرست سرزمین اسپین میں باقی نہ رہا۔ عیسائیوں نے سب کو یا تو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ یا سمندر میں ڈبو دیا۔ یا آگ میں جلا ڈالا۔

۲

خلفائے اربعہ کے بعد اسلامی حکومت بنی امیہ کے ہاتھ میں چلی گئی جس کے بانی امیر معاویہ (وفات ۶۰ھ) تھے اس سلسلۂ حکومت کا پانچواں فرماں روا عبدالملک بن مروان تھا۔ ۸۶ھ میں عبدالملک کا انتقال ہوا۔ انتقال سے پہلے اس نے اپنے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان کو ولی عہد مقرر کردیا۔ اس نے تمام صوبوں کے گورنروں اور عاملوں کے نام فرامین جاری کیے کہ عید الفطر کے اجتماع میں یکم شوال ۸۶ھ کو ولید و سلیمان کی ولی عہدی کے لیے بیعت لی جائے۔ چنانچہ تمام ممالک اسلامی میں تاریخ مقررہ پر ان دونوں کی ولی عہدی کے لیے بیعت لی گئی۔ یہی موقع ہے جب کہ مدینہ کے مشہور محدث سعید بن مسیب کو بیعت سے انکار کرنے پر درے لگائے گئے۔

عبدالملک بن مروان (۸۶-۲۳ھ) کے انتقال کے بعد جب اس کا بڑا لڑکا ولید تخت پر بیٹھا تو اس نے یہ کوشش شروع کی کہ اپنے بعد تخت کی وراثت اپنے بھائی (سلیمان) کے بجائے اپنے بیٹے (عبدالعزیز) کی طرف منتقل کردے۔ ولید بن عبدالملک نے پہلے اپنے بھائی سلیمان کو لکھا کہ وہ از خود ولی عہدی سے دست بردار ہوجائے۔ جب سلیمان اس کے لیے تیار نہ ہوا تو اس نے دوسری تدبیر کی۔ اس نے تمام والیان ملک اور ممتاز افراد کو اپنے حق میں ہموار کیا اور طے کیا کہ ایک روز کسی خاص اجتماع کے موقع پر تمام ممالک اسلامی میں سلیمان بن عبدالملک کی ولیعہدی کی منسوخی کا اعلان کردیا جائے اور اس کے بجائے عبدالعزیز بن ولید کی ولیعہدی پر لوگوں سے بیعت لے لی جائے۔

مگر اس منصوبہ کی تکمیل سے پہلے ۱۵ جمادی الثانی ۹۶ھ (فروری ۷۱۵ء) میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ولید بن عبدالملک کے انتقال کے بعد سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا تو قدرتی طور پر وہ ان سرداروں کا دشمن ہوگیا جنھوں نے اس کو تخت سے محروم کرنے کی سازش میں اس کے بھائی ولید کا ساتھ دیا تھا۔ انھیں میں سے ایک حجاج بن یوسف تھا جو مشرق کے اسلامی ممالک کا وائسرائے تھا اور مغربی ممالک کا وائسرائے موسیٰ بن نصیر۔ حجاج کا صدر مقام عراق تھا اور موسیٰ بن نصیر کا قیروان۔ ان دونوں نے ولید کے منصوبہ کی حمایت کی تھی اس لیے دونوں سلیمان کی نظر میں اس کے بدترین دشمن تھے جن سے سب سے پہلے نمٹنا نئے حکمراں کے لیے ضروری تھا۔

حجاج، سلیمان بن عبدالملک کی تخت نشینی سے آٹھ ماہ پہلے شوال ۹۵ھ میں انتقال کر گیا تھا۔ اس لیے

سلیمان اب حجاج بن یوسف کو نہیں پا سکتا تھا۔ تاہم حجاج کے رشتے دار اس کے انتقامی جذبات کی تسکین کے لیے موجود تھے جن میں سرفہرست حجاج کے ابن عم اور داماد محمد بن قاسم کا نام تھا جس نے سندھ (موجودہ پاکستان) میں غیر معمولی فاتحانہ کارنامے دکھا کر حجاج کی شہرت میں اضافہ کیا تھا۔

محمد بن قاسم نہایت اعلیٰ درجہ کی قابلیت رکھنے والا اسپہ سالار تھا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں "اس نے سندھ و ہند کی فتوحات میں ایک طرف اپنے آپ کو رستم و اسکندر سے زیادہ بڑا بہادر ثابت کیا تو دوسری طرف نوشیروان عادل سے بڑھ کر عادل و رعایا پرور ظاہر ہوا" یہ نوجوان فتح مند سردار سندھ و پنجاب میں اتنی تیزی سے گھس رہا تھا اور بستیوں کی بستیاں اس کے اثر سے اس طرح دائرہ اسلام میں داخل ہوتی چلی جا رہی تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب سارا علاقہ ایک اسلامی علاقہ بن جائے گا۔

ہندوستان کی مہم پر محمد بن قاسم کو حجاج ہی نے روانہ کیا تھا اس کے لیے حجاج نے کتنا اہتمام کیا تھا اس کا اندازہ چند مثالوں سے ہو گا۔

۱۔ حجاج نے دیگر تمام ساز و سامان کے علاوہ ۳۰ ہزار دینار خصوصی طور پر محمد بن قاسم کے ہمراہ کیے تھے تاکہ ناگہانی ضرورت کے وقت کام آسکیں (میر معصوم) کہا جاتا ہے کہ فوج کشی کی اس مہم پر کل ۶ کروڑ درہم صرف ہوئے تھے۔

۲۔ فراہمی سامان کا حجاج کو اس قدر خیال تھا کہ اس نے سوچا کہ محمد بن قاسم کو عربوں کی عادت کی بنا پر کھانے میں سرکہ کی ضرورت ہو گی۔ چنانچہ اس نے بہت سی روئی سرکہ میں تر کر کے خشک کرایا اور اس کو محمد بن قاسم کے پاس روانہ کیا اور لکھا کہ جب سرکہ کھانے کا جی چاہے تو اس کو پانی میں بھگو کر نچوڑ لیا کرنا۔

۳۔ پانچ منجنیقیں جو بھاری ہونے کی وجہ سے خشکی کے راستے سے روانہ نہ ہو سکی تھیں، ایک بڑے جہاز پر لدوا کر ساحل سندھ کی طرف روانہ کیں۔ یہ منجنیقیں اتنی بڑی تھیں کہ ان میں سے ہر ایک کو چلانے کے پانچسو آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی۔

۴۔ اس پوری مہم کے دوران حجاج اور محمد بن قاسم کے درمیان ڈاک کا سلسلہ جاری رہا۔ حجاج بصرہ میں تھا اور محمد بن قاسم سندھ میں۔ مگر انتظام یہ تھا کہ ہر تیسرے روز ایک خط حجاج لکھتا تھا اور اسی طرح محمد بن قاسم بھی ساری مصروفیتوں کے باوجود ہر تیسرے روز حجاج کے نام مفصل حالات تحریر کرتا۔ ڈاک کی روانگی کے لیے ایسے خاص انتظامات کیے گئے تھے کہ اگرچہ دیبل (سندھ) اور بصرہ میں ہزاروں کوس کا فاصلہ تھا مگر برابر ساتویں روز بصرہ سے دیبل اور دیبل سے بصرہ دونوں کے خطوط پہنچ جاتے تھے۔

محمد بن قاسم نے ۹۵ھ میں ملتان فتح کیا۔ اب پورا سندھ اس کے قبضہ میں تھا۔ بحر عرب سے لے کر حدود کشمیر تک تمام راجاؤں اور سرداروں نے اسلام کی عظمت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اب اس نے پورے برصغیر میں اسلام کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور قنوج کی طرف کوچ کرنا شروع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ قنوج پر قبضہ کرنے کے بعد

بقیہ علاقوں کی فتوحات کا دروازہ کھل جائے گا۔ مگر ۹۶ھ میں سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا۔ اس کو حجاج کے متعلقین سے حجاج کا بدلہ لینا تھا۔ اس نے ایک طرف حجاج کے بعد یزید بن مہلب کو عراق کا والی مقرر کیا اور ایک خارجی المذہب صالح بن عبدالرحمٰن کو خراج وصول کرنے کی خدمت سپرد کی۔ یہ دونوں حجاج کے بدترین دشمن تھے۔ چنانچہ سلیمان کے حکم کے مطابق ان دونوں نے نسل عقیل (خاندان حجاج) کے لوگوں کو طرح طرح سے ماخوذ کر کے قتل کرنا شروع کیا۔

دوسری طرف سلیمان نے محمد بن قاسم کو ولایت سندھ سے معزول کرنے کا حکم جاری کر دیا جس کا قصور اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ حجاج بن یوسف کا ابن عم اور داماد تھا اور حجاج کا نامور عزیز ہونے کی بنا پر اس کو ہلاک کر کے سلیمان اپنے انتقامی جوش کو ٹھنڈا کر سکتا تھا۔ سلیمان نے محمد بن قاسم کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو سندھ کا حاکم مقرر کیا۔ نیا حاکم دربار خلافت کا حکم لے کر سندھ پہنچا۔ اس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کیا اور مجرموں کی طرح اس کو ٹاٹ کے کپڑے پہنائے۔ ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈالیں اور معاویہ بن مہلب کی حراست میں عراق روانہ کیا۔ یہ بھی محمد بن قاسم کی سعادت مندی تھی۔ ورنہ سندھ میں وہ اتنا مقبول تھا کہ وہ خلیفہ کے حکم سے بغاوت کر کے خود یزید اور مہلب کو گرفتار کر سکتا تھا۔

فتوح البلدان کے بیان کے مطابق عربی کا مشہور شعر اسی وقت محمد بن قاسم کی زبان پر جاری ہوا تھا:

اضاعونی وای فتی اضاعوا — لیوم کریھۃ وسداد ثغر

(لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کیسے جوان کو ضائع کیا۔ وہ جو مصیبت کے دن کام آئے اور سرحدوں کو محفوظ رکھے)

اس کے بعد محمد بن قاسم کو دمشق لے جایا گیا۔ وہاں سلیمان کے حکم سے وہ واسط کے جیل خانہ میں قید کر دیا گیا۔ اس پر داروغہ جیل کی حیثیت سے صالح بن عبدالرحمٰن مسلط تھا جس نے اس کو جیل میں طرح طرح کی تکلیفیں دے کر مار ڈالا۔

ایک مورخ ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے،

"اگر ولید بن عبدالملک کی زندگی کچھ روز اور وفا کرتی۔ یا سلیمان ہی عقل و ہوش سے کام لے کر محمد بن قاسم کو چھوڑ دیتا تو شاید ایشیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔"

یہی مورخ مزید لکھتا ہے "محمد بن قاسم کے زمانہ میں خلقت خدا کثرت سے اسلام قبول کرتی جا رہی تھی۔ تبلیغ دین کی جو سچی اور صحیح کوشش اس نے چند روز میں کر کے دکھا دی۔ بعد کی بڑی بڑی سلطنتیں صدیوں میں بھی نہ کر سکیں۔ اس نو عمر سپہ سالار نے چند روز کی حکمرانی میں جو گہرا اثر ڈال دیا تھا۔ ویسا اثر پٹھانوں اور مغلوں کی سلطنتیں پانچ سو برس میں بھی ملک پر نہیں ڈال سکیں۔ سندھ کے علاوہ بقیہ ملک میں آج مسلمان تھوڑے ہیں اور ملک پر کوئی اثر نہیں رکھتے۔ بخلاف اس کے سندھ میں سب سے بڑا غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہے اور یہ صرف عربوں اور خاصتہً محمد بن قاسم کی دین ہے۔"

تاتاری فتنہ اختلافی سیاست کا نتیجہ تھا

مسلم دنیا پر تاتاریوں کا حملہ ساتویں صدی ہجری کے ربع اول میں ہوا اس وقت بغداد کی سلطنت پر ناصر لدین اللہ کا قبضہ تھا اور خراسان میں خوارزم شاہ حکومت کر رہا تھا۔ دونوں میں سیاسی اختلاف پیدا ہو گیا۔ تاتاریوں کے ہاتھ سے مسلم دنیا کی غارت گری انھیں دو مسلم قائدین کے باہمی اختلاف کے نتیجہ میں وقوع میں آئی۔ خراسان کی سلطنت اگرچہ ایک آزاد سلطنت تھی۔ تاہم وہاں خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ خوارزم شاہ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ناصر لدین اللہ کی مملکت کے ایک سرحدی حصہ (عراق) کو کاٹ کر اپنے علاقہ میں شامل کر لے۔ اس نے اپنے ملک میں ناصر لدین اللہ کا خطبہ موقوف کرا دیا۔ ناصر لدین اللہ اس خبر سے بہت خفا ہوا۔ اس نے اس کے توڑ کے لئے یہ تدبیر کی کہ لڑاکو تاتاری قبائل کو اکسا کر خوارزم شاہ پر حملہ کرا دیا۔ یہ تدبیر نہ صرف خوارزم شاہ بلکہ پوری مسلم دنیا کے لئے ایک عذاب ثابت ہوئی۔ تاتاری جب خوارزم شاہ کو مغلوب کر چکے تو انھوں نے ناصر لدین اللہ کی سلطنت پر حملہ کر دیا اور بالآخر دونوں کو برباد کر ڈالا۔

خوارزم شاہ کو ۲۱ سال حکومت کرنے کا موقع ملا اور ناصر لدین اللہ کو ۴۶ سال۔ اس کے بعد دونوں میں سے ہر ایک اسی قبر میں لیٹ گیا جس میں وہ اپنے بھائی کو لٹانا چاہتا تھا ——— تاریخ کا یہ سبق بھی کتنا عبرت انگیز ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ کوئی اس سے سبق نہیں لیتا۔ ہر شخص جس کو موقع ملتا ہے پہلی فرصت میں اسی تاریخ کو دہراتا ہے جو خوارزم شاہ اور ناصر لدین اللہ کے واقعہ کی شکل میں ہمیشہ کے لئے ناکام ہو چکی ہے اور آخرت میں ناکام تر شکل میں سامنے آنے والی ہے۔

۱۰۹۵ سے لے کر ۱۲۷۱ء تک یورپ کی مسیحی قوموں نے بلاد اسلامیہ پر آٹھ زبردست حملے کئے۔ یہ حملے مغربی سمت سے ہوتے تھے اور ان کا مقصد "مقدس مقامات" کو عیسائی قبضہ میں لینا تھا۔ مگر دوسو سالہ جنگ اس طرح ختم ہوئی کہ بالآخر یروشلم مسلمانوں ہی کے قبضہ میں رہا۔ اسی زمانہ میں ۱۲۲۰ء میں تاتاریوں (مغلوں) نے بلاد اسلامیہ پر حملہ کیا اور اس حد تک کامیاب ہوئے کہ سارے عالم اسلام کو زیر و زبر کر ڈالا۔ وہ چین کے شمالی پہاڑوں سے چنگیز خاں کی زیر قیادت نکلے اور ترکستان، ماوراء النہر، خراسان، آذربائیجان، اصفہان، افغانستان، فارس، عراق، شام، ایشیائے کوچک، روس، آسٹریا تک تمام ملکوں کو لوٹ مار اور قتل و غارت کا قبرستان بنا دیا۔ مورخ ابن اثیر جو اس زمانہ کا عینی شاہد ہے، اس زمانہ کے واقعات بیان کرنے بیٹھتا ہے تو اس کے قلم سے یہ الفاظ نکل جاتے ہیں:

من الذی یسہل علیہ ان یکتب نعی الاسلام والمسلمین؟ ومن الذی یہون ذکر ذلک؟ فیالیت امی لم تلدنی ویالیتنی مت قبل ہذا وکنت نسیا منسیا۔۔ فلو قال قائل ان العالم منذ خلق اللہ سبحانہ

کون ہے جس کے لئے آسان ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کی ہلاکت کی داستان لکھے۔ اور کون ہے جس کے لئے اس کا ذکر آسان ہو۔ کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا اور کاش میں اس سے پہلے مر گیا ہوتا اور ختم ہو گیا ہوتا۔ اگر کوئی کہے کہ جب آدم پیدا کئے گئے، اس وقت سے لے کر اب تک ایسا حادثہ

وتعالیٰ آدم الی الآن۔ ای الی عہد ابن الاثیر۔ لم یبتلوا بمثلہا لکان صادقا ..   انسانیت پر نہیں آیا تو یقیناً وہ سچا ہوگا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی (۵۹۳ھ۔ ۱۱۳۷ء) کی وفات کے ۲۰ سال سے بھی کم عرصہ میں اتنا بڑا حادثہ عالم اسلام پر کیوں پیش آیا۔ کچھ لوگ اس سلسلہ میں تاتاریوں کی سفاکی کا حوالہ دینا کافی سمجھتے ہیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ حکمراں قومیں ہمیشہ سفاک دشمنوں کے نرغہ میں رہی ہیں۔ کوئی نہ کوئی "تاتار" مسلمانوں کے لئے ہمیشہ موجود رہا ہے۔ پھر اس کو تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں یہ شاندار کامیابی کیسے حاصل ہوئی۔ حالاں کہ یہ وہ وقت تھا جب کہ اسلامی سلطنت کی وسعت، اس کی مسلسل فتوحات، اس کی حربی اور تمدنی ترقیاں اور اس کے مقابلہ میں یورپی قوموں کی عبرتناک پسپائی نے اتنی دھاک بٹھادی تھی کہ کوئی سیاسی حوصلہ مند سلطنت اسلامی کی طرف رخ کرنے کی جرأت مشکل ہی سے کرسکتا تھا۔ تاتاری حملہ کا واقعہ دہلی خلیفہ ناصرلدین اللہ (۶۲۲ھ۔ ۵۵۳ھ) کے زمانہ میں ہوا۔ مشہور مورخ ابن اثیر اس خلیفہ کا ہم عصر تھا۔ وہ تاتاریوں کی خوں ریزی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

وکانوا کلما مروا بمدینۃ اوقریۃ وضعوا السیف علی اھلہا دون تفرقۃ بین کبیر ا وصغیر او رجل او امراۃ، وعمت بلاد المشرق جرائمہم وضائقہم	جب وہ کسی شہر یا گاؤں سے گزرتے تو اس کے باشندوں پر اپنی تیغ بے نیام کردیتے اور بڑے چھوٹے، عورت، مرد سب کو قتل کرڈالتے۔ مشرق کے تمام علاقے ان کے جرائم سے بھر گئے۔

ابن اثیر نے ۶۱۷ھ (۱۲۲۰ء) کے حوادث کے ذیل میں لکھا ہے:

ان سبب خروج التتار الی الدیار الاسلامیۃ ھو تصرف خوارزم شاہ السیئ بقتل جماعۃ من التتار جاؤا الی بلادکا للتجارۃ ونہب اموالہم	بلاد اسلامیہ پر تاتاریوں کی یورش کی وجہ خوارزم شاہ کی یہ بیہودہ حرکت تھی کہ اس نے تاتاریوں کی جماعت کو قتل کردیا اور ان کے اموال کو چھین لیا جوکہ اس کے ملک میں تجارت کی غرض سے آئے تھے۔

یہی قصہ مختلف شکلوں میں مشہور ہوا ہے جس میں تاتاری فتنہ کی ذمہ داری خوارزم شاہ (م ۶۱۷ھ) پر ڈالی گئی ہے۔ مگر تاریخ کے گہرے مطالعہ سے یہ بات صحیح نظر نہیں آتی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خود مورخ ابن اثیر نے دوسرے موقع پر ایک اور بات لکھی ہے:

وقیل فی سبب خروجہم الی بلاد الاسلام غیر ذلک مما لا یذکر فی بطون الدفاتر: فکان ماکان مما لست اذکرہ فظن خیرا ولا تسال عن السبب	تاتاریوں کی یورش کا اس کے سوا دوسرا سبب بھی بیان کیا گیا ہے جس کو لکھا نہیں جا سکتا، جو ہوا وہ ہوا۔ اب میں اس کو بیان نہیں کروں گا۔ تم اچھا گمان کرو اور سبب مت پوچھو۔ الکامل، ج ۹، صفحہ ۳۳۱

ابن اثیر کے اس بیان سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ سیاسی اسباب سے اصل حقیقت کو چھپا رہا ہے، مگر یہ تاریخ

کی خوش قسمتی تھی کہ ابن اثیر کی زندگی ہی میں وہ سیاسی رکاوٹ ختم ہوگئی اور بعد کے "دفتر" میں وہ اس کو درج کرنے کے لئے زندہ رہا۔ تاتاری حملہ ۶۱۷ھ میں ہوا اور خلیفہ ناصرلدین اللہ کا انتقال ۶۲۲ھ میں۔ ابن اثیر نے مذکورہ بالا جملے ۶۱۷ھ کے حوادث کے ذیل میں لکھے تھے۔ ناصرلدین اللہ کے انتقال کے بعد جب وہ ۶۲۲ھ کے حوادث کے ذیل میں خلیفہ کے حالات لکھنے بیٹھا تو اس نے اپنی تاریخی کتاب میں حسب ذیل الفاظ ثبت کئے:

ان کان سبب ما ینسبه العجم الیه صحیحا من انه هو الذی اطمع التتار فی البلاد وراسلهم فی ذلک فهو الطامة الکبری التی یصغر عندها کل ذنب عظیم

اگر وہ سبب صحیح ہو جو عجمی لوگ ناصرلدین اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں یعنی وہی تھا جس نے تاتاریوں کو حملہ پر اکسایا اور اس سلسلہ میں ان کے پاس پیغام بھیجا تو وہ ایسی قیامت تھی جس کے آگے ہر بڑا گناہ ہیچ ہے۔

استاذ احمد حافظ (مؤلف کتاب الدولۃ الخوارزمیۃ والمغول) نے اس موقع پر حسب ذیل تعلیق کی ہے:

والظاهر ان ابن الاثیر وهو من المعاصرین للغزو المغولی والخلیفة الناصر لدین الله لم یجرؤ علی المجاهرة باستدعاء الخلیفة للمغول، ولم ینقل ذلک بصراحة ووضوح الا بعد ما توفی الخلیفة ذکر هذه الحقیقة فی جلاء وجراة

اس کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ ابن اثیر، جو کہ مغلوں کے حملہ اور خلیفہ ناصرلدین اللہ کے ہم زمانہ ہیں۔ خلیفہ کی وفات سے پہلے صراحۃً اس کو کہنے کی جرأت نہ کرسکے تھے کہ مغلوں کو بلانے والا خود خلیفہ ناصرلدین اللہ تھا۔ اس حقیقت کو انھوں نے خلیفہ کی وفات کے بعد جرأت اور وضاحت سے بیان کیا

ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ابن اثیر کے قول کو نقل کیا ہے اور اس پر کوئی جرح و تعدیل نہیں کی (جلد ۱۳، صفحہ ۱۰۷) ابوالفداء نے اپنی تاریخ میں اس کی تائید کی ہے اور لکھا ہے:

وقد نسب الی الامام الناصر انه هو الذی کاتب التتار واطمعهم فی البلاد لیشغل خوارزم شاه عن قصد العراق

ج ۳ صفحہ ۱۳۶

خلیفہ ناصرلدین اللہ کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ وہی ہے جس نے تاتاریوں کو لکھا اور ان کو حملہ کرنے کے لئے اکسایا تاکہ خوارزم شاہ اس کے مقابلہ میں مشغول ہوجائے اور عراق کا قصد نہ کرے

اسی طرح مقریزی نے اپنی کتاب السلوک لمعرفۃ دول الملوک میں اس کی تائید کی ہے (ج ۱، صفحہ ۲۱۸) وہ خلیفہ ناصرلدین اللہ کی وفات کے تذکرے میں لکھتا ہے

وفی خلافته خرب التتار بلاد المشرق حتی وصلوا الی همذان، وکان هو السبب فی ذلک فانه کتب الیهم بالعبور الی البلاد خوفا من السلطان علاؤ الدین محمد بن خوارزم شاه، لما هم بالاستیلاء علی بغداد

ناصرلدین اللہ کی خلافت کے زمانہ میں تاتاریوں نے بلاد اسلامیہ کے مشرقی علاقہ میں غارت گری کی یہاں تک کہ ہمدان تک پہنچ گئے، اس کا سبب خود یہی خلیفہ تھا، اس نے تاتاریوں کو لکھا کہ وہ بلاد اسلامیہ میں گھس آئیں۔ یہ

وان يجعلها دار مملكته كما كانت السلجوقية — اس نے سلطان علاء الدین محمد بن خوارزم شاہ کے خوف سے کیا تھا، کیونکہ وہ بغداد پر قبضہ کا ارادہ کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کو اپنا دار الحکومت بنائے۔

خلیفہ ناصر الدین اللہ نے تقریباً ستر برس کی عمر پائی۔ وہ ۵۷۵ھ میں تخت پر بیٹھا اور ۴۶ سال تک حکمراں رہا آخر عمر میں اس کو شدید قسم کی پیچش ہو گئی۔ اس کی بصارت جاتی رہی اور وہ اندھا ہو گیا اور اسی حال میں رمضان ۶۲۲ھ (۱۲۲۵ء) کی آخری رات کو مر گیا۔ تاتاری اپنے اس خروج میں پہلے خوارزم شاہ پر حملہ آور ہوئے اور خراسان اور بلاد جبل کو اس کے قبضہ سے چھین لیا۔ اس کے بعد چنگیز خاں (۱۱۶۲-۱۲۲۷ء) کی قیادت میں ارانیہ اور شروان پر قابض ہو گئے۔ خوارزم شاہ تاتاریوں سے شکست کھا کر طبرستان کے کسی مقام میں چلا گیا اور ۲۱ سالہ حکومت کے بعد ۶۱۷ھ میں فوت ہو گیا۔ تاتاریوں کا ایک گروہ غزنی، سجستان، کرمان وغیرہ کی طرف نکل گیا۔ خوارزم شاہ کو شکست دینے کے بعد تاتاریوں نے اس کے بیٹے جلال الدین بن خوارزم شاہ کو غزنی میں شکست دی۔ چنگیز خاں اس کا تعاقب کرتے ہوئے دریائے سندھ تک چلا گیا۔ جلال الدین دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندستان میں داخل ہو گیا۔ چند روز ہندستان میں رہ کر ۶۲۲ھ میں خوزستان اور عراق کی طرف چلا گیا اور آذر بائیجان اور آرمینیا پر قابض ہو گیا۔ یہاں تک کہ مظفر کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس کے بعد تاتاریوں کا ٹڈی دل ناصر الدین اللہ کی مملکت کی طرف بڑھا اور سارے عالم اسلام کو قتل و غارت گری کا قبرستان بنا ڈالا۔

ناصر الدین اللہ نے خوارزم شاہ کو نیچا دکھانے کے لئے جو تدبیر کی، وہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں عربوں نے ترک خلافت کا "جوا" اپنے سر سے اتار پھینکنے کے لئے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ بنگلہ دیش نے پاکستانی غلبہ کے خلاف اپنی لڑائی میں ایک خارجی ملک کو بہترین مددگار پایا (۱۹۷۰) افغانستان میں سردار داؤد خاں کی حکومت کو ختم کرنے کے لئے وہاں کے لیڈر اشتراکی روس سے مل گئے (۱۹۷۸) وغیرہ۔ اس طرح آج بھی اکثر مسلم ممالک کسی نہ کسی "تاتاری فتنہ" کی شکارگاہ بنے ہوئے ہیں۔ اور ان نئے تاتاریوں کو جو لوگ مسلم ممالک میں داخلہ کا راستہ دے رہے ہیں وہ دوبارہ خود مسلمان ہیں جو اپنے حریف مسلمان کو شکست دینے کے لئے اغیار کو ان کے اوپر چڑھا لاتے ہیں، اس سیاست کا نتیجہ دوبارہ اسی بھیانک صورت میں نکل رہا ہے جو بارھویں صدی عیسوی میں ناصر الدین اللہ کے زمانہ میں نکلا تھا۔ اس قسم کی سیاست میں نہ صرف ملت کے بہترین امکانات برباد ہوتے ہیں بلکہ وہ دونوں فریقوں کے لئے یکساں مہلک ہے، جو لوگ اپنے مسلمان بھائی کی ضد میں اغیار کو اپنی صفوں میں داخل کرتے ہیں وہ جب آتے ہیں تو صرف ان کے مفروضہ حریف کو ختم نہیں کرتے۔ بلکہ بیرونی دراندازی کی یہ سیاست بالآخر خود ان کے لئے بھی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ وہ خود بھی بہت جلد اسی تخریبی سیاست کا شکار بن جاتے ہیں جس کا شکار وہ اپنے حریف مسلمان کو بنانا چاہتے تھے۔ بنگلہ دیش کے شیخ مجیب الرحمٰن کا قتل (۱۹۷۵) اور افغانستان کے کرنل عبد القادر (۱۹۷۸) کی تطہیر (purge) اس کی تازہ مثالیں ہیں۔

متحدہ محاذ کی سیاست

یہ دوسری صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے۔ لوگ بنی امیہ کے مظالم سے تنگ آچکے تھے اور ہر صبح شام ایک نئی حکومت کے منتظر تھے جس کی ایک روایت کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔ دوسری طرف ہاشمی (یا عباسی) خاندان کے کچھ لوگ بنی امیہ کے کھنڈر پر اپنی شاہی عمارت اٹھانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس صورت حال نے ایک طرف عوام اور دوسری طرف عباسی حوصلہ مندوں کے لئے ایک مشترک نقطہ فراہم کردیا ——— بنی امیہ کا خاتمہ۔ اگرچہ مظلوم عوام کے لئے اس کا محرک کچھ اور تھا اور عباسی حوصلہ مندوں کے لئے کچھ اور۔ اس مشترکہ جدوجہد کے نتیجہ میں ۱۳۲ھ میں خلافت بنو امیہ کا خاتمہ ہوگیا اور سفاح تخت نشین ہوا، جو عباسیوں کا پہلا خلیفہ تھا۔ سفاح کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر منصور خلیفہ ہوا۔ ۱۳۶ھ میں اس کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ بنو امیہ کے آخری زمانہ میں جو لوگ ان کے خلاف تحریک چلا رہے تھے ان میں محمد بن عبد اللہ (نفس ذکیہ) اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبد اللہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ لوگ امام حسن ابن علی کی اولاد سے تھے۔

بنو عباس جو نسلی وجوہ سے اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے اور اموی سلطنت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ جب انھیں مذکورہ بالا دونوں بھائیوں کی خفیہ تحریک کا علم ہوا تو وہ ان سے مل گئے۔ حتیٰ کہ خود المنصور (جو بعد کو خلیفہ ہوا) نے نفس زکیہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اموی سلطنت ختم ہوئی اور عباسی سلطنت اس کی جگہ قائم ہوگئی۔ مگر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ مظالم اور زیادہ بڑھ گئے، حتیٰ کہ شاعر کو کہنا پڑا:

فمهلاً يا بني العباس مهلاً   لقد كويت بغدركما الصدور

اے بنی عباس اپنا ظلم چھوڑ دو تمھاری غداری سے سینے داغدار ہو چکے ہیں۔

چنانچہ نفس زکیہ اور ان کے بھائی دونوں روپوش ہوگئے اور جو "انقلابی تحریک" پہلے وہ بنی امیہ کے خلاف چلا رہے تھے اس کو اب بنو عباس کے خلاف چلانے لگے۔ یہاں تک کہ موقع پاکر انھوں نے خروج (سلطنت سے بغاوت) کا اعلان کردیا اور مدینہ میں اپنی آزاد حکومت قائم کرلی۔ اس کے بعد ان کا جو انجام ہوا وہ یہ کہ نفس زکیہ ۱۴۵ھ میں مارے گئے اور ان اور ان کا سر منصور کے دربار میں پیش کیا گیا۔ وہی منصور جس نے ان کے ہاتھ پر نوجوانی کی عمر میں بیعت کی تھی۔

عباسی سلطنت کے قیام سے پہلے نفس زکیہ کی تحریک اور عباسی تحریک دونوں کا مشترک دشمن ایک تھا یعنی بنو امیہ۔ مگر جب عباسی تحریک نے بنو امیہ کی تحریک کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی اور عباسی سلطنت قائم ہوگئی تو اب صورت حال بدل گئی۔ اب عباسی سلطنت کے لئے نفس زکیہ دشمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ کیوں کہ وہ موجودہ عباسی سلطنت سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ وہی المنصور جو "انقلاب" سے پہلے نفس زکیہ کا حلیف تھا، اب ان کا دشمن بن گیا۔ اس نے ان کی تحریک کو ختم کرنے میں اتنی سرگرمی دکھائی کہ دو مہینے تک لباس نہیں بدلا اور بستر پر نہیں سویا۔ اس کو اس وقت تک چین نہیں آیا جب تک اس نے اس تحریک کو ختم نہ کرلیا۔

تاریخ کا یہ تجربہ ایک ہزار سال پہلے پیش آچکا تھا جو بتا رہا تھا کہ مختلف محرکات رکھنے والے لوگ جب کسی مقصد کے لئے متحدہ محاذ بناتے ہیں تو اس کا فائدہ ہمیشہ اس فریق کو حاصل ہوتا ہے جو زیادہ زور آور اور ہوشیار ہو۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس تجربہ سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا اور لوگ بار بار اسی ناکام تجربہ کو دہراتے رہے۔

جمال الدین افغانی (۱۸۹۷ - ۱۸۳۸) نے مصر میں احیائے ملت کا علم بلند کیا۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے قوم پرستوں کی ایک انجمن الحزب الوطنی کے نام سے قائم کی جس کے ممبروں کی تعداد کافی وسیع تھی۔ اس میں شیخ محمد عبدہ، سعد زاغلول پاشا، عبداللہ نعیم بے اور احسان بے جیسے ممتاز لوگ شامل تھے۔ مصر میں جمال الدین افغانی کا اثر و رسوخ اتنا بڑھا کہ وہاں کی با اثر جماعت جمعیت ماسونیہ نے ان کو اپنا صدر نامزد کیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا جب جمال الدین افغانی کی انجمن کا ایک خفیہ رکن توفیق پاشا مصر کے تخت حکومت پر متمکن ہوگیا۔ اگرچہ اس کامیابی میں فرانس اور برطانیہ کا زیادہ ہاتھ تھا۔ اس واقعہ کے بعد جمال الدین افغانی اور ان کے "قوم پرست" ساتھی بہت خوش ہوئے۔ انھیں نظر آیا کہ ان کی دیرینہ آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہو رہی ہیں۔ مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ یہ محض سراب تھا۔ توفیق پاشا نے تخت پر بیٹھتے ہی جمال الدین افغانی اور ان کے مخصوص خادم ابوتراب کو مصر سے جلاوطنی کا حکم دے دیا۔ توفیق پاشا، سید جمال الدین افغانی کی خفیہ مجلسوں میں شریک ہو چکا تھا، اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ لوگ امپیریلزم کے شدید مخالف ہیں۔ چوں کہ توفیق پاشا کو انھیں امپیریلسٹ طاقتوں (فرانس اور برطانیہ) کی حمایت سے کام کرنا تھا، اس لئے اس نے مصر میں ان کی موجودگی کو حکومت کے لئے ایک خطرہ سمجھا۔ اس نے فوج اور پولس کی کڑی نگرانی میں جمال الدین افغانی اور ان کے خادم کو سوئز بھیج دیا اور وہاں انھیں بجبر کشتی پر سوار کر کے روانہ کر دیا گیا۔

عجیب بات ہے کہ صرف نصف صدی بعد اسی حصہ میں ٹھیک اسی غلطی کو دوبارہ اس سے زیادہ بری شکل میں دہرایا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں جب مصر میں شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور فوجی افسروں نے ملک میں حکومت قائم کرلی تو ایک صاحب مجھ سے ملے۔ "مولانا..... مصر جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں" انھوں نے بہت رازدارانہ انداز میں کہا۔

"کیوں خیریت تو ہے"، میں نے پوچھا۔

"یہ جو مصر میں انقلاب ہوا ہے، بظاہر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ فوجی انقلاب ہے، مگر حقیقۃً اخوانی اس انقلاب کے ہیرو ہیں۔ اب مصر میں اخوان المسلمین کی حکومت ہوگی، مولانا اس لئے جانا چاہتے ہیں کہ اس نازک اور تاریخی موقع پر اخوانی لیڈروں کو نصیحت کریں اور اسلامی نظام کی تعمیر کے لئے انھیں مفید مشورے دیں"

یہ واقعہ ہے کہ مصر میں جو فوجی افسر انقلاب لائے تھے ان میں ایسے بھی تھے جن کے اخوان المسلمین سے تعلقات تھے۔ وہ اخوانی تحریک کی تائید کرتے تھے۔ حتیٰ کہ خود جمال عبدالناصر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخوانیوں کے اجتماعات میں شریک ہوتے تھے۔ موجودہ صدر سادات کا بیان ہے کہ فوجی افسروں کی "انقلابی کونسل" نے ان کو مامور کیا تھا کہ وہ اخوانیوں سے رابطہ قائم کریں اور انقلابی جدوجہد کے سلسلہ میں ان کی تائید حاصل کریں۔ چنانچہ جس رات کو شاہ فاروق

کی حکومت کا تختہ الٹا گیا ہے۔ اخوانی رضاکار قاہرہ کی سڑکوں پر پہرہ دینے میں مشغول تھے۔ وہ ان خفیہ باتوں کے بھی رازدار تھے جن میں شاہ فاروق کو تخت سے معزول کرنے کی اسکیم بنائی گئی تھی۔

"جب اخوان المسلمین اور فوجی افسروں کے اشتراک سے مصر میں انقلاب آیا تھا تو کیوں ایسا ہوا کہ فوجی افسروں نے برسر اقتدار آنے کے بعد اخوانیوں کو ختم کر دیا" یہ سوال اکثر لوگوں کو پریشان کرتا ہے۔ جواب بالکل سادہ ہے۔ یہ "اشتراک"، اسی قسم کی ایک غلطی تھی جس کا نمونہ اوپر کی مثالوں میں آپ دیکھ چکے ہیں۔

شاہ فاروق کی فوج کے کچھ جونیر افسر فاروق کی قبر کے اوپر اپنی حکمرانی کا تخت بچھانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ مگر انھیں شبہ تھا کہ وہ تنہا اپنے اس خواب کو عملی شکل دے سکتے ہیں۔ دوسری طرف اخوان المسلمین مصر میں اسلامی طرز کی حکومت قائم کرنے کے خواہش مند تھے۔ مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی اس تمنا کو کس طرح واقعہ بنائیں۔ دونوں کی راہ کی رکاوٹ بظاہر صرف ایک چیز تھی، شاہ فاروق کی حکومت۔ اس صورت حال نے دونوں گروہوں کے لئے ایک مشترک نقطۂ اتحاد فراہم کر دیا۔ باہم ملاقاتیں اور دوستیاں شروع ہوگئیں۔ خفیہ مجالس میں شاہ کے خلاف اسکیمیں بننے لگیں۔ دونوں خوش ہوگئے کہ مقصد کے حصول کا قریبی موقع ہاتھ آگیا ہے۔ مگر جب حکومت بدلی تو فطری طور پر وہ ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو زیادہ ہوشیار اور عملی طور پر حکومت سے قریب تر تھے اور اتفاق سے یہ وہی لوگ تھے جن کو اسلامی یگانگت سے زیادہ ذاتی حوصلوں کی تکمیل کے شوق نے فریق ثانی سے قریب کیا تھا۔ انقلاب کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ ان حوصلوں کی تکمیل میں پہلے جہاں شاہ فاروق کی شخصیت حائل تھی وہاں اب یہ "قدیم دوست"، آکر کھڑے ہوگئے ہیں یا کم از کم کھڑے ہو سکتے ہیں۔ حل بہت آسان تھا۔ پہلے کے فوجی افسر اب ملک کے حکمراں بن چکے تھے۔ انھوں نے اپنے قدیم دوستوں کو اس سے بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ اپنی راہ سے ہٹا دیا جس کا مظاہرہ انھوں نے شاہ فاروق کی معزولی کے وقت کیا تھا۔

اسی اتحادی سیاست کو مزید بدتر شکل میں پاکستان میں دہرایا گیا ہے۔ ۱۹۵۸ میں پاکستان میں فوجی انقلاب ہوا اور صدر ایوب کی "ڈکٹیٹرشپ"، ملک میں قائم ہوگئی۔ یہ صورت حال ملک کے بہت سے لوگوں کے لئے پریشان کن تھی۔ ان میں ایک طبقہ "اسلام پسند"، حضرات کا تھا، یہ لوگ پاکستان میں اسلامی نظام لانے کے علم بردار تھے اور صدر ایوب اور ان کی "بنیادی جمہوریت"، ان کے نزدیک اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ دوسرا گروہ سیکولر اور سوشلسٹ ذہن رکھنے والوں کا تھا۔ ان کو بھی یہی محسوس ہو رہا تھا کہ "بنیادی جمہوریت"، کے ہوتے ہوئے وہ ملک کے اقتدار پر قبضہ نہ کر سکیں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کو ختم کیا جائے۔ دونوں گروہ آخری منزل کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ تاہم دونوں محسوس کرتے تھے کہ "صدر ایوب" کی ذات دونوں کے لئے یکساں رکاوٹ ہے۔ اشتراک کی اس منفی بنیاد نے دونوں کو ایک متحدہ سیاسی پلیٹ فارم پر یکجا کر دیا۔ اور پھر دونوں نے مل کر ملک میں وہ طوفان مچایا کہ خود ملک دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ یہ متحدہ محاذ جو بڑے بڑے دعووں کے ساتھ بنایا گیا تھا جب اپنے آخری انجام کو پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کا سارا فائدہ سیکولرزم اور سوشلزم کے علم برداروں

کے حصہ میں آیا ہے اللہ اسلام پسند گروہ کو اس کے سوا کچھ نہیں ملا کہ ساری طاقت خرچ کرکے سیاست کے صحرا میں ملوما مدحورا بنے رہیں۔

اب اسی نادان سیاست کو ہندوستان کے کچھ مسلم قائدین نے اس ملک میں درآمد کیا ہے۔ وہ معاہداتی سیاست کے نعرے لگا رہے ہیں۔ الیکشن کے موقع پر وہ ایک سیاسی پارٹی سے مل کر دوسری پارٹی کو شکست دیتے ہیں۔ مگر قوم کے بے شمار وسائل کو خرچ کرنے کے بعد ان کے حصہ میں جو آخری چیز آئی ہے وہ صرف یہ کہ الکشن کے بعد جب لوگ اسمبلیوں پر قبضہ کرلیں اور وزارتیں بنالیں تو ہمارے لیڈر اسٹیج پر نمودار ہو کر یا پریس کانفرنس کرکے یہ "انکشاف" کریں کہ جیتنے والوں نے ہم سے فلاں فلاں وعدے کئے تھے جو پورے نہیں کئے گئے۔ ۱۹۶۷ کے الکشن میں معاہداتی سیاست کے رہنماؤں نے دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر ریاستوں میں حکمراں کانگریس کو شکست دی۔ ۱۹۷۷ کے الکشن میں اندرا گاندھی کی شکست کے بعد ایک مسلم رہنما نے کہا "آج ہم نے ظلم کا بیڑا غرق کردیا" مگر ان فتوحات کے باوجود اصل صورت حال آج بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ وہ پہلے تھی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی غلطی کو ہم کب تک دہراتے رہیں گے۔ اصل سیاست یہ ہے کہ خود اپنے آپ کو طاقتور اور مستحکم بنایا جائے۔ سیاسی اشتراک یا متحدہ محاذ ہمیشہ اس فریق کے لئے مفید ہوتا ہے جو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ فیصلہ کن پوزیشن کا حامل ہو، اندرونی کمزوری اور انتشار کو درست کرنے سے پہلے متحدہ محاذ کی طرف دوڑنا نادانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ (اگست ۱۹۷۲)

اس سلسلہ میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ جہاں تک جزوی امور میں تعاون کا تعلق ہے۔ اس قسم کا تعاون ہر ایک سے لیا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ کافر و مشرک سے بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے نازک سفر میں عبداللہ بن اُرَیقِط کو رہنما بنایا جو کہ مشرک تھا۔ صفوان بن امیہ آپ کے ساتھ غزوۂ حنین میں شریک ہوئے۔ حالاں کہ اس وقت تک وہ مشرک تھے۔ امام زہری نے روایت کیا ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعان بناس من الیھود فی حربہ فاسھم لھم (رواہ سعید فی سننہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض یہودیوں سے جنگ کے موقع پر مدد لی تو ان کے لئے مال غنیمت میں حصہ مقرر کیا۔

مگر یہ جزوی اور انفرادی تعاون کی مثالیں ہیں۔ کلی جدوجہد کے سلسلہ میں کبھی اغیار پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر وہ جدوجہد جو "غیر صالح حکمراں" کو ہٹا کر اس کی جگہ "صالح حکمراں" کو لانے کے لئے کی جائے۔ اس قسم کی سیاسی جدوجہد تمام تر جماعت صالحہ کی اپنی طاقت پر ہونا چاہئے۔ کوئی جماعت صالح اگر اپنے بل پر انقلاب لانے کی پوزیشن میں نہ ہو تو اس کا غیر سیاسی دائرۂ عمل میں کام کرنے پر قانع رہنا اس سے بہتر ہے کہ وہ غیر صالح عناصر کو لے کر عملی سیاست کے میدان میں کود پڑے۔ یہ غیر صالح عناصر اپنے مزاج کی بنا پر ایسا کبھی نہیں کر سکتے کہ "غیر صالح حکمراں" کو بے دخل کرنے کے بعد اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں اور خالی شدہ تخت کو تمام تر جماعت صالحہ کے حوالے کردیں۔ وہ لازماً یہ چاہیں گے کہ تخت پر خود قبضہ کریں۔ اس وقت "متحدہ محاذ" کے اندر باہمی کشمکش شروع ہوگی جو یقینی طور پر غیر صالح عناصر کے غلبہ پر ختم ہوگی۔ ساری تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے۔

جب تعمیری حوصلے سیاسی عزائم میں تبدیل ہو جائیں

ابوعلی محمد بن علی بن مقلہ (۳۲۸ - ۲۷۲ھ) ایک غیر معمولی صلاحیت رکھنے والا فن کار تھا۔ اس نے قدیم عربی خط (خط کوفی) میں اصلاحات کرکے اس کو حسین اور جاذب بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ ابتدا میں وہ عباسی حکومت کے ایک دفتر میں چھ دینار ماہوار پر منشی تھا۔ پھر اس کا فنی کمال اس کو خلیفہ کے دربار تک لے گیا۔ یہاں اس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ مسلسل تین بادشاہوں کا وزیر بنتا رہا۔ اولاً مقتدر باللہ عباسی (۳۲۰ — ۲۸۲) کا، پھر اس کے بھائی قاہر باللہ (۳۲۲ —   ) کا، اس کے بعد راضی باللہ (۳۲۹ — ۲۹۷) کا۔ واضح ہو کہ "وزیر" قدیم زمانے میں وزیر اعظم کے ہم معنی ہوتا تھا۔ کیونکہ بادشاہ کا صرف ایک وزیر ہوتا تھا اور اس کو سارے اختیارات حاصل ہوتے تھے مقتدر باللہ کے ابتدائی زمانے میں حامد بن عباس وزیر تھا۔ اس کے ساتھ اس نے علی بن عیسٰی الجراح کو نائب وزیر بنایا تو لوگوں کو سخت تعجب ہوا۔ ایک شاعر کی نظم کا ایک شعر یہ ہے۔

اعجب من کل ما رأینا
ان وزیرین فی بلاد

سب سے عجیب بات جو ہم نے دیکھی
وہ یہ کہ ایک ملک میں دو وزیر ہیں

ابن مقلہ کے یہ مناصب اس کے فن کی ترقی میں بے حد مددگار ہو سکتے تھے۔ اگر ان ملے ہوئے مواقع کو وہ فن تحریر اور اس سلسلے کی دوسری چیزوں کی ترقی اور تحقیق میں لگاتا تو نہ صرف یہ کہ عربی رسم الخط بہت پہلے اپنے معراج کمال کو پہنچ جاتا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ تحریر اور کتاب کے میدان کی بہت سی دوسری ایجادیں جو اس کے بہت بعد سامنے آئیں اسی کے زمانے میں وجود میں آگئی ہوتیں۔ مثال کے طور پر کاغذ ابن مقلہ سے آٹھ سو برس پہلے ۱۰۵ء میں چین میں ایجاد ہوا۔ اس کا ایجاد کرنے والا سائی لون تھا جو ابن مقلہ کی طرح چینی شہنشاہ ہوٹی کا وزیر تھا۔ روسی ترکستان میں عربوں اور چینیوں کی جنگ میں کچھ چینی قیدی جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے وہ کاغذ بنانا جانتے تھے۔ سمرقند میں ان سے کاغذ بنوایا گیا۔ اس کے بعد ۷۹۵ء میں دستی کاغذ کی صنعت بغداد میں قائم ہوئی۔ تاہم مشین کے ذریعے کاغذ بنانے کا کام پہلی بار ۱۶۸۰ء میں ہالینڈ میں کیا گیا۔ مسلسل رول کی شکل میں کاغذ بنانے کی صنعت ۱۷۹۸ء میں فرانس میں شروع ہوئی۔ اسی طرح پرنٹنگ پریس پہلی بار غالباً چینیوں نے ۷۷۰ء میں دریافت کیا۔ یہ ابن مقلہ (۹۴۰ — ۸۸۵ء) کی پیدائش سے ۱۱۵ سال پہلے کا زمانہ تھا۔ پرنٹنگ کا قدیم ترین نمونہ اس سے بھی پہلے پانچویں صدی عیسوی کا چین میں دریافت ہوا ہے۔ یورپ میں ترقی یافتہ پرنٹنگ پریس ۱۵ویں صدی میں گوٹن برگ نے بنایا اور بائبل چھاپی۔ تاہم مسلم دنیا میں پرنٹنگ پریس نپولین کے ذریعے ۱۷۹۸ء میں پہلی بار مصر پہنچا۔

ابن مقلہ جو نہ صرف فن تحریر کا ماہر تھا بلکہ حیرت انگیز تخلیقی صلاحیت رکھتا تھا۔ اگر وہ اپنی خدا داد صلاحیتوں کو اپنے میدان میں لگاتا تو کاغذ اور چھپائی اور اس طرح کی دوسری نعمتیں جو عالم اسلام کو بہت بعد کو ملیں شاید ابن مقلہ کے زمانہ ہی میں اس کو مل چکی ہوتیں۔ مگر وہ اس پر قانع نہ رہ سکا کہ اپنے آپ کو مخصوص میدان میں محدود رکھے۔ وزارت کے ملے ہوئے مواقع کو وہ تحریر اور کاغذ اور چھپائی کی ترقی میں استعمال کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس اس نے ان مواقع کو عزت و ناموری کی طرف چھلانگ لگانے کے لئے ایک زینہ کے طور پر استعمال کیا۔ ابن مقلہ جب وزیر کے منصب پر پہنچ گیا تو اس کے ساتھ وہی حادثہ ہوا جس سے وہ لوگ بہت کم بچتے ہیں جن کو حالات کسی بلند مقام پر پہنچا دیں۔ اس کے فنی حوصلے اب سیاسی

عزائم میں تبدیل ہو گئے۔ خاموش تعمیری کاموں میں مشغول رہنے کے بجائے وہ سیاسی اور فوجی تحریکوں کا لیڈر بن گیا اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ خلیفہ قاہر باللہ کو تخت سے اتار کر ابو احمد بن مکتفی کو عباسی سلطنت کا حکمراں بنا یا جائے۔

راز کھل گیا۔ ابن مقلہ پر یہ الزام لگا کہ اس نے فوجی سردار مونس خادم کے ساتھ مل کر قاہر باللہ کی حکومت کو ختم کرنے کی سازش کی تھی۔ سازش کے انکشاف کے بعد ابن مقلہ کا گھر جلوا دیا گیا۔ ابو احمد بن مکتفی کو دیوار میں چن دیا گیا۔ تاہم ابن مقلہ کی ذہانت اس کے کام آئی۔ وہ فرار ہو کر بچ گیا اور اس کے بعد پانچ لاکھ دینار خلیفہ کو نذر کر کے دوبارہ وزارت حاصل کر لی۔ مگر اس کے سیاسی عزائم نے دوبارہ اس کے لئے مسائل پیدا کئے۔ یہاں تک کہ راضی باللہ نے اس کو وزارت سے معزول کر کے اس کے گھر میں نظر بند کر دیا اور اس کا دایاں ہاتھ کٹوا دیا۔ بلاشبہ یہ ایک سخت ترین سزا تھی جو کسی فن کار کو دی جا سکتی تھی۔ گھر کی قید میں جو اشعار وہ پڑھا کرتا تھا۔ اس میں سے ایک شعر یہ تھا:

لیس بعد الیمین لذۃ عیش

یا حیاتی بانت یمینی فبینی

دایاں ہاتھ کٹ جانے کے بعد زندگی میں کوئی لطف نہیں، اے میری زندگی جب میرا دایاں ہاتھ مجھ سے جدا ہو گیا تو تو بھی جدا ہو جا۔

ابن مقلہ کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تو اس نے بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق کی۔ یہاں تک کہ بائیں ہاتھ سے بھی وہ اتنا ہی اچھا لکھ لیتا تھا جیسا وہ دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔ پھر اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ میں ایک قلم باندھا اور اس سے لکھنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ ہاتھ کٹنے سے پہلے کے خط اور ہاتھ کٹنے کے بعد کے خط میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ باکمال انسان اپنے گھر کے قیدخانے میں ۵۶ سال کی عمر میں مر گیا۔

ابن مقلہ شاعر بھی تھا۔ اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کے ماتم میں بہت سے اشعار موزوں کئے۔ وہ کہتا تھا: "وہ ہاتھ جس نے قرآن کے فلاں فلاں نسخے لکھے، جس نے رسول اللہ ؐ کی فلاں فلاں حدیثیں لکھیں، جس نے مشرق و مغرب میں احکام لکھ کر بھیجے وہ چوروں کے ہاتھ کی طرح کاٹ دیا گیا۔"

ماضی کے ابن مقلہ کو تاریخ معاف کر سکتی ہے، مگر حال کے "ابن مقلہ" جو اپنے مناصب کو تعمیری جدوجہد میں نہیں لگاتے بلکہ اشتہاری قسم کے ذاتی عزائم میں اپنے قیمتی مواقع کو برباد کر رہے ہیں۔ ان کے پاس دوسری بار اس اندوہناک غلطی میں مبتلا ہونے کا کیا عذر ہے۔ کیا انھیں یاد نہیں کہ مومن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایک بل سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بہترین صلاحیتیں ہمیشہ سیاسی عزائم میں برباد ہوئی ہیں۔ سیاست بازی کے کام میں عام طور پر وہی لوگ حصہ لیتے ہیں جو قدرت سے اعلیٰ صلاحیت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اعلیٰ صلاحیت کو کسی تعمیری خدمت میں لگانے کے بجائے سیاسی حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں بے شمار انسانی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ بے شمار اقتصادی وسائل برباد ہوتے ہیں۔ اور عملاً اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ کچھ لوگوں کو لیڈرانہ شہرت حاصل ہو جائے اور عوام کے حصہ میں صرف یہ نتیجہ آئے کہ ایک "ظالم" کی جگہ دوسرا "ظالم" تخت سلطنت پر بیٹھ گیا ہو۔ تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے کہ مقابلہ آرائی کی سیاست سے کبھی کوئی حقیقی نتیجہ برآمد ہوا ہو۔ قوم کو اٹھانے کا راز یہ ہے کہ قوم کے رہنما اپنے سیاسی جھنڈے کو نیچا کر لیں۔ انفرادی حوصلوں کا "بیج" جہاں زمین میں دفن ہوتا ہے وہیں سے قومی مستقبل کا شاندار "درخت" اگتا ہے۔ آج ہماری تاریخ کو اسی قسم کی "شہادت" کا انتظار ہے۔

سیاست کے ساتھ دینی خدمت کا کام نہیں کیا جا سکتا

شمالی نائجیریا کی ۶۵ ملین آبادی میں آدھے سے زیادہ مسلمان ہیں۔ دو سو برس پہلے کی بات ہے۔ شمالی نائجیریا کے سلطان بیوا نے ریاست کے علما کو اپنے دربار میں بلایا اور ان کو تحفے دئے۔ آنے والوں میں ایک بزرگ نے تحفہ قبول نہیں کیا۔ یہ عثمان دان فودیو (۱۸۱۷ - ۱۷۵۴) تھے۔ انھوں نے کہا: میں آپ کا تحفہ اس وقت لوں گا جب کہ آپ مجھ کو تبلیغ اسلام کا پروانہ عطا فرمائیں — سلطان نے فوراً ان کے مطالبہ کو مان لیا۔ عثمان دان فودیو نے اس کے بعد تبلیغ و دعوت کا کام شروع کیا۔ ان کی کوششوں سے نائجیریا کے بہت سے باشندے مسلمان ہو گئے۔

تاہم یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ عثمان دان فودیو نے اس کے بعد سلطان کے سامنے سیاسی مطالبات رکھنے شروع کئے۔ "تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کرو۔ ٹیکس کی شرح گھٹاؤ، وغیرہ"۔ اس قسم کے مطالبات نے حکمرانوں کو خفا کر دیا۔ سلطان بیوا کسی طرح ان کو برداشت کرتا رہا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا سلطان نفاتا تخت پر بیٹھا۔ اس نے نہ صرف عثمان دان فودیو کے سیاسی مطالبات کو رد کیا بلکہ ان کی تبلیغی سرگرمیوں پر بھی پابندی لگا دی۔ اب عثمان دان فودیو اور ان کے ساتھی سلطان کے سیاسی مخالف بن کر کھڑے ہو گئے۔ ۱۸۰۹ میں اس باہمی جنگ کا سلسلہ شروع ہوا جو عثمان دان فودیو کی موت (۱۸۱۷) تک ناکام طور پر جاری رہا — احمدو بلو انھیں عثمان دان فودیو کے لڑکے تھے جن کو اپنے باپ سے ایک طرف تبلیغی جذبہ کی وراثت ملی تھی اور اسی کے ساتھ سیاسی جہاد کی بھی۔ عجیب بات ہے کہ احمدو بلو نے اپنے والد کے انجام سے کوئی سبق نہیں لیا اور اسی تجربہ کو پھر دہرایا جو ان کے پیش رو کے زمانہ میں ناکام ہو چکا تھا۔

"میری کوششوں کی وجہ سے دسمبر ۱۹۶۳ سے لے کر مارچ ۱۹۶۵ تک تقریباً دو لاکھ (۱۸۶۹۳۰) مشرکوں نے اسلام قبول کیا۔ ان میں سے بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو سماجی زندگی میں نمایاں مقام رکھتے ہیں"۔

یہ نائجیریا کے سابق وزیر اعظم الحاج احمدو بلو (۱۹۶۶ — ۱۹۰۱) کے الفاظ ہیں جو انھوں نے ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴) کی موتمر اسلامی (قاہرہ) میں تقریر کرتے ہوئے کہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ افریقہ کی لگ بھگ ۲۲ کروڑ آبادی میں دس کروڑ ۸۰ لاکھ مسلمان ہیں۔

اگر مسلم ملکوں کی مدد شامل حال ہو تو افریقہ کے مشرک قبائل میں تیزی سے اسلام پھیل سکتا ہے۔ اور اس کا ثبوت خود میری وہ کامیابیاں ہیں جن کا میں نے ابھی حوالہ دیا"۔

احمدو بلو کو اسلام کی خدمت کا یہ جذبہ اپنے دادا عثمان ڈان فوڈیو سے ملا تھا۔ ۱۹ ویں صدی میں جب پرتگال، فرانس اور برطانیہ نے افریقہ کے علاقوں میں گھسنا شروع کیا تو افریقہ میں اس کے رد عمل کے تحت بہت سے مصلحین اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھیں میں سے ایک عثمان ڈان فوڈیو بھی تھے۔ انھوں نے گزشتہ صدی میں مسلمانوں کی اصلاح اور استعماری طاقتوں کے خلاف جہاد کی زبردست تحریک چلائی۔ دریائے نائجیریا کے کنارے کنارے دور تک انھوں نے اسلام کا جھنڈا لہرا دیا تھا۔ ۱۸۲۳ میں ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشینوں نے

یہ مہم جاری رہی۔ نائجیریا کی راجدھانی لاگوس سے لے کر شمال میں لکوٹو شہر تک مقابلے جاری تھے۔ تاہم آخری فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہوا۔ انھوں نے ۱۸۸۶ میں سلطان محمد طاہر اور ان کے ساتھیوں کو شکست دے کر نائجیریا پر قبضہ کر لیا۔

احمد وبلو انھیں روایات کے درمیان موجودہ صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ سوکوتو کے امیر قبیلہ تھے۔ ابھی وہ دس سال کے تھے کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔ ان کی ماں ایک دیندار خاتون تھیں۔ قدیم رواج کے مطابق پہلے انھیں قرآن حفظ کرایا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے عربی مدرسہ میں داخلہ لیا اور ۲۱ سال کی عمر تک دینی تعلیم سے فراغت حاصل کر لی۔ ۱۹۲۶ میں مغربی تعلیم کے لئے کاسینا کالج میں داخل ہوئے اور انگریزی زبان اور ریاضیات کی تعلیم مکمل کی۔ خاندانی وراثت کے تحت ان کو سکوتو کا امیر بنایا گیا۔ ۱۹۳۴ میں سلطان حسن نے ان کو شہر رباح کا گورنر مقرر کیا۔ ۱۹۳۸ میں جب سلطان حسن کا انتقال ہوا تو نئے سلطان ابوبکر نے احمد وبلو کو سوکوتو کے "ساردونا" کے منصب پر سرفراز کیا۔ ۱۹۴۸ میں انھوں نے لندن کا سفر کیا اور آزادی کے مسائل پر حکومت برطانیہ سے گفتگو کی۔

۱۹۶۳ کی مردم شماری کے مطابق نائجیریا میں ۳۰ ملین مسلمان ہیں، عیسائی ۱۹ ملین اور دوسرے قبائل ۱۰ ملین ہیں۔ شمالی نائجیریا میں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں اور جنوبی نائجیریا میں زیادہ تر عیسائی۔ احمد وبلو شمالی نائجیریا کے لیڈر رہے۔ وہ مغربی استعمار کے خلاف جنگ میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۶۰ میں نائجیریا آزاد ہوا تو وہاں ایک فیڈرل گورنمنٹ بنی۔ اس حکومت کے فیڈرل پرائم منسٹر سر ابوبکر تفاوا بلیوا (۱۹۱۲–۱۹۶۶) تھے۔ احمد وبلو شمالی نائجیریا کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ یہ ایک مخلوط حکومت تھی جس میں مختلف پارٹیوں کے نمائندے اور مسلمان اور عیسائی دونوں شریک تھے۔ احمد وبلو نے مسلمانوں کی اصلاح وتعمیر اور عیسائیوں میں اسلام کی اشاعت کا کام پوری توجہ سے شروع کیا۔ اس کے نتائج بھی نکلنے شروع ہوئے۔ مگر انھیں زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ۱۵ جنوری ۱۹۶۶ کو ۲۵ فوجی افسروں نے مل کر بغاوت کر دی۔ اس بغاوت میں ابوبکر تفاوا بلیوا، احمد وبلو اور بہت سے مسلمان اور عیسائی مارے گئے۔ اس کے بعد نائجیریا میں فوجی حکومت قائم ہوگئی جس کے سربراہ جنرل ارونسی تھے۔ مگر انھیں بھی صرف چھ ماہ حکومت کرنے کا موقع ملا۔ ۲۹ جولائی ۱۹۶۶ کو دوسری فوجی بغاوت ہوئی اور وہ بھی ختم کر دیئے گئے۔

نائجیریا میں دو مسئلے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد ستر فی صد ہے۔ مگر تعلیم، اقتصادیات اور تنظیم میں پیچھے ہونے کی وجہ سے عملاً اکثر شعبوں پر عیسائی چھائے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے بلند کیا جائے تاکہ وہ ملک میں اپنا جائز مقام پا سکیں۔ دوسرا کام یہاں کے عیسائیوں اور خاص طور پر ۱۰ ملین مشرک قبائل میں اسلام کی اشاعت ہے۔ یہ دونوں کام احمد وبلو نے شروع کر دیئے تھے۔ مگر ان کی شہادت سے جو سبق ملتا ہے وہ یہ کہ تعمیر وتبلیغ کا کام سیاست کو لے کر نہیں کیا جا سکتا۔ احمد وبلو اگر سیاست سے الگ ہو کر یہ کام کر رہے ہوتے تو وہ ۲۰–۲۵ برس میں نائجیریا کی تاریخ بدل دیتے۔ مگر سیاست کے خارزار نے انھیں بھی ختم کر دیا اور ان کے ملی اور اسلامی کام کو بھی ☐

سیاسی حرص کے بجائے سیاسی قناعت

کوئی مرد عورت اپنی اولاد کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتے۔ یہی سیاست کا معاملہ بھی ہے کسی کے لیے ممکن نہیں کردہ اپنے پیدا کردہ سیاسی حالات کے منطقی نتائج سے انکار کر سکے۔ ایسی ہر کوشش ہمیشہ الٹی پڑتی ہے اور محرومیوں میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ اس کو پاکستان کی مثال سے سمجھئے۔

پاکستان تقسیم کے نعرہ پر بنا۔ مسلمانوں کی طرف سے "ڈائرکٹ ایکشن" کی نوبت آجانے کے بعد بالآخر یہ تحریک کامیاب ہوئی اور فریق ثانی نے اس مطالبہ کو مان لیا کہ آبادی کی بنیاد پر ملک کو تقسیم کر دیا جائے۔ مگر ۴۷ میں جب تقسیم کی سرحدیں طے کرنے کا وقت آیا تو پاکستانی لیڈروں کو نظر آیا کہ تقسیم کے اصول کے مطابق "جوناگڑھ" اور "حیدر آباد" جیسی مسلم ریاستیں ان کے ہاتھ سے نکل رہی ہیں۔ اب انھوں نے کوشش کی کہ دیسی ریاستوں کے معاملہ میں الحاق کے اصول کو مبہم رکھا جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ بیک وقت کشمیر پر بھی قبضہ کر لیں گے اور حیدر آباد پر بھی۔ کشمیر کو اس دلیل سے کہ وہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، حیدر آباد کو اس لئے کہ وہاں کا حکمران مسلمان ہے۔ مگر یہ خود اپنے پیدا کردہ حالات کے منطقی نتائج سے انکار کرنا تھا۔ چنانچہ اس کا انجام الٹا ہوا۔ دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑنے کی کوشش میں پاکستان ایک کو بھی نہ پکڑ سکا۔

پاکستان بنا تو وہ دو ایسے الگ الگ حصوں پر مشتمل تھا جن میں سے ایک (مشرقی حصہ) واضح طور پر دوسرے کے مقابلہ میں عددی اکثریت رکھتا تھا۔ بنگالی لیڈر حسین شہید سہروردی کی کوششوں سے پاکستان کے سابقہ دونوں حصوں میں سیاسی مساوات (Parity) قائم ہوگئی۔ صدر ایوب خاں کی بنیادی جمہوریت میں یہ مساوات ایک مسلمہ سیاسی اصول کے طور پر باقی رہی۔ اس کے مطابق مشرقی حصہ کے چالیس ہزار اور مغربی حصہ کے چالیس ہزار نمائندہ ووٹر ملک کی حکومت کا فیصلہ کرتے تھے۔ مگر پاکستان کے رہنما اس نظام کے خلاف ہو گئے۔ انھیں صدر ایوب کو اقتدار سے ہٹانا تھا اور اس کی سب سے آسان تدبیر یہ تھی کہ عوام کو یہ کہہ کر ان کے خلاف بھڑکا دیا جائے کہ بنیادی جمہوریت قائم کر کے انھوں نے عوام کے سیاسی حقوق کو غصب کر رکھا ہے۔ اب پاکستان میں تحریک جمہوریت چلائی گئی۔ بے پناہ نقصانات کے بعد بالآخر تحریک کامیاب ہوئی۔ صدر ایوب اور ان کی بنیادی جمہوریت دونوں ختم ہو گئے۔

۱۹۷۰ میں پاکستان کا پہلا عوامی انتخاب ہوا جس میں ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی آبادی چوں کہ زیادہ تھی، اس کے نمائندوں کی تعداد مرکزی اسمبلی میں زیادہ (۵۵ فی صد) ہو گئی۔ مساوات ٹوٹ گئی اور بنگلہ دیش نے پاکستان کے اوپر سیاسی بالاتری حاصل کر لی۔

اب پاکستان کے رہنما چیخ اٹھے۔ انھوں نے جمہوریت کے فتنہ کو یہ سمجھ کر جگایا تھا کہ وہ خود ان کو اقتدار تک پہنچانے کا زینہ بنے گی نہ اس لئے کہ بنگلہ دیش کے سیکولر لیڈر اس کو استعمال کر کے پاکستان کے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہو جائیں گے۔ انھوں نے چاہا کہ جمہوریت کو دوبارہ "پابند جمہوریت" بنائیں اور مشرقی اور مغربی حصہ میں مساویانہ نمائندگی

کا اصول قائم کریں جیسا کہ وہ پہلے قائم تھا۔ مگر عوامی جمہوریت کو زندہ کرنے کے بعد اس قسم کی کوشش خود اپنے پیدا کردہ حالات کے نتائج سے بھاگنے کے ہم معنی تھا۔ بنگلہ دیش عوامی رائے دہی کے اصول کے تحت ملی ہوئی سیاسی فوقیت کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ جمہوری منطق کے تحت پیدا شدہ نتائج کے انکار نے نئے شدید تر مسائل پیدا کئے۔ دونوں حصوں میں کشمکش بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ نوبت آئی کہ خود پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔

۱۹۷۸ میں یہ تجربہ اب ایک نئی شکل میں دہرایا جا رہا ہے۔ پاکستان کے دوسرے عوامی انتخاب (۱۹۷۷) میں بھٹو پارٹی کو کامیابی حاصل ہوئی۔ حزب مخالف کے لئے یہ سیاسی محرومی ناقابل برداشت تھی۔ اس نے الکشن کے نتائج کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے نعرہ لگایا کہ بھٹو پارٹی دھاندلی کر کے الکشن جیتی ہے۔ ورنہ پاکستانی عوام کی نناوے فی صد اکثریت ہمارے ساتھ ہے۔ انھوں نے "دوبارہ الکشن کراؤ" کے نام پر پاکستانی شہروں میں ہنگامے شروع کر دیئے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر فوجی افسروں نے بغاوت کر دی اور حکومت پر قبضہ کر لیا۔ عوام کو مطمئن کرنے کے لئے جنرل محمد ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ وہ صرف ریفری کے طور پر حکومت کے ایوان میں داخل ہوئے ہیں اور بہت جلد منصفانہ الکشن کرائے جائیں گے۔

پاکستان قومی اتحاد کے لیڈر خوش ہو گئے اور ۱۹۷۷ کو "عام الفتح" قرار دیا۔ مگر بھٹو پارٹی کے جلسوں میں عوام کی بھیڑ نے بتایا کہ بھٹو کے بے اقتدار ہونے کے باوجود عوام اب بھی اسی کے ساتھ ہیں اور اگر الکشن ہوا تو بھٹو پارٹی ہی دوبارہ برسر اقتدار آ جائے گی۔ جس جمہوریت کو لانے کے لئے پاکستانی رہنماؤں نے چوتھائی صدی خرچ کر دی تھی وہ جب آئی تو معلوم ہوا کہ وہ ساری کی ساری "بھٹو" جیسے لوگوں کے حصہ میں چلی گئی ہے۔ ان کو محسوس ہوا کہ مسئلہ صرف جمہوری انتخابات کا نہیں ہے بلکہ "مسئلہ انتخابات کی پیش آمدہ مصیبت اور ان کے متوقع بھیانک نتائج کا بھی ہے"۔ اب انھوں نے اپنے نعرے بدل دیئے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ "جمہوریت کو جلا ڈالو۔ لوگوں کی آزادیاں سلب کر لو۔ عمر کا کوڑا حرکت میں لاؤ (المنبر، فیصل آباد ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۸) یہی پاکستان کے تمام مخالف بھٹو رہنماؤں کا ذہن ہے۔ کوئی اس بات کو بھدے الفاظ میں کہہ رہا ہے اور کوئی خوبصورت الفاظ میں۔ مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کی سیاست خود اپنے پیدا کردہ حالات کے نتائج کو قبول نہ کرنا ہے۔ جب پاکستان میں عوامی جمہوریت کو زندہ کیا گیا ہے تو اب یہ ممکن نہیں کہ اس کے منطقی نتائج کو ظہور میں آنے سے رد کیا جا سکے۔ پاکستانی رہنماؤں کی یہ سیاست بلا شبہ ان کے لئے نہایت مہنگی پڑے گی۔ "نظام مصطفیٰ" اور "نظریہ پاکستان" جیسے الفاظ بول کر اس سیلاب کو روکا نہیں جا سکتا۔

اس قسم کی غلطی بار بار کیوں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ "سیاسی حرص" ہے۔ ہمارے رہنما صرف اتنے پر قانع ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں جو حقیقی حالات کے اعتبار سے انھیں مل سکتا ہے۔ ان کی اس کمزوری نے انھیں غیر حقیقت پسند بنا دیا ہے۔ وہ ایسے اقدامات کرتے ہیں جن کو نبھانے کی طاقت ان میں نہیں ہوتی۔ اسلامی تعلیم کے مطابق اگر وہ حرص کے بجائے قناعت کا طریقہ اختیار کریں تو وہ زیادہ بڑی اور حقیقی کامیابی حاصل کریں اور قوم کو بھی نئے نئے مسائل سے دوچار کرنے کی ذمہ داری سے بچ جائیں۔ (۲۳ اکتوبر ۱۹۷۸)

تاریخ کا ایک سبق

ترکی مشرق و مغرب کا سنگم ہے اس لیے مغربی تہذیب سے تصادم کا مسئلہ سب سے پہلے یہیں پیش آیا۔ مگر اس کے جواب میں کیا ہوا۔ ایک طرف قدیم علماء کا گروہ تھا جو مغرب کی طرف سے آنے والی ہر چیز کا اس درجہ مخالف تھا کہ سلطان سلیم ثالث (۱۸۰۷-۱۷۸۹) اور اس کے جانشین سلطان محمود (۱۸۳۹-۱۸۰۸) کی نئی فوجی تنظیمات اور ان جدید اصلاحات تک کی مخالفت کی جو انھوں نے ترکی کو عسکری اور علمی لحاظ سے یورپ کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے دوش بدوش لے چلنے کے لیے نافذ کی تھیں۔

دوسری طرف ترکی کی وہ نئی نسل تھی جو پیرس اور برلن اور لندن کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرکے آئی تھی، وہ ترکی کو مغرب کے رنگ میں رنگ دینا چاہتی تھی۔ ان کی انتہا پسندی کا عالم یہ تھا کہ انھوں نے مغربی تقلید کے جواز کے لیے ایک پورا فلسفہ بنا ڈالا۔ ضیاء گوک الپ نے کہا:

"مغربی تہذیب درحقیقت بحر روم کی تہذیب کا امتداد ہے، اس تہذیب (جس کو ہم بحیرہ روم کے منطقہ کی تہذیب کہتے ہیں) کے بانی سماری، سیتھی، فنیقی، رعاۃ، ترکی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

تاریخ میں قدیم زمانوں سے پہلے ایک طورانی دور کا وجود ملتا ہے، اس لیے کہ وسط ایشیا کے قدیم باشندے ہمارے اجداد تھے۔ اس کے بعد مسلمان ترکوں نے اس تہذیب کو ترقی دی اور اس کو یورپ تک پہنچایا۔ پھر مغربی و مشرقی سلطنت روما کے خاتمہ کے بعد ترکوں نے یورپ کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا، اور اسی بنیاد پر ہم مغربی تہذیب کا جزو ہیں اور ہمارا اس میں حصہ ہے۔"

ان کا منتہائے فکر یہ تھا کہ "وہ اپنے دماغ سے کام لے کر اپنے کو مغرب کی روشن اور بلند پایہ تہذیب میں جذب کرلیں" (عرفان اورگا، اتاترک، ۲۹۰) کمال اتاترک (۱۹۳۸-۱۸۸۱) جب ۱۹۲۴ میں ترک جمہوریہ کے پہلے صدر مقرر ہوئے تو ان کے نزدیک جو سب سے اہم کام تھا وہ یہ کہ ترکوں کو مغرب کا لباس پہنا دیں۔ انھوں نے پردہ کو خلاف قانون قرار دیا۔ عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف جاری کیے عربی میں اذان ممنوع ہوگئی۔ ہیٹ کا استعمال لازمی قرار دیا گیا۔ حتیٰ کہ جب ایک خوں ریز انقلاب کے بعد ہیٹ کی جنگ جیت لی گئی تو مصطفیٰ کمال نے مکہ کی موتمر اسلامی (۱۹۲۶) میں شرکت کے لیے ترک پارلیمنٹ کے ایک ممبر ادیب ثروت کو اس حال میں روانہ کیا کہ وہ اس کے واحد مندوب تھے جو اپنے سر پر مغربی ہیٹ رکھے ہوئے تھے۔ یہ گویا ترکی کی فتح عظیم کا اعلان تھا۔

یہی مثال ہر مسلم ملک میں پیش آئی ہے۔ ان میں ڈگری کا فرق تو ہوسکتا ہے مگر نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔ ہر جگہ یہی ہوا کہ قدیم مذہبی طبقہ نے مغرب سے نفرت اور اجتناب میں زندگی کا راز بتایا اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے مغرب کی تقلید سے یہ امید کی کہ وہ دوبارہ بام عروج پر پہنچ جائیں گے۔ مگر یہ مثال کہیں نظر نہیں آتی کہ کچھ لوگ شدت سے اس پہلو کی طرف قوم کو متوجہ کر رہے ہوں کہ قوت و طاقت کے اس راز کو معلوم کرو جس سے مسلح ہو کر مغرب تمہارے اوپر اور دنیا کے اوپر چھا رہا ہے

ترکی کی یہ تاریخ ایک انتہائی مثال ہے جو بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلم ممالک کس طرح حالات کا اندازہ کرنے میں ناکام رہے اور نتیجۃً وقت کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی نہ کرسکے۔ اسی کے ساتھ ترکی کی تاریخ میں دو اور علامتی مثالیں بھی ہیں۔ ملی کام کے لئے جان دار کارکنوں کا نہ ملنا، اور تیاری کے بغیر اقدامات۔

جدید ترکی میں دو شخصیتیں علمی و فکری حیثیت سے انتہائی نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک نامق کمال (۱۸۸۸ـ ۱۸۴۰) دوسرے ضیا گوک الپ (۱۹۲۴ـ ۱۸۷۵) دونوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ دونوں ترکی کے علاوہ عربی اور فرنچ زبانیں جانتے تھے۔ انیسویں صدی کی مسلم دنیا کی دوسری تمام شخصیتوں کی طرح اگرچہ یہ دونوں ہی سیاست سے متاثر تھے۔ اور سیاسی انقلاب کو سب سے بڑا کام سمجھتے تھے۔ تاہم دونوں میں یہ فرق تھا کہ نامق کمال نسبتاً معتدل اور متوازن فکر کے آدمی تھے۔ وہ عملی سیاست سے متاثر ہونے کے باوجود اسلامی اصطلاحوں میں سوچتے تھے اور "ترک اتحاد" کے بجائے "اسلامی اتحاد" کے الفاظ بولتے تھے۔ مزید یہ کہ نامق کمال کو ترکی کی جدید نسل میں مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ خالدہ ادیب خانم نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> "نامق کمال ترکی جدید کی محبوب ترین شخصیت تھی۔ ترکی کے افکار و سیاسیات کی تاریخ میں ان سے زیادہ کسی دوسری شخصیت کی پرستش نہیں کی گئی"

Halde Adib, Turkey Faces West, P.64

دوسری طرف ضیا گوک الپ ایک آزاد خیال آدمی تھا۔ اس کے فکری نظام میں اسلام بنیادی عامل کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے دعوت دی کہ ترکی کی تعمیر نو خالص قومی اور مادی بنیادوں پر کی جائے۔ وہ اسلامی تہذیب کے بجائے مغربی تہذیب کا پرجوش علم بردار تھا۔

ترکی کی بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ ترکی میں نامق کمال جیسے لوگوں کے افکار کو غلبہ نہیں ملا۔ بلکہ ضیا گوک الپ جیسے لوگ عملاً وہاں کی سیاست و قیادت پر چھا گئے۔ اس کی کم از کم ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ضیا گوک الپ کے افکار کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کمال اتاترک (۱۹۳۸ـ ۱۸۸۱) جیسا طاقتور اور مضبوط ارادہ کا آدمی مل گیا تھا۔

اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے۔ نامق کمال نے اگرچہ اپنی قوم کے ایک طبقہ میں محبوبیت حاصل کی۔ تاہم اپنے خطیبانہ ادب میں وہ جو خیالات کو پیش کر رہے تھے، ان کے اندر روایتی لوگوں کے لئے خواہ کتنی ہی اپیل ہو، جدید افکار کے عالمی سیلاب میں اس کی حیثیت ایک قسم کے رومانی خواب کی تھی۔ اصولی طور پر بلاشبہ یہ بات درست ہے کہ اسلام کو اجتماعی اداروں کی بنیاد ہونا چاہئے۔ مگر ایک ایسی دنیا میں جہاں عملی طور پر سیکولر افکار کا غلبہ ہو، کوئی شخص اپنا علیحدہ جزیرہ تعمیر نہیں کرسکتا۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ عمومی فکری فضا کو اس کے موافق بنا لیا جائے۔

جدوجہد نام ہے اپنے آپ کو خدا کے منصوبہ میں شامل کرنے کا

ہندستان میں مغربی قوموں کے لئے داخلہ کا راستہ سب سے پہلے واسکو ڈی گاما (۱۵۲۴-۱۴۶۰) نے پیدا کیا۔ اس کے بعد پرتگالی اور فرانسیسی قومیں اس ملک کے ساحلی علاقوں میں داخل ہوئیں۔ آخر میں انگریز آئے اور ڈیڑھ سو برس کے اندر انھوں نے پورے برصغیر پر قبضہ کر لیا۔ ہند، پاکستان، بنگلہ دیش، سیلون، برما، تبت نیپال، سب انگریز کے جھنڈے کے نیچے آگئے۔ ہندستان پر اپنے قبضہ کو دائمی بنانے کے لئے انھوں نے نہر سوئز پر قبضہ کیا اور اس کے بیشتر حصے مہنگی قیمت پر خرید لئے۔

انگریزوں نے نہ صرف ہندستان کی سیاست اور معیشت پر قبضہ کیا بلکہ یہاں کی سرکاری زبان بدل دی۔ تعلیمی نظام ایسا بنایا جس سے ایسی نسل پیدا ہو جو لارڈ میکالے کے الفاظ میں "پیدائش کے اعتبار سے ہندستانی اور خیالات کے اعتبار سے انگریز ہو"۔ عیسائی مشنریوں نے حکومت کی مدد سے مسلح ہو کر پورے ملک کو عیسائی بنانے کا کام شروع کر دیا۔ اس طرح ایک ایسی حکومت جس کی وسعت اتنی زیادہ تھی کہ "اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا" اپنے تمام وسائل اور تہذیبی طاقت کے ساتھ ملک کے اوپر چھاگئی اور اپنے اقتدار کو مستقل بنانے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو اس مادی دنیا میں اور وہ بھی آج کے ترقی یافتہ دور میں کوئی کر سکتا ہے۔

مگر اگست ۱۹۴۷ کا انقلاب بتاتا ہے کہ بات وہیں ختم نہیں ہو جاتی جہاں کوئی اپنے طور پر اسے ختم سمجھ لیتا ہے۔ کوئی قوم خواہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر دوسری قوم کے اوپر غالب آجائے، پھر بھی کچھ ایسے گوشے باقی رہتے ہیں جہاں سے جدوجہد کر کے دبی ہوئی قوم دوبارہ نئی زندگی حاصل کرے۔ پھر اس انقلاب ہی کی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ یہ کام محض جھنجھلاہٹ کے ساتھ سر ٹکرانے سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ حالات کو گہرائی کے ساتھ سمجھا جائے اور حریف کے اس نازک گوشہ کو تلاش کیا جائے جہاں سے مؤثر جدوجہد کا آغاز کیا جا سکتا ہے —— خدا نے اپنی دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا ہے کہ یہاں ہر بار گرنے کے بعد اس کے بندوں کے لئے دوبارہ ابھرنے کا ایک نیا امکان باقی رہے۔ مگر یہ امکان اسی کے لئے واقعہ بنتا ہے جو اپنے آپ کو خدائی اسکیم کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لئے تیار ہو۔ جو اپنی خودساختہ راہوں پر دوڑنا شروع کر دے، اس کے لئے خدا کی اس دنیا میں ابدی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

گھڑی کی سوئی بظاہر جہاں سب سے زیادہ قریب نظر آتی ہے وہ اس کا شیشہ ہے۔ لیکن گھڑی کی سوئی گھمانے کے لئے کوئی شخص اس کے شیشہ پر زور آزمائی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی چابی پر اپنا ہاتھ لے جاتا ہے۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ملت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمارے تمام لیڈر "گھڑی" کے شیشہ پر زور آزمائی کر رہے ہیں۔ خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ سوئی تو نہ گھومے البتہ غلط طریق عمل کی وجہ سے مسائل میں کچھ اور اضافہ ہو جائے۔

اسلامی مرکز کی اشاعتی مہم : عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

دین کیا ہے	از	مولانا وحید الدین خاں	Rs. 1.50
الاسلام	"	"	12.00
تجدید دین	"	"	2.00
ظہور اسلام	"	"	12.00
اسلامی زندگی	"	"	
زلزلۂ قیامت	"	"	3.00
تاریخ کا سبق	"	"	2.00
تعمیر ملت	"	"	2.00
مذہب اور جدید چیلنج	"	"	13.50
اسلامیات	"	"	2.00
عقلیات اسلام	"	"	2.00
اسلام دین فطرت	"	"	2.00
تعلیمات قرآن	"	"	2.00
قرآن کا مطلوب انسان	"	"	

ماہنامہ **الرسالہ** تعمیری اور اصلاحی مضامین کے مستقل مطالعہ کے لئے — زرتعاون سالانہ 24.00

MAKTABA AL-RISALA, JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 110006